تفہیم احکام القرآن

www.KitaboSunnat.com

جلد دوم

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ معارفِ اسلامی منصورہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

www.kitabosunnat.com

تفہیم احکام القرآن (جلد دوم)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي

حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے

لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ

جو بالکل سیدھی ہے جو لوگ اسے مان کر بھلے کام

الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ

کرنے لگیں انھیں یہ بشارت دیتا ہے کہ

أَجْرًا كَبِيرًا ﴿٩﴾

ان کے لیے بڑا اجر ہے۔

(بنی اسرائیل ۱۷:۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفہیم احکام القرآن

تفہیم القرآن اور مولانا مودودیؒ کی دیگر تحریروں
میں مذکور احکام القرآن کا مجموعہ

جلد دوم

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: مولانا عبدالوکیل علوی

ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں)

نام کتاب	تفہیم احکام القرآن (جلد دوم) (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج)
لوازمہ از تصنیفات	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
ترتیب وتدوین	مولانا عبدالوکیل علوی
باہتمام	ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور 042-3532476, 35414677, 35419520 E-mail: imislami1979@gmail.com
مطبع	نوید حفیظ پرنٹرز، لاہور
اشاعت اول	اکتوبر ۲۰۰۷ء (۱۰۰۰)
اشاعت دوم	فروری ۲۰۱۵ء (۱۱۰۰)
صفحات	۶۲۸
قیمت	-/۸۲۵ روپے

تقسیم کنندہ:

مکتبہ معارف اسلامی

منصورہ ملتان روڈ لاہور پوسٹ کوڈ نمبر 54790

فون: 042-35432419, 35419520-24.(Ext-418)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فہرست

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
عرضِ ناشر	۱۹	عبادت کا جاہلی تصور	۲۸
عرضِ مرتب: اسلامی عبادات	۲۱	عبادت کا جوگیانہ تصور	۲۸
مقدمہ	۲۷	عبادت کا اسلامی تصور	۲۸
عبادت کے لغوی معنی	۲۷	روحانی ارتقا اور خدا کی یافت کا راستہ	۳۱
عبادات: اصل مقصد و حقیقت	۲۷	تمام عبادات کی روح اور جوہر	۳۲

حصہ اوّل: نماز

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
باب اوّل: نماز کی اہمیت و ضرورت	۳۸	استقامت کا ذریعہ	۶۲
فصل اوّل: نماز، افراد کی تیاری کا پروگرام	۳۹	مشکلات میں تسلی	۶۳
مراسمِ عبادت کی حیثیت	۳۹	تحمل و برداشت	۶۳
یاددہانی	۴۰	ایمان کی پختگی	۶۴
فرض شناسی	۴۱	نیک بنانا	۶۴
تعمیر سیرت	۴۳	بے حیائی سے روکنا	۶۵
ضبطِ نفس	۵۱	متذکرہ خوبی کے دو پہلو	۶۶
خلاصۂ بحث	۵۳	اصلاحی اثرات کب مرتب ہوتے ہیں!	۶۷
نماز اور تنظیم جماعت	۵۴	نماز کب قبول ہوتی ہے؟	۶۷
نماز باجماعت کا کردار	۵۵	فصل سوم: نماز کی اہمیت	۶۹
اذان کا مقام	۵۵	عہدِ رسالت میں نماز کی اہمیت	۶۹
مسجد میں اجتماع	۵۶	اقامت دین میں نماز کا مقام	۷۰
صف بندی کا اثر	۵۷	نماز اصلاح کا آخری ذریعہ	۷۰
اجتماعی دعائیں	۵۸	تارکِ نماز دوزخی ہے	۷۱
امامت کی حیثیت	۵۸	نماز سے غفلت برتنے والوں کا انجام	۷۲
فصل دوم: نماز کے فوائد	۶۲	باب دوم: نماز کی شرائط	۷۵
طلبِ اعانت کا وسیلہ	۶۲	فصل اوّل: طہارت	۷۷
		طہارت کا حکم	۷۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
طہارت کا جامع مفہوم	۷۷	مخالفین کے پروپیگنڈے کا جواب	۹۳
بدنی طہارت	۷۷	کعبے کی طرف رخ کرنے کا مطلب	۹۳
نظافتِ لباس	۷۸	تحویل قبلہ کی حکمت	۹۴
اخلاقی عیوب سے پاکی	۷۸	تحویل قبلہ، منصب امامت پر سرفرازی کا نشان	۹۵
پاک دامنی	۷۸	استقبال قبلہ اور شرک کا شبہ	۹۵
وضو	۷۹	ہوائی جہاز میں قبلے کا مسئلہ	۹۷
دل کی طہارت	۷۹	چاند پر قبلے کا حکم	۹۷
وضو کے بعد دعا	۷۹	**فصل سوم: اوقات نماز**	۹۸
وضو کی حکمت	۸۰		
وضو میں پاؤں دھونے کا مسئلہ	۸۰	ابتدائی دور میں اوقات نماز	۹۸
وضو کے قرآنی احکام میں کمی بیشی	۸۳	امامت جبریل اور نماز کے اوقات	۹۹
مس الذکر سے وضو ٹوٹنے کا مسئلہ	۸۴	اوقات پنج گانہ کا قرآن سے ثبوت	۹۹
نواقض وضو اور انسانی عقل	۸۴	منکرینِ حدیث کی جسارت	۱۰۲
سگریٹ پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا	۸۶	رجوع الی اللہ کے لیے پنج وقتہ نماز کا اہتمام	۱۰۳
وضو میں مستعمل پانی کا حکم	۸۶	کیا شب و روز میں پانچ اوقات زیادہ ہیں؟	۱۰۴
تیمم	۸۶	دلوک الشمس کے معنی	۱۰۴
بنیادی حکم	۸۶	بھولی ہوئی نماز کی ادائیگی کا وقت	۱۰۵
عَابِرِیْ سَبِیْلٍ کا مفہوم	۸۷	گرمی میں نماز ظہر کے لیے ابراد کا حکم	۱۰۶
لمس سے کیا مراد ہے؟	۸۷	ایک اعتراض کا جواب	۱۰۶
تیمم کے احکام	۸۷	جمع بین الصلاتین	۱۰۷
تیمم کے معنی	۸۷	وہ اوقات جن میں نماز ادا کرنا مکروہ ہے	۱۰۸
تیمم کا طریقہ	۸۷	نماز فجر دیر سے پڑھنا	۱۰۹
تیمم کا مقصد	۸۸	قطبین میں اوقات کا تعین	۱۰۹
موزوں اور جرابوں پر مسح	۸۸	چھ مہینے کے دن رات والے علاقوں میں اوقات کا تعین	۱۱۰
غسلِ جنابت کے لیے پانی کی مقدار	۸۹		
کھڑے ہو کر پیشاب کرنا	۹۰	**باب سوم: نماز کے ارکان**	۱۱۱
فصل دوم: استقبال قبلہ	۹۱	**فصل اوّل: تعوّذ اور تسمیہ**	۱۱۳
بنیادی حکم	۹۱	نماز کی ابتدا	۱۱۳
تحویلِ قبلہ	۹۲	تسبیح	۱۱۳
تحویلِ قبلہ کا حتمی حکم	۹۲	تعوّذ	۱۱۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
تلاوت قرآن سے پہلے تعوذ	۱۱۳
شیطان سے پناہ مانگنے کی حکمت	۱۱۴
تسمیہ	۱۱۶
فصل دوم: قراءت	۱۱۷
سورۃ الفاتحہ	۱۱۷
حمد کے معنی	۱۱۷
تعریف، اللہ ہی کے لیے	۱۱۷
الحمد للہ کے ترجمے پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۱۸
سورۂ فاتحہ اور باقی قرآن کا باہمی تعلق	۱۱۹
سورۂ فاتحہ، ایک دعا	۱۱۹
فاتحہ خلف الامام	۱۲۰
آمین بالجہر	۱۲۱
قراءت قرآن کو خاموشی سے سننے کا حکم	۱۲۱
آیت کا اصل مقصود	۱۲۱
ائمہ کی اختلافی آرا	۱۲۲
نماز میں قراءت فرض ہے	۱۲۲
قراءت میں آواز معتدل رکھنے کی ہدایت	۱۲۲
اگر امام کوئی آیت پڑھنا بھول جائے	۱۲۳
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق تلاوت	۱۲۳
نماز فجر میں قراءت کی طوالت	۱۲۴
فصل سوم: رکوع وسجود	۱۲۶
رکوع	۱۲۶
قومہ	۱۲۶
سجدہ	۱۲۶
تسبیحاتِ رکوع وسجدہ	۱۲۶
سجدہ باعثِ قربِ الٰہی	۱۲۷
فصل چہارم: تشہد اور درود	۱۲۸
تشہد میں انگلی اٹھانا	۱۲۸
درود	۱۲۸

عنوان	صفحہ
تشہد اور درود کے مسنون الفاظ	۱۲۸
درود وسلام کی اہمیت	۱۳۱
آیت کا منشا	۱۳۲
مسلمانوں کے لیے حکم	۱۳۲
درود کے مختلف الفاظ	۱۳۳
درود کی فرضیت ووجوب	۱۳۶
درود کی فضیلت	۱۳۶
کسی اور پر درود بھیجنا	۱۳۷
باب چہارم: حفاظتِ نماز	۱۳۹
فصل اوّل: نماز میں خشوع خضوع	۱۴۱
خشوع کے معنی	۱۴۱
آدابِ نماز	۱۴۱
حالتِ نشہ میں نماز کی ممانعت	۱۴۲
غلبۂ نیند کے وقت نماز چھوڑ کر سو جانے کا حکم	۱۴۲
مکمل انہماک اور توجہ کے بغیر نماز	۱۴۳
توجہ مرکوز کرنے کا طریقہ	۱۴۳
نماز میں اللہ کو دیکھنے کا مطلب	۱۴۴
عبادت کو خامیوں سے پاک کرنے کا طریقہ	۱۴۴
نماز میں ہاتھ ہلانا وغیرہ	۱۴۶
غیر امام کی آواز پر حرکت کرنا	۱۴۷
صلوٰۃ وسطیٰ	۱۴۹
باب پنجم: متعلقاتِ نماز	۱۵۱
فصل اوّل: اذان	۱۵۳
اذان کا آغاز کس طرح ہوا!	۱۵۳
اذان کے الفاظ	۱۵۴
اذان سن کر شیطان کا گوز کرنا	۱۵۴
حدیث کی مزید تشریح	۱۵۶
اذان پر کفار کا ردعمل	۱۵۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
اذانِ جمعہ کے بعد خرید و فروخت	۱۵۹
نمازِ جمعہ کی دوسری اذان	۱۵۹
اذان میں شرک کا شائبہ!	۱۶۰
سیلاب یا کثرتِ بارش کے موقع پر اذان دینا	۱۶۰
فصل دوم: جماعت	۱۶۱
نماز با جماعت کی اہمیت	۱۶۱
جماعت میں شمولیت کے آداب	۱۶۲
صف بندی کا طریقہ	۱۶۳
جماعت میں عورتوں کی شمولیت	۱۶۳
خوشبو کی ممانعت	۱۶۳
گھر بہتر ہے	۱۶۴
عورتوں کی جماعت	۱۶۵
نماز جمعہ میں شرکت	۱۶۵
فصل سوم: شرائط امامت	۱۶۶
امامت کی شرائط و آداب	۱۶۶
۱۔ تقویٰ و پرہیزگاری	۱۶۶
۲۔ اکثریت کی نمائندگی	۱۶۶
۳۔ مقتدیوں کے ساتھ ہمدردی	۱۶۶
۴۔ معذوری میں جگہ خالی کرنا	۱۶۶
۵۔ امام کی کامل اطاعت	۱۶۶
۶۔ غلطی پر تنبیہ	۱۶۷
۷۔ معصیت میں اطاعت نہیں	۱۶۷
امام کی صفات	۱۶۷
نابینا کے پیچھے نماز	۱۶۸
فصل چہارم: نماز کی قضا	۱۶۹
چھوڑے ہوئے فرائضِ شرعیہ کی قضا	۱۶۹
مزید بحث	۱۷۱
فصل پنجم: نمازِ قصر	۱۷۴
نماز قصر، حالتِ امن و جنگ میں	۱۷۴
سفر میں سنتوں کی ادائیگی	۱۷۴
سفرِ قصر کے لیے فی سبیل اللہ کی شرط	۱۷۵
فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ کا مفہوم	۱۷۵
نماز قصر اور مقدارِ سفر	۱۷۶
عارضی قیام، اور قصر کا مسئلہ	۱۷۷
نماز قصر کے لیے مدتِ سفر	۱۷۷
تردد اور قید کی حالت میں نماز قصر	۱۷۷
حالتِ امن میں قصر قرآن کے خلاف نہیں	۱۷۸
جدید دور کی سفری سہولتوں میں قصر	۱۷۹
فوجیوں کے لیے قصر	۱۸۰
فصل ششم: نمازِ جمعہ	۱۸۱
فرضیت و اہمیت	۱۸۱
جمعہ ایک مخصوص اسلامی اصطلاح	۱۸۲
جمعہ کی فرضیت کا حکم کب ہوا؟	۱۸۲
ہجرت کے بعد آپ کا اوّلین کام	۱۸۳
نمازِ جمعہ کا وقت	۱۸۳
رکعتوں کی تعداد	۱۸۳
نماز جمعہ کی اذان	۱۸۴
ذکر اللہ سے مراد	۱۸۴
ذکر کی طرف دوڑنے کا مطلب	۱۸۵
تمام مصروفیات چھوڑنے کا حکم	۱۸۵
فرضیتِ جمعہ کے چند دلائل	۱۸۶
زمین میں پھیل جانے کا حکم	۱۸۷
ایک اصولی مسئلہ	۱۸۸
ہفتہ وار چھٹی اور جمعہ	۱۸۸
اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہنے کا حکم	۱۸۹
احکام جمعہ کا خلاصہ	۱۹۰
مذہب حنفی	۱۹۰
مذہب شافعی	۱۹۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
مذہب مالکی	۱۹۲
مذہب حنبلی	۱۹۳
احکام جمعہ کا سبب نزول	۱۹۳
شیعہ حضرات کا طعن اور اس کا جواب	۱۹۵
صحابہؓ کے بارے میں غلو عقیدت	۱۹۵
آدابِ جمعہ	۱۹۶
نماز جمعہ اور دو رکعت نفل	۱۹۷
مجاہدین کے لیے نماز جمعہ	۱۹۸
خطبۂ جمعہ کی زبان	۱۹۸
خطبہ نمازِ جمعہ کا حصہ نہیں	۱۹۹
نماز اور خطبے کے مقاصد کا فرق	۲۰۰
چند خطب ماثورہ	۲۰۲
نماز اور خطبے کا ایک اور فرق	۲۰۵
خلاصۂ مباحث	۲۰۵
مانعینِ خطبۂ غیر عربیہ کے دلائل	۲۰۶
استدلالِ مذکور پر تنقیدی نظر	۲۰۶
دوسری دلیل	۲۰۹
تیسری دلیل	۲۰۹
عملی مشکلات	۲۱۰
خطبۂ جمعہ کی زبان پر مزید بحث	۲۱۱
خطبۂ غیر عربیہ کو لازم قرار دینا	۲۱۶
دیہات میں نمازِ جمعہ	۲۱۹
جمعہ کی شرعی حیثیت اور مقصد	۲۱۹
اسلام کی اجتماعیت	۲۱۹
فرضیتِ جمعہ کی حکمت	۲۲۰
فرضیتِ جمعہ کی اہمیت	۲۲۱
دو اصولی باتیں	۲۲۲
عملی تفصیلات جو متفق علیہ ہیں	۲۲۲
اختلافات اور ان کے وجوہ	۲۲۳

عنوان	صفحہ
مصرِ جامع کی شرط اور اس کی تشریح	۲۲۴
اختلافات کا اصل منشا	۲۲۵
مسلک حنفی کے اصل منشا کی تحقیق	۲۲۶
مسلکِ حنفی کی مزید تشریح	۲۲۸
فرضیتِ جمعہ کی نوعیت	۲۲۹
شرائطِ جمعہ	۲۳۰
قابلِ ترمیم شرائط	۲۳۳
شرطِ مصر	۲۳۴
آخری تنقیح	۲۳۶
خلاصۂ کلام	۲۳۸
تحریرِ فتویٰ کی دینی ضرورت	۲۳۹
فصل ہفتم: نمازِ عید	۲۴۱
نمازِ عید کا طریقہ	۲۴۱
نمازِ عید کے بعد مصافحہ اور معانقہ	۲۴۲
فصل ہشتم: نمازِ جنازہ	۲۴۳
منافق کی نمازِ جنازہ پڑھنے کی ممانعت	۲۴۳
غائبانہ نمازِ جنازہ	۲۴۳
فصل نہم: سنن ونوافل	۲۴۴
سنتوں کی اہمیت	۲۴۴
نمازِ فجر کی دو سنتیں	۲۴۴
نفل کا مفہوم	۲۴۵
باجماعت نوافل	۲۴۵
نمازِ تہجد	۲۴۵
نمازِ تہجد کی فضیلت	۲۴۵
حضورؐ کو قیام اللیل کا حکم	۲۴۶
مقدارِ وقت	۲۴۷
ترتیل کا حکم	۲۴۷
رات کی نماز کا حکم کیوں دیا گیا؟	۲۴۸
رات کے اٹھنے کا مفہوم	۲۴۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

عنوان	صفحہ
نفس پر قابو پانے کے معنی	۲۴۹
ذکر الٰہی کا حکم	۲۴۹
نمازِ تہجد میں تخفیف کا حکم	۲۵۱
تہجد اور قراءت کا قانونی حکم	۲۵۲
نفلوں میں فرض!	۲۵۲
فصل دہم: ذکر و دعا	۲۵۳
نماز کے بعد دعا	۲۵۳
دعا میں ہاتھ اٹھانے کا مسئلہ	۲۵۳
صبح و شام ذکر الٰہی کا حکم	۲۵۴
ذکر اور اس کے طریقے	۲۵۵
ہمہ وقت تسبیح کرنے کا حکم	۲۵۶
تسبیح و استغفار کے اہم مواقع	۲۵۶
مشرکین کے لیے دعائے مغفرت کی ممانعت	۲۵۷
حضرت ابراہیمؑ کی اپنے مشرک باپ کے لیے دعا	۲۵۸
فارغ اوقات میں اللہ کی طرف رغبت	۲۵۹
اللہ کو اچھے ناموں سے یاد کرنے کا حکم	۲۶۰
اپنے رب کو پکارنے کا حکم	۲۶۱
دعا عین عبادت اور جانِ عبادت ہے	۲۶۲
سوار ہوتے وقت دعا کا حکم	۲۶۵
اس تعلیم کے اخلاقی نتائج	۲۶۷
حمد و تسبیح سے مراد	۲۶۷
قبولیتِ دعا کے لیے قبروں پر چلہ کشی	۲۶۸
اللہ قریب ہے	۲۶۹
استغفار کا حکم اور اس کی برکتیں	۲۷۰
نماز کی دعاؤں کے متعلق چند شبہات	۲۷۳
فصل یازدہم: رفع الیدین اور آمین بالجہر	۲۷۶
رفع یدین کی فقہی حیثیت	۲۷۶
مختلف مکاتبِ فکر کے طریقوں پر نماز	۲۷۸
اولاد کو اپنے فقہی مسلک پر مجبور نہیں کیا جا سکتا	۲۷۹
فقہی اختلافات کی بنا پر نمازوں کی علیٰحدگی	۲۷۹
اختلافی مسائل پر امت سازی	۲۸۱
فصل دوازدہم: نماز کی زبان کا مسئلہ	۲۸۳
قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں	۲۸۳
نومسلموں کے لیے حکم	۲۸۳
عربی میں نماز کے لزوم کی مصلحتیں	۲۸۴
امام ابوحنیفہؒ اور غیر عربی میں نماز کی اجازت	۲۸۵
ایک غلط استدلال اور اس کا جواب	۲۸۶
آیت کا مفہوم	۲۸۶
ائمہ مجتہدین کے اختلافات	۲۸۷
امام ابوحنیفہ کا مذہب	۲۸۷
صاحبین کا مذہب	۲۸۸
امام شافعی کا مذہب	۲۸۸
مسئلے کی پوری تحقیق	۲۸۸
مصالح شرعیہ	۲۸۹
دلائل شرعیہ	۲۹۰
فصل سیزدہم: متفرقات	۲۹۳
نماز میں جدید آلات کا استعمال	۲۹۳
لاؤڈ سپیکر	۲۹۳
ریڈیو اور گراموفون وغیرہ	۲۹۹
سترہ اور اس کے احکام	۳۰۰
نمازی کے سامنے سے گزرنا	۳۰۱
ننگے سر نماز پڑھنا	۳۰۱
جوتے پہن کر نماز پڑھنا	۳۰۲
جیب میں تصویر والا شناختی کارڈ اور نماز	۳۰۳
اجرت پر قرآن سنانے والے کے پیچھے نماز	۳۰۳
گم شدہ چیز کا مسجد میں اعلان	۳۰۳
مسجدوں کی آبادکاری	۳۰۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حصہ دوم: زکوٰۃ

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
باب اوّل: احکامِ زکوٰۃ	۳۰۶	**فصل سوم: محلِ زکوٰۃ اشیا**	۳۲۳
		مویشی	۳۲۴
فصل اوّل: زکوٰۃ کی اہمیت وضرورت	۳۰۷	پولٹری فارم وغیرہ	۳۲۴
زکوٰۃ کی اصل روح	۳۰۷	آلاتِ پیدائش	۳۲۴
لغوی اور اصطلاحی معنی	۳۰۷	زیورات	۳۲۵
زکوٰۃ بمعنی پاکیزگی نفس	۳۰۸	بینکوں کی امانتوں کا حکم	۳۲۵
زکوٰۃ کی اہمیت	۳۰۸	لیے ہوئے قرضوں کی زکوٰۃ	۳۲۶
انفاق کا عام اور خاص حکم	۳۰۸	دیے ہوئے قرضوں کی زکوٰۃ	۳۲۶
اللہ کے ہاں زکوٰۃ کی قدر	۳۰۹	متوفی کے ترکے میں زکوٰۃ	۳۲۶
مخلص اہلِ ایمان کا طرزِ عمل	۳۱۱	مرہونہ جائداد پر زکوٰۃ	۳۲۷
تمام امتوں کو زکوٰۃ کا حکم	۳۱۱	متنازعہ جائداد کی زکوٰۃ	۳۲۷
امتِ مسلمہ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم	۳۱۲	قابلِ ارجاع نالش جائداد کا حکم	۳۲۷
ذریعۂ ہدایت	۳۱۲	عطیے کی زکوٰۃ کا حکم	۳۲۷
اصل نیکی	۳۱۳	بیمے اور پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ	۳۲۷
اہل ایمان کی اہم ترین صفت	۳۱۳	ڈیری فارم کے مویشیوں پر زکوٰۃ	۳۲۷
اسلامی اخوت کی بنیاد	۳۱۴	پھلوں، پھولوں اور سبزیوں کی زکوٰۃ	۳۲۸
نصرتِ خداوندی کا ذریعہ	۳۱۴	معدنیات کی زکوٰۃ	۳۲۸
زکوٰۃ نہ دینے کی سزا	۳۱۵	برآمد شدہ دفینہ اور آثارِ قدیمہ	۳۲۸
فصل دوم: بنیادی احکام	۳۱۶	شہد کی زکوٰۃ	۳۲۹
زرعی پیداوار	۳۱۶	آبی پیداوار کی زکوٰۃ	۳۲۹
دیگر اموال	۳۱۶	درآمدات وبرآمدات کی زکوٰۃ	۳۲۹
زکوٰۃ کے علاوہ ناداروں کا حق	۳۱۷	سکوں کی زکوٰۃ	۳۲۹
زکوٰۃ کے علاوہ ٹیکس	۳۱۸	کرایہ پر دی جانے والی اشیا	۳۳۰
زکوٰۃ اور ٹیکس میں فرق	۳۲۰	مضاربت کی صورت میں زکوٰۃ	۳۳۲
وہ لوگ جن پر زکوٰۃ واجب ہے	۳۲۰	کمپنیوں کی زکوٰۃ	۳۳۳
وجوبِ زکوٰۃ کی عمر	۳۲۲	تجارتی حصص کی زکوٰۃ	۳۳۳

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
فصل چہارم: نصابِ زکوٰۃ اور شرحِ ادائیگی	۳۳۷
مختلف اموال میں شرحِ زکوٰۃ	۳۳۷
چند اشیا کا نصابِ زکوٰۃ	۳۳۷
سونے چاندی کے نصاب کی تحقیق	۳۳۸
سونے اور چاندی کا الگ الگ نصاب	۳۳۸
شرحِ زکوٰۃ میں تبدیلی	۳۴۰
اموالِ زکوٰۃ کی فہرست میں اضافہ	۳۴۱
فصل پنجم: مصارفِ زکوٰۃ	۳۴۲
قرآنی فہرست	۳۴۲
۱-فقرا	۳۴۲
۲-مساکین	۳۴۲
۳-عاملین	۳۴۳
۴-مؤلفۃ القلوب	۳۴۳
۵-رقاب	۳۴۶
۶-غارمین	۳۴۶
۷-فی سبیل اللہ	۳۴۶
۸-ابن السبیل	۳۴۶
زکوٰۃ کا مستحق کون!	۳۴۷
زکوٰۃ کے لیے اجتماعی نظام کی ضرورت	۳۴۸
جنگی ضروریات کے لیے زکوٰۃ کا استعمال	۳۴۹
ایک وضاحت	۳۴۹
صاحبِ نصاب مستحقین	۳۴۹
بنی ہاشم کو زکوٰۃ دینا	۳۵۰
زکوٰۃ سے ادارے قائم کرنا	۳۵۰
زکوٰۃ سے وظائف مقرر کرنا	۳۵۰
زکوٰۃ اور رفاہِ عامہ	۳۵۰
زکوٰۃ سے قرضہ دینا	۳۵۰
ایک علاقے کی زکوٰۃ دوسرے علاقے میں منتقل کرنا	۳۵۱
ہنگامی دفاعی فنڈ میں زکوٰۃ دینا	۳۵۱
زکوٰۃ کی رقم سے کارخانے قائم کرنا	۳۵۱
فصل ششم: تحصیل و تقسیمِ زکوٰۃ	۳۵۲
تحصیلِ زکوٰۃ کا طریقِ کار	۳۵۲
زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا انتظام	۳۵۲
انفرادی ادائیگی	۳۵۳
تحصیلِ زکوٰۃ کا مہینہ	۳۵۳
غیر اسلامی حکومت کے ذریعے تحصیلِ زکوٰۃ	۳۵۴
زکوٰۃ سے بچنے کے حیلے	۳۵۴
زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک	۳۵۴
زکوٰۃ کی رقم قرض میں منہا کرنا	۳۵۸

حصہ سوم: روزہ

عنوان	صفحہ
فرضیتِ صوم	۳۶۱
روزوں کی فرضیت کا حکم	۳۶۱
فرضیت میں تدریج	۳۶۲
باب اوّل: اہمیت و فضیلت	۳۶۳
فصل اوّل: اہمیت اور فوائد	۳۶۵
روزے کی اہمیت	۳۶۵
ہر کام کا ایک مقصد	۳۶۶
ظاہر کو حقیقت سمجھنے کے نتائج	۳۶۷
فصل دوم: روزے کا اصل مقصد	۳۶۹
بندگیِ رب کی تربیت	۳۶۹
مقصدِ زندگی، بندگیِ رب	۳۶۹
عبادات کا مقصد	۳۶۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
روزہ، ایمان کی مضبوطی کی علامت	۳۷۰
ایک ماہ کی مسلسل ٹریننگ	۳۷۰
اطاعت کی طویل مشق	۳۷۱
تربیت کے لیے سازگار اجتماعی ماحول	۳۷۱
ہماری موجودہ حالت!	۳۷۲
تربیت کا انفرادی پہلو	۳۷۳
اجتماعی پہلو	۳۷۴
تقویٰ کی فضا	۳۷۵
جماعتی احساس	۳۷۶
امداد باہمی کی روح	۳۷۷
روزہ اور ضبطِ نفس	۳۷۸
فصل سوم: روزے اور رمضان کی فضیلت	۳۸۲
روزہ جسم کی زکوٰۃ ہے	۳۸۲
روزے کی غیر معمولی فضیلت	۳۸۲
روزے اور قرآن کی شفاعت	۳۸۳
روزہ دار کے لیے دو فرحتیں	۳۸۳
روزہ ڈھال ہے	۳۸۴
سرما کا روزہ، غنیمتِ باردہ	۳۸۴
گناہ سے بچنے کا ذریعہ	۳۸۵
نیکی کی حرص پیدا کرنا	۳۸۶
رمضان کی آمد پر پکارنے والے کی پکار	۳۸۶
رمضان، نیکیوں کا موسم بہار	۳۸۷
گذشتہ تمام گناہوں کی بخشش کا زمانہ	۳۸۸
جہنم کی آگ سے آزادی کا مہینہ	۳۸۹
رحمت، مغفرت اور نجات کا مہینہ	۳۹۰
رمضان اور دوسرے مہینوں میں یہ فرق کیوں؟	۳۹۱
رمضان میں حضورؐ کی شفقت اور فیاضی	۳۹۵
رمضان میں شیاطین کے جکڑے جانے کا مفہوم	۳۹۶
رمضان کی آخری رات کو امت کی مغفرت	۳۹۶
عید کی مبارک باد کے حقیقی مستحق لوگ	۳۹۷
باب دوم: روزے کے احکام	۳۹۹
فصل اوّل: رؤیتِ ہلال	۴۰۱
چاند دیکھنے کی اہمیت	۴۰۱
عبادات کے لیے قمری حساب کی مصلحت	۴۰۲
شمسی حساب کی قباحت	۴۰۲
سائنس کے ہیضے کے شکار لوگ	۴۰۳
ساری دنیا میں ایک دن عید!	۴۰۳
عیدوں کے مہینے ناقص نہیں ہوتے	۴۰۴
شعبان کا چاند دیکھنے کا اہتمام	۴۰۵
رؤیت ہلال میں شہادت کا نصاب	۴۰۵
تاریخ کا تعین چاند دیکھنے سے	۴۰۷
چاند کا گھٹنا بڑھنا اور اس میں پوشیدہ حکمت	۴۰۸
فصل دوم: سحری کا اہتمام	۴۰۹
سحری میں برکت ہے	۴۰۹
بہترین سحری، کھجور	۴۱۰
سحری کے وقت میں گنجائش	۴۱۰
روزے کی نیت کا وقت	۴۱۲
خوردونوش کی حدود	۴۱۲
عبادات کے لیے معیار اوقات	۴۱۳
فصل سوم: افطار کی اہمیت	۴۱۴
افطار کا صحیح وقت	۴۱۴
یہود کے ہاں روزہ کھولنے کا دستور	۴۱۵
اسلام برائی کو مقامِ آغاز سے روکتا ہے	۴۱۵
افطار میں جلدی کرنا	۴۱۶
جلدی کرنے کا مفہوم	۴۱۷
افطار کے لیے افضل چیزیں	۴۱۸
روزہ افطار کرانے والے کا اجر	۴۱۸
افطار کے وقت کی دعائیں	۴۱۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
فصل چہارم: روزے میں جائز اور ناجائز امور	۴۲۱
روزے کا قانون	۴۲۱
روزے میں جھوٹ بولنا	۴۲۱
بھول کر کھانا پینا	۴۲۲
پچھنے لگوانا	۴۲۲
بیویوں کے پاس جانا	۴۲۴
بیوی سے میل جول کے حدود	۴۲۶
حالت جنابت میں روزہ شروع کرنا	۴۲۷
قے آنا	۴۲۷
آنکھ میں سرمہ اور کان میں دوائی ڈالنا	۴۲۸
نہانا اور سر پر پانی ڈالنا	۴۲۸
بھڑ کے کاٹنے سے روزے کا حکم	۴۲۹
بیماری یا تکلیف میں روزہ توڑنا	۴۲۹
تھوک نگلنا اور مصطگی وغیرہ چبانا	۴۳۰
انجکشن لگوانا	۴۳۱
فصل پنجم: روزہ اور سفر	۴۳۳
مسافر کے لیے روزے کے احکام	۴۳۳
جہاد کے موقع پر روزہ توڑنے کا حکم	۴۳۵
عظیم الشان نعمت الٰہی کا شکریہ	۴۳۵
سفر میں روزہ، ایک دوسرے پر اعتراض	۴۳۶
مشکل سفر میں روزہ	۴۳۷
مسافر کا قبل از وقت روزہ کھولنا	۴۳۸
سفر میں روزہ رکھنا گناہ ہے!	۴۳۹
اصل پوزیشن	۴۴۰
تین افراد کے لیے روزہ چھوڑنے کی اجازت	۴۴۰
فصل ششم: روزے کی قضا اور فدیہ	۴۴۲
قضا روزے کب رکھے جائیں!	۴۴۲
شوہر کی اجازت کے بغیر روزے کی قضا	۴۴۲
حائضہ کے لیے روزوں کی قضا	۴۴۳
متوفی کے روزوں کی قضا	۴۴۳
متوفی کے قضا روزوں کا فدیہ	۴۴۴
تندرست آدمی کا روزے کے بجائے فدیہ دینا	۴۴۵
دوسرے کے بدلے میں روزہ رکھنا	۴۴۸
فصل ہفتم: روزے کا کفارہ	۴۵۰
رمضان کے ایک روزے کا بدل	۴۵۰
عبادات کی اصل روح	۴۵۰
روزے کا کفارہ	۴۵۱
فقہا کا اختلاف	۴۵۲
فصل ہشتم: نفلی روزے	۴۵۴
نفلی روزے کی فضیلت	۴۵۴
نفلی اعمال کی اصل روح	۴۵۵
نفلی عبادات میں اعتدال	۴۵۷
نفلی روزے کے متعلق آپؐ کی ہدایت	۴۵۸
مختلف روایات میں تطبیق	۴۵۸
شعبان کے روزے	۴۵۹
شعبان کے آخری دو دنوں کا مسئلہ	۴۶۰
محرم کے روزے	۴۶۱
روزۂ عاشورہ	۴۶۲
عاشورہ ایک دینی یادگار	۴۶۳
حضورؐ کے چار معمول	۴۶۳
عرفہ کے دن روزہ	۴۶۴
ذوالحجہ کا پہلا عشرہ	۴۶۴
پیر کے روزے کی فضیلت	۴۶۵
ہر ماہ تین نفلی روزے	۴۶۵
پیر اور جمعرات کے روزے	۴۶۶
ہفتے اور اتوار کا روزہ	۴۶۷
ایام بیض کے روزے	۴۶۸
مہینے کے پہلے تین دنوں کے روزے	۴۶۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
احادیث میں تطبیق	۴۶۹
جمعہ کے دن روزہ	۴۶۹
اللہ کی راہ میں روزہ	۴۷۰
نفلی روزے کی قضا	۴۷۱
نفلی روزہ قبل از وقت افطار کرنا	۴۷۲
فصل نہم: ممنوع روزے	۴۷۴
صومِ وصال	۴۷۴
صوم الدہر	۴۷۴
جمعہ کے دن کی تخصیص	۴۷۵
ہفتے کے دن روزہ	۴۷۸
عید کے دن روزہ	۴۷۹
ایامِ تشریق کا روزہ	۴۷۹
نصف شعبان کے بعد روزہ	۴۸۰
مشکوک دن کا روزہ	۴۸۱
باب سوم: متعلقاتِ روزہ و رمضان	۴۸۳
فصل اوّل: تراویح	۴۸۵
احکام تراویح کا خلاصہ	۴۸۵
حضورؐ کا طرزِ عمل	۴۸۵
باقاعدہ جماعت کا آغاز	۴۸۵
۳۶ رکعت پڑھنے کی توجیہ	۴۸۶
ہر محلے میں اس کا اہتمام	۴۸۶
تراویح کا افضل وقت	۴۸۶
تعداد رکعاتِ تراویح	۴۸۷
دس تراویح	۴۸۹
فصل دوم: اعتکاف	۴۹۰
حضورؐ کا معمول	۴۹۰
آخری سال کا اعتکاف	۴۹۰
ازواج مطہرات کا اعتکاف	۴۹۱
اعتکاف کا فقہی حکم	۴۹۱
معتکف میں کب داخل ہونا چاہیے	۴۹۲
حضورؐ کے معتکف کی کیفیت	۴۹۲
معتکف کے لیے احکام	۴۹۳
مباشرت سے پرہیز	۴۹۳
مریض کی عیادت کا طریقہ	۴۹۴
اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت	۴۹۴
فصل سوم: لیلۃ القدر	۴۹۶
ہزار مہینوں سے بہتر رات	۴۹۶
نزول قرآن کی رات	۴۹۶
وجہ تسمیہ	۴۹۷
تعیین میں اختلاف	۴۹۸
لیلۃ القدر ۲۷ ویں شب!	۴۹۹
لیلۃ القدر کی تلاش	۵۰۰
عدمِ تعیین کی حکمت	۵۰۱
پورے رمضان میں لیلۃ القدر کی تلاش	۵۰۲
کیا لیلۃ القدر ہر رمضان میں ہوتی ہے؟	۵۰۳
لیلۃ القدر کی دعا	۵۰۳
فصل چہارم: صدقۂ فطر	۵۰۴
صدقہ کا مفہوم	۵۰۴
صدقۂ فطر کا صحیح مصرف	۵۰۴
صدقۂ فطر کی مقدار	۵۰۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حصہ چہارم: حج

عنوان	صفحہ
باب اوّل: خانۂ کعبہ	۵۰۶
فصل اوّل: کعبے کی اہمیت	۵۰۷
تاریخی اہمیت	۵۰۷
مذہبی اہمیت	۵۰۷
معاشی و معاشرتی اہمیت	۵۰۸
فصل دوم: مرکزیت	۵۱۱
عالم اسلام کا دل	۵۱۱
وحدتِ ملت کا پرکیف نظارہ	۵۱۱
ایک مقصد، ایک مرکز پر اجتماع	۵۱۲
دنیا میں واحد مرکزِ امن	۵۱۳
حقیقی مساوات کا مرکز	۵۱۳
معاشی و تمدنی مرکز	۵۱۴
مرکزیت کی نشانیاں	۵۱۵
امن و امان	۵۱۵
جزیرۂ عرب کی لسانی وحدت	۵۱۶
بے آب و گیاہ صحرا میں عظیم شہر کی آبادی	۵۱۷
فصل سوم: بعض مخصوص احکام	۵۲۱
مشرکین کا داخلہ	۵۲۱
پاک رکھنے کا مطلب	۵۲۱
ان احکام کی خلاف ورزی پر سزا	۵۲۲
غلاف کعبہ کی شرعی حیثیت	۵۲۳
شبہات	۵۲۶
اسراف بے جا کا شبہہ	۵۲۶
شرک کا شبہہ	۵۲۶
غلافِ کعبہ کی تاریخ	۵۲۸
فتح مکہ سے پہلے	۵۲۸
فتح مکہ کے بعد	۵۲۹
اراضی مکہ کی خرید و فروخت اور کرایہ	۵۳۲
باب دوم: حج	۵۳۵
فصل اوّل: فرضیت	۵۳۷
فرضیتِ حج کی تاریخ	۵۳۷
زندگی میں ایک ہی حج فرض ہے	۵۳۸
جاہلی رسومات کا خاتمہ	۵۳۸
نئی اصلاحات	۵۴۱
فصل دوم: حکمت اور روح	۵۴۳
مناسک حج اور ان کی اصل روح	۵۴۳
مناسکِ حج اور دُعائیں	۵۴۵
احرام	۵۴۶
تلبیہ	۵۴۸
حرم کی حاضری	۵۴۹
طوافِ زیارت	۵۵۰
مقامِ ابراہیمؑ میں نفل	۵۵۲
سعی صفا و مروہ	۵۵۲
وقوفِ منیٰ، عرفات اور مزدلفہ	۵۵۴
رمی جمار	۵۵۴
تحلیل	۵۵۵
فصل سوم: اہمیت اور فوائد	۵۵۶
فریضۂ حج کی اہمیت	۵۵۷
بندگی کی مختلف شکلوں کا مجموعہ	۵۵۸
جانی قربانی	۵۵۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
آستانہ بوسی	۵۵۹
جہاد	۵۵۹
سفرِ حج کی نوعیت	۵۶۰
نیکی اور تقویٰ کی رغبت	۵۶۰
پرہیزگاری اور تقویٰ کی افزائش	۵۶۱
بے عیب حج	۵۶۱
حج کے اثرات	۵۶۲
حج کے لیے اذنِ عام اور اس کے تمدنی فوائد	۵۶۳
مَنَافِعَ کا مفہوم	۵۶۳
حج ایک اجتماعی عبادت	۵۶۴
بین الاقوامی اجتماع	۵۶۴
عالمِ اسلام میں حرکت و بیداری	۵۶۵
عالم گیر برادری کا قیام	۵۶۶
عالم گیر مساوات	۵۶۶
ہماری قدر ناشناسی	۵۶۷
حج کے پورے فوائد سے محرومی کی وجہ	۵۶۹
فصل چہارم: احکام	۵۷۱
سفرِ حج کے لیے زادِ راہ	۵۷۲
شہوانی فعل، بدعملی اور لڑائی جھگڑے	۵۷۳
سفرِ حج کے دوران میں کسبِ معاش	۵۷۳
احرام کی حالت میں حرام چیزیں	۵۷۳
حالتِ مرض میں سر منڈانے کا فدیہ	۵۷۴
حالتِ احرام میں شکار	۵۷۴
شکار کا کفارہ	۵۷۴
طوافِ افاضہ	۵۷۵
سعی بین الصفا والمروہ	۵۷۵
سب کو عرفات سے پلٹنے کا حکم	۵۷۶
ایامِ تشریق میں منیٰ سے مکہ واپسی	۵۷۷
وادیِ مُحسّر سے گزرنا	۵۷۷
سفرِ حج میں اللہ کا ذکر	۵۷۷
منیٰ میں ذکر اللہ	۵۷۷
حجامت وغیرہ کا حکم	۵۷۸
سر منڈوانا افضل ہے	۵۷۸
حجِ تمتع	۵۷۹
احصار کی صورت میں قربانی	۵۷۹
حجۃ الوداع اور اعلانِ براءت	۵۸۰
حجِ اکبر	۵۸۰
حجِ بدل	۵۸۰
ناجائز دولت سے حج کرنا	۵۸۱
عورت کا محرم کے بغیر سفرِ حج	۵۸۲
باب سوم: قربانی	۵۸۳
فصل اوّل: تاریخی پسِ منظر	۵۸۵
تاریخی دن کا انتخاب	۵۸۸
فصل دوم: اہمیت	۵۸۹
قربانی کی مصلحتیں	۵۸۹
قربانی کی حکمت	۵۹۰
قربانی کا حکم، قرآن میں	۵۹۱
قربانی کا حکم حدیث میں	۵۹۲
فقہائے اُمت کی آرا	۵۹۴
اُمت کا متواتر عمل	۵۹۵
فصل سوم: احکام	۵۹۶
قربانی کی قسمیں	۵۹۶
۱-مناسکِ حج کے طور پر	۵۹۶
۲-دمِ تمتع و قران وغیرہ	۵۹۷
۳-عمومی قربانی	۵۹۸
قربانی کا وجوب	۵۹۹
قربانی کے جانور	۶۰۱
جانوروں کی تسخیر کا مقصد	۶۰۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
ہدی کے جانوروں سے استفادے کی مدت	۶۰۱
اونٹ ذبح کرنے کا مسنون طریقہ	۶۰۲
ذبح کے وقت تسمیہ کی مختلف صورتیں	۶۰۳
قربانی کے گوشت کا حکم	۶۰۴
قربانی کے گوشت کا مستحق کون!	۶۰۵
ہندوستان میں گائے کی قربانی کا مسئلہ	۶۰۵
جبری امتناع کی صورت میں مباحات کا وجوب	۶۰۶
فصل چہارم: اعتراضات وشبہات	۶۰۸
معاشی اعتراض	۶۰۸
منکرین حدیث کے حملے کا جواب	۶۱۰
منکرین حدیث کی ہٹ دھرمی پر تبصرہ	۶۱۱
فصل پنجم: عیدِ قربان	۶۱۳
سماجی زندگی اور تہوار	۶۱۳
ہر تہوار تاریخی واقعے کی یادگار	۶۱۳
تہوار منانے کے مختلف طریقے	۶۱۳
عید اور بقر عید کے دو تہوار	۶۱۵
عید منانے کا طریقہ	۶۱۵
فصل ششم: متفرق مباحث	۶۱۹
فلمِ خانۂ خدا کی شرعی حیثیت	۶۱۹
شعائر اللہ	۶۲۰
شعائر کے معنی	۶۲۰
شعائر اللہ سے مراد	۶۲۱
حالتِ جنگ اور احترام شعائر اللہ	۶۲۱
چند شعائر	۶۲۲
حرام مہینوں میں لڑائی کرنا	۶۲۲
ماہ حرام کی حرمت کا خیال	۶۲۳
شعائر اللہ اور اشہرِ حرم	۶۲۴
کتابیات	۶۲۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عرضِ ناشر

ہم اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتے ہیں کہ مفسر قرآن سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں سے مرتب کردہ مجموعہ احادیث بعنوان تفہیم الاحادیث ہمارے ادارے نے آٹھ جلدوں میں شائع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے شائقین علم اور محبانِ علوم اسلامی کے حلقوں میں جو مقبولیت بخشی وہ باعثِ تشکر و امتنان ہے۔ اس عظیم علمی کام کے بعد ہمارا دوسرا علمی منصوبہ مولانا مرحوم و مغفور ہی کی تحریروں سے احکام القرآن مرتب کرنے کا تھا۔ اللہ نے اس دقیق کام میں بھی ہمیں اپنے خصوصی فضل سے سرخرو کیا ہے اور جلد اوّل کے بعد اب ہم تفہیم احکام القرآن کی جلد دوم ہدیہ قارئین کر رہے ہیں۔ کئی جلدوں پر مشتمل اس عظیم کام میں کافی وقت اور وسائل صرف ہوئے ہیں۔ الحمدللہ جس مقصد کے لیے مادی و افرادی وسائل استعمال کیے گئے اس کے حصول میں کامیابی حاصل ہوئی۔ یارب لک الحمد ولک الشکر۔

تفہیم احکام القرآن کی پہلی جلد اگست ۲۰۰۶ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے۔ الحمدللہ اب جلد دوم طباعت کے مرحلوں سے گزر کر شائقینِ علومِ قرآن تک پہنچنے والی ہے۔ ہم نے جلد اوّل کے آغاز میں عرضِ ناشر کے تحت عرض کیا تھا کہ تفہیم احکام القرآن کی ترتیب میں ہمارے ادارے کا انداز اس لحاظ سے منفرد ہے کہ ہم نے اس علمی کتاب کو عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے۔ یعنی ترتیب قرآنی کے لحاظ سے مسلسل احکام القرآن کو مدون کرنے کے پرانے انداز میں تبدیلی کی گئی ہے۔ الحمدللہ یہ عام قارئین ہی کے لیے نہیں، اہلِ علم و نظر اور محققین و مصنفین کے لیے بھی مفید اور مطالعہ، استفادہ اور حوالہ جات کی تلاش کے لیے زیادہ آسان ثابت ہوا ہے۔

جلد اوّل میں پانچ ابواب تھے یعنی علوم القرآن، دعوت بالقرآن، قرآن کے دو بنیادی احکام، ایمانیات اور اسلامی اخلاقیات۔ گویا یہ سبھی موضوعات عمومی طور پر عقاید اور افکار و نظریات سے متعلق تھے۔ تفہیم احکام القرآن کی جلد دوم کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جو سبھی عبادات سے متعلق ہیں۔ حصہ اوّل میں نماز ہے جو آگے پھر پہلی جلد کی طرح ابواب میں تقسیم ہے۔ اس میں چار ابواب آئے ہیں۔ ہر باب کی آگے کئی فصلیں ہیں۔ حصہ دوم کا موضوع زکوٰۃ ہے، جس میں ایک ہی باب ہے جو چھ ذیلی فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ سوم روزے کے احکام پر مشتمل ہے، جس کے تین ابواب ہیں۔ حصہ چہارم کا موضوع حج ہے۔ اس کو بھی تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں کتاب کے مرتب اور ہمارے ادارے کے سینیر محقق جناب عبدالوکیل علوی صاحب نے عرض مرتب کے زیرعنوان ان چاروں عبادات کا بنیادی تعارف قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے اصل احکام کا موضوع شروع کرنے سے قبل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی مختلف تحریروں سے انتخاب کر کے احکام القرآن کے متعلق

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک مقدمہ مرتب کیا ہے، جس سے کتاب کی افادیت بلاشبہ بہت بڑھ گئی ہے۔ مولانا عبدالوکیل علوی صاحب کی یہ محنت کئی سالوں پر محیط ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تمام تحریروں سے احکام القرآن کے ضمن میں استنباط وتدوین کا یہ عظیم کارنامہ انھوں نے اپنی طویل محنت، علمی قابلیت اور تحقیقی صلاحیت کی بدولت بطریقِ احسن مکمل کیا ہے۔ مفسرِ قرآن سیّد مودودیؒ کی روح ان شاءاللہ اس کام سے خوش ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فاضل مرتب کو اس کا بہترین اجر عطا فرمائے۔

کتاب کی باقی دو جلدیں بھی تیار ہیں اور ان شاءاللہ بہت جلد وہ بھی طبع ہو کر مارکیٹ میں آجائیں گی۔ اس عظیم کام میں مولانا علوی صاحب کی معاونت کا فریضہ مولانا گل زادہ شیر پاؤ صاحب نے ادا کیا ہے۔ متن خوانی بھی خود علوی صاحب اور گل زادہ صاحب نے کی ہے اور کمپوزنگ ادارے کے دیگر ساتھیوں نے کی ہے۔ ناظم ادارہ محمد انور گوندل صاحب کی شب وروز کی مساعی اور لگن نے اس سلسلۃ الذہب کو طباعت کے مرحلوں سے گزار کر منصۂ شہود پر لانے میں قابلِ قدر کردار ادا کیا ہے۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر دے۔ مفسرِ قرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے رشحاتِ قلم امت کا بہت بڑا سرمایہ ہیں اور انھیں مرتب صورت میں عنوانات کے تحت لوگوں تک پہنچانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ الحمدللہ ہمارا ادارہ اس کام میں حسبِ توفیق اپنی حقیر کاوشیں جاری رکھے ہوئے ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ پیش کش پہلے کی طرح اہلِ علم اور عام قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔

اہل علم ونظر سے درخواست ہے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے جہاں بھی کچھ علمی ملاحظات وتحفظات محسوس کریں، بلاتوقف ہم تک پہنچائیں۔ ہم ان کے شکرگزار ہوں گے۔

خاکسار

حافظ محمد ادریس

ڈائریکٹر، ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور

۱۲؍رمضان المبارک ۱۴۲۸ھ

بمطابق ۲۵؍ستمبر ۲۰۰۷ء

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عرض مرتب

اسلامی عبادات

نماز

عبادات میں نماز اسلام کا ایک نہایت اہم اور بنیادی رکن ہے۔ انبیاے سابقین خود بھی نماز پوری پابندی سے پڑھتے تھے اور اپنی امت کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔ قرآن مجید میں ان میں سے بہت سے انبیاے کرام کی نماز کا ذکر، اس وضاحت اور صراحت کے بغیر کہ ان کی نماز کی صورت کیا تھی اور اس کے ادا کرنے کا انداز اور طریقہ کیا تھا، موجود ہے۔ مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں مذکور ہے: فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ (آل عمران ٣: ٣٩) پھر فرشتوں نے (زکریاؑ) کو پکارا جبکہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔

حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (یونس ١٠: ٨٧) ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی (ہارونؑ) کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں مکان بناؤ اور اپنے مکانوں کو قبلہ ٹھہرالو اور (ان میں) نماز قائم کرو اور مومنین کو (کامرانی و کامیابی) کی خوشخبری دو۔

حضرت شعیبؑ کی نماز کا ذکر درج ذیل الفاظ میں بیان ہوا ہے: قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ (ہود ١١: ٨٧) لوگوں نے کہا: اے شعیبؑ! کیا تمھاری نماز تمھیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں، جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے رہے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے باقاعدہ نماز قائم کرنے کی دعا کی کہ وہ انھیں اس پر قائم رکھے: رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ (ابراہیم ١٤: ٤٠) پروردگار! مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا۔ اے پروردگار! میری یہ دعا قبول فرما۔

حضرت اسماعیلؑ اپنے اہل و عیال کو نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیتے تھے: وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝ (مریم ١٩: ٥٥) وہ (اسماعیلؑ) اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور وہ اپنے پروردگار کے حضور پسندیدہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور لوط علیہم السلام کا ذکر کر کے فرمایا کہ ہم نے ان سب کو نماز قائم کرنے کا حکم دیا تھا: وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ (الانبیاء ٢١: ٧٣) ہم نے انھیں (انسانوں کا) پیشوا بنایا، وہ ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے۔ ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ ہر طرح کی بھلائی کے کام انجام دیں۔ نیز نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ وہ ہماری بندگی میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لگے رہتے تھے۔

حضرت لقمان نے بھی اپنے بیٹے کو نماز قائم کرنے کی تاکید کی: یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ (لقمان ۳۱:۱۷) بیٹا! نماز قائم کرو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اقامتِ نماز کا حکم تھا اس کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں: وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا۝ (مریم ۱۹:۳۱) اللہ تعالیٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا زندگی بھر کے لیے حکم دیا ہے۔

حضرت آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ اور ادریسؑ وغیرہ تمام انبیا کے زمانے میں نماز پڑھی جاتی تھی مگر بعد کے لوگوں نے اسے چھوڑ دیا اور برائیوں کے مرتکب ہوگئے۔ اسی سلسلے میں ارشاد ربانی ہے: فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۝ (مریم ۱۹:۵۹) ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے، جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ سو عنقریب وہ گمراہی کی سزا سے دوچار ہوں گے۔

بنی اسرائیل کو بھی نماز کا حکم تھا۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر کیا گیا ہے مگر وہ اس پر قائم نہ رہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّكٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝ (البقرہ ۲:۸۳) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا، رشتہ داروں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا۔ لیکن تھوڑے سے لوگوں کے سوا تم اس عہد سے پھر گئے اور اب تک منہ پھیرے ہوئے ہو۔

قصہ مختصر تمام انبیاؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نماز قائم رکھنے کا حکم تھا۔ پھر یہی حکم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دیا گیا۔

قرآن مجید نے نماز کے بنیادی اور اصولی گوشوں کی صراحت اور وضاحت کی ہے۔ اس کے ضروری احکام اور شرائط کا ذکر بھی کیا ہے۔ جو لوگ تارک نماز ہیں یا ریاکاری کی نماز پڑھتے ہیں اس میں کاہلی، تساہل اور سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں یا منافقت سے کام لیتے ہیں، ان کی قرآن مجید میں شدید مذمت کی گئی ہے اور جو دلچسپی و دلجمعی، پورے انہماک و توجہ اور پورے خشوع و خضوع اور توجہ الی اللہ کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، ان کی تعریف و توصیف کی گئی ہے اور انھی کو فلاح کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

زکوٰۃ

اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنا بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز کا قائم کرنا فرض ہے۔ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر مقامات پر نماز اور زکوٰۃ کا اکٹھے ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دونوں ارکان کا ادا کرنا اور ان پر عمل پیرا ہونا نہایت ضروری ہے۔ جس طرح ادائیگی نماز سابقہ تمام انبیائے کرام پر فرض اور لازم تھی اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنا بھی فرض تھی۔ دنیا بھر کے مذاہب اپنے پیروؤں کو تلقین کرتے ہیں کہ محتاجوں، مسکینوں، بے سہارا لوگوں کی مالی مدد کی جائے تاکہ ان کی معاشی حالت بہتر ہو سکے۔ مگر اس کا تعین کسی مذہب میں نہیں کیا گیا کہ کتنی رقم میں سے کتنی رقم اس مد میں مخصوص کی جائے۔ یہ امتیاز اور خصوصیت صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے صاف اور واضح طور پر متعین کر دیا کہ اتنی رقم میں سے اتنی رقم اس مد میں دینی ضروری اور لازمی ہے۔ اتنا غلہ اگر ہو تو اس میں سے اتنا غلہ دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں یہ صراحت و وضاحت بھی کر دی کہ سالانہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آمدنی کا باقاعدہ حساب رکھا جائے اور ہر سال اس میں سے احکام شریعت کے مطابق متعین مقدار ادا کی جائے۔

اسلام میں نماز اور زکوٰۃ دونوں کا ایک ساتھ ذکر واضح کرتا ہے کہ یہ دونوں اسلامی زندگی کی نمایاں ترین اور اولین علامات ہیں۔ اگر کوئی انسان انفرادی طور پر اور کوئی جماعت بحیثیت جماعت دانستہ طور پر ان اعمال کو یکسر ترک کر کے اس کی فرضیت سے انکار کر دے تو اسے مسلمانوں میں شمار نہیں کیا جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف قتال کیا گیا۔ زکوٰۃ کوئی ٹیکس نہیں یہ تو نماز کی طرح عبادت ہے۔ نماز بدنی عبادت ہے تو زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ اس کی اس حیثیت سے انکار دائرہ اسلام سے خروج کے مترادف ہے۔

اس عبادت کی فرضیت کا مقصد یہ ہے کہ دولت چند مخصوص لوگوں میں مرکوز ہو کر نہ رہ جائے۔ اسلام اسے پسند نہیں کرتا کہ کچھ لوگ تو کثرتِ دولت کی بنا پر نہ صرف مزے اڑائیں بلکہ اسراف وتبذیر کے ذریعے معاشرے کو مسموم کرتے رہیں اور کچھ غریب لوگ نان جویں کو ترسیں۔ اسلام چاہتا ہے کہ سرمایہ ایک جگہ منجمد ہو کر رہ جانے کے بجائے گردش میں رہے اور نظام زکوٰۃ کے ذریعے سے سرمایہ جاری وساری رہے۔

قرآنِ مجید مصارفِ زکوٰۃ کو آٹھ مدات میں تقسیم کرتا ہے۔ ضرورت مند کی ضرورت کے مطابق اسے حصہ دیا جاسکتا ہے، کسی کو کم اور کسی کو زیادہ دیا جاسکتا ہے، ناگہانی مصیبت کا شکار مالدار آدمی بھی وقتی طور پر مدِ زکوٰۃ سے حصہ لے سکتا ہے۔ اگر کسی کا چالو کاروبار بعض وجوہ کی بنا پر ختم ہو جائے تو وہ باوجود اپنی سابقہ معاشرتی حیثیت کے زکوٰۃ لینے کا حق دار ہے۔ اسے بھی وقتی طور پر مستحقینِ زکوٰۃ کے زمرے میں شامل کر کے اس کی زکوٰۃ کی مد سے مدد کی جانی چاہیے۔

روزہ

نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزہ بھی اسلام کے ارکان خمسہ میں سے ایک رکن ہے۔ قرآنِ مجید میں اس کی فرضیت اور اہمیت کو بایں الفاظ ذکر کیا ہے: يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿﴾ (البقرہ ۲: ۱۸۳) اے لوگو روزہ تم پر اس طرح فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلی امتوں کے لوگوں پر کیا گیا تھا۔ اس کی فرضیت سے مقصود ومطلوب لوگوں کے قلوب میں صفت تقویٰ پیدا کرنا ہے۔

تقویٰ کیا ہے؟ تقویٰ ظاہر ہے محض بھوکا پیاسا رہنے کا نام نہیں ہے اور نہ جسم کے فطری تقاضوں سے کنارہ کش رہنے کا نام تقویٰ ہے۔ صرف کھانا پینا چھوڑنے اور جسم کو مشقت میں ڈالنے سے تقویٰ تو پیدا نہیں ہوتا اور نہ اس طرح انسان تقویٰ کی معراج تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ایک انسان مہینہ بھر کھانا پینا ترک کیے رکھے مگر اس کے باوجود اس کے خبثِ باطن کی ذرہ برابر بھی اصلاح نہ ہو۔

روزے میں، نکتے کی اصل بات ہے مرغوباتِ نفس کو صرف اس غرض کے لیے چھوڑنا کہ ایسا کرنا اللہ کے حکم پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہے، حکم الٰہی کی اطاعت اور اس کی خوشنودی اور رضا جوئی کے حصول کے لیے ہے۔ یہ ساری مشقتیں اور تکلیفیں اس لیے انگیز کرنا کہ اس عمل سے میرا رب راضی ہو جائے، بس یہ ہے وہ تقویٰ جو رمضان کے روزوں سے مقصود ہے۔ اس دوران میں اگر اللہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری کا جذبہ اس سطح تک ابھر آتا ہے کہ روزے دار بھوک، پیاس اور اپنی جنسی خواہشات تک کے لیے قرآن وسنت سے رہنمائی حاصل کرنے لگتا ہے تو اس سے بڑھ کر طہارتِ قلب اور پاکیزگیِ رُوح اور کیا ہوسکتی ہے۔ گویا مختصر طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ اصل تقویٰ اطاعتِ الٰہی نفسِ انسانی کی اصلاح وتہذیب اور نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھنا ہے۔

روزے کی فرضیت اور اس کے بارے میں ضروری اور اصولی احکام درج ذیل ہیں:

جہاں تک روزے کی فرضیت کا معاملہ ہے وہ تو ظاہر ہے۔ اس کی فرضیت سورۂ بقرہ کی آیات ۱۸۳-۱۸۵ میں مذکور ہے یعنی يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ سے لے کر وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ تک۔

ان آیتوں میں روزے کے بڑے مقصد تین بیان ہوئے ہیں:

(۱) تقویٰ، (۲) اللہ عزوجل کی کبریائی وعظمت بیان کرنا، (۳) اُس کا اِس احسان عظیم پر شکر ادا کرنا۔

روزے کی سب حکمتیں اور فضائل اسی کے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں احادیث نبوی میں بہت سارا مواد دستیاب ہے۔ روزے دار کا اس مہینے میں رزق کشادہ کردیا جاتا ہے۔ افطار کرانے والے کے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔ اس مہینے کا پہلا عشرہ رحمت اور دوسرا عشرہ مغفرت اور تیسرا عشرہ عتق من النار ہے۔ ایک طرف روزے کے فضائل اور برکتیں بے شمار ہیں تو دوسری طرف تارکِ روزہ کے لیے وعید بھی بڑی سخت ہے۔ جو شخص عذرِ شرعی کے بغیر دیدہ دانستہ ایک دن روزہ نہ رکھے تو اس کے بدلے اگر تمام عمر روزے رکھے تو بھی کافی نہ ہوگا۔ (ترمذی)

اسلام میں روزے کے ساتھ فدیے اور کفارے کے جو احکام دیے گئے ہیں ان سے مقصود دراصل غریبوں اور حاجت مندوں کی معاشی کفالت کا بندوبست ہے۔ یہ غریبوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی وبھلائی کرنے کا ایک ذریعہ ہے اسی لیے اسے مؤاسات، ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔

طبی مشاہدات اس پر شاہد ہیں کہ بھوک صحت کے لیے مفید ہے۔ بعض امراض کا شافی علاج بھی ہے۔ اگر انسانی معدے کو کچھ وقت کے لیے خالی رکھا جائے تو اس کی کارکردگی بہتر ہوجاتی ہے، جس طرح زمین کو ایک عرصہ بغیر کاشت رکھنے سے وہ زیادہ زرخیز اور کارآمد ہوجاتی ہے تو اسی طرح قوائے انہضام کو مہینہ بھر آرام دینے سے وہ زیادہ مضبوط ہوکر روحانی یکسوئی اور صفائی کے لیے اکسیر کا کام دیتے ہیں۔ اس طرح روزہ درحقیقت ایک روحانی تربیت ہے۔

اسلام نے تکمیلی کارنامہ اس طرح انجام دیا ہے کہ اس نے روزے کو ایک نیا مفہوم عطا کیا ہے افراط وتفریط سے اسے یکسر پاک وصاف کردیا ہے اور اسے اعلیٰ درجے کی روحانی، اخلاقی اور جسمانی تربیت کا ذریعہ بنا کر اجتماعی اور معاشرتی اہمیتوں کا حامل قرار دیا ہے۔

رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کا حکم دیا گیا ہے۔ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ایک بابرکت رات لیلۃ القدر ہے جس میں عبادت ہزار مہینوں کے ثواب سے بڑھ کر ہے۔ یہ رات اکثریت کی رائے کے مطابق ستائیس رمضان کی رات ہے۔ پورے رمضان میں قیام اللیل یعنی نماز تراویح کی بڑی فضیلت ہے، باجماعت قرآن مجید کی سماعت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حج

ارکانِ ثلاثہ، نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی طرح حج بھی اسلام کا ایک اساسی رکن ہے۔ حج ایسے لوگوں پر فرض کیا گیا ہے جو سفری خرچ رکھنے کے ساتھ ان سارے تقاضوں کو پورا کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں جو حج کی فرضیت کے لیے شریعت نے مقرر کیے ہیں: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا (آل عمران ۳:۹۷) اللہ کا لوگوں پر یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔

حج کے لیے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا تھا۔ پھر ان ہی کو تعمیر بیت اللہ کی ذمہ داری سونپی اور حکم دیا کہ لوگوں میں فرضیتِ حج کا اعلان کر دیں اور اسے ہر قسم کی گندگی سے پاک رکھنے کی تاکید فرمائی۔ قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے: وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۝ (الحج ۲۲:۲۶-۲۷) اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے بیت اللہ کی جگہ تجویز کی تھی اور (حکم دیا کہ) میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اور میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دو کہ وہ تمھارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹنیوں پر سوار آئیں۔

قرآن مجید کے بیان کی رو سے دنیا کا پہلا مرکزِ عبادت مکہ مکرمہ میں تعمیر کیا گیا جسے اللہ کی ہدایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اپنے لختِ جگر حضرت اسماعیلؑ کے تعاون سے تعمیر کیا۔ اب دنیا کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اگر مالی استطاعت اور جسمانی صحت و طاقت رکھتا ہے تو عمر بھر میں ایک مرتبہ سعادتِ حج سے سرفراز اور بہرہ مند ہو اور جو استطاعت کے باوجود اس سے بے نیازی کا مظاہرہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے: إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ۝ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ۗ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝ (آل عمران ۳:۹۶-۹۷) بلاشبہ پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لیے مقرر کیا گیا، وہی ہے جو مکہ مکرمہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام انسانوں کے لیے سرچشمہ ہدایت اس میں کھلی نشانیاں ہیں۔ ان میں ایک، مقامِ ابراہیم ہے جو شخص اس بابرکت گھر میں داخل ہوا وہ امن و حفاظت میں آ گیا۔ لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس گھر کا حج کرے۔ اور جو کوئی اس سے انکار کرے تو ذہن نشین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

دورانِ حج چند آداب کا ملحوظ رکھنا بڑا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ۝ (البقرہ ۲:۱۹۷) حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ بس جس نے ان مہینوں میں حج کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا تو وہ ایامِ حج میں شہوانی فعل، بدعملی اور لڑائی جھگڑے نہ کرے۔ جو بھلائی کا کام تم کرو گے اللہ اُسے جانتا ہے۔ سفرِ حج کے لیے زادِ راہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اپنے ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے۔ پس اے ہوش مندو! میری نافرمانی سے بچو۔

حج اور عمرے کے لیے احرام باندھ لینے کے بعد شکار کرنا جائز نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد باری ہے:

أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۗ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ ○ (المائدہ ۵:۱) تمھارے لیے مویشی جانور حلال قرار دیے گئے ہیں بجز ان کے جن کے بارے میں تمھیں دوسری جگہ بتایا جائے گا۔ لیکن احرام کی حالت میں تمھارے لیے شکار کرنا حلال نہیں۔ بے شک اللہ جیسا کچھ چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَن قَتَلَهُ مِنكُم مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ أَوْ عَدْلُ ذَٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ ۗ عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ ۚ وَمَنْ عَادَ فَيَنتَقِمُ اللَّهُ مِنْهُ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ○ (المائدہ ۵:۹۵) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! احرام کی حالت میں شکار نہ مارو، اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے گا تو جو جانور اس نے مارا ہو اُسی کے ہم پلہ ایک جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ نذرانہ کعبے تک پہنچایا جائے گا، یا نہیں تو اس گناہ کے کفارے میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا، یا اس کے بعد روزے رکھنے ہوں گے تا کہ وہ اپنے کیے کا مزہ چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا اُسے اللہ نے معاف کر دیا، لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا تو اس سے اللہ بدلہ لے گا۔ اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ محرم پر جنگل یعنی خشکی کا جانور شکار کرنا حرام ہے۔ سمندری اور دریائی شکار حلال ہے۔ قرآن مجید میں اس سلسلے میں ارشاد باری ہے: أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ○ (المائدہ ۵:۹۶) تمھارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا تا کہ تمھیں خود بھی اس سے فائدہ پہنچے اور قافلے کے لیے زادِ راہ بھی بنا سکتے ہو۔ البتہ خشکی کا شکار، جب تک تم احرام کی حالت میں ہو، تم پر حرام کیا گیا ہے۔ پس بچو اُس خدا کی نافرمانی سے جس کی پیشی میں تم سب کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا۔

عبدالوکیل علوی
ایم - اے (عربی، اسلامیات، تاریخِ اسلام)
ایم - او - ایل، فاضل عربی، فاضل علومِ اسلامیہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مقدمہ (از ملفوظات سید ابوالاعلیٰ مودودی)

عبادت کے لغوی معنی

عربی زبان میں عبودۃ، عبودیۃ اور عبدیۃ کے اصل معنی خضوع اور تذلّل کے ہیں۔ یعنی تابع ہو جانا، رام ہو جانا، کسی کے سامنے اس طرح سپر ڈال دینا کہ اس کے مقابلے میں کوئی مزاحمت یا انحراف و سرتابی نہ ہو، اور وہ اپنے منشا کے مطابق جس طرح چاہے خدمت لے۔ اسی اعتبار سے اہل عرب اس اونٹ کو بَعِیرٌ مُعَبَّدٌ کہتے ہیں جو سواری کے لیے پوری طرح رام ہو چکا ہو، اور اس راستے کو طریق مُعَبَّد، جو کثرت سے پامال ہو کر ہموار ہو گیا ہو۔ پھر اسی اصل سے اس مادے میں غلامی، اطاعت، پوجا، ملازمت[1] اور قید یا رکاوٹ کے مفہومات پیدا ہو گئے ہیں......

اس تشریح سے[2] یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مادہ عبد کا اساسی مفہوم کسی کی بالادستی و برتری تسلیم کر کے اس کے مقابلے میں اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جانا، سرتابی و مزاحمت چھوڑ دینا اور اس کے لیے رام ہو جانا ہے۔ یہی حقیقت بندگی و غلامی کی ہے۔ لہٰذا اس لفظ سے اولین تصور، جو ایک عرب کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، وہ بندگی اور غلامی ہی کا تصور ہے، پھر چونکہ غلام کا اصلی کام اپنے آقا کی اطاعت و فرماں برداری ہے، اس لیے لازماً اس کے ساتھ ہی اطاعت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اور جبکہ ایک غلام اپنے آقا کی بندگی و اطاعت میں محض اپنے آپ کو سپرد ہی نہ کر چکا ہو بلکہ اعتقاداً اس کی برتری کا قائل اور اس کی بزرگی کا معترف بھی ہو، اور اس کی مہربانیوں پر شکر و احسان مندی کے جذبے سے بھی سرشار ہو، تو وہ اس کی تعظیم و تکریم میں مبالغہ کرتا ہے، مختلف طریقوں سے اعتراف نعمت کا اظہار کرتا ہے اور طرح طرح سے مراسم بندگی بجالاتا ہے۔ اسی کا نام پرستش ہے اور یہ تصور عبدیت کے مفہوم میں صرف اس وقت شامل ہوتا ہے جبکہ غلام کا محض سر ہی آقا کے سامنے جھکا ہوا نہ ہو بلکہ اس کا دل بھی جھکا ہوا ہو۔ رہے باقی دو تصورات تو وہ دراصل عبدیت کے ضمنی تصورات ہیں اصلی اور بنیادی نہیں ہیں۔

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، فروری ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۵-۱۱۸)

عبادت: اصل مقصد و حقیقت

قرآن کی رو سے عبادت وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (الذاریات ۵۱:۵۶) میں نے نہیں پیدا کیا جن و انس کو مگر اس لیے کہ وہ

۱- لازم پکڑنا، وابستہ ہونا اور تابع بن کر رہ جانا۔ (مرتب)

۲- تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: لسان العرب، مادہ: ع، ب، د۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میری عبادت کریں۔

انبیا علیہم السلام جس غرض کے لیے دنیا میں بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انسان کو خدا کی عبادت کی طرف دعوت دیں:

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶) یہ کہ بندگی کرو اللہ کی اور دور رہو طاغوت سے۔

پس ہمارے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ عبادت سے مراد کیا ہے اور اسلام میں جو عبادات ہم پر فرض کی گئی ہیں ان کی اصلی روح کیا ہے۔ اگر ان امور کو ہم نہ جانیں گے تو اس مقصد ہی کو پورا کرنے سے قاصر رہ جائیں گے، جس کے لیے ہم کو پیدا کیا گیا ہے۔

عبادت کا جاہلی تصوّر

اسلام میں عبادات کا مفہوم محض پوجا کا نہیں ہے بلکہ بندگی (prayer) کا بھی ہے۔ عبادت کو محض پوجا کے معنی میں لینا دراصل جاہلیت کا تصور ہے۔ جاہل لوگ اپنے معبودوں کو انسانوں پر قیاس کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بڑے آدمی، سردار یا بادشاہ، خوشامد سے خوش ہوتے ہیں، نذرانے پیش کرنے سے مہربان ہو جاتے ہیں، ذلت اور عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑنے سے پسیج جاتے ہیں اور اُن سے یونہی کام نکالا جا سکتا ہے، اُسی طرح ان کا معبود بھی انسان سے خوشامد، نذر و نیاز اور اظہارِ عاجزی کا طالب ہے۔ انھی تدبیروں سے اس کو اپنے حال پر مہربان کیا جا سکتا ہے اور اس کو خوش کر کے کام نکالا جا سکتا ہے۔ اس تصور کی بنا پر جاہلی مذاہب چند مخصوص اوقات میں مخصوص مراسم ادا کرنے کو عبادت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

عبادت کا جوگیانہ تصوّر

اسی طرح اسلام میں عبادت کا یہ بھی تصور نہیں ہے کہ آدمی دنیا کی زندگی سے الگ ہو کر خدا سے لو لگائے، مراقبہ (meditation) نفس کشی اور مجاہدات و ریاضت (spiritual exercises) کے ذریعے سے اپنی اندرونی قوتوں کو نشوونما دے، کشف و کرامت کی قوتیں اپنے اندر پیدا کرے، اور دنیوی زندگی کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کر کے اُخروی نجات حاصل کرے۔ عبادت کا یہ تصور اُن مذاہب میں پایا جاتا ہے جن کی بنیاد زندگی کے راہبانہ تصور، (ascetic view of life) پر ہے، جو اس دنیا کو انسان کے لیے قید خانہ اور جسم کو روح کے لیے قفس سمجھتے ہیں، جن کے نزدیک دین داری اور دنیا داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جو دنیا کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں اور اس کے تعلقات سے باہر نجات کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ جن کے نزدیک روحانی ترقی کے لیے مادی انحطاط یا مادیات سے بے تعلقی ناگزیر ہے۔

عبادت کا اسلامی تصوّر

اسلام کا تصور ان دونوں سے مختلف ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انسان خدائے واحد کا بندہ ہے۔ اس کا خالق، اس کا رازق،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کا مالک، اس کا حاکم صرف خداوندِ عالم ہے۔ خدا نے اس زمین پر اس کو اپنے خلیفہ کی حیثیت سے مامور کیا ہے۔ یہاں کچھ اختیارات اس کو عطا کیے ہیں۔ کچھ ذمہ داریاں اور کچھ خدمتیں اس کے سپرد کی ہیں۔ اپنی مملکت اور اپنی رعیت کے ایک حصے پر اس کو کچھ اقتدار دیا ہے۔ اس کا کام اپنے مالک کے مقصد کو پورا کرنا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ادا کرنا ہے۔ آقا کی سپرد کی ہوئی خدمتوں کو انجام دینا ہے۔ اپنے اختیارات کو اور اپنی قوتوں کو حاکمِ اصلی کے قانون اور اس کی رضا کے مطابق استعمال کرنا ہے۔ جس قدر زیادہ سرگرمی و جانفشانی کے ساتھ وہ زمین کی زندگی میں اپنی ذمہ داریوں اور اپنی متعلقہ خدمات بجالائے گا، اور جتنی زیادہ وفاداری اور فرماں برداری کے ساتھ اپنے اختیارات کے استعمال میں مالک کے قانون کی پیروی کرے گا، اتنا ہی زیادہ وہ کامیاب ہوگا۔ اس کی آیندہ ترقی کا انحصار اسی پر ہے کہ اپنی ماموریت کی مدت ختم کرنے کے بعد جب وہ مالک کے سامنے حساب کے لیے پیش ہو تو اس کے کارنامۂ زندگی سے یہ ثابت ہو کہ وہ ایک فرض شناس اور مطیع و فرماں بردار بندہ تھا، نہ یہ کہ سست، کام چور، نافرض شناس تھا، یا یہ کہ باغی و نافرمان تھا۔

اس نقطۂ نظر سے عبادت کے وہ دونوں تصوّر جو ابتدا میں بیان کیے گئے ہیں غلط اور قطعی غلط ہیں۔ جو شخص اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کو پوجنے کے لیے الگ کرتا ہے اور اس تھوڑے سے وقت میں عبادت کے چند مخصوص مراسم ادا کر دینے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ میں نے خدا کا حق ادا کر دیا ہے، اب میں آزاد ہوں کہ اپنی زندگی کے معاملات کو جس طرح چاہوں انجام دوں، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آپ نے رات دن کے لیے نوکر رکھا ہو، اور جسے پوری تنخواہ دے کر آپ پرورش کر رہے ہوں، وہ بس صبح و شام آ کر آپ کو جھک جھک کر سلام کر دیا کرے، اور اس کے بعد آزادی کے ساتھ جہاں چاہے کھیلتا پھرے یا جس جس کی چاہے نوکری بجالائے۔ اسی طرح جو شخص دنیا اور اس کے معاملات سے الگ ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھتا ہے اور اپنا سارا وقت نماز پڑھنے، روزے رکھنے، قرآن پڑھنے اور تسبیح پھرانے میں صرف کر دیتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے آپ اپنے باغ کی رکھوالی کے لیے مقرر کریں، مگر وہ باغ کو اور اس کے کام کاج کو چھوڑ کر آپ کے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑا رہے، صبح سے شام اور شام سے صبح تک آقا آقا پکارتا رہے، اور باغبانی کے متعلق جو ہدایات آپ نے اسے دی ہیں ان کو نہایت خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ بس پڑھتا ہی رہے، ان کے مطابق باغ کی اصلاح و ترقی کے لیے کام ذرا نہ کر کے دے، ایسے ملازموں کے متعلق جو کچھ رائے آپ قائم کریں گے وہی رائے اسلام کی بھی ایسے عبادت گزاروں کے متعلق ہے۔ اور جو برتاؤ اس قسم کے ملازموں کے ساتھ آپ کریں گے، وہی برتاؤ ان غلط تصورات کے تحت عبادت کرنے والوں کے ساتھ خدا بھی کرے گا۔

اسلام کا تصورِ عبادت یہ ہے کہ آپ کی ساری زندگی خدا کی بندگی میں بسر ہو۔ آپ اپنے آپ کو دائمی اور ہمہ وقتی ملازم (wholetime servant) سمجھیں۔ آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو۔ اس دنیا میں آپ جو کچھ بھی کریں، خدا کی شریعت کے مطابق کریں۔ آپ کا سونا اور جاگنا، آپ کا کھانا اور پینا، آپ کا چلنا اور پھرنا، غرض سب کچھ خدا کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قانونِ[1] شرعی کی پابندی میں ہو۔ خدا نے جن تعلقات میں آپ کو باندھا ہے ان سب میں آپ بندھیں، اور ان کو اس طریقے سے جوڑیں یا توڑیں جس طریقے سے خدا نے انھیں جوڑنے یا توڑنے کا حکم دیا ہے۔ خدا نے جو خدمات آپ کے سپرد کی ہیں اور دنیوی زندگی میں جو فرائض آپ سے متعلق کیے ہیں، ان سب کا بار آپ نفس کی پوری رضامندی کے ساتھ سنبھالیں اور ان کو اس طریقے سے ادا کریں جس کی طرف خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے آپ کی رہنمائی کی ہے۔ آپ ہر وقت ہر کام میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں، اور سمجھیں کہ آپ کو اپنی ایک ایک حرکت کا حساب دینا ہے۔ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ، اپنے محلے میں ہمسایوں کے ساتھ، اپنی سوسائٹی میں دوستوں کے ساتھ اور اپنے کاروبار میں اہل معاملہ کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت ایک ایک بات اور ایک ایک کام میں خدا کی مقرر کردہ حدود کا آپ کو خیال رہے۔ جب آپ رات کے اندھیرے میں ہوں اور کوئی نافرمانی اس طرح کر سکتے ہوں کہ کوئی آپ کو دیکھنے والا نہ ہو، اس وقت بھی آپ کو یہ خیال رہے کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔ جب آپ جنگل میں جا رہے ہوں اور وہاں کوئی جرم اس طرح کر سکتے ہوں کہ کسی پکڑنے والے اور کسی گواہی دینے والے کا کھٹکا نہ ہو، اس وقت بھی آپ خدا کو یاد کر کے ڈر جائیں اور جرم سے باز رہیں۔ جب آپ جھوٹ، بے ایمانی اور ظلم سے بہت سا فائدہ حاصل کر سکتے ہوں اور کوئی آپ کو روکنے والا نہ ہو، اس وقت بھی آپ خدا سے ڈریں اور فائدے کو اس لیے چھوڑ دیں کہ خدا اس سے ناراض ہوگا۔ اور جب سچائی اور ایمانداری میں سراسر آپ کو نقصان پہنچتا ہو اس وقت بھی نقصان اٹھانا قبول کر لیں، صرف اس لیے کہ خدا اس سے خوش ہوگا۔

پس دنیا کو چھوڑ کر کونوں اور گوشوں میں جا بیٹھنا اور اللہ اللہ کرنا عبادت نہیں ہے، بلکہ دنیا کے دھندوں میں پھنس کر اور دنیوی زندگی کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھال کر خدا کے قانون کی پابندی کرنا عبادت ہے۔ ذکرِ الٰہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان

۱- موجودہ زمانے میں ایک صاحب نے قانونِ شرعی (moral law) اور قانونِ طبیعی (physical law) کے فرق کو نظر انداز کر کے گمراہیوں کا ایک عظیم الشان فتنہ کھڑا کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک عبادتِ الٰہی محض قانونِ طبیعی کی پیروی کا نام ہے، قطع نظر اس کے کہ قانونِ شرعی کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ اس بنا پر وہ ان لوگوں کو بھی خدا کا عبادت گزار اور خلیفہ الٰہی اور صالح و مومن قرار دیتے ہیں جو قانونِ طبیعی کے ماتحت تنظیم اور سائنٹیفک ایجادات کے ذریعے سے طاقت بہم پہنچائیں، اگرچہ اس طاقت سے کام لینے میں خدا کے قانونِ شرعی کے پابند نہ ہوں۔ یہ ایسی زبردست غلطی ہے جس نے کفر کو عین اسلام، بغاوت کو عین عبادت اور معصیت کو عین طاعت بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور اسلام کے مشن کی اصلی روح ہی کو مسخ کر ڈالا ہے۔ ان صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ اسلام کے آنے کا تو بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ آدمی کو قانونِ طبیعی سے قانونِ شرعی کے تحت کام لینے کی تعلیم دے۔ اگر انسان محض قانونِ طبیعی کے تحت عمل کرنے کے لیے ہوتا اس چیز کی تعلیم دینے کے لیے کسی نبی اور کتاب کے آنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے لیے تو حیوانی جبلت ہی کافی تھی۔ اگر آدمی کا کام محض قانونِ طبیعی پر عمل کرنا ہی ہو تو اس میں اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ جس طرح بھیڑیا بکری کو پھاڑ کھاتا ہے، اور یہ اس کے لیے قانونِ طبیعی ہے، اسی طرح ایک آدمی اگر دوسرے آدمی سے زیادہ طاقت رکھتا ہے اور اس کو پھاڑ کھاتا ہے، تو یہ اس کے لیے بھی قانونِ طبیعی ہے۔ ایک قوم اگر دوسری قوم سے زیادہ ہوائی جہاز اور بم بنا سکتی ہے اور اس طاقت سے کام لے کر اسے اپنا بندہ بنا لیتی ہے تو یہ بھی اس کے لیے قانونِ طبیعی ہے۔ یہ نظریہ انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا کر درندوں اور موذی جانوروں کے مرتبے میں پہنچا دیتا ہے۔ اور اسلام اس سے ہزاروں کوس دور ہے کہ انسان کی اس حیوانیت کو خدا کی عبادت قرار دے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پر اللہ اللہ جاری ہو، بلکہ اصلی ذکرِ الٰہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا سے غافل کرنے والی ہیں ان میں پھنسو اور پھر خدا سے غافل نہ ہو۔ دنیا کی زندگی میں جہاں قانونِ الٰہی کو توڑنے کے بے شمار مواقع، بڑے بڑے نقصانوں کا خوف لیے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ وہاں خدا کو یاد کرو اور اس کے قانون کی پیروی پر قائم رہو۔ حکومت کی کرسی پر بیٹھو اور وہاں یاد رکھو کہ میں بندوں کا خدا نہیں ہوں بلکہ خدا کا بندہ ہوں۔ عدالت کے منصب پر متمکن ہو اور وہاں ظلم پر قادر ہونے کے باوجود خیال رکھو کہ خدا کی طرف سے میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں۔ زمین کے خزانوں پر قابض و متصرّف ہو اور پھر یاد رکھو کہ میں ان خزانوں کا مالک نہیں ہوں بلکہ امین ہوں اور پائی پائی کا حساب مجھے اصل مالک کو دینا ہے۔ فوجوں کے کمانڈر بنو اور پھر خوف خدا تمھیں طاقت کے نشے میں مدہوش ہونے سے بچاتا رہے۔ سیاست و جہاں بانی کا کٹھن کام ہاتھ میں لو اور پھر سچائی، انصاف اور حق پسندی کے مستقل اصولوں پر عمل کر کے دکھاؤ۔ تجارت اور مالیات اور صنعت کی باگیں سنبھالو اور پھر کامیابی کے ذرائع میں پاک اور ناپاک کا امتیاز کرتے ہوئے چلو۔ ایک ایک قدم پر حرام تمھارے سامنے ہزار خوشنمائیوں کے ساتھ آئے اور پھر تمھاری رفتار میں لغزش نہ آنے پائے۔ ہر طرف ظلم اور جھوٹ اور دغا اور فریب اور بدکاری کے راستے تمھارے سامنے کھلے ہوئے ہوں اور دنیوی کامیابیاں اور مادی لذتیں ہر راستے کے سرے پر جگمگاتے ہوئے تاج پہنے کھڑی نظر آئیں اور پھر خدا کی یاد اور آخرت کی باز پرس کا خوف تمھارے لیے پابندِ پا بن جائے۔ حدود اللہ میں سے ایک ایک حد قائم کرنے میں ہزاروں مشکلیں دکھائی دیں، حق کا دامن تھامنے اور عدل و صداقت پر قائم رہنے میں جان و مال کا زیاں نظر آئے اور خدا کے قانون کی پیروی کرنا زمین و آسمان کو دشمن بنالینے کا ہم معنی ہو جائے، پھر بھی تمھارا ارادہ متزلزل نہ ہو اور تمھاری جبینِ عزم پر شکن تک نہ آئے۔ یہ ہے اصلی عبادت۔ اس کا نام ہے یادِ خدا۔ اِسی کو ذکرِ الٰہی کہتے ہیں، اور یہی وہ ذکر ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ فرمایا گیا ہے کہ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (الجمعہ ۶۲: ۱۰) پس جب نماز ختم ہو جائے تو پھیل جاؤ زمین میں اور تلاش کرو اللہ کے فضل میں سے اور یاد کرو اللہ کو بہت تاکہ تم فلاح پاؤ۔

روحانی ارتقا اور خدا کی یافت کا راستہ

اسلام نے روحانی ترقی اور خدا کی یافت کا بھی یہی راستہ بتایا ہے۔ انسان خدا کو جنگلوں اور پہاڑوں میں یا عزلت کے گوشوں میں نہیں پا سکتا۔ خدا اس کو انسانوں کے درمیان، دنیوی زندگی کے ہنگامۂ کارزار میں ملے گا اور اس قدر قریب ملے گا کہ گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ جس کے سامنے حرام کے فائدے، ظلم کے مواقع اور بدکاری کے راستے قدم قدم پر آئے اور ہر قدم پر وہ خدا سے ڈر کر ان سے بچتا ہوا چلا، اسے خدا کی یافت ہو گئی۔ ہر قدم پر وہ اپنے خدا کو پاتا رہا، بلکہ آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ نہ پاتا اور نہ دیکھتا تو اس دشوار گھاٹی سے بخیریت کیونکر گزر سکتا تھا؟ جس نے گھر میں تفریح کے لمحوں میں اور کاروبار کے ہنگاموں میں ہر کام اس احساس کے ساتھ کیا کہ خدا مجھ سے دور نہیں ہے، اس نے خدا کو ہر لحہ اپنے سے قریب اور بہت قریب پایا، جس نے سیاست اور حکومت اور صلح و جنگ اور مالیات اور صنعت و تجارت جیسے ایمان کی سخت آزمائش کرنے والے کام کیے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور یہاں کامیابی کے شیطانی ذرائع سے بچ کر خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کا پابند رہا اس سے بڑھ کر مضبوط اور سچا ایمان اور کس کا ہوسکتا ہے؟ اُس سے زیادہ خدا کی معرفت اور کسے حاصل ہوسکتی ہے؟ اگر وہ خدا کا ولی اور مقرب بندہ نہ ہوگا تو اور کون ہوگا؟

اسلامی نقطۂ نظر سے، انسان کی روحانی قوتوں کے نشوونما کا راستہ یہی ہے۔ روحانی ارتقا اس کا نام نہیں ہے کہ آپ پہلوان کی طرح ورزشیں کر کے اپنی قوت ارادی (will-power) کو بڑھا لیں اور اس کے زور سے کشف وکرامت کے شعبدے دکھانے لگیں۔ بلکہ روحانی ارتقا اس کا نام ہے کہ آپ اپنے نفس کی خواہشات پر قابو پائیں، اپنے ذہن اور اپنے جسم کی تمام طاقتوں سے صحیح کام لیں، اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونے کی کوشش کریں۔ دنیوی زندگی میں جہاں قدم قدم پر آزمائش کے مواقع پیش آتے ہیں، اگر آپ حیوانی اور شیطانی طریقِ کار سے بچتے ہوئے چلیں اور پورے شعور اور صحیح تمیز کے ساتھ اس طریقے پر ثابت قدم رہیں جو انسان کے شایانِ شان ہے، تو آپ کی انسانیت یوماً فیوماً ترقی کرتی چلی جائے گی۔ اور آپ روز بروز خدا سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔ اس کے سوا روحانی ترقی اور کسی چیز کا نام نہیں[۱]۔

(اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر، جون ۲۰۰۲ء، ص ۷-۱۶)

تمام عبادات کی روح اور جوہر

آج کل عام طور پر دلوں میں ایک [شبہہ] پایا جاتا ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک حد تک واقعات پر مبنی بھی ہے۔ [وہ یہ کہ صرف نماز ہی نہیں، اسلام کی دوسری فرض عبادات بھی اسی غرض کے لیے رکھی گئی ہیں کہ انسان کی عملی زندگی پر ان کا اثر مترتب ہو، مگر اس کی کیا وجہ ہے کہ آج ہم اس اثر کو مسلمانوں کی عملی زندگی میں مفقود پاتے ہیں۔] مگر اس میں کوئی ایسا اشکال نہیں ہے جس کے حل میں دشواری ہو.......... اسلامی عبادات کا نظریہ اپنی جگہ بالکل درست ہے، عقل حکم لگاتی ہے کہ جس غرض کے لیے یہ عبادات فرض کی گئی ہیں وہ اُن سے بدرجۂ اتم پوری ہونی چاہیے، کیونکہ انسان کے نفس کو خدا کی طرف متوجہ کرنے اور احکامِ خداوندی کی اطاعت کا خوگر بنانے کے لیے اس سے بہتر کوئی عملی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ عالمِ واقعہ میں بھی اس نظریے کی صحت ثابت ہو چکی ہے۔ قرونِ اُولیٰ میں اسی نماز روزے اور حج زکوٰۃ نے اسلام کے نصب العین کے مطابق عرب و عجم کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی روحانی واخلاقی تربیت کی تھی اور ان کے اخلاق وسیرت اور کردار پر وہی اثر ڈالا تھا جو اسلام کا مقصود تھا۔ اب اگر ہم کسی شخص یا جماعت کی عملی زندگی میں ان عبادات کے وہ اثرات نہیں دیکھتے، تو ان عبادات کی تاثیر میں شبہہ کرنے کے بجائے ہم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ نفوس کی اثر پذیری کی صلاحیت کسی وجہ سے ماؤف ہوگئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آگ

۱- اکثر لوگ 'روحانی ترقی' کا لفظ بولتے ہیں، مگر خود نہیں جانتے کہ 'روحانیت' آخر ہے کیا چیز۔ اس لیے وہ تمام عمر ایک مبہم چیز کی تلاش اور سعی وحصول میں لگے رہتے ہیں اور ساری تگ ودو کے بعد بھی کچھ نہیں جانتے کہ کہاں پہنچنا تھا اور کہاں پہنچے۔ حالانکہ اسی لفظ 'روحانیت' پر غور کرلیں تو بات بالکل واضح ہوجائے کہ اس لفظ روحانیت میں روح سے مراد انسانی روح ہے نہ کہ کوئی اور روح۔ پس روحانیت انسانیت ہی کا دوسرا نام ہوا۔ انسان اپنی حیوانی خواہشات کی بندگی سے نکل کر کمالِ انسانیت کی طرف جتنی زیادہ پیش قدمی کرے گا، اور اخلاق واوصافِ انسانی سے آراستہ ہوکر رضائے الٰہی کے بلند ترین نصب العین تک پہنچنے کی جتنی کامیاب سعی کرے گا، اسی قدر روحانی ترقی اس کو حاصل ہوگی۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لکڑی کو جلا دیتی ہے۔ تجربہ و مشاہدہ کی تکرار نے اس امر میں کسی شبہے کی گنجایش باقی نہیں رکھی ہے کہ آگ کا کام جلانا اور لکڑی کا کام جل جانا ہے۔ اس یقینی علم کے بعد اگر کسی وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لکڑی کو آگ پر رکھا جا رہا ہے اور وہ نہیں جلتی تو ہم کو یہ گمان نہیں ہوتا کہ آگ میں جلانے کی خاصیت نہیں رہی ہے، بلکہ ہم یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ لکڑی گیلی ہے، اس میں آگ کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جس طریقِ تربیت و ہدایت کے متعلق ازروئے عقل ہم جانتے ہیں کہ نفوس پر اس سے ایک خاص اثر مترتب ہونا چاہیے اور اس کی عین فطرت اس کی مقتضی ہے کہ اس سے نفوس پر وہی اثر مترتب ہو اور تجربے سے ثابت بھی ہو چکا ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں بے شمار نفوس پر فی الواقع وہی اثر مترتب ہوا ہے، اس کی تاثیر کو اگر ہم بعض نفوس کے حق میں ناکام دیکھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہمارے دل میں اس کی تاثیر کے متعلق کوئی شک پیدا ہو؟ کیوں نہ ہم سمجھیں کہ گیلی لکڑی کی طرح ان نفوس میں بھی اثر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے؟

جہاں تک نماز کی ظاہری صورت کا تعلق ہے وہ تو اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ اوقاتِ مقررہ پر چند جسمانی حرکات کا اعادہ اور چند مقرر الفاظ کی تکرار ہے۔ اور یہی حال دوسری عبادات کا بھی ہے۔ ایک خاص مہینے میں صبح سے شام تک اکل و شرب اور مباشرت سے مجتنب رہے، اس کا نام روزہ ہو گیا۔ سال میں ایک مرتبہ اپنے مال میں سے ایک مقررہ مقدار مخصوص مصارف کے لیے نکال دی، یہ زکوٰۃ ہو گئی۔ ایک خاص زمانے میں حجاز کا سفر کر لیا اور مخصوص مقامات پر چند مناسک ادا کر دیے، یہ حج ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ بجائے خود ان افعال میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسان کے نفس پر اثر انداز ہو سکتی ہو مجرد افعال ہونے کے لحاظ سے نماز اور ایک جسمانی ورزش، روزے اور فاقے، زکوٰۃ اور سرکاری ٹیکس حج اور عام سفروں کے درمیان کچھ بھی فرق نہیں اور کوئی صاحب عقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ ورزشِ جسمانی سے رُوح میں لطافت پیدا ہوتی ہے، یا فاقہ کرنے سے اخلاقی تربیت ہوتی ہے، یا ٹیکس ادا کرنے اور کسی مقام کا سفر کرآنے سے انسان میں اعلیٰ درجے کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔

مگر جو چیز ان اعمال کو دوسرے افعال سے ممتاز کرتی ہے اور ان کو تہذیبِ اخلاق و تزکیۂ نفس و تصفیۂ روح کا ایک بہترین ذریعہ بناتی ہے وہ ایمان ہے۔ ایمان ہی رکوع و سجود اور قیام و قعود کو 'نماز' بناتا ہے۔ وہی فاقے کو 'روزے' میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہی ٹیکس کی ماہیت میں انقلاب پیدا کر کے اُسے 'زکوٰۃ' کا بلند مرتبہ بخشتا ہے۔ اور وہی ایک خاص قسم کے سفر کو سیر و سیاحت کے ادنیٰ مقام سے اُٹھا کر 'حج' کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ درحقیقت ان تمام عبادات کی روح اور ان کا جوہر وہی ہے۔ اسی سے ارکانِ عبادت میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ وہی اُن ارکان کو تاثیر کی قوت بخشتا ہے۔ اُسی کی بدولت نفس میں اُن سے متاثر ہونے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص واقعی ایمان رکھتا ہو، خدا کو اپنا خدا سمجھتا ہو، آخرت کی زندگی پر عقیدہ رکھتا ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول مانتا ہو، اور ان کی لائی ہوئی تعلیم کو خدا کی تعلیم سمجھتا ہو تو ممکن نہیں ہے کہ وہ دن میں پانچ وقت نماز کا سبق تازہ کرے اور پھر بھی اس کی لوحِ دل، اس سبق کے اثر سے یکسر خالی رہے اور اس کی روزمرہ زندگی میں خوفِ خدا اور اطاعت احکامِ الٰہی کا کوئی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نشان نمایاں نہ ہو۔ ہر سال پورے ایک مہینے تک سخت ضوابط کے ماتحت پرہیز گاری اور خدا ترسی کی تربیت پاتا ہے اور پھر بھی اس کی زندگی میں قطعاً کوئی انقلاب نہ ہو، حتیٰ کہ وہ بالکل ایسا کورے کا کورا دہ جائے کہ گویا اس نے کوئی تربیت پائی ہی نہیں۔ خالص ایمان بالغیب کی تحریک پر ہر سال اپنے محبوب مال کی قربانی کرتا رہے اور پھر بھی اُسی شُحِّ نفس اور قساوتِ قلب اور حرام خوری و خود غرضی کے مرض میں مبتلا رہے جو ایک بے ایمان، خود پرست انسان میں پائی جاتی ہے۔ اپنے رب کی پکار پر لبیک لبیک کہتا ہوا اپنا گھر بار چھوڑ کر، اپنے مفید و محبوب مشاغل ترک کر کے فقیرانہ لباس پہن کر نکلے، ایک مدتِ دراز تک اسی شوق اور عشق کی لگن دل میں لیے ہوئے سفر کرے، یہاں تک کہ مرکزِ اسلام میں پہنچ کر اپنی آنکھوں سے اللہ کی اُن روشن نشانیوں کا مشاہدہ کر لے جو خدا کے سچے اور مطیع فرمان بندوں کی سرفرازیوں پر اور سرکشوں کی نامرادیوں پر کھلی گواہی دے رہی ہیں، اور پھر بھی جب واپس آئے تو اس سفر کے آثار اور نتائج سے اس کی سیرت ایسی معرّا ہو کہ وہ گویا کہیں گیا ہی نہیں اور اس کی آنکھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔

یہ ضرور ہے کہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے ہر نفس پر ان عبادات کی تاثیرات یکساں نہیں ہو سکتیں۔ نفوس کی کم و بیش صلاحیتوں کے لحاظ سے، اور قوتِ ایمانی کی زیادتی اور کمی کے لحاظ سے اُن کا کم و بیش اور شدید و ضعیف ہونا ایک فطری بات ہے۔ لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایمان کے ساتھ جو عبادت کی جائے وہ بالکل ہی بے اثر ثابت ہو۔ ہم یہ بات قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص نماز کو فحشاء و منکر کے ساتھ جمع کرتا ہے، جس کی زندگی میں روزہ اور فسق ایک ساتھ پائے جاتے ہیں، جس کی سیرت میں حرام خوری اور زکوٰۃ دونوں بہم ہیں، جو حج اور ہتکِ حرمات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا رہا ہے، اس کی نماز 'نماز' نہیں ایک عادی حرکت ہے، اس کا روزہ 'روزہ' نہیں فاقہ ہے، اس کی زکوٰۃ 'زکوٰۃ' نہیں چندہ یا ٹیکس ہے، اس کا حج، 'حج' نہیں بلکہ اس کے حق میں ویسا ہی ایک سفر ہے جیسا پیرس اور لندن کا سفر۔ یہ جو کچھ کہا گیا، اس کے مصداق صرف وہی لوگ ہیں جن کی سیرت اور کردار پر، عباداتِ اسلامی کا کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے سے قطعی انکار ہے کہ مسلمانوں میں جتنے نمازی، روزہ دار، زکوٰۃ کے پابند، اور حج کرنے والے ہیں، سب کے سب ایسے ہی ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک قلیل تعداد ایسے منافقین پر بھی مشتمل ہو، لیکن الحمد للہ کہ اکثریت کا یہ حال نہیں ہے۔ اکثریت جس مرض میں مبتلا ہے وہ نفاق نہیں، بلکہ ضعفِ ایمانی ہے۔ اِسی ضُعف کا یہ نتیجہ ہے کہ عبادات کی تاثیریں بھی ضعیف ہو گئی ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، حج بھی کر آتے ہیں، مگر یہ سب چیزیں دلوں کو مس کرتی ہوئی اس طرح گذر جاتی ہیں جیسے بھاپ آئینے کی سطح پر ایک ہلکی سی نمی چھوڑ کر گذر جائے۔ یہ تاثیر کا عدم نہیں بلکہ اس کا ضعف ہے۔ ایمان کی چنگاریاں دلوں میں دبی چھپی اب بھی موجود ہیں۔ اور ان کی حرارت ہے سے عبادتیں کچھ نہ کچھ اثر ضرور کر رہی ہیں۔ لیکن وہ اثر اتنا کمزور ہوتا ہے کہ عبادت گذاروں کی سیرت اور کردار میں اس کے نشانات کچھ بہت زیادہ نمایاں نہیں ہوتے۔

میں یہ ماننے سے بھی انکار کرتا ہوں کہ مسلمانوں میں جو لوگ عبادات کے پابند ہیں ان کا حال عبادت نہ کرنے والوں سے بدتر یا اُن کے برابر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں اب بھی اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اخلاقی حیثیت سے وہی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنصر زیادہ بہتر پایا جائے گا جو نماز روزے کا پابند ہے۔ مگر اصل معاملہ یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہوں میں خدافراموش لوگوں کی بہ نسبت عبادت گذاروں کی برائیاں زیادہ کھٹکتی ہیں۔ ایک تارکِ صوم وصلوٰۃ کی بدسیرتی و بدمعاملگی اتنی زیادہ بری معلوم نہیں ہوتی جتنی ایک پابندِ صوم وصلوٰۃ کی بدسیرتی وبدمعاملگی بے نماز سے برائی ہی متوقع ہوتی ہے اس لیے جب وہ برائی کرتا ہے تو اس کی کچھ زیادہ شکایت نہیں ہوتی۔ مگر نمازی سے ہر شخص یہ اُمید رکھتا ہے کہ وہ خدا سے ڈرنے والا اور پرہیز گار ہوگا۔ اس لیے جب اس سے عام توقعات کے خلاف بُرے اوصاف کا ظہور ہوتا ہے تو یہ معاملہ ہر آنکھ میں کھٹک اور ہر زبان پر شکایت پیدا کردیتا ہے۔ سفید دیوار پر سیاہی کی ایک چھینٹ بھی ہو تو ہر دیکھنے والا اس عیب پر انگلی اُٹھائے گا۔ باورچی خانے کی سیاہ دیواروں پر جتنا چاہے کوئلہ مل دیکھیے۔ کسی کو بھی اس کی پروانہ ہوگی۔

بے جا مبالغہ اگر نہ کیا جائے تو حقیقت صرف اتنی ہی ہے کہ ہمارے درمیان ایک عظیم اکثریت ایسے نمازیوں اور عبادت گذاروں اور حاجیوں کی ہے جو ان عبادات سے اصلاحِ نفس کے وہ پورے فوائد حاصل نہیں کررہی ہے جو دراصل ان سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ اور یہ بات کچھ بے سبب نہیں ہے۔ اس کا ایک اہم سبب ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایمان، جو اِن عبادات کی جان اور ان کی تاثیر کا اصل موجب تھا، دلوں میں ضعیف ہوگیا ہے[1]۔

پھر ضعفِ ایمان کا بھی ایک سبب ہے۔ اور وہ ہے قرآن کی تعلیم سے نابلد ہونا۔ خدا نے ایمان کی دعوت دینے کے لیے جس چیز کو ذریعہ بنایا تھا وہ تو یہی قرآن تھا۔ مگر عام مسلمان اسی کے فہم سے محروم اور اسی کی تعلیم سے ناواقف ہیں۔ اب آخر دلوں میں ایمان کا نشو ونما ہو تو کس طرح۔

ایک اور چیز جس کا ہماری عبادتوں کو ضعیف الاثر بنانے میں بڑا حصہ ہے دین اور دنیا کی علیحدگی کا غلط تخیل ہے۔ یہ دراصل جاہلیت کا اعتقاد تھا جس کو اسلام نے بالکل مٹا دیا تھا۔ مگر نہ معلوم اس نے کس طرح مسلمانوں میں راہ پالی۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دین انسانی زندگی کے شعبوں میں سے محض ایک شعبہ ہے جس کا دوسرے شعبوں سے کوئی تعلق نہیں۔ مذہبی رسوم، عبادات اور قربانیاں، محض اس لیے ضروری ہیں کہ خدا یا دیوتاؤں کو خوش کیا جائے، اور زندگی کے معاملات میں اُن کی تائید حاصل کی جائے۔ اِن فرائض کو انجام دے کر جب انسان عبادت گاہوں سے باہر نکلے تو مذہب کی طرف سے اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور وہ مختار ہوتا ہے کہ اپنی دنیا کے معاملات جس ڈھنگ پر چاہے چلائے۔ اسلام نے اس غلط حد بندی کو

۱- .... نماز روزہ وغیرہ اعمال صرف اسی صورت میں برائی سے بچنے کا بہترین ذریعہ اور معاشرے کو صحیح ڈگر پر چلانے کا آلہ ہوسکتے ہیں جبکہ انھیں خلوص کے ساتھ کیا جائے، اور خلوص کے ساتھ آدمی ان پر اسی صورت میں کاربند ہوسکتا ہے جب وہ ایمانداری سے یہ سمجھتا ہو کہ خدا ہے اور میں اس کا بندہ ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں اور کوئی آخرت آنے والی ہے جس میں مجھے اپنے اعمال کا احساب دینا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان سب باتوں کو خلاف واقعہ سمجھتا ہو، اور یہ خیال کرتا ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص اصلاح کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس صورت میں بھی یہ عبادات برائی سے بچنے کا ذریعہ اور معاشرے کو صحیح ڈگر پر چلانے کا آلہ بن سکیں گی۔ ایک طرف ان عبادات کے یہ فوائد بیان کرنا اور دوسری طرف ان فطری بنیادوں کو خود ڈھا دینا جن پر ان عبادات کے یہ فوائد منحصر ہیں، بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی کارتوس سے سارا گن پاؤڈر نکال دیں اور پھر کہیں کہ یہ کارتوس شیر کے شکار میں بہت کارگر ہے۔ (رسائل و مسائل، چہارم، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۹۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مٹایا۔ دین کو زندگی کا ایک شعبہ نہیں بلکہ پوری زندگی کا نظامِ عمل قرار دیا۔ عقائد اور اخلاق کے درمیان، ایمان اور سیرت کے درمیان، عبادات اور معاملات کے درمیان، مذہبی اعمال اور دنیوی اعمال کے درمیان ایک گہرا ربط قائم کیا۔ اور انسان کی دنیوی زندگی ہی کو بالکلیہ دینی زندگی بنا دیا۔ اس نے بتایا کہ دین اس دنیا کے معاملات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اسی دنیا کے کاروبار میں اللہ تعالیٰ کے قانون کی پیروی، اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی، اور اس کی رضا کے اتباع کا نام دین ہے۔ عبادات اور معاملات دو مختلف چیزیں نہیں ہیں بلکہ معاملات ہی میں حدود اللہ کی پابندی اور خوشنودیٔ الٰہی کی طلب، اور تقرّب الی اللہ کی سعی کا نام عبادت ہے۔ نماز روزے اور حج و زکوٰۃ کو عبادت اور فرض قرار دینے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ عبادت کو انھی اعمال میں منحصر کر دیا جائے، بلکہ دراصل یہ اعمال انسان کو اُس بڑی عبادت کے لیے مستعد کرنے والے ہیں جس کا دائرہ اُس کی پوری زندگی پر وسیع ہے۔ مسلمان کی عبادت گاہ پوری کائنات ہے۔ اس کی ساری زندگی عبادت ہے۔ اس کو ہر آن خدا کا عبادت گذار بندہ ہونا چاہیے۔ اس کا معبد صرف اس کی مسجد تک محدود نہیں بلکہ مسجد اس کی تربیت گاہ ہے جہاں وہ عبادت کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔ اگر اس کی نماز اور اس کے روزے اور اس کی دوسری عبادتوں کا ربط اس کے معاملات سے منقطع ہو جائے اور وہ اپنی زندگی کے اعمال میں قانونِ الٰہی کے اتباع سے آزاد ہو تو محض صوم و صلوٰۃ کی پابندی سے وہ دین دار اور عبادت گزار بندہ بن نہیں سکتا۔

افسوس ہے کہ دین کا یہ تصور رفتہ رفتہ مسلمانوں کے ذہن سے محو ہوتا جا رہا ہے اور دین و دنیا کی علیٰحدگی کا وہی جاہلی تصور اس کی جگہ لے رہا ہے جس کو اسلام نے مٹا دیا تھا۔ اور یہ اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ عبادات اور معاملات کا باہمی تعلق منقطع ہو گیا۔ عملی زندگی سے نمازوں کا ربط ٹوٹ گیا۔ معاشیات پر زکوٰۃ کی فرماں روائی باقی نہ رہی۔ سال کے گیارہ مہینے رمضان کی حکومت سے آزاد ہو گئے بلکہ رمضان المبارک غریب خود بھی اپنے حدود میں صرف حلق کا دربان بنا کر رکھ دیا گیا۔ حج کی حیثیت ہندوؤں کی جاترا اور عیسائیوں کے (Pilgrimage) سے زیادہ نہ رہی۔ اور یہ غلط فہمی عام طور پر لوگوں میں پھیل گئی کہ نماز اور فحشاء و منکر، روزے اور فسق و فجور، زکوٰۃ اور حرام خوری، حج اور ہتکِ حرمات ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔

(تفہیمات، دوم، نومبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۲۰-۲۲۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حصہ اوّل

نماز

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب اوّل

نماز کی ضرورت واہمیت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اول

نماز، افراد کی تیاری کا پروگرام

مراسمِ عبادت کی حیثیت

اسلام انسان کی پوری دنیوی زندگی کو عبادت میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا اقرار کرنے کے ساتھ ہی یہ بات لازم آ جاتی ہے کہ جس اللہ تعالیٰ کو آدمی نے اپنا معبود تسلیم کیا ہے، اس کا عبد یعنی بندہ بن کر رہے، اور بندہ بن کر رہنے ہی کا نام عبادت ہے۔ کہنے کو تو یہ چھوٹی سی بات ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ اسے زبان سے ادا کر دیا جا سکتا ہے، مگر عملاً آدمی کی ساری زندگی کا اپنے تمام گوشوں کے ساتھ عبادت بن جانا آسان کام نہیں، اس کے لیے بڑی زبردست ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خاص طور پر ذہن کی تربیت کی جائے۔ مضبوط کیریکٹر پیدا کیا جائے۔ عادات اور خصائل کو ایک سانچے میں ڈھالا جائے، اور صرف انفرادی سیرت ہی کی تعمیر پر اکتفا نہ کر لیا جائے، بلکہ ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جو بڑے پیمانے پر افراد کو اس عبادت کے لیے تیار کرنے والا ہو، اور جس میں جماعت کی طاقت فرد کی پشت پناہ، اس کی مددگار اور اس کی کمزوریوں کی تلافی کرنے والی ہو۔ یہی غرض ہے جس کے لیے اسلام میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ ان کو عبادت کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس یہی عبادت ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُس اصلی عبادت کے لیے آدمی کو تیار کرتی ہیں۔ یہ اس کے لیے لازمی ٹریننگ کورس ہیں۔ انھی سے وہ مخصوص ذہنیت بنتی ہے، اس خاص کیرکٹر کی تشکیل ہوتی ہے، منظم عادات و خصائل کا وہ پختہ سانچہ بنتا ہے، اور اس اجتماعی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کی زندگی کسی طرح عبادتِ الٰہی میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ان چار چیزوں کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ اسی بنا پر ان کو ارکانِ[1] اسلام قرار دیا گیا ہے۔ یعنی وہ

۱- انھی صاحب نے جن کا ذکر اس سے پہلے حاشیے میں کیا جا چکا ہے، کلمۂ شہادت اور ان چار عبادتوں کے ارکانِ اسلام ہونے کا صاف انکار کر دیا ہے۔ اور اس کے بجائے اپنی طرف سے اسلام کے دس ارکان تصنیف کیے ہیں۔ یہ صاحب جہل مرکب میں مبتلا ہیں۔ ان کو نہ اسلام سے کوئی واقفیت ہے، نہ لفظِ رکن کے معنی و مفہوم کو وہ جانتے ہیں، نہ انھیں یہ خبر ہے کہ یہ پانچوں چیزیں کس حیثیت سے اسلام کی رکن قرار دی گئی ہیں، نہ وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ اگر یہ پانچوں چیزیں موجود نہ ہوں تو اسلام سرے سے کسی چیز کا نام ہی نہیں رہتا۔ اس پر مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ خدا کے پیغمبر نے جن چیزوں کو ارکان اسلام قرار دیا ہے ان کو یہ حضرت فرماتے ہیں کہ یہ ارکانِ اسلام نہیں ہیں۔ اور خود انھوں نے جن دس باتوں کو تصنیف کیا ہے انھیں یہ ارکانِ اسلام قرار دیتے ہیں۔ گویا آنجناب کے نزدیک اسلام اس دین کا نام نہیں ہے جسے خدا کے رسولؐ نے پیش کیا تھا، بلکہ جس چیز کو یہ کیمبرج کا رینگلر وضع کرے گا اس کا نام اسلام ہے۔ ایک طرف ان بزرگ کے یہ تطاولات ہیں اور دوسری طرح عام لوگوں میں علم کی کمی اور دنیا پرستی کی زیادتی کا یہ حال ہے کہ ایسے شخص کی قیادت میں جو تنظیم ہوا سے وہ اسلامی تنظیم اور اسلامی نظامِ امارت سمجھتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک امیر کے عقیدے اور علم دین اور اخلاق کو دیکھنے کی حاجت نہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر......)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ستون ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت قائم ہوتی اور قائم رہتی ہے۔

آیئے، اب ہم دیکھیں کہ ان میں سے ایک ایک رکن اسلامی زندگی کی عمارت کو کس طرح قائم کرتا ہے، اور کس طرح انسان کو اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

یاددہانی:

انسان کی زندگی کو عبادت میں تبدیل کرنے کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذہن میں اس بات کا شعور ہر وقت تازہ، ہر وقت زندہ اور ہر وقت کارفرما رہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے۔ اور اسے دنیا میں سب کچھ بندہ ہونے کی حیثیت ہی سے کرنا ہے۔ اس شعور کو بار بار ابھارنے اور تازہ کرنے کی ضرورت اس لیے لاحق ہوتی ہے کہ انسان درحقیقت جس کا بندہ ہے وہ تو اس کی آنکھوں سے اوجھل اور اس کے حواس سے دور ہے، لیکن اس کے برعکس ایک شیطان خود آدمی کے اپنے نفس میں موجود ہے جو ہر وقت کہتا رہتا ہے کہ تو میرا بندہ ہے اور لاکھوں کروڑوں شیطان ہر طرف دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرتا ہے کہ تو میرا بندہ ہے۔ یہ شیاطین آدمی کو محسوس ہوتے ہیں، نظر آتے ہیں اور ہر آن نت نئے طریقوں سے اپنی طاقت اس کو محسوس کراتے رہتے ہیں۔ ان دوگونہ اسباب سے یہ شعور کہ میں خدا کا بندہ ہوں اور اس کے سوا مجھے کسی کی بندگی نہیں کرنی ہے، آدمی کے ذہن سے گم ہو جاتا ہے۔ اس کو زندہ اور کارفرما رکھنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان خدا کی خدائی کا زبان سے اقرار کرلے، یا محض ایک 'علمی فارمولا' کی حیثیت سے اس کو سمجھ لے، بلکہ اس کے لیے قطعاً ناگزیر ہے کہ اسے بار بار ابھارا اور تازہ کیا جائے۔ یہی کام نماز کرتی ہے۔ صبح اٹھتے ہی سب کاموں سے پہلے وہ آپ کو یہی بات یاد دلاتی ہے۔ پھر جب آپ دن کو اپنے کام کاج میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ ہنگامۂ سعی وعمل کے دوران میں دو دفعہ آپ کو تھوڑی دیر کے لیے الگ کھینچ بلاتی ہے تا کہ احساسِ بندگی کا نقش اگر دھندلا ہو گیا ہو تو اسے تازہ کردے۔ پھر شام کو جب تفریحوں اور دلچسپیوں کا وقت آتا ہے تو پھر یہ آپ کو آگاہ کرتی ہے کہ تم خدا کے بندے ہو شیطانِ نفس کے بندے نہیں ہو۔ اس کے بعد رات آتی ہے، وہ رات جسے اندر کا شیطان اور باہر کے شیاطین، سب مل کر معصیتوں سے سیاہ کردینے کے لیے دن بھر منتظر رہتے ہیں۔ نماز پھر آپ کو خبردار کرتی ہے کہ تمھارا کام خدا کی بندگی کرنا ہے نہ کہ ان شیاطین کی۔

یہ نماز کا پہلا فائدہ ہے۔ اسی بنا پر اسے قرآن میں ذکر کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کے معنی یاددہانی کے ہیں۔ اگر نماز میں اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا، تب بھی صرف یہی ایک صفت اس کو رکنِ اسلام قرار دینے کے لیے کافی تھی۔ کیونکہ اس فائدے کی اہمیت پر جتنا زیادہ غور کیا جائے اتنا ہی زیادہ اس امر کا یقین حاصل ہوتا ہے کہ آدمی کا عملاً بندۂ خدا بن کر رہنا اس یاددہانی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

(گذشتہ سے پیوستہ) نفسِ تنظیم اور نفسِ نظامِ امارت مقصود بالذات ہے، خواہ عمر فاروقؓ کے تحت ہو، خواہ ہٹلر اور مسولینی کے تحت میسر آجائے۔ خدا کی پناہ اس دور کے فتنے کس حد تک پہنچ رہے ہیں۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فرض شناسی:

پھر چونکہ آپ کو اس زندگی میں ہر قدم پر خدا کے احکام بجالانے ہیں، خدا کی سپرد کی ہوئی خدمات اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی نگہداشت کے ساتھ انجام دینی ہیں، اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ میں فرض شناسی پیدا ہو اور فرض کو مستعدی اور فرماں برداری کے ساتھ انجام دینے کی عادت آپ کی فطرتِ ثانیہ بن جائے۔ جو شخص یہ جانتا ہی نہ ہو کہ فرض کیا بلا ہوتی ہے اور اس کا فرض ہونا کیا معنی رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ کبھی ادائے فرض کے قابل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح جو شخص فرض کے معنی تو جانتا ہو مگر اس کی تربیت اتنی خراب ہو کہ فرض کو فرض جاننے کے باوجود اسے ادا کرنے کی پروا نہ کرے، اس کے کیرکٹر پر کوئی اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اور نہ وہ کسی عملی خدمت (active service) کا اہل ہوسکتا ہے۔ بس یہ بالکل ناگریز ہے کہ جن لوگوں کو کسی ذمہ دارانہ خدمت پر مامور کیا جائے ان کے لیے فرض شناسی اور اطاعتِ امر کی تربیت کا بھی انتظام کیا جائے۔ اس کا فائدہ صرف یہی نہیں ہے کہ کام کے آدمی تیار ہوتے رہتے ہیں بلکہ اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ روزانہ کارآمد آدمیوں اور ناکارہ آدمیوں کے درمیان تمیز ہوتی رہتی ہے۔ روز یہ فرق کھلتا رہتا ہے کہ جو لوگ خدمت کے امیدوار ہیں ان میں کون قابلِ اعتماد ہے اور کون نہیں ہے۔ تمام عملی خدمات کے لیے یہ قطعاً ضروری ہے کہ ہمیشہ بالالتزام عملی آزمائش (practical test) پر آدمیوں کو پرکھا جاتا رہے تاکہ ناقابلِ اعتماد آدمی ملازمت میں نہ رہنے پائیں۔ فوج کو دیکھیے، کن کن طریقوں سے وہاں ڈیوٹی کو سمجھنے اور اسے ادا کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ رات دن میں کئی کئی بار بگل بجایا جاتا ہے۔ سپاہیوں کو ایک جگہ حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا ہے، ان سے قواعد [parade] کرائی جاتی ہے۔ یہ سب کس لیے؟ اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ سپاہیوں کو حکم بجالانے کی عادت ہو۔ ان میں فرض شناسی کا مادہ پیدا ہو۔ ان میں ایک نظام اور تربیت کے ساتھ کام کرنے کی خصلت پیدا ہو۔ اور اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ روزانہ سپاہیوں کی آزمائش کی جاتی رہے، روز یہ فرق کھلتا رہے کہ جو لوگ فوج میں بھرتی ہوئے ہیں ان میں سے کون کام کے آدمی ہیں اور کون ناکارہ ہیں۔ جو سُست اور نالائق لوگ بگل کی آواز سن کر گھر بیٹھے رہیں یا قواعد [parade] میں حکم کے مطابق حرکت نہ کریں انھیں پہلے ہی فوج سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان پر یہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا کہ جب کام کا وقت آئے گا تو وہ فرض کی پکار پر لبیک کہیں گے۔

دنیوی فوجوں کے لیے تو کام کا وقت کبھی برسوں میں آتا ہے، اور اس کے لیے یہ اہتمام ہے کہ روزانہ سپاہیوں کی تربیت اور ان کی آزمائش کی جاتی ہے مگر اسلام جو فوج بھرتی کرتا ہے اس کے لیے ہر وقت کام کا وقت ہے۔ وہ ہر وقت برسرِ کار (on duty) ہے۔ اس کے لیے ہر وقت معرکۂ کارزار گرم ہے۔ اسے زندگی میں ہر آن، ہر لمحہ فرائض ادا کرنے ہیں، خدمات بجالانی ہیں، شیطانی قوتوں سے لڑنا ہے، حدود اللہ کی حفاظت کرنی ہے، اور احکام شاہی کو نافذ کرنا ہے۔ اسلام محض ایک اعتقادی مسلک نہیں ہے بلکہ عملی خدمت ہے اور عملی خدمت بھی ایسی جس میں رخصت، تعطیل، آرام کا کوئی وقت نہیں۔ رات دن کے چوبیس گھنٹے پیہم اور مسلسل خدمت ہی خدمت ہے۔ اب فوج کی مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیجیے کہ ایسی سخت عملی خدمت کے لیے کتنی سخت ڈسپلن، کیسی زبردست تربیت اور کتنی شدید آزمائش کی ضرورت ہے۔ محض عقیدہ (creed) کا زبانی اقرار اس کے لیے کیوں کر کافی ہو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سکتا ہے کہ ایک شخص اس فوج میں رکھ لیا جائے جس کو اتنی اہم خدمت انجام دینی ہے۔ عقیدے کا اقرار تو صرف اس ملازمت میں داخل ہونے کے لیے امیدواری کا اعلان ہے۔ اس اعلان کے بعد یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ اسے ڈسپلن کے شکنجے میں کسا جائے۔ اس ڈسپلن میں رہ کر ہی وہ اسلام کے کام کا بن سکتا ہے۔ اور اگر وہ اپنے آپ کو اس شکنجے کی گرفت میں دینے پر تیار نہیں، اگر وہ فرض کی پکار پر نہیں آتا، اگر وہ احکام کی اطاعت کے لیے کوئی مستعدی اپنے اندر نہیں رکھتا تو وہ اسلام کے لیے قطعی ناکارہ ہے۔ خدا اور اس کے دین کو ایسے فضول آدمی کی کوئی حاجت نہیں۔

یہی دوگونہ اغراض ہیں جن کے لیے نماز رات دن میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے۔ یہ روزانہ پانچ بگل بجاتی ہے تاکہ اللہ کے سپاہی اس کو سن کر ہر طرف سے دوڑے چلے آئیں اور ثابت کریں کہ وہ فرض کو پہچانتے ہیں۔ اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں، اور اس کے احکام بجالانے کے لیے مستعد ہیں۔ اس طریقے سے ایک طرف سپاہیوں کی تربیت ہوتی ہے اور دوسری طرف مومن اور منافق کا فرق کھلتا رہتا ہے۔ جو لوگ اس آواز پر پابندی کے ساتھ آتے ہیں اور ضابطے کے مطابق حرکت کرتے ہیں ان میں فرض شناسی، مستعدی، انضباط اور اطاعتِ امر کا مادہ نشوونما پاتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اس آواز کو سن کر اپنی جگہ سے نہیں ہلتے وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ یا تو وہ فرض کو پہچانتے نہیں، یا پہچانتے ہیں تو اسے ادا کرنے کے لیے مستعد نہیں ہیں۔ یا تو وہ اس اقتدار (authority) ہی کو تسلیم نہیں کرتے جس نے اسے فرض قرار دیا ہے، یا پھر ان کی ذہنی حالت اتنی ناقص ہے کہ جسے اپنا اللہ اور رب مانتے ہیں اس کے پہلے اور اہم ترین حکم کو بجالانے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اگر ایمان رکھتے بھی ہیں تو صادق الایمان (true to their conviction) نہیں ہیں۔ ان میں یہ صفت اور صلاحیت موجود نہیں ہے کہ جس چیز کو حق جانیں اس کے مطابق عمل کرنے کی زحمت بھی اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ پہلی صورت میں وہ مسلمان نہیں ہیں اور دوسری صورت میں وہ اتنے نالائق اور ناکارہ ہیں کہ اسلامی جماعت میں رہنے کے قابل نہیں۔

اسی بنا پر قرآن میں نماز کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (البقرہ ۲: ۴۵) بے شک یہ (نماز) ایک مشکل کام ہے، مگر فرماں برداروں کے لیے مشکل نہیں۔

یعنی جو لوگ خدا کی اطاعت و بندگی کے لیے تیار نہیں ہیں صرف انھی پر نماز گراں گذرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر جس پر نماز گراں گزرے وہ خود اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی و اطاعت کے لیے تیار نہیں ہے۔[1]

اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (التوبہ ۹: ۱۱) اگر وہ کفر و شرک سے توبہ کریں اور نماز کے پابند ہوں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔

۱۔ نماز کی پابندی احساس فرض کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک آدمی ایمان داری کے ساتھ یہ محسوس کرلے کہ جس خدا پر میں ایمان لایا ہوں اس نے نماز مجھ پر فرض کی ہے اور میں منافق ہوں گا کہ ایمان کا دعویٰ بھی کروں اور خدا کا عائد کردہ فرض بھی ادا نہ کروں تو وہ کبھی نماز پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر آدمی اس فرض کے احساس ہی سے خالی ہو تو اس سے نماز کی پابندی نہیں ہو سکتی۔

(مکاتیب سید ابو الاعلیٰ مودودی، دوم، نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۳۲۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یعنی نماز کے بغیر آدمی اسلام کی دینی برادری میں شامل ہی نہیں ہوسکتا۔اس بنا پر قرآن کے بارے میں فرمایا کہ

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرہ ۲:۳) یہ کتاب صرف اُن خداترس لوگوں کے لیے ہدایت ہے جواَن دیکھی حقیقت پر ایمان لائیں اور نماز کے پابند بنیں اور جورزق ہم نے دیا ہے اس میں سے راہِ خدا میں دیں۔

اسی بنا پر منافقین کی یہ صفت بیان کی گئی کہ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى (النساء ۴: ۱۴۲) یعنی وہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو اس طرح کسمساتے ہوئے بادلِ ناخواستہ اٹھتے ہیں کہ گویا ان کی جان پر بن رہی ہے۔اور اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (الماعون ۱۰۷:۵) یعنی وہ اپنی نمازوں سے غافل ہوتے ہیں۔

اس بنا پر حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلٰوةِ۔(مسلم، کتاب الصلوٰۃ) بندے اور کفر کے درمیان ترکِ صلوٰۃ واسطہ ہے۔

یعنی ترکِ صلوٰۃ وہ پُل ہے جس کو عبور کر کے آدمی ایمان سے کفر کی طرف جاتا ہے۔

اسی بنا پر رحمۃ للعالمینؐ نے فرمایا کہ جولوگ اذان کی آواز سن کر گھروں سے نہیں نکلتے، میرا جی چاہتا ہے کہ جا کر ان کے گھروں میں آگ لگادوں اور اسی بنا پر فرمایا کہ اَلْعَهْدُ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلٰوةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ۔(ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) ہمارے اور عرب کے بدوؤں کے درمیان تعلق کی بنا نماز ہے جس نے اسے چھوڑ دیا وہ کافر قرار پائے گا اور اس سے ہمارا تعلق ٹوٹ جائے گا۔

آج دین سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جولوگ نماز نہیں پڑھتے، جو اذان کی آواز سن کرٹس سے مس نہیں ہوتے، جن کو یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ مؤذن کس کو بلا رہا ہے اور کس کام کے لیے بلا رہا ہے، وہ مسلمان سمجھے جاتے ہیں، اور یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ نماز کی کوئی اہمیت اسلام میں نہیں ہے، اس کے بغیر بھی آدمی مسلمان ہوسکتا ہے بلکہ مسلمانوں کا امام اور ملت کا قائد بھی ہوسکتا ہے۔مگر جب اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ تھا، اس وقت یہ حال نہ تھا۔مستند روایت ہے کہ كَانَ اَصْحَابُ النَّبِيِّ لَا يَرَوْنَ شَيْئًا مِنَ الْاَعْمَالِ تَرْكُهٗ كُفْرًا غَيْرَ الصَّلٰوةِ۔ (ترمذی) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں یہ بات متفق علیہ تھی کہ اسلامی اعمال میں سے صرف نماز ہی وہ عمل ہے جس کو چھوڑ دینا کفر ہے۔

تعمیرِ سیرت:

نماز کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسان کی سیرت کو اس خاص ڈھنگ پر تیار کرتی ہے جو اسلامی زندگی بسر کرنے، یا بالفاظِ دیگر زندگی کو خدا کی عبادت بنا دینے کے لیے ضروری ہے۔

دنیا میں ہر جگہ آپ دیکھتے ہیں کہ جیسا کام کسی جماعت کو کرنا ہوتا ہے، جیسے مقاصد اس کے پیشِ نظر ہوتے ہیں انھی کے لحاظ سے سیرت بنانے کے لیے نظامِ تربیت وضع کیا جاتا ہے۔مثلاً سلطنتوں کی سول سروس کا مقصد وفاداری کے ساتھ ملک کا انتظام کرنا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوتا ہے، اس لیے سول سروس کی ٹریننگ میں تمام تر زور حکومتِ مقتدرہ کی وفاداری اور تنظیمِ مملکت (administration) کی صلاحیتیں پیدا کرنے ہی پر صرف کیا جاتا ہے۔ تقویٰ اور طہارت کا وہاں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ پرائیویٹ زندگی خواہ کتنی ہی گندی کیوں نہ ہو، ایک شخص اس کے باوجود سول سروس میں داخل ہوسکتا ہے اور ترقی کر سکتا ہے۔ کیونکہ حکومت میں راستی اور حق کے اصولوں پر پابندی کرنا اور اخلاق کو سیاست کی بنیاد بنانا وہاں سرے سے پیشِ نظر ہی نہیں ہے۔ اسی طرح فوجوں کی تنظیم کا مقصد جنگ کی قابلیت بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ اس لیے سپاہیوں کی تربیت محض اسی نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے کہ انھیں مار دھاڑ کے لیے تیار ہونا ہے۔ انھیں پریڈ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ منظم صورت میں کام کر سکیں۔ انھیں اسلحے کا استعمال سکھایا جاتا ہے تاکہ کشت و خون کے فن میں ماہر ہو جائیں۔ ان کو اطاعتِ امر کا خوگر بنایا جاتا ہے تاکہ حکومت جہاں اور جس غرض کے لیے بھی ان کے دست و بازو سے کام لینا چاہے وہاں وہ بے تامل کام کریں۔ اس کے ماسوا کوئی بلند تر اخلاقی مقصد چونکہ پیش نظر نہیں ہوتا اس لیے فوجیوں کی سیرت میں تقویٰ پیدا کرنے کا خیال تک کسی کو نہیں آتا۔ سپاہی اگر ڈسپلن کے پابند ہیں تو حکومت کے مقصد کے لیے بس یہی کافی ہے۔ اس کے بعد کچھ پروا نہیں اگر وہ زانی، شرابی، جھوٹے، بددیانت اور ظالم ہوں۔

اسلام اس کے برعکس ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتا ہے جس کا مقصدِ اوّل نیکی کو قائم کرنا اور بدی کو مٹانا ہے، جس کو سیاست، عدالت، تجارت، صنعت، صلح و جنگ، بین الاقوامی تعلقات، غرض تمدن کے ہر شعبے میں اخلاق کے مستقل اصولوں کی پابندی کرنی ہے، جسے زمین پر خدا کے قانون کو نافذ کرنا ہے۔ اس لیے وہ اپنے اہل کار، سپاہی اور افسر ایک دوسرے نظامِ تربیت کے تحت تیار کرتا ہے تاکہ ان کے اندر وہ سیرت پیدا ہو جو اس خاص نوعیت کی خدمت سے مناسبت رکھتی ہے۔ اس سیرت کی بنیاد اسلام کے ایمانیات ہیں۔ خدا کا خوف، اس کی محبت، اس کا عشق، اس کی خوشنودی کو مقصدِ زندگی قرار دینا، اس کو حاکمِ اصلی سمجھنا، اس کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ خیال کرنا، اور یہ جاننا کہ ایک روز وہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے، یہی وہ اساسی تصورات ہیں جن پر اسلامی سیرت کی بنا قائم ہوتی ہے۔ مسلمان اسلام کے طریقے پر ایک قدم نہیں چل سکتا جب تک کہ اسے یہ یقین نہ ہو کہ خدا ہر وقت ہر جگہ ہر حال میں اسے دیکھ رہا ہے، اس کی ہر حرکت سے باخبر ہے، اندھیرے میں بھی اس کو دیکھتا ہے، تنہائی میں بھی اس کے ساتھ ہے۔ اس کے دل میں جو نیت چھپی ہوئی ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے، اس کے دماغ میں جو خیالات اور ارادے پیدا ہوتے ہیں ان سے بھی وہ ناواقف نہیں، تمام دنیا سے چھپ جانا ممکن ہے مگر خدا سے چھپنا غیر ممکن، تمام دنیا کی سزاؤں سے آدمی بچ سکتا ہے مگر خدا کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ دنیا میں نیکی ضائع ہوسکتی ہے بلکہ نیکی کا بدلہ بدی کی صورت میں مل سکتا ہے مگر خدا کے ہاں یہ ممکن نہیں، دنیا کی نعمتیں محدود ہیں مگر خدا کی نعمتیں بے حد و حساب ہیں دنیا کا نفع و نقصان فانی و آنی ہے مگر خدا کے ہاں جو نفع یا نقصان ہے وہ پائیدار ہے۔ یہی یقین آدمی کو خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کے لیے تیار کرتا ہے۔ اسی اعتقاد کے زور سے وہ حلال و حرام کی ان حدود کا لحاظ رکھنے پر آمادہ ہوتا ہے جو خدا نے زندگی کے معاملات میں قائم کی ہیں۔ یہی چیز اسے خواہشات کی بندگی سے، ناجائز منفعتوں اور لذتوں کے لالچ سے اور بداخلاقی کے مفید مطلب ذرائع اختیار کرنے سے روکتی ہے۔ اسی عقیدے میں یہ طاقت ہے کہ آدمی کو عدل، صداقت، حق شناسی و حق پرستی اور مکارمِ اخلاق کی صراطِ مستقیم پر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ثابت قدم رکھے، اور اسے دنیا کی اصلاح کے اس کٹھن کام پر اُٹھنے کے لیے آمادہ کرے جس کی دشواریوں اور ذمہ داریوں کا تصور بھی کوئی غیر مومن انسان برداشت نہیں کر سکتا۔

نماز وہ چیز ہے جو ان تصورات کو بار بار تازہ کرتی ہیں اور ذہن میں گہری جڑوں کے ساتھ بٹھاتی رہتی ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو کہ نماز کا ارادہ کرنے کے ساتھ ہی اسلامی سیرت کی تعمیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے، اور پھر ایک ایک حرکت، ایک ایک فعل، اور ایک ایک قول جو نماز سے متعلق ہے، کچھ اسی طور پر رکھا گیا ہے کہ اس سے خود بخود آدمی کی سیرت اسلام کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔

دیکھیے! نماز کا ارادہ کرتے ہی سب سے پہلے آپ اپنا جائزہ لیتے ہیں کہ ناپاک تو نہیں ہوں؟ کپڑے تو نجس نہیں ہیں؟ وضو ہے یا نہیں؟ غور کیجیے یہ خیال آپ کو کیوں آتا ہے؟ اگر آپ نجس حالت میں نماز کے لیے کھڑے ہوں، یا بے وضو کھڑے ہو جائیں تو کون آپ کو پکڑ سکتا ہے؟ کس کو آپ کے حال کی خبر ہو سکتی ہے؟ پھر آپ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ کو خدا کا خوف ہے، اس بات کا یقین ہے کہ اس سے کوئی راز نہیں چھپ سکتا اور اس پر ایمان ہے کہ آخرت میں اس فعل کا جواب دینا پڑے گا۔ یہی چیز آپ سے طہارت اور وضو کے ان تمام قواعد وضوابط کی پابندی کراتی ہے جو نماز کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، ورنہ کوئی دنیوی طاقت ایسی موجود نہیں ہے جو آپ سے ان کی پابندی کرانے والی ہو۔

اس کے بعد آپ نماز پڑھنا شروع کرتے ہیں۔ یہاں آپ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قیام وقعود اور رکوع وسجود کی حالتوں میں قرآن کی آیات یا دعائیں یا تسبیحیں جس جس طرح پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح ان کو پڑھیں، آخر یہ پابندی آپ کیوں کرتے ہیں؟ یہ ساری چیزیں تو آہستہ پڑھی جاتی ہیں۔ اگر آپ انھیں نہ پڑھیں یا ان کی جگہ کچھ اور پڑھ دیں، یا ان میں اپنی طرف سے کچھ الٹی سیدھی باتیں ملا دیں تو کسی کو بھی آپ کے اس فعل کی خبر نہیں ہو سکتی۔ پھر بتائیے کس کا خوف، کس کے واقفِ اسرار ہونے کا یقین اور کس کی جزا وسزا پر ایمان آپ کو ٹھیک ٹھیک نماز ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے؟

نماز کے اوقات آپ پر مختلف حالتوں میں آتے ہیں۔ کبھی آپ جنگل میں ہوتے ہیں، کبھی رات کے اندھیرے میں، کبھی گھر کی تنہائی میں، کبھی اپنی دلچسپ تفریحوں میں مشغول ہوتے ہیں، اور کبھی اپنے کاروبار میں منہمک، کبھی سردی کی شدت لحاف سے سر نکالنے کی اجازت تک نہیں دیتی اور کبھی چلچلاتی دھوپ گھر سے قدم نکالتے ہی بھون ڈالنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ غرض اسی طرح بے شمار مختلف حالتیں آپ پر رات دن میں آتی رہتی ہے۔ ان سب حالتوں میں کون سی طاقت آپ کو نماز کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے؟ اگر وہ خدا پر ایمان، اس کے سمیع علیم ہونے کا یقین، اس کی ناراضی کا خوف اور اس کی رضا کی طلب نہیں تو اور کیا ہے؟ ضروری نہیں کہ یہ سب تصورات آپ کے شعور جلی ہی میں تازہ رہیں۔ سیرت دراصل ان تصورات سے بنتی ہے جو شعور خفی میں پیوستہ ہوتے ہیں۔ شعور کی گہرائی میں جو تصور اُتر جاتا ہے وہی حقیقت میں مستحکم ہوتا ہے اور اسی سے مستقل خصائل اور اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اب ذرا ان چیزوں پر نظر ڈالیے جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں۔ ان میں اول سے لے کر آخر تک ایک ایک لفظ ایسا ہے جو اسلام کے بنیادی تصورات اور اس کے اسپرٹ سے لبریز ہے۔ ان مضامین کو بار بار پڑھنے سے وہ تمام ایمانیات بار بار تازہ اور بار بار ذہن نشین ہوتے رہتے ہیں جن پر اسلامی سیرت کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔

سب سے پہلے اذان کو لیجیے۔ روزانہ پانچ وقت آپ کو کن الفاظ میں نماز کی اطلاع دی جاتی ہے؟

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ. خدا سب سے بڑا ہے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کوئی اس لائق نہیں کہ اس کی بندگی کی جائے۔

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰه. میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ. آؤ نماز کے لیے۔

حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ. آؤ اس کام کے لیے جس میں فلاح اور بہبودگی ہے۔

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ. اللہ سب سے بڑا ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّااللّٰه. اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

دیکھو! یہ کیسی زبردست پکار ہے۔ ہر روز پانچ مرتبہ یہ آواز کس طرح تمھیں یاد دلاتی ہے کہ زمین میں جتنے خدائی کے دعوے دار پھر رہے ہیں، یہ سب جھوٹے ہیں۔ زمین و آسمان میں صرف ایک ہی ہستی ہے جس کے لیے بڑائی ہے۔ اور وہی عبادت کے لائق ہے، آؤ اس کی عبادت کرو، اسی کی عبادت میں تمھارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔ کون ہے جو اس آواز کو سن کر ہل نہ جائے گا؟ کیوں کر ممکن ہے کہ جس کے دل میں ایمان ہو، وہ اتنی بڑی بات کی گواہی اور ایسی زبردست پکار کو سن کر اپنی جگہ بیٹھا رہ جائے اور اپنے مالک کے آگے سر جھکانے کے لیے دوڑ نہ پڑے۔

اس کے بعد تم نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہو۔ منہ قبلے کے سامنے ہے۔ پاک صاف ہو کر بادشاہ عالم کے دربار میں حاضر ہو۔ سب سے پہلے تمھاری زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ (الانعام ۶:۷۹) میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اس ذات کی طرف پھیر دیا جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خدائی میں کسی کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اس دوٹوک بات کا اقرار کر کے اس کے بعد تم کانوں تک ہاتھوں کو اٹھاتے ہو، گویا دنیا و مافیہا سے دست بردار ہو رہے ہو[1]

۱- ہاتھ اٹھانا دراصل دو چیزوں کی علامت ہے۔ ایک تسلیم (surrender) یعنی مزاحمت ترک کر کے اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ دوسرے دست برداری، یعنی جن چیزوں سے آدمی اب تک تعلق رکھتا تھا، ان سے اس نے ہاتھ اٹھالیا۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہو، پھر اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیتے ہو[1]، گویا اب بالکل اپنے بادشاہ کے سامنے مؤدب دست بستہ کھڑے ہو۔ تم کیا عرض و معروض کرتے ہو؟

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ۔ پاک ہے تو اے خدا۔ تعریف وستایش ہے تیرے لیے[2]۔ برکت والا ہے تیرا نام۔ سب سے بلند و بالا ہے تیری بزرگی۔ اور کوئی معبود نہیں تیرے سوا۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ خدا کی پناہ مانگتا ہوں میں شیطان مردود کی دراندازی و شرارت سے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ تعریف خدا کے لیے جو سارے جہان والوں کا رب ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝ نہایت رحمت والا اور بڑا مہربان ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۝ روز جزا کا حاکم ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۝ مالک! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۝ ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۝ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے فضل وانعام فرمایا ہے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۝ جن سے تو ناراض نہیں ہے اور جو راہ راست سے بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔

اٰمِيْن۔ خدایا! ایسا ہی ہو، مالک ہماری اس دعا کو قبول کر۔

اس کے بعد تم قرآن کی کچھ آیتیں پڑھتے ہو جن میں سے ہر ایک میں اسلام کے اساسی اصول، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی عملی ہدایات بیان کی گئی ہیں۔ اور اس راہ راست کے نشانات دکھائے گئے ہیں جس کی طرف رہنمائی کی درخواست ابھی اس سے پہلے تم نے کی ہے۔ مثلاً:

وَالْعَصْرِ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ۝ زمانے کی قسم (یعنی زمانہ اس بات پر گواہ ہے) کہ آدمی نقصان میں ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۝ (العصر ۱۰۳:۱-۳) اور جو ایک دوسرے کو حق پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی

۱- کسی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا انتہائی ادب واحترام اور غلامانہ نیازمندی کا اظہار ہے۔ اسی لیے قدیم ترین زمانے سے بادشاہوں نے اپنے درباری آداب میں اسے شامل کیا ہے۔ لیکن اسلام اسے صرف دربار الٰہی کی حاضری کے لیے خاص کرتا ہے۔ (مؤلف)

۲- 'پاک ہے' یعنی عیب، نقص، کمزوری اور غلطی سے پاک ہے۔ اور 'تعریف وستائش ہے تیرے لیے' یعنی تمام کمالات اور تمام خوبیوں سے تو متصف ہے۔ (مؤلف)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تلقین کرتے رہے۔

ان مختصر جملوں میں انسان کو بتایا گیا ہے کہ تو بربادی و نامرادی سے بچ نہیں سکتا جب تک کہ خدا پرستی و نیک عملی اختیار نہ کرے، اور صرف انفرادی نیکی ہی کافی نہیں ہے، بلکہ تیری فلاح کے لیے ناگزیر ہے کہ تیری سوسائٹی ایسی ہو جس میں حق پرستی کی روح کارفرما ہو۔ تیری اپنی تاریخ اس حقیقت پر گواہی دے رہی ہے۔ یا مثلاً:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ؕ تو نے دیکھا اُس شخص کو جو روزِ جزا کو نہیں مانتا (وہ کیسا آدمی ہوتا ہے؟)۔

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۙ ایسا ہی آدمی یتیم کو دھتکارتا ہے۔

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ؕ اور مسکین کو کھانا کھلانا تو درکنار دوسروں سے بھی یہ کہنا پسند نہیں کرتا کہ غریب کو کھانا کھلاؤ۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۙ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ○ (الماعون ۱۰۷:۱تا۷) پھر افسوس ہے ان نمازیوں پر جو (آخرت کو نہ ماننے ہی کی وجہ سے) نماز سے غفلت کرتے ہیں، اور پڑھتے بھی ہیں تو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے اور ان کے دل ایسے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ذرا ذرا سی چیزیں حاجت مندوں کو دیتے ہوئے بھی ان کا دل دکھتا ہے۔

ان چھوٹے چھوٹے پراثر فقروں میں یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ آخرت کا اعتقاد آدمی کی اخلاقی زندگی میں کیا اثر رکھتا ہے، اور اس عقیدے پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے آدمی کا اجتماعی برتاؤ اور انفرادی رویہ کس طرح خلوص اور ہمدردی سے خالی ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ افسوس ہے ہر اس شخص کے حال پر جو دوسروں کی عیب چینی کرتا ہے اور آوازیں کستا پھرتا ہے۔

الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ روپیہ جمع کرتا اور گن گن کر رکھتا ہے۔

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کا ساتھ دے گا۔

كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۖ ہرگز نہیں! ایک دن آنے والا ہے جب وہ یقیناً حطمہ میں ڈالا جائے گا۔

وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ اور تجھے کیا خبر حطمہ کیا چیز ہے۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ، جس کی لپٹیں دلوں پر چھا جائیں گی۔

اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ○ (الہمزہ ۱۰۴:۱-۹) وہ اونچے اونچے ستون جیسے شعلوں کی صورت میں ان کو گھیر لے گی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ محض دو تین نمونے ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر نماز میں قرآن کا کوئی نہ کوئی حصہ پڑھنا کس لیے لازم کیا گیا ہے۔ اس سے غرض یہی ہے کہ روزانہ کئی کئی وقت خدا کے احکام، اس کی ہدایات اور اس کی تعلیمات بار بار آدمی کو یاد دلائی جاتی رہیں۔ یہ دنیا، یہ دارالعمل جس میں کام کرنے کے لیے انسان بھیجا گیا ہے، اسی طرح درست رہ سکتی ہے کہ اس کے اندر کام کرنے کے دوران میں آدمی کو تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد الگ بلایا جاتا رہے تاکہ جہاں جس قانون اور جس ہدایت نامے (instrument of instructions) کے مطابق اسے کام کرنا ہے اس کی دفعات اس کی یاد میں تازہ ہوتی رہیں۔

ان ہدایتوں کے پڑھنے کے بعد تم اللہ اکبر کہتے ہوئے رکوع میں جاتے ہو۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے بادشاہ کے آگے جھکتے[1] ہو اور بار بار کہتے ہو:

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ۔ پاک ہے میرا رب جو بڑا بزرگ ہے۔

پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہو اور کہتے ہو:

سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ۔ اللہ نے سن لی اس شخص کی بات جس نے اس کی تعریف بیان کی۔

پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے میں گر[2] جاتے ہو اور بار بار کہتے ہو:

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی۔ پاک ہے میرا مالک جو سب سے بالا و برتر ہے۔

پھر اللہ اکبر کہہ کر سر اٹھاتے ہو، ادب سے بیٹھ جاتے ہو اور یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہو:

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّيِّبَاتُ۔ ہماری سلامیاں، ہماری نمازیں اور ہمارے تمام اچھے کام اللہ کے لیے ہیں۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ۔ سلام ہو آپ پر اے نبیؐ! اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں آپ پر نازل ہوں۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ۔ سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے سب نیک بندوں پر۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

یہ شہادت دیتے وقت سیدھے ہاتھ کی انگلی اٹھائی جاتی ہے، کیونکہ یہ نماز میں مسلمان کے عقیدے کا اعلان (declaration) ہے اور اس کو زبان سے ادا کرتے وقت خاص طور پر توجہ اور زور دینے کی ضرورت ہے۔

۱- یہ رکوع اس تسلیم و سپردگی کی مزید ترقی ہے جس کی ابتدا نماز کے شروع میں ہاتھ اٹھا کر کی گئی تھی۔ (مؤلف)

۲- یہ اسی تسلیم و سپردگی کی تکمیل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بندے نے اپنا وہ سر جس میں خودی و خودسری اور انانیت و خودپرستی رہتی ہے، خدا کے آگے زمین پر ٹیک دیا۔ اب اس سر میں خود مختاری کے سودے کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہا۔ بندہ اب پوری طرح اپنے خدا کا تابع فرمان ہے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ خدایا! رحمت فرما محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر جس طرح تو نے رحمت فرمائی ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر، تو قابلِ تعریف اور صاحبِ عظمت ہے۔

اَللّٰهُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ خدایا! برکت عطا فرما محمدؐ اور آلِ محمدؐ کو جس طرح تو نے برکت دی ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ کو، تو قابلِ تعریف اور صاحبِ عظمت ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ۔ خدایا! تیری پناہ مانگتا ہوں دوزخ کے عذاب سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں دجال کے فتنے سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں زندگی اور موت کے فتنے سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں بُرے اعمال سے، اور دوسروں کے حقوق کی ذمہ داری سے۔

یہ ہیں وہ عبارتیں جو رات دن کی پانچوں نمازوں میں بہ تکرار دہرائی جاتی ہیں مگر رات کو سونے سے پہلے سب سے آخری نماز کی سب سے آخری رکعت میں ایک اور دعا پڑھی جاتی ہے جس کا نام دعائے قنوت ہے۔ یہ ایک عظیم الشان اقرار نامہ ہے جو سکون کے لمحوں میں بندہ اپنے خدا کے سامنے پیش کرتا ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنُؤْمِنُ بِکَ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْکَ وَنُثْنِیْ عَلَیْکَ الْخَیْرَ۔ خدایا! ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ تجھ سے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ تجھ پر ایمان لاتے ہیں، تیرے ہی اوپر بھروسا کرتے ہیں۔ اور تیری بہترین تعریف کرتے ہیں۔

وَنَشْکُرُکَ وَلَا نَکْفُرُکَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ۔ ہم تیرا شکر ادا کریں گے، ناشکری نہیں کریں گے۔ جو تیری نافرمانی کرے گا، ہم اسے چھوڑ دیں گے اور اس سے تعلق توڑ دیں گے۔

اَللّٰهُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ وَاِلَیْکَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ خدایا! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں، تیرے ہی لیے نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے ہیں۔ ہماری ساری کوششوں اور ساری دوڑ دھوپ کا مقصود تو ہے۔

وَنَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَنَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ۔ ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں کہ یقیناً تیرا عذاب کفرانِ نعمت کرنے والوں کو آ لے گا۔

یہ عبارتیں کسی شرح و بیان کی محتاج نہیں ہیں۔ ہر شخص ان کے اندر خود دیکھ سکتا ہے کہ اسلام اپنی سول سروس اور اپنی فوج اور اپنی سوسائٹی کے ہر فرد کو کن جذبات اور کن ارادوں اور کن نیتوں کے ساتھ تربیت کرتا ہے، کیا چیزیں ان کے دل میں بٹھاتا ہے۔ اور کس قسم کی خصلتیں ان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ محض پریڈ سے تیار کی ہوئی فوج اسلام کے کسی کام کی نہیں۔ محض انتظامی قابلیت رکھنے والی سروس کی بھی اسے حاجت نہیں۔ اُسے تو ان سپاہیوں اور ان کارکنوں کی حاجت ہے جن کے اندر باضابطگی کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ساتھ تقویٰ بھی ہو، جو سر کاٹنے اور سر کٹوانے کے ساتھ دل بدلنے اور اخلاق کو ڈھالنے کی طاقت بھی رکھتے ہوں، جو صرف زمین کا انتظام کرنے والے ہی نہ ہوں بلکہ اہل زمین کی اصلاح کرنے والے بھی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے آپ دیکھیے تو آپ کا دل گواہی دے گا کہ اسلامی مقاصد کے لیے نماز کے سوا یا نماز سے بہتر کوئی دوسرا نظام تربیت ممکن نہیں ہے۔ جو شخص اس نظام کے تحت ٹھیک ٹھیک تربیت پائے، اسی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ امانتوں اور ذمہ داریوں اور حقوق اللہ و حقوق العباد کا جو بار دنیوی زندگی میں اس پر ڈالا جائے گا اس کو وہ خدا پرستی کے ساتھ سنبھالے گا اور قعر دریا میں رہ کر بھی کبھی دامن تر نہ ہونے دے گا۔

اسی بنا پر قرآن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ ۔[العنکبوت ۲۹:۴۵] یقیناً نماز بے حیائی اور بدی سے روکتی ہے۔

اسی بنا پر قدیم زمانے سے نماز اسلامی تحریک کا لازمی جز رہی ہے جس قدر انبیاؑ خدا کی طرف سے آئے ہیں ان سب کی شریعت میں نماز اولین رکنِ اسلام تھی۔ کیونکہ اسلام کی تحریک میں جب کبھی زوال آیا، نماز کا نظامِ تربیت ٹوٹ جانے کی وجہ سے ہی آیا فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ [مریم ۱۹:۵۹] پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشاتِ نفس کے پیچھے پڑ گئے، سو عنقریب وہ کج راہی میں مبتلا ہوں گے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اسلام کے طریقے پر چلنے کے لیے اسلامی سیرت ضروری ہے اور اسلامی سیرت نماز کے نظام تربیت ہی سے بنتی ہے۔ جب یہ نظام ٹوٹ جائے گا تو سیرتیں بگڑ جائیں گی، اور اس کا لازمی نتیجہ زوال و انحطاط (degeneration) ہے۔

ضبطِ نفس:

تعمیر سیرت کے ساتھ ساتھ نماز انسان میں ضبطِ نفس (control) کی طاقت بھی پیدا کرتی ہے جس کے بغیر سیرت کا مدعا حاصل نہیں ہوسکتا۔ تعمیرِ سیرت کا کام بجائے خود اتنا ہے کہ یہ انسانی خودی (human ego) کو تربیت دے کر مہذب بنا دیتی ہے۔ لیکن اس تربیت یافتہ خودی کو ان جسمانی اور نفسانی قوتوں پر، جو اس کے لیے آلے کی حیثیت رکھتی ہیں' عملاً پورا قابو حاصل نہ ہو تو اس کی تربیت و تہذیب کا مقصود، یعنی صحیح برتاؤ اور ٹھیک چلن (right conduct) حاصل نہیں ہوسکتا۔ ایک مثال کے پیرا یے میں اس کو یوں سمجھیے کہ انسان ایک موٹر اور ایک ڈرائیور کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ مجموعہ ٹھیک کام اسی حالت میں کرسکتا ہے جب کہ موٹر کے تمام آلات اور اس کی تمام طاقتیں ڈرائیور کے قابو میں ہوں، اور ڈرائیور مہذب، تربیت یافتہ اور واقفِ راہ ہو۔ اگر آپ نے ڈرائیور کو تربیت دے کر تیار کر دیا، مگر اسٹیرنگ، بریک اور ایکسلریٹر پوری طرح اس کے قابو میں نہ آئے، یا آئے تو سہی مگر ڈھیلے رہے تو اس صورت میں ڈرائیور موٹر کو نہ چلائے گا بلکہ موٹر ڈرائیور کو چلائے گی، اور چونکہ موٹر صرف چلنا جانتی ہے، بینائی، تمیز اور راستے کی واقفیت نہیں رکھتی، اس لیے جب وہ ڈرائیور کو لے کر چلے گی تو اوندھے سیدھے راستوں پر جدھر چاہے گی اسے کھینچے کھینچے پھرے گی۔ اس مثال کے مطابق انسان کی جسمانی طاقتیں اور اس کی نفسانی خواہشات اور ذہنی قوتیں موٹر کے حکم میں ہیں، اور اس کی خودی ڈرائیور کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ موٹر ویسی ہی چالاک ہے جیسی لوہے والی موٹر ہوتی ہے، مگر وہ بے جان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے اور یہ جان دار۔ یہ خواہشات، جذبات اور داعیات بھی رکھتی ہے اور ہر وقت کوشش کرتی رہتی ہے کہ ڈرائیور اس کو نہ چلائے، یہ ڈرائیور کو چلائے۔ تمام انبیا علیہم السلام کی تعلیم کا مقصود ڈرائیور کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ وہ اس موٹر کو اپنے اوپر سوار نہ ہونے دے بلکہ خود اس پر سوار ہو اور اسے اپنے اختیار سے چلا کر اس سیدھی شاہراہ پر سفر کرے جو منزل مقصود کی طرف جاتی ہے۔ اس غرض کے لیے صرف یہی بات کافی نہیں ہے کہ ڈرائیور کو راستے کا علم، موٹر کا طریقِ استعمال اور مقصدِ استعمال اور فی الجملہ ڈرائیوری کے آداب سکھا کر ایک مہذب اور تربیت یافتہ ڈرائیور بنا دیا جائے، بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ اسٹیرنگ، بریک اور ایکسلریٹر ہر وقت مضبوطی کے ساتھ کسے ہوئے رکھے جائیں اور ڈرائیور کی گرفت ان پر ڈھیلی نہ ہونے پائے، کیونکہ یہ منہ زور موٹر ہر وقت بے راہ روی کے لیے زور لگا رہی ہے۔

نماز میں دعاؤں اور تسبیحوں کے ساتھ اوقات کی پابندی، طہارت وغیرہ کی شرائط اور جسمانی حرکات کا جوڑ اسی لیے لگایا گیا ہے کہ ڈرائیور اپنی موٹر پر پوری طرح قابو یافتہ رہے اور اسے اپنے ارادے کے تحت چلانے میں مشاق ہو جائے۔ اس طریقے سے موٹر کی منہ زوری روزانہ پانچ وقت توڑی جاتی ہے، بریک کسے جاتے ہیں، ایکسلریٹر اور اسٹیرنگ مضبوط کیے جاتے ہیں، اور ڈرائیور کی گرفت مستحکم کی جاتی ہے، صبح کا وقت ہے، نیند مزے سے آ رہی ہے، آرام طلب نفس کہتا ہے پڑے رہو، اب کہاں اٹھ کر جاؤ گے۔ نماز کہتی ہے کہ وقت آ چکا ہے، سیدھی طرح اٹھو، غسل کی حاجت ہے تو نہاؤ، ورنہ وضو کرو، جاڑے کا موسم ہے تو ہوا کرے، پانی گرم نہیں ہے، نہ سہی، ٹھنڈے پانی سے ہی طہارت حاصل کرو، اور چلو مسجد کی طرف۔ ان دو متضاد مطالبوں میں سے اگر آپ نے نفس کے مطالبے کو پورا کر دیا تو موٹر آپ پر سوار ہو گئی۔ اگر نماز کے مطالبے کو پورا کیا تو آپ موٹر پر سوار ہو گئے۔ اسی طرح ظہر، عصر، مغرب، عشاء، ہر وقت نفس کسی نہ کسی مشغولیت، فائدے، نقصان، لطف، لذت، مشکلات وغیرہ کے بہانے نکالتا ہے، موقع ڈھونڈتا رہتا ہے کہ ذرا آپ کے اندر کمزوری پیدا ہو اور یہ آپ پر سوار ہو جائے مگر نماز ہر موقع پر آپ کے لیے تازیانہ بن کر آتی ہے، آپ کی اونگھتی ہوئی قوت ارادی کو جگاتی ہے، اور آپ سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی موٹر کو اپنے حکم کا تابع بناؤ، اس کے غلام بن کر نہ رہ جاؤ۔ یہ معرکہ روز پیش آتا ہے۔ مختلف اوقات اور مختلف حالتوں اور مختلف صورتوں میں پیش آتا ہے کبھی سفر میں اور کبھی حضر میں، کبھی گرمی میں اور کبھی جاڑے میں۔ کبھی آرام کے وقت اور کبھی کاروبار کے وقت، کبھی تفریح کے موقع پر اور کبھی رنج و غم اور مصیبت کے موقع پر۔ ان بے شمار مختلف النوع حالتوں میں نفس کی طلب اور نماز کی پکار کے مابین کشمکش ہوتی ہے، اور آپ آزمایش میں ڈالے جاتے ہیں۔ نفس کی بات آپ نے مانی تو شکست کھا گئے۔ خادم آپ کا آقا بن گیا۔ اندھی، جاہل موٹر کے قابو میں آپ نے اپنے آپ کو دے دیا۔ اب یہ ٹیڑھے بھینگے راستوں پر آپ کو لیے لیے پھرے گی اور آپ بے بسی کے عالم میں اس کے ساتھ ساتھ پھرتے رہیں گے۔ بخلاف اس کے اگر آپ نماز کا مطالبہ پورا کرتے رہے تو آپ اس موٹر کا باغیانہ زور توڑ دیں گے۔ اس پر حکمران بن جائیں گے اور آپ میں یہ طاقت پیدا ہو جائے گی کہ اپنے علم و اذعان اور اپنے ارادے کے مطابق اس کے کل پرزوں اور اس کی قوتوں سے کام لیں۔

اسی بنا پر قرآن نے نماز کے ضائع کرنے کا فوری اور لازمی نتیجہ یہ بیان کیا ہے کہ آدمی شہوات اور خواہشات کا تابع بن

www.kitabosunnat.com
"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

جاتا ہے اور سیدھے راستے سے ہٹ کر ٹیڑھے راستوں میں بھٹکتا چلا جاتا ہے:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَٱتَّبَعُواْ ٱلشَّهَوَٰتِۖ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا (مریم ۵۹:۱۹) پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات کے پیچھے پڑ گئے۔ لہٰذا عنقریب وہ کج راہی میں مبتلا ہوں گے۔

خلاصۂ بحث: یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ نماز کے فوائد و منافع کا صرف ایک پہلو ہے۔ یعنی یہ کہ نماز افراد کس طرح تیار کرتی ہے۔ اب دوسرے پہلو کی طرف توجہ کرنے سے پہلے فرد کی تیاری کے اس پروگرام پر مجموعی نظر ڈال لیجیے۔ اس پروگرام کے پانچ حصے ہیں:

۱- آدمی کے ذہن میں اس کیفیت کے ادراک کو تازہ رکھنا کہ وہ دنیا میں ایک خود مختار وجود نہیں ہے بلکہ رب العالمین کا بندہ ہے اور یہاں اسی حیثیت سے اس کو کام کرنا ہے۔

۲- بندے کی حیثیت سے اس کو فرض شناس بنانا اور اس میں ادائے فرض کی عادت پیدا کرنا۔

۳- فرض شناس اور نافرض شناس میں تمیز کرنا اور نافرض شناس افراد کو چھانٹ کر الگ کر دینا۔

۴- خیالات کا ایک پورا نظام، ایک پوری آئیڈیالوجی آدمی کے ذہن میں اتار دینا اور اس کو ایسا مستحکم کرنا کہ ایک پختہ سیرت بن جائے۔

۵- آدمی میں یہ قوت پیدا کرنا کہ اپنے عقیدے اور اپنے علم و بصیرت کے مطابق جس طرزِ عمل کو صحیح سمجھتا ہو اس پر عمل کر سکے، اور اپنے جسم و نفس کی تمام طاقتوں سے اس راہ میں کام لے سکے۔ اس کے کیرکٹر میں اس قسم کا ڈھیلا پن نہ رہ جائے کہ صحیح تو سمجھتا ہو ایک طریقے کو، مگر اپنے نفس کی خواہش سے مجبور ہو کر چلے دوسرے طریقے پر۔

اسلام جو سوسائٹی بناتا ہے اس کے ایک ایک فرد کو وہ اس طرح نماز کے ذریعے سے تیار کرتا ہے۔ دس برس کی عمر کے بعد سوسائٹی کے ہر لڑکے اور لڑکی پر نماز فرض کر دی گئی ہے[۱]۔ اور یہ فرض کسی حال میں اس سے ساقط نہیں ہوتا، اِلّا یہ کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو یا عورت حیض و نفاس کی حالت میں ہو۔ بیماری میں، سفر میں، جنگ کے معرکے تک میں، یہ فرض اسے ادا کرنا پڑے گا۔ اُٹھ نہ سکے تو بیٹھ کر پڑھے؛ بیٹھنا ممکن نہ ہو، لیٹ کر پڑھے؛ ہاتھ پاؤں حرکت نہ کر سکتے ہوں، اشارے سے پڑھے؛ پانی نہ ملتا ہو، مٹی سے تیمم کر کے پڑھے؛ قبلے کی سمت نہ معلوم ہو، جدھر گمان ہو اسی طرف منہ کر کے پڑھے۔ غرض کوئی عذر اس معاملے میں مسموع نہیں ہے۔ نماز کا وقت جب آ جائے تو ہر حال میں مسلمان مامور ہے کہ اس فرض کو ادا کرے۔

بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے اپنے اجزائے ترکیبی، یعنی اپنے افراد کو فرداً فرداً تیار کرنے کا ایسا مکمل انتظام کیا ہو۔ دنیا کے اجتماعی نظامات میں جماعت (community) کی ہیئتِ ترکیبی بنانے اور افراد کو بیرونی بندشوں سے جکڑنے ہی پر تمام زور دیا جاتا ہے، مگر جماعت کے ایک ایک جز کو اندر سے تیار کرنے اور

۱- نماز کی فرضیت کی حد دس سال نہیں بلکہ بلوغت ہے۔ مولانا مرحوم نے شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو فرضیت پر محمول کیا ہے کہ جب بچہ دس سال کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو اس کی پٹائی کرو، مگر دراصل اس ہدایت کا مقصد تادیب ہے نہ کہ فرضیت۔ (مرتبین)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جماعتی اصولوں کے مطابق بنانے کی کوشش کم کی جاتی ہے۔ حالانکہ جماعت کی حیثیت ایک دیوار کی سی ہے، جو اینٹوں سے بنتی ہے، ایک ایک اینٹ اگر مضبوط نہ ہو تو دیوار بحیثیتِ مجموعی کمزور ہوگی۔ اسی طرح افراد کی سیرت میں اگر کمزوری ہو، اگر ان کے خیالات جماعتی اصولوں کے مطابق نہ ہوں، اور اگر عملاً وہ جماعتی راہ کے خلاف چلنے کے لیے میلانات رکھتے ہوں تو محض بیرونی بندشیں جماعت کے نظام کو زیادہ عرصے تک قائم نہیں رکھ سکتیں۔ آخرکار بغاوت رونما ہوگی اور نظام ٹوٹ جائے گا۔

نماز اور تنظیمِ جماعت

اب ہمیں نماز کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ انفرادی سیرت تنہا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی جب تک کہ جماعت (community) میں بھی وہی سیرت موجود نہ ہو۔ فرد اپنے نصب العین (ideal) کو پا ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ لوگ، جن کے درمیان وہ زندگی بسر کر رہا ہے، اس نصب العین تک پہنچنے میں اس کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ فرد جن اصولوں پر ایمان رکھتا ہے، ان کے مطابق تنہا عمل کرنا اس کے لیے ناممکن ہے، تاوقتیکہ پوری جماعتی زندگی انھی اصولوں پر قائم نہ ہو جائے۔ آدمی دنیا میں اکیلا پیدا نہیں ہوا ہے، نہ اکیلا رہ کر کوئی کام کرسکتا ہے، اس کی ساری زندگی اپنے بھائی بندوں، دوستوں اور ہمسایوں، معاملہ داروں اور زندگی کے بے شمار ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں قسم کے تعلقات میں جکڑی ہوئی ہے۔ دنیا میں وہ خدا کی طرف سے مامور اسی پر کیا گیا ہے کہ اس اجتماعی زندگی اور ان اجتماعی تعلقات میں خدا کے قانون کو جاری کرے۔ اس قانون پر عمل کرنے اور اس کو نافذ کرنے کا نام ہی عبادت ہے۔ اگر آدمی ایسے لوگوں کے درمیان گھرا ہوا ہو جو اس قانون کو مانتے ہی نہ ہوں، یا سب کے سب اس کی نافرمانی پر تلے ہوئے ہوں، یا ان کے باہمی تعلقات اس طرح کے ہوں کہ اس کو جاری کرنے میں وہ ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو اکیلے آدمی کے لیے خود اپنی زندگی میں بھی اس پر عمل کرنا غیر ممکن ہے۔ کجا کہ وہ جماعتی زندگی میں اس کو نافذ کرسکے۔

علاوہ بریں مسلمان کے لیے یہ دنیا سخت جدوجہد، مقابلے اور کشمکش کا معرکۂ کارزار ہے۔ یہاں خدا سے بغاوت کرنے والوں کے بڑے بڑے جتھے بنے ہوئے ہیں جو انسانی زندگی میں خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کو پوری قوت کے ساتھ جاری کر رہے ہیں اور ان کے مقابلے میں مسلمان پر یہ ذمہ داری .... بھاری، کمر توڑنے والی ذمہ داری .... ڈالی گئی ہے کہ یہاں خدا کے قانون کو پھیلائے اور جاری کرے، انسان کے بنائے ہوئے قوانین جہاں جہاں چل رہے ہیں انھیں مٹائے اور ان کی جگہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے قانون کی حکومت قائم کرے۔ یہ زبردست خدمت جو مسلمان کے سپرد کی گئی ہے، اس کو باغی جتھوں کے مقابلے میں کوئی اکیلا مسلمان انجام نہیں دے سکتا۔ اگر کروڑوں مسلمان بھی دنیا میں موجود ہوں، مگر الگ الگ رہ کر انفرادی کوشش کریں، تب بھی وہ مخالفین کی منظم طاقت کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ سارے بندے جو خدا کی عبادت کرنا چاہتے ہیں، ایک جتھا بنیں، ایک دوسرے کے مددگار ہوں، ایک دوسرے کی پشت پناہ بن جائیں اور مل کر اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کریں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان دونوں اغراض کے لیے مسلمانوں کا صرف مل جانا ہی کافی نہیں، بلکہ یہ ملنا صحیح طریق پر ہونا چاہیے۔ صرف اجتماعی نظام پیدا ہو جانا کافی نہیں بلکہ ایک صالح اجتماعی نظام درکار ہے جس میں مسلمان اور مسلمان کا تعلق ٹھیک ویسا ہی ہو جیسا کہ اسلام چاہتا ہے۔ ان کے درمیان مساوات ہو، محبت اور ہمدردی ہو یک جہتی اور وحدت فی العمل (unity in action) ہو، سب کے اندر خدا کی بندگی کرنے کا مشترک ارادہ نہ صرف موجود ہو، بلکہ پیہم متحرک رہے اور اجتماعی حرکت کرنے کی عادت ان کی طبیعت ثانیہ بن جائے۔ ان میں سے ہر ایک یہ جانتا ہو کہ جب وہ لیڈر بنے تو جماعت میں اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے اور جب کوئی دوسرا ان کا لیڈر ہو تو وہ کس طرح ان کی اطاعت کریں۔ کس طرح اس کے حکم پر حرکت کریں، کہاں تک کہ اس کی فرماں برداری ان پر واجب ہے۔ کہاں انھیں اس کو ٹوکنا چاہیے، اور کس حد پر پہنچ کر وہ ان کی اطاعت کا مستحق نہیں رہتا۔

نماز باجماعت کا کردار: نماز انفرادی سیرت کی تعمیر کے ساتھ یہ کام بھی کرتی ہے۔ وہ اس اجتماعی نظام کا پورا ڈھانچا بناتی ہے، اس کو قائم کرتی اور قائم رکھتی ہے، اور اسے روزانہ پانچ مرتبہ حرکت میں لاتی ہے تاکہ وہ ایک مشین کی طرح چلتا رہے۔ اسی لیے پنج وقتہ نماز کو جماعت کی ساتھ ادا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ شریعت کی رو سے ایک ایک شخص الگ الگ نماز پڑھ کر فرض سے سبک دوش [تو ہوسکتا ہے، مگر وہ گنہ گار ہوگا اگر قصداً بلا عذر مسجد میں حاضر ہو کر جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے۔][1]

جماعت کی اس تاکید کا مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کا نظام اجتماعی اپنی صحیح صورت پر قائم اور متحرک رہے۔ مسجد کا پنج وقتہ اجتماع مسلمانوں کے نظام اجتماعی کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کی مضبوطی پر اس پورے نظام کی مضبوطی منحصر ہے۔ ادھر یہ کمزور ہوئی اور ادھر سارا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔

اذان کا مقام: حکم ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی اُٹھ جاؤ اور اپنے اپنے کام چھوڑ کر مسجد کی طرف رخ کرو۔ اس طلبی کی پکار سن کر ہر طرف سے مسلمانوں کا ایک مرکز کی طرف دوڑنا وہی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے جو فوج کی ہوتی ہے۔ فوج کے سپاہی جہاں جہاں بھی ہوں، بگل کی آواز سنتے ہی سمجھ لیتے ہیں کہ ہمارا کمانڈر ہمیں بلا رہا ہے۔ اس طلبی پر سب کے دل میں ایک ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے یعنی کمانڈر کے حکم کی پیروی کا خیال، اور اس خیال کے آتے ہی سب ایک ہی کام کرتے ہیں۔ یعنی اپنے اپنے کام چھوڑ کر اٹھنا اور ہر طرف سے سمٹ کر ایک ہی جگہ جمع ہو جانا۔ فوج میں یہ طریقہ کس لیے رکھا گیا ہے؟ اس لیے کہ اول تو ہر ہر سپاہی میں فرداً فرداً حکم ماننے اور اس مستعدی کے ساتھ عمل کرنے کی خصلت و عادت پیدا ہو، اور اس کے ساتھ ہی ایسے تمام فرماں بردار سپاہی مل کر ایک گروہ، ایک جتھا، ایک ٹیم بن جائیں اور ان میں یہ عادت پیدا ہو جائے کہ کمانڈر کا حکم پاتے ہی ایک وقت میں ایک جگہ سب مجتمع ہو جایا کریں تاکہ جب کوئی مہم پیش آئے تو ساری فوج ایک آواز میں ایک مقصد کے لیے اکٹھی ہو کر کام کر سکے۔ فوجی اصطلاح میں اس کو سرعتِ اجتماع (mobility) کہتے ہیں اور یہ فوجی زندگی کی جان ہے۔ اگر کسی فوج میں اس طرح مجتمع ہونے کی صلاحیت نہ ہو، اور اس کے سپاہی ایسے خود سر ہوں کہ جس کا جدھر منہ اُٹھتا ہو اُدھر چلا جاتا ہو، تو خواہ ایسی فوج

1- ترجمان القرآن اور کتابی صورت میں آغاز کی اشاعتوں میں اس مقام پر عبارت کچھ اور ہے ہم نے بریکٹوں میں اپریل ۱۹۷۰ء کی اشاعت سے ترمیم شدہ عبارت شامل کی ہے۔ (مرتبین)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا ایک ایک سپاہی تیس مار خاں ہی کیوں نہ ہو وہ کسی مہم کو سر نہیں کر سکتی۔ اس قسم کے ایک ہزار بہادر سپاہیوں کو دشمن کے پچاس سپاہیوں کا ایک منظم دستہ الگ الگ پکڑ کر ختم کر سکتا ہے۔ ٹھیک اسی مصلحت کی بنا پر مسلمانوں کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا گیا ہے کہ جو مسلمان جہاں بھی اذان کی آواز سنے، سب کام چھوڑ کر اپنے قریب کی مسجد کا رخ کرے۔ اس اجتماع کی مشق ان کو روزانہ پانچ وقت کرائی جاتی ہے، کیونکہ اس خدائی فوج کی ڈیوٹی دنیا کی ساری فوجوں سے زیادہ سخت ہے، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ دوسری فوجوں کے لیے تو مدتوں میں کبھی ایک مہم پیش آتی ہے اور اس کی خاطر ان کو یہ ساری فوجی مشقیں کرائی جاتی ہیں، مگر اس خدائی فوج کو ہر وقت ایک مہم درپیش ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ یہ بھی بہت بڑی رعایت ہے کہ اسے دن رات میں صرف پانچ مرتبہ ہی خدائی بگل کی آواز پر دوڑنے اور خدائی چھاؤنی، یعنی مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

مسجد میں اجتماع: اب آپ مسجد میں جمع ہوتے ہیں اور صرف جمع ہونے ہی میں بے شمار فائدے ہیں۔ یہاں جو آپ نے ایک دوسرے کو دیکھا، پہچانا، ایک دوسرے سے واقف ہوئے، یہ دیکھنا، پہچاننا، واقف ہونا کس حیثیت سے ہے؟ اس حیثیت سے کہ آپ سب خدا کے بندے ہیں، ایک رسولؐ کے پیرو ہیں، ایک کتاب کے ماننے والے ہیں، ایک ہی مقصد سب کی زندگی کا ہے، اسی مقصد کے لیے آپ مسجد میں جمع ہوئے ہیں اور اسی مقصد کے لیے مسجد سے باہر جا کر بھی آپ کو عمل کرنا ہے۔ اس قسم کا تعارف آپ میں خود بخود یہ خیال پیدا کر دیتا ہے کہ آپ سب ایک قوم ہیں، ایک ہی فوج کے سپاہی ہیں، ایک دوسرے کے بھائی اور رفیق ہیں، دنیا میں آپ کے اغراض، آپ کے مقاصد، آپ کے نقصانات اور آپ کے فوائد سب مشترک ہیں، آپ کی زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اٹھیں گے تو ایک ساتھ اور گریں گے تو ایک ساتھ۔

پھر آپ جو ایک دوسرے کو دیکھیں گے تو ظاہر ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھیں گے اور یہ دیکھنا بھی دشمن کو دیکھنا نہیں بلکہ دوست کا دوست اور بھائی کا بھائی کو دیکھنا ہوگا۔ اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے کہ میرا کوئی بھائی پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے، کوئی پریشان صورت ہے، کوئی فاقہ زدہ چہرہ لیے ہوئے آیا ہے، کوئی معذور، لنگڑا، لولا، اندھا ہے تو خواہ مخواہ آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ آپ میں سے جو خوشحال ہیں، وہ غریبوں اور بے کسوں پر رحم کھائیں گے۔ جو بدحال ہیں انھیں امیروں تک پہنچنے اور اپنا حال کہنے کی ہمت ہوگی۔ کسی کے متعلق معلوم ہوگا کہ بیمار ہے یا کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے اس لیے مسجد میں نہیں آیا تو آپ اس کی عیادت کو جائیں گے کسی کے مرنے کی خبر ملی تو آپ اس کے جنازے میں شریک ہوں گے اور غم زدہ عزیزوں کو تسلی دیں گے۔ یہ سب باتیں آپس کی محبت کو بڑھانے والی، آپ کو ایک دوسرے کے قریب کرنے والی اور ایک دوسرے کا مددگار بنانے والی ہیں۔

اور ذرا غور کیجیے، یہاں جو آپ جمع ہوئے ہیں تو ایک جگہ پاک مقصد کے لیے جمع ہوئے ہیں، آپ کو کسی فلم سٹار کا عشق یہاں کھینچ کر نہیں لایا ہے۔ آپ شراب خوری یا جوے بازی کے لیے جمع نہیں ہوئے ہیں۔ یہ بدکاروں کا اجتماع نہیں ہے کہ سب کے دل میں ناپاک خواہشیں اور نیتیں بھری ہوئی ہوں۔ یہ تو اللہ کے بندوں کا اجتماع ہے، اللہ کی عبادت کے لیے اللہ کے گھر میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سب اپنے خدا کے سامنے بندگی کا اقرار کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ ایسے موقع پر اول تو ایمان دار آدمی کے دل میں خود ہی اپنے گناہوں پر شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس نے کوئی گناہ اپنے دوسرے بھائی کے سامنے کیا تھا۔ اور وہ بھی یہاں مسجد میں موجود ہے، تو محض اس کی نگاہوں کا سامنا ہو جانا ہی کافی ہے کہ گناہ گار اپنے دل میں کٹ کٹ جائے اور اگر کہیں مسلمانوں میں ایک دوسرے کو نصیحت کرنے کا جذبہ بھی موجود ہو اور وہ جانتے ہوں کہ ہمدردی و محبت کے ساتھ ایک دوسرے کی اصلاح کس طرح کرنی چاہیے تو یقین جانیے کہ یہ اجتماع انتہائی رحمت و برکت کا موجب ہوگا۔ اس طرح سب مسلمان مل کر ایک دوسرے کی خرابیوں کو دور کریں گے، ایک دوسرے کے نقائص کی اصلاح کریں گے اور پوری جماعت صالحین کی جماعت بنتی چلی جائے گی۔

صف بندی کا اثر: یہ صرف مسجد میں جمع ہونے کی برکتیں ہیں۔ اب دیکھیے، کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے میں کتنی برکات پوشیدہ ہیں۔

سب مسلمان مسجد میں مساوی الحیثیت ہیں۔ ایک چمار اگر پہلے آیا ہو تو وہ اگلی صف میں ہوگا، اور ایک رئیس اگر بعد میں آئے تو وہ پچھلی صفوں میں رہے گا، کوئی بڑے سے بڑا آدمی مسجد میں اپنی سیٹ ریزرو نہیں کرا سکتا۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ دوسرے مسلمانوں کو مسجد میں کسی جگہ کھڑے ہونے سے روک دے یا جہاں وہ پہلے سے موجود ہو وہاں سے اس کو ہٹا دے۔ کوئی اس کا مجاز نہیں کہ آدمیوں پر سے پھاند کر یا صفوں کو چیر کر آگے پہنچنے کی کوشش کرے۔ سب مسلمان ایک صف میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوں گے، وہاں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، نہ کوئی اونچ ہے نہ نیچ۔ نہ کسی کے چھو جانے سے کوئی ناپاک ہو جاتا ہے، نہ کسی کے برابر کھڑا ہونے سے کسی کی عزت کو بٹہ لگتا ہے۔ بازار کا جاروب کش آئے گا اور گورنر کے برابر کھڑا ہو جائے گا۔ یہ وہ اجتماعی جمہوریت (social democracy) ہے جسے قائم کرنے میں اسلام کے سوا کوئی کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہاں روزانہ پانچ وقت سوسائٹی کے افراد کی اونچ نیچ برابر کی جاتی ہے، بڑوں کے دماغ سے کبریائی کا غرور نکالا جاتا ہے۔ چھوٹوں کے ذہن سے پستی کا احساس دور کیا جاتا ہے اور سب کو یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ خدا کی نگاہ میں تم سب انسان یکساں ہو۔

یہ صف بندی جس طرح طبقاتی امتیازات کو مٹاتی ہے اسی طرح نسل، قبیلہ، وطن اور رنگ وغیرہ کی عصبیتوں کو بھی مٹاتی ہے۔ مسجد میں کسی امتیازی نشان کے لحاظ سے مختلف انسانی گروہوں کے بلاک الگ نہیں ہوتے۔ تمام مسلمان جو مسجد میں آئیں، خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، ایشیائی ہوں یا فرنگی، سامی ہوں یا آرین اور ان کے قبیلوں اور ان کی زبانوں میں خواہ کتنے ہی اختلافات ہوں، بہرحال سب کے سب ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔ روزانہ پانچ وقت اس نوع کا اجتماع ان تعصبات کی بیخ کنی کرتا رہتا ہے جو انسانی جماعت میں خارجی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ انسانی وحدت قائم کرتا ہے، بین الاقوامیت کی جڑیں مضبوط کرتا ہے اور اس خیال کو دماغوں میں پیوست کر دیتا ہے کہ حسب و نسب اور برادریوں کی ساری عصبیتیں جھوٹی ہیں، تمام انسان خدا کے بندے ہیں، اور اگر خدا کی بندگی و عبادت پر وہ سب متفق ہو جائیں تو پھر وہ سب ایک امت ہیں۔

پھر جب یہ ایک صف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک ساتھ رکوع و سجدہ کرتے ہیں تو ان کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اندر منظم اجتماعی حرکت کرنے کی وہ صلاحیتیں پرورش پاتی ہیں جنھیں پیدا کرنے کے لیے فوج کو پریڈ کرائی جاتی ہے۔ اس کا مدعا ہی یہ ہے کہ مسلمانوں میں یک جہتی اور وحدت فی العمل پیدا ہو اور خدا کی بندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر تنِ واحد کی طرح ہو جائیں۔

اجتماعی دعائیں: صف بندی کے ان تمام فائدوں کو وہ دعائیں دو آتشہ کر دیتی ہیں، جو نماز میں خدا سے مانگی جاتی ہیں۔ سب یک زبان ہو کر اپنے مالک سے عرض کرتے ہیں کہ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ۝ ہم سب تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝ ہم سب کو سیدھے راستے کی ہدایت دے۔

اَلسَّلَامُ عَلَيۡنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيۡنَ. ہم پر سلامتی ہو اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی۔

نماز کی دعاؤں میں کہیں آپ کو واحد کا صیغہ نہ ملے گا۔ جہاں آپ دیکھیں گے جمع ہی کا صیغہ پائیں گے۔ اجتماعی عبادت اور اجتماعی حرکات کے ساتھ مل کر یہ اجتماعی دعائیں ہر مسلمان کے ذہن میں یہ نقش ثبت کر دیتی ہیں اور روزانہ ثبت کرتی رہتی ہیں کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اسے سب کچھ تنہا اپنے ہی لیے چاہنا اور مانگنا نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی جماعت کے ساتھ مربوط ہے، جماعت کی بھلائی میں اس کی بھلائی ہے۔ جماعت ہی کی راہ راست پر چلنے میں اس کی خیر ہے۔ خدا کی طرف سے فضل اور سلامتی جماعت پر نازل ہوگی، تب ہی وہ خود بھی اس سے متمتع ہو سکے گا۔ یہ چیز دماغوں سے انفرادیت (individualism) کو نکالتی ہے، اجتماعی ذہنیت (social mindedness) پیدا کرتی ہے، افراد جماعت میں خیر خواہی کے جذبات اور مخلصانہ محبت کے روابط کو نشو و نما دیتی ہے، اور روزانہ پانچ مرتبہ اس طریقے سے مسلمانوں کے احساس اجتماعیت کو اکسایا جاتا ہے تاکہ مسجد کے باہر زندگی کے وسیع میدان میں ان کا برتاؤ درست رہے۔

امامت کی حیثیت: یہ اجتماعی عبادت ایک امام (leader) کے بغیر انجام نہیں پاتی۔ دو آدمی بھی اگر فرض نماز پڑھیں تو لازم ہے کہ ان میں سے ایک امام بنے اور دوسرا مقتدی (follower)۔ جماعت جب کھڑی ہو جائے تو اس سے الگ نماز پڑھنا سخت ممنوع ہے۔ بلکہ ایسی نماز ہوتی ہی نہیں۔ حکم ہے کہ جو آتا جائے اسی امام کے پیچھے جماعت میں شامل ہوتا جائے۔ امامت کا منصب، کسی طبقے یا کسی نسل یا گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں نہ اس کے لیے کوئی ڈگری یا سند درکار ہے۔ ہر مسلمان امام بن سکتا ہے۔ البتہ شریعت یہ سفارش کرتی ہے کہ امام بنانے میں آدمی کی چند صفات کا لحاظ کیا جائے جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

جماعت میں امام اور مقتدیوں کا تعلق جس طور پر قائم کیا گیا ہے اس میں ایک ایک چیز انتہا درجے کی معنی خیز ہے۔ اس میں دراصل ہر مسلمان کو قیادت (leadership) اور اتباعِ قیادت (followership) کی مکمل ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ اس چھوٹی مسجد سے باہر اس وسیع مسجد میں جس کا نام زمین ہے، مسلمانوں کا جماعتی نظام کیسا ہونا چاہیے، جماعت میں امام کی کیا حیثیت ہے، اس کے فرائض کیا ہیں، اس کے حقوق کیا ہیں اور امام بننے کی صورت میں اس کا طرز عمل کیسا ہونا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چاہیے۔ دوسری طرف جماعت کو اس کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے اور کن باتوں میں کرنی چاہیے۔ اگر وہ غلطی کرے تو مسلمان کیا کریں، کہاں تک غلطی میں بھی اس کی پیروی کریں، کہاں وہ اس کو ٹوکنے کے مجاز ہیں، کہاں ان کو اس سے یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ اپنی غلطی کی اصلاح کرے۔ اور کس موقع پر وہ اس کو امامت سے ہٹا سکتے ہیں۔ یہ سب گویا چھوٹے پیمانے پر ایک سلطنت کو چلانے کی مشق ہے جو ہر روز پانچ مرتبہ ہر چھوٹی سے چھوٹی مسجد میں کرائی جاتی ہے۔

ہدایت کی گئی کہ امام ایسے شخص کو منتخب کیا جائے، جو پرہیز گار ہو، نیک سیرت ہو، دین کا علم رکھتا ہو اور سن رسیدہ ہو۔ حدیث میں ترتیب بھی بتا دی گئی ہے کہ ان صفات میں سے کون سی صفت کس صفت پر مقدم ہے۔ یہیں سے یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ سردارِ قوم کے انتخاب میں کن چیزوں کا لحاظ کرنا چاہیے۔

حکم ہے کہ امام ایسے شخص کو نہ بنایا جائے جس سے جماعت کی اکثریت ناراض ہو۔ یوں تھوڑے، بہت مخالف کس کے نہیں ہوتے۔ لیکن اگر جماعت میں زیادہ آدمی کسی شخص کی اقتدا کرنے سے کراہت کرتے ہوں تو اسے امام نہ بنایا جائے۔

یہاں بھی سردار قوم کے انتخاب کا ایک قاعدہ بتا دیا گیا۔ ایک بُری شہرت کا آدمی جس کی بدسیرتی و بدکرداری سے عام لوگ نفرت کرتے ہوں، اس قابل نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کا امیر بنایا جائے۔

حکم ہے کہ جو شخص امام بنے وہ نماز پڑھانے میں جماعت کے ضعیف لوگوں کا بھی لحاظ رکھے۔ محض جواں، مضبوط، تندرست اور فرصت والے آدمیوں ہی کو پیش نظر رکھ کر لمبی لمبی قراءت اور لمبے لمبے رکوع اور سجدے نہ کرنے لگے، بلکہ یہ بھی خیال رکھے کہ جماعت میں بوڑھے بھی ہیں، بیمار بھی ہیں، کمزور بھی ہیں، اور ایسے مشغول آدمی بھی ہیں، جو اپنا کام چھوڑ کر نماز کے لیے آئے ہیں اور جن کو نماز سے پھر اپنے کام کی طرف واپس جانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں یہاں تک رحم اور شفقت کا نمونہ پیش فرمایا ہے کہ نماز پڑھاتے میں اگر کسی بچے کے رونے کی آواز آ جاتی تو آپ نماز مختصر کر دیتے تھے۔ تاکہ اگر بچے کی ماں جماعت میں شامل ہو تو اسے تکلیف نہ ہو۔ یہ گویا سردارِ قوم کو تعلیم دی گئی ہے کہ جب وہ سردار بنایا جائے تو جماعت میں اس کا طرز عمل کیسا ہونا چاہیے۔

حکم ہے کہ اگر نماز پڑھانے کے دوران میں امام کو کوئی حادثہ پیش آ جائے جس کی وجہ سے وہ نماز پڑھانے کے قابل نہ رہے تو فوراً ہٹ جائے اور اپنی جگہ پیچھے کے آدمی کو کھڑا کر دے۔ یہاں پھر سردار قوم کے لیے ایک ہدایت ہے۔ اس کا بھی یہی فرض ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو سرداری کے قابل نہ پائے تو خود ہٹ جائے اور دوسرے اہل آدمی کے لیے جگہ خالی کر دے۔ اس میں نہ شرم کا کچھ کام ہے اور نہ خود غرضی کا۔

حکم ہے کہ امام کے فعل کی سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیے۔ اس کی حرکت سے پہلے حرکت کرنا سخت ممنوع ہے، حتیٰ کہ جو شخص امام سے پہلے رکوع یا سجدے میں جائے اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز وہ گدھے کی صورت میں اٹھایا جائے گا۔ یہاں قوم کو سبق دیا گیا ہے کہ اسے سردار کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

امام اگر نماز میں غلطی کرے، مثلاً جہاں اسے بیٹھنا چاہیے تھا وہاں کھڑا ہو جائے یا جہاں کھڑا ہونا چاہیے تھا وہاں بیٹھ جائے تو حکم ہے سبحان اللہ کہہ کر اسے غلطی سے متنبہ کرو۔ سبحان اللہ کے معنی ہیں: اللہ پاک ہے۔ امام کی غلطی پر سبحان اللہ کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ خطا سے پاک تو بس اللہ ہی کی ذات ہے، تم انسان ہو، تم سے بھول چوک ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ طریقہ ہے امام کو ٹوکنے کا۔

اور جب اس طرح امام کو ٹوکا جائے تو اس کو لازم ہے کہ بلا کسی شرم و لحاظ کے اپنی غلطی کی اصلاح کرے اور صرف اصلاح ہی نہ کرے بلکہ نماز ختم کرنے سے پہلے اللہ کے سامنے اپنے قصور کے اعتراف میں دو مرتبہ سجدہ بھی کرے۔ البتہ اگر ٹوکے جانے کے باوجود امام کو اس امر پر پورا یقین ہو کہ اس مقام پر اسے کھڑا ہی ہونا چاہیے تھا، یا بیٹھنا چاہیے تھا، تو وہ اپنے وثوق کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔ اس صورت میں جماعت کا کام یہ ہے کہ وہ امام کا ساتھ دے، اگرچہ وہ اپنی جگہ اس امر کا یقین واثق ہی کیوں نہ رکھتی ہو کہ امام غلطی کر رہا ہے۔ نماز ختم ہو جانے کے بعد مقتدیوں کو حق ہے کہ امام پر اس کی غلطی ثابت کریں اور اس سے مطالبہ کریں کہ دوبارہ نماز پڑھائے۔

امام کے ساتھ جماعت کا یہ طرزِ عمل تو صرف ان غلطیوں کے بارے میں ہے جو معمولی جزئیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن اگر امام سنت نبوی کے خلاف نماز کی ہیئت اور ترکیب بدل دے، یا قرآن کو تحریف کر کے پڑھے، یا نماز کے پڑھانے کے دوران میں کفر و شرک یا صریح معصیت کا ارتکاب کرے، یا کوئی ایسا فعل کرے جس سے معلوم ہو کہ یا تو وہ قانونِ الٰہی کی پیروی سے منحرف ہو گیا ہے، یا اس کی عقل میں فتور آ گیا ہے تو جماعت کا فرض ہے کہ نماز توڑ کر اس سے الگ ہو جائے اور اسے ہٹا کر کسی دوسرے شخص کو اس کی جگہ قائم کرے۔ پہلی صورت میں امام کی پیروی نہ کرنا جتنا بڑا گناہ ہے، دوسری صورت میں اس کی پیروی کرنا اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔

بعینہٖ یہی صورت بڑے پیمانے پر قوم اور اس کے سردار کے تعلق کی بھی ہے۔ جب تک سردار اسلامی کانسٹی ٹیوشن کے اندر کام کر رہا ہے اس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے۔ نافرمانی کریں گے تو گنہ گار ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ اسے ٹوک سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے ٹوکنے پر بھی وہ فروعی معاملات میں غلطیاں کرے تو انھیں اس کی اطاعت پر قائم رہنا چاہیے۔ مگر جب وہ اسلامی کانسٹی ٹیوشن کی حدود سے نکل رہا ہو تو پھر وہ مسلمانوں کی جماعت کا امیر نہیں رہ سکتا۔

یہاں تک نماز کے مقاصد اور اس کے اثرات کی جو تشریح کی گئی ہے اگرچہ وہ اس کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہے تاہم اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس کو اسلام کا رکنِ عظیم کیوں قرار دیا گیا ہے۔ رکن ستون کو کہتے ہیں جس کے سہارے پر عمارت قائم ہوتی ہے۔ اسلامی زندگی کی عمارت کو قائم ہونے اور قائم رہنے کے لیے جن سہاروں کی ضرورت ہے، ان میں سب سے مقدم سہارا یہ ہے کہ مسلمانوں کے افراد میں فرداً فرداً اور ان کی جماعت میں بحیثیتِ مجموعی وہ اوصاف پیدا ہوں جو خدا کی بندگی کا حق ادا کرنے اور دنیا میں خلافتِ الٰہی کا بار سنبھالنے کے لیے ضروری ہیں۔ وہ غیب پر سچا اور زندہ ایمان رکھنے والے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوں، وہ اللہ کو اپنا واحد فرماں روا تسلیم کریں اور اس کے فرض شناس اور اطاعت کیش بندے ہوں، اسلام کا نظامِ فکر و نظریۂ حیات ان کی رگ رگ میں ایسا پیوستہ ہو جائے کہ اسی کی بنیاد پر اُن میں ایک پختہ سیرت پیدا ہو۔ اور ان کا عملی کردار اسی کے مطابق ڈھل جائے۔ اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر وہ اتنے قابو یافتہ ہوں کہ اپنے ایمان و اعتقاد کے مطابق ان سے کام لے سکیں۔ ان کے اندر منافقین کی جماعت اگر پیدا ہو گئی ہو یا باہر سے گھس آئی ہو تو وہ اہلِ ایمان سے الگ ہو جائے۔ ان کی جماعت کا نظام اسلام کے اجتماعی اصولوں پر قائم ہو، اور ایک مشین کی طرح پیہم متحرک رہے۔ ان میں اجتماعی ذہنیت کارفرما ہو۔ ان کے درمیان محبت ہو، ہمدردی ہو، تعاون ہو، مساوات ہو، وحدتِ روح اور وحدتِ عمل ہو، وہ قیادت اور اقتدا کے حدود کو جانتے اور سمجھتے ہوں اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ یہ تمام مقاصد چونکہ نماز کی اقامت سے حاصل ہوتے ہیں لہٰذا اس کو دین اسلام کا ستون قرار دیا گیا۔ یہ ستون اگر منہدم ہو جائے تو مسلمانوں کی انفرادی سیرت اور اجتماعی ہیئت دونوں مسخ ہو کر رہ جائیں اور وہ اس مقصد عظیم کے لیے کام کرنے کے اہل ہی نہ رہیں جس کی خاطر جماعت وجود میں آئی ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا کہ نماز عماد الدین ہے۔ یعنی دین کا سہارا ہے جس نے اس کو گرایا اس نے دین کو گرایا۔

(اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر، بار سوم، ص ۱۲-۴۴، سنہ ندارد)

❁ ❁ ❁

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

نماز کے فوائد

طلبِ اعانت کا وسیلہ

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرہ ۲:۴۵) صبر اور نماز سے مدد لو۔

یعنی اگر تمھیں نیکی کے راستے پر چلنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے تو اس دشواری کا علاج صبر اور نماز ہے، ان دو چیزوں سے تمھیں وہ طاقت ملے گی جس سے یہ راہ آسان ہو جائے گی۔

صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور خواہشاتِ نفس کا وہ انضباط ہے، جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب وضمیر کے پسند کیے ہوئے راستے پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔ ارشادِ الٰہی کا مدعا یہ ہے کہ اس اخلاقی صفت کو اپنے اندر پرورش کرو اور اس کو باہر سے طاقت پہنچانے کے لیے نماز کی پابندی کرو۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۷۳-۷۴، البقرہ، حاشیہ ۶۰)

استقامت کا ذریعہ

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ○ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ○ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ○ (الحجر ۱۵:۹۴-۹۹) پس اے نبیؐ! جس چیز کا تمھیں حکم دیا جارہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروانہ کرو۔ تمھاری طرف سے ہم اُن مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی خدا قرار دیتے ہیں۔ عن قریب انھیں معلوم ہو جائے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمھارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ (اس کا علاج یہ ہے کہ) اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجالاؤ، اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے۔

یعنی تبلیغِ حق اور دعوتِ اصلاح کی کوششوں میں جن تکلیفوں اور مصیبتوں سے تم کو سابقہ پیش آتا ہے ان کے مقابلے کی طاقت اگر تمھیں مل سکتی ہے تو صرف نماز اور بندگیِ رب پر استقامت سے مل سکتی ہے۔ یہی چیز تمھیں تسلی بھی دے گی، تم میں صبر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بھی پیدا کرے گی، تمھارا حوصلہ بھی بڑھائے گی، اور تم کو اس قابل بھی بنادے گی کہ دنیا بھر کی گالیوں اور مذمتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں اس خدمت پر ڈٹے رہو جس کی انجام دہی میں تمھارے رب کی رضا ہے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۵۱۹، الحجر، حاشیہ ۵۳)

مشکلات میں تسلّی

[ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے، جب سورۂ بنی اسرائیل نازل ہوئی تھی] اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید کی آواز بلند کرتے ہوئے ۱۲ سال گزر چکے تھے۔ آپؐ کے مخالفین آپؐ کا راستہ روکنے کے لیے سارے جتن کر چکے تھے۔

[اس سورت میں] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ مشکلات کے اس طوفان میں مضبوطی کے ساتھ اپنے موقف پر جمے رہیں اور کفر کے ساتھ مصالحت کا خیال تک نہ کریں۔ نیز مسلمانوں کو، جو کبھی کبھار کفار کے ظلم و ستم اور ان کی کج بحثیوں، اور ان کے طوفانِ کذب وافترا پر بے ساختہ جھنجلا اُٹھتے تھے، تلقین کی گئی ہے کہ پورے صبر و سکون کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے رہیں اور تبلیغ واصلاح کے کام میں اپنے جذبات پر قابو رکھیں۔ اس سلسلے میں اصلاحِ نفس اور تزکیۂ نفس کے لیے اُن کو نماز کا نسخہ بتایا گیا ہے، کہ یہ وہ چیز ہے جو تم کو ان صفاتِ عالیہ سے متصف کرے گی جن سے راہِ حق کے مجاہدوں کو آراستہ ہونا چاہیے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا موقع ہے جب پنج وقتہ نماز پابندی اوقات کے ساتھ مسلمانوں پر فرض کی گئی۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۵۸۶-۵۸۷، بنی اسرائیل، موضوع اور مضمون)

تحمل و برداشت

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۝ (طٰہٰ ۲۰: ۱۳۰) پس اے محمدؐ! جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اُن پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد وثنا کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو، سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی، شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔

[پہلے اُن قوموں کا ذکر ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ] چونکہ اللہ تعالیٰ ان کو ابھی ہلاک نہیں کرنا چاہتا، اور ان کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر کر چکا ہے، اس لیے اُس کی دی ہوئی اس مہلت کے دوران میں جو کچھ بھی تمھارے ساتھ کریں اُس کو تمھیں برداشت کرنا ہوگا اور صبر کے ساتھ اُن کی تمام تلخ و ترش باتیں سنتے ہوئے اپنا فریضہ تبلیغ و تذکیر انجام دینا پڑے گا۔ اس تحمل و برداشت اور اس صبر کی طاقت تمھیں نماز سے ملے گی جس کو تمھیں ان اوقات میں پابندی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۱۳۸، طٰہٰ، حاشیہ ۱۱۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایمان کی پختگی

مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (الروم ۳۰:۳۱) (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور ڈرو اُس سے اور نماز قائم کرو اور نہ ہو جاؤ مشرکین میں سے۔

......آدمی کے ذہن میں جب تک کوئی خیال محض خیال کی حد تک رہتا ہے، اس میں استحکام اور پائیداری نہیں ہوتی۔ اس خیال کے ماند پڑ جانے کا بھی خطرہ رہتا ہے اور بدل جانے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کے مطابق کام کرنے لگتا ہے تو وہ خیال اس کے اندر جڑ پکڑ لیتا ہے، اور جوں جوں وہ اس پر عمل کرتا جاتا ہے، اس کا استحکام بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس عقیدہ وفکر کا بدل جانا یا ماند پڑ جانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو رجوع إلی اللہ اور خوفِ خدا کو مستحکم کرنے کے لیے ہر روز پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنے سے بڑھ کر کوئی عمل کارگر نہیں ہے۔ کیونکہ دوسرا جو عمل بھی ہو، اس کی نوبت دیر دیر میں آتی ہے یا متفرق صورتوں میں مختلف مواقع پر آتی ہے۔ لیکن نماز ایک ایسا عمل ہے جو ہر چند گھنٹوں کے بعد ایک ہی متعین صورت میں آدمی کو دائما کرنا ہوتا ہے، اور اس میں ایمان واسلام کا وہ پورا سبق، جو قرآن نے اسے پڑھایا ہے، آدمی کو بار بار دہرانا ہوتا ہے تاکہ وہ اسے بھولنے نہ پائے۔ مزید برآں کفار اور اہل ایمان، دونوں پر یہ ظاہر ہونا ضروری ہے کہ انسانی آبادی میں سے کس کس نے بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعتِ رب کی روش اختیار کر لی ہے۔

اہلِ ایمان پر اس کا ظہور اس لیے درکار ہے کہ ان کی ایک جماعت اور سوسائٹی بن سکے اور وہ خدا کی راہ میں ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں اور ایمان واسلام سے جب بھی ان کے گروہ کے کسی شخص کا تعلق ڈھیلا پڑنا شروع ہو اسی وقت کوئی کھلی علامت فوراً ہی تمام اہل ایمان کو اس کی حالت سے باخبر کر دے۔

کفار پر اس کا ظہور اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر کی سوئی ہوئی فطرت اپنے ہم جنس انسانوں کو خداوندِ حقیقی کی طرف بار بار پلٹتے دیکھ کر جاگ سکے، اور جب تک وہ نہ جاگے ان پر خدا کے علم برداروں کی عملی سرگرمی دیکھ دیکھ کر دہشت طاری ہوتی رہے۔ ان دونوں مقاصد کے لیے بھی اقامتِ صلوٰۃ ہی سب سے زیادہ موزوں ذریعہ ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۷۵۴-۷۵۵، الروم، حاشیہ ۵۰)

نیک بنانا

وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ۝ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ۚ ذٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ (ہود ۱۱:۱۱۳-۱۱۴) ان ظالموں کے طرف ذرا ر جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمھیں کوئی ایسا ولی وسرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمھیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی اور دیکھو، نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔ درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں۔

جو برائیاں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور جو برائیاں تمھارے ساتھ اس دعوتِ حق کی دشمنی میں کی جارہی ہیں، ان سب کو دفع کرنے کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ تم خود زیادہ سے زیادہ نیک بنو اور اپنی نیکی سے اس بدی کو شکست دو، اور تم کو نیک بنانے کا بہترین ذریعہ یہ نماز ہے جو خدا کی یاد کو تازہ کرتی رہے گی اور اس کی طاقت سے تم بدی کے اس منظم طوفان کا نہ صرف مقابلہ کر سکو گے بلکہ اسے دفع کر کے دنیا میں عملاً خیر وصلاح کا نظام بھی قائم کر سکو گے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۳۷۱، ہود، حاشیہ ۱۱۴)

بے حیائی سے روکنا

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ (العنکبوت ۲۹:۴۵) اور نماز قائم کرو یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر اصل مخاطب تمام اہلِ ایمان ہیں۔ ان پر جو ظلم و ستم اُس وقت توڑے جا رہے تھے، اور ایمان پر قائم رہنے میں جن شدید حوصلہ شکن مشکلات سے ان کو سابقہ پیش آ رہا تھا، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے پچھلے چار رکوعوں میں صبر وثبات اور توکل علی اللہ کی مسلسل تلقین کرنے کے بعد اب انھیں عملی تدبیر یہ بتائی جارہی ہے کہ قرآن کی تلاوت کریں اور نماز قائم کریں۔

نماز کے بہت سے اوصاف میں سے ایک اہم وصف [فحش اور برے کاموں سے روکنا] ہے جسے موقع و محل کی مناسبت سے یہاں نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مکہ کے اس ماحول میں جن شدید مزاحمتوں سے مسلمانوں کو سابقہ درپیش تھا ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں مادی طاقت سے بڑھ کر اخلاقی طاقت درکار تھی۔ اس اخلاقی طاقت کی پیدائش اور اس کے نشوونما کے لیے پہلے دو تدبیروں کی نشان دہی کی گئی۔ ایک تلاوت قرآن، دوسرے اقامتِ صلوٰۃ۔ اس کے بعد اب یہ بتایا جارہا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ وہ ذریعہ ہے جس سے تم لوگ اُن برائیوں سے پاک ہو سکتے ہو جن میں اسلام قبول کرنے سے پہلے تم خود مبتلا تھے اور جن میں تمھارے گردوپیش اہل عرب کی اور عرب سے باہر کی جاہلی سوسائٹی اس وقت مبتلا ہے۔

غور کیا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس موقع پر نماز کے اس خاص فائدے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونا اپنے اندر صرف اتنا ہی فائدہ نہیں رکھتا کہ یہ بجائے خود ان لوگوں کے لیے دنیا و آخرت میں نافع ہے جنھیں یہ پاکیزگی حاصل ہو، بلکہ اس کا لازمی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے اُن کو اُن سب لوگوں پر زبردست برتری حاصل ہو جاتی ہے جو طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہوں اور جاہلیت کے اس ناپاک نظام کو، جو اُن برائیوں کی پرورش کرتا ہے، برقرار رکھنے کے لیے ان پاکیزہ انسانوں کے مقابلے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فَحْشَآء اور مُنْكَر کا اطلاق جن برائیوں پر ہوتا ہے انھیں انسان کی فطرت برا جانتی ہے اور ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر معاشرے کے لوگ، خواہ وہ عملاً کیسے ہی بگڑے ہوئے ہوں، اصولاً ان کو برا ہی سمجھتے رہے ہیں۔ نزول قرآن کے وقت عرب کا معاشرہ بھی اس عام کلیے سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اس معاشرے کے لوگ بھی اخلاق کی معروف خوبیوں اور برائیوں سے واقف تھے، بدی کے مقابلے میں نیکی کی قدر پہچانتے تھے، اور شاید ہی ان کے اندر کوئی ایسا شخص ہو جو برائی کو بھلائی سمجھتا ہو یا بھلائی کو بری نگاہ سے دیکھتا ہو۔ اس حالت میں اس بگڑے ہوئے معاشرے کے اندر کسی ایسی تحریک کا اُٹھنا جس سے وابستہ ہوتے ہی خود اُسی معاشرے کے افراد اخلاقی طور پر بدل جائیں اور اپنی سیرت و کردار میں اپنے ہم عصروں سے نمایاں طور پر بلند ہو جائیں، لامحالہ اپنا اثر کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ ممکن نہ تھا کہ عرب کے عام لوگ برائیوں کو مٹانے والی اور نیک اور پاکیزہ انسان بنانے والی اس تحریک کا اخلاقی وزن محسوس نہ کرتے اور اس کے مقابلے میں محض جاہلی تعصبات کے کھوکھلے نعروں کی بنا پر اُن لوگوں کا ساتھ دیے چلے جاتے جو خود اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھے اور جاہلیت کے اُس نظام کو قائم رکھنے کے لیے لڑ رہے تھے جو ان برائیوں کو صدیوں سے پرورش کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس موقع پر مسلمانوں کو مادی وسائل اور طاقتیں فراہم کرنے کے بجائے نماز قائم کرنے کی تلقین کی تاکہ یہ مٹھی بھر انسان اخلاق کی وہ طاقت اپنے اندر پیدا کر لیں جو لوگوں کے دل جیت لے اور تیر و تفنگ کے بغیر دشمنوں کو شکست دے دے۔

متذکرہ خوبی کے دو پہلو: نماز کی یہ جو خوبی اِس آیت میں بیان کی گئی ہے، اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک اس کا وصف لازم ہے یعنی یہ کہ وہ فحشا اور منکر سے روکتی ہے، اور دوسرا اس کا وصف مطلوب ہے، یعنی یہ کہ اس کا پڑھنے والا واقعی فحشا اور منکر سے رُک جائے۔

جہاں تک روکنے کا تعلق ہے، نماز لازماً یہ کام کرتی ہے۔ جو شخص بھی نماز کی نوعیت پر ذرا سا غور کرے گا وہ تسلیم کرے گا کہ انسان کو برائیوں سے روکنے کے لیے جتنے بریک بھی لگانے ممکن ہیں ان میں سب سے زیادہ کارگر بریک نماز ہی ہو سکتی ہے۔ آخر اس سے بڑھ کر مؤثر مانع اور کیا ہو سکتا ہے کہ آدمی کو ہر روز دن میں پانچ وقت خدا کی یاد کے لیے بلایا جائے اور اس کے ذہن میں یہ بات تازہ کی جائے کہ تو اس دنیا میں آزاد و خود مختار نہیں ہے بلکہ ایک خدا کا بندہ ہے اور تیرا خدا وہ ہے جو تیرے کھلے اور چھپے تمام اعمال سے، حتیٰ کہ تیرے دل کے ارادوں اور نیتوں تک سے واقف ہے، اور ایک وقت ضرور ایسا آنا ہے جب تجھے اُس خدا کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ پھر اس یاد دہانی پر بھی اکتفا نہ کی جائے بلکہ آدمی کو عملاً ہر نماز کے وقت اس بات کی مشق کرائی جاتی رہے کہ وہ چھپ کر بھی اپنے خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ نماز کے لیے اٹھنے کے وقت سے لے کر ختم کرنے تک مسلسل آدمی کو وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن میں اس کے اور خدا کے سوا کوئی تیسری ہستی یہ جاننے والی نہیں ہوتی کہ اس شخص نے خدا کے قانون کی پابندی کی ہے یا اسے توڑ دیا ہے۔ مثلاً اگر آدمی کا وضو ساقط ہو چکا ہو اور وہ نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے تو اس کے اور خدا کے سوا آخر کسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ وضو سے نہیں ہے۔ اگر آدمی نماز کی نیت ہی نہ کرے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور بظاہر رکوع و سجود اور قیام و قعود کرتے ہوئے اذکارِ نماز پڑھنے کی بجائے خاموشی کے ساتھ غزلیں پڑھتا رہے تو اس کے اور خدا کے سوا کس پر یہ راز فاش ہو سکتا ہے کہ اس نے دراصل نماز نہیں پڑھی ہے۔ اس کے باوجود جب آدمی جسم اور لباس کی طہارت سے لے کر نماز کے ارکان اور اذکار تک قانونِ خداوندی کی تمام شرائط کے مطابق ہر روز پانچ وقت نماز ادا کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نماز کے ذریعے سے روزانہ کئی کئی بار اس کے ضمیر میں زندگی پیدا کی جا رہی ہے، اس میں ذمہ داری کا احساس بیدار کیا جا رہا ہے، اسے فرض شناس انسان بنایا جا رہا ہے، اور اس کو عملاً اس بات کی مشق کرائی جا رہی ہے کہ وہ خود اپنے جذبہ اطاعت کے زیرِ اثر خفیہ اور علانیہ ہر حال میں اس قانون کی پابندی کرے جس پر وہ ایمان لایا ہے، خواہ خارج میں اس سے پابندی کرانے والی کوئی طاقت موجود ہو یا نہ ہو اور خواہ دنیا کے لوگوں کو اس کے عمل کا حال معلوم ہو یا نہ ہو۔

اصلاحی اثرات کب مرتب ہوتے ہیں: اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ نماز صرف یہی نہیں کہ آدمی کو فحشا و منکر سے روکتی ہے بلکہ درحقیقت دنیا میں کوئی دوسرا طریقِ تربیت ایسا نہیں ہے جو انسان کو برائیوں سے روکنے کے معاملہ میں اس درجہ موثر ہو۔ رہا اب یہ سوال کہ آدمی نماز کی پابندی اختیار کرنے کے بعد عملاً بھی برائیوں سے رکتا ہے یا نہیں، تو اس کا انحصار خود اس آدمی پر ہے جو اصلاحِ نفس کی یہ تربیت لے رہا ہو۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی نیت رکھتا ہو اور اس کی کوشش کرے تو نماز کے اصلاحی اثرات اس پر مرتب ہوں گے، ورنہ ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی تدبیرِ اصلاح بھی اس شخص پر کارگر نہیں ہو سکتی جو اس کا اثر قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہو، یا جان بوجھ کر اس کی تاثیر کو دفع کرتا رہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے غذا کی لازمی خاصیت بدن کا تغذیہ اور نشو و نما ہے، لیکن یہ فائدہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ آدمی اسے جزوِ بدن بننے دے۔ اگر کوئی شخص ہر کھانے کے بعد فوراً ہی قے کر کے ساری غذا باہر نکالتا چلا جائے تو اس طرح کا کھانا اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ایسے شخص کی نظیر سامنے لا کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ غذا موجبِ تغذیہ بدن نہیں ہے کیونکہ فلاں شخص کھانا کھانے کے باوجود سوکھتا چلا جا رہا ہے، اسی طرح بدعمل نمازی کی مثال پیش کر کے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ نماز برائیوں سے روکنے والی نہیں ہے کیونکہ فلاں شخص نماز پڑھنے کے باوجود بدعمل ہے۔ ایسے نمازی کے متعلق تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت نماز نہیں پڑھتا جیسے کھانا کھا کر قے کر دینے والے کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت کھانا نہیں کھاتا۔

نماز کب قبول ہوتی ہے: ٹھیک یہی بات ہے جو متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض اکابر صحابہ و تابعین سے مروی ہے۔ عمران بن حصین کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: مَنْ لَّمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ فَلَا صَلَاةَ لَهُ۔ (ابن ابی حاتم) جسے اس کی نماز نے فحش اور برے کاموں سے نہ روکا اس کی نماز نہیں۔

ابن عباس حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں: مَنْ لَّمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ لَمْ يَزْدَدْ بِهَا مِنَ اللّٰهِ اِلَّا بُعْدًا۔ جس کی نماز نے اسے فحش اور برے کاموں سے نہ روکا اس کو اس کی نماز نے اللہ سے اور زیادہ دور کر دیا۔ (ابن ابی حاتم، طبرانی)

یہی مضمون جناب حسن بصریؒ نے بھی حضورؐ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ (ابن جریر، بیہقی)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابن مسعود سے حضورؐ کا یہ ارشاد مروی ہے: لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یُطِعِ الصَّلٰوۃَ وَطَاعَۃُ الصَّلٰوۃِ اَنْ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ (ابن جریر، ابن ابی حاتم) اس شخص کی کوئی نماز نہیں ہے جس نے نماز کی اطاعت نہ کی۔ اور نماز کی اطاعت یہ ہے کہ آدمی فَحْشَآءَ مُنْکَر سے رُک جائے۔[1]

اسی مضمون کے متعدد اقوال حضرت عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہؓ بن عباس، حسن بصری قتادہ اور اعمش وغیرھم سے منقول ہیں۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں: جو شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ اس کی نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں، اسے دیکھنا چاہیے کہ اس کی نماز نے اسے فحشا اور منکر سے کہاں تک باز رکھا۔ اگر نماز کے روکنے سے وہ برائیاں کرنے سے رُک گیا ہے تو اس کی نماز قبول ہوئی ہے۔ (روح المعانی)

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۷۰۴-۷۰۷، العنکبوت، حاشیہ ۷۷-۷۸)

❁ ❁ ❁

۱- مذکورہ بالا روایات پر تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد علامہ ناصر الدین البانی نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے۔ سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ ص ۱۴-۱۷۔ (مرتب)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

نماز کی اہمیت

عہدِ رسالت میں نماز کی اہمیت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی شخص مسلمانوں کی جماعت میں شمار ہی نہ ہوسکتا تھا جب تک کہ وہ نماز کا پابند نہ ہو۔ جس طرح تمام دنیوی جماعتیں اور مجلسیں اپنے اجتماعات میں کسی ممبر کے بلا عذر شریک نہ ہونے کو اس کی عدم دلچسپی پر محمول کرتی ہیں اور مسلسل چند اجتماعات سے غیر حاضر رہنے پر اسے ممبری سے خارج کر دیتی ہیں، اس طرح اسلامی جماعت کے کسی رکن کا نماز باجماعت سے غیر حاضر رہنا اس زمانے میں اس بات کی صریح دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اور اگر وہ مسلسل چند مرتبہ جماعت سے غیر حاضر رہتا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بنا پر سخت سے سخت منافقوں کو بھی اس زمانے میں پانچوں وقت مسجد کی حاضری ضرور دینی پڑتی تھی، کیونکہ اس کے بغیر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار کیے ہی نہ جاسکتے تھے۔ البتہ جو چیز ان کو سچے اہلِ ایمان سے تمیز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ سچے مومن ذوق وشوق سے آتے تھے، وقت سے پہلے مسجدوں میں پہنچ جاتے تھے، نماز سے فارغ ہو کر بھی مسجدوں میں ٹھہرے رہتے تھے، اور ان کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ نماز سے ان کو حقیقی دلچسپی ہے۔ بخلاف اس کے، اذان کی آواز سنتے ہی منافق کی جان پر بن جاتی تھی، دل پر جبر کر کے اٹھتا تھا، اس کے آنے کا انداز صاف غمازی کرتا تھا کہ آ نہیں رہا بلکہ اپنے آپ کو کھینچ کر لا رہا ہے، جماعت ختم ہوتے ہی اس طرح بھاگتا تھا گویا کسی قیدی کو رہائی ملی ہے، اور اس کی تمام حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص خدا کے ذکر سے کوئی رغبت نہیں رکھتا۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۴۱۰، النساء، حاشیہ ۱۷۲)

[اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ]

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا (النساء ۴: ۱۴۲) یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اقامت دین میں نماز کا مقام

نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ اس دین کے ارکان ہیں جن پر یہ دین قائم ہوتا ہے اس لیے ان کو قائم کرنا اقامت دین کے لیے مطلوب ہے، اور جہاد چونکہ دین کو اس نظام کے ساتھ قائم کرنے کا ذریعہ ہے اس لیے وہ بھی اقامت دین ہی کے لیے مطلوب ہے۔.......... آلاَ اَدُلُّکَ بِرَأسِ الْاَمْرِ وَعُمُوْدِہٖ وَذِرْوَۃِ سَنَامِہٖ؟ قَالَ: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! قَالَ: رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ، وَعُمُوْدُہٗ الصَّلٰوۃُ وَذِرْوَۃُ سَنَامِہٖ الْجِھَادُ۔ (معاذ بن جبلؓ)[1] [کیا میں تمھیں دین وشریعت کی اساس اور اصل، اس کا ستون وعمود اور اس کی بلندی، شان وعظمت نہ بتاؤں؟ عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: اسلام اس کا راس الامر ہے، عمود اس کا صلاۃ ہے، بلندی، عظمت وشان اس کی جہاد (فی سبیل اللہ) ہے]۔

(رسائل و مسائل، چہارم، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۳۶۳)

س: کیا نماز اقامتِ دین کا حکم بھی دیتی ہے؟

ج: نماز ہی تو حکم دیتی ہے اقامتِ دین کا۔ جب آپ کہتے ہیں: 'نَخْلَعُ وَ نَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ' [ہم بیزار ہیں اور چھوڑتے ہیں اُن لوگوں کو جو تیری نافرمانی کرتے ہیں] تو دشمنان دین سے آپ کی لڑائی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

(۵-اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۲۳۰)

نماز اصلاح کا آخری ذریعہ

حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ دن کو نمازیں پڑھتا ہے اور رات کو چوری کرتا ہے۔ اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ یا تو چوری اس سے نماز چھڑا دے گی یا نماز اس سے چوری چھڑا دے گی۔[2]

یہ تو ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی تعلیم۔ اب اگر ایک آدمی اصلاح کے جوش میں آکر ایسے شخص سے یہ

۱- ترمذی، ج ۲ ابواب الایمان ص ۸۹۔ باب ماجاء فی حرمۃ الصلاۃ
○مسند احمد ج ۵ ص ۲۳۱۔ معاذ بن جبل
○ابن ماجہ کتاب الفتن باب ۱۲ کف اللسان فی الفتنۃ
○السنن الکبریٰ للبیھقی ج ۹، ص ۲۰۔ کتاب السیر باب اصل فرض الجھاد عن معاذ بن جبل
○مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۱، ص ۸ (مختصر روایت) بحوالہ تفہیم الاحادیث، ج ۳، ص ۷۷ اشاعت دوم
۲- ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱۵، بحوالہ تفہیم الاحادیث ج ۳، ص ۸۳۔ اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہے کہ کم بخت جب تو چوری کرتا ہے تو تیری نماز کس کام کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کی اصلاح کی آخری امید منقطع کرنا چاہتے ہیں۔ چوری میں تو وہ مبتلا ہے ہی۔ اب آپ اس سے نماز بھی چھڑوانا چاہتے ہیں۔ نماز ایک آخری رشتہ ہے جس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مکمل بھلائی کی طرف پلٹ آنے میں اس کی مدد کرے۔ لیکن وہ رشتہ بھی جوشِ اصلاح میں کاٹ دینا چاہتے ہیں۔ اپنے نزدیک تو آپ نے بڑی اصلاح کی بات کی لیکن حقیقت میں آپ نے اسے جہنم کی طرف دھکیلنے میں حصہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ جب وہ شخص چوری کرتا ہے تو نماز سے اسے کیا حاصل۔ بلکہ یہ فرمایا کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ایک وقت آئے گا کہ یا تو اس کی نماز اس سے چوری چھڑا دے گی یا چوری نماز چھڑا دے گی۔

(۵-اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۲۱۷-۲۱۸)

س: کیا نماز روزے سے نفس کی پاکیزگی بھی حاصل ہوتی ہے؟

ج: مسلمان کی نماز تو اسے یہی حکم دیتی ہے کہ وہ برائی سے بچے بشرطیکہ نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر نماز پڑھے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ اگر وہ بلا سوچے یا نماز کے مقصد کو نظر انداز کر کے پڑھے گا تو پھر نماز پڑھ کر رشوت لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھے گا۔ اگر رشوت لینے والا نماز پڑھے گا اور سمجھے گا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے تو یہ خیال کر کے کہ میں تو حرام کھا رہا ہوں، وہ رشوت کے قریب بھی نہیں جائے گا۔

(۵-اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۲۳۰)

تارک نماز دوزخی ہے

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ (المدثر ۷۴:۴۳) [جنت والے مجرموں سے پوچھیں گے: تمھیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟] وہ کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔

مطلب یہ ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہ تھے جنھوں نے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کو مان کر خدا کا وہ اولین حق ادا کیا ہو جو ایک خدا پرست انسان پر عائد ہوتا ہے، یعنی نماز۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نماز کوئی شخص اس وقت تک پڑھ نہیں سکتا جب تک وہ ایمان نہ لایا ہو۔ اس لیے نمازیوں میں سے ہونا آپ سے آپ ایمان لانے والوں میں سے ہونے کو مستلزم ہے۔ لیکن نمازیوں میں سے نہ ہونے کو دوزخ کا سبب قرار دے کر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ ایمان لا کر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا، اگر وہ تارکِ نماز ہو۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۱۵۴، المدثر، حاشیہ ۳۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نماز سے غفلت برتنے والوں کا انجام

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ (الماعون ۱۰۷: ۵) پھر تباہی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ ○

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہاں 'ف' اس معنی میں ہے کہ کھلے کھلے منکرین آخرت کا حال تو یہ تھا جو ابھی تم نے سنا، اب ذرا اُن منافقوں کا حال بھی دیکھو جو نماز پڑھنے والے گروہ، یعنی مسلمانوں میں شامل ہیں، وہ چونکہ بظاہر مسلمان ہونے کے باوجود آخرت کو جھوٹ سمجھتے ہیں، اس لیے ذرا دیکھو کہ وہ اپنے لیے کس تباہی کا سامان کر رہے ہیں۔

مصلین کے معنی تو 'نماز پڑھنے والوں' کے ہیں، لیکن جس سلسلۂ کلام میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور آگے ان لوگوں کی جو صفات بیان کی گئی ہے اُن کے لحاظ سے اس لفظ کے معنی درحقیقت نمازی ہونے کے نہیں بلکہ اہلِ صلوٰۃ، یعنی مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونے کے ہیں۔

[آگے] فِىْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ نہیں کہا گیا بلکہ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ کہا گیا ہے۔ اگر فی صلاتھم کے الفاظ استعمال ہوتے تو مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنی نماز میں بھولتے ہیں۔ لیکن نماز پڑھتے پڑھتے کچھ بھول جانا شریعت میں نفاق تو درکنار، گناہ بھی نہیں ہے بلکہ سرے سے کوئی عیب یا قابلِ گرفت بات تک نہیں ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی وقت نماز میں بھول لاحق ہوئی ہے اور حضورؐ نے اس کی تلافی کے لیے سجدہ سہو کا طریقہ مقرر فرمایا ہے۔ اس کے برعکس عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی نماز سے غافل ہیں۔ نماز پڑھی تو اور نہ پڑھی تو، دونوں کی ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کبھی پڑھتے ہیں اور کبھی نہیں پڑھتے۔ پڑھتے ہیں تو اس طرح کہ نماز کے وقت کو ٹالتے رہتے ہیں اور جب وہ بالکل ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے تو اٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتے ہیں۔ یا نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو بددلی کے ساتھ اٹھتے ہیں اور بادلِ ناخواستہ پڑھ لیتے ہیں، جیسے کوئی مصیبت ہے جو ان پر نازل کی گئی ہے۔ کپڑوں سے کھیلتے ہیں، جماہیاں لیتے ہیں۔ خدا کی یاد کا کوئی شائبہ تک ان کے اندر نہیں ہوتا۔ پوری نماز میں اُن کو نہ یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں اور نہ یہ خیال رہتا ہے کہ انھوں نے کیا پڑھا ہے۔ پڑھ رہے ہوتے ہیں نماز اور دل کہیں اور پڑا رہتا ہے۔ مارامار، اس طرح پڑھتے ہیں کہ نہ قیام ٹھیک ہوتا ہے نہ رکوع نہ سجود۔ بس کسی نہ کسی طرح نماز کی سی شکل بنا کر جلدی سے جلدی فارغ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ تو ایسے ہیں کہ کسی جگہ پھنس گئے تو نماز پڑھ لی، ورنہ اس عبادت کا کوئی مقام ان کی زندگی میں نہیں ہوتا۔ نماز کا وقت آتا ہے تو انھیں محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ نماز کا وقت ہے۔ مؤذن کی آواز کان میں آتی ہے تو انھیں یہ خیال تک نہیں آتا کہ یہ کیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پکار رہا ہے، کس کو پکار رہا ہے اور کس لیے پکار رہا ہے۔ یہی آخرت پر ایمان نہ ہونے کی علامات ہیں۔ کیونکہ دراصل اسلام کے مدعیوں کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ نہ نماز پڑھنے پر کسی جزا کے قائل ہیں اور نہ انھیں اس بات کا یقین ہے کہ اس کے نہ پڑھنے پر کوئی سزا ملے گی۔ اسی بنا پر حضرت انس بن مالک اور عطاء بن دینار کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے اس نے فی صلاتھم ساھون نہیں بلکہ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ فرمایا۔ یعنی ہم نماز میں بھولتے تو ضرور ہیں مگر نماز سے غافل نہیں ہیں، اس لیے ہمارا شمار منافقوں میں نہیں ہوگا۔

قرآن مجید میں منافقین کی اس کیفیت کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ وَلَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَھُمْ کُسَالٰی وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَھُمْ کٰرِھُوْنَ۔ (التوبہ ۹: ۵۴) وہ نماز کے لیے نہیں آتے مگر کسمساتے ہوئے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، مگر بادلِ ناخواستہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: تِلْكَ صَلٰوةُ الْمُنَافِقِ، تِلْكَ صَلٰوةُ الْمُنَافِقِ، تِلْكَ صَلٰوةُ الْمُنَافِقِ، یَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰی اِذَا کَانَتْ بَیْنَ قَرْنَیِ الشَّیْطٰنِ قَامَ فَنَقَرَ اَرْبَعاً لَا یَذْکُرُ اللّٰهَ فِیْهَا اِلَّا قَلِیْلاً (بخاری، مسلم، مسند احمد) یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے یہ منافق کی نماز ہے۔ عصر کے وقت بیٹھا سورج کی طرف دیکھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان پہنچ جاتا ہے (یعنی غروب کا وقت قریب آجاتا ہے) تو اٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے جن میں اللہ کو کم ہی یاد کرتا ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے ان کے صاحبزادے مُصعب بن سعدؒ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن لوگوں کے بارے میں پوچھا تھا جو نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کو اس کا وقت ٹال کر پڑھتے ہیں۔ (ابن جریر، ابویعلیٰ، ابن المنذر، ابنِ ابی حاتم، طبرانی فی الاوسط، ابنِ مردویہ، بیہقی فی السنن۔ یہ روایت حضرت سعد کے اپنے قول کی حیثیت سے بھی موقوفاً نقل ہوئی ہے اور اس کی سند زیادہ قوی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی حیثیت سے اس کی روایت کو مرفوعاً روایت کو بیہقی اور حاکم نے ضعیف قرار دیا ہے۔)

حضرت مصعبؒ کی دوسری روایت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے والد ماجد سے پوچھا کہ اس آیت پر آپ نے غور فرمایا؟ کیا اس کا مطلب نماز کو چھوڑ دینا ہے؟ یا اس سے مراد نماز پڑھتے پڑھتے آدمی کا خیال کہیں اور چلا جانا ہے؟ خیال بٹ جانے کی حالت ہم میں سے کس پر نہیں گزرتی؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں! اس سے مراد نماز کے وقت کو ضائع کرنا اور اسے وقت ٹال کر پڑھنا ہے۔ (ابنِ جریر، ابنِ ابی شیبہ، ابویعلیٰ، ابنِ المنذر، ابنِ مردویہ، بیہقی فی السنن)[1]

۱۔ احادیث کی تخریج تفہیم الاحادیث، ج ۳ میں ملاحظہ کی جائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس مقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ نماز میں دوسرے خیالات کا آ جانا اور چیز ہے اور نماز کی طرف کبھی متوجہ ہی نہ ہونا اور اس میں ہمیشہ ہی دوسری باتیں سوچتے رہنا بالکل دوسری چیز۔ پہلی حالت تو بشریت کا تقاضا ہے، بلاارادہ دوسرے خیالات آ ہی جاتے ہیں اور مومن کو جب بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ نماز سے اس کی توجہ ہٹ گئی ہے تو وہ پھر کوشش کر کے اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ دوسری حالت نماز سے غفلت برتنے کی تعریف میں آتی ہے کیونکہ اس میں آدمی صرف نماز کی ورزش کر لیتا ہے۔ خدا کی یاد کا کوئی ارادہ اس کے دل میں نہیں ہوتا۔ نماز شروع کرنے سے سلام پھیرنے تک ایک لمحے کے لیے بھی اس کا دل خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، اور جن خیالات کو لیے ہوئے وہ نماز میں داخل ہوتا ہے انھی میں مستغرق رہتا ہے۔[1]

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۴۸۳-۴۸۵، الماعون، حاشیہ ۸-۹)

۱- نمازوں کو ضائع کرنے سے مراد ترک نماز بھی ہے، نماز با جماعت کے اہتمام سے غفلت بھی اور .... نماز کے حقیقی فائدوں کو ضائع کرنا اور ادائے نماز کے باوجود خوف خدا سے خالی رہنا (بھی)۔ (مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، اوّل، جون ۱۹۷۰ء، ص ۳۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب دوم

نماز کی شرائط

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

طہارت

طہارت کا حکم

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ (البقرہ ۲:۲۲۲) اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ ط وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّھَّرُوْا ط وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْھِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ مِّنْہُ ط مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○ (المائدۃ ۵:۶) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو چاہیے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو، سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو[1]۔ اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ[2]۔ اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو، اور پانی نہ ملے، تو پاک مٹی سے کام لو، بس اُس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔ اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا، مگر وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

طہارت کا جامع مفہوم

وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ ○ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ ○ (المدثر ۷۴:۴-۵) اور اپنے کپڑے پاک رکھو اور گندگی سے دور رہو۔

□ **بدنی طہارت:** یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو، کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح

۱- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی جو تشریح فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منہ دھونے میں کلی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے، بغیر اس کے منہ کے غسل کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اور کان چونکہ سر کا ایک حصہ ہیں اس لیے سر کے مسح میں کانوں کے اندرونی و بیرونی حصوں کا مسح بھی شامل ہے۔ نیز وضو شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھو لینے چاہییں تاکہ جن ہاتھوں سے آدمی وضو کر رہا ہو وہ خود پہلے پاک ہو جائیں۔ (مؤلف)

۲- جنابت خواہ مباشرت سے لاحق ہوئی ہو یا خواب میں مادۂ منویہ خارج ہونے کی وجہ سے، دونوں صورتوں میں غسل واجب ہے۔ اس حالت میں غسل کے بغیر نماز پڑھنا یا قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہیں۔ (تفہیم القرآن، اوّل، ص ۴۴۸، المائدۃ، حاشیہ ۲۴-۲۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت اور نظافت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا اور حضورؐ کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا۔ اس لیے آپؐ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپؐ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضورؐ نے نوع انسانی کو طہارتِ جسم و لباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتیٰ کہ دنیا کی بیش تر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو 'طہارت' کا ہم معنی ہو۔

بخلاف اس کے اسلام کا یہ حال ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے جس میں پاکی اور ناپاکی کے فرق اور پاکیزگی کے طریقوں کو انتہائی تفصیلی جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

□ **نظافتِ لباس:** دوسرا مفہوم ان الفاظ کا یہ ہے کہ اپنا لباس صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچیلا ہو، اتنا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اجلے کپڑے ہی پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیادار انسان ہے حالانکہ انسانی فطرت میل کچیل سے نفرت کرتی ہے اور شائستگی کی معمولی حس بھی جس شخص کے اندر موجود ہو وہ صاف ستھرے انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اس کی ظاہری حالت بھی ایسی پاکیزہ اور نفیس ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کثافت نہ پائی جائے جو طبائع کو اس سے متنفر کرنے والی ہو۔

□ **اخلاقی عیوب سے پاکی:** تیسرا مفہوم اس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو، تمھارا لباس ستھرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو، مگر اس میں فخر و غرور، ریا اور نمائش، ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ لباس وہ اولین چیز ہے جو آدمی کی شخصیت کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے۔ جس قسم کا لباس کوئی شخص پہنتا ہے اس کو دیکھ کر لوگ پہلی نگاہ ہی میں یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ رئیسوں اور نوابوں کے لباس، مذہبی پیشہ وروں کے لباس، متکبر اور برخود غلط لوگوں کے لباس، چھچھورے اور کم ظرف لوگوں کے لباس، بدقوارہ اور آوارہ منش لوگوں کے لباس، سب اپنے پہننے والوں کے مزاج کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانے والے کا مزاج ایسے سب لوگوں سے فطرتاً مختلف ہوتا ہے، اس لیے اس کا لباس بھی ان سب سے لازماً مختلف ہونا چاہیے۔ اس کو ایسا لباس پہننا چاہیے جسے دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کر لے کہ وہ ایک شریف اور شایستہ انسان ہے جو نفس کی کسی برائی میں مبتلا نہیں ہے۔

□ **پاک دامنی:** چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اردو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی پاک دامنی کے ہم معنی الفاظ، اخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابنِ عباسؓ، ابراہیم نخعی، شعبی، عطا، مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر، حسن بصری اور دوسرے اکابر مفسرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو۔ عربی محاورے میں کہتے ہیں: فُلَانٌ طَاهِرُ الثِّيَابِ وَ فُلَانٌ طَاهِرُ الذَّيْلِ. فلاں شخص کے کپڑے پاک ہیں یا اس کا دامن پاک ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق اچھے ہیں۔ اس کے برعکس کہتے ہیں: فُلَانٌ دَنِسُ الثِّيَابِ. اس شخص کے کپڑے گندے ہیں اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بدمعاملہ آدمی ہے، اس کے قول قرار کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے، خواہ وہ عقائد اور خیالات کی ہو، یا اخلاق و اعمال کی، یا جسم و لباس اور رہن سہن کی۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے گردوپیش سارے معاشرے میں طرح طرح کی جو گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان سب سے اپنا دامن بچا کر رکھو۔ کوئی شخص کبھی تم پر یہ حرف نہ رکھ سکے کہ جن برائیوں سے تم لوگوں کو روک رہے ہو ان میں سے کسی کا بھی کوئی شائبہ تمھاری اپنی زندگی میں پایا جاتا ہے۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۱۴۳-۱۴۵، المدثر، حاشیہ ۵،۴)

وضو

دل کی طہارت

اس آواز (اذان) کو سن کر تم اٹھتے ہو اور سب سے پہلے اپنا جائزہ لے کر دیکھتے ہو کہ میں پاک ہوں یا ناپاک؟ میرے کپڑے پاک ہیں یا نہیں؟ گویا تمھیں اس بات کا احساس ہے کہ بادشاہ دو عالم کے دربار میں حاضری کا معاملہ دنیا کے دوسرے سب معاملات سے مختلف ہے۔ دوسرے کام تو ہر حال میں کیے جا سکتے ہیں، مگر یہاں جسم اور لباس کی پاکی اور اس پاکی پر مزید طہارت (یعنی وضو) کے بغیر حاضری دینا سخت بے ادبی ہے۔ اس احساس کے ساتھ تم پہلے اپنے پاک ہونے کا اطمینان کرتے ہو اور پھر وضو شروع کر دیتے ہو۔ اس وضو کے دوران میں اگر تم اپنے اعضا دھونے کے ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر کرتے رہو اور فارغ ہو کر وہ دعا پڑھو جو رسول اللہ نے سکھائی ہے تو محض تمھارے اعضا ہی نہ دھلیں گے بلکہ ساتھ ساتھ تمھارا دل بھی دھل جائے گا۔

وضو کے بعد دعا

اس دعا کے الفاظ یہ ہیں: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ. اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ. میں شہادت دیتا ہوں کہ اکیلے ایک لاشریک خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ خدایا! مجھے توبہ کرنے والوں میں شامل کر اور مجھے پاکیزگی اختیار کرنے والا بنا۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۸-۱۴۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وضو کی حکمت

وضو میں منہ، کہنیوں تک، ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھونے اور سر پر مسح کرنے کا حکم تو قرآن میں دیا گیا ہے۔ (المائدہ ۵:۶) پھر منہ اور پاؤں دھونے کے حکم کی...... [یہ توجیہ] صحیح نہیں ہے...... کہ یہ حکم محض گرد صاف کرنے کے لیے دیا گیا ہے اور جہاں گرد و غبار نہ ہو وہاں اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے...... دراصل اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اس کی عبادت کے قابل ہونے اور قابل نہ ہونے کی حالت کے درمیان فرق کیا جائے تاکہ آدمی جب اس کی عبادت کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اپنے جسم اور لباس کا جائزہ لے کر دیکھے کہ آیا میں خدا کے حضور حاضر ہونے کے قابل ہوں یا نہیں، اور جانے سے پہلے اپنے آپ کو پاک صاف کرکے اہتمام کے ساتھ جائے۔ اس طرح عبادت کی اہمیت دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور آدمی اسے اپنے عام معمولی کاموں سے ایک مختلف اور بالاتر نوعیت کا کام سمجھ کر بجالاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں پانی نہ ملے وہاں تیمّم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حالانکہ تیمم سے بظاہر کوئی صفائی بھی نہیں ہوتی۔

علاوہ بریں وضو میں جس صفائی کا حکم دیا گیا ہے اس سے ایک ضمنی مقصد یہ بھی ہے کہ پنج وقتہ نماز کی وجہ سے آدمی کو پاک رہنے کی عادت پڑ جائے۔ گندگی لازماً صرف مٹی اور گرد و غبار کی وجہ سے ہی نہیں ہوتی۔ آدمی کے مسامات سے ہر وقت کچھ نہ کچھ فضلات خارج ہوتے رہتے ہیں، اگر اسے دھویا نہ جاتا رہے تو یہ مادے جسم کی سطح پر جم جم کر بو پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب لوگوں کے منہ سے بھی بو آتی ہے، ان کے بدن میں بھی ایک طرح کی سڑاند ہوتی ہے، اور اُن کے پاؤں تو سخت بدبودار ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے جوتوں اور جرابوں میں بھی تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے پیرو کسی حیثیت سے بھی نفرت انگیز حالت میں رہیں۔ یورپ کے لوگ اس بدبو کو دبانے کے لیے عطریات اور لونڈر استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ بدبو کو اوپری خوشبوؤں سے دبانا کوئی پاکیزگی و طہارت نہیں ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۳۱۰-۳۱۱)

وضو میں پاؤں دھونے کا مسئلہ

س: آیت وضو (المائدہ ۵:۶) میں فَاغْسِلُوْا اور وَامْسَحُوْا دو فعل استعمال ہوئے ہیں۔ پہلے سے چہرے اور کہنیوں تک ہاتھ دھونے کا حکم ہے۔ اور دوسرے سے پیروں اور سر کے مسح کرنے کا حکم ہے۔ سمجھنا یہ مقصود ہے کہ اہلِ سنت پیر دھوتے ہیں پیروں کا مسح کیوں نہیں کرتے؟ یہ بات کہاں سے ظاہر ہوتی ہے کہ پیر وضو کے آخر میں دھوئے جائیں؟

ج: آیتِ وضو کے متعلق شیعوں اور سنیوں کے درمیان یہ اختلاف بہت پرانا ہے کہ آیا اس میں پاؤں دھونے کا حکم دیا گیا ہے یا ان پر صرف مسح کرنے کا...... یہ غلط فہمی ہے کہ قرآن میں صاف پیروں کے مسح کرنے کا حکم ہے اور اہلِ سنت نے محض حدیث کی بنیاد پر دھونے کا مسلک اختیار کر لیا ہے۔ اگر صاف حکم یہی موجود ہوتا تو پھر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف عمل کرتا۔ اصل مختلف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فیہ سوال تو یہی ہے کہ قرآن فی الواقع ان دونوں فصلوں میں کس کا حکم دیتا ہے اور اس کا حقیقی منشا کیا ہے۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں:
يَآيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ۔ (المائدہ ۵:۶) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم اٹھو نماز کے لیے تو دھوؤ اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک اور مسح کرو اپنے سروں پر اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک۔

اس میں لفظ وَأَرْجُلَكُمْ کی دو قراءتیں متواتر ہیں۔ نافع، ابن عامر، حفص، کسائی اور یعقوب کی قراءت وَأَرْجُلَكُمْ (بفتح لام) ہے اور ابن کثیر، حمزہ، ابو عمر اور عاصم کی قراءت وَأَرْجُلِكُمْ (بکسرِ لام)۔ ان میں سے کسی قراءت کی حیثیت بھی یہ نہیں ہے کہ بعد میں کسی وقت بیٹھ کر نحویوں نے اپنے اپنے فہم اور منشا کے مطابق الفاظِ قرآنی پر خود اعراب لگا دیے ہوں، بلکہ یہ دونوں قراءتیں متواتر طریقے سے منقول ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلی قراءت اختیار کی جائے تو وَأَرْجُلَكُمْ کا تعلق فَاغْسِلُوا کے حکم سے جڑتا ہے اور معنی یہ ہو جاتے ہیں: 'اور دھوؤ اپنے پاؤں ٹخنوں تک' اور اگر دوسری قراءت قبول کی جائے تو اس کا تعلق وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ سے قائم ہوتا ہے اور معنی یہ نکلتے ہیں: 'اور مسح کرو اپنے پاؤں ٹخنوں تک'۔

یہ صریح اختلاف ہے جو ان دو مشہور و معروف اور متواتر قراءتوں کی وجہ سے آیت کے معنی میں واقع ہو جاتا ہے اس تعارض کو رفع کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں قراءتوں کو کسی ایک ہی مفہوم (غسل یا مسح) پر محمول کیا جائے۔ لیکن اس کی جتنی کوششیں بھی کی گئی ہیں وہ ہمیں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچاتیں۔ کیونکہ جتنے وزنی دلائل کے ساتھ ان کو غسل پر محمول کیا جا سکتا ہے قریب قریب اتنے ہی وزنی دلائل مسح پر محمول کرنے کے حق میں بھی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ محض قواعدِ زبان کی بنا پر ان میں سے کسی ایک معنی کو ترجیح دی جائے۔ لیکن یہ صورت بھی مفید مطلب نہیں، کیونکہ دلائل ترجیح دونوں پہلوؤں میں قریب قریب برابر ہیں۔ اب آخر اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عمل کو دیکھا جائے۔

ظاہر ہے کہ وضو کا حکم کہیں خلا میں تو نہیں دیا گیا تھا اور نہ وہ محض قرآن کی مصحف پر لکھا ہوا ہمیں مل گیا ہے۔ یہ تو ایک ایسے فعل کا حکم ہے جو پنج وقتہ نمازوں کے موقع پر عمل کرنے کے لیے دیا گیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اس پر ہر روز کئی کئی بار عمل کرتے تھے اور آپ کے متبعین، مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب روزانہ اس حکم کی تعمیل اُس طریقے پر کرتے تھے جو انھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل سے سیکھا تھا۔ آخر ہم کیوں نہ یہ دیکھیں کہ قرآن کے اس حکم پر ہزارہا صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور بعد کے بے شمار مسلمانوں نے صحابہؓ کو کس طرح عمل کرتے دیکھا؟ قرآن کے الفاظ سے جو بات واضح نہ ہوتی ہو اسے سمجھنے کے لیے اس ذریعے سے زیادہ معتبر ذریعہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔

اس ذریعۂ علم کی طرف جب ہم رجوع کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ صحابہ کی اتنی کثیر تعداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پاؤں دھونے کے قول اور عمل کو نقل کرتی ہے، اور تابعین کی اس سے بھی زیادہ تعداد صحابہؓ سے اس کو روایت کرتی ہے کہ اس خبر کی صحت میں شک کرنے کی کوئی گنجایش نہیں رہتی۔ یہ درست ہے کہ کچھ تھوڑی سی روایات مسح کے حق میں بھی ہیں۔ لیکن ان میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے کسی میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا عمل مسح کا تھا، بلکہ دو تین صحابیوں کی اپنی رائے یہ تھی کہ قرآن صرف مسح کا حکم دیتا ہے۔ نیز ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ اگر وضو سے ہوتے اور پھر نماز کے وقت تجدیدِ وضو کرنا چاہتے تو صرف مسح پر اکتفا کرتے تھے۔ دوسری طرف متعدد مستند روایات خود اہلِ تشیع کے ہاں ایسی ملتی ہیں جن سے پاؤں دھونے کا حکم اور عمل ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً محمد بن نعمان کی روایت ابو عبد اللہؒ سے، جس کو کلبی اور ابو جعفر طوسی نے بھی صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ اگر تم سر کا مسح بھول جاؤ اور پاؤں دھو بیٹھو تو پھر سر کا مسح کرو اور دوبارہ پاؤں دھولو۔

اسی طرح محمد بن حسن الصفار حضرت زید بن علی سے، وہ اپنے والد امام زین العابدین سے، وہ اپنے والد امام حسینؓ سے اور وہ اپنے والد سیدنا علیؓ سے ان کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ میں وضو کرنے بیٹھا، سامنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ میں جب پاؤں دھونے لگا تو آپؐ نے فرمایا: اے علی! انگلیوں کے درمیان خلال کرلو۔

الشرف الرضی نے نہج البلاغہ میں حضرت علی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی جو کیفیت نقل کی ہے اس میں بھی وہ پاؤں دھونے ہی کا ذکر فرماتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ روایات کا وزن تمام تر غَسلِ قدمین کے حق میں ہے اور محض مسح کی تائید بہت ہی کم، اور سنداً اور معناً کمزور روایتیں کرتی ہیں۔

اب عقل کے لحاظ سے دیکھیے تو پاؤں دھونے ہی کا عمل زیادہ معقول اور قرآن کے منشا سے قریب تر محسوس ہوتا ہے۔ وضو میں جتنے اعضا کی صفائی کا حکم دیا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ گندگی اور میل کچیل لگنے کا امکان اگر کسی عضو کو ہے تو وہ پاؤں ہی ہیں۔ اور سب سے کم جس حصۂ جسم کے آلودہ ہونے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں وہ سر ہے۔ یہ عجیب بات ہوگی کہ دوسرے سب اعضا کو تو دھونے کا حکم ہو اور پاؤں مسح کے حکم میں سر کے ساتھ شامل کیے جائیں۔ پھر پاؤں پر مسح اگر وضو کے آخر میں کیا جائے تو لامحالہ گیلے ہاتھ ہی پھیرنے ہوں گے اس صورت میں پاؤں پر جو گرد و غبار یا میل کچیل موجود ہوگا وہ گیلے ہاتھ پھیرنے سے اور بھی زیادہ گندے ہو جائے گا۔ علاوہ بریں اگر آدمی پاؤں پر صرف مسح کرے تو آیت کے دو محتمل[1] معنوں میں سے ایک (یعنی غَسلِ قدمین) لازماً چھوٹ جاتا ہے اور صرف ایک ہی مفہوم کی تعمیل ہوتی ہے۔ لیکن اگر آدمی پاؤں دھوئے بھی اور اچھی طرح ہاتھوں سے مل کر ان کو صاف بھی کر دے تو آیت کے دونوں مفہوموں پر بدرجۂ اتم عمل ہو جاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں غسل اور مسح دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔

البتہ مسح کے حکم پر عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں کیا ہے جبکہ آپؐ نے موزے پہنے ہوئے تھے۔ یہ آیت کے دوسرے مفہوم سے بھی مطابقت رکھتا ہے، بکثرت روایاتِ صحیحہ سے بھی ثابت ہے، اور سراسر معقول بھی۔ مگر تعجب ہے کہ شیعہ حضرات اسے نہیں مانتے حالانکہ یہ ان کے اپنے مسلک سے بھی قریب تر ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۴۱۹-۴۲۵)

۱- ترجمان القرآن اور کتابی صورت میں ابتدائی اشاعتوں میں یہ لفظ مُحتمل (میم کے بعد ح اور پھر ت) ہے اور یہی درست ہے۔ (مرتبین)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وضو کے قرآنی احکام میں کمی بیشی

س: قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم نماز کی تیاری کریں تو ہمیں وضو کرنا چاہیے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نماز کے لیے از سرِ نو وضو کرنا ضروری ہے، نماز پڑھ لینے کے بعد وضو کی میعاد ختم ہو جاتی ہے اور دوسری نماز کے لیے بہر حال الگ وضو کرنا لازمی ہے۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ لوگ ایک وضو سے کئی کئی نمازیں کیوں پڑھتے ہیں۔ اسی طرح قرآن میں وضو کے جو ارکان [بیان] ہوئے ہیں اُن میں کلی کرنے اور ناک میں پانی لینے کا ذکر نہیں ہے اور نہ کہیں ایسے افعال و عوارض کی فہرست دی گئی ہے جن سے وضو ٹوٹتا ہے۔ اس صورت میں کلی وغیرہ کرنا اور بعض امور کو نواقضِ وضو قرار دینا کیا قرآنی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے؟

ج: بلاشبہ وضو کے بارے میں قرآن مجید میں یہی حکم ہے کہ جب نماز کے لیے اٹھو تو وضو کرو، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ اس حکم کا منشا کیا ہے؟ اسی طرح قرآن میں صرف منہ دھونے کا حکم ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منہ دھونے کا صحیح طریقہ اور معنی بتائے کہ اس میں کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا بھی شامل ہے۔ قرآن میں صرف سر کے مسح کا حکم ہے، مگر حضورؐ نے ہمیں بتایا کہ سر کے مسح میں کان کا مسح بھی شامل ہے۔ آپ نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ وضو شروع کرتے وقت پہلے اُن ہاتھوں کو پاک کر لو جن سے تمھیں وضو کرنا ہے۔ یہ باتیں قرآن میں نہیں بتائی گئی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمِ قرآنی کی تشریح کر کے ہمیں یہ باتیں بتائی ہیں۔ قرآن کے ساتھ نبی کے آنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ کتاب کے منشا کو کھول کر ہمیں بتائے اور اس پر عمل کر کے بتائے۔ آیت: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ [النحل ۱۶: ۴۴] میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اے نبی! ہم نے یہ ذکر لوگوں کے پاس براہِ راست بھیج دینے کے بجائے تمھاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے سامنے وضاحت کے ساتھ اس ہدایت کی تشریح کرو جو اُن کی طرف بھیجی گئی ہے۔

اس بات کو اگر آپ اچھی طرح سمجھ لیں تو آپ کو اپنے اس سوال کا جواب سمجھنے میں بھی کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ ایک ہی وضو سے ایک سے زائد نمازیں پڑھنا کیوں جائز ہے۔ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ ایک وضو کی مدتِ قیام کس قدر ہے؟ اور کن چیزوں سے یہ مدت ختم ہوتی ہے۔ اگر حضورؐ یہ نہ بتاتے تو ایک شخص یہ غلطی کر سکتا تھا کہ تازہ وضو کے بعد پیشاب کر لیتا یا کسی دوسرے ناقضِ وضو فعل کا صدور اس سے ہو جاتا اور وہ پھر بھی نماز کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ یا مثلاً دورانِ نماز میں ریح خارج ہو جانے کے باوجود نماز پڑھ ڈالتا۔ قرآن میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ نماز کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے، یہ نہیں بتایا گیا کہ وضو کب تک باقی رہتا ہے اور کن چیزوں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص بطورِ خود یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ابھی ابھی جس شخص نے وضو کیا ہے، ریح خارج ہونے سے اس کے وضو میں کیا قباحت واقع ہو جاتی ہے۔ اب جبکہ حضورؐ نے واضح طور پر یہ بتا دیا کہ وضو کے ساقط کرنے والے اسباب کیا ہیں تو اس سے خود بخود یہ بات نکل آئی کہ جب تک ان اسباب میں سے کوئی سبب رونما نہ ہو، وضو باقی رہے گا خواہ اس پر کتنے ہی گھنٹے گزر جائیں۔ اور جب ان میں سے کوئی سبب رونما ہو جائے تو وضو باقی نہ رہے گا خواہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آدمی نے ابھی ابھی تازہ وضو کیا ہو اور اس کے اعضا بھی پوری طرح خشک نہ ہوئے ہوں۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۶۸-۷۱)

مَسِّ الذَّکر سے وضو ٹوٹنے کا مسئلہ

حنفیہ کے نزدیک ذکر [عضوِ خاص] کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا مگر باقی تینوں ائمہ کی رائے یہ ہے کہ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ البتہ حنفیہ کہتے ہیں کہ مَسِّ ذکر کے بعد اگر وضو کر لیا جائے تو اچھا ہے۔ دراصل اختلاف دو حدیثوں کی وجہ سے ہے۔ ایک حدیث میں یہ ہے کہ حضورؐ سے جب یہ مسئلہ دریافت کیا گیا تو آپؐ نے جواب دیا: 'کیا وہ تیرے ہی جسم کا ایک حصہ نہیں ہے؟' یعنی اگر کسی دوسرے حصۂ جسم کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا تو اسے چھونے سے کیوں ٹوٹے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ 'جو اپنے ذکر کو چھوئے وہ وضو کرے'۔ حنفیہ نے پہلی حدیث کو لیا ہے، اور دوسری حدیث کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں وضو اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی اس کے بعد آدمی کو ہاتھ دھو لینا چاہیے۔ باقی ائمہ اسے اصطلاحی معنی میں لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد نماز کے لیے آدمی کو از سر نو وضو کرنا چاہیے۔

(مکتوبات سید ابوالاعلیٰ مودودی بنام حکیم محمد شریف مسلم، جنوری ۱۹۸۶ء، ص ۷۷)

نواقضِ وضو اور انسانی عقل

س: اسلام نے جسم و لباس کی طہارت و نظافت کا جو لحاظ رکھا ہے اس کی قدر و قیمت سے عقلِ انسانی انکار نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سلسلے میں بعض جزئیات بالکل ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ریح کے نکلنے سے وضو کا ٹوٹ جانا، حالانکہ جسم کے ایک حصے سے محض ایک ہوا کے نکل جانے میں بظاہر کوئی ایسی نجاست نہیں ہے جس سے وضو ساقط ہو جائے۔ آخر اس ہوا سے کیا چیز گندی ہو جاتی ہے؟ اسی طرح پیشاب کرنے سے وضو کا سقوط، حالانکہ اگر احتیاط سے پیشاب کیا جائے اور پھر اچھی طرح دھو لیا جائے تو کہیں کوئی نجاست لگی نہیں رہ جاتی۔ یہی حال دوسرے نواقضِ وضو کا ہے جس[1] سے وضو ٹوٹنے اور تجدیدِ وضو لازم آنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ براہِ کرم اس الجھن کو اس طرح دور کیجیے کہ مجھے عقلی اطمینان حاصل ہو جائے۔

ج: نواقضِ وضو کے مسئلے میں آپ کو جو شبہات پیش آئے ہیں انھیں اگر آپ حل کرنا چاہیں تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ شریعت میں جن جن باتوں سے وضو کے ٹوٹنے اور تجدیدِ وضو لازم آنے کا حکم لگایا گیا ہے پہلے ان سب کو اپنے ذہن سے نکال دیجیے، پھر خود اپنے طور پر سوچیے کہ عام انسانوں کے لیے (جن میں عالم اور جاہل، عاقل اور کم عقل، طہارت پسند اور طہارت سے غفلت کرنے والے، سب ہی قسم کے لوگ مختلف درجات و حالات کے موجود ہیں) آپ کو ایک ایسا ضابطہ بنانا ہے جس میں حسبِ ذیل خصوصیات موجود ہوں:

۱- یہ لفظ رسائل و مسائل کی پہلی اشاعت میں بھی 'س' کے ساتھ ہے 'جس' مگر ترجمان القرآن میں 'جن' ہے اور یہی درست ہے۔ (مرتب)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۱۔ لوگوں کو بار بار صاف اور پاک ہوتے رہنے پر مجبور کیا جائے اور ان میں نظافت کی حس اس قدر بیدار کر دی جائے کہ وہ نجاستوں اور کثافتوں سے خود بچنے لگیں۔

۲۔ خدا کے سامنے حاضر ہونے کی اہمیت اور امتیازی حیثیت ذہن میں بٹھائی جائے تاکہ نیم شعوری طور پر آدمی خود بخود اپنے اندر یہ محسوس کرنے لگے کہ نماز کے قابل ہونے کی حالت دنیا کی دوسری مشغولیتوں کے قابل ہونے کی حالت سے لازماً مختلف ہے۔

۳۔ لوگوں کو اپنے نفس اور اس کے حال کی طرف توجہ رکھنے کی عادت ڈالی جائے تاکہ وہ اپنے پاک یا ناپاک ہونے اور ایسے ہی دوسرے احوال سے جو اُن پر وارد ہوتے رہتے ہیں بے خبر نہ ہونے پائیں اور ایک طرح سے خود اپنے وجود کا جائزہ لیتے رہیں۔

۴۔ ضابطے کی تفصیلات کو ہر شخص کے اپنے فیصلے اور رائے پر نہ چھوڑا جائے بلکہ ایک طریق کار متعین ہو، تاکہ انفرادی طور پر لوگ طہارت میں افراط و تفریط نہ کریں۔

۵۔ ضابطہ اسی طرح بنایا جائے کہ اس میں اعتدال کے ساتھ طہارت کا مقصد حاصل ہو، نہ اتنی سختی ہو کہ زندگی تنگ ہو کر رہ جائے اور نہ اتنی نرمی کہ پاکیزگی ہی باقی نہ رہے۔

ان پانچ خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر آپ خود ایک ضابطہ تجویز کریں اور خیال رکھیں کہ اس میں کوئی بات اُس نوعیت کی نہ آنے پائے جس پر وہ اعتراضات ہو سکتے ہوں، جو آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔

اس قسم کا ضابطہ بنانے کی کوشش میں اگر آپ صرف ایک ہفتہ صرف کریں گے تو آپ کی سمجھ میں خود بخود یہ بات آ جائے گی کہ ان خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر صفائی و طہارت کا کوئی ایسا ضابطہ نہیں بنایا جا سکتا جس پر اُس نوعیت کے اعتراضات وارد نہ ہو سکتے ہوں جو آپ نے پیش کیے ہیں۔ آپ کو بہر حال کچھ چیزیں ایسی مقرر کرنی پڑیں گی جن کے پیش آنے پر ایک طہارت کو ختم شدہ فرض کرنا اور دوسری طہارت کو ضروری قرار دینا ہوگا۔ آپ کو یہ بھی متعین کرنا ہوگا کہ ایک طہارت کی مدتِ قیام (duration) کن حدود تک رہے گی اور کن حدود پر ختم ہو جائے گی۔ اس غرض کے لیے جو حدیں بھی آپ تجویز کریں گے ان میں ناپاکی ظاہر اور نمایاں اور محسوس نہ ہو گی بلکہ فرضی اور حکمی ہی ہوگی۔ اور لامحالہ بعض حوادث ہی کو حد بندی کے لیے نشان مقرر کرنا ہوگا۔ پھر آپ خود غور کیجیے کہ آپ کی تجویز کردہ حدیں اُن اعتراضات سے کس طرح بچ سکتی ہیں جو آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔

جب آپ اس زاویۂ نظر سے اس مسئلے پر غور کریں گے تو آپ خود بخود اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ شارع نے جو ضابطہ تجویز کر دیا ہے وہی ان اغراض کے لیے بہترین اور غایت درجہ معتدل ہے۔ اس کے ایک ایک جزئیہ کو الگ الگ لے کر علت و معلول اور سبب و مسبب کا ربط تلاش کرنا معقول طریقہ نہیں ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ کیا بحیثیتِ مجموعی ان اغراض و مصالح کے لیے، جو اوپر بیان ہوئی ہیں، اس سے بہتر اور جامع تر کوئی ضابطہ تجویز کیا جا سکتا ہے؟ لوگوں کو احکامِ وضو میں جو غلط فہمی پیش آتی ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس بنیادی حکمت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جو بحیثیتِ مجموعی ان احکام میں ملحوظ رکھی گئی ہے بلکہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک ایک جزئی حکم کے متعلق یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں فعل میں آخر کیا بات ہے کہ اس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی ضرب آخر کس طرح شکستِ وضو کا سبب بن جاتی ہے۔

(رسائل و مسائل، اول، جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۱۵۷-۱۶۰)

سگریٹ پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا

س: مولانا! وضو کی حالت میں سگریٹ پینا کیسا ہے؟

ج: کوئی حرج نہیں۔ وضو نہیں ٹوٹتا البتہ نماز سے پہلے کلی کر کے منہ کو اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے تاکہ سگریٹ کی بو باقی نہ رہے۔

(۵-اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۱۷۲)

وضو میں مستعمل پانی کا حکم

س: حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے پانی کو صحابہؓ شوق سے لیتے تھے اور اپنے چہروں پر ملتے تھے، حالانکہ وضو کے پانی سے وضو صحیح نہیں۔ دونوں باتوں کی تطبیق کی کیا صورت ہے؟

ج: وضو کا پانی ناپاک نہیں ہوتا، مومن بلکہ ہر انسان کا جھوٹا پاک ہے، چنانچہ اگر کلی کا پانی کپڑوں پر گر جائے تو کپڑے ناپاک نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ حکم صرف یہ ہے کہ وضو کے پانی سے وضو نہیں ہوتا۔ صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے پانی سے وضو نہیں کرتے تھے بلکہ محبت اور عقیدت کے باعث بطور تبرک پانی کو اپنے ہاتھوں اور چہروں پر مل لیتے تھے اور جن کو یہ پانی نہیں ملتا تھا وہ دوسروں کے ہاتھوں کی نمی ہی سے یہ تقاضا پورا کر لیتے تھے۔ صحابہؓ برکت کے لیے حضورؐ کے وضو کا پانی برتنوں میں بھی رکھ لیتے تھے۔

(استفسارات، اول، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۶۰)

تیمّم

بنیادی حکم

وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَیْدِیْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ (النساء ۴: ۴۳) اور اسی طرح جنابت کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ غسل نہ کر لو، اِلّا یہ کہ راستے سے گزرتے ہو۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو، یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے، یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو، اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو، بے شک اللہ نرمی سے کام لینے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔

جنابت کے اصل معنی دُوری اور بیگانگی کے ہیں۔ اسی سے لفظ اجنبی نکلا ہے۔ اصطلاحِ شرع میں جنابت سے مراد وہ نجاست ہے جو قضائے شہوت سے یا خواب میں مادہ خارج ہونے سے لاحق ہوتی ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی طہارت سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

□ **عَابِرِیْ سَبِیْلٍ کا مفہوم:** فقہا اور مفسرین میں سے ایک گروہ نے اس آیت کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں نہ جانا چاہیے، اِلّا یہ کہ کسی کام کے لیے مسجد میں سے گزرنا ہو۔ اسی رائے کو عبداللہؓ بن مسعود، انس بن مالکؓ، حسن بصری اور ابراہیم نخعی وغیرہ حضرات نے اختیار کیا ہے۔ دوسرا گروہ اس سے سفر مراد لیتا ہے۔ یعنی اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے تو تیمم کیا جا سکتا ہے۔ رہا مسجد کا معاملہ، تو اس گروہ کی رائے میں جُنبی کے لیے وضو کر کے مسجد میں بیٹھنا جائز ہے۔ یہ رائے حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؒ اور بعض دوسرے حضرات نے اختیار فرمائی ہے۔ اگرچہ اس امر میں قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے اور نہانا ممکن نہ ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن پہلا گروہ اس مسئلے کو حدیث سے اخذ کرتا ہے اور دوسرا گروہ اس روایت کی بنیاد قرآن کی مندرجہ بالا آیت پر رکھتا ہے۔

□ **لمس سے مراد:** اس امر میں اختلاف ہے کہ لمس یعنی چھونے سے کیا مراد ہے۔ حضرات علیؓ، ابن عباسؓ، ابوموسیٰؓ اشعری، اُبیؓ بن کعب، سعیدؒ بن جبیر، حسن بصری اور متعدد ائمہ کی رائے ہے کہ اس سے مراد مباشرت ہے اور اسی رائے کو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام سفیان ثوری نے اختیار کیا ہے۔ بخلاف اس کے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عمرؓ کی رائے ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب کی بھی یہی رائے ہے کہ اس سے مراد چھونا یا ہاتھ لگانا ہے اور اسی رائے کو امام شافعی نے اختیار کیا ہے۔ بعض ائمہ نے بیچ کا مسلک بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً امام مالکؒ کی رائے ہے کہ اگر عورت یا مرد ایک دوسرے کو جذباتِ شہوانی کے ساتھ ہاتھ لگائیں تو ان کا وضو ساقط ہو جائے گا اور نماز کے لیے انھیں نیا وضو کرنا ہوگا، لیکن اگر جذباتِ شہوانی کے بغیر ایک کا جسم دوسرے سے مس ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

تیمّم کے احکام

اگر آدمی بے وضو ہے یا اسے غسل کی حاجت ہے اور پانی نہیں ملتا تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر مریض ہے اور غسل یا وضو کرنے سے اس کو نقصان کا اندیشہ ہے تو پانی موجود ہونے کے باوجود تیمم کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

□ **تیمم کے معنی:** تیمم کے معنی قصد کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب پانی نہ ملے یا پانی ہو اور اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو پاک مٹی کا قصد کرو۔

□ **تیمم کا طریقہ:** تیمم کے طریقے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دفعہ مٹی پر ہاتھ مار کر منہ پر پھیر لیا جائے، پھر دوسری دفعہ ہاتھ مار کر کہنیوں تک ہاتھوں پر پھیر لیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور اکثر فقہا کا یہی مذہب ہے، اور صحابہ وتابعین میں سے حضرت علیؓ، عبداللہ بن عمرؓ، حسن بصریؒ، شعبیؒ اور سالم بن عبداللہؒ وغیرہم اس کے قائل تھے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک صرف ایک دفعہ ہی ہاتھ مارنا کافی ہے۔ وہی ہاتھ منہ پر بھی پھیر لیا جائے اور اسی کو کلائی تک ہاتھوں پر بھی پھیر لیا جائے۔ کہنیوں تک مسح کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ عطاء اور مکحول اور اوزاعی اور احمد بن حنبلؒ کا مذہب ہے اور عموماً حضراتِ اہل حدیث اسی کے قائل ہیں۔

تیمم کے لیے ضروری نہیں کہ زمین ہی پر ہاتھ مارا جائے۔ اس غرض کے لیے ہر گرد آلود چیز اور ہر وہ چیز جو خشک اجزاے ارضی پر مشتمل ہو کافی ہے۔

□ **تیمم کا مقصد:** بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس طرح مٹی پر ہاتھ مار کر منہ اور ہاتھوں پر پھیر لینے سے آخر طہارت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ آدمی میں طہارت کی حس اور نماز کا احترام قائم رکھنے کے لیے ایک اہم نفسیاتی تدبیر ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ آدمی خواہ کتنی ہی مدت تک پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو، بہرحال اس کے اندر طہارت کا احساس برقرار رہے گا، پاکیزگی کے جو قوانین شریعت میں مقرر کر دیے گئے ہیں ان کی پابندی وہ برابر کرتا رہے گا، اور اس کے ذہن سے قابلِ نماز ہونے کی حالت اور قابلِ نماز نہ ہونے کی حالت کا فرق و امتیاز کبھی محو نہ ہو سکے گا۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۵۵-۳۵۶، النساء، حاشیہ ۶۷-۷۰)

موزوں اور جرابوں پر مسح

س: موزوں اور جرابوں پر مسح کے بارے میں علما میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں آج کل تعلیم کے سلسلے میں سکاٹ لینڈ کے شمالی حصے میں مقیم ہوں۔ یہاں جاڑے کے موسم میں سخت سردی پڑتی ہے، اور اونی جراب کا ہر وقت پہننا ناگزیر ہے۔ کیا ایسی جراب پر بھی مسح کیا جا سکتا ہے؟ براہِ نوازش اپنی تحقیق احکامِ شریعت کی روشنی میں تحریر فرمائیں۔

ج: جہاں تک چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے کا تعلق ہے اس کے جواز پر قریب قریب تمام اہلِ سنت کا اتفاق ہے مگر سوتی اور اونی جرابوں کے معاملے میں عموماً ہمارے فقہا نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ موٹی ہوں، اور شفاف نہ ہوں کہ ان کے نیچے سے پاؤں کی جلد نظر آئے، اور وہ کسی قسم کی بندش کے بغیر خود قائم رہ سکیں۔

میں نے اپنی امکانی حد تک یہ تلاش کرنے کی کوشش کی کہ ان شرائط کا ماخذ کیا ہے مگر سنت میں ایسی کوئی چیز نہ مل سکی۔ سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا ہے۔ نسائی کے سوا کتب سنن میں اور مسند احمد میں مغیرہ بن شعبہ کی روایت موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور مسح علی الجوربین و النعلین۔ (اپنی جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا) ابوداؤد کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ، عبداللہؓ بن مسعود، براءؓ بن عازب، انسؓ بن مالک، ابوامامہؓ، سہل بن سعد اور عمرو بن حریث نے جرابوں پر مسح کیا ہے۔ نیز حضرت عمرؓ اور ابن عباسؓ سے بھی یہ فعل مروی ہے۔ بلکہ بیہقی نے ابن عباسؓ اور انسؓ بن مالک سے اور طحاوی نے اوس بن ابی اوس سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضورؐ نے صرف جوتوں پر مسح فرمایا تھا۔ اس میں جرابوں کا ذکر نہیں ہے۔ اور یہی عمل حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے۔ ان مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جراب اور صرف جوتے اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جرابیں پہنے ہوئے جوتے پر مسح کرنا بھی اسی طرح جائز ہے جس طرح چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا۔ ان روایات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فقہا کی تجویز کردہ شرائط میں سے کوئی شرط بیان فرمائی ہو اور نہ یہی ذکر کسی جگہ ملتا ہے کہ جن جرابوں پر حضورؐ نے اور مذکورہ بالا صحابہ نے مسح فرمایا وہ کس قسم کی تھیں۔ اس لیے میں [یہ] کہنے پر مجبور ہوں کہ فقہا کی عائد کردہ ان شرائط کا کوئی ماخذ نہیں ہے۔ اور فقہا چونکہ شارع نہیں ہیں اس لیے ان کی شرطوں پر اگر کوئی عمل نہ کرے تو وہ گناہ گار نہیں ہو سکتا۔

امام شافعیؒ اور امام احمد کی رائے یہ ہے کہ جرابوں پر اس صورت میں آدمی مسح کر سکتا ہے جبکہ آدمی جوتے اوپر پہنے رہے۔ لیکن اوپر جن صحابہؓ کے آثار نقل کیے گئے ہیں ان میں سے کسی نے بھی اس شرط کی پابندی نہیں کی ہے۔

مسح علی الخفین پر غور کر کے میں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ دراصل یہ تیمّم کی طرح ایک سہولت ہے جو اہلِ ایمان کو ایسی حالتوں کے لیے دی گئی ہے جبکہ وہ کسی صورت سے پاؤں ڈھانکے رکھنے پر مجبور ہوں اور بار بار پاؤں دھونا ان کے لیے موجب نقصان یا وجہ مشقت ہو۔ اس رعایت کی بنا اس مفروضے پر نہیں ہے کہ طہارت کے بعد موزے پہن لینے سے پاؤں نجاست سے محفوظ رہیں گے اس لیے ان کو دھونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ بلکہ اس کی بنا اللہ کی رحمت ہے جو بندوں کو سہولت عطا کرنے کی مقتضی ہوئی۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو سردی سے، یا راستے کے گرد و غبار سے بچنے کے لیے، یا پاؤں کے کسی زخم کی حفاظت کے لیے آدمی پہنے اور جس کے بار بار اتارنے اور پھر پہننے میں آدمی کو زحمت ہو، اس پر مسح کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ اُونی جراب ہو یا سوتی، چمڑے کا جوتا ہو یا کرمچ کا، یا کوئی کپڑا ہی ہو جو پاؤں پر لپیٹ کر باندھ لیا گیا ہو۔

میں جب کبھی کسی کو وضو کے بعد مسح کے لیے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ بندہ اپنے خدا سے کہہ رہا ہے کہ 'حکم ہو تو ابھی یہ موزے کھینچ لوں اور پاؤں دھو ڈالوں، مگر چونکہ سرکار ہی نے رخصت عطا فرما دی ہے اس لیے مسح پر اکتفا کرتا ہوں'۔

میرے نزدیک دراصل یہی معنی مسح علی الخفین وغیرہ کی حقیقی روح ہیں اور اس روح کے اعتبار سے وہ تمام چیزیں یکساں ہیں جنھیں اُن ضروریات کے لیے آدمی پہنے جن کی رعایت ملحوظ رکھ کر مسح کی اجازت دی گئی ہے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۳۴-۲۳۷)

غُسل جنابت کے لیے پانی کی مقدار

ابوسلمہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں اور حضرت عائشہؓ کے بھائی حضرت عائشہؓ کے پاس گئے اور حضرت عائشہؓ کے بھائی نے اُن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی بابت دریافت کیا۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے ایک برتن منگایا جو قریب قریب ایک صاع کے برابر تھا اور انھوں نے غسل کیا اور اپنے سر پر پانی بہایا اس حال میں کہ ہمارے اور ان کے درمیان پردہ تھا۔ (بخاری کتاب الغسل، باب الغسل بالصاع ونحوہ)

.....بعض لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ روایت پہنچی تھی کہ آپؐ ایک صاع بھر پانی سے غسل کر لیتے تھے۔ اتنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پانی کو لوگ غسل کے لیے ناکافی سمجھتے تھے اور بنائے غلط فہمی یہ تھی کہ وہ غسل جنابت اور غسل بغرض صفائی بدن کا فرق نہیں سمجھ رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے ان کو تعلیم دینے کے لیے بیچ میں ایک پردہ ڈالا جس سے صرف ان کا سر اور چہرہ ان دونوں صاحبوں کو نظر آتا تھا اور پانی منگا کر اپنے اوپر بہایا[1]۔ اس طریقے سے حضرت عائشہؓ ان کو دو باتیں بتانا چاہتی تھیں۔ ایک یہ کہ غسلِ جنابت کے لیے صرف جسم پر پانی بہانا کافی ہے، دوسرے یہ کہ اس مقصد کے لیے صاع بھر پانی کفایت کرتا ہے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۰-۲۱)

کھڑے ہو کر پیشاب کرنا

حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم چلے جا رہے تھے کہ راستے میں آپؐ ایک کوڑے کے ڈھیر کی طرف گئے جو ایک دیوار کے پیچھے تھا اور آپ کھڑے ہوئے جیسے تم میں سے کوئی کھڑا ہوتا ہے اور آپؐ نے پیشاب کیا۔ میں ہٹ کر دور جانے لگا تو مجھے آپؐ نے اشارہ کیا اور میں آپؐ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ یہاں تک کہ آپؐ فارغ ہو گئے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے دیوار اور ڈھیر کے درمیان کھڑے ہو کر پیشاب کیا تاکہ دونوں طرف سے پردہ رہے اور حضرت حذیفہؓ کو روک کر پیچھے کھڑا کیا کیونکہ اس صورت میں نظر آنے کا امکان نہیں رہتا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مستند روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ بیٹھ کر ہی پیشاب کرتے تھے۔ مگر اس موقع پر آپؐ نے کسی عذر کی وجہ سے ایسا کیا تھا۔ اور حضرت حذیفہؓ نے یہ روایت اسی لیے بیان کی تھی کہ ان کے زمانے میں بعض لوگ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کو قطعی ناجائز قرار دینے لگے تھے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۳۴)

جہاں بیٹھ کر پیشاب کرنا ممکن نہ ہو، وہاں کھڑے ہو کر کرنے میں مضائقہ نہیں۔ اگر احتیاط برتی جائے تو کپڑے چھینٹوں سے بچائے جا سکتے ہیں۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۳۳)

۱- اس حدیث پر اعتراض کرنے والوں کی پہلی غلطی یہ ہے کہ وہ ابوسلمہؓ کا نام پڑھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ کوئی غیر شخص تھے، حالانکہ وہ حضرت عائشہؓ کے رضاعی بھانجے تھے جنھیں حضرت ام کلثوم بنت ابوبکر صدیقؓ نے دودھ پلایا تھا پس دراصل یہ دونوں صاحب جو حضرت عائشہ سے مسئلہ پوچھنے گئے تھے، آپ کے محرم ہی تھے، ان میں سے کوئی غیر نہ تھا۔ پھر دوسری غلطی، بلکہ زیادتی وہ یہ کرتے ہیں کہ روایت میں تو صرف 'حجاب' یعنی پردہ کا ذکر ہے، مگر یہ لوگ اپنی طرف سے اس میں یہ بات بڑھا لیتے ہیں کہ وہ پردہ باریک تھا۔ اور اس اضافے کے لیے وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ اگر باریک نہ ہوتا جس میں سے عائشہ نہاتی ہوئی نظر آ سکتیں تو پھر اسے درمیان ڈال کر نہانے سے کیا فائدہ؟ حالانکہ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ اس وقت مسئلہ کیا درپیش تھا جس کی تحقیق کے لیے یہ دونوں صاحب اپنی خالہ اور بہن کے پاس گئے تھے، تو انھیں اپنے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا اور یہ سوچنے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی کہ پردہ باریک ہونا چاہیے تھا۔ دراصل وہاں سوال یہ نہ تھا کہ غسل کا طریقہ کیا ہے بلکہ بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ غسل کے لیے کتنا پانی کافی ہو سکتا ہے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

استقبال قبلہ

بنیادی حکم

وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (البقرہ ۲:۱۴۸) ہر ایک کے لیے ایک رخ ہے، جس کی طرف وہ مُڑتا ہے پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو[1]۔ جہاں بھی تم ہوگے، اللہ تمھیں پالے گا۔ اُس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔

وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ ۗ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۙ (البقرہ ۲:۱۴۹-۱۵۰) تمھارا گزر جس مقام سے بھی ہو، وہیں سے اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف پھیر دو، کیونکہ یہ تمھارے رب کا بالکل برحق فیصلہ ہے اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ اور جہاں سے بھی تمھارا گزر ہو، اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف پھیرا کرو، اور جہاں بھی تم ہو، اُسی کی طرف منہ کرکے نماز پڑھو، تاکہ لوگوں کو تمھارے خلاف کوئی حجت نہ ملے۔ ہاں! اُن میں سے جو ظالم ہیں، ان کی زبان کسی حال میں بند نہ ہوگی۔ تو اُن سے تم نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو اس لیے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور اس توقع پر کہ میرے اس حکم کی پیروی سے تم...... فلاح کا راستہ پاؤ گے۔

[لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ کہ لوگوں کو تمھارے خلاف کوئی حجت نہ ملے' کا مطلب یہ ہے کہ] ہمارے اس حکم کی پوری پابندی کرو۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ تم میں سے کوئی شخص مقررہ سمت کے سوا کسی دوسری سمت کی طرف نماز پڑھتے دیکھا جائے۔ ورنہ تمھارے دشمنوں کو تم پر یہ اعتراض کرنے کا موقع مل جائے گا کہ کیا خوب امت وسط ہے کیسے اچھے حق پرستی کے گواہ بنے ہیں، جو یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ یہ حکم ہمارے رب کی طرف سے آیا ہے اور پھر اس کی خلاف ورزی بھی کیے جاتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۲۴، البقرہ، حاشیہ ۱۵۰)

۱۔ پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے، جسے سامع خود تھوڑے سے غور و فکر سے بھر سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ نماز جسے پڑھنی ہوگی، اسے بہر حال کسی نہ کسی سمت کی طرف تو رخ کرنا ہی ہوگا، مگر اصل چیز وہ رخ نہیں ہے، جس طرف تم مڑتے ہو، بلکہ اصل چیز وہ بھلائیاں ہیں جنھیں حاصل کرنے کے لیے تم نماز پڑھتے ہو۔ لہٰذا سمت اور مقام کی بحث میں پڑنے کی بجائے تمھیں فکر بھلائیوں کے حصول ہی کی ہونی چاہیے۔ (تفہیم القرآن، اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۴۹، ص ۱۲۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تحویلِ قبلہ

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ (البقرۃ ۲: ۱۴۲-۱۴۳) نادان لوگ ضرور کہیں گے: انھیں کیا ہوا پہلے یہ جس قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔اس سے یکا یک پھر گئے؟ اے نبیؐ ان سے کہو: مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔اور اسی طرح تو ہم نے تمھیں ایک 'امت وسط' بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

پہلے جس طرف تم رخ کرتے تھے اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹا پھر جاتا ہے۔ یہ معاملہ تھا تو بڑا سخت، مگر ان لوگوں کے لیے کچھ بھی سخت نہ ثابت ہوا، جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے۔اللہ تمھارے اس ایمان کو ہر گز ضائع نہ کرے گا، یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق و رحیم ہے۔

تحویلِ قبلہ کا حتمی حکم

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ (البقرۃ ۲: ۱۴۴) یہ تمھارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔لو، ہم اُسی قبلے کی طرف تمھیں پھیرے دیتے ہیں، جسے تم پسند کرتے ہو[1]۔ مسجد حرام[2] کی طرف رُخ پھیر دو۔اب جہاں کہیں تم ہو، اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔

یہ ہے وہ اصل حکم، جو تحویلِ قبلہ کے بارے میں دیا گیا تھا۔ یہ حکم رجب یا شعبان ۲ھ میں نازل ہوا۔ابنِ سعد کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بشر بن براء بن مَعْرُور کے ہاں دعوت پر گئے ہوئے تھے۔وہاں ظہر کا وقت آ گیا اور آپؐ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکا یک وحی کے ذریعے سے یہ آیت نازل ہوئی اور اسی وقت آپؐ اور آپؐ کی اقتدا میں جماعت کے تمام لوگ بیت المقدس سے کعبے کے رخ پھر گئے۔اس کے بعد مدینہ اور اطراف مدینہ میں اس کی عام منادی کی گئی۔براء بن عازب کہتے ہیں کہ ایک جگہ منادی کی آواز اس حالت پر پہنچی کہ لوگ رکوع میں تھے۔

۱- اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم آنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے منتظر تھے۔آپؐ خود یہ محسوس فرما رہے تھے کہ بنی اسرائیل کی امامت کا دور ختم ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ بیت المقدس کی مرکزیت بھی رخصت ہوئی۔اب اصل مرکزِ ابراہیمی کی طرف رُخ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۲۲، البقرہ، حاشیہ ۱۴۶)

۲- مسجد حرام کے معنی ہیں حرمت اور عزت والی مسجد۔اس سے مراد وہ عبادت گاہ ہے جس کے وسط میں خانۂ کعبہ واقع ہے۔(حوالہ ایضاً)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حکم سنتے ہی سب کے سب اسی حالت میں کعبے کی طرف مڑ گئے۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ بنی سلمہ میں یہ اطلاع دوسرے روز صبح کی نماز کے وقت پہنچی۔ لوگ ایک رکعت پڑھ چکے تھے کہ ان کے کانوں میں آواز پڑی: 'خبردار رہو، قبلہ بدل کر کعبے کی طرف کر دیا گیا ہے' سنتے ہی پوری جماعت نے اپنا رخ بدل دیا۔[1]

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۲۱، البقرۃ، حاشیہ ۱۴۶)

مخالفین کے پروپیگنڈے کا جواب

www.kitabosunnat.com

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ۔ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ (البقرۃ ۲: ۱۴۴-۱۴۵) یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی تھی، خوب جانتے ہیں کہ (تحویل قبلہ کا) یہ حکم ان کے رب ہی کی طرف سے ہے اور برحق ہے، مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم ان اہلِ کتاب کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ، ممکن نہیں کہ یہ تمھارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں، اور نہ تمھارے لیے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلے کی پیروی کرو۔

وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (البقرۃ ۲: ۱۴۵) ان میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے کے قبلے کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہے، اور اگر تم نے اس علم کے بعد، جو تمھارے پاس آ چکا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی کی، تو یقیناً تمھارا شمار ظالموں میں ہوگا۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ○ (البقرۃ ۲: ۱۴۶-۱۴۷) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس مقام کو (جسے قبلہ بنایا گیا ہے) ایسا پہچانتے ہیں جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں، مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپا رہا ہے۔ یہ قطعی ایک امرِ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، لہٰذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔

کعبے کی طرف رخ کرنے کا مطلب

کعبے کی طرف رُخ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی خواہ دنیا کے کسی کونے میں ہو، اُسے بالکل ناک کی سیدھ میں کعبے کی طرف رخ کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ہر وقت ہر شخص کے لیے ہر جگہ مشکل ہے۔ اسی لیے کعبے کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، نہ کہ کعبے کی سیدھ میں۔ قرآن کی رو سے ہم اس بات کے لیے ضرور مکلف ہیں کہ حتی الامکان صحیح سمتِ کعبہ کی تحقیق

۱- خیال رہے کہ بیت المقدس مدینے سے عین شمال میں ہے اور کعبہ بالکل جنوب میں۔ نماز باجماعت پڑھتے ہوئے قبلہ تبدیل کرنے میں لامحالہ امام کو چل کر مقتدیوں کے پیچھے آنا پڑا ہوگا اور مقتدیوں کو صرف رُخ ہی نہ بدلنا پڑا ہوگا، بلکہ کچھ نہ کچھ انھیں بھی چل کر اپنی صفیں درست کرنی پڑی ہوں گی۔ چنانچہ بعض روایات میں یہی تفصیل مذکور بھی ہے۔ (تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۲۲، البقرۃ، حاشیہ ۱۴۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کریں، مگر اس بات پر مکلف نہیں ہیں کہ ضرور بالکل ہی صحیح سمت معلوم کرلیں۔ جس سمت کے متعلق ہمیں امکانی تحقیق سے ظنِ غالب حاصل ہو جائے کہ یہ سمت کعبہ ہے، اُدھر نماز پڑھنا یقیناً صحیح ہے۔ اور اگر کہیں آدمی کے لیے سمتِ قبلہ کی تحقیق مشکل ہو، یا وہ کسی ایسی حالت میں ہو کہ قبلے کی طرف اپنی سمت قائم نہ رکھ سکتا ہو (مثلاً ریل یا کشتی میں)، تو جس طرف اسے قبلے کا گمان ہو، یا جس طرف رخ کرنا اس کے لیے ممکن ہو، اسی طرف وہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ البتہ اگر دورانِ نماز میں صحیح سمت قبلہ معلوم ہو جائے یا صحیح سمت کی طرف نماز پڑھنا ممکن ہو جائے، تو نماز کی حالت ہی میں اس طرف پھر جانا چاہیے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۲۱-۱۲۲، البقرہ، حاشیہ ۱۴۶)

تحویلِ قبلہ کی حکمت

(سورہ بقرہ) کے دس رکوعوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے اُن کی تاریخی فردِ قرار دادِ جرم اور ان کی وہ موجودہ حالت جو نزولِ قرآن کے وقت تھی، بے کم و کاست پیش کر دی ہے اور ان کو بتا دیا کہ تم ہماری اُس نعمت کی انتہائی ناقدری کر چکے ہو جو ہم نے تمھیں دی تھی۔ تم نے صرف یہی نہیں کیا کہ منصبِ امامت کا حق ادا کرنا چھوڑ دیا، بلکہ خود بھی حق اور راستی سے پھر گئے .... چونکہ تم اس طریقے سے ہٹ گئے ہو اور اس خدمت کی اہلیت پوری طرح کھو چکے ہو، لہٰذا تمھیں امامت کے منصب سے معزول کیا جاتا ہے۔

تبدیلِ امامت کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی قدرتی طور پر تحویلِ قبلہ کا اعلان ہونا بھی ضروری تھا۔ جب تک بنی اسرائیل کی امامت کا دور تھا، بیت المقدس مرکزِ دعوت رہا اور وہی قبلۂ اہلِ حق بھی رہا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیرو بھی اس وقت تک بیت المقدس ہی کو قبلہ بنائے رہے۔ مگر جب بنی اسرائیل اس منصب سے باضابطہ معزول کر دیے گئے، تو بیت المقدس کی مرکزیت آپ سے آپ ختم ہوگئی۔ لہٰذا اعلان کیا گیا کہ اب وہ مقام دینِ الٰہی کا مرکز ہے، جہاں سے اس رسول کی دعوت کا ظہور ہوا ہے۔ اور چونکہ ابتدا میں ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا مرکز بھی یہی مقام تھا، اس لیے اہلِ کتاب اور مشرکین، کسی کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ قبلہ ہونے کا زیادہ حق کعبے ہی کو پہنچتا ہے۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۱۰۹-۱۱۰، البقرہ، حاشیہ ۱۲۳)

[تحویلِ قبلہ] سے مقصود یہ دیکھنا تھا کہ کون لوگ ہیں جو جاہلیت کے تعصبات اور خاک و خون کی غلامی میں مبتلا ہیں، اور کون ہیں جو ان بندشوں سے آزاد ہو کر حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہیں۔ ایک طرف اہلِ عرب اپنے وطنی و نسلی فخر میں مبتلا تھے اور عرب کے کعبے کو چھوڑ کر باہر کے بیت المقدس کو قبلہ بنانا، ان کی اس قوم پرستی کے بت پر ناقابلِ برداشت ضرب تھا۔ دوسری طرف بنی اسرائیل اپنی نسل پرستی کے غرور میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنے آبائی قبلے کے سوا کسی دوسرے قبلے کو برداشت کرنا ان کے لیے محال تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بت جن لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہوں، وہ اُس راستے پر کیسے چل سکتے تھے، جس کی طرف اللہ کا رسولؐ انھیں بلا رہا تھا۔ اس لیے اللہ نے ان بت پرستوں کو سچے حق پرستوں سے الگ چھانٹ دینے کے لیے پہلے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا تا کہ جو لوگ عرب بیت کے بت کی پرستش کرتے ہیں، وہ الگ ہو جائیں۔ پھر اس قبلے کو چھوڑ کر کعبے کو قبلہ بنایا تا کہ جو اسرائیلیت کے پرستار ہیں، وہ بھی الگ ہو جائیں۔ اس طرح صرف وہ لوگ رسول کے ساتھ رہ گئے جو کسی بت کے پرستار نہ تھے، محض خدا کے پرستار تھے۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۱۲۰-۱۲۱، البقرہ، حاشیہ ۱۴۵)

تحویلِ قبلہ: منصبِ امامت پر سرفرازی کا نشان

تحویلِ قبلہ کا یہ حکم دراصل اس منصب پر تمھاری سرفرازی کا نشان ہے، لہٰذا تمھیں اس لیے بھی ہمارے حکم کی پیروی کرنی چاہیے کہ ناشکری و نافرمانی کرنے سے کہیں یہ منصب تم سے چھین نہ لیا جائے۔ اس کی پیروی کرو گے، تو یہ نعمت تم پر مکمل کر دی جائے گی۔

اس حکم کی پیروی کرتے ہوئے یہ امید رکھو (کہ فلاح کا راستہ پالو گے) یہ شاہانہ انداز بیان ہے۔ بادشاہ کا اپنی شانِ بے نیازی کے ساتھ نوکر سے یہ کہہ دینا کہ ہماری طرف سے فلاں عنایت و مہربانی کے امیدوار رہو، اس بات کے لیے بالکل کافی ہوتا ہے کہ وہ ملازم اپنے گھر شادیانے بجوائے اور اسے مبارک بادیاں دی جانے لگیں۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۱۲۵، البقرہ، حواشی ۱۵۱-۱۵۲)

استقبالِ قبلہ اور شرک کا شبہہ

س: یہاں (اسلامک کلچر سنٹر لندن میں) چند انگریز لڑکیاں جمعے کے روز آئی ہوئی تھیں۔ بڑے غور سے نماز کو دیکھتی رہیں۔ بعد میں انھوں نے ہم سے سوال کیا کہ آپ لوگ جنوب مشرق کی طرف منہ کر کے کیوں نماز پڑھتے ہیں؟ کسی اور طرف کیوں نہیں کرتے؟ کعبے کو کیوں اہمیت دیتے ہیں؟ سنگِ اسود کو کیوں چومتے ہیں؟ وہ بھی تو ایک پتھر ہے جیسے دوسرے پتھر۔ اس طرح تو یہ بھی ہندوؤں کی طرح بت پرستی ہوگئی۔ وہ سامنے بت رکھ کر پوجتے ہیں اور مسلمان اس کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہیں۔ ہم انھیں تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ براہِ کرم ہمیں اس کے متعلق کچھ بتائیں تا کہ پھر ایسا کوئی موقع آئے تو ہم معترضین کو سمجھا سکیں؟

ج: قریب قریب اسی مضمون کے متعدد سوالات ہندستان کے مختلف حصوں سے بھی حال ہی میں ہمارے پاس آئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ آج کل جگہ جگہ یہ سوال مسلمانوں کے سامنے چھیڑا جا رہا ہے۔ ان معترضین میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جن کا مقصد کسی نہ کسی طرح اسلام پر اعتراض جڑنا ہوتا ہے اور دنیا میں کوئی جواب بھی ان کے لیے تسلی بخش نہیں ہو سکتا۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں حقیقتِ حال سے ناواقفیت کی بنا پر نیک نیتی کے ساتھ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ بات بالکل کافی ہے کہ آپ انھیں معقولیت کے ساتھ حقیقت سے آگاہ کر دیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ مشرکین کے مختلف گروہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بعض دوسری ہستیوں کو بھی خدائی صفات اور اختیارات کا حامل سمجھتے ہیں، یا یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر حلول کیا ہے، اور اس غلط عقیدے کی بنا پر وہ ان ہستیوں کے مجسمے اور آستانے بنا کر ان کے آگے عبادت کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ کا بت آج تک کسی مشرک قوم نے نہیں بنایا اور نہ اس کی پرستش کے لیے کبھی یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس کی کوئی خیالی شکل تیار کر کے اس کے آگے سر بسجود ہوں۔ دنیا کے تمام مشرکین قریب قریب صاف طور پر سمجھتے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شکل وصورت سے منزہ ہے۔ اس کا اور دوسرے معبودوں کا فرق اُن کے عقائد اور مذہبی مراسم میں نمایاں طریقے سے تسلیم کر گیا ہے۔ اس لیے بت صرف دوسرے معبودوں ہی کے بنائے گئے ہیں۔ اللہ کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

بت پرستی کی اس حقیقت کو جو شخص اچھی طرح سمجھ لے گا وہ اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ مسلمانوں کا نماز میں خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنا، یا حج میں کعبے کا طواف کرنا اور حجر اسود کو چومنا بت پرستی سے کوئی ادنیٰ سی وجہ مماثلت بھی رکھتا ہے۔ اسلام خالص توحیدی مذہب ہے جو اللہ کے سوا سرے سے کسی کو معبود ہی نہیں مانتا اور نہ اس بات کا قائل ہے کہ اللہ نے کسی کے اندر حلول کیا ہے، یا وہ کسی مادی مخلوق کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔

خانہ کعبہ کو اگر غیر مسلموں نے نہیں دیکھا ہے تو اس کی تصویریں تو بہر حال انھوں نے دیکھی ہی ہیں۔ کیا وہ راست بازی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بت ہے جس کی ہم پرستش کر رہے ہیں؟ کیا کوئی شخص بدرستیِ ہوش وحواس یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ چوکور عمارت اللہ رب العالمین کی شکل بنائی گئی ہے؟

رہا حجرِ اسود تو وہ ایک چھوٹا سا پتھر ہے جو خانہ کعبہ کی چار دیواری کے ایک کونے میں قدِ آدم کے برابر بلندی پر لگا ہوا ہے۔ مسلمان اس کی طرف رخ کر کے سجدہ نہیں کرتے، بلکہ خانہ کعبہ کا طواف اس مقام سے شروع کر کے اسی مقام پر ختم کرتے ہیں۔ اور ہر طواف اسے بوسہ دے کر، یا اس کی طرف اشارہ کر کے شروع کرتے ہیں۔ اس کا آخر بت پرستی سے کیا تعلق ہے؟

اب رہی یہ بات کہ دنیا بھر کے مسلمان خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے کیوں نماز پڑھتے ہیں۔ تو اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ یہ مرکزیت اور تنظیم کی خاطر ہے۔ اگر تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک مرکز اور ایک رخ متعین نہ کر دیا گیا ہوتا تو ہر نماز کے وقت عجیب افراتفری برپا ہوتی۔ انفرادی نمازیں ادا کرتے وقت ایک مسلمان کا منہ مغرب کی طرف تو دوسرے کا مشرق کی طرف، تیسرے کا شمال کی طرف اور چوتھے کا جنوب کی طرف۔ اور جب مسلمان نماز باجماعت کے لیے کھڑے ہوتے تو ہر مسجد میں ہر نماز سے پہلے اس بات پر ایک کانفرنس ہوتی کہ آج کس طرف رخ کر کے نماز پڑھی جائے۔ یہی نہیں بلکہ ہر مسجد کی تعمیر کے وقت ہر محلے میں یہ جھگڑا برپا ہوتا کہ مسجد کا رخ کس طرف ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان سارے امکانات کو ایک قبلہ مقرر کر کے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اور قبلہ اسی جگہ کو بنایا جسے فطرتاً مرکزیت حاصل ہونی چاہیے تھی، کیونکہ خدا پرستی کی یہ تحریک اسی جگہ سے شروع ہوئی تھی اور خدائے واحد کی پرستش کے لیے دنیا میں سب سے پہلا معبد وہی بنایا گیا تھا۔

(رسائل و مسائل، چہارم، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۱۴۱-۱۴۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوائی جہاز میں قبلے کا مسئلہ

ہوائی جہاز کے سفر کے دوران میں نماز کی ادائیگی کے بارے میں کسی صاحب نے سوال کیا تو مولانا نے فرمایا:

جب جہاز کا رخ کعبے کی طرف ہو اور نماز کا وقت ہو جائے تو نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ مثلاً جب ہم مشرقی[1] پاکستان سے واپس آتے ہیں تو نماز کے وقت نماز جہاز میں ہی ادا کرتے ہیں۔ لیکن جب رُخ صحیح نہ ہو، تو پھر جب جہاز کہیں ٹھہرے اس وقت نماز پڑھنی چاہیے۔ البتہ ایسا کرنا درست ہے کہ نماز شروع کرتے وقت جہاز کا رخ صحیح ہو، پھر چاہے جدھر کو گھوم جائے نماز پوری کر لینی چاہیے۔

(۵-اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۱۹۹)

چاند پر قبلے کا حکم

چاند پر امکانی آبادی کے بارے میں ایک صاحب نے سوال کیا تو مولانا نے فرمایا:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ.......... سے اشارہ ملتا ہے کہ چاند پر پہنچ کر سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نام پر ایک عمارت بنا دی جائے اور اسے بطور قبلہ استعمال کیا جائے۔

(گفتار و افکار، فروری ۱۹۸۸ء، ص ۲۱۲)

۱- موجودہ بنگلہ دیش (مرتب)

۲- اس پہلی اشاعت کے بعد یہ کتاب یادگار لمحات کے نام سے چھپ رہی ہے۔ (مرتب)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

اوقاتِ نماز

ابتدائی دور میں اوقاتِ نماز

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۚ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ○ (الدھر ۷۶: ۲۵-۲۶) اپنے رب کا نام صبح وشام یاد کرو، رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اُس کی تسبیح کرتے رہو۔

قرآن کا قاعدہ ہے کہ جہاں بھی کفار کے مقابلے میں صبر وثبات کی تلقین کی گئی ہے وہاں اس کے معا بعد اللہ کا ذکر اور نماز کا حکم دیا گیا ہے، جس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دینِ حق کی راہ میں دشمنانِ حق کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ اسی چیز سے حاصل ہوتی ہے۔ صبح وشام اللہ کا ذکر کرنے سے مراد ہمیشہ اللہ کو یاد کرنا بھی ہوسکتا ہے، مگر جب اللہ کی یاد کا حکم اوقات کے تعین کے ساتھ دیا جائے تو پھر اس سے مراد نماز ہوتی ہے۔ اس آیت میں سب سے پہلے فرمایا: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۚ اپنے رب کا نام صبح وشام یاد کرو۔

بُكْرَةً عربی زبان میں صبح کو کہتے ہیں اور اَصِيْلٌ کا لفظ زوال کے وقت سے غروب تک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں ظہر اور عصر کے اوقات آجاتے ہیں۔ پھر فرمایا: وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو۔

رات کا وقت غروبِ آفتاب سے شروع ہوجاتا ہے، اس لیے رات کو سجدہ کرنے کے حکم میں مغرب اور عشاء، دونوں وقتوں کی نمازیں شامل ہوجاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ ارشاد کہ رات کے طویل اوقات میں اُس کی تسبیح کرتے رہو، نمازِ تہجد کی طرف اشارہ کرتا ہے............

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کے یہی اوقات ابتدائے اسلام میں تھے، البتہ اوقات اور رکعتوں کے تعین کے ساتھ پنج وقتہ نماز کی فرضیت کا حکم معراج کے موقع پر دیا گیا۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۲۰۲، الدھر، حاشیہ ۳۰)

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ (ھود ۱۱: ۱۱۴) نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔

'دن کے سروں پر' سے مراد صبح اور مغرب ہے، اور 'کچھ رات گزرنے پر' سے مراد عشا کا وقت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ارشاد اس زمانے کا ہے جب نماز کے لیے ابھی پانچ وقت مقرر نہیں کیے گئے تھے۔ معراج کا واقعہ اس کے بعد پیش آیا جس میں پنج

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وقتہ نماز فرض ہوئی۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۳۷۱، ہود، حاشیہ ۱۱۳)

امامتِ جبرائیل اور نماز کے اوقات

[بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور موطا وغیرہ کتبِ حدیث میں صحیح سندوں کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ] جبرائیل علیہ السلام نے آپؐ کو نمازوں کے صحیح اوقات بتانے کے لیے دو روز تک پانچوں وقت کی نمازیں آپ کو پڑھائیں۔ ان میں آپؐ مقتدی تھے اور جبرائیلؑ امام۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۱۹۴، النجم، حاشیہ ۵)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبریلؑ نے دو مرتبہ مجھ کو بیت اللہ کے قریب نماز پڑھائی۔ پہلے دن ظہر کی نماز ایسے وقت پڑھائی جبکہ سورج ابھی ڈھلا ہی تھا اور سایہ ایک جوتی کے تسمے سے زیادہ دراز نہ تھا، پھر عصر کی نماز ایسے وقت پڑھائی جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے اپنے قد کے برابر تھا، پھر مغرب کی نماز ٹھیک اس وقت پڑھائی جبکہ روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے، پھر عشاء کی نماز شفق غائب ہوتے ہی پڑھا دی اور فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جب روزہ دار پر کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن انھوں نے ظہر کی نماز مجھے اس وقت پڑھائی جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے قد کے برابر تھا، اور عصر کی اس وقت جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے قد سے دو گنا ہو گیا اور مغرب کی نماز اس وقت جبکہ روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے، اور عشاء کی نماز ایک تہائی رات گزر جانے پر، اور فجر کی نماز اچھی طرح روشنی پھیل جانے پر۔ پھر جبریلؑ نے پلٹ کر مجھ سے کہا کہ اے محمدؐ یہی اوقات انبیاؑ کے نماز پڑھنے کے ہیں اور نمازوں کے صحیح اوقات ان دونوں وقتوں کے درمیان ہیں۔[1] (یعنی پہلے دن ہر وقت کی ابتدا اور دوسرے دن ہر وقت کی انتہا بتائی گئی ہے۔ ہر وقت کی نماز ان دونوں کے درمیان ادا ہونی چاہیے)۔

اوقاتِ پنج گانہ کا قرآن سے ثبوت

قرآن مجید میں نماز کے ان پانچوں اوقات کی طرف مختلف مواقع پر اشارے کیے گئے ہیں۔ چنانچہ سورۂ ہود میں فرمایا:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ[1] (ھود ۱۱: ۱۱۴) نماز قائم کرو دن کے دونوں کناروں پر (یعنی فجر اور مغرب) اور کچھ رات گزرنے پر (یعنی عشاء)۔

۱- اس مقام پر بعض حضرات یہ شبہہ ظاہر کرتے ہیں کہ جبرائیلِ امین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا (امام) کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ وہ استاد ہیں اور حضورؐ شاگرد اور اس سے حضورؐ پر جبرائیل کی فضیلت لازم آئے گی؟ لیکن یہ شبہہ اس لیے غلط ہے کہ جبرائیل اپنے کسی ذاتی علم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم نہیں دیتے تھے، جس سے آپ پر ان کی فضیلت لازم آئے بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے آپ تک علم پہنچانے کا ذریعہ بنایا تھا اور وہ محض واسطۂ تعلیم ہونے کی حیثیت سے مجازاً آپؐ کے معلم تھے۔ اس سے ان کی فضیلت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ محض تعلیم کی غرض سے ان کا امام بنایا جانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ آپؐ سے افضل تھے۔ (تفہیم القرآن، پنجم، ص ۱۹۶، النجم، حاشیہ ۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا:

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۖ وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ (طٰہٰ ۲۰:۱۳۰)
اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اسی کی تسبیح کر طلوع آفتاب سے پہلے (فجر) اور غروب آفتاب سے پہلے (عصر) اور رات کے اوقات میں پھر تسبیح کر (عشاء) اور دن کے سروں پر (یعنی صبح، ظہر اور مغرب)۔

پھر سورۂ روم میں ارشاد ہوا:

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ○ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِيًّا وَّ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ○ (الروم ۳۰:۱۷-۱۸) پس اللہ کی تسبیح کرو جبکہ تم شام کرتے ہو (مغرب) اور جب صبح کرتے ہو (فجر)۔ اسی کے لیے حمد ہے آسمانوں اور زمین میں۔ اور اسی کی تسبیح کرو دن کے آخری حصے میں (عصر) اور جبکہ تم دوپہر کرتے ہو (ظہر)۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۳۵-۶۳۶، بنی اسرائیل، حاشیہ ۹۵)

[سورۂ ق میں ارشادِ ربانی ہے:]

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ۚ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ○
(ق ۵۰:۳۹-۴۰) اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو، طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے، اور رات کے وقت پھر اس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔

رب کی حمد اور تسبیح سے مراد یہاں نماز ہے اور جس مقام پر بھی قرآن میں حمد و تسبیح کو خاص اوقات کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے، وہاں اس سے مراد نماز ہی ہوتی ہے۔ 'طلوع آفتاب سے پہلے' فجر کی نماز ہے۔ 'غروب آفتاب سے پہلے' دو نمازیں ہیں، ایک ظہر، دوسری عصر۔ 'رات کے وقت' مغرب اور عشا کی نمازیں ہیں اور تیسری تہجد بھی رات کی تسبیح میں شامل ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۱۲۵، ق، حاشیہ ۵۱)

[سورۂ طور میں ارشادِ ربانی ہے:] وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ○
(الطور ۵۲:۴۸-۴۹) تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کرو اور ستارے جب پلٹتے ہیں اس وقت بھی۔

اس سے مراد، مغرب و عشا اور تہجد کی نمازیں بھی ہیں، اور تلاوت قرآن بھی، اور اللہ کا ذکر بھی۔ ستاروں کے پلٹنے سے مراد، رات کے آخری حصے میں ان کا غروب ہونا اور سپیدۂ صبح کے نمودار ہونے پر ان کی روشنی کا ماند پڑ جانا ہے۔ یہ نماز فجر کا وقت ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۱۸۵، الطور، حاشیہ ۴۱-۴۲)

[سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:]

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نماز قائم کرو زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآنِ فجر مشہود ہوتا ہے۔

اس آیت میں مجملاً یہ بتایا گیا ہے کہ پنج وقتہ نماز، جو معراج کے موقع پر فرض کی گئی تھی، اس کے اوقات کی تنظیم کس طرح کی جائے۔ حکم ہوا کہ ایک نماز تو طلوع آفتاب سے پہلے پڑھ لی جائے، اور باقی چار نمازیں زوالِ آفتاب کے بعد سے ظلمتِ شب تک پڑھی جائیں۔ پھر اس حکم کی تشریح کے لیے جبریل علیہ السلام بھیجے گئے۔ جنھوں نے نماز کے ٹھیک ٹھیک اوقات کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۳۵-۶۳۷، بنی اسرائیل، حاشیہ ۹۵)

[سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۳۰ میں بھی] نماز کے اوقات کی طرف صاف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے فجر کی نماز۔ سورج غروب ہونے سے پہلے عصر کی نماز۔ اور رات کے اوقات میں عشا اور تہجد کی نماز۔ رہے دن کے کنارے، تو وہ تین ہی ہو سکتے ہیں۔ ایک کنارہ صبح ہے، دوسرا کنارہ زوالِ آفتاب، اور تیسرا کنارہ شام، لہٰذا دن کے کناروں سے مراد فجر، ظہر، اور مغرب کی نماز ہی ہو سکتی ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۱۳۸، طٰہٰ، حاشیہ ۱۱۱)

[سورۂ الروم کی آیات ۱۷-۱۸] میں نماز کے چار اوقات کی طرف صاف اشارہ ہے: فجر، مغرب، عصر اور ظہر۔ اس کے علاوہ مزید اشارات جو قرآن مجید میں اوقاتِ نماز کی طرف کیے گئے ہیں حسب ذیل ہیں:

بنی اسرائیل آیت ۷۸، ہود آیت ۱۱۴، طٰہٰ آیت ۱۳۰ اور المؤمن آیت ۵۵۔ ان میں سے پہلی آیت بتاتی ہے کہ نماز کے اوقات زوالِ آفتاب کے بعد سے عشا تک ہیں، اور اس کے بعد پھر فجر کا وقت ہے۔ دوسری آیت میں دن کے دونوں سروں سے مراد صبح اور مغرب کے اوقات ہیں اور 'کچھ رات گزرنے پر' سے مراد عشا کا وقت۔ تیسری آیت میں قبل طلوع آفتاب سے مراد فجر اور قبل غروب سے مراد عصر۔ رات کی گھڑیوں میں مغرب اور عشا دونوں شامل ہیں۔ اور دن کے کنارے تین ہیں، ایک صبح، دوسرے زوالِ آفتاب، تیسرے مغرب [1]۔ اس طرح قرآن مجید مختلف مقامات پر نماز کے اُن پانچوں اوقات کی طرف اشارہ کرتا ہے جن پر آج دنیا بھر کے مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ محض ان آیات کو پڑھ کر کوئی شخص بھی اوقاتِ نماز متعین نہ کر سکتا تھا جب تک کہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے معلمِ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے قول اور عمل سے ان کی طرف رہنمائی نہ فرماتے۔

۱- وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ۔ اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔

صبح و شام حمد و تسبیح کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ دائماً اللہ کو یاد کرتے رہو۔ دوسرے یہ کہ ان مخصوص اوقات میں نماز ادا کرو۔ اور یہ دوسرے معنی لینے کی صورت میں اشارہ نماز کے ان پانچوں اوقات کی طرف ہے جو اس سورت کے نزول کے کچھ مدت بعد تمام اہل ایمان پر فرض کر دیے گئے۔ اس لیے کہ عَشِی کا لفظ عربی زبان میں زوالِ آفتاب سے لے کر رات کے ابتدائی حصے تک کے لیے بولا جاتا ہے۔ جس میں ظہر سے عشاء تک کی چاروں نمازیں آ جاتی ہیں۔ اور ابکار صبح کی پو پھٹنے سے طلوع آفتاب تک کے وقت کو کہتے ہیں جو نماز فجر کا وقت ہے۔ (تفہیم القرآن، چہارم، ص ۴۱۶، المومن حاشیہ ۷۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

منکرینِ حدیث کی جسارت

یہاں ذرا تھوڑی دیر ٹھہر کر منکرینِ حدیث کی اس جسارت پر غور کیجیے کہ وہ 'نماز پڑھنے' کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نماز جو آج مسلمان پڑھ رہے ہیں یہ سرے سے وہ چیز ہی نہیں ہے جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ قرآن تو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے، اور اس سے مراد نماز پڑھنا نہیں بلکہ 'نظام ربوبیت' قائم کرنا ہے۔ اب ذرا ان سے پوچھیے کہ وہ کون سا نرالا نظامِ ربوبیت ہے جسے یا طلوع آفتاب سے پہلے قائم کیا جاسکتا ہے یا پھر زوال آفتاب کے بعد سے کچھ رات گزرنے تک؟ اور وہ کون سا نظامِ ربوبیت ہے جو خاص جمعہ کے دن قائم کیا جانا مطلوب ہے؟: اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللہِ۔ (الجمعۃ ۶۲:۹) جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعے کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔

نظامِ ربوبیت کی آخر وہ کون سی خاص قسم ہے کہ اسے قائم کرنے کے لیے جب آدمی کھڑا ہو تو پہلے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھولے اور سر پر مسح کرے ورنہ وہ اسے قائم نہیں کرسکتا؟: اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ۔ (المائدۃ ۵:۶) جب تم نماز کے لیے اٹھو تو چاہیے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو۔

نظامِ ربوبیت کے اندر آخر یہ کیا خصوصیت ہے کہ اگر آدمی حالتِ جنابت میں ہو تو جب تک وہ غسل نہ کرے اسے قائم نہیں کرسکتا؟: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ .... وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا۔ (النساء ۴:۴۳) اور نماز کے قریب نہ جاؤ......... اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک غسل نہ کرلو۔

یہ کیا معاملہ ہے کہ اگر آدمی عورت کو چھو بیٹھا ہو اور پانی نہ ملے تو اس عجیب و غریب نظامِ ربوبیت کو قائم کرنے کے لیے اسے پاک مٹی پر ہاتھ مار کر اپنے چہرے اور منہ پر مَلنا ہوگا؟: اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْھِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ۔ (النساء ۴:۴۳) یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو، اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کرلو۔

یہ کیسا عجیب نظامِ ربوبیت ہے کہ اگر سفر پیش آجائے تو آدمی اسے پورا قائم کرنے کے بجائے آدھا ہی قائم کرلے؟: وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ۔ (النساء ۴:۱۰۱) اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کردو۔

پھر یہ کیا لطیفہ ہے کہ اگر جنگ کی حالت ہو تو فوج کے آدھے سپاہی ہتھیار لیے ہوئے امام کے پیچھے 'نظامِ ربوبیت' قائم کرتے رہیں اور آدھے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہیں۔ اس کے بعد جب پہلا گروہ امام کے پیچھے 'نظامِ ربوبیت' قائم کرتے ہوئے ایک سجدہ کرلے تو وہ اُٹھ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے چلا جائے، اور دوسرا گروہ اس کی جگہ آکر امام کے پیچھے اس 'نظامِ ربوبیت' کو قائم کرنا شروع کردے۔ وَاِذَا کُنْتَ فِیْھِمْ فَاَقَمْتَ لَھُمُ الصَّلٰوۃَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ مَّعَکَ وَلْیَاْخُذُوْا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ. (النساء ۴:۱۰۲) اور اے نبیؐ! جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالت جنگ میں) انھیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے اسلحے لیے رہے، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آ کر تمھارے ساتھ نماز پڑھے۔

قرآن مجید کی یہ ساری آیات صاف بتا رہی ہیں کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد وہی نماز قائم کرنا ہے جو مسلمان دنیا بھر میں پڑھ رہے ہیں، لیکن منکرینِ حدیث ہیں کہ خود بدلنے کے بجائے قرآن کو بدلنے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بالکل ہی بے باک نہ ہو جائے وہ اس کے کلام کے ساتھ یہ مذاق نہیں کر سکتا جو یہ حضرات کر رہے ہیں۔ یا پھر قرآن کے ساتھ یہ کھیل وہ شخص کھیل سکتا ہے جو اپنے دل میں اسے اللہ کا کلام نہ سمجھتا ہو اور محض دھوکا دینے کے لیے قرآن قرآن پکار کر مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہو۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۷۴۱-۷۴۲، الروم، حاشیہ ۴۴)

رجوع الی اللہ کے لیے پنج وقتہ نماز کا اہتمام

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ۔ (الروم ۳۰:۳۱-۳۲) (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے، اور ڈرو اس سے، اور نماز قائم کرو اور نہ ہو جاؤ اُن مشرکین میں سے جنھوں نے اپنا دین الگ بنا لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے غضب کا خوف، دونوں قلب کے افعال ہیں۔ اس قلبی کیفیت کو اپنے ظہور اور اپنے استحکام کے لیے لازماً کسی ایسے جسمانی فعل کی ضرورت ہے جس سے خارج میں بھی ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص واقعی اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی کی طرف پلٹ آیا ہے، اور آدمی کے اپنے نفس میں بھی اس رجوع و تقویٰ کی کیفیت کو ایک عملی مُمارَست [مشق] کے ذریعے سے پے در پے نشوونما نصیب ہوتا چلا جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اُس ذہنی تبدیلی کا حکم دینے کے بعد فوراً ہی اس جسمانی عمل، یعنی اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے۔ آدمی کے ذہن میں جب تک کوئی خیال محض خیال کی حد تک رہتا ہے، اس میں استحکام اور پائیداری نہیں ہوتی۔ اُس خیال کے ماند پڑ جانے کا بھی خطرہ رہتا ہے اور بدل جانے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کے مطابق کام کرنے لگتا ہے تو وہ خیال اس کے اندر جڑ پکڑ لیتا ہے، اور جوں جوں وہ اس پر عمل کرتا جاتا ہے، اس کا استحکام بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس عقیدہ و فکر کا بدل جانا یا ماند پڑ جانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو رجوع الی اللہ اور خوفِ خدا کو مستحکم کرنے کے لیے ہر روز پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنے سے بڑھ کر کوئی عمل کارگر نہیں ہے۔ کیونکہ دوسرا جو عمل بھی ہو، اس کی نوبت دیر دیر میں آتی ہے یا متفرق صورتوں میں مختلف مواقع پر آتی ہے۔ لیکن نماز ایک ایسا عمل ہے جو ہر چند گھنٹوں کے بعد ایک ہی متعین صورت میں آدمی کو دائماً کرنا ہوتا ہے، اور اس میں ایمان و اسلام کا وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پورا سبق، جو قرآن نے اسے پڑھایا ہے، آدمی کو بار بار دہرانا ہوتا ہے تاکہ وہ اسے بھولنے نہ پائے۔ مزید برآں کفار اور اہلِ ایمان، دونوں پر یہ ظاہر ہونا ضروری ہے کہ انسانی آبادی میں سے کس کس نے بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعتِ رب کی روش اختیار کر لی ہے۔ اہلِ ایمان پر اس کا ظہور اس لیے درکار ہے کہ ان کی ایک جماعت اور سوسائٹی بن سکے اور وہ خدا کی راہ میں ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں اور ایمان و اسلام سے جب بھی ان کے گروہ کے کسی شخص کا تعلق ڈھیلا پڑنا شروع ہو اسی وقت کوئی کھلی علامت فوراً ہی تمام اہلِ ایمان کو اس کی حالت سے باخبر کر دے۔ کفار پر اس کا ظہور اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر کی سوئی ہوئی فطرت اپنے ہم جنس انسانوں کو خداوندِ حقیقی کی طرف بار بار پلٹتے دیکھ کر جاگ سکے، اور جب تک وہ نہ جاگے ان پر خدا کے فرماں برداروں کی عملی سرگرمی دیکھ دیکھ کر دہشت طاری ہوتی رہے۔ ان دونوں مقاصد کے لیے بھی اقامتِ صلوٰۃ ہی سب سے زیادہ موزوں ذریعہ ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا یہ حکم مکہ معظمہ کے اُس دور میں دیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں کی ایک مٹھی بھر جماعت کفارِ قریش کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہی تھی اور اس کے بعد بھی ۹ برس تک پستی رہی۔ اُس وقت دور دور بھی کہیں اسلامی حکومت کا نام و نشان نہیں تھا۔ اگر نماز اسلامی حکومت کے بغیر بے معنی ہوتی، جیسا کہ بعض نادان سمجھتے ہیں، یا اقامتِ صلوٰۃ سے مراد نماز قائم کرنا سرے سے ہوتا ہی نہیں بلکہ 'نظامِ ربوبیت' چلانا ہوتا، جیسا کہ منکرینِ سنت کا دعویٰ ہے، تو اس حالت میں قرآن مجید کا یہ حکم دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور یہ حکم آنے کہ ۹ سال تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان اس حکم کی تعمیل آخر کس طرح کرتے رہے؟

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۷۵۴-۷۵۵، الروم، حاشیہ ۵۰)

کیا شب و روز میں پانچ اوقات زیادہ ہیں؟

ایک شخص کے پوچھنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ اس نے پوچھا: کیا اس کے سوا بھی کوئی چیز مجھ پر لازم ہے؟ جواب میں ارشاد ہوا: نہیں اِلّا یہ کہ تم اپنی خوشی سے کچھ پڑھو (بخاری و مسلم)

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۱۳۳، المزمل، حاشیہ ۲۱)

پچاس نمازوں والا واقعہ معتبر احادیث میں آیا ہے۔ اس سے جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ نماز کے لیے شب و روز میں پانچ وقت زیادہ نہیں ہیں بلکہ جتنی بار انسان کو اللہ کی عبادت کرنی چاہیے اس کے مقابلے میں بہت کم ہیں، اور یہ کہ ان اوقات میں سے کسی وقت کی نماز کو آدمی ضائع کرتا ہے تو ایک نہیں بلکہ گویا دس نمازوں کو ضائع کرتا ہے۔

(مکاتیب سید ابو الاعلیٰ مودودی، اول، جون ۱۹۷۰ء، ص ۲۹)

دلوک الشّمس کے معنی

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ۔ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۸) نماز قائم کرو زوالِ آفتاب سے لے کر رات کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اندھیرے تک۔

زوالِ آفتاب ہم نے دلوک الشمس کا ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ بعض صحابہ و تابعین نے دلوک سے مراد غروب بھی لیا ہے۔ لیکن اکثریت کی رائے یہی ہے کہ اس سے مراد آفتاب کا نصف النہار سے ڈھل جانا ہے۔ حضرت عمرؓ، ابن عمرؓ، انس بن مالکؓ، ابو برزہ اسلمیؒ، حسن بصریؒ، شعبیؒ، عطاءؒ، مجاہدؒ اور ایک روایت کی رو سے ابن عباسؓ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام محمد باقرؒ اور امام جعفر صادقؒ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ بلکہ بعض احادیث میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی دلوک شمس کی یہی تشریح منقول ہے، اگرچہ ان کی سند کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔

غسق اللیل بعض کے نزدیک رات کا پوری طرح تاریک ہو جانا ہے اور بعض اس سے نصف شب مراد لیتے ہیں۔ اگر پہلا قول تسلیم کیا جائے تو اس سے عشا کا اول وقت مراد ہوگا، اور اگر دوسرا قول صحیح مانا جائے تو پھر یہ اشارہ عشا کے آخر وقت کی طرف ہے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۳۴، بنی اسرائیل، حاشیہ ۹۲-۹۳)

بھولی ہوئی نماز کی ادائیگی کا وقت

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۔ (طٰہٰ ۲۰: ۱۴) اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔

یہاں نماز کی اصلی غرض پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ آدمی خدا سے غافل نہ ہو جائے، دنیا کے دھوکا دینے والے مظاہر اُس کو اس حقیقت سے بےفکر نہ کریں کہ میں کسی کا بندہ ہوں، آزاد و خود مختار نہیں ہوں۔ اس فکر کو تازہ رکھنے اور خدا سے آدمی کا تعلق جوڑے رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے جو ہر روز کئی بار آدمی کو دنیا کے ہنگاموں سے ہٹا کر خدا کی طرف لے جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ نماز قائم کرنا کہ میں تجھے یاد کروں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ۔ مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد رکھوں گا۔

ضمناً اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ جس شخص کو بھول لاحق ہو جائے اسے جب بھی یاد آئے نماز ادا کر لینی چاہیے۔ حدیث میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: مَنْ نَسِیَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، وَ لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذٰلِكَ۔ (مسلم، بخاری، احمد) جو شخص کسی وقت کی نماز بھول گیا ہو، اسے چاہیے کہ جب یاد آئے، ادا کر لے، اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اسی معنی میں ایک روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے، جسے مسلم، ابوداؤد اور نسائی وغیرہ نے لیا ہے۔ اور ابو قتادہ کی روایت ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا: اگر ہم نماز کے وقت سو گئے ہوں تو کیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا: نیند میں کچھ قصور نہیں ہے، قصور تو جاگنے کی حالت میں ہے۔ پس جب تم میں سے کوئی شخص بھول جائے یا سو جائے تو جب بیدار ہو جائے یا جب یاد آئے، نماز پڑھ لے۔ (ترمذی، نسائی، ابوداؤد)

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۸۹-۹۰، طٰہٰ، حاشیہ ۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گرمی میں نمازِ ظہر کے لیے ابراد کا حکم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

گرمی کا زور ہو تو ظہر کی نماز ٹھنڈی کر کے پڑھو (یعنی دیر کر کے پڑھو جب کہ گرمی کی شدت میں کمی ہو جائے)۔

گرمی کی شدت جہنم کی پھونک سے ہے۔ جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی اور کہا: اے رب! میرے اجزا ایک دوسرے کو کھائے جاتے ہیں۔ اس کے رب نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک مرتبہ جاڑے میں اور دوسری مرتبہ گرمی میں۔ گرمی کا سانس اس شدید ترین گرمی جیسا ہوتا ہے جو تم لوگ موسم گرما میں پاتے ہو، اور سردی کا سانس اس شدید ترین سردی جیسا ہوتا ہے جو تم موسم سرما میں پاتے ہو۔[1]

ایک اعتراض کا جواب

.... پہلے اس امر پر غور کیجیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد اس بیان سے آخر کیا ہو سکتا تھا؟ کیا یہ کہ آپؐ ایک عالمِ طبیعیات کی حیثیت سے موسمی تغیرات کے وجوہ بیان فرمانا چاہتے تھے؟ یا یہ کہ آپؐ ایک نبی کی حیثیت سے گرمی کی تکلیف محسوس کرنے والوں کو جہنم کا تصور دلانا چاہتے تھے، جس شخص نے بھی قرآن اور سیرت نبیؐ پر کچھ غور کیا ہو گا وہ بلا تأمل کہہ دے گا کہ آپؐ کی حیثیت پہلی نہ تھی بلکہ دوسری تھی۔ اور گرمی کی شدت کے زمانے میں ظہر کی نماز ٹھنڈی پڑھنے کا حکم دیتے ہوئے آپؐ نے جو کچھ فرمایا، اس سے آپؐ کا مقصد دوزخ سے ڈرانا اور ان کاموں سے روکنا تھا جو آدمی کو دوزخ کا مستحق بناتے ہیں۔ اس لحاظ سے آپؐ کا یہ ارشاد قرآن کے اس ارشاد سے ملتا جلتا ہے جو غزوۂ تبوک کے موقع پر فرمایا گیا تھا کہ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ (التوبہ ۹:۸۱) انھوں نے کہا کہ اس شدید گرمی میں جہاد کے لیے نہ نکلو۔ اے نبیؐ! ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس گرمی سے زیادہ گرم ہے۔

جس طرح یہاں قرآن علمِ طبیعیات کا کوئی مسئلہ بیان نہیں کر رہا ہے، اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی طبیعیات کا درس دینے کے لیے نہیں ہے۔ قرآن دنیا کی گرمی کا جہنم کی گرمی سے مقابلہ اس لیے کر رہا ہے کہ پس منظر میں وہ لوگ موجود تھے جو اس گرمی سے گھبرا کر جہاد کے لیے نکلنے سے جی چرا رہے تھے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا کی شدید گرمی اور شدید سردی کو دوزخ کی محض دو پھونکوں کے برابر اس لیے بتا رہے ہیں کہ پس منظر میں وہ لوگ موجود تھے جو جاڑے میں صبح کی

۱- حضرت ابو ہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَاَبْرِدُوْا بِالصَّلٰوةِ فَاِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ. (بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ باب الابراد بالظہر فی شدۃ الحر)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَاَبْرِدُوْا بِالصَّلٰوةِ فَاِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ وَاشْتَكَتِ النَّارُ اِلٰى رَبِّهَا فَقَالَتْ يَا رَبِّ اَكَلَ بَعْضِيْ بَعْضاً فَاَذِنَ لَهَا بِنَفَسَيْنِ، نَفَسٌ فِي الشِّتَاءِ وَنَفَسٌ فِي الصَّيْفِ وَهُوَ اَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الْحَرِّ وَاَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الزَّمْهَرِيْرِ. (بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب الابراد بالظہر اور بدا الخلق)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور گرمی میں ظہر کی نماز کے لیے نکلنے سے گھبراتے تھے۔ چنانچہ مسند احمد میں زید بن ثابتؓ کی یہ روایت آئی ہے کہ لَمْ یَکُنْ یُصَلِّیْ صَلٰوۃً اَشَدُّ عَلٰی اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْھَا۔ ظہر کی نماز سے بڑھ کر کوئی نماز اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق نہ تھی۔ اور اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس نے گرمی کے زمانے میں عرب کی دوپہر کبھی دیکھی ہو۔

اس کے بعد حدیث کے اصل الفاظ کی طرف آئیے۔ فان شدۃ الحر من فیح جھنم (گرمی کی شدت جہنم کی پھونک سے ہے) کے معنی لازماً یہی نہیں ہے کہ دنیا میں گرمی جہنم کی پھونک کی وجہ سے ہوتی ہے، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ جہنم کی پھونک کی قسم یا جنس سے ہے۔ اس لیے کہ عربی زبان میں لفظ من بیان جنس کے لیے بکثرت استعمال ہوتا ہے اور خود قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ جیسے:

مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ۔ (فاطر ۳۵:۲) [اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لیے کھول دے۔] مَھْمَا تَاْتِنَا بِہٖ مِنْ اٰیَۃٍ لِّتَسْحَرَنَا بِھَا (اعراف ۷:۱۳۲) [تو ہمیں مسحور کرنے کے لیے خواہ کوئی نشانی لے آئے۔] اور فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ۔ (الحج ۲۲:۳۰) [پس بتوں کی گندگی سے بچو۔]

رہا آخری فقرہ، تو اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ دنیا میں گرمی اور جاڑے کے موسم دوزخ کی ان دو پھونکوں کے سبب سے آتے ہیں، بلکہ الفاظ یہ ہیں: فَاَذِنَ لَھَا بِنَفَسَیْنِ نَفَسٌ فِی الشِّتَاءِ وَ نَفَسٌ فِی الصَّیْفِ، اَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الْحَرِّ وَاَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الزَّمْھَرِیْرِ۔ (پس اس کے رب نے اس کو دو سانسوں کی اجازت دی، ایک سانس جاڑے میں اور ایک سانس گرمی میں، جو اس شدید ترین گرمی جیسا ہے جو تم پاتے ہو، اور اس شدید ترین سردی جیسا ہے جو تم پاتے ہو۔)

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۷-۳۰)

جمع بین الصلاتین

حنفیہ جمع بین الصلاتین کے جس معنی میں قائل ہیں وہ یہ ہے کہ ایک نماز کا وقت ختم ہو رہا ہو اور دوسری کا شروع ہو رہا ہو، اس وقت دونوں وقت کی نماز ملا کر پڑھ لی جائیں۔

سفر میں اگر آدمی وقت پر نماز پڑھنے کا موقع پائے تو ادا کرے ورنہ مجبوراً قضا کر کے دوسرے وقت کی نماز کے وقت اس کو ادا کرے۔

(مکاتیب سید ابو الاعلیٰ مودودی، دوم، نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۳۲۳)

س: انگلستان میں مقیم ایک طالب علم کا سوال ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ظہر کے لیے بہت کم ٹائم ملتا ہے جبکہ عصر کے لیے ملتا ہی نہیں ہے، اس صورت حال میں جمع بین الصلاتین کی گنجایش ہو گی؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ج: نمازوں کے بارے میں جس مشکل کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کا حل یہ ہے کہ ظہر کی نماز میں اگر سنتیں ادا کرنے کا وقت نہ مل سکے تو صرف فرض پڑھ لیا کریں، اور عصر کے لیے وقت ملنے کی اگر کوئی صورت مکمل نہ ہو تو مغرب کے ساتھ قضا پڑھ لیا کریں۔ دو وقت کی نمازوں کو ملا کر پڑھنے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ظہر اور مغرب کے آخری وقتوں میں عصر کو ظہر کے ساتھ اور مغرب کو عشا کے ساتھ ملا کر پڑھا جا سکتا ہے اور دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ایک وقت کی نماز کے ساتھ دوسرے وقت کی نماز پیشگی بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ لیکن اس بات کو قریب قریب تمام علمائے اہل سنت نے ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی شخص دو وقت کی نمازوں کو ملا کر پڑھنے کی عادت بنا لے۔ کیونکہ اس طرح تو عملاً پانچ وقت کے تین وقت ہی بن کر رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا آپ اس سے تو پرہیز کریں، البتہ جب کبھی عصر کی نماز پڑھنا ممکن نہ ہو، اسے قضا پڑھ لیا کریں۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۳)

وہ اوقات جن میں نماز ادا کرنا مکروہ ہے

نماز کے اوقات کا یہ نظام [جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے] مقرر کرنے میں جو مصلحتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں ان میں سے ایک اہم مصلحت یہ بھی ہے کہ آفتاب پرستوں کے اوقاتِ عبادت سے اجتناب کیا جائے۔ آفتاب ہر زمانے میں مشرکین کا سب سے بڑا، یا بہت بڑا معبود رہا ہے، اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات، خاص طور پر ان کے اوقاتِ عبادت رہے ہیں، اس لیے ان اوقات میں تو نماز پڑھنا حرام کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ آفتاب کی پرستش زیادہ تر اس کے عروج کے اوقات میں کی جاتی رہی ہے، لہٰذا اسلام میں حکم دیا گیا ہے کہ تم دن کی نمازیں زوالِ آفتاب کے بعد پڑھنی شروع کرو اور صبح کی نماز طلوعِ آفتاب سے پہلے پڑھ لیا کرو۔ اس مصلحت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متعدد احادیث میں بیان فرمایا ہے چنانچہ ایک حدیث میں حضرت عمرو بن عَبَسہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے اوقات دریافت کیے تو آپؐ نے فرمایا:

صَلِّ صَلٰوةَ الصُّبۡحِ ثُمَّ اَقۡصِرۡ عَنِ الصَّلٰوةِ حِیۡنَ تَطۡلُعُ الشَّمۡسُ حَتّٰی تَرۡتَفِعَ فَاِنَّهَا تَطۡلُعُ حِیۡنَ تَطۡلُعُ بَیۡنَ قَرۡنَیِ الشَّیۡطٰنِ وَ حِیۡنَئِذٍ یَسۡجُدُ لَهُ الۡكُفَّارُ۔ صبح کی نماز پڑھو اور جب سورج نکلنے لگے تو نماز سے رُک جاؤ، یہاں تک کہ سورج بلند ہو جائے کیونکہ سورج جب نکلتا ہے تو شیطان کے سینگوں کے درمیان نکلتا ہے اور اس وقت کفار اس کو سجدہ کرتے ہیں۔

پھر آپؐ نے عصر کی نماز کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

ثُمَّ اَقۡصِرۡ عَنِ الصَّلٰوةِ حَتّٰی تَغۡرُبَ الشَّمۡسُ فَاِنَّهَا تَغۡرُبُ بَیۡنَ قَرۡنَیِ الشَّیۡطٰنِ حِیۡنَئِذٍ یَسۡجُدُ لَهُ الۡكُفَّارُ۔ (مسلم) پھر نماز سے رُک جاؤ یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے کیونکہ سورج شیطان کے سینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے اور اس وقت کفار اس کو سجدہ کرتے ہیں۔

اس حدیث میں سورج کا شیطان کے سینگوں کے درمیان طلوع اور غروب ہونا ایک استعارہ ہے یہ تصور دلانے کے لیے کہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شیطان اس کے نکلنے اور ڈوبنے کے اوقات کو لوگوں کے لیے ایک فتنۂ عظیم بنا دیتا ہے۔ گویا جب لوگ اس کو نکلتے اور ڈوبتے دیکھ کر سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیطان اسے اپنے سر پر لیے ہوئے آیا ہے اور سر پر لیے جا رہا ہے۔ اس استعارے کی گرہ حضورؐ نے خود اپنے اس فقرے میں کھول دی ہے کہ اس وقت کفار اس کو سجدہ کرتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۳۶-۶۳۷، بنی اسرائیل، حاشیہ ۹۵)

نماز فجر دیر سے پڑھنا

ابوداؤد اور دوسری کتب سنن میں [حضرت صفوان بن معطل سُلمی کے بارے میں] یہ ذکر آتا ہے کہ اُن کی بیوی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت کی تھی کہ یہ کبھی صبح کی نماز وقت پر نہیں پڑھتے۔ انھوں نے عذر پیش کیا کہ یا رسول اللہؐ! یہ میرا خاندانی عیب ہے، دیر تک سوتے رہنے کی اس کمزوری کو میں کسی طرح دور نہیں کر سکتا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اچھا جب آنکھ کھلے، نماز ادا کر لیا کرو۔

(تفہیم القرآن، سوم، حاشیہ، ص ۳۱۱، النور، تاریخی پس منظر)

قطبین میں اوقات کا تعین

جن ممالک میں چوبیس گھنٹے کے اندر طلوع وغروب ہوتا ہے، ان میں خواہ دن اور رات چھوٹے ہوں یا بڑے، نمازوں اور روزوں کے اوقات انھی قاعدوں پر مقرر کیے جائیں گے جو قرآن میں بتائے گئے ہیں۔ یعنی فجر کی نماز طلوع آفتاب سے پہلے ظہر کی نماز زوالِ آفتاب کے بعد، عصر کی نماز غروبِ آفتاب سے قبل، مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد اور عشا کی نماز کچھ رات گزر جانے پر۔ اسی طرح روزہ بہر حال صبح صادق کے ظہور پر شروع ہوگا اور غروبِ آفتاب کے معاً بعد افطار کیا جائے گا۔ جہاں ظہر وعصر، یا مغرب وعشا میں فصل ممکن نہ ہو وہاں جمع بین الصلوٰتین کر لیں۔

[ایسے علاقوں کے باشندے] اپنی سہولت کے لیے [اپنے قریب والے ممالک] کی رصد گاہ سے دریافت کر لیں کہ ان کے علاقے میں آفتاب کے طلوع وغروب اور زوال کے اوقات کیا ہیں۔ پھر ان اوقات کے لحاظ سے اپنی نمازوں کے اوقات مقرر کر لیں۔

روزے کے لیے وہاں کے دن کی بڑائی سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ابن بطوطہ نے روس کے شہر بُلغار کے متعلق لکھا ہے کہ گرمی کے زمانے میں جب وہاں پہنچا تو رمضان کا مہینہ تھا اور افطار کے وقت سے لے کر صبح صادق کے ظہور تک صرف ۲ گھنٹے کا وقت تھا۔ اسی مختصر مدت میں وہاں کے مسلمان افطار بھی کرتے، کھانا بھی کھاتے اور عشا کی نماز بھی پڑھ لیتے تھے۔ نماز عشا سے فارغ ہو کر کچھ دیر نہ گزری تھی کہ صبح صادق ظاہر ہو جاتی اور پھر فجر کی نماز پڑھ لی جاتی تھی۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۳۸-۲۳۹)

س: جن علاقوں میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں نماز وغیرہ کے اوقات کس طرح مقرر ہوں گے؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ج: اگر وہاں دنیا کے دوسرے تمام کاموں کے اوقات مقرر ہو سکتے ہیں، کھانے پینے کے اوقات مقرر ہو سکتے ہیں تو پھر نماز کے اوقات طے کرنے میں کیا دقت ہے؟ ظاہر ہے کہ وہاں لوگ صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد دوپہر کا کھانا تین ماہ بعد یا شام کا کھانا چھے ماہ بعد تو نہیں کھاتے؟ جب ہر معاملہ اپنے جائز فطری تقاضوں کے مطابق ہی طے کیا جاتا ہے تو پھر دینِ فطرت کے معاملے میں کیا پیچیدگی پیش آ سکتی ہے۔ چنانچہ ایسے علاقوں میں اوقاتِ نماز طے کرنے کے لیے دو اصول اپنائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہاں نماز کے اوقات مکہ معظمہ میں نمازوں کے مطابق رکھے جائیں۔ دوسرے یہ کہ جس قریب ترین شہر یا بستی میں معمول کے مطابق طلوع وغروب آفتاب ہوتا ہے اس کے اوقات اپنا لیے جائیں۔

[ایک صاحب نے کہا:] نمازوں کے اوقات کی جو علامات بتائی گئی ہیں، کیا ان کے بغیر اوقات کا تعین ہو سکتا ہے؟

[مولانا نے فرمایا:] سوال یہ ہے کہ اصل اہمیت کس چیز کی ہے؟ اصل اہمیت نماز کی ہے نہ کہ ان علامات کی۔ اب جہاں یہ علامات ظاہر نہ ہوتی ہوں، کیا آپ وہاں نماز سے بری الذمہ قرار پا سکتے ہیں۔؟

(۵-اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۲۶-۲۷)

چھ مہینے کے دن رات والے علاقوں میں اوقات کا تعین

قطبین کے علاقوں کے اوقاتِ عبادت کے معاملے میں میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ جن علاقوں میں رات اور دن کا الٹ پھیر ۲۴ گھنٹے کے اندر ہو جاتا ہے ان میں روزہ نماز کے اوقات اسی قاعدے پر ہونے چاہییں جو خطِ استوا سے قریب تر مقامات کے لیے ہے، خواہ رات دو ہی گھنٹے کی ہو یا دن دو ہی گھنٹے کا رہ جائے۔ البتہ اس کے آگے جہاں رات اور دن ۲۴ گھنٹوں سے متجاوز ہو جاتے ہیں، وہاں گھڑیوں کے حساب سے اوقات مقرر کیے جانے چاہییں اور ایسے مقامات پر تعینِ اوقات مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ کے معیار پر کیا جانا چاہیے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۳۱۷-۳۱۸، ۳۲۲-۳۲۳)

❁ ❁ ❁

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب سوم

نماز کے ارکان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

تعوذ اور تسمیہ

نماز کی ابتدا

تم نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہو۔ منہ قبلے کے سامنے ہے، پاک صاف ہوکر بادشاہِ عالم کے دربار میں حاضر ہو، سب سے پہلے تمھاری زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں: اَللّٰـهُ اَكْبَرُ (اللہ سب سے بڑا ہے) اس زبردست حقیقت کا اقرار کرتے ہوئے کانوں تک ہاتھ اٹھاتے ہو، گویا دنیا و مافیہا سے دست بردار ہو رہے ہو۔ پھر ہاتھ باندھ لیتے ہو گویا اب تم بالکل اپنے بادشاہ کے سامنے باادب دست بستہ کھڑے ہو۔ اس کے بعد تم کیا عرض معروض کرتے ہو۔

تسبیح

سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَ تَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ. تیری پاکی بیان کرتا ہوں، اے اللہ! اور وہ بھی تیری تعریف کے ساتھ۔ بڑی برکت والا ہے تیرا نام، سب سے بلند و بالا ہے تیری بزرگی اور کوئی معبود نہیں تیرے سوا۔

تعوذ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ خدا کی پناہ مانگتا ہوں میں شیطان مردود کی دراندازی اور شرارت سے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص۱۴۹-۱۵۰)

□ **تلاوتِ قرآن سے پہلے تعوذ:** فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ○ (النحل ۱۶:۹۸-۱۰۰)
پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔ اُسے اُن لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔ اس کا زور تو انھی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے اور اس کے بہکانے سے شرک کرتے ہیں۔

اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بس زبان سے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کہہ دیا جائے، بلکہ اس کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ساتھ فی الواقع دل میں یہ خواہش اور عملاً یہ کوشش بھی ہونی چاہیے کہ آدمی قرآن پڑھتے وقت شیطان کے گمراہ کن وسوسوں سے محفوظ رہے، اور غلط اور بے جا شکوک و شبہات میں مبتلا نہ ہو۔ قرآن کی ہر بات کو اس کی صحیح روشنی میں دیکھے، اور اپنے خود ساختہ نظریات یا باہر سے حاصل کیے ہوئے تخیلات کی آمیزش سے قرآن کے الفاظ کو وہ معنی نہ پہنانے لگے جو اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہیں۔ اس کے ساتھ آدمی کے دل میں یہ احساس بھی موجود ہونا چاہیے کہ شیطان سب سے بڑھ کر جس چیز کے درپے ہے وہ یہی ہے کہ ابن آدم قرآن سے ہدایت نہ حاصل کرنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب اس کتاب کی طرف رجوع کرتا ہے تو شیطان اسے بہکانے اور اخذِ ہدایت سے روکنے اور فکر و فہم کی غلط راہوں پر ڈالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ اس لیے آدمی کو اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت انتہائی چوکنا رہنا چاہیے اور ہر وقت خدا سے مدد مانگتے رہنا چاہیے کہ کہیں شیطان کی دراندازیاں اسے اس سرچشمۂ ہدایت کے فیض سے محروم نہ کر دیں۔ کیونکہ جس نے یہاں سے ہدایت نہ پائی وہ پھر کہیں سے ہدایت نہ پا سکے گا، اور جو اس کتاب سے گمراہی اخذ کر بیٹھا اسے پھر دنیا کی کوئی چیز گمراہیوں کے چکر سے نہ نکال سکے گی۔

قرآن کو اس کی اصلی روشنی میں صرف وہی شخص دیکھ سکتا ہے جو شیطان کی گمراہ کن وسوسہ اندازیوں سے چوکنا ہو اور ان سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ سے پناہ مانگے۔ ورنہ شیطان کبھی آدمی کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ سیدھی طرح قرآن کو اور اس کی باتوں کو سمجھ سکے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۵۷۱، النحل، حاشیہ ۱۰۱)

☐ **شیطان سے پناہ مانگنے کی حکمت:** قرآن مجید میں یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جب تم قرآن پڑھو تو پہلے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو شیطان رجیم سے --- اسی حکم کی بنا پر قرآن مجید کی تلاوت کا آغاز اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ سے کیا جاتا ہے --- یہ ہدایت کیوں دی گئی ہے؟ پناہ مانگنے میں آپ سے آپ کچھ باتیں شامل ہوتی ہیں۔ پناہ مانگنے کے عین مفہوم میں کچھ چیزیں شامل ہیں۔ ایک خود پناہ دوسرے پناہ مانگنے والا۔ تیسرے وہ جس سے پناہ مانگی جائے۔

پناہ مانگنے والا پناہ ہمیشہ اس صورت میں مانگا کرتا ہے جبکہ اسے کسی خطرے کا احساس ہو۔ اگر خطرے کا احساس ہی نہ ہو تو پناہ کا کوئی تصور اس کے ذہن میں نہیں آتا۔ اور پناہ ہمیشہ اس سے مانگی جاتی ہے جس کے متعلق آدمی کو یہ اطمینان ہوتا ہے کہ یہ ہمیں محفوظ کر سکتا ہے، اس خطرے سے جس کا ہم احساس رکھتے ہیں۔ جب تک یہ دونوں باتیں شامل نہیں ہوں گی آدمی کے ذہن میں نہ کوئی پناہ کے لیے تصور آئے گا اور نہ کسی کی طرف وہ توجہ کرے گا، مانگنے کی۔

ظاہر بات ہے کہ اگر کسی آدمی کو پناہ لینے کی ضرورت کا احساس ہی نہ ہو تو وہ کبھی نہیں بھاگے گا۔ جیسے زلزلہ اچانک آتا ہے۔ چونکہ لوگوں کو احساس نہیں ہوتا کہ کوئی خطرہ پیش آنے والا ہے اس لیے لوگ اطمینان سے بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر ایک منٹ پہلے بھی انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ زلزلہ آنے والا ہے اور ہمارے مکان کے گرنے کا خطرہ ہے تو بے خبری کی وجہ سے آدمی خطرے میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر خطرے کا احساس ہو جائے، یہ معلوم ہو جائے کہ مثلاً شیر آ رہا ہے، یہ معلوم ہو جائے کہ مکان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گرنے والا ہے، یہ معلوم ہو جائے کہ آگ لگنے والی ہے تو آدمی فوراً ہوشیار ہو جاتا ہے۔ وہ پناہ لینے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح سے اگر آدمی کو یہ اطمینان نہ ہو کہ فلاں جگہ مجھے تحفظ حاصل ہو گا تو اطمینان کے ساتھ اس جگہ کی طرف رخ نہیں کرتا۔ اگر ایک آدمی مثلاً خطرہ محسوس کرتا ہے لیکن اسے جائے پناہ نہیں معلوم۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ گھبرایا گھبرایا چاروں طرف پھرے گا۔ چونکہ اس کو یہ اطمینان نہیں ہے کہ فلاں جگہ ہے جہاں مجھے پناہ مل سکتی ہے۔ اب دیکھیے قرآن مجید پڑھنے سے پہلے یہ ہدایت فرمائی گئی کہ جب تم قرآن پڑھو تو اللہ کی پناہ مانگو، شیطان رجیم سے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ شیطان رجیم سے خطرہ عظیم ہے انسان کو۔ کیوں؟ اس وجہ سے کہ اول روز پیدائش سے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تھا، وہ بھی خار کھائے بیٹھا ہے کہ جس خلافت کے منصب پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو مامور کیا ہے اس خلافت کے منصب کا میں اس کو نااہل ثابت کروں گا۔ میں ثابت کروں گا کہ یہ اس قابل نہیں تھا کہ اس کو خلافت سونپی جاتی۔ میں یہ ثابت کروں گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا اور فساد برپا کرے گا اور خرابیاں لائے گا جو خلافت کے منصب کے لیے موزوں نہیں۔

یہ قرآن مجید اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ تمھارا ازلی دشمن شیطان ہے جو اس بات کے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ تم کو اللہ کے راستے سے بھٹکائے، تمھارے دلوں میں وسوسے ڈالے، تم کو دنیا پر فریفتہ کرے، آخرت کو بھلائے، حتیٰ کہ خود اللہ تعالیٰ کے وجود کے سلسلے میں بھی تمھارے دلوں میں شک ڈالے۔ ہر ممکن طریقے سے وہ تم کو بہکانے پر تلا ہوا ہے۔ اب جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ زلزلہ مثلاً اچانک آتا ہے، آدمی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں زمین کے اندر وہ مواد پک رہا ہے جو زلزلہ لائے گا، تو بے خبر آدمی خطرے میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو خبردار کر دیا جائے کہ یہ زلزلہ آنے والا ہے اور آدمی یہ محسوس کرے کہ یہ میرے لیے خطرناک ہے تو اس صورت میں آدمی پناہ لینے کی کوشش کرے گا۔

قرآن مجید یہ کام کرتا ہے کہ وہ خبردار کر دیتا ہے آدمی کو کہ شیطان تمھارے لیے ایک خطرہ ہے جو اس بات پر تلا ہوا ہے کہ تم قرآن مجید کو نہ سمجھو اور کوشش کرتا ہے کہ تم الٹا سمجھو، کوشش کرتا ہے تمھارے دلوں میں شکوک ڈالنے کی، کوشش کرتا ہے تمھیں راہ ہدایت سے بھٹکانے کی۔ یہ آخری چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدمی کی ہدایت کے لیے نازل کی ہے لیکن شیطان کی کوشش یہ ہے کہ یہیں سے آدمی ہدایت نہ پائے اور اگر یہاں سے اس نے ہدایت نہ پائی تو پھر دنیا میں اور کہیں سے ہدایت وہ پا نہیں سکتا۔ اس وجہ سے چونکہ یہی ایک منبع ہدایت ہے یہی سرچشمہ ہے رہنمائی کا، اور شیطان اس پر تلا ہوا ہے کہ تم یہاں سے ہدایت نہ پانے پاؤ۔ اس وجہ سے تم کو اس خطرے کو محسوس کرنا چاہیے۔ جب تم قرآن پڑھنے بیٹھو تو اس خطرے کو محسوس کرو کہ شیطان پیچھے ہے۔ دیکھیے قرآن مجید میں بکثرت وہ باتیں کی گئی ہیں کہ جو بہت سے خودساختہ انسانی نظریات کے خلاف پڑتی ہیں۔ بہت سی وہ باتیں کی گئی ہیں جو انسان کی خواہشات نفس کے خلاف پڑتی ہیں۔ بہت سی وہ باتیں بیان کی گئی ہیں جو انسان میں جو مختلف قسم کے اوہام اور رسوم اور آداب رائج ہیں ان کے خلاف پڑتی ہیں۔ پھر بہت سی وہ چیزیں ہیں جو متشابہات کے (قبیل سے ہیں) جن میں اس بات کا امکان ہے کہ اگر آدمی غلط معنی لے بیٹھے تو بالکل کفر میں مبتلا ہو جائے۔ مثلاً قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا ذکر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں کہ جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں۔ اگر آدمی اس کے غلط معنی لے بیٹھے تو کفر میں مبتلا ہو جائے۔ میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں بلکہ فی الواقع آپ کے اندر احساس ہونا چاہیے کہ شیطان رجیم ایک خطرہ ہے اور دوسری یہ کہ اللہ کی پناہ جب مانگنے جائیں تو اپنی طرف سے وہ کام نہ کریں کہ جس کی وجہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے آپ اللہ کی پناہ سے محروم ہو جائیں۔ کیوں؟ مثلاً آدمی زبان سے یہ کہہ رہا ہے کہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ لیکن اپنے وہ تصورات جو اس کے دماغ میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ ان کو نہیں نکالتا اپنے جو نظریات قائم کیے ہیں ان کے اوپر جما ہوا ہے۔ کوشش یہ کرتا ہے کہ قرآن اس کے مطابق ہی ملے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو نہ خطرہ لاحق ہے نہ خطرے کا احساس ہوا ہے، نہ وہ اللہ کی پناہ فی الواقع مانگ رہا ہے۔ اللہ کی پناہ مانگنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ذہن کو دوسرے تصورات سے خالی کر لے اور اس ارادے سے بیٹھے کہ یہاں سے ہدایت پانی ہے' اس کے بعد اللہ کی پناہ آپ کو ملے گی۔ اور جس وقت آپ کے دل میں کوئی احساس پیدا ہو آپ محسوس کر جائیں اس بات کو کہ کوئی وسوسہ آ رہا ہے، کوئی شک آ رہا ہے تو پھر کانپ جایئے اور اللہ سے پناہ مانگیے۔ تب جا کر یہ نسخہ کارگر ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت میں کوئی تعویذ نہیں ہے یا عملیات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے کہ زبان سے نکالتے ہی پھر وہ حصار ہو گیا آپ کے گرد، اور اب شیطان نہیں آ سکتا، یہ نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہم کو یہ ہدایت کی ہے کہ میری کتاب کو پڑھتے ہوئے چوکنے رہو۔ بالکل ہوشیار رہو۔

(کیسٹ نمبر ۱، ادارہ الابلاغ، نور چیمبر لاہور، سورۃ فاتحہ کے ضمن میں تعوذ پر گفتگو، بحوالہ تفہیم الاحادیث، سوم، ص ۵۵-۵۶، اگست ۲۰۰۴ء)

تسمیہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

اسلام جو تہذیب انسان کو سکھاتا ہے اس کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہر کام کی ابتدا خدا کے نام سے کرے۔ اس قاعدے کی پابندی اگر شعور اور خلوص کے ساتھ کی جائے تو اس سے لازماً تین فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک یہ کہ آدمی بہت سے برے کاموں سے بچ جائے گا، کیونکہ خدا کا نام لینے کی عادت اسے ہر کام شروع کرتے وقت یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ کیا واقعی میں اس کام پر خدا کا نام لینے میں حق بجانب ہوں؟ دوسرے یہ کہ جائز اور صحیح اور نیک کاموں کی ابتدا کرتے ہوئے خدا کا نام لینے سے آدمی کی ذہنیت بالکل ٹھیک سمت اختیار کرے گی اور وہ ہمیشہ صحیح ترین نقطے سے اپنی حرکت کا آغاز کرے گا۔ تیسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب وہ خدا کے نام سے اپنا کام شروع کرے گا تو خدا کی تائید اور توفیق اس کے شامل حال ہوں گی، اس کی سعی میں برکت ڈالی جائے گی اور شیطان کی فساد انگیزیوں سے اس کو بچایا جائے گا۔ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ جب بندہ اس کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہ بھی بندے کی طرف توجہ فرماتا ہے۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۴۳، الفاتحہ، حاشیہ ۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

قراءت

سورۃ الفاتحہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۭ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۭ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ ۝ (الفاتحہ ۱:۱-۷) تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے، رحمان اور رحیم ہے، روز جزا کا مالک ہے۔ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ہمیں سیدھا راستہ دکھا، اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔

☐ **حمد کے معنی:** حمد کا لفظ تعریف اور شکر دونوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اصل معنی اس کے تعریف کے ہیں، شکر کے معنی ضمناً پیدا ہوتے ہیں۔جب ایک آدمی کسی کا احسان مند ہوتا ہے تو اس کی تعریف کرتا ہے اس وجہ سے شکر کا مفہوم اس کے اندر آپ سے آپ آجاتا ہے۔اسی لیے بسا اوقات جب کوئی آپ سے پوچھتا ہے کہ آپ کا مزاج کیسا ہے؟ آپ کہتے ہیں: الحمد للہ! تو وہ الحمد للہ شکر کے معنی میں ہوتا ہے۔کھانا کھا کر آپ اٹھتے ہیں، آپ کہتے ہیں، الحمد للہ! پانی پیتے ہیں، آپ کہتے ہیں الحمد للہ! یہ سارا الحمد للہ جو ہے یہ شکر کے معنوں میں ہے لیکن اس کی بنا کیا ہے؟ اس کی بنا یہ ہے کہ آدمی جب کسی کا شکر گزار ہوتا ہے اور دل میں اپنے احسان مندی محسوس کرتا ہے تو وہ اس کی تعریف کرتا ہے اور اس تعریف کا اصل جو محرک ہوتا ہے وہ شکر کا جذبہ ہوتا ہے۔بہت سے لوگ آپ دیکھیں گے کہ کسی شخص نے اگر ان کے اوپر بہت بڑا احسان کیا ہے وہ کہیں گے: اجی، اس کا کیا کہنا! وہ تو بڑا سخی آدمی ہے، بڑا فیاض آدمی ہے، بڑا ہمدرد آدمی ہے۔اب یہ ساری باتیں جو کہہ رہا ہے تو وہ ظاہر ہے، تعریف کر رہا ہے۔درحقیقت وہ اظہارِ شکر کر رہا ہے، محرک اس کا شکر ہوتا ہے لیکن بنا جو اصل...... حمد کی ہے وہ تعریف ہے اور تعریف دو طرح سے ہوا کرتی ہے: ایک بجائے خود کسی کے کمال کی تعریف ہوتی ہے اور ایک کسی ایسے کمال کی تعریف ہوتی ہے جو ہمارے لیے نافع ہے۔مثلاً یہ کہ ایک پھول کو آپ دیکھتے ہیں، اس کے حسن کی آپ تعریف کرتے ہیں، قطع نظر اس کے کہ وہ آپ کے لیے نافع ہے یا نہیں۔یعنی بجائے خود وہ پھول اتنا حسین ہے کہ آپ اس کی تعریف کر رہے ہیں وہ اس تعریف کا مستحق ہے، ایک دوا کی آپ تعریف کرتے ہیں، یہ تعریف اس بنا پر ہے کہ اس کے خواص آپ کے لیے نافع ہیں۔

☐ **تعریف اللہ ہی کے لیے:** اللہ تعالیٰ کی جو تعریف ہے وہ ان دونوں وجوہ سے ہے۔اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بجائے خود کامل ہے، بجائے خود تمام کمالات کا اور ساری خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ اس بنا پر بھی ہے کہ دنیا میں جو چیز بھی قابلِ تعریف ہے اس کے اندر جو صفت بھی پیدا ہوتی ہے تعریف کی، وہ اللہ کے پیدا کرنے سے ہوتی ہے تو وہ منبع کمالات بھی ہے اور سرچشمۂ کمالات بھی ہے۔ تمام خوبیوں کی ابتدا اسی کی ذات سے ہوتی ہے اور تمام خوبیاں اسی کی پیدا کردہ ہیں اور اس بنا پر بھی ہے کہ اس کی بے شمار صفات ایسی ہیں جو براہِ راست ہمارے وجود کا سبب بنی ہیں۔ براہِ راست ہمارے لیے جو کچھ بھی ہم کو بھلائی پہنچتی ہے، اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے پہنچتی ہے تو ان فوائد و منافع کی وجہ سے بھی جو اللہ سے ہم کو پہنچتے ہیں ہم اس کی تعریف کرتے ہیں اور بجائے خود اس کے کمالات کی بنا پر بھی تعریف کرتے ہیں کہ جس چیز میں بھی جو کچھ کمال ہے اس کا سرچشمہ اس کی ذات ہے۔

جب الحمد للہ کہا جائے تو اس کے اندر خود یہ مفہوم شامل ہو جاتا ہے کہ حقیقت میں تعریف جس چیز کا نام ہے اس کا مستحق وہی ہے یعنی دوسرا کوئی تعریف کا مستحق نہیں ہے، دوسرا اگر تعریف کا مستحق ہے تو مجازاً ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ بالذات مستحق ہے اور حقیقت میں تعریف اگر پہنچتی ہے تو اسی کو پہنچتی ہے۔ مثلاً آپ چیز دیکھتے ہیں کہ بڑی اچھی بنی ہوئی ہے۔ جب آپ اس کی تعریف کرتے ہیں کہ کیا خوب بنی ہوئی ہے تو حقیقت میں اس بنانے والے کی تعریف کرتے ہیں۔ یعنی وہ چیز بجائے خود تعریف کی مستحق نہیں، بنانے والا تعریف کا مستحق ہے جس نے اتنی اعلیٰ درجے کی چیز بنائی۔ تو جتنی چیزیں بھی ہیں جن کی کوئی شخص تعریف کرتا ہے حقیقت میں وہ ساری تعریف اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔......... اگر تعریف کا مستحق اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے تو باقی وہ کون ہیں جو معبود ہونے کے مستحق ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر تمام تعریف اللہ کے لیے ہے تو یقیناً ساری عبادت اللہ ہی کے لیے ہے۔ کوئی دوسرا کسی عبادت کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اگر اس میں کوئی کمال ہے بھی تو عطیہ اللہ تعالیٰ کا۔ اپنا ذاتی کوئی کمال نہیں۔ ذاتی کمال جب اس کا نہیں ہے تو وہ عبادت کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے۔

ایک نبی بلاشبہ نہایت ہی مقدس ہستی ہے نہایت پاکیزہ ہستی ہے لیکن کس بنا پر وہ قابل تعریف ہے؟ اس بنا پر کہ اللہ نے نبی بنایا ہے۔ جب اللہ کا بنایا ہوا نبی ہونے کی وجہ سے وہ قابل تعریف ہے اور جو کچھ اس کے کمالات ہیں وہ اللہ کے دیے ہوئے ہیں تو معبود نبی کو ہونا چاہیے کہ اللہ کو ہونا چاہیے؟ اسی طرح دوسری جو ہستیاں بھی ہیں اگر فرض کیجیے کوئی شخص سورج کی عبادت کر رہا ہے۔ سورج کو روشنی کہاں سے ملی؟ سورج کو حرارت کہاں سے ملی؟ یہ انرجی جو سورج دے رہا ہے یہ کہاں سے حاصل ہوئی؟ اگر اس کا بنانے والا اللہ ہی ہے اور ظاہر بات ہے کہ اللہ ہی ہے تو معبود ہونے کا مستحق سورج نہیں ہے بلکہ اللہ ہے۔ تو اس طرح سے الحمد للہ کا لفظ خود شرک کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ یہیں سے آغاز ہو جاتا ہے شرک کی جڑ کاٹنے کا اور توحید کے اثبات کا۔

(کیسٹ سورہ فاتحہ، ادارہ الابلاغ، نور چیمبر لاہور، بحوالہ تفہیم الاحادیث سوم، اگست ۲۰۰۴ء، ص ۱۶-۱۸)

الحمد للہ کے ترجمے پر اعتراض اور اس کا جواب

س: تفہیم القرآن میں آپ نے الحمد للہ کا ترجمہ 'تعریف اللہ [ہی] کے لیے ہے' کیا ہے۔ حالانکہ مترجمین سلف و خلف نے اس کا ترجمہ 'تمام خوبیاں اللہ کے لیے'، 'سب تعریف اللہ کے لیے' کیا ہے۔ تفہیم القرآن کا ترجمہ کچھ نامکمل' یا نا تمام سا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

محسوس ہوتا ہے۔

ج: اردو زبان میں 'اللہ کے لیے تعریف ہے' اور 'تعریف اللہ [ہی] کے لیے ہے' کے درمیان معنی کے اعتبار سے بہت بڑا فرق ہے۔ اللہ کے لیے تعریف ہے، کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ جس طرح دوسروں کے لیے تعریف ہوسکتی ہے اس طرح اللہ کے لیے بھی ہے۔ لیکن جب 'تعریف اللہ [ہی] کے لیے ہے' کہا جائے گا تو مطلب یہ ہوگا کہ تعریف جس چیز کا نام ہے، وہ اپنے تمام مفہومات کے ساتھ اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے' کسی دوسرے کو یہ تعریف نہیں پہنچتی۔ میں نے اس ترجمے میں بعینہ اس مضمون کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے جو الحمدلِلّٰہ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس اندازِ بیان کو اختیار کرنے سے وہ معنی زیادہ اچھی طرح ادا ہوجاتے ہیں۔ جو دوسرے مترجمین 'تمام خوبیاں اللہ کے لیے ہیں' یا 'ساری خوبیاں اللہ کے لیے ہیں' یا 'سب تعریف اللہ کے لیے ہے' اور ایسے ہی دوسرے الفاظ سے ادا کرنا چاہتے ہیں۔

(رسائل و مسائل، پنجم، اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۶۸)

سورۂ فاتحہ اور باقی قرآن کا باہمی تعلق

دراصل یہ سورت ایک دعا ہے جو خدا نے ہر اُس انسان کو سکھائی ہے جو اس کی کتاب کا مطالعہ شروع کر رہا ہو۔ کتاب کی ابتدا میں اس کو رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم واقعی اس کتاب سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو پہلے خداوند عالم سے یہ دعا کرو۔

انسان فطرتاً دعا اُسی چیز کی کیا کرتا ہے جس کی طلب اور خواہش اس کے دل میں ہوتی ہے، اور اسی صورت میں کرتا ہے جبکہ اسے یہ احساس ہو کہ اس کی مطلوب چیز اُس ہستی کے اختیار میں ہے جس سے وہ دعا کر رہا ہے۔ پس قرآن کی ابتدا میں اس دعا کی تعلیم دے کر گویا انسان کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو راہ راست کی جستجو کے لیے پڑھے، طالب حق کی سی ذہنیت لے کر پڑھے، اور یہ جان لے کہ علم کا سرچشمہ خداوندِ عالم ہے' اس لیے اسی سے رہنمائی کی درخواست کر کے پڑھنے کا آغاز کرے۔

اس مضمون کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات خود واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن اور سورۂ فاتحہ کے درمیان حقیقی تعلق کتاب اور اس کے مقدمے کا سا نہیں بلکہ دعا اور جوابِ دعا کا سا ہے۔ سورۂ فاتحہ ایک دعا ہے بندے کی جانب سے، اور قرآن اُس کا جواب ہے خدا کی جانب سے۔ بندہ دعا کرتا ہے کہ اے پروردگار! میری رہنمائی کر۔ جواب میں پروردگار پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ ہدایت و رہنمائی جس کی درخواست تو نے مجھ سے کی ہے۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۴۲، الفاتحہ، مضمون)

سورۂ فاتحہ ایک دعا

............سورۃ فاتحہ اصل میں تو ایک دعا ہے (اور)............دعا کی ابتدا اس ہستی کی تعریف سے کی جانی چاہیے جس سے ہم دعا مانگنا چاہتے ہیں۔ یہ گویا اس امر کی تعلیم ہے کہ دعا جب مانگو تو مہذب طریقے سے مانگو۔ یہ کوئی تہذیب نہیں ہے کہ منہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کھولتے ہی جھٹ اپنا مطلب پیش کر دیا۔ تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے دعا کر رہے ہو، پہلے اس کی خوبی کا، اس کے احسانات اور اس کے مرتبے کا اعتراف کرو۔

تعریف ہم جس کی بھی کرتے ہیں، دو وجوہ سے کیا کرتے ہیں: ایک یہ کہ وہ بجائے خود حُسن و خوبی اور کمال رکھتا ہو، قطع نظر اس سے کہ ہم پر اس کے ان فضائل کا کیا اثر ہے۔ دوسرے یہ وہ ہمارا محسن ہو اور ہم اعترافِ نعمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی خوبیاں بیان کریں۔

اللہ تعالیٰ کی تعریف ان دونوں حیثیتوں سے ہے یہ ہماری قدر شناسی کا تقاضا بھی ہے اور احسان شناسی کا بھی، کہ ہم اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوں۔ دنیا میں جہاں، جس چیز اور جس شکل میں بھی کوئی حسن، کوئی خوبی (اور) کوئی کمال ہے اس کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔ کسی انسان، کسی فرشتے کسی دیوتا، کسی سیارے، غرض کسی مخلوق کا کمال بھی ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ کا عطیہ ہے، پس اگر کوئی اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کے گرویدہ اور پرستار، احسان مند اور شکر گزار، نیاز مند اور خدمت گار بنیں، تو وہ خالقِ کمال ہے نہ کہ صاحبِ کمال۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۴۳، الفاتحہ، حاشیہ ۲)

فاتحہ خلف الامام

فاتحہ خلف الامام کے بارے میں جو کچھ میں نے تحقیق کیا ہے، اس کی رو سے زیادہ صحیح مسلک یہ ہے کہ جب امام بآواز بلند پڑھ رہا ہو تو مقتدی خاموش رہیں اور جب امام آہستہ پڑھ رہا ہو تو مقتدی بھی فاتحہ پڑھیں۔ اس طرح کسی حکمِ قرآنی اور کسی حدیث کی خلاف ورزی کا اندیشہ نہیں رہتا۔ اور تمام مختلف دلائل دیکھ کر یہ ایک متوسط طریقہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ لیکن جو شخص امام کے پیچھے کسی صورت میں بھی فاتحہ نہیں پڑھتا یا ہر حال میں پڑھتا ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی نماز نہیں ہوتی۔ کیونکہ دونوں مسلکوں کی تائید میں دلائل موجود ہیں، اور وہ شخص جان بوجھ کر حکم کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے بلکہ جو حکم اس کے نزدیک دلیل سے ثابت ہے اسی پر عمل کر رہا ہے، لہٰذا اس پر وہ الزام نہیں رکھا جا سکتا جو حکمِ شرعی کی بالقصد مخالفت کرنے والے پر رکھا جاتا ہے۔

(رسائل و مسائل، اول، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۱۹۳-۱۹۴)

س: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فاتحہ خلف الامام کے ثبوت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ براہِ کرم تبصرہ فرمایئے!

ج: میں نے اس مسئلے پر جتنا غور کیا ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو شخص فاتحہ خلف الامام پڑھتا ہے، اس کی نماز بھی ہو جاتی ہے اور جو شخص امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز بھی ہو جاتی ہے۔ یہ زیادتی ہے اگر کوئی شخص کہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے والے کی نماز نہیں ہوتی یا نہ پڑھنے والوں کی نہیں ہوتی۔ یہ بالکل ایسا ہے کہ جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے عمر بھر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نماز نہیں پڑھی۔ اس لیے جو لوگ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے ہیں، ان کی نماز بھی ہو جاتی ہے اور جو نہیں پڑھتے، ان کی بھی ہو جاتی ہے۔ خواہ مخواہ اس میں لڑنے جھگڑنے کی کیا ضرورت ہے؟

اگر کسی کا ان دلائل پر اطمینان ہو جو فاتحہ خلف الامام کے حامی بیان کرتے ہیں تو وہ فاتحہ پڑھے۔ لیکن اگر کسی کا اطمینان اُن دلائل پر ہو جاتا ہے جو فاتحہ خلف الامام نہ پڑھنے والے پیش کرتے ہیں تو وہ نہ پڑھے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی شخص یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ امام ابو حنیفہؒ یا امام شافعیؒ نے تمام عمر نماز نہیں پڑھی۔

(استفسارات، اول، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۱)

آمین بالجہر

حدیث کی کتابوں میں آمین بالجہر کا ثبوت بھی ملتا ہے اور خاموشی سے آمین کہنے کا بھی۔ لیکن میں اس بات کا قائل ہوں کہ اگر ایک آدمی ایک ثابت شدہ سنت پر عمل کر رہا ہو اور اس کے مقابلے میں دوسری بھی ثابت شدہ سنتیں ہوں تو ایک مسلمان کو دوسری ثابت شدہ سنتوں پر بھی ضرور عمل کرنا چاہیے۔ اگرچہ وہ زندگی میں ایک بار ہی کیوں نہ ہو۔ ایک آدمی زور سے آمین کہنے کا قائل ہے، اسے بھی آہستہ بھی کہنی چاہیے، تاکہ دونوں سنتوں پر اس کا عمل ہو جائے۔ بس کوشش کرنی چاہیے کہ کوئی سنت ایسی نہ رہ جائے، جس پر آدمی عمل نہ کر سکا ہو۔

(استفسارات، اول، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۶۵)

قراءتِ قرآن کو خاموشی سے سننے کا حکم

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ (الاعراف ۷: ۲۰۴) جب قرآن تمھارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو، شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔

□ **آیت کا اصل مقصود:** یہ جو تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تم لوگ قرآن کی آواز سنتے ہی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہو اور شور و غل برپا کرتے ہو تاکہ نہ خود سنو اور نہ کوئی دوسرا سن سکے، اس روش کو چھوڑ دو اور غور سے سنو تو سہی کہ اس میں تعلیم کیا دی گئی ہے۔ کیا عجب کہ اس کی تعلیم سے واقف ہو جانے کے بعد تم خود بھی اُسی رحمت کے حصہ دار بن جاؤ جو ایمان لانے والوں کو نصیب ہو چکی ہے۔ مخالفین کی طعن آمیز بات کے جواب میں یہ ایسا لطیف و شیریں اور ایسا دلوں کو مسخر کرنے والا اندازِ تبلیغ ہے کہ اس کی خوبی کسی طرح بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ جو شخص حکمتِ تبلیغ سیکھنا چاہتا ہو وہ اگر غور کرے تو اس جواب میں بڑے سبق پا سکتا ہے۔

اس آیت کا اصل مقصود تو وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے لیکن ضمناً اس سے یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ جب خدا کا کلام پڑھا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جارہا ہو تو لوگوں کو ادب سے خاموش ہو جانا چاہیے اور توجہ کے ساتھ اسے سننا چاہیے۔ اسی سے یہ بات بھی مُستنبط ہوتی ہے کہ امام جب نماز میں قرآن کی تلاوت کر رہا ہو تو مقتدیوں کو خاموشی کے ساتھ اس کی سماعت کرنی چاہیے۔

□ **ائمہ کی اختلافی آرا:** لیکن اس مسئلے میں ائمہ کے درمیان اختلاف واقع ہوگیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ امام کی قراءت خواہ جہری ہو یا سرّی، مقتدیوں کو خاموش ہی رہنا چاہیے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ صرف جہری قراءت کی صورت میں مقتدیوں کو خاموش رہنا چاہیے۔ لیکن امام شافعیؒ اس طرف گئے ہیں کہ جہری اور سرّی دونوں صورتوں میں مقتدیوں کو قراءت کرنی چاہیے کیونکہ بعض احادیث کی بنا پر وہ سمجھے ہیں کہ جو شخص نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۱۱۴، الاعراف، حاشیہ ۱۵۳)

نماز میں قراءت فرض ہے

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ (المزمل ۷۳: ۲۰) اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔

چونکہ نماز میں زیادہ طول زیادہ تر قرآن کی طویل قراءت ہی سے ہوتا ہے، اس لیے فرمایا کہ تہجد کی نماز میں جتنا قرآن بسہولت پڑھ سکو پڑھ لیا کرو اس سے نماز کی طوالت میں آپ سے آپ تخفیف ہو جائے گی اس ارشاد کے الفاظ اگرچہ بظاہر حکم کے ہیں لیکن یہ امر متفق علیہ ہے کہ تہجد فرض نہیں بلکہ نفل ہے۔ حدیث میں بھی صراحت ہے کہ ایک شخص کے پوچھنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ اس نے پوچھا: کیا اس کے سوا بھی کوئی چیز مجھ پر لازم ہے؟ جواب میں ارشاد ہوا: نہیں، الّا یہ کہ تم اپنی خوشی سے کچھ پڑھو۔ (بخاری و مسلم)

اس آیت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ نماز میں جس طرح رکوع و سجود فرض ہے اسی طرح قرآن مجید کی قراءت بھی فرض ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح دوسرے مقامات پر رکوع یا سجود کے الفاظ استعمال کر کے نماز مراد لی ہے، اسی طرح یہاں قرآن کی قراءت کا ذکر کیا ہے اور مراد اس سے نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ اس استنباط پر اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب نماز تہجد خود نفل ہے تو اس میں قرآن پڑھنا کیسے فرض ہو سکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نفل نماز بھی جب آدمی پڑھے تو اس میں نماز کی تمام شرائط پوری کرنا اور اس کے تمام ارکان و فرائض ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ نفل نمازوں کے لیے کپڑوں کی طہارت، جسم کا پاک ہونا، وضو کرنا اور ستر چھپانا واجب نہیں ہے اور اس میں قیام و قعود اور رکوع و سجود بھی نفل ہی ہیں۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۱۳۳، المزمل، حاشیہ ۲۱)

قراءت میں آواز معتدل رکھنے کی ہدایت

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۔ (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۱۰) اور اپنی نماز نہ بہت زیادہ بلند آواز

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے، ان دونوں کے درمیان اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو۔

ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ مکے میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے صحابہؓ نماز پڑھتے وقت بلند آواز سے قرآن پڑھتے تھے تو کفار شور مچانے لگتے اور بسا اوقات گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتے تھے اس پر حکم ہوا کہ نہ تو اتنے زور سے پڑھو، کہ کفار سن کر ہجوم کریں، اور نہ اس قدر آہستہ پڑھو کہ تمھارے اپنے ساتھی بھی نہ سن سکیں۔ یہ حکم صرف انھی حالات کے لیے تھا۔ مدینے میں جب حالات بدل گئے تو یہ حکم باقی نہ رہا۔ البتہ جب کبھی مسلمانوں کو مکے کے سے حالات سے دوچار ہونا پڑے، انھیں اسی ہدایت کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۵۱، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۲۴)

اگر امام کوئی آیت پڑھنا بھول جائے

ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قراءت کے دوران میں ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد حضرت ابی بن کعبؓ نے پوچھا کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: نہیں، میں بھول گیا تھا۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۳۱۴، الاعلیٰ، حاشیہ ۸)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ تلاوت

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا۔ (المزمل ۷۳: ۴) اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔

یعنی تیز تیز رواں دواں نہ پڑھو بلکہ آہستہ ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرو اور ایک ایک آیت پر ٹھہرو (گویا کہ حضورؐ کی قراءت تیز تیز رواں دواں نہ ہوتی تھی، بلکہ آپ ایک ایک لفظ آہستہ آہستہ زبان سے ادا کرتے تھے اور ہر آیت پر ٹھہرتے) تاکہ ذہن پوری طرح کلامِ الٰہی کے مفہوم اور مدعا کو سمجھے اور اس کے مضامین سے متاثر ہو۔ کہیں اللہ کی ذات و صفات کا ذکر ہے تو اس کی عظمت و ہیبت دل پر طاری ہو۔ کہیں اس کے عذاب کا ذکر ہے تو دل پر اس کا خوف طاری ہو۔ کہیں کسی چیز کا حکم ہے کسی چیز سے منع کیا گیا ہے تو سمجھا جائے کہ کس چیز کا حکم دیا گیا ہے اور کس چیز سے منع کیا گیا ہے۔ غرض یہ قراءت محض قرآن کے الفاظ کو زبان سے ادا کر دینے کے لیے نہیں بلکہ غور و فکر اور تدبر کے ساتھ ہونی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کا طریقہ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ آپؐ الفاظ کو کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر بتایا کہ آپ اللہ، رحمٰن اور رحیم کو مد کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری)

حضرت ام سلمہؓ سے یہی سوال کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ حضورؐ ایک ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے اور ہر آیت پر ٹھہرتے جاتے تھے، مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ پڑھ کر رک جاتے پھر الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ پر ٹھہرتے اور اس کے بعد رک کر مٰلِكِ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یَوْمِ الدِّیْنِ۝ کہتے۔(مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی)

دوسری ایک روایت میں حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ حضورؐ ایک ایک لفظ واضح طور پر پڑھا کرتے تھے۔(ترمذی، نسائی)

حضرت حذیفہ بن یمانؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات کی نماز میں حضورؐ کے ساتھ کھڑا ہو گیا تو آپؐ کی قراءت کا یہ انداز دیکھا کہ جہاں تسبیح کا موقع آتا وہاں تسبیح فرماتے، جہاں دعا کا موقع آتا وہاں دعا مانگتے، جہاں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا موقع آتا وہاں پناہ مانگتے۔(مسلم، نسائی)

حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رات کی نماز میں جب حضورؐ اس مقام پر پہنچے: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝ اگر تو انھیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف فرما دے تو تو غالب اور دانا ہے۔ تو اسی کو دہراتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔(مسند احمد، بخاری)

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۱۲۶-۱۲۷، المزمل، حاشیہ ۴)

نماز فجر میں قراءت کی طوالت

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا۝ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۸)

نماز قائم کرو، زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک، اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو۔ کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے۔

فجر کے لغوی معنی ہیں 'پو پھٹنا' یعنی وہ وقت جب اول اول سپیدۂ صبح رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتا ہے۔

فجر کے قرآن سے مراد فجر کی نماز ہے۔ قرآن مجید میں نماز کے لیے کہیں تو صلوٰۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور کہیں اس کے مختلف اجزا میں سے کسی جز کا نام لے کر پوری نماز مراد لی گئی ہے، مثلاً تسبیح، حمد، ذکر، قیام، رکوع، سجود وغیرہ۔ اسی طرح یہاں فجر کے وقت قرآن پڑھنے کا مطلب محض قرآن پڑھنا نہیں، بلکہ نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ اس طریقے سے قرآن مجید نے ضمناً یہ اشارہ کر دیا ہے کہ نماز کن اجزا سے مرکب ہونی چاہیے۔ اور انھی اشارات کی رہنمائی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی وہ ہیئت مقرر فرمائی جو مسلمانوں میں رائج ہے۔

قرآن فجر کے مشہود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے فرشتے اس کے گواہ بنتے ہیں جیسا کہ احادیث میں بتصریح بیان ہوا ہے۔ اگرچہ فرشتے ہر نماز اور ہر نیکی کے گواہ ہیں، لیکن جب خاص طور پر فجر کی قراءت پر ان کی گواہی کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز میں طویل قراءت کرنے کا طریقہ اختیار فرمایا اور اسی کی پیروی صحابہ کرامؓ نے کی۔ اور بعد کے ائمہ نے اسے مستحب قرار دیا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس آیت میں مجملاً یہ بتایا گیا ہے کہ پنج وقتہ نماز، جو معراج کے موقع پر فرض کی گئی تھی، اس کے اوقات کی تنظیم کس طرح کی جائے۔ حکم ہوا کہ ایک نماز تو طلوع آفتاب سے پہلے پڑھ لی جائے اور باقی چار نمازیں زوال آفتاب کے بعد سے ظلمت شب تک پڑھی جائیں۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۳۴-۶۳۵، بنی اسرائیل، حاشیہ ۹۴-۹۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

رکوع وسجود

رکوع

(اس) کے بعد تم اللہ اکبر کہتے ہوئے رکوع کرتے ہو، گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے مالک کے آگے جھکتے ہو اور بار بار کہتے ہو: سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ پاک ہے میرا پروردگار جو بڑا بزرگ ہے۔

قومہ

پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہو اور کہتے ہو: سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ اللہ نے سن لی اس شخص کی بات جس نے اس کی تعریف بیان کی۔

سجدہ

پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے میں گر جاتے ہو اور بار بار کہتے ہو: سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی پاک ہے میرا رب جو سب سے بالا و برتر ہے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۴)

تسبیحاتِ رکوع وسجدہ

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ○ (الواقعہ ۵۶:۹۶) پس اے نبیؐ! اپنے رب کے نام کی تسبیح کرو۔

حضرت عقبہؓ بن عامر جہنی کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو تم لوگ اپنے رکوع میں رکھو، یعنی رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ کہا کرو۔ اور جب آیت سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی ○ نازل ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: اسے اپنے سجدے میں رکھو، یعنی سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہا کرو۔ (مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم، ابن المنذر)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا جو طریقہ مقرر فرمایا ہے اس کے چھوٹے سے چھوٹے اجزا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تک قرآن پاک کے اشاروں سے ماخوذ ہیں۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص۲۹۶، الواقعہ، حاشیہ ۴۲)

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى (الاعلیٰ ۸۷:۱) (اے نبیؐ!) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو۔

حضرت عقبہؓ بن عامر جہنی سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدے میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى پڑھنے کا حکم، سورۃ الاعلیٰ کی آیت سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى کی بنا پر دیا تھا، اور رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ پڑھنے کا جو طریقہ حضورؐ نے مقرر فرمایا تھا وہ سورۂ واقعہ کی آخری آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ○ پر مبنی تھا۔ (مسند احمد، ابو داؤد، ابن ماجه، ابن حبان، حاكم، ابن المنذر)

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۳۱۰، الاعلیٰ، حاشیہ ۱)

سجدہ باعثِ قربِ الٰہی

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔ (العلق ۹۶:۱۹) اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو۔

سجدہ کرنے سے مراد نماز ہے۔ یعنی اے نبیؐ! تم بے خوف اُسی طرح نماز پڑھتے رہو جس طرح پڑھتے رہے ہو اور اس کے ذریعے سے اپنے رب کا قرب حاصل کرو۔ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ بندہ سب سے زیادہ اپنے رب سے اس وقت قریب ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۳۹۹، سورۃ العلق، حاشیہ ۱۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

تشہد اور درود

پھر [تم] اللہ اکبر کہتے ہوئے سر اٹھاتے ہو اور نہایت ادب سے بیٹھ کر یہ پڑھتے ہو:

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ. ہماری سلامیاں، ہماری نمازیں اور ساری پاکیزہ باتیں اللہ کے لیے ہیں۔ سلام آپ پر اے نبیؐ! اور اللہ کی رحمت اور برکتیں، سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے سب نیک بندوں پر۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

تشہد میں انگلی اٹھانا

یہ شہادت دیتے وقت تم شہادت کی انگلی اٹھاتے ہو، کیونکہ یہ نماز میں تمھارے عقیدے کا اعلان ہے اور اس کو زبان سے ادا کرتے ہوئے وقت خاص طور پر توجہ اور زور دینے کی ضرورت ہے۔

درود

اس کے بعد تم درود پڑھتے ہو:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ. خدایا رحمت فرما ہمارے سردار اور مولیٰ محمدؐ اور ان کی آل پر جس طرح تو نے رحمت فرمائی ابراہیمؑ اور آل ابراہیمؑ پر۔ یقیناً تو بہترین صفات والا اور بزرگ ہے۔ اور خدایا برکت نازل فرما ہمارے سردار اور مولیٰ محمدؐ اور ان کی آل پر جس طرح تو نے برکت نازل فرمائی ابراہیمؑ اور آل ابراہیمؑ پر یقیناً تو بہترین صفات والا اور بزرگ ہے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۴-۱۵۵)

تشہد اور درود کے مسنون الفاظ

س: آپ نے خطبات میں نماز کی تشریح کرتے ہوئے جو درود درج کیا ہے اس میں سیدنا و مولانا کے الفاظ مسنون و ماثور درود

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے زائد ہیں۔ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو درود منقول ہوا ہے اس میں یہ الفاظ نہیں پائے جاتے۔ ایک عالم دین نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ مسنون درود سے زائد اِن الفاظ کو نماز میں پڑھنا مکروہ ہے۔ آپ کے پاس اس کے لیے کیا سند جواز ہے؟

ج: اس اضافے کو جو بزرگ مکروہ قرار دیتے ہیں وہ غالباً اس مسئلے کی نوعیت سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تشہد کے پورے مسئلے کی تحقیق کی جائے۔

تشہد کے متعلق صحیح ترین روایت وہ ہے جو حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے منقول ہوئی ہے۔ اس کو بیس سے زیادہ سندوں کے ساتھ محدثین نے نقل کیا ہے اور تمام راویوں نے اَلتَّحِیَّاتُ سے لے کر عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ تک پوری عبارت یکساں نقل کی ہے، کسی روایت کے الفاظ دوسری روایت کے الفاظ سے مختلف نہیں ہیں۔ اس کے باوجود یہ فیصلہ نہیں کر دیا گیا کہ نماز میں صرف یہی تشہد پڑھا جائے۔ امام شافعیؒ، ابن عباسؓ کے تشہد کو، اور امام مالکؒ، حضرت عمرؓ کے تشہد کو افضل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کے الفاظ باہم بھی مختلف ہیں اور ابن مسعودؓ کی روایت سے بھی مختلف ہیں۔ ان کے علاوہ تشہد کی بہت سی مختلف عبارتیں حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوموسیٰؓ اشعری، حضرت عائشہؓ، حضرت سمرہؓ بن جندب، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت ابوحمیدؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت حسینؓ بن علی، حضرت طلحہؓ بن عبداللہ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، اور دوسرے صحابہ کرام سے احادیث میں روایت ہوئی ہیں ان میں سے جس تشہد کو بھی آدمی پڑھے اس کی نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ ابن عبدالبر اور ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ یہ مباح میں اختلاف ہے، یعنی ان مختلف تشہدات میں سے کوئی بھی غیر مباح نہیں ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ علما کی ایک بڑی جماعت ہر اُس تشہد کے پڑھنے کو جائز قرار دیتی ہے جو احادیث سے ثابت ہو۔ لیکن بات صرف یہیں تک نہیں رہتی کہ جو تشہدات حدیث سے ثابت ہیں ان میں سے کسی ایک کو پڑھ لینا جائز ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک جلیل القدر صحابی حضورؐ سے تشہد کی ایک عبارت خود نقل کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ میں نے اس میں دو جگہ اضافہ کیا ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ ابوداؤد اور دار قطنی میں ان کا یہ ارشاد موجود ہے کہ السلام علیك ایھا النبی ورحمة اللّٰه کے بعد میں نے وَبَرَکَاتُہٗ کا، اور اشھد ان لا الٰه الا اللّٰه کے بعد وحدہ لا شریك له کا اضافہ کر دیا۔ مگر یہ بات میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی نے حضرت عبداللہؓ بن عمر کے اس فعل کو قابل اعتراض ٹھہرایا۔

اب رہا تشہد کے بعد کا مضمون، تو اس کے متعلق سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ اس کا پڑھنا سرے سے لازم نہیں ہے۔ ابو داؤد، مسند احمد، ترمذی اور دار قطنی میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضورؐ نے عبده ورسوله تک تشہد کی تعلیم دینے کے بعد فرمایا:

اِذَا قُلْتَ هٰذَا (اَوْقَضَيْتَ هٰذَا) فَقَدْ قَضَيْتَ صَلٰوتَكَ اِنْ شِئْتَ اَنْ تَقُوْمَ فَقُمْ وَاِنْ شِئْتَ اَنْ تَقْعُدَ فَاقْعُدْ. جب تم نے یہ پڑھ لیا (یا اس کو پورا کر لیا) تو تم اپنی نماز سے فارغ ہو گئے۔ اس کے بعد اُٹھ جانا چاہو تو اُٹھ جاؤ اور بیٹھنا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چاہوتو بیٹھے رہو۔

یہ ارشاد اس باب میں بالکل صریح ہے کہ عبدہ ورسولہ پر نماز مکمل ہوجاتی ہے، اس کے بعد آدمی کچھ نہ پڑھے تب بھی اس کی نماز میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا، اور درود و دعا تشہد میں داخل نہیں ہے بلکہ اس سے زائد ایک چیز ہے۔

اس زائد چیز کا پڑھنا یقیناً مستحب ہے لیکن اس کے لیے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوئی عبارت مخصوص نہیں کی ہے جس کے الفاظ مقرر ہوں اور ان میں کوئی کمی بیشی جائز نہ ہو۔ بخاری ومسلم اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جو روایت منقول ہوئی ہے اس میں تشہد کی عبارت بیان کرنے کے بعد وہ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ثُمَّ یَتَخَیَّرُ مِنَ الْمَسْئَلَةِ مَاشَآءَ۔ پھر آدمی جو دعا چاہے مانگے۔

مسند احمد اور نسائی کی ایک روایت میں حضورؐ کے الفاظ ہیں کہ ثُمَّ لِیَتَخَیَّرْ اَحَدُ کُمْ مِنَ الدُّعَآءِ اَعْجَبَهٗ اِلَیْهِ فَلْیَدْعُ بِهٖ رَبَّهٗ عَزَّوَجَلَّ۔ پھر تم میں سے ایک شخص کوئی دعا انتخاب کرلے جو اسے سب سے زیادہ پسند ہو اور وہی اپنے رب عزیز وجلیل سے مانگ لے۔

اسی سے ملتے جلتے الفاظ بخاری اور ابوداؤد کی روایات میں آئے ہیں۔ ان ارشادات سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی ہے کہ حضورؐ یہ تو پسند فرماتے ہیں کہ تشہد کے بعد آدمی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے (جس میں درود شامل ہے کیونکہ وہ بھی ایک دعا ہی ہے) لیکن اس کے الفاظ کا انتخاب خود دعا مانگنے والے پر چھوڑ دیتے ہیں۔

اب درود شریف کے مسئلے کو لیجیے۔ معترض کا کہنا یہ ہے کہ حضورؐ سے اس کے جو الفاظ ماثور ہیں ان میں کوئی کمی بیشی کرنا مکروہ ہے۔ لیکن کیا واقعی فقہا کے درمیان یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔

امام ابوبکر بن مسعود کاسانی، جن کی کتاب بدائع الصنائع فقہ حنفی کی معتبر ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے، اس مسئلے پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وَلَا یُکْرَهُ اَنْ یَّقُوْلَ فِیْهَا وَارْحَمْ مُحَمَّدًا عِنْدَ عَامَّةِ الْمَشَائِخِ، وَ بَعْضُهُمْ کَرِهُوْا ذٰلِکَ.......... وَالصَّحِیْحُ اَنَّهٗ لَا یُکْرَهُ۔ اور درود میں وارحم محمدًا کہنا اکثر اکابر علما کے نزدیک مکروہ نہیں ہے اور بعض اسے مکروہ کہتے ہیں.......... مگر صحیح یہ ہے کہ وہ مکروہ نہیں۔

درود میں سیدنا کا لفظ بڑھانے کے متعلق مشہور شافعی فقیہ شمس الدین الرملی، جو چھوٹے شافعی کہلاتے ہیں اپنی کتاب نہایة المحتاج الی شرح المنہاج میں لکھتے ہیں:

وَالْاَفْضَلُ الْاِتْیَانُ بِلَفْظِ السِّیَادَةِ.......... لِاَنَّ فِیْهِ الْاِتْیَانَ بِمَا اُمِرْنَا بِهٖ وَ زِیَادَةُ الْاِخْبَارِ بِالْوَاقِعِ الَّذِیْ هُوَ اَدَبٌ، فَهُوَ اَفْضَلُ مِنْ تَرْکِهٖ۔ اور افضل یہ ہے کہ درود میں لفظ سیادت لایا جائے.......... کیونکہ یہ ایسی چیز کا لانا ہے جس کے لیے ہم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مامور ہیں اور اس میں اُس امر واقعی کا مزید بیان ہے جو ادب ہے، لہٰذا اس کو چھوڑنے سے اس کا ادا کرنا افضل ہے۔

صرف درود ہی نہیں، تشہد تک میں شوافع نے لفظ سیدنا کے اضافے کو نہ صرف جائز رکھا ہے بلکہ اس پر ان کا عمل بھی ہے۔ چنانچہ الفقه علی المذاهب الاربعة میں شافعی مذہب کا جو تشہد درج کیا گیا ہے وہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے: وَاَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ حالانکہ ابن عباسؓ کے جس تشہد کو امام شافعی نے اختیار کیا ہے اس میں لفظ سیدنا نہیں پایا جاتا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی کی کتاب ردالمحتار فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں سے ہے۔ اس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رحمت کی دعا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بعض علمانے اللّٰهم ارحم محمدًا کہنے کو ناجائز کہا ہے اور بعض نے اسے جائز قرار دیا ہے، اور اسی دوسرے قول کو امام سرخسی نے ترجیح دی ہے۔ پھر درود میں لفظ سیدنا کے استعمال پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ہمارے (یعنی حنفیہ کے) مسلک کے خلاف ہے اور اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تشہد میں کمی وبیشی کو مکروہ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ اعتراض کمزور ہے، کیونکہ درود تشہد پر زائد ایک چیز ہے، اس میں شامل نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص تشہد میں اَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ کہے تو ضرور مکروہ ہے، لیکن تشہد کے بعد جو درود پڑھا جاتا ہے اس میں یہ لفظ بڑھایا جاسکتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نماز میں جو درود پڑھا جاتا ہے اس کا درود کے ماثور الفاظ ہی میں پڑھا جانا لازم نہیں ہے، اور ان ماثور الفاظ میں کمی وبیشی کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر درود میں اَللّٰهُمَّ اَرْحَمْ مُحَمَّدًا اور اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ کہنا مکروہ نہیں ہے تو سیدنا کے ساتھ مولانا کہہ دینے میں کراہت کی کیا معقول وجہ ہوسکتی ہے؟[1]

(رسائل و مسائل، پنجم، اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۲۰۲-۲۰۷)

درود وسلام کی اہمیت

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ○ (الاحزاب ۵۶:۳۳) اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں، اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم بھی ان پر درود وسلام بھیجو۔

اللہ کی طرف سے اپنے نبی پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ پر بے حد مہربان ہے، آپ کی تعریف فرماتا ہے، آپؐ کے کام میں برکت دیتا ہے، آپؐ کا نام بلند کرتا ہے اور آپ پر اپنی رحمتوں کی بارش فرماتا ہے۔

ملائکہ کی طرف سے آپؐ پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپؐ سے غایت درجے کی محبت رکھتے ہیں اور آپ کے حق میں اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپؐ کو زیادہ سے زیادہ بلند مرتبے عطا فرمائے، آپؐ کے دین کو سربلند کرے، آپؐ کی شریعت کو فروغ بخشے اور آپؐ کو مقام محمود پر پہنچائے۔

۱- مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: رسائل و مسائل، پنجم، جولائی ۲۰۰۳ء، ص ۲۰۷-۲۳۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آیت کا منشا

سیاق سباق پر نگاہ ڈالنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ بات کس لیے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ وقت وہ تھا جب دشمنانِ اسلام سے دینِ مبین کے فروغ پر اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے حضورؐ کے خلاف الزامات کی بوچھاڑ کر رہے تھے اور اپنے نزدیک یہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح کیچڑ اچھال کر وہ آپؐ کے اس اخلاقی اثر کو ختم کر دیں گے جس کی بدولت اسلام اور مسلمانوں کے قدم روز بروز بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ان حالات میں یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو یہ بتایا کہ کفار و مشرکین اور منافقین میرے نبی کو بدنام کرنے اور نیچا دکھانے کی جتنی چاہیں کوشش کر دیکھیں، آخر کار وہ منہ کی کھائیں گے، اس لیے کہ میں اس پر مہربان ہوں اور ساری کائنات کا نظم و نسق جن فرشتوں کے ذریعے سے چل رہا ہے وہ سب اس کے حامی اور ثنا خواں ہیں۔ وہ اس کی مذمت کر کے کیا پا سکتے ہیں جبکہ میں اس کا نام بلند کر رہا ہوں اور میرے فرشتے اس کی تعریفوں کے چرچے کر رہے ہیں۔ وہ اپنے اوچھے ہتھیاروں سے اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں جبکہ میری رحمتیں، برکتیں اس کے ساتھ ہیں اور میرے فرشتے شب و روز دعا کر رہے ہیں کہ رب العالمین محمدؐ کا مرتبہ اور زیادہ اونچا کر اور اس کے دین کو زیادہ فروغ دے۔

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اے لوگو جن کو محمدؐ رسول اللہ کی بدولت راہ راست نصیب ہوئی ہے، تم ان کی قدر پہچانو اور ان کے احسان عظیم کا حق ادا کرو۔ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، اس شخص نے تمھیں علم کی روشنی دی۔ تم اخلاق کی پستیوں میں گرے ہوئے تھے، اس شخص نے تمھیں اٹھایا اور اس قابل بنایا کہ آج محسود خلائق بنے ہوئے ہو۔ تم وحشت اور حیوانیت میں مبتلا تھے، اس شخص نے تم کو بہترین انسانی تہذیب سے آراستہ کیا۔ کفر کی دنیا اسی لیے اس شخص پر خار کھا رہی ہے کہ اس نے یہ احسانات تم پر کیے، ورنہ اس نے کسی کے ساتھ ذاتی طور پر کوئی برائی نہ کی تھی۔ اس لیے اب تمھاری احسان شناسی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جتنا بغض وہ اس خیر مجسم کے خلاف رکھتے ہیں اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ محبت تم اس سے رکھو، جتنی وہ اس سے نفرت کرتے ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کے گرویدہ ہو جاؤ، جتنی وہ اس کی مذمت کرتے ہیں اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کی تعریف کرو، جتنے وہ اس کے بدخواہ ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کے خیر خواہ بنو اور اس کے حق میں وہی دعا کرو جو اللہ کے فرشتے شب و روز اس کے لیے کر رہے ہیں کہ اے ربِ دو جہاں! جس طرح تیرے نبیؐ نے ہم پر بے پایاں احسانات فرمائے ہیں، تو بھی ان پر بے حد و بے حساب رحمت فرما، ان کا مرتبہ دنیا میں بھی سب سے زیادہ بلند کر اور آخرت میں بھی انھیں تمام مقربین سے بڑھ کر تقرب عطا فرما۔

مسلمانوں کے لیے حکم

اس آیت میں مسلمانوں کو دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک صَلُّوْا عَلَيْهِ، دوسرے وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا .... صلوٰۃ کا لفظ جب عَلٰی کے صِلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے تین معنی ہوتے ہیں۔ ایک، کسی پر مائل ہونا، اس کی طرف محبت کے ساتھ متوجہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہونا اور اس پر جھکنا۔ دوسرے، کسی کی تعریف کرنا۔ تیسرے، کسی کے حق میں دعا کرنا۔ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لیے بولا جائے گا تو ظاہر ہے کہ تیسرے معنی میں نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ کا کسی اور سے دعا کرنا قطعاً ناقابل تصور ہے۔ اس لیے لامحالہ وہ صرف پہلے دو معنوں میں ہوگا۔ لیکن جب یہ لفظ بندوں کے لیے بولا جائے گا، خواہ وہ فرشتے ہوں یا انسان، تو وہ تینوں معنوں میں ہوگا۔ اس میں محبت کا مفہوم بھی ہوگا، مدح و ثنا کا مفہوم بھی اور دعاے رحمت کا مفہوم بھی۔ لہٰذا اہل ایمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں صَلُّوْا عَلَيْهِ کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے گرویدہ بن جاؤ، ان کی مدح و ثنا کرو، اور ان کے لیے دعا کرو۔

سلام کا لفظ بھی دو معنی رکھتا ہے۔ ایک ہر طرح کی آفات اور نقائص سے محفوظ رہنا، جس کے لیے ہم اردو میں سلامتی کا لفظ بولتے ہیں، دوسرے صلح اور عدم مخالفت۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے حق میں کامل سلامتی کی دعا کرو، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم پوری طرح دل و جان سے ان کا ساتھ دو اور ان کی مخالفت سے پرہیز کرو، اور ان کے سچے فرماں بردار بن کر رہو۔

درود کے مختلف الفاظ

یہ حکم جب نازل ہوا تو متعدد صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! سلام کا طریقہ تو آپ ہمیں بتا چکے ہیں، یعنی نماز میں اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ و برکاتهاور ملاقات کے وقت اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کہنا، مگر آپ پر صلوٰۃ بھیجنے کا طریقہ کیا ہے؟

اس کے جواب میں حضورؐ نے بہت سے لوگوں کو مختلف مواقع پر جو درود سکھائے ہیں وہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

☐ **کعب بن عجرہؓ:** اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰٓى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰٓى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰٓى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰٓى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔ [اے اللہ! درود بھیج محمد اور آل محمد پر جس طرح تو نے درود بھیجا تھا، ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر، اے اللہ! برکت عطا فرما محمد اور آل محمد کو جس طرح تو نے برکت عطا فرمائی تھی ابراہیمؑ اور آل ابراہیم کو، بے شک تو تعریف کیا ہوا اور بڑی شان والا ہے۔] یہ درود تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ حضرت کعب بن عجرہؓ سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، امام احمد، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق، ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے روایت کیا ہے۔

☐ **ابن عباسؓ:** ان سے بھی بہت خفیف فرق کے ساتھ وہی درود مروی ہے جو اوپر نقل ہوا ہے۔ (ابن جریر)

☐ **ابوحمید ساعدیؓ:** اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ اَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ اَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰٓى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔ (مالك، احمد، بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجه) [اے اللہ! درود بھیج محمد پر، آپ کی ازواج مطہرات پر اور آپ کی اولاد پر، جیسا کہ تو نے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابراہیمؑ پر بھیجا تھا۔ اے اللہ! برکت عطا فرما محمد کو، آپ کی ازواج مطہرات کو اور آپ کی اولاد کو جیسا کہ تو نے برکت عطا کی تھی ابراہیمؑ کو، بے شک تو تعریف کیا ہوا اور بڑی شان والا ہے۔]

□ **ابو مسعود بدریؓ:** اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ فِی الْعَالَمِیْنَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ۔ (مالک، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، احمد، ابن جریر، ابن حبان، حاکم) [اے اللہ! محمد اور اس کے آل پر درود بھیج، جس طرح کہ تو نے ابراہیم اور آل ابراہیم پر درود بھیجا۔ اور برکت نازل فرما محمد اور آلِ محمد پر، جیسا کہ تو نے ابراہیم اور آلِ ابراہیم پر دونوں جہانوں میں درود نازل فرمایا۔]

□ **ابو سعید خدریؓ:** اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ عَبْدِکَ وَرَسُوْلِکَ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ۔ (احمد، بخاری، نسائی، ابن ماجہ) اے اللہ! درود بھیج اپنے بندے اور رسول، محمدؐ پر جیسا کہ تو نے درود بھیجا تھا ابراہیمؑ پر اور برکت عطا فرما محمدؐ اور آل محمدؐ کو جس طرح کہ تو نے برکت عطا فرمائی تھی ابراہیمؑ پر۔

□ **بریدہ الخزاعیؓ:** اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ صَلٰوتَکَ وَرَحْمَتَکَ وَبَرَکَاتِکَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا جَعَلْتَھَا عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ۔ (احمد، عبد بن حمید، ابن مردویہ) [اے اللہ! محمدؐ اور آل محمدؐ پر اپنا درود، اپنی رحمت اور برکت نازل فرما، جس طرح کہ تو نے نازل فرمائی تھی ابراہیمؑ پر، بے شک تو تعریف کیا ہوا اور بڑی شان والا ہے۔]

□ **ابو ہریرہؓ:** اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ وَ بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ فِی الْعٰلَمِیْنَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ۔ (نسائی) [اے اللہ! درود بھیج محمدؐ اور آل محمدؐ اور برکت عطا فرما محمدؐ اور آل محمدؐ کو جس طرح کہ تو نے تمام مخلوقات میں درود اور برکت کی تھی ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیم پر، بے شک تو تعریف کیا ہوا اور بڑی شان والا ہے۔]

□ **طلحہؓ:** اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ وَ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ۔ (ابن جریر) [اے اللہ! درود بھیج محمدؐ اور آل محمدؐ پر جیسا کہ تو نے درود بھیجا تھا ابراہیمؑ پر، بے شک تو تعریف کیا ہوا اور بڑی شان والا ہے اور برکت عطا فرما محمدؐ اور آل محمدؐ کو جیسا کہ تو نے برکت فرمائی تھی ابراہیمؑ پر، بے شک تو تعریف کیا ہوا اور بڑی شان والا ہے۔]

یہ تمام درود الفاظ کے اختلاف کے باوجود معنی میں متفق ہیں۔ ان کے اندر چند اہم نکات ہیں جنھیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

اوّلاً: ان سب میں حضورؐ نے مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ مجھ پر درود بھیجنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہ اے خدا! تو محمدؐ پر درود بھیج۔[1]

ثانیاً: حضورؐ کی شانِ کرم نے یہ گوارا نہ فرمایا کہ تنہا اپنی ہی ذات کو اس دعا کے لیے مخصوص فرمالیں، بلکہ اپنے ساتھ اپنی آل اور ازواج اور ذرّیت کو بھی شامل کرلیا۔ ازواج اور ذریت کے معنی تو ظاہر ہیں۔ رہا آل کا لفظ، تو وہ محض حضورؐ کے خاندان والوں کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں وہ سب لوگ آ جاتے ہیں جو آپؐ کے پیرو ہوں اور آپ کے طریقے پر چلیں۔ عربی لغت کی رو سے آل اور اہل میں فرق یہ ہے کہ کسی شخص کی آل وہ سب لوگ سمجھے جاتے ہیں جو اس کے ساتھی، مددگار اور متبع ہوں، خواہ وہ اس کے رشتہ دار ہوں یا نہ ہوں۔ اور کسی شخص کے اہل وہ سب لوگ کہے جاتے ہیں جو اس کے رشتہ دار ہوں، خواہ وہ اس کے ساتھی اور متبع ہوں یا نہ ہوں۔ قرآن مجید میں ۱۴ مقامات پر آلِ فرعون کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ان میں سے کسی جگہ بھی آل سے مراد محض فرعون کے خاندان والے نہیں ہیں بلکہ وہ سب لوگ ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں اس کے ساتھی تھے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ آیات ۴۹-۵۰، آل عمران ۳: ۱۱، الاعراف: ۱۳۰، المومن: ۴۶)۔ پس آلِ محمد سے ہر وہ شخص خارج ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر نہ ہو، خواہ وہ خاندانِ رسالت ہی کا ایک فرد ہو، اور اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلتا ہو، خواہ وہ حضورؐ سے کوئی دور کا بھی نسبی تعلق نہ رکھتا ہو۔ البتہ خاندانِ رسالت کے وہ افراد بدرجۂ اولیٰ آلِ محمد ہیں جو آپؐ سے نسبی تعلق بھی رکھتے ہیں اور آپؐ کے پیروکار بھی ہیں۔

ثالثاً: ہر درود جو حضورؐ نے سکھایا ہے اس میں یہ بات ضرور شامل ہے کہ آپ پر ویسی ہی مہربانی فرمائی جائے جیسی ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر فرمائی گئی ہے۔ اس مضمون کو سمجھنے میں لوگوں کو بڑی مشکل پیش آئی ہے۔ اس کی مختلف تاویلیں علما نے کی ہیں۔ مگر کوئی تاویل دل کو نہیں لگتی۔ میرے نزدیک صحیح تاویل یہ ہے (والعلم عند اللہ) کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ پر ایک خاص کرم فرمایا ہے جو آج تک کسی پر نہیں فرمایا، اور وہ یہ ہے کہ تمام وہ انسان جو نبوت اور وحی اور کتاب کو ماخذِ ہدایت مانتے ہیں وہ حضرت ابراہیمؑ کی پیشوائی پر متفق ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی یا یہودی۔ لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا کے پیروؤں کا مرجع بنایا ہے اسی طرح مجھے بھی بنا دے۔ اور کوئی ایسا شخص جو نبوت کا

۱- نادان لوگ جنھیں معنی کا شعور نہیں ہے اس پر فوراً یہ اعتراض جڑ دیتے ہیں کہ یہ تو عجیب بات ہوئی، اللہ تعالیٰ تو ہم سے فرما رہا ہے کہ تم میرے نبی پر درود بھیجو، مگر ہم الٹا اللہ سے کہتے ہیں کہ تو درود بھیج۔ حالانکہ دراصل اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ بتایا ہے کہ تم مجھ پر 'صلوٰۃ' کا حق ادا کرنا چاہو بھی تو نہیں کر سکتے، اس لیے اللہ ہی سے دعا کرو کہ وہ مجھ پر صلوٰۃ فرمائے۔ ظاہر بات کہ ہم حضورؐ کے مراتب بلند نہیں کر سکتے۔ اللہ ہی بلند کر سکتا ہے ہم حضورؐ کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکتے۔ اللہ ہی ان کا اجر دے سکتا ہے۔ ہم حضورؐ کے رفعِ ذکر کے لیے اور آپؐ کے دین کو فروغ دینے کے لیے خواہ کتنی ہی کوشش کریں، اللہ کے فضل اور اس کی توفیق و تائید کے بغیر اس میں کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ حضورؐ کی محبت و عقیدت بھی ہمارے دل میں اللہ ہی کی مدد سے جاگزیں ہو سکتی ہے ورنہ شیطان نہ معلوم کتنے وساوس دل میں ڈال کر ہمیں آپؐ سے منحرف کر سکتا ہے۔ (اعاذنا اللہ من ذالک) لہٰذا حضورؐ پر صلوٰۃ کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ اللہ سے آپؐ پر صلوٰۃ کی دعا کی جائے۔ جو شخص اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحمّدٍ کہتا ہے وہ گویا اللہ کے حضور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ خدایا، تیرے نبیؐ پر صلوٰۃ کا جو حق ہے اسے ادا کرنا میرے بس میں نہیں ہے، تو ہی میری طرف سے اس کو ادا کر اور مجھ سے اس کے ادا کرنے میں جو خدمت چاہے لے لے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ماننے والا ہو، میری نبوت پر ایمان لانے سے محروم نہ رہ جائے۔

درود کی فرضیت ووجوب

یہ امر کہ حضورؐ پر درود بھیجنا سنت اسلام ہے، جب آپ کا نام آئے اس کا پڑھنا مستحب ہے، اور خصوصاً نماز میں اس کا پڑھنا مسنون ہے، اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ اس امر پر بھی اجماع ہے کہ عمر میں ایک مرتبہ حضورؐ پر درود بھیجنا فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اس کا حکم دیا ہے۔ لیکن اس کے بعد درود کے مسئلے میں علما کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ نماز میں آخری مرتبہ جب آدمی تشہد پڑھتا ہے اس میں صلوٰۃ علی النبی پڑھنا فرض ہے، اگر کوئی شخص نہ پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی۔ صحابہؓ میں سے ابنِ مسعودؓ، ابومسعود انصاریؓ، ابن عمرؓ اور جابرؓ بن عبداللہ، تابعین میں سے شعبیؒ، امام باقرؒ، محمد بن کعبؒ قرظی اور مقاتلؒ بن حیان، اور فقہا میں سے اسحاق بن راہویہؒ کا بھی یہی مسلک تھا، اور آخر میں امام بن حنبلؒ نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور جمہور علما کا مسلک یہ ہے کہ درود، عمر میں صرف ایک مرتبہ پڑھنا فرض ہے۔ یہ کلمہ شہادت کی طرح ہے کہ جس نے ایک مرتبہ اللہ کی الٰہیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کر لیا اس نے فرض ادا کر دیا۔ اسی طرح جس نے ایک دفعہ درود پڑھ لیا وہ فریضہ صلوٰۃ علی النبی سے سبک دوش ہوگیا۔ اس کے بعد نہ کلمہ پڑھنا فرض ہے نہ درود۔

ایک اور گروہ نماز میں اس کا پڑھنا مطلقاً واجب قرار دیتا ہے۔ مگر تشہد کے ساتھ اس کو مقید نہیں کرتا۔

ایک دوسرے گروہ کے نزدیک ہر دعا میں اس کا پڑھنا واجب ہے۔ کچھ اور لوگ اس کے قائل ہیں کہ جب بھی حضورؐ کا نام آئے، درود پڑھنا واجب ہے۔ اور ایک گروہ کے نزدیک ایک مجلس میں حضورؐ کا ذکر خواہ کتنی ہی مرتبہ آئے، درود پڑھنا بس ایک دفعہ واجب ہے۔

درود کی فضیلت

یہ اختلافات صرف وجوب کے معاملہ میں ہیں۔ باقی رہی درود کی فضیلت، اور اس کا موجبِ اجر وثواب ہونا، اور اس کا ایک بہت بڑی نیکی ہونا، تو اس پر ساری امت متفق ہے۔ اس میں کسی ایسے شخص کو کلام نہیں ہو سکتا جو ایمان سے کچھ بھی بہرہ رکھتا ہو۔ درود تو فطری طور پر ہر اس مسلمان کے دل سے نکلے گا جسے یہ احساس ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑے محسن ہیں۔ اسلام اور ایمان کی جتنی قدر انسان کے دل میں ہوگی اتنی ہی زیادہ قدر اس کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کی بھی ہوگی، اور جتنا زیادہ آدمی ان احسانات کا قدر شناس ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ حضورؐ پر درود بھیجے گا۔ پس درحقیقت کثرتِ درود ایک پیمانہ ہے جو ناپ کر بتا دیتا ہے کہ دینِ محمدؐ سے ایک آدمی کتنا گہرا تعلق رکھتا ہے اور نعمت ایمان کی کتنی قدر اس کے دل میں ہے۔ اسی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ صَلٰوۃً لَمْ تَزَلِ الْمَلَائِکَۃُ تُصَلِّیْ عَلَیْہِ مَا صَلّٰی عَلَیَّ۔(احمد و ابن ماجہ) جو شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے ملائکہ اس پر درود بھیجتے رہتے ہیں جب تک وہ مجھ پر درود بھیجتا رہے۔

مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدَۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْراً (مسلم) جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس بار درود بھیجتا ہے۔

اَوْلَی النَّاسِ بِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَکْثَرُ ھُمْ عَلَیَّ صَلٰوۃً۔ (ترمذی) قیامت کے روز میرے ساتھ رہنے کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجے گا۔

اَلْبَخِیْلُ الَّذِیْ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ۔ (ترمذی) بخیل ہے وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔

کسی اور پر درود بھیجنا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسروں کے لیے اَللّٰھُمَّ صَلِّ علی فلانٍ یا صلی اللہ علیہ وسلم یا اسی طرح کے دوسرے الفاظ کے ساتھ صلٰوۃ جائز ہے یا نہیں، اس میں علما کے درمیان اختلاف ہے۔ایک گروہ جس میں قاضی عیاض سب سے زیادہ نمایاں ہیں، اسے مطلقاً جائز رکھتا ہے۔ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خود غیر انبیا پر صلٰوۃ کی متعدد مقامات پر تصریح کی ہے۔مثلاً اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ (البقرہ ۲:۱۵۷)[اُن پر اُن کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی۔]

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (التوبہ ۹:۱۰۳)[اے نبیؐ! تم ان کے مال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انھیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو۔]

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ۔ (الاحزاب ۳۳:۴۳)[وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمھارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں۔]

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد مواقع پر لفظ صلٰوۃ کے ساتھ غیر انبیا کو دعا دی ہے۔مثلاً ایک صحابی کے لیے آپؐ نے دعا فرمائی کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی اٰلِ اَبِیْ اَوْفٰی۔[اے اللہ! آلِ ابو اوفٰی پر درود نازل فرما۔]

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی بیوی کی درخواست پر فرمایا: صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْكِ وَعَلٰی زَوْجِكِ۔ [اللہ تجھ پر اور تیرے شوہر پر درود نازل فرمائے۔]

جو لوگ زکوٰۃ لے کر حاضر ہوتے ان کے حق میں آپؐ فرماتے ہیں: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْھِمْ۔ [اے اللہ! ان پر درود نازل فرما۔]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حضرت سعدؓ بن عبادہ کے حق میں آپؐ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ صَلٰوتَکَ وَ رَحْمَتَکَ عَلٰی اٰلِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَۃَ۔ [اے اللہ! اپنا درود اور رحمت نازل فرما، آلِ سعدؓ پر]

اور مومن کی روح کے متعلق حضورؐ نے خبر دی کہ ملائکہ اس کے حق میں دعا کرتے ہیں: صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ وَعَلٰی جَسَدِکَ۔ [اللہ تعالیٰ تجھ پر اور تیرے جسم پر درود نازل فرمائے۔]

لیکن جمہور اُمت کے نزدیک ایسا کرنا اللہ اور اس کے رسول کے لیے تو درست تھا مگر ہمارے لیے درست نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب یہ اہل اسلام کا شعار بن چکا ہے کہ وہ صلوٰۃ وسلام کو انبیا علیہم السلام کے لیے خاص کرتے ہیں اس لیے غیر انبیا کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اسی بنا پر حضرت عمر بن عبد العزیز نے ایک مرتبہ اپنے ایک عامل کو لکھا تھا کہ میں نے سنا ہے، کچھ واعظین نے یہ نیا طریقہ شروع کیا ہے کہ وہ صلوٰۃ علی النبی کی طرح اپنے سرپرستوں اور حامیوں کے لیے بھی صلوٰۃ کا لفظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ میرا یہ خط پہنچنے کے بعد ان لوگوں کو اس فعل سے روک دو اور انھیں حکم دو کہ وہ صلوٰۃ کو انبیا کے لیے مخصوص رکھیں اور دوسرے مسلمانوں کے حق میں دعا پر اکتفا کریں۔ (روح المعانی)

اکثریت کا یہ مسلک بھی ہے کہ حضورؐ کے سوا کسی نبی کے لیے بھی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کا استعمال درست نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۱۲۳-۱۲۸، الاحزاب، حواشی ۱۰۶-۱۰۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب چہارم

حفاظتِ نماز

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حفاظتِ نماز کا مفہوم

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ (المعارج ۷۰: ۳۴) اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔

اس سے نماز کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس بلند سیرت و کردار کے لوگ خدا کی جنت کے مستحق قرار دیے گئے ہیں ان کی صفات کا ذکر نماز ہی سے شروع اور اسی پر ختم کیا گیا ہے۔ نمازی ہونا ان کی پہلی صفت ہے، نماز کا ہمیشہ پابند رہنا اُن کی دوسری صفت اور نماز کی حفاظت کرنا اُن کی آخری صفت۔ نماز کی حفاظت سے بہت سے چیزیں مراد ہیں۔ وقت پر نماز ادا کرنا، نماز سے پہلے یہ اطمینان کر لینا کہ جسم اور کپڑے پاک ہیں، باوضو ہونا اور وضو میں اعضا کو اچھی طرح دھونا، ارکان اور واجبات اور مستحباتِ نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا، نماز کے آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھنا، خدا کی نافرمانیاں کر کے اپنی نمازوں کو ضائع نہ کرنا، یہ سب چیزیں نماز کی حفاظت میں شامل ہیں۔ (تفہیم القرآن، ششم، ص ۹۲، المعارج، حاشیہ ۲۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

نماز میں خشوع خضوع

الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (المؤمنون ۲۳:۲) جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

خشوع کے معنی

خشوع کے اصل معنی ہیں کسی کے آگے جھک جانا، دب جانا، اظہارِ عجز و انکسار کرنا۔ اس کیفیت کا تعلق دل سے بھی ہے اور جسم کی ظاہری حالت سے بھی۔ دل کا خشوع یہ ہے کہ آدمی کسی کی ہیبت اور عظمت وجلال سے مرعوب ہو۔ اور جسم کا خشوع یہ ہے کہ جب وہ اس کے سامنے جائے تو سر جھک جائے، اعضا ڈھیلے پڑ جائیں، نگاہ پست ہو جائے، آواز دب جائے اور ہیبت زدگی کے وہ سارے آثار اس پر طاری ہو جائیں جو اس حالت میں فطرتاً ہو جایا کرتے ہیں جبکہ آدمی کسی زبردست باجبروت ہستی کے حضور پیش ہو۔ نماز میں خشوع سے مراد دل اور جسم کی یہی کیفیت ہے اور یہی نماز کی اصل روح ہے حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہا ہے اور ساتھ ساتھ داڑھی کے بالوں سے کھیلتا جاتا ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا:

لَوْخَشَعَ قَلْبُهٗ خَشَعَتْ جَوَارِحُهٗ۔ اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے جسم پر بھی خشوع طاری ہوتا۔

آدابِ نماز

اگرچہ خشوع کا تعلق حقیقت میں دل سے ہے اور دل کا خشوع آپ سے آپ جسم پر طاری ہوتا ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث سے ابھی معلوم ہوا۔ لیکن شریعت میں نماز کے کچھ ایسے آداب بھی مقرر کر دیے گئے ہیں جو ایک طرف قلبی خشوع میں مددگار ہوتے ہیں اور دوسری طرف خشوع کی گھٹتی بڑھتی کیفیات میں فعلِ نماز کو کم از کم ظاہری حیثیت سے ایک معیارِ خاص پر قائم رکھتے ہیں۔

ان آداب میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی دائیں بائیں نہ مڑے اور نہ سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھے (زیادہ سے زیادہ صرف گوشۂ چشم سے اِدھر اُدھر دیکھا جا سکتا ہے۔ حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک نگاہ سجدہ گاہ سے متجاوز نہ ہونی چاہیے مگر مالکیہ اس بات کے قائل ہیں کہ نگاہ سامنے کی طرف رہنی چاہیے)۔ نماز میں ہلنا اور مختلف سمتوں میں جھکنا بھی ممنوع ہے۔ کپڑوں کو بار بار سمیٹنا، یا ان کو جھاڑنا، یا اس سے شغل کرنا بھی ممنوع ہے۔ اس بات سے بھی منع کیا گیا ہے کہ سجدے میں جاتے وقت آدمی اپنے بیٹھنے کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جگہ یا سجدے کی جگہ صاف کرنے کی کوشش کرے۔ تن کر کھڑے ہونا، بہت بلند آواز سے کڑک کر قراءت کرنا، یا قراءت میں گانا بھی آدابِ نماز کے خلاف ہے۔ زور زور سے جمائیاں لینا، اور نماز میں ڈکاریں لینا بھی نماز میں بے ادبی ہے۔ جلدی جلدی مارا مار نماز پڑھنا بھی سخت ناپسندیدہ ہے۔ حکم یہ ہے کہ نماز کا ہر فعل پوری طرح سکون اور اطمینان سے ادا کیا جائے۔ اور ایک فعل، مثلاً رکوع یا سجود یا قیام یا قعود جب تک مکمل نہ ہو لے دوسرا فعل شروع نہ کیا جائے۔ نماز میں اگر کوئی چیز اذیت دے رہی ہو تو اسے ایک ہاتھ سے دفع کیا جا سکتا ہے، مگر بار بار ہاتھوں کو حرکت دینا، یا دونوں ہاتھوں کو استعمال کرنا ممنوع ہے۔

ان ظاہری آداب کے ساتھ یہ چیز بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ آدمی نماز میں جان بوجھ کر غیر متعلق باتیں سوچنے سے پرہیز کرے۔ بلا ارادہ خیالات ذہن میں آئیں اور آتے رہیں تو یہ نفسِ انسانی کی ایک فطری کمزوری ہے، لیکن آدمی کی پوری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ نماز کے وقت اس کا دل خدا کی طرف متوجہ ہو اور جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا ہو وہی دل سے بھی عرض کرے۔ اس دوران میں اگر بے اختیار دوسرے خیالات آ جائیں تو جس وقت بھی آدمی کو اُن کا احساس ہو اسی وقت اسے اپنی توجہ اُن سے ہٹا کر نماز کی طرف پھیر لینی چاہیے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۶۱-۲۶۲، المومنون، حاشیہ ۳)

حالتِ نشہ میں نماز کی ممانعت

یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ. (النساء ۴:۴۳) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

غالباً ۴ ہجری کی ابتدا میں یہ دوسرا حکم آیا اور نشے میں نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے شراب پینے کے اوقات بدل دیے اور ایسے اوقات میں شراب پینی چھوڑ دی جن میں یہ اندیشہ ہوتا کہ کہیں نشہ ہی کی حالت میں نماز کا وقت نہ آ جائے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آیت میں سُکر یعنی نشہ کا لفظ ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف شراب کے لیے خاص نہ تھا بلکہ ہر نشہ آور چیز کے لیے عام تھا۔ اور اب اس کا حکم باقی ہے۔ اگرچہ نشہ آور اشیا کا استعمال بجائے خود حرام ہے، لیکن نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا دوہرا اور عظیم تر گناہ ہے۔

غلبۂ نیند کے وقت نماز چھوڑ کر سو جانے کا حکم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ جب کسی شخص پر نیند کا غلبہ ہو رہا ہو اور وہ نماز پڑھنے میں بار بار اونگھ جاتا ہو تو اسے نماز چھوڑ کر سو جانا چاہیے۔ بعض لوگ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جو شخص نماز کی عربی عبارت کا مطلب نہیں سمجھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ لیکن علاوہ اس کے کہ یہ ایک بے جا تشدد ہے، خود قرآن کے الفاظ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن میں حَتّٰی تَفْقَهُوْا یا حَتّٰی تَفْهَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ نہیں فرمایا ہے بلکہ حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ فرمایا ہے۔ یعنی نماز میں آدمی کا اتنا ہوش رہنا چاہیے کہ وہ یہ جانے کہ وہ کیا چیز اپنی زبان سے ادا کر رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کھڑا تو ہو نماز پڑھنے اور شروع کر دے کوئی غزل۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۳۵۴، النساء، حواشی ۶۵-۶۶)

مکمل انہماک اور توجہ کے بغیر نماز

س: ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ تم چاہو نماز پڑھو یا نہ پڑھو، جہنم سے نہیں بچ سکتے۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ مکمل انہماک اور توجہ کے بغیر پڑھی جانے والی نماز کبھی خدا کے حضور مقبول نہیں ہو سکتی اور ایسا انہماک پیدا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

ج: اللہ تعالیٰ ہر اُس نماز کو قبول فرماتا ہے جو بندہ اس کے لیے پڑھتا ہے۔ باقی رہی انہماک، توجہ اور یک سوئی کے لحاظ سے اس نماز کی قدر و قیمت، تو یہ قدر و قیمت طے کرنا اللہ کا کام ہے بندوں کا نہیں، انسان کو نماز میں انہماک اور توجہ کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن اگر اس میں کوئی کمی رہ جائے تو ہمت ہار کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے بلکہ کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اسے ایسی ہر کوشش کا اجر بھی دے گا۔ .... جو لوگ اس طرح خدا کے بندوں کو مایوس کرتے ہیں وہ انھیں خدا کی طرف بلانے کا نہیں بلکہ دور ہٹانے کا کام کرتے ہیں۔

(۵-اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۸۱-۸۲)

توجہ مرکوز کرنے کا طریقہ

نماز میں جان بوجھ کر دوسری باتوں کا خیال کرنا اور غیر متعلق امور کو سوچنا ممنوع ہے۔ اپنے وہ خیالات جو بے اختیار خود آجائیں، یا غفلت کی بنا پر آدمی بے جانے بوجھے جن میں مبتلا ہو جائے تو ان سے نماز میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی۔ ان کا علاج بس یہ ہے کہ جس وقت آدمی کو شعور ہو جائے کہ وہ دوسرے خیالات میں پڑ گیا ہے، اس وقت ان کو دفع کر کے اپنی نماز کی طرف متوجہ ہو جائے۔

رہا یہ سوال کہ نماز میں آدمی آخر کس چیز پر اپنے ذہن کو مرکوز کرے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسے نماز کے معنی پر اپنا ذہن مرکوز کرنا چاہیے۔ جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا ہو وہی کچھ کرنے کا اسے ارادہ بھی کرنا چاہیے۔ اور جو حرکات و سکنات بھی وہ نماز میں کر رہا ہو انھی کے کرنے کی اس کو نیت کرنی چاہیے۔ مثلاً قرآن مجید کی جو آیات وہ تلاوت کر رہا ہو ان کے معنی کی طرف اسے پوری طرح متوجہ ہونا چاہیے۔ سورہ فاتحہ اس طرح پڑھنی چاہیے کہ وہ خود یہ معروضات اللہ کے حضور پیش کر رہا ہے۔ دوسری قراءت اس طرح کرنی چاہیے کہ کلامِ الٰہی کی ایک ایک بات کو وہ سمجھتا جائے اور اس سے اثر لیتا جائے، تسبیحات اور تشہد وغیرہ، سب فہم و شعور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ اسے زبان سے ادا کرنی چاہییں اور رکوع و سجود وغیرہ تمام حرکات اسے عادتاً نہیں بلکہ ارادتاً کرنی چاہییں۔

(مکتوباتِ سید ابو الاعلیٰ مودودی بنام حکیم محمد شریف مسلم، جنوری ۱۹۸۶ء، ص ۱۰۳)

نماز میں اللہ کو دیکھنے کا مطلب

یہ خیال کہ نماز میں آدمی اللہ کا تصور جمائے اور اس پر ذہن کو اتنا مرکوز کرے کہ اللہ میاں اس کو نظر آنے لگیں، بالکل ہی ایک غلط خیال ہے اور حدیث کے الفاظ کا مطلب نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ (تو اللہ کی بندگی اس طرح کرے کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے)۔ یہ ارشاد اول تو محض نماز سے متعلق نہیں ہے، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد سب عبادات ہی ہیں، ان سب میں آخر آدمی ہفتوں اور مہینوں اللہ میاں کی صورت کا تصور کیسے جمائے رہ سکتا ہے۔ دوسرے، حضورؐ کا ارشاد یہ نہیں ہے کہ عبادت میں اللہ میاں کا تصور جماؤ اور انھیں دیکھنے کی کوشش کرو، بلکہ ارشاد یہ ہے کہ اللہ کی بندگی اس غلام نوکر کی طرح بجالاؤ جس کے سامنے اس کا آقا کھڑا ہو اور وہ دیکھ رہا ہو کہ آقا سامنے موجود ہے۔ ایسا غلام یا ملازم جس طرح حسنِ کارکردگی کا پورا پورا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح ایک مومن کو بھی اس زندگی میں خدا کی غلامی، بندگی، عبادت، اطاعت زیادہ سے زیادہ عمدگی سے کرنی چاہیے۔ کیونکہ اگر اسے یہ نظر نہیں آتا کہ اللہ سامنے موجود ہے تو کم از کم یہ تو وہ یقین کے ساتھ جانتا ہو کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے (فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ) اس سیدھے اور صاف مفہوم کو تصور جمانے کے غلط معنی کی طرف پھیر کر نہ معلوم کتنے بندگانِ خدا کو غلط فہمیوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ اور اس کی بدولت معلوم نہیں کتنے لوگ اللہ میاں کا تصور جمانے کی کوششِ ناکام ہی کرتے کرتے اس اندیشے کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے ہیں کہ شاید ان کی سب نمازیں بےکار ہی گئیں۔

(مکتوباتِ سید ابو الاعلیٰ مودودی بنام حکیم محمد شریف مسلم، جنوری ۱۹۸۶ء، ص ۱۰۴)

عبادت کو خامیوں سے پاک کرنے کا طریقہ

س: ہمیں یہ کیوں کر معلوم ہو کہ ہماری عبادت خامیوں سے پاک ہے یا نہیں اور اسے قبولیت کا درجہ حاصل ہو رہا ہے یا نہیں؟ ....قرآن وحدیث کے بعض ارشادات جن کا مفہوم یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو روزے میں بھوک پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بہت سے لوگ اپنی نمازوں سے رکوع و سجود کے علاوہ کچھ نہیں پاتے، یا یہ کہ جو کوئی اپنے آپ کو عابد سمجھے جانے پر خوش ہو تو نہ صرف اس کی عبادت ضائع ہوگئی بلکہ وہ شرک ہوگی، اور اس طرح سے دیگر تنبیہات جن میں عبادت کے لیے بےصلہ ہو جانے اور سزا دہی کی خبر دی گئی ہے دل کو نا امید و مایوس کرتی ہیں۔

اگر کوئی شخص اپنی عبادت کو معلوم شدہ نقائص سے پاک کرنے کی کوشش کرے اور اپنی دانست میں کر بھی لے پھر بھی ممکن ہے کہ اس کی عبادت میں کوئی ایسا نقص رہ جائے جس کا اسے علم نہ ہو سکے اور یہی نقص اس کی عبادت کو لاحاصل بنا دے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

............اسلام کا مزاج اس قدر نازک ہے کہ اپنی بشریت کے ہوتے ہوئے اس کے مقتضیات کو پورا کرنا ناممکن سا نظر آتا ہے............

ج: اسلام کا مزاج بلاشبہ بہت نازک ہے مگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی استطاعت سے زیادہ مکلف نہیں فرماتا۔ قرآن و حدیث میں جن چیزوں کے متعلق ذکر کیا گیا ہے کہ وہ عبادات کو باطل یا بے وزن کر دینے والی ہیں ان کے ذکر سے دراصل عبادات کو مشکل بنانا مطلوب نہیں ہے، بلکہ انسان کو ان خرابیوں پر متنبہ کرنا مقصود ہے تا کہ انسان اپنی عبادات کو ان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے، اور عبادات میں وہ روح پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہو جو مقصود بالذات ہے۔ عبادات کی اصل روح تعلق باللہ، اخلاص لِلّٰہ، اور تقویٰ و احسان ہے۔ اس روح کو پیدا کرنے کی کوشش کیجیے، اور ریا سے، فسق سے، دانستہ نافرمانی سے بچیے۔ ان ساری چیزوں کا محاسبہ کرنے کے لیے آپ کا اپنا نفس موجود ہے۔ وہ خود ہی آپ کو بتا سکے گا کہ آپ کی نماز میں، آپ کے روزے میں، آپ کی زکوٰۃ میں اور حج میں کس قدر اللہ کی رضا جوئی اور اس کی اطاعت کا جذبہ موجود ہے، اور ان عبادتوں کو آپ نے فسق و معصیت اور ریا سے کس حد تک پاک رکھا ہے۔ یہ محاسبہ اگر آپ خود کرتے رہیں تو ان شاء اللہ آپ کی عبادتیں بتدریج خالص ہوتی جائیں گی اور جتنی جتنی وہ خالص ہوں گی آپ کا نفس مطمئن ہوتا جائے گا۔ ابتداءً جو نقائص محسوس ہوں ان کا نتیجہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ آپ مایوس ہو کر عبادت چھوڑ دیں، بلکہ یہ ہونا چاہیے کہ آپ اخلاص کی پیہم کوشش کرتے جائیں۔ خبردار رہیے کہ عبادت میں نقص کا احساس پیدا ہونے سے جو مایوسی کا جذبہ ابھرتا ہے اُسے دراصل شیطان ابھارتا ہے اور اس لیے ابھارتا ہے کہ آپ عبادت سے باز آ جائیں۔ یہ شیطان کا وہ پوشیدہ حربہ ہے جس سے وہ طالبینِ خیر کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ان سب کوششوں کے باوجود یہ معلوم کرنا بہر حال کسی انسان کے امکان میں نہیں ہے کہ اس کی عبادات کو قبولیت کا درجہ حاصل ہو رہا ہے کہ نہیں۔ اس کو جاننا اور اس کا فیصلہ کرنا صرف اس ہستی کا کام ہے جس کی عبادت آپ کر رہے ہیں اور ہماری اور آپ کی عبادتوں کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ ہر وقت اس کے غضب سے ڈرتے رہیے۔ اور اس کے فضل کے امیدوار رہیے۔ مومن کا مقام بین الخوف والرجا ہے۔ خوف اس کو مجبور کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بہتر بندگی بجالانے کی کوشش کرے۔ اور امید اس کی ڈھارس بندھاتی ہے کہ اس کا رب کسی کا اجر ضائع کرنے والا نہیں ہے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۳۶۳-۳۶۷)

س: توجہ اور حضورِ قلب کی کمی کیا نماز کو بے کار کر دیتی ہے؟ نماز کو اس خامی سے کیوں کر پاک کیا جائے؟

نماز میں عربی زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے نہایت بے حضوریِ قلب پیدا ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے کیونکہ ہم سوچتے ایک زبان میں ہیں اور نماز دوسری زبان میں پڑھتے ہیں۔ اگر آیات کے مطالب سمجھ بھی لیے جائیں تب بھی ذہن اپنی زبان میں سوچنے سے باز نہیں رہتا............

ج: توجہ اور حضورِ قلب کی کمی نماز میں نقص ضرور پیدا کرتی ہے، لیکن فرق ہے اُس بے توجہی میں جو نادانستہ ہو اور اس میں جو دانستہ ہو۔ نادانستہ پر مواخذہ نہیں ہے بشرطیکہ انسان کو دورانِ نماز میں جب کبھی اپنی بے توجہی کا احساس ہو جائے اسی وقت وہ خدا کی طرف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

متوجہ ہونے کی کوشش کرے۔ اور اس معاملے میں غفلت سے کام نہ لے۔ رہی دانستہ بے توجہی، بے دلی کے ساتھ نماز پڑھنا اور نماز میں قصداً دوسری باتیں سوچنا، تو بلاشبہ یہ نماز کو بے کار کر دینے والی چیز ہے۔

عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر جو بے حضوری کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کی تلافی جس حد تک ممکن ہو نماز کے اذکار کا مفہوم ذہن نشین کرنے سے کر لیجیے۔ اس کے بعد جو کمی رہ جائے اس پر آپ عنداللہ ماخوذ نہیں ہیں۔ کیونکہ آپ حکمِ خدا اور رسول کی تعمیل کر رہے ہیں۔ اس بے حضوری پر آپ سے اگر مواخذہ ہو سکتا تھا تو اس صورت میں جب کہ خدا اور رسول نے آپ کو اپنی زبان میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہوتی اور پھر آپ عربی میں نماز پڑھتے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۳۶۳-۳۶۸)

نماز میں ہاتھ ہلانا وغیرہ

س: بعض لوگ نماز میں ہاتھ وغیرہ ہلاتے ہیں۔ ٹوپی یا کپڑا وغیرہ ٹھیک کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات اس حالت میں کہ وہ ہاتھ باندھے ہوئے نہ ہوں۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا کرتہ وغیرہ ٹھیک کر لیتے ہیں۔ اس سے نماز میں فرق آ جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

ج: اصل میں بات یہ ہے کہ مسائلِ شرعیہ کو بیان کرنے میں بعض اوقات بے احتیاطی کی جاتی ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں انتہا پسندی پیدا ہونے لگتی ہے۔ دراصل نماز میں خرابی وہ فعل پیدا کرتا ہے جس میں آدمی بیک وقت دونوں ہاتھ ملا کر کوئی کام کرے اور مسلسل کچھ دیر تک کرتا جائے۔ اس کی وجہ سے دیکھنے والے کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ شخص نماز میں ہے یا یوں ہی کھڑا ہوا کوئی کام کر رہا ہے۔ دوسرے اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ آدمی نماز سے غافل ہو کر کوئی دوسرا کام کر رہا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ بات درست نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی کسی حقیقی ضرورت سے بھی اپنے کسی ہاتھ کو استعمال نہ کرے۔ یا یہ کہ آدمی دونوں طرف اپنے ہاتھ الگ الگ رکھتے ہوئے انھیں استعمال نہ کرے۔

ایک ہے ملا کر دونوں ہاتھوں سے کام کر لینا اور ایک ہے الگ الگ اپنی جگہ دونوں سے کام لینا۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ اور ان دونوں کے متعلق ایک ہی حکم لگانا ٹھیک نہیں۔ اگر فرض کیجیے کہ ایک آدمی کو دونوں طرف کھجلی ہوئی ہے تو وہ کیا کرے۔ یا اگر ایک آدمی کو دونوں طرف کسی چیز نے کاٹ لیا ہے تو وہ کیا کرے۔ اسی طرح ایک آدمی مثلاً جب سجدے میں جانے لگے اور وہ اپنا تہمد یا پاجامہ دونوں طرف سے تھوڑا تھوڑا اٹھا لے تا کہ وہ آسانی سے سجدہ کر سکے تو اس پر بھی خواہ مخواہ اعتراض کرنا مناسب نہیں۔ اور نہ اس کی نماز ٹوٹ جانے کا فیصلہ کر دینا درست ہے۔ البتہ دونوں ہاتھوں کو ملا کر استعمال کرنے میں اور اس میں فرق ہے۔ لوگوں کے اندر یہ ایک انتہا پسندی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ذرا ذرا سی باتوں میں نماز ٹوٹ جانے اور بڑے بڑے گناہ لاحق ہو جانے کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ مسائل کے بیان میں اس طرح کی شدت اختیار کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

(استفسارات، اوّل، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۸-۱۳۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

غیر امام کی آواز پر حرکت کرنا

نماز میں غیر امام کی آواز پر حرکت کرنا مطلقاً مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر:

۱- اگر آدمی نماز میں ہو اور کوئی سلام کرے تو اشارے سے جواب دینا مفسدِ صلوٰۃ نہیں۔ ترمذی میں حضرت بلالؓ سے اور نسائی میں حضرت صہیبؓ سے مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حالتِ نماز میں سلام کیا جاتا تو آپؐ ہاتھ کے اشارے سے جواب دیتے تھے۔

۲- نماز میں اگر کسی شخص سے کسی ضروری بات کے متعلق سوال کیا جائے تو اشارے سے جواب دینا بھی مفسدِ صلوٰۃ نہیں۔ چنانچہ خلاصے میں ہے کہ مصلّی کو سلام کیا جائے اور وہ ہاتھ یا سر کے اشارے سے جواب دے دے، یا اسے کسی چیز کی خبر دی جائے اور وہ سر کی حرکت سے ہاں یا نہیں کا اشارہ کر دے، یا اس سے پوچھا جائے کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں اور وہ انگلیوں کے اشارے سے بتا دے تو یہ مفسدِ صلوٰۃ نہیں۔ (فتح القدیر، ج ۱، ص ۲۹۲)

۳- اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور کوئی اسے پکار دے اور وہ اس کو یہ بتانے کے لیے کہ میں نماز میں ہوں زور سے لا الٰــہ الاّ اللّٰہُ کہہ دے تو اس سے نماز میں کوئی خرابی نہیں آتی (ہدایہ، باب مایفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیہا)

۴- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جب کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تو نماز مختصر کر دیتے تھے تاکہ بچے کی ماں اگر شریک جماعت ہو تو وہ پریشان نہ ہونے پائے۔ (بخاری اور مسلم میں اس مضمون کی متعدد روایتیں ہیں)

۵- حضرت عائشہ کا ارشاد ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض سخت ہو گیا تو آپ کے حکم سے حضرت ابوبکر نماز پڑھانے لگے۔ ایک روز حضور نے مرض میں کمی محسوس فرمائی اور نماز میں شریک ہونے کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب آپ کے آنے کی آہٹ پائی تو پیچھے ہٹنے لگے۔ مگر آپ نے اشارے سے ان کو منع کیا۔ چنانچہ وہ اپنی جگہ کھڑے رہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بائیں جانب جا کر بیٹھ گئے۔ (متفق علیہ)

۶- مسجد قبا میں لوگ نماز پڑھ رہے تھے کہ تحویلِ قبلہ کی منادی اُن کے کانوں میں پہنچی اور انھوں نے اسی حالت میں اپنا رخ کعبے کی طرف پھیر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل کو نہ صرف جائز رکھا بلکہ پسند فرمایا۔ اسی سے فقہا نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر کوئی شخص سمتِ قبلہ سے ناواقف ہو اور گمانِ غالب کی بنا پر کسی رخ پر نماز پڑھ رہا ہو، پھر اسی حالت میں کوئی اسے قبلے کی صحیح سمت بتا دے، تو اسی وقت اس کو صحیح سمت کی طرف پھر جانا چاہیے (ہدایہ، باب شروط الصلوٰۃ التی تتقدمہا)

اسی طرح کی اور بھی بکثرت مثالیں احادیث و آثار میں موجود ہیں اور ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر غیر مصلّی کے ذریعے سے بھی مقتدیوں کو امام کے رکوع و سجود اور قیام و قعود کی اطلاع پہنچے، اور وہ ذریعہ قابلِ اعتماد ہو، تو اس کے مطابق حرکت کرنے سے نماز میں کوئی قباحت واقع نہیں ہوتی۔ قاطعِ صلوٰۃ جو چیز ہے وہ دراصل اس نوعیت کا فعل ہے جس میں آپ کو مشغول دیکھ کر ناواقف آدمی یہ گمان کرے کہ آپ نماز نہیں پڑھ رہے ہیں، یا پھر مصلّی اور غیر مصلّی کے درمیان ایسا معاملہ ہو جو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مکالمہ اور تعلیم تعلّم کی حد تک پہنچا ہوا ہو۔ چنانچہ مبسوط میں ہے:

كُلُّ عَمَلٍ إِذَا نَظَرَ إِلَيْهِ النَّاظِرُ مِنْ بَعِيدٍ لَا يَشُكُّ أَنَّهُ فِي غَيْرِ الصَّلٰوةِ فَهُوَ مُفْسِدٌ لِصَلٰوتِهِ وَكُلُّ عَمَلٍ لَوْ نَظَرَ إِلَيْهِ النَّاظِرُ فَرُبَمَا يَشْتَبِهُ عَلَيْهِ أَنَّهُ فِي الصَّلٰوةِ فَذَالِكَ غَيْرُ مُفْسِدٍ۔ (المبسوط، ج ۱، ص ۱۹۵) ہر وہ عمل جسے دور سے دیکھ کر آدمی بلا شک یہ سمجھے کہ اس کا مرتکب نماز میں نہیں ہے، مفسدِ صلوٰۃ ہے اور ہر وہ عمل جسے دیکھنے کے باوجود آدمی یہ شبہ کر سکتا ہو کہ وہ نماز میں ہے، مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہے۔

اور مبسوط ہی میں دوسری جگہ ہے:

فَأَمَّا غَيْرُ الْمُقْتَدِيْ إِذَا فَتَحَ عَلَى الْمُصَلِّيْ تَفْسُدُ بِهٖ صَلٰوةُ الْمُصَلِّيْ وَكَذَالِكَ الْمُصَلِّيْ إِذَا فَتَحَ غَيْرَ الْمُصَلِّيْ، لِأَنَّهُ تَعْلِيمٌ وَ تَعَلُّمٌ وَالْقَارِئُ إِذَا اسْتَفْتَحَ غَيْرَهُ فَكَأَنَّهُ يَقُولُ بَعْدَ مَا قَرَأْتُ مَاذَا؟ فَذَكِّرْنِيْ۔ وَالَّذِيْ يَفْتَحُ عَلَيْهِ كَأَنَّهُ يَقُولُ: بَعْدَ مَاقَرَأْتَ كَذَا، فَخُذْ مِنِّيْ۔ (المبسوط، ج ۱، ص ۱۹۳) اگر غیر مقتدی (خواہ الگ نماز پڑھ رہا ہو یا نماز نہ پڑھ رہا ہو) مصلّی کو لقمہ دے تو مصلّی کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ اور اسی طرح اگر مصلّی غیر مصلّی کو لقمہ دے تب بھی نماز فاسد ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ تعلیم و تعلّم ہے۔ قاری جب پڑھتے پڑھتے دوسرے سے لقمہ مانگتا ہے تو گویا وہ سامع سے کہتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہے؟ مجھے یاد دلاؤ۔ اور لقمہ دینے والا گویا اس کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ اس کے بعد یہ ہے۔ یہ لو (یعنی اس طرح لقمہ دینا اور لقمہ لینا کلام کی حد میں آ جاتا ہے)۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ نماز پڑھا رہے تھے۔ حضرت رفاعہ بن رافع کو چھینک آئی اور انھوں نے زور سے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ مُبَارَكًا عَلَيْهِ كَمَا يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضٰى۔ [حمد ہے اللہ کے لیے، بہت زیادہ، پاکیزہ اور بابرکت حمد، جیسا کہ ہمارا رب چاہتا ہے۔]

نماز ختم ہونے کے بعد حضورؐ نے فرمایا: یہ کون تھا جس نے یہ فقرہ کہا تھا؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تیس سے زیادہ فرشتے اس قول کو لے جانے کے لیے ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے تھے۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

دوسری حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ اس حال میں نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ کے کندھے پر ایک بچی (اُمامہ بنت ابی العاص) بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ جب رکوع میں جاتے تو اس کو اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو اسے پھر کندھے پر بٹھا لیتے (بخاری و مسلم)

اسی بنا پر فقہا نے مسئلہ نکالا ہے کہ اگر نماز میں بچے کو اٹھائے رہے تو یہ فعل مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہے (عالمگیری) نیز حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ نماز پڑھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک بچھو نے آپ کو کاٹ لیا اور اسی حالت میں آپ نے اپنی جوتی رکھ کر اس کو مار ڈالا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اُقْتُلُوا الْأَسْوَدَيْنِ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي الصَّلٰوةِ۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی) بچھو اور سانپ کو مارو خواہ تم نماز ہی میں کیوں نہ ہو۔

(تفہیمات، دوم، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۳۵۷-۳۶۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صلوٰۃِ وسطیٰ

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ○ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرہ ۲:۲۳۸-۲۳۹) اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو، خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسنِ صلوٰۃ کی جامع ہو، اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو، جیسے فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔ بدامنی کی حالت ہو، تو خواہ پیدل ہو، خواہ سوار، جس طرح ممکن ہو، نماز پڑھو۔ اور جب امن میسر آ جائے، تو اللہ کو اُس طریقے سے یاد کرو، جو اُس نے تمھیں سکھا دیا ہے، جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔

قوانینِ تمدن و معاشرت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس تقریر کو نماز کی تاکید پر ختم فرماتا ہے، کیونکہ نماز ہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر خدا کا خوف، نیکی و پاکیزگی کے جذبات اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کا مادہ پیدا کرتی ہے اور اسے راستی پر قائم رکھتی ہے۔ یہ چیز نہ ہو تو انسان کبھی الٰہی قوانین کی پابندی پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور آخر کار اسی نافرمانی کی رو میں بہہ نکلتا ہے جس پر یہودی بہہ نکلے۔

اصل میں لفظ [الصلوٰۃ الوسطیٰ] استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد بعض مفسرین نے صبح کی نماز لی ہے، بعض نے ظہر، بعض نے مغرب اور بعض نے عشا۔ لیکن ان میں سے کوئی قول بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ صرف اہلِ تاویل کا استنباط ہے۔ سب سے زیادہ اقوال نمازِ عصر کے حق میں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی نماز کو صلوٰۃ وسطیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن جس واقعے سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جنگِ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے حملے نے اس درجہ مشغول رکھا کہ سورج ڈوبنے کو آ گیا اور آپؐ نمازِ عصر نہ پڑھ سکے۔ اُس وقت آپؐ نے فرمایا کہ خدا ان لوگوں کی قبریں اور ان کے گھر آگ سے بھر دے، انھوں نے ہماری صلوٰۃِ وسطیٰ فوت کرا دی۔

اس سے یہ سمجھا گیا کہ آپؐ نے نمازِ عصر کو صلوٰۃِ وسطیٰ فرمایا ہے، حالانکہ اس کا یہ مطلب ہمارے نزدیک زیادہ قرینِ صواب ہے کہ اس مشغولیت نے اعلیٰ درجے کی نماز ہم سے فوت کرا دی، ناوقت پڑھنی پڑے گی، جلدی جلدی ادا کرنی ہوگی، خشوع و خضوع اور اطمینان و سکون کے ساتھ نہ پڑھ سکیں گے۔

وسطیٰ کے معنی بیچ والی چیز کے بھی ہیں اور ایسی چیز کے بھی جو اعلیٰ اور اشرف ہو۔ صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد بیچ کی نماز بھی ہو سکتی ہے اور ایسی نماز بھی جو صحیح وقت پر پورے خشوع اور توجہ الی اللہ کے ساتھ پڑھی جائے، اور جس میں نماز کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ بعد کا فقرہ کہ اللہ کے آگے فرماں بردار بندوں کی طرح کھڑے ہو، خود اس کی تفسیر کر رہا ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۸۲-۱۸۳، البقرہ، حاشیہ ۲۶۲-۲۶۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب پنجم

متعلّقاتِ نماز

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

اذان

اذان کا آغاز کس طرح ہوا!

مشکوٰۃ کی کتاب الصلوٰۃ میں باب الاذان .... میں جو احادیث جمع کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں جب نماز با جماعت کا باقاعدہ نظام قائم کیا گیا تو اوّل اوّل اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایت اس بارے میں نہیں آئی تھی کہ نماز کے لیے لوگوں کو کس طرح جمع کیا جائے۔ حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا[1]۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ آگ جلائی جائے تاکہ اس کا دھواں بلند ہوتے دیکھ کر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ نماز کھڑی ہو رہی ہے۔ بعض دوسرے لوگوں نے ناقوس بجانے کی رائے دی لیکن کچھ اور لوگوں نے کہا کہ پہلا طریقہ یہود اور دوسرا نصاریٰ کا ہے۔ ابھی اس معاملے میں کوئی آخری فیصلہ نہ ہوا تھا اور اسے سوچا جا رہا تھا کہ حضرت عبداللہ بن زیدؓ انصاری نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص ناقوس لیے جا رہا ہے۔ انھوں نے اس سے کہا: اے بندۂ خدا! یہ ناقوس بیچتا ہے؟ اس نے پوچھا: اس کا کیا کرو گے؟ انھوں نے کہا: نماز کے لیے لوگوں کو بلائیں گے۔ اس نے کہا میں اس سے اچھا طریقہ تمھیں بتاتا ہوں، چنانچہ اس نے اذان کے الفاظ انھیں بتائے۔ صبح ہوئی تو حضرت عبداللہؓ نے آ کر حضورؐ کو اپنا خواب سنایا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے، اٹھو اور بلالؓ کو ایک ایک لفظ بتاتے جاؤ، یہ بلند آواز سے پکارتے جائیں گے۔ جب اذان کی آواز بلند ہوئی تو حضرت عمرؓ دوڑے ہوئے آئے اور عرض کیا کہ خدا کی قسم! آج میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فللّٰہ الحمد............

اس سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نماز کے لیے اذان دینے کا طریقہ مشورے سے نہیں طے ہوا، بلکہ الہام سے ہوا ہے اور یہ الہام بصورت خواب حضرت عبداللہ بن زید اور حضرت عمرؓ پر ہوا تھا۔ لیکن مشکوٰۃ کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں جو روایات آئی ہیں ان سب کو اگر جمع کیا جائے تو ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جس روز ان صحابیوں کو خواب میں اذان کی ہدایت ملی اسی روز خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی بذریعۂ وحی یہ حکم آ گیا تھا۔ فتح الباری میں علامہ ابن حجر نے ان روایات کو جمع کر دیا ہے۔

(سنت کی آئینی حیثیت، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۱۸۶-۱۸۷)

۱- آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلے پر (مشاورت) فرمائی تھی کہ لوگوں کو نماز کے اوقات پر جمع کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے .... جس کے نتیجے میں بالآخر اذان کا طریقہ آپ نے مقرر فرمایا۔ (اسلامی ریاست، جولائی ۱۹۸۸ء، ص ۳۶۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اذان کے الفاظ

دن میں پانچ وقت آپ کو یہ کہہ کر پکارا جاتا ہے:

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔ خدا سب سے بڑا ہے، خدا سب سے بڑا ہے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی بندگی کا حق دار نہیں۔

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ۔ آؤ نماز کے لیے

حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ۔ آؤ اس کام کے لیے جس میں فلاح ہے۔

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

دیکھو یہ کیسی زبردست پکار ہے۔ ہر روز پانچ مرتبہ یہ آواز کس طرح تمھیں یاد دلاتی ہے کہ زمین میں جتنے بڑے خدائی کے دعوے دار نظر آتے ہیں، سب جھوٹے ہیں۔ زمین و آسمان میں ایک ہی ہستی ہے جس کے لیے بڑائی ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ آؤ اس کی عبادت کرو۔ اسی کی عبادت میں تمھارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔ کون ہے جو اس آواز کو سن کر ہل نہ جائے گا؟ کیوں کر ممکن ہے کہ جس کے دل میں ایمان ہو، وہ اتنی بڑی گواہی اور ایسی زبردست پکار سن کر اپنی جگہ بیٹھا رہے اور اپنے مالک کے آگے سر جھکانے کے لیے دوڑ نہ پڑے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۷-۱۴۸)

اذان سن کر شیطان کا گوز کرنا

[ایک صاحب نے بعض احادیث پر اعتراضات کیے ہیں۔ ان میں سے ایک] حدیث کو جن الفاظ میں انھوں نے نقل کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

حضورؐ کا فرمانا کہ اذان سن کر شیطان گوز کرتا ہوا بھاگتا ہے۔

اس حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں:

اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ اَدْبَرَ الشَّيْطَانُ لَهٗ ضُرَاطٌ حَتّٰى لَا يَسْمَعَ التَّاذِيْنَ فَاِذَا قُضِیَ النِّدَآءُ اَقْبَلَ حَتّٰى اِذَا ثُوِّبَ لِلصَّلٰوةِ اَدْبَرَ حَتّٰى اِذَا قُضِیَ التَّثْوِيْبُ اَقْبَلَ حَتّٰى يَخْطُرَ بَيْنَ الْمَرْءِ وَنَفْسِهٖ يَقُوْلُ [اُذْكُرْ كَذَا] لِمَالَمْ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یَکُنْ یَذْکُرُ حَتّٰی یَظَلَّ الرَّجُلُ لَا یَدْرِیْ کَمْ صَلّٰی۔[1] جب نماز کے لیے ندا کی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے اور
اس کے گوز صادر ہوتے ہیں کہ اذان نہ سنے۔ پھر جب اذان ختم ہو جاتی ہے تو پلٹ آتا ہے۔ پھر جب نماز کے لیے تکبیر اقامت
کہی جاتی ہے تو پھر بھاگتا ہے اور جب تکبیر ختم ہو جاتی ہے تو واپس آ جاتا ہے کہ خطرے ڈالے آدمی اور اس کے نفس کے
درمیان۔ کہتا ہے کہ فلاں بات یاد کرو، فلاں بات یاد کرو۔ ایسی ایسی باتیں یاد دلاتا ہے جن کا اس کو نماز سے پہلے خیال تک نہ تھا۔
حتیٰ کہ آدمی بھول جاتا ہے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں۔

[اس] حدیث کی روایت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر وضع یا ضعف کا حکم لگایا جا سکے۔ اس کو امام بخاری نے خفیف سے لفظی تغیر کے ساتھ تین مختلف ابواب میں تین طریقوں سے روایت کیا ہے۔ کتاب الصلوٰۃ باب فضل التاذین میں عبداللہ بن یوسف، مالک، ابوالزناد، اعرج اور ابوہریرہ اس کے راوی ہیں۔ باب تفکر الرجل الشّیءَ فی الصلوٰۃ میں یحییٰ بن بکیر، لیث، جعفر بن ربیعہ، اعرج اور ابوہریرہ نے اس کو روایت کیا ہے۔ اور کتاب بدء الخلق باب صفتہ الابلیس و جنودہ میں محمد بن یوسف، اوزاعی، یحییٰ بن ابی کثیر، ابوسلمہ اور ابوہریرہ کے نام اس کے اسناد میں نظر آتے ہیں۔ نسائی نے بھی باب فضل التاذین میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔ سلسلۂ اسناد میں قتیبہ اور مالک آئے ہیں۔ مسلم نے بھی باب فضل الاذان میں اس مضمون کی پانچ روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے بعض میں لہٗ ضراط کی جگہ لہٗ حصاص آیا ہے۔ جس کی تفسیر اصمعی نے شدتِ فرار سے کی ہے۔ ایک اور حدیث جو مسلم نے جابر سے نقل کی ہے، یہ ہے کہ شیطان جب اذان کی آواز سنتا ہے تو روحاء[2] تک بھاگتا چلا جاتا ہے۔

اب رہا متن حدیث تو اس میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس کی صداقت پر ہر نماز پڑھنے والا گواہی دے سکتا ہے۔ اذان اور تکبیر کی آواز سن کر فی الواقع انسان خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس وقت کوئی خطرہ اس کے قلب میں نہیں آتا۔ مگر نماز شروع کرتے ہی طرح طرح کے وسوسے آنے لگتے ہیں۔ اس کیفیت کی وجہ کو مختلف پیرایوں میں بیان فرمایا گیا ہے۔ مقصود صرف یہ بتانا تھا کہ اذان کی آواز سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ اس میں فرار کی شدت کو ظاہر کرنے کے لیے کہیں فرمایا گیا ہے کہ وہ روحاء تک بھاگتا چلا جاتا ہے۔ یعنی میلوں تک نہیں ٹھہرتا۔ کہیں وہی مفہوم لہٗ حصاص کے لفظ سے ادا فرمایا ہے اور کہیں لہٗ ضراط کہہ کر شدت کے ساتھ کراہت کا بھی اظہار کر دیا گیا ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم اردو میں کہیں کہ شیطان دم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ محض استعارہ ہوگا۔ اب اگر کوئی شخص اس مجازی کلام کو حقیقت پر محمول کرے اور فرض کر لے کہ شیطان واقعی ایک دم رکھتا ہے اور بھاگتے وقت اس کو ٹانگوں میں دبا لیتا ہے تو یہ قائل کے بیان کا نہیں، سامع کی عقل کا قصور ہوگا۔ اسی طرح شیطان کے گوز کرتے ہوئے بھاگنے سے بھی اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ شیطان واقعی پیٹ رکھتا ہے اور اس میں غذا ہضم ہوتی ہے اور اس سے ریاح خارج ہوتے ہیں تو یہ اس بات کا

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، سوم، اگست ۲۰۰۴ء، ص ۴۴-۵۰۔

۲۔ روحاء مدینے سے کئی میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے۔ (مرتب)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ثبوت ہوگا کہ وہ یکسر کودن آدمی ہے۔ بات سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ ایسی باتوں پر اعتراض کرنے والے تو محض فتنہ پرداز ہیں۔ ان کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے جو انھیں سیدھی سی بات کو بھی سیدھی طرح نہیں سمجھنے دیتی۔ مگر افسوس ان مسلمانوں پر ہے جو ایسے اعتراضات کو سن کر لا جواب اور شرمندہ ہوتے ہیں۔

(ترجمان القرآن، ج ۴، عدد ۵، جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ، جولائی ۱۹۳۴ء، ص ۳۰۵-۳۰۷)

حدیث کی مزید تشریح

[گذشتہ بحث پر ایک صاحب نے اعتراض کیا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے:] آپ نے بخاری کے ادبر الشیطان له ضراط کو مسلم کے لهٗ حصاصٌ کے سامنے بے حقیقت اور محض استعارہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان لوگوں کو کودن قرار دیا ہے جو حدیث بخاری کے الفاظ کو ظاہر پر محمول کر کے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ شیطان پیٹ رکھتا ہے اور اس سے ریاح خارج ہوتے ہیں۔ لیکن علمائے اہل حدیث اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کے لٹریچر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شیطان کا مجسم ہونا اور اس کے پیٹ سے ریاح کا خارج ہونا ایک مسلّم حقیقت ہے۔ بایں ہمہ آپ کے جواب سے نفس اعتراض پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ اصل اعتراضات ہنوز طے نہیں ہوئے۔ ازاں جملہ ایک عام اعتراض جو روز سننے میں آتا ہے یہ ہے کہ اذان سن کر شیطان کا بھاگ جانا، مگر نماز پڑھنے کی حالت میں معاً پھر نہ صرف لوٹ آنا بلکہ نمازیوں کے دل و دماغ پر مسلط ہو جانا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ آیا اذان نماز سے بہتر ہے یا خود نماز میں ایسی کوئی خرابی موجود ہے جس کے باعث شیطان کو ایسے تسلط کا موقع مل جاتا ہے کہ از روئے روایات خود رسول اللہ تک رکعتیں بھولتے اور بروئے حکایت علماء امام غزالی تک نماز میں نفسِ نماز سے منحرف ہو کر ادھر ادھر کے خیالات میں منہمک ہو جاتے تھے؟ براہ مہربانی واضح طور پر بتلایئے کہ نماز میں بمقابلہ اذان کے شیطانی تسلط قائم ہونے کے وجوہ کیا ہیں؟

[مولانا مودودیؒ نے اس کا یہ جواب دیا:] میں نے حدیث بخاری کے الفاظ کو حدیث مسلم کے الفاظ کے سامنے بے حقیقت ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، بلکہ صرف یہ کہا تھا کہ مسلم میں جو الفاظ آرہے ہیں وہ حدیث بخاری کے الفاظ کی تفسیر کرتے ہیں۔ مختلف احادیث پر نظر ڈالنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اذان کی تاثیر کو مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے۔ ان سب ارشادات کو ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصل مقصد اذان کا یہ اثر بیان کرنا تھا کہ اس کو سن کر شیطان بھاگ جاتا ہے اور اس کے دوران میں انسان شیطانی وساوس سے محفوظ رہتا ہے۔ علمائے اہل حدیث کی رائے اگر اس سے مختلف ہے تو ان کے دلائل معلوم ہونے کے بعد میں کچھ عرض کر سکوں گا۔

میں نے جہاں تک کتاب اللہ کا مطالعہ کیا ہے، اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس اور اس کی ذرّیت اور جن، انسان و حیوان کی طرح مادی جسم نہیں رکھتے، بلکہ آتشیں مخلوق ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ابلیس کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۔ (الاعراف ۷: ۱۲) اور جنوں کے متعلق حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا ہے کہ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۚ (الرحمٰن ۵۵: ۱۵) اور ابلیس کے متعلق ارشاد ہے کہ كَانَ مِنَ الْجِنِّ۔ [الکہف ۱۸: ۵۰] ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ شیطان کی حقیقت انسان سے مختلف ہے۔ نہ وہ انسان کا سا جسم رکھتا ہے اور نہ اس پر وہ احوال گزرتے ہیں، جو انسان پر گزرا کرتے ہیں۔ مثلاً اکل طعام واخراج ریاح وغیرہ۔ باقی رہی یہ بات کہ حدیث نبوی کے الفاظ لہ ضراط کو شیطان کے صاحب شکم ہونے اور اس سے ریاح خارج ہونے کے لیے دلیل قرار دیا جائے تو میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے۔ لغت عرب میں ضراط کا لفظ محض ریح شکم کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ مجازاً بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً خفت کے معنی میں: چنانچہ بالوں کی کمی کو الضراط کہتے ہیں اور جس شخص کی داڑھی ہلکی ہو اس کو اضرط کہا جاتا ہے۔ جس عورت کی بھویں ہلکی ہوں وہ ضرطاء کہلاتی ہے۔ انکار اور استخفاف کے معنی میں: يُقَالُ اَضْرَطَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ اِذَا اسْتَخَفَّ بِهٖ وَسَخِرَ مِنْهُ۔ اور حدیث علیؓ میں ہے کہ اِنَّهٗ دَخَلَ بَيْتَ الْمَالِ فَاَضْرَطَ بِهٖ اَیْ اِسْتَخَفَّ بِهٖ وَسَخِرَ مِنْهُ۔ ناپسندیدگی اور کراہت کے معنی میں: وَ فِی الْمَثَلِ اَلْاَكْلُ سَرْطَانٌ وَ الْقَضَاءُ ضَرْطَانٌ وَ تَاوِيْلُ ذٰلِكَ تُحِبُّ اَنْ تَاْخُذَ وَ تَكْرَهُ اَنْ تَرُدَّ۔[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں شیطان کے بھاگنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے حضورؐ نے لہ ضراط جو فرمایا ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بھاگتے وقت فی الواقع اس کے پیٹ سے ریاح خارج ہوتے ہیں بلکہ اس سے مراد ایسی شدتِ فرار ہے جس میں خوف اور کراہت اور گھبراہٹ بھی شامل ہے۔ خود ہماری زبان کے محاورات میں بھی گوز کرنے کا لفظ حقیقی معنی پر محمول نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے اضطراب اور خوف اور بدحواسی اور عجز وغیرہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کہیں کہ فلاں شخص گوز کرتا ہوا بھاگا تو کوئی بھی اس کا یہ مفہوم نہیں لیتا کہ فی الواقع بھاگتے وقت اس کے پیٹ سے ریاح خارج ہو رہے تھے، بلکہ اس سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ سخت بدحواسی اور خوف کی حالت میں بھاگا۔ پس جب انسان کے متعلق یہ الفاظ سن کر آپ ان کو حقیقت پر محمول نہیں کرتے، حالانکہ انسان پیٹ رکھتا ہے اور اس سے ریاح خارج ہونا ایک امر طبعی ہے، تو پھر شیطان کے حق میں یہ الفاظ سن کر آپ ان کو حقیقت پر کس طرح محمول کر سکتے ہیں، درآں حالیکہ وہ انسان وحیوان کا سا جسم نہیں رکھتا؟

میں اپنے محدود علم کی بنا پر اس حدیث کے معنی کی جو تحقیق کر سکتا تھا وہ میں نے بیان کردی ہے۔ اگر کوئی شخص میری تحقیق کو غلط ثابت کردے تو میں اس سے رجوع کرنے میں کبھی تامل نہ کروں گا۔ الحمدللہ، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی رائے کو وحی والہام سمجھتے ہیں، اور اختلاف کرنے والوں کو گالیاں دیتے ہیں۔

رہا آپ کا یہ سوال کہ جب اذان سن کر شیطان بھاگ جاتا ہے تو نماز پڑھنے میں واپس کیوں آجاتا ہے؟ اور کیا نماز اذان سے فروتر چیز ہے؟ تو اس کا جواب میرے ذمے نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کرنا چاہیے کہ اس نے اذان اور نماز

۱- پہلے دو جملے عربی کے محاورے ہیں۔ ان میں سے پہلا محاورہ یہ ہے کہ اَضْرَطَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ یہ محاورہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی کو ذلیل سمجھ کر اس کا مذاق اڑایا جائے۔ دوسرے محاورے میں اگر یہ کہا جائے کہ دَخَلَ بَيْتَ الْمَالِ فَاَضْرَطَ بِهٖ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بیت المال کم محسوس ہوا اور اس کا مذاق اڑایا۔ تیسرا ایک ضرب المثل ہے۔ اَلْاَكْلُ سَرْطَانٌ وَالْقَضَاءُ ضَرْطَانٌ اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک آدمی کوئی چیز لینا تو پسند کرے مگر واپس دینا اس کے لیے سخت ناگوار ہو۔ (مرتب)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے درمیان کیا فرق رکھا ہے جس کا یہ اثر ہے یا پھر شیطان سے پوچھنا چاہیے کہ تو اذان کی آواز سن کر بھاگ کیوں جاتا ہے اور نماز پڑھنے میں واپس کیوں آ جاتا ہے؟ مگر ایک بات میں بھی آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ حدیث میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے آیا وہ صحیح ہے یا نہیں؟ آپ کا خود اپنا تجربہ اس کی تصدیق کرتا ہے یا نہیں؟ دوسرے نماز پڑھنے والوں کے تجربات بھی اس کی تائید کرتے ہیں یا نہیں؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اذان کی آواز سن کر ہر نمازی مسلمان کا دل یکا یک ذکر الٰہی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اور یہ چند لمحے شیطانی وساوس سے خالی گزرتے ہیں۔ لیکن نماز پڑھنے میں طرح طرح کے خیالات آ کر اس کو گھیر لیتے ہیں، اور ایسی ایسی باتیں یاد آتی ہیں جو نماز شروع کرنے سے پہلے اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوتیں؟ اگر یہ واقعہ ہے اور آپ کا ذاتی تجربہ بھی اس کا شاہد ہے تو آپ اس کی تصدیق کو اس کی وجہ معلوم ہونے پر کیوں موقوف رکھتے ہیں؟ کیا واقعہ کو واقعہ تسلیم کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کو اس کی وجہ معلوم ہو جائے؟ اگر کسی واقعہ کی وجہ نہ معلوم ہو تو کیا آپ اس کے واقعہ ہونے سے انکار کر دیں گے؟ اگر آپ کے سر میں درد ہو اور اس کی وجہ سمجھ میں نہ آئے تو کیا آپ اپنے احساسِ درد کو جھٹلا دیں گے؟ یہ بات تو بالکل عقل عام (common sense) سے تعلق رکھتی ہے کہ واقعہ کو واقعہ ماننے کے لیے وجہ کا معلوم ہونا شرط نہیں ہے۔ آپ دنیا کے بہت سے واقعات کو تسلیم کرتے ہیں۔ درآں حالیکہ آپ کو ان کی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ پھر آخر یہ حجت طلبی مذہبی لٹریچر ہی کے ساتھ کیوں مخصوص ہو گئی ہے کہ اگر اس کے کسی بیان کی تائید تجربے اور مشاہدے سے بھی ہو جائے تو اسے ماننے کو دل نہیں چاہتا جب تک کہ اس کی وجہ معلوم نہ ہو جائے؟ اور اگر اس کی وجہ بھی معلوم ہو جائے تو پھر تصدیق میں یہ سوال مانع ہو جاتا ہے کہ جب اس خاص معاملے میں یہ واقعہ پیش آتا ہے تو ایک دوسرے معاملے میں بھی یہی واقعہ کیوں پیش نہیں آتا۔

آپ پوچھتے ہیں کہ کیا [اذان نماز] سے بہتر ہے یا نماز میں کوئی ایسی خرابی موجود ہے جس کے باعث حالتِ نماز میں شیطان کو تسلط کا موقع مل جاتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ شیطان کے بھاگنے اور واپس آ جانے سے نہ تو نماز پر اذان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور نہ نماز میں کسی خرابی کا موجود ہونا لازم آتا ہے۔ اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اذان اور نماز کی کیفیات میں فرق ہے۔ شیطان کے لیے ان دونوں میں جو کچھ فرق ہے اس کو ہم نہیں جان سکتے اور نہ وہ ہم کو بتایا گیا ہے۔ البتہ نفسِ انسانی کے لیے ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔ نفسیات کا ایک معمولی نکتہ ہے کہ جب کوئی آواز انسان کی توجہ کو دفعتاً اپنی طرف جذب کرتی ہے تو تھوڑی دیر کے لیے انسان کا نفس دوسرے مشاغل سے ہٹ کر اس کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ مگر جب انسان کسی کام میں زیادہ دیر تک مشغول رہتا ہے، تو بغیر خاص کوشش کے اس کو پوری جمعیتِ خاطر (concentration) حاصل نہیں ہوتی، اور خیالات ادھر ادھر بھٹکنے لگتے ہیں۔ عوام پر یہ حالت اکثر گزرتی ہے، کیونکہ وہ جمعیتِ خاطر اور کامل توجہ الی اللہ بہم پہنچانے پر کم قادر ہوتے ہیں لیکن خواص بھی اس پر خاص قدرت رکھنے کے باوجود کبھی کبھی بتقاضائے بشریت محض اضطراری طور پر انتشارِ خیال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اذان اور نماز کا یہ فرق دونوں کی کیفیتوں کے فرق پر مبنی ہے، نہ کہ خدا کی جناب میں ان کی مقبولیت اور ان کے مراتب کے فرق پر۔

(ترجمان القرآن، ج ۵، عدد ۲، شعبان ۱۳۵۳ھ، اکتوبر ۱۹۳۴ء، ص ۱۵۴-۱۵۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اذان پر کفار کا ردعمل

وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ○ (المائدۃ ۵:۵۸) جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور اس سے کھیلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔

اذان کی آواز سُن کر اُس کی نقلیں اتارتے ہیں، تمسخر کے لیے اس کے الفاظ بدلتے ہیں اور مسخ کرتے ہیں اور اس پر آوازے کستے ہیں۔ ان کی یہ حرکتیں محض بے عقلی کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ جہالت اور نادانی میں مبتلا نہ ہوتے تو مسلمانوں سے مذہبی اختلاف رکھنے کے باوجود ایسی خفیف حرکات ان سے سرزد نہ ہوتیں۔ آخر کون معقول آدمی یہ پسند کرسکتا ہے کہ جب کوئی گروہ خدا کی عبادت کے لیے منادی کرے تو اس کا مذاق اُڑایا جائے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۴۸۳، المائدۃ، حواشی ۸۹-۹۰)

اذانِ جمعہ کے بعد خرید وفروخت

إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (الجمعہ ۶۲:۹) جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعے کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو۔

نماز جمعہ کی دوسری اذان

جس اذان کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد وہ اذان ہے جو خطبے سے پہلے دی جاتی ہے، نہ کہ وہ اذان جو خطبے سے کافی دیر پہلے لوگوں کو یہ اطلاع دینے کے لیے دی جاتی ہے کہ جمعے کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ حدیث میں حضرت سائبؓ بن یزید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صرف ایک ہی اذان ہوتی تھی اور وہ امام کے منبر پر بیٹھنے کے بعد دی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی یہی عمل ہوتا رہا۔ پھر حضرت عثمانؓ کے دور میں جب آبادی بڑھ گئی تو انھوں نے پہلے ایک اور اذان دلوانی شروع کردی جو مدینے کے بازار میں ان کے مکان زَوراء پر دی جاتی تھی۔ (بخاری، ابوداؤد، نسائی، طبرانی)

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۹۴، الجمعہ، حاشیہ ۱۴)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جمعے کی ایک اذان ہوتی تھی، حضرت عثمانؓ نے ایک اور اذان رائج کی۔ یہ.......... ایک نیا کام تھا لیکن مدینہ کی آبادی بڑھ جانے کے بعد جمعے کے لیے لوگوں کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی اس لیے صحابہؓ نے اسے قبول کیا یہ بدعت مستحبہ تھی۔

(مکاتیبِ سید ابوالاعلیٰ مودودی، اوّل، جون ۱۹۷۰ء، ص ۷۸)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اذان میں شرک کا شائبہ

س: ایک مسلمان کو ماں کی گود میں جو اولین درس ملتا ہے وہ یہ ہے (کہ) اللہ ہی لائق عبادت ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں.......... پھر اذان بلاوا ہے خالصتاً اللہ کی عبادت کے لیے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں، تو اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ ھی اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے کیا معنی؟

ج: اذان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی شہادت دی جاتی ہے نہ کہ خدا ہونے کی۔ پھر آپ کے دل میں یہ شبہہ کیوں پیدا ہوا کہ رسالت کی شہادت دینے سے عبادت میں شرک واقع ہو جائے گا؟ رسالت کی شہادت تو اسی لیے دی جاتی ہے کہ ہم خدا کی عبادت اس عقیدے اور طریقے کے مطابق کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھایا ہے، ہم نے خود اپنی فکر سے یہ طریقہ اور عقیدہ ایجاد نہیں کر لیا ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۳۰۱-۳۰۴)

سیلاب یا کثرت بارش کے موقع پر اذان دینا

س: حالیہ بارشوں اور سیلاب کے دوران بعض لوگوں نے مکانوں کی چھتوں پر خوفِ خدا سے اذانیں دیں۔ ایسا کرنا کہاں تک جائز ہے۔ کیا یہ فعل مستحب ہے یا گناہ یا خلافِ شرع ہے؟

ج: سیلاب یا کثرتِ بارش یا کسی اور آفت کے موقع پر اذانیں دینا مسلمانوں میں رائج ہو گیا ہے۔ لیکن میرے علم کی حد تک یہ طریقہ کسی سند پر مبنی نہیں ہے، بلکہ غالباً لوگوں نے اسے اللہ تعالیٰ کو مدد کے لیے پکارنے کی ایک صورت سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اگر لوگ اسے مشروع سمجھ کر کریں تو غلط ہے، اور اگر محض اللہ سے فریاد کرکے اور اس کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی نیت سے کریں تو مباح ہے۔

(رسائل و مسائل، پنجم، اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۲۳۹-۲۴۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

نماز کی جماعت

نماز باجماعت کی اہمیت

..........نماز[گویا] دن میں پانچ وقت بگل بجاتی ہے تا کہ اللہ کے سپاہی اس کو سن کر ہر طرف سے دوڑے چلے آئیں اور ثابت کریں کہ وہ اللہ کے احکام کو ماننے کے لیے مستعد ہیں۔ جو مسلمان اس بگل کو سن کر بھی بیٹھا رہتا ہے اور اپنی جگہ سے نہیں ہلتا، وہ دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ یا تو فرض کو پہچانتا ہی نہیں یا اگر پہچانتا ہے تو وہ اتنا نالائق اور ناکارہ ہے کہ خدا کی فوج میں رہنے کے قابل نہیں۔

اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو لوگ اذان کی آواز سن کر اپنے گھروں سے نہیں نکلتے، میرا جی چاہتا ہے کہ جا کر ان کے گھروں میں آگ لگا دوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حدیث میں نماز کو کفر اور اسلام کے درمیان وجہ تمیز قرار دیا گیا ہے۔ عہد رسالت اور عہد صحابہؓ میں کوئی ایسا شخص مسلمان ہی نہ سمجھا جاتا تھا جو نماز کے لیے جماعت میں حاضر نہ ہوتا ہو۔ حتیٰ کہ منافقین بھی، جنھیں اس امر کی ضرورت ہوتی تھی کہ ان کو مسلمان سمجھا جائے، اس امر پر مجبور ہوتے تھے کہ نماز باجماعت میں شریک ہوں۔ چنانچہ قرآن میں جس چیز پر منافقین کو ملامت کی گئی ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ وہ نماز نہیں پڑھتے، بلکہ یہ ہے کہ بادلِ نخواستہ نہایت بددلی کے ساتھ نماز کے لیے اٹھتے ہیں: وَإِذَا قَامُوٓا۟ إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ قَامُوا۟ كُسَالَىٰ (النساء ۴: ۱۴۲)[جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں]۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں کسی ایسے شخص کے مسلمان سمجھے جانے کی گنجایش نہیں ہے جو نماز نہ پڑھتا ہو۔ اس لیے کہ اسلام محض ایک اعتقادی چیز نہیں ہے، بلکہ عملی چیز ہے، اور عملی چیز بھی ایسی کہ زندگی میں ہر وقت ہر لمحے ایک مسلمان کو اسلام پر عمل کرنے اور کفر و فسق سے لڑنے کی ضرورت ہے۔ ایسی زبردست عملی زندگی کے لیے لازم ہے کہ مسلمان خدا کے احکام بجالانے کے لیے ہر وقت مستعد ہو۔ جو شخص اس قسم کی مستعدی نہیں رکھتا وہ اسلام کے لیے قطعاً ناکارہ ہے۔ اسی لیے دن میں پانچ وقت نماز فرض کی گئی تا کہ جو لوگ مسلمان ہونے کے مدعی ہیں ان کا بار بار امتحان لیا جاتا رہے، کہ وہ فی الواقع مسلمان ہیں یا نہیں، اور فی الواقع اس عملی زندگی میں خدا کے احکام بجالانے کے لیے مستعد ہیں یا نہیں۔ اگر وہ خدائی پیریڈ کا بگل سن کر جنبش نہیں کرتے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام کی عملی زندگی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے بعد ان کا خدا کو ماننا اور رسول کو ماننا محض بے معنی ہے۔ اسی بنا پر قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى ٱلْخَـٰشِعِينَ (البقرہ ۲: ۴۵)[بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے، مگر فرماں بردار بندوں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے لیے مشکل نہیں ہے۔]

یعنی جو لوگ خدا کی اطاعت و بندگی کے لیے تیار نہیں ہیں صرف انھی پر نماز گراں گزرتی ہے اور جس پر نماز گراں گزرے وہ خود اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی و اطاعت کے لیے تیار نہیں ہے

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۲-۱۴۴)

س: شریعت میں نماز با جماعت کی کیا حیثیت ہے؟ یہ واجب ہے یا سنت مؤکدہ ہے یا واجب بالکفایہ یا سنت مؤکدہ بالکفایہ ہے؟ کن حالات یا عذرات میں اس کے وجوب یا تاکید کی سختی کم ہو جاتی ہے۔ جہاں مسجدیں کم اور دور دور ہیں لہٰذا اکثر لوگ گھروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ چاہیں تو تھوڑی سی زحمت گوارا کر کے مسجد میں پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن کوئی تو فاصلے کا عذر کرتا ہے، کوئی اندھیری رات کا، کوئی پانی اور کیچڑ اور راستے کی خرابی کا۔ کیا یہ عذر معقول ہیں؟ بعض لوگ ہیں جو اپنی دکانوں پر ہی نماز پڑھتے ہیں اور تنہا ہونے کا عذر پیش کرتے ہیں............

جواب: نماز کے بارے میں شرعی حکم یہی ہے کہ جہاں تک اذان کی آواز پہنچتی ہو وہاں کے لوگوں کو مسجد میں حاضر ہونا چاہیے۔ اِلّا یہ کہ کوئی عذر شرعی مانع ہو۔ عذر شرعی یہ ہے کہ آدمی بیمار ہو، یا اسے کوئی خطرہ لاحق ہو، یا کوئی ایسی چیز مانع ہو جس کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہو۔ بارش اور کیچڑ، پانی ایسے ہی موانع میں سے ہے۔ چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ اس حالت میں اذان کے ساتھ اَلَا صلوا فی رحالکم کی آواز لگا دیتے تھے تاکہ لوگ اذان سن کر اپنی اپنی جگہ ہی نماز پڑھ لیں۔

(رسائل و مسائل، چہارم، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۳۴۳-۳۴۹)

جماعت میں شمولیت کے آداب

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب نماز کھڑی ہو تو اس کی طرف سکون و وقار کے ساتھ چل کر آؤ۔ بھاگتے ہوئے نہ آؤ، پھر جتنی نماز بھی مل جائے، اس میں شامل ہو جاؤ اور جتنی چھوٹ جائے اسے بعد میں پورا کر لو۔ (صحاح ستہ)

حضرت ابو قتادہ انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضورؐ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے کہ یکایک لوگوں کے بھاگ بھاگ کر چلنے کی آواز آئی۔ نماز ختم کرنے کے بعد حضورؐ نے ان لوگوں سے پوچھا یہ کیسی آواز تھی؟ ان لوگوں نے عرض کیا: ہم نماز میں شامل ہونے کے لیے بھاگ کر آ رہے تھے۔ فرمایا: ایسا نہ کرو۔ نماز کے لیے جب بھی آؤ، پورے سکون کے ساتھ آؤ، جتنی مل جائے اس کو امام کے ساتھ پڑھ لو، جتنی چھوٹ جائے وہ بعد میں پوری کر لو۔ (بخاری، مسلم)

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۹۵، الجمعۃ، حاشیہ ۱۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صف بندی کا طریقہ

س: کیا نماز کی صف بندی میں پاؤں کی انگلیاں ملانا بھی ضروری ہے؟

ج: اس کا حدیث میں ذکر نہیں۔ البتہ حدیث میں کندھے سے کندھا اور ٹخنے سے ٹخنا ملانے کا ذکر ضرور آیا ہے۔ ملانے کا مطلب یہ نہیں کہ مس کرو بلکہ یہ ہے کہ قریب کرو، تاکہ صف میں سیدھ قائم ہو جائے۔ اگر انگلیوں کے مطابق صف سیدھی کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس میں کامیابی نہیں ہوگی۔ کیونکہ کسی کا پاؤں لمبا اور کسی کا چھوٹا ہوتا ہے۔ کوئی بالغ ہوگا اور کوئی بچہ۔ ان کی انگلیوں کے مطابق صف کیسے سیدھی ہوگی۔ قطار سیدھی کرنے کا وہی طریقہ صحیح ہے جو حدیث میں آیا ہے۔

(استفسارات، اول، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۶۲)

جماعت میں عورتوں کی شمولیت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں بالعموم صبح اور شام کی نماز میں آتی تھیں اور مردوں کے صفوں کی پیچھے نماز پڑھتی تھیں۔ جمعہ میں بھی ان کا آنا ثابت ہے، اور عیدین میں تو ان کو شریک ہونے کا حکم دیا جاتا تھا۔ نیز احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ عیدین میں مردوں کے سامنے خطبہ دینے کے بعد اس جگہ تشریف لے جاتے تھے جہاں عورتوں کا مجمع ہوتا تھا اور وہاں ان کے لیے الگ بھی ایک تقریر فرماتے تھے۔ یہ بھی معتبر روایات میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی میں عورتوں کے آنے جانے کے لیے دروازہ الگ کر دیا تھا اور ایک دفعہ ایک مرد کو عورتوں کے دروازے سے آتے یا جاتے دیکھ کر آپ نے مارا تھا۔ حضورؐ کی محفل میں عورتیں بھی آپ کے ارشادات سے مستفید ہونے اور مسائل پوچھنے کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ اور پردے کے پیچھے سے سوال کرتی تھیں۔ یہ سب روایات میں نے پردہ اور تفسیر سورۂ نور میں جمع کر دی ہیں۔ آپ انھیں دیکھ لیں۔ حضرت عمرؓ نے عورتوں کو شریک جماعت ہونے کو نہیں روکا تھا البتہ حضرت عائشہؓ نے آخر زمانے میں یہ دیکھ کر، کہ عورتیں خوشبو لگا کر اور زینت کے ساتھ آنے لگی ہیں، یہ فرمایا تھا کہ اگر حضورؐ کے زمانے میں یہ حرکت کی جاتی تو عورتوں کا مسجدوں میں آنا بند کر دیا جاتا۔

(مکتوباتِ سید ابو الاعلیٰ مودودی بنام حکیم محمد شریف مسلم، جنوری ۱۹۸۶ء، ص ۹۶)

خوشبو کی ممانعت

......حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لَا تَمْنَعُوْا اِمَآءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ وَلٰكِنْ لِيَخْرُجْنَ وَهُنَّ تَفِلَاتٌ۔ (ابو داؤد، احمد) اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو مگر وہ خوشبو لگا کر نہ آئیں۔ اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک عورت مسجد سے نکل کر جا رہی تھی کہ حضرت ابو ہریرہؓ اس کے پاس سے گزرے اور انھوں نے محسوس کیا کہ وہ خوشبو لگائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اسے روک کر پوچھا: اے خدائے جبار کی بندی! کیا تو مسجد سے آرہی ہے؟ اس نے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہا: ہاں۔ بولے: میں نے اپنے محبوب، ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو عورت مسجد میں خوشبو لگا کر آئے اس کی نماز اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک کہ وہ گھر جا کر غسل جنابت نہ کر لے۔(ابو داؤد، ابن ماجه، احمد، نسائی)

......نماز میں اگر امام بھول جائے تو مردوں کو حکم ہے کہ سبحان اللہ کہیں، مگر عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مار کر امام کو متنبہ کریں۔ اَلتَّسْبِيحُ لِلرِّجَالِ وَالتَّصْفِيْقُ لِلنِّسَآءِ (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجه)

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۹۳، النور، حاشیہ ۴۷)

گھر بہتر ہے

نبی صلی علیہ وسلم نے ....نماز با جماعت میں عورتوں کی شرکت نہ صرف یہ کہ لازم نہیں رکھی بلکہ اس کی اجازت ان الفاظ میں دی کہ اگر وہ آنا چاہیں تو انھیں روکو نہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ تصریح بھی فرما دی کہ ان کے لیے گھر کی نماز مسجد کی نماز سے افضل ہے۔ ابن عمرؓ اور ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لَا تَمْنَعُوْا اِمَآءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ ۔ (ابوداؤد) اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو۔ دوسری روایات ابن عمرؓ سے ان الفاظ اور ان سے ملتے جلتے الفاظ میں ہیں: اِئْذَنُوْا لِلنِّسَآءِ اِلَى الْمَسَاجِدِ بِاللَّيْلِ ۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد) عورتوں کو رات کے وقت مسجدوں میں آنے کی اجازت دو۔ اور ایک روایت ان الفاظ میں ہے: لَا تَمْنَعُوْا نِسَآءَ كُمُ الْمَسَاجِدَ وَ بُيُوْتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ۔ (احمد، ابوداؤد) اپنی عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روکو نہیں، اگر چہ اُن کے گھر اُن کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔

ام حمید ساعدیہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے آپؐ کے پیچھے نماز پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ فرمایا: تمھارا اپنے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں پڑھنے سے بہتر ہے اور تمھارا اپنے گھر میں نماز پڑھنا اپنے محلے کی مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے اور تمھارا اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا جامع مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے۔ (احمد طبرانی) قریب قریب اسی مضمون کی روایت ابو داؤد میں عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہیں، اور حضرت ام سلمہؓ کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں: خَيْرُ مَسَاجِدِ النِّسَآءِ قَعْرُ بُيُوْتِهِنَّ (احمد طبرانی) عورتوں کے لیے بہترین مسجدان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں۔ لیکن حضرت عائشہؓ دور بنی امیہ کی حالت دیکھ کر فرماتی ہیں: اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے جو اَب ہیں تو اُن کا مسجدوں میں آنا اُسی طرح بند فرما دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کا آنا بند کر دیا گیا تھا۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

مسجد نبوی میں حضورؐ نے عورتوں کے داخل ہونے کے لیے ایک الگ دروازہ مخصوص کر دیا تھا اور حضرت عمرؓ اپنے دور حکومت میں مردوں کو اس دروازے سے آنے جانے کی سخت ممانعت فرماتے تھے۔ (ابوداؤد، باب اعتزال النساء فی المساجد اور باب ماجاء فی خروج النساء الی المساجد) جماعت میں عورتوں کی صفیں مردوں سے پیچھے رکھی جاتی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تھیں۔ اور نماز کے خاتمے پر حضورؐ سلام پھیرنے کے بعد کچھ دیر توقف فرماتے تھے تاکہ مردوں کے اٹھنے سے پہلے عورتیں اٹھ کر چلی جائیں۔ (احمد و بخاری بروایت ام سلمہ) آپ کا ارشاد تھا کہ مردوں کی بہترین صف سب سے آگے کی صف ہے اور بدترین صف سب سے پیچھے (یعنی عورتوں سے قریب) کی صف۔ اور عورتوں کی بہترین صف سب سے پیچھے کی صف ہے اور بدترین صف سب سے آگے کی (یعنی مردوں سے قریب کی) صف ہے۔ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، احمد)

عیدین کی نماز میں عورتیں شریک ہوتی تھیں مگر ان کی جگہ مردوں سے الگ تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبے کے بعد عورتوں کی طرف جا کر ان کو الگ خطاب فرماتے تھے۔ (ابوداؤد بروایتِ جابر عبداللہ بخاری و مسلم بروایت ابن عباس) ایک مرتبہ مسجدِ نبوی کے باہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ راستے میں مرد اور عورت سب گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ اس پر آپ نے عورتوں سے فرمایا: اِسْتَأْخِرْنَ فَاِنَّهٗ لَيْسَ لَكُنَّ اَنْ تَحْقُقْنَ الطَّرِيْقَ، عَلَيْكُنَّ بِحَافَاتِ الطَّرِيْقِ۔ ٹھیر جاؤ، تمھارے لیے سڑک کے بیچ میں چلنا درست نہیں ہے، کنارے پر چلو۔ یہ ارشاد سنتے ہی عورتیں کنارے ہو کر دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ (ابوداؤد)

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۳۹۵-۳۹۶، النور، حاشیہ ۴۹)

عورتوں کی جماعت

س: عورتوں کی نماز با جماعت کا کیا طریقہ ہے کیا عورت عورتوں کی امامت کرا سکتی ہے؟

ج: عورت عورتوں کی امامت کرا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے اور اس کا طریقہ بتا دیا ہے۔ یعنی عورت امام صف کے درمیان کھڑی ہو۔

(استفسارات، اول، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۵۹)

نمازِ جمعہ میں شرکت

س: کیا عورتوں کا نمازِ جمعہ پڑھنا جائز ہے؟

ج: جی ہاں! اگر پردے کا انتظام ہو تو ان کا نمازِ جمعہ پڑھنا جائز ہے، لیکن فرض نہیں۔ عورت کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔

(استفسارات، اول، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۵۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

شرائطِ امامت

امامت کے شرائط و آداب

۱- **تقویٰ و پرہیز گاری:** حکم ہے کہ امام ایسے شخص کو بنایا جائے جو پرہیز گار ہو، علم میں زیادہ ہو، قرآن زیادہ جانتا ہو اور سن رسیدہ بھی ہو۔ حدیث میں ترتیب بھی بتادی گئی ہے کہ ان صفات میں کون سی صفت کس صفت پر مقدم ہے[۱]۔

۲- **اکثریت کی نمائندگی:** حکم ہے کہ امام ایسا شخص نہ ہو جس سے جماعت کی اکثریت ناراض ہو، یوں تھوڑے بہت مخالف کس کے نہیں ہوتے لیکن اگر جماعت میں زیادہ تر آدمی کسی شخص سے نفرت کرتے ہوں تو اسے امام نہ بنایا جائے[۲]۔

۳- **مقتدیوں کے ساتھ ہمدردی:** حکم ہے کہ جو شخص جماعت کا امام بنایا جائے وہ نماز ایسی پڑھائے کہ جماعت کے ضعیف ترین آدمی کو بھی تکلیف نہ ہو۔ محض جوان، مضبوط، تندرست اور فرصت والے آدمیوں کو ہی پیش نظر رکھ کر لمبی لمبی قراءت اور لمبے لمبے رکوع اور سجدے نہ کرنے لگے، بلکہ یہ بھی دیکھے کہ جماعت میں بوڑھے بھی ہیں، بیمار بھی ہیں، کمزور بھی ہیں اور ایسے مشغول بھی ہیں جو جلدی نماز پڑھ کر اپنے کام پر واپس جانا چاہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں یہاں تک رحم اور شفقت کا نمونہ پیش فرمایا ہے کہ نماز پڑھاتے میں کسی بچے کے رونے کی آواز آجاتی تو نماز مختصر کر دیتے تاکہ اگر بچے کی ماں جماعت میں شریک ہے تو اسے تکلیف نہ ہو یہ گویا سردار قوم کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ جب سردار بنایا جائے تو قوم کے اندر اس کا طرز عمل کیسا ہونا چاہیے۔

۴- **معذوری میں جگہ خالی کرنا:** حکم ہے کہ امام کو اگر نماز پڑھاتے میں کوئی حادثہ پیش آجائے جس کی وجہ سے وہ نماز پڑھانے کے قابل نہ رہے تو فوراً ہٹ جائے اور اپنی جگہ پیچھے کے آدمی کو کھڑا کر دے[۳]۔

۵- **امام کی کامل اطاعت:** حکم ہے کہ امام کے فعل کی سختی کے ساتھ پابندی کرو۔ اس کی حرکت سے پہلے حرکت کرنا سخت ممنوع ہے، یہاں تک کہ جو شخص امام سے پہلے رکوع یا سجدہ میں جائے اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ وہ گدھے کی صورت میں اٹھایا جائے گا[۱]۔

۱- یہیں سے یہ تعلیم بھی دے دی گئی کہ سردار قوم کے انتخاب میں کن باتوں کا لحاظ کرنا چاہیے۔ (مؤلف)

۲- یہاں پھر سردار قوم کے انتخاب کا ایک قاعدہ بتادیا گیا۔ (مؤلف)

۳- اس کے معنی یہ ہیں کہ سردار قوم کا بھی یہی فرض ہے جب وہ سرداری کے قابل اپنے آپ کو نہ پائے تو اسے خود ہٹ جانا چاہیے اور دوسرے اہل آدمی کے لیے جگہ خالی کر دینی چاہیے۔ اس میں نہ شرم کا کچھ کام ہے اور نہ خود غرضی کا۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۶- **غلطی پر تنبیہ:** امام اگر نماز میں غلطی کرے، مثلاً جہاں بیٹھنا تھا وہاں کھڑا ہو جائے اور جہاں کھڑا ہونا چاہیے تھا وہاں بیٹھ جائے تو حکم ہے کہ سبحان اللہ کہہ کر اسے غلطی پر متنبہ کر دو۔ سبحان اللہ کے معنی یہ ہیں: اللہ پاک ہے۔ امام کی غلطی پر سبحان اللہ کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ غلطی سے تو صرف اللہ ہی پاک ہے۔ تم انسان ہو، تم سے بھول چوک ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ طریقہ ہے امام کو ٹوکنے کا۔ اور جب اس طرح سے ٹوکا جائے تو اس کو لازم ہے کہ بلا کسی شرم ولحاظ کے اپنی غلطی کی اصلاح کرے۔ البتہ اگر ٹوکے جانے کے باوجود امام کو یقین ہو کہ اس نے صحیح فعل کیا ہے تو وہ اپنے یقین کے مطابق عمل کر سکتا ہے اور اس صورت میں جماعت کا کام یہ ہے کہ اس عمل کو غلط جاننے کے باوجود اس کا ساتھ دے۔ نماز ختم ہو جانے کے بعد مقتدی حق رکھتے ہیں کہ امام پر اس کی غلطی ثابت کریں اور نماز دوبارہ پڑھانے کا اس سے مطالبہ کریں۔

۷- **معصیت میں اطاعت نہیں:** امام کے ساتھ جماعت کا یہ برتاؤ صرف اُن حالات کے لیے ہے جب کہ غلطی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہو۔ لیکن اگر امام سنت نبوی کے خلاف نماز کی ترکیب بدل دے یا نماز میں قرآن کو جان بوجھ کر غلط پڑھے یا نماز پڑھاتے ہوئے کفر و شرک یا صریح گناہ کا ارتکاب کرے تو جماعت کا فرض ہے کہ اسی وقت نماز توڑ کر اس امام سے الگ ہو جائے[۲]۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۷-۱۶۹)

امام کی صفات

اسلام کے جتنے انسٹی ٹیوشن ہیں، ان میں سب سے اہم و اقدم مسجد ہے۔ جس کی کامیابی امام کی قابلیت پر منحصر ہے۔ مگر شاید سب سے زیادہ degeneration اسی انسٹی ٹیوشن میں ہوا ہے۔ اب امام کا مفہوم مسلمانوں کے ذہن میں یہ رہ گیا ہے کہ جو شخص کسی کام کے قابل نہ رہے وہ امامت کے قابل ہے اور اس کو امامت کرنی چاہیے۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ امام ہی کو سب سے زیادہ قابل ہونا چاہیے۔..........

[ائمہ کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے] سردست مجملاً اتنا عرض کرتا ہوں کہ اچھے تعلیم یافتہ اور عمدہ کیرکٹر کے اور کافی سن رسیدہ آدمیوں کا انتخاب کیجیے۔ مجرّدوں سے شادی شدہ آدمی زیادہ قابل ترجیح ہیں۔ سب سے زیادہ جو چیز ان کے ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے وہ امام کی صحیح حیثیت ہے۔

امام اپنی مسجد کے حلقۂ اثر میں اسلام کا نمائندہ ہے۔ اس کے اخلاق اور اس کی سیرت کو نہایت پاکیزہ ہونا چاہیے۔ ایک معمولی درجے کی دنائت یا ناشائستگی بھی اگر اس سے سرزد ہو تو غیروں کی نظر ہی میں نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی نظر میں بھی اسلام کی وقعت گر جاتی ہے، حتیٰ کہ لوگوں کے ایمان تک خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کو اپنی زندگی ایسی بنانی چاہیے کہ گویا وہ زندہ اور

۱- یہاں گویا قوم کو سبق دیا گیا ہے کہ اسے اپنے سردار کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے۔

۲- یہ سب ہدایتیں ایسی ہیں جن میں پوری تعلیم دے دی گئی ہے کہ تم کو اپنی قومی زندگی میں اپنے سردار کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چلتا پھرتا اسلام ہے۔ دلوں میں اس کی عزت اور محبت جاگزیں ہونی چاہیے اور اس کی شخصیت میں ایسی کشش ہونی چاہیے کہ وہ اپنی بستی کا مرکز بن جائے اور اپنی مقناطیسیت سے مسجد کو بھی اسلامی آبادی کا مرکز بنادے۔ امام کا خوش آواز ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ قرآن کو دلکش طریق سے پڑھ سکے۔ اس میں خطابت کی قابلیت بھی ضروری ہے تاکہ جمعہ کا خطبہ برجستہ دے سکے۔ اس کا مطالعہ کافی وسیع ہونا چاہیے۔ وہ نہ صرف احکامِ اسلامی سے خوب واقف ہو بلکہ عام معلومات بھی اسے حاصل ہوں اور ایک حد تک لیڈرشپ کی اچھی صلاحیتیں اس کے اندر موجود ہوں۔ فرقہ بندی میں اس کو غلو نہ ہو۔ اسے وسیع الخیال اور وقت و زمانہ کا مصلحت شناس ہونا چاہیے۔..........

(اقبال، دارالاسلام اور مودودی، (مجموعۂ مکتوبات، سید اسعد گیلانی) ۱۹۷۸ء، ص ۱۲۹-۱۳۰)

نابینا کے پیچھے نماز

نابینا کے پیچھے نماز کے مکروہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اسلام کے دورِ اوّل میں بکثرت صحابہ، تابعین اور علما و صلحا نابینا تھے اور اُن کے پیچھے لوگ نمازیں پڑھتے تھے۔

(مکتوبات سید ابوالاعلیٰ مودودی بنام حکیم محمد شریف مسلم، جنوری ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

نماز کی قضا

چھوڑے ہوئے فرائضِ شرعیہ کی قضا

س: ایک مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے: قضا نمازیں جلد سے جلد ادا کرنا لازم ہیں...... جب تک فرض ذمے پر باقی رہتا ہے کوئی نفل قبول نہیں کیا جاتا۔

اس اصول کی عقلی حیثیت کسی دلیل کی محتاج نہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ شریعت ہمارے کسی عقلی اصول کو تسلیم کرکے اس پر اپنے مسائل کی بنیاد رکھے۔ ادھر ہم مسلمانوں کی غالب اکثریت کا یہ حال ہے کہ ہر شخص پر ایک زمانہ تھوڑا یا بہت جاہلیت کا گزر چکا ہے جس میں نہ نماز کا خیال نہ روزے کی پروا، اس لیے قضا نمازوں کے لازم فی الذمہ ہونے سے بہت ہی کم لوگ خالی ہیں۔

اس مسئلے سے حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

کیا واقعی جب تک کوئی فرض نماز باقی فی الذمہ ہے نوافل (جن میں سنن رواتب بھی داخل ہیں) مقبول نہ ہوں گے؟ جو لوگ اس حالت میں (کہ قضا نمازیں ان کے ذمے باقی ہیں) ہر نماز کے ساتھ سنتیں اور نفلیں پڑھتے ہیں ان کی سنتوں اور نفلوں کا کیا ہوگا؟ کیا وہ ضائع جائیں گی یا قضا نمازوں میں محسوب ہوں گی؟

یہ اصول تو عام اور ہمہ گیر ہے یقیناً نمازوں کے ساتھ اس کی خصوصیت کی کوئی وجہ نہیں تو کیا روزوں اور دیگر فرائضِ شرعیہ میں بھی یہی اصول جاری ہے؟ خصوصیت کے ساتھ زکوٰۃ کے متعلق وضاحت فرمائیں۔ اکثر لوگوں کی یہ حالت ہے کہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے لیکن نفل صدقات دیتے رہتے ہیں۔ مثلاً کبھی کوئی چیز پکوا کر فقرا کو تقسیم کردی، کسی نیک کام میں چندہ دے دیا، سائلوں کو پیسے دے دیے۔ اسی طرح زمیندار اور کاشت کار حضرات عُشر ادا نہیں کرتے لیکن برداشتِ فصل کے موقع پر جمع شدہ سائلین کو کچھ دے دیتے ہیں اور سارا سال گداگروں کو ان کے گھر والوں کی طرف سے مٹھی آٹا اور غلہ دیا جاتا رہتا ہے۔ اس طرح دیتے وقت نہ ان کی نیت عشر اور زکوٰۃ کی ہوتی ہے نہ انھوں نے عشر اور زکوٰۃ کا کوئی حساب کر رکھا ہوتا ہے۔ اس طرح کے اخراجات کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا وہ سب دیا دلایا ضائع جا رہا ہے یا عند اللہ عشر اور زکوٰۃ میں محسوب ہو رہا ہے۔

اس اصول پر (کہ جب تک فرض ذمہ پر باقی رہتا ہے کوئی نفل قبول نہیں کیا جاتا) دلیل کی حیثیت سے جو اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (فاطر ۳۵:۱۰) کا ذکر کیا جاتا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے؟ کیا کسی حدیث میں عمل صالح کی تفسیر فرائض اور الکلم الطیب کی نفلی اذکار کے ساتھ وارد ہوئی ہے؟

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

ج: آپ کے تمام سوالات جس وجہ سے پیدا ہوئے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ایک صحیح مسئلہ ذرا غلط طریقے سے بیان کر دیا گیا ہے۔ کسی عمل کا قبول کرنا یا نہ کرنا انسانوں کے اختیار میں نہیں ہے، خداوند عالم کے اختیار میں ہے۔ اگر کسی کے ذمے فرضوں کی قضا لازم ہو اور فرض کی قضا ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اخلاص کی بنا پر وہ سنن ونوافل بھی ادا کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے اس خلوص کو رد فرما دے۔ ہاں، اگر فرض کی قضا سے غافل رہ کر یہ کام کرے تو امید نہیں ہے کہ یہ فعل اللہ کے ہاں مقبول ہوگا، کیونکہ فرض کی قضا بمنزلہ قرض ہے، اور قرض ادا کرنے سے غفلت برت کر خیرات کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

البتہ جن لوگوں نے اپنی زندگی میں ایک زمانہ حالتِ جاہلیت میں گزار دیا ہو اور اس میں بے شمار نمازیں چھوڑ دی ہوں، ان کے لیے پچھلی قضا بھی ادا کرنا اور سنن ونوافل بھی پڑھنا مشکل ہے۔ اس میں اندیشہ ہے کہ اکثر کسل کی بنا پر وہ قضا ادا کرنے سے رہ جائیں گے۔ اس کے برعکس اس میں بڑی سہولت ہے کہ ہر وقت کی فرض نماز کے ساتھ جتنی سنتیں بالعموم پڑھی جاتی ہیں ان کو سنت کی نیت سے پڑھنے کے بجائے آدمی پچھلے چھوٹے ہوئے فرائض کی قضا کے طور پر پڑھتا رہے یہاں تک کہ اس امر کا گمان غالب ہو جائے کہ پچھلی سب قضائیں ادا ہو چکی ہیں۔ اس طرح آدمی بغیر کسی دقت کے بآسانی اس فرض سے سبکدوش ہوسکتا ہے۔

آپ پڑھی ہوئی نمازوں کے ضائع ہونے یا نہ ہونے کا قصہ چھوڑیں اب جب کہ مسئلہ آپ کو معلوم ہو گیا ہے تو آئندہ تمام سنتیں اور نوافل پچھلے چھوٹے ہوئے فرضوں کی نیت کر کے پڑھنا شروع کر دیں۔

چھوٹی ہوئی نمازوں ہی کی طرح قضا روزوں کا معاملہ بھی ہے جس کے فرض روزے چھوٹ گئے ہوں وہ نفل روزے رکھنے کے بجائے فرض کی نیت سے پچھلی قضا کیوں نہ ادا کرے۔

یہی معاملہ زکوٰۃ کا بھی ہے۔ آپ خود سوچیے، آخر یہ کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ جس کے ذمے فرض زکوٰۃ واجب ہو وہ اسے تو ادا نہ کرے اور یوں خیرات کرتا پھرے۔ آخر کیوں نہیں وہ اسی خیرات کو زکوٰۃ کا حساب لگا کر ادا کرتا؟ ضائع کرنے یا قبول کر لینے کے اختیارات تو اللہ کو ہیں، مگر جو بات ہماری اور آپ کی عقل میں آجاتی ہے کہ فریضے سے غفلت برت کر نوافل ادا کرنے میں کوئی معقولیت نہیں ہے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اللہ میاں کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہ آئے گی؟ اگر وہ پوچھیں کہ جو کچھ میں نے لازم کیا تھا وہ تو تو نے ادا نہیں کیا اور اپنی خوشی سے یہ سب کچھ دے آیا تو آخر کسی کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟

آپ نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس کے متعلق میرے علم میں کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں ہے جس میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ الکلم الطیب سے مراد نفلی اذکار اور عمل صالح سے مراد فرائض ہیں۔ جن صاحب نے یہ استدلال پیش کیا ہے، آپ انھی سے دریافت کریں۔ ممکن ہے کہ ان کے علم میں ایسی کوئی حدیث ہو۔ البتہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر ہے کہ الکلم الطیب سے مراد اللہ کا ذکر ہے اور عمل صالح سے مراد فرائض ہیں۔ اور یہ بھی انھی کی رائے ہے کہ جو فرائض ادا کرے اس کا عمل اس کے ذکر اللہ کو لے کر اوپر صعود کرے گا، مگر جو محض ذکر کرے اور فرائض ادا نہ کرے اس کا ذکر رد کر دیا جائے گا۔

(رسائل و مسائل، سوم، جون ۱۹۶۷ء، ص ۲۷۸-۲۸۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مزید بحث

س: [فروری ۱۹۵۹ء] کے ترجمان القرآن کے رسائل ومسائل میں ایک سوال کے جواب میں چھوٹی ہوئی نمازوں اور دیگر فرائضِ شرعیہ کی قضا کے بارے میں آپ نے لکھا ہے: ان کی قضا کا آسان طریقہ یہ ہے کہ فرض نمازوں کے بعد جو سنتیں عموماً پڑھی جاتی ہیں انھیں چھوٹے ہوئے فرضوں کی قضا کی نیت کر کے پڑھا جائے تو اس طرح آسانی سے آدمی اس قرض سے سبکدوش ہوسکتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فی الواقع اس طرح سے چھوٹے ہوئے فرائض کی قضا لازماً ہر اس شخص کو دینی پڑے گی جس نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ جاہلیت کی حالت میں گزارا ہے؟ ظاہر ہے کہ سائل کا منشا اُن فرائضِ شرعیہ کی قضا کے متعلق تو دریافت کرنے کا نہیں ہے جو کسی شرعی عذر کی بنا پر آدمی سے چھوٹ جاتے ہیں بلکہ ان فرائض سے ہے جن سے وہ دیدہ دانستہ اور محض بے عملی کی وجہ سے ایک مدت (پانچ، دس، بیس، تیس سال) تک غفلت اور بے پروائی برتتا رہا ہے۔ اب اگر وہ پورے عزم و استقلال کے ساتھ اپنی سابقہ زندگی سے تائب ہوکر آیندہ اپنی زندگی کو شریعت کے مطابق بسر کرنے کا عہد کرتا ہے اور فرائضِ شرعیہ کی پوری پوری پابندی کرتا ہے تو کیا سابقہ زندگی کے متروکہ فرائض کی قضا بھی اسے لازماً دینی ہوگی؟ کیا توبہ اس کے سابقہ گناہوں کی تلافی نہیں کر سکے گی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر توبہ کا مصرف کیا ہے؟ سورۂ مریم کی اس آیت سے تو صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۙ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ[1] (مریم۱۹: ۵۹-۶۰) یہی نہیں بلکہ قرآن پاک کی اکثر دوسری آیات اور احادیث نبویہؐ سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ ان آیات واحادیث کی روشنی میں آپ کے ارشادات کی کیا توجیہ ہوگی؟

آپ نے ان فرائضِ شرعیہ کی قضا کے متعلق جو طریقہ تجویز کیا ہے اگر انسان اس پر عمل کرنا چاہے تو اس میں بھی کئی طرح کی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ سنتیں پڑھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فرضوں کی بجا آوری میں آدمی سے جو کوتاہیاں ہوجاتی ہیں ان کی تلافی سنتیں اور نوافل پوری کر سکیں۔ اب اگر سابقہ زندگی کی چھوٹی ہوئی فرض نمازوں کی قضا دیتے ہوئے سنتیں اور نوافل پڑھنے کا موقع آدمی نہ پا سکے تو اس کی تمام نمازیں ادھوری رہ جائیں گی، یہی معاملہ روزوں اور زکوٰۃ وغیرہ کا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص نے بلوغت کے بعد اپنی عمر کے بیس پچیس سال حالتِ جاہلیت میں گزارے ہیں وہ اگر آپ کے تجویز کردہ طریقے کے مطابق ان کی قضا دینا بھی چاہے تو نہ وہ اس سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہوسکتا ہے اور نہ وہ اس پر مطمئن ہی ہوسکے گا۔

۱- ترجمہ: پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی، پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں۔ البتہ جو توبہ کریں اور ایمان لے آئیں اور نیک عملی اختیار کرلیں وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہیں ہوگی۔ (مرتب)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کی بقیہ زندگی کتنی رہ گئی ہے؟

میرے خیال میں اس مسئلے کا تعلق قریب قریب ہر مسلمان سے ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کے پیش نظر عوام تو ایک طرف رہے، بڑے بڑے دین دار گھرانوں کی نئی نسلیں بھی اسی بے عملی میں مبتلا ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اپنی زندگی اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا عزم کرے تو آپ کے اس جواب سے اس پر بددلی اور مایوسی طاری ہو سکتی ہے۔ براہ کرام اس کی مزید وضاحت فرما کر مشکور فرما دیں۔

ج: پہلے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ پہلے میں خود بھی یہی خیال رکھتا تھا کہ جاہلیت کی حالت میں جو نمازیں قصداً یا غفلت سے چھوڑی گئی ہیں ان کے لیے صرف توبہ کافی ہے اور ان کی قضا واجب نہیں۔ لیکن تحقیق کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر آدمی کافر نہ تھا، صرف جہالت اور غفلت کی بنا پر تارکِ نماز رہا، تو اس کے لیے صرف توبہ کافی نہیں بلکہ پچھلی نمازوں کی قضا بھی کرنی چاہیے۔ ابن تیمیہؒ نے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے یہ اصولی بات بیان کی ہے کہ توبہ کے ساتھ سابق کی تلافی اور آئندہ کے لیے اصلاح دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی گناہ ایسا ہو جس کی تلافی کے امکانات ہی نہ ہوں تو بات دوسری ہے۔ اس صورت میں توبہ اور ندامت و شرمساری کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن جن گناہوں کی تلافی ممکن ہو ان پر توبہ کے ساتھ تلافی کیے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ مثلاً کسی کا قرض آپ کے ذمے تھا اور آپ نے مدتوں اسے ادا نہ کیا، تو اب اس گناہ کی معافی صرف توبہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ وہ قرض ادا کرنا بھی اس کے ساتھ ناگزیر ہے۔

رہا یہ سوال کہ سنتیں فرائض کے نقائص میں جو جبر کسر کا کام کرتی ہیں، یہ تو قضائے فوائت کی صورت میں نہ ہو سکے گا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ قضائے فوائت کا ثواب ان شاء اللہ یہ کسر پوری کر دے گا۔ آدمی کا پچھلے گناہ پر نادم ہو کر اس کی تلافی کے لیے کوشش کرنا اپنے اندر ایک زائد ثواب رکھتا ہے۔

بقیہ عمر کتنی رہ گئی ہے، اس کی تو آدمی کو خبر نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس وقت بھی آدمی تلافی مافات شروع کر دے اللہ تعالیٰ اس کی قدر فرمائے گا۔ اور اگر تمام مافات کی تلافی کرنے سے پہلے اس کی اجل آ جائے تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں اس کی یہ کوشش اتنی مقبول ہو گی کہ اللہ تعالیٰ خود ہی اس کے مافات کو معاف فرما دے گا۔

(رسائل و مسائل، سوم، جون ۱۹۶۷ء، ص ۲۸۲-۲۸۸)

یہ بات بھی سخت حیرت انگیز ہے کہ لوگ نماز کی قضا کے قائل نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ چیز بکثرت احادیث سے ثابت ہے اور تمام فقہائے اسلام بالاتفاق اس کے قائل ہیں۔ پوری اسلامی تاریخ میں کوئی ایک قابلِ ذکر فقیہ بھی اس کا قائل نہیں ہوا ہے کہ روزے کی قضا تو واجب ہے مگر نماز کی قضا واجب نہیں۔ بخاری، مسلم، نسائی، ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی اور مسند احمد میں متعدد احادیث حضرت انسؓ، ابو ہریرہؓ اور ابو قتادہؓ انصاری سے مروی ہیں، جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نماز کو انسان بھول جائے یا سوتا رہ جائے اور نماز کا وقت نکل گیا ہو تو جس وقت بھی اسے یاد آئے یا وہ بیدار ہو اسے وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چھوٹی ہوئی نماز پڑھ لینی چاہیے۔

یہ تو ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قولی حکم۔ رہا آپؐ کا اپنا فعل، تو ابو سعید خدریؓ، جابر عبداللہؓ اور عمران بن حصین سے متعدد واقعات مسند احمد، بخاری، مسلم اور نسائی میں منقول ہیں، جن میں وہ بتاتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے چھوٹی ہوئی نمازیں ادا کی ہیں۔ ایک سفر میں رات بھر چل کر آخر وقت میں قافلے نے پڑاؤ کیا اور اترتے ہی سب پر نیند غالب ہوگئی۔ یہاں تک کہ جب سورج نکل آیا تو اس کی گرمی سے لوگ بیدار ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اذان دلوائی اور جماعت کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی۔ غزوۂ خندق میں ایک روز عصر کی نماز قضا ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے وقت ادا کی۔ اور ایک دن اسی غزوہ میں ظہر، عصر، اور مغرب کی نمازیں قضا ہوئیں اور ایسے وقت یہ تینوں نمازیں ادا کی گئیں جب کہ عشا کا وقت شروع ہو رہا تھا۔[1]

(رسائل و مسائل، سوم، جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۲۵-۳۲۶)

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، سوم، اکتوبر ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۱-۱۸۳۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل پنجم

نمازِ قصر

نماز قصر، حالتِ امن و جنگ میں

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ⁂ (النساء ۴:۱۰۱) اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کر دو۔

زمانہ امن کے سفر میں قصر یہ ہے کہ جن اوقات کی نماز میں چار رکعتیں فرض ہیں ان میں دو رکعتیں پڑھی جائیں۔ اور حالتِ جنگ میں قصر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جنگی حالات جس طرح بھی اجازت دیں، نماز پڑھی جائے۔ جماعت کا موقع ہو تو جماعت سے پڑھو ورنہ فرداً فرداً ہی سہی۔ قبلہ رُخ نہ ہو سکتے ہو تو جدھر بھی رخ ہو، سواری پر بیٹھے ہوئے اور چلتے ہوئے بھی پڑھ سکتے ہو۔ رکوع و سجدہ ممکن نہ ہو تو اشارہ ہی سے سہی۔ ضرورت پڑے تو نماز ہی کی حالت میں چل بھی سکتے ہو۔ کپڑوں کو خون لگا ہوا ہو تب بھی مضائقہ نہیں۔ ان سب آسانیوں کے باوجود اگر ایسی پر خطر حالت ہو کہ کسی طرح نماز نہ پڑھی جا سکے تو مجبوراً مؤخر کی جائے جیسے جنگ خندق کے موقع پر ہوا۔[1]

سفر میں سنتوں کی ادائیگی

اس امر میں اختلاف ہے کہ سفر میں صرف فرض پڑھے جائیں یا سنتیں بھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ آپ سفر میں فجر کی سنتوں اور عشا کے وتر کا تو التزام فرماتے تھے مگر باقی اوقات میں صرف فرض پڑھتے تھے، سنتیں پڑھنے کا التزام آپ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ نفل نمازوں کا جب موقع ملتا تھا پڑھ لیا کرتے تھے، حتیٰ کہ سواری پر بیٹھے ہوئے بھی پڑھتے رہتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے لوگوں کو سفر میں فجر کے سوا دوسرے اوقات کی سنتیں پڑھنے سے منع کیا ہے۔[2] مگر اکثر علما ترک اور فعل دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں اور اسے بندے کے اختیار پر چھوڑ دیتے ہیں۔ حنفیہ کا مختار مذہب یہ ہے کہ مسافر جب راستہ طے کر رہا ہو تو سنتیں نہ پڑھنا افضل ہے اور جب کسی مقام پر منزل کرے اور اطمینان حاصل ہو تو پڑھنا افضل ہے۔

۱- تفہیم الاحادیث، سوم، اکتوبر ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۱-۱۸۳۔

۲- تفہیم الاحادیث، سوم، اکتوبر ۱۹۹۷ء، ص ۲۰۱-۲۰۵۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سفرِ قصر کے لیے فی سبیل اللہ کی شرط

جس سفر میں قصر کیا جاسکتا ہے اس کے لیے بعض ائمہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ فی سبیل اللہ ہونا چاہیے، جیسے جہاد، حج، عمرہ، طلبِ علم وغیرہ۔ ابن عمرؓ، ابن مسعودؓ اور عطا کا یہی فتویٰ ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ سفر کسی ایسے مقصد کے لیے ہونا چاہیے جو شرعاً جائز ہو، حرام و ناجائز اغراض کے لیے جو سفر کیا جائے اس میں قصر کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ قصر ہر سفر میں کیا جاسکتا ہے، رہی سفر کی نوعیت، تو وہ بجائے خود ثواب یا عتاب کی مستحق ہوسکتی ہے، مگر قصر کی اجازت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ کا مفہوم

بعض ائمہ نے 'مضائقہ نہیں' [فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ] کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ سفر میں قصر کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ محض اس کی اجازت ہے۔ آدمی چاہے تو اس سے فائدہ اُٹھائے ورنہ پوری نماز پڑھے۔ یہی رائے امام شافعیؒ نے اختیار کی ہے، اگرچہ وہ قصر کرنے کو افضل اور ترکِ قصر کو ترک اولیٰ قرار دیتے ہیں۔ امام احمدؒ کے نزدیک قصر کرنا واجب تو نہیں ہے مگر نہ کرنا مکروہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قصر کرنا واجب ہے اور یہی رائے ایک روایت میں امام مالکؒ سے بھی منقول ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سفر میں قصر کیا ہے اور کسی معتبر روایت میں یہ منقول نہیں ہے کہ آپؐ نے کبھی سفر میں چار رکعتیں پڑھی ہوں۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کے ساتھ سفروں میں رہا ہوں اور کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے قصر نہ کیا ہو[1]۔ اسی کی تائید میں ابن عباس اور دوسرے متعدد صحابہؓ سے بھی مستند روایات منقول ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے جب حج کے موقع پر منیٰ میں چار رکعتیں پڑھائیں تو صحابہ نے اس پر اعتراض کیا اور حضرت عثمانؓ نے یہ جواب دے کر لوگوں کو مطمئن کیا کہ میں نے مکہ میں شادی کر لی ہے، اور چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں متاہِل ہوا ہو وہ گویا اس شہر کا باشندہ ہے، اس لیے میں نے یہاں قصر نہیں کیا۔ ان کثیر روایات کے خلاف دو روایتیں حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قصر اور اتمام دونوں درست ہیں، لیکن یہ روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے علاوہ خود حضرت عائشہؓ ہی کے ثابت شدہ مسلک کے خلاف ہیں[2]۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ایک حالت بین السفر والحضر بھی ہوتی ہے جس میں ایک ہی عارضی فرودگاہ پر حسبِ موقع کبھی قصر اور کبھی اتمام دونوں کیے جاسکتے ہیں، اور غالباً حضرت عائشہؓ نے اسی حالت کے متعلق فرمایا ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں قصر بھی کیا اور اتمام بھی۔ رہے قرآن کے یہ الفاظ کہ 'مضائقہ نہیں اگر قصر کرو' تو ان کی نظیر سورۂ بقرہ رکوع ۱۹ [۲: ۱۵۸] میں گزر چکی ہے جہاں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کے متعلق بھی یہی الفاظ فرمائے گئے ہیں، حالانکہ یہ سعی مناسک حج میں سے ہے اور واجب ہے۔ دراصل دونوں جگہ یہ کہنے کا مقصد لوگوں

۱- ملاحظہ ہو: مرجع سابق

۲- ایضاً۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے اس اندیشے کو دور کرنا ہے کہ ایسا کرنے سے کہیں کوئی گناہ تو لازم نہیں آئے گا یا ثواب میں کمی تو نہ ہوگی۔

نماز قصر اور مقدارِ سفر

مقدارِ سفر جس میں قصر کیا جا سکتا ہے، ظاہریہ کے نزدیک کچھ نہیں ہے، ہر سفر میں قصر کیا جا سکتا ہے خواہ کم ہو یا زیادہ۔ امام مالکؒ کے نزدیک ۴۸ میل یا ایک دن رات سے کم کے سفر میں قصر نہیں ہے۔ یہی رائے امام احمدؒ کی ہے۔ ابن عباسؓ کا بھی یہی مسلک ہے اور امام شافعیؒ سے بھی ایک قول اس کی تائید میں مروی ہے۔ حضرت انسؓ ۱۵ میل کے سفر میں قصر کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ امام اوزاعی اور امام زُہری حضرت عمرؓ کی اس رائے کو لیتے ہیں کہ ایک دن کا سفر قصر کے لیے کافی ہے۔ حسن بصری دو دن، امام ابو یوسفؒ دو دن سے زیادہ کی مسافت میں قصر جائز سمجھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس سفر میں پیدل یا اونٹ کی سواری کے تین دن صرف ہوں (یعنی تقریباً ۱۸ فرسنگ یا ۵۴ میل) اس میں قصر کیا جا سکتا ہے۔ یہی رائے ابن عمر، ابن مسعود اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۸۹-۳۹۰، النساء، حاشیہ ۱۳۲)

س (الف): قصرِ صلوٰۃ انگریزی میلوں کے حساب کتنے لمبے سفر میں واجب ہے؟

(ب): کیا یہ فاصلہ یک طرفہ سفر کے لیے ہے یا آمد و رفت کی دوہری مسافت بھی شمار ہوگی؟

(ج): کیا ایک مقررہ حلقے میں سفر کرنے پر بھی یہ رعایت حاصل ہوگی؟

جواب (الف): فقہا کی آرا اس معاملے میں مختلف ہیں۔ چنانچہ قصر صلوٰۃ کے لیے کم از کم ۹ میل اور زیادہ سے زیادہ ۴۸ میل کا نصاب مقرر کیا گیا ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملے میں کوئی صریح ارشاد منقول نہیں ہے، اور نصِ صریح کی غیر موجودگی میں جن دلائل سے استنباط کیا گیا ہے، ان کے اندر مختلف اقوال کی گنجایش ہے۔ صحیح یہ ہے کہ قصر کے لیے مسافت کا ایسا تعین جس میں ایک نقطۂ خاص سے تجاوز کرتے ہی قصر کا حکم لگایا جا سکے شارعؑ کا منشا نہیں ہے۔ شارعؑ نے 'سفر' کے مفہوم کو عرف عام پر چھوڑ دیا ہے اور یہ بات ہر شخص خود بآسانی جان سکتا ہے کہ کب وہ سفر میں ہے اور کب سفر میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اگر شہر سے تفریح کے لیے نکلتے ہیں یا گاؤں سے خرید و فروخت کے لیے شہر جاتے ہیں تو کبھی مسافر ہونے کا احساس ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے جب واقعتاً سفر درپیش ہوتا ہے تو ہم مسافرت کی کیفیت خود محسوس کرتے ہیں۔ اسی احساس کے مطابق قصر اور اتمام کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ شرعی معاملات میں صرف اس شخص کا فتوائے قلب معتبر ہے جو شریعت کی پابندی کا ارادہ رکھتا ہو، نہ کہ بہانے بازی کا۔

(ب): اس حصے کا جواب اوپر ہی کی سطور میں موجود ہے۔ ویسے جن فقہا نے مقدارِ سفر مقرر کرنے کی کوشش کی ہے ان کے پیشِ نظر یک طرفہ مسافت تھی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(ج): ہاں، مقررہ حلقے میں سفر کرنے کی کوشش میں بھی قصر صلوٰۃ کرنا چاہیے جس طرح اس حلقے سے باہر کے سفروں کے دوران میں۔

(رسائل و مسائل، اول، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۳-۱۷۴)

عارضی قیام، اور قصر کا مسئلہ

اثنائے سفر میں دورانِ قیام جس میں قصر کیا جا سکتا ہے مختلف ائمہ کے نزدیک مختلف ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک جہاں آدمی نے چار دن ٹھیرنے کا ارادہ کر لیا ہو وہاں پوری نماز پڑھنی ہوگی۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک جہاں چار دن سے زیادہ قیام کا ارادہ ہو وہاں قصر جائز نہیں۔ امام اوزاعیؒ ۱۳ دن اور امام ابوحنیفہ ۱۵ دن یا اس سے زیادہ کی نیتِ قیام پر پوری نماز ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۹۰، النساء، حاشیہ ۱۳۲)

نمازِ قصر کے لیے مدتِ سفر

مسافر کے معاملے میں امام شافعیؒ، امام احمد، اور ایک روایت کی رو سے امام مالکؒ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ جو شخص کسی مقام پر چار دن یا اس سے زیادہ ٹھیرنے کا ارادہ رکھتا ہو اسے پوری نماز پڑھنی چاہیے۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کا مسلک یہ ہے کہ دس دن یا اس سے زیادہ ٹھیرنے کی نیت مسافر کو مقیم بنا دیتی ہے۔ امام اوزاعیؒ بارہ دن کی اور امام ابوحنیفہؒ پندرہ دن کی حد مقرر کرتے ہیں۔ علمائے اسلام میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ اپنے شہر سے باہر نکل کر کسی دوسرے مقام پر کوئی شخص چاہے مہینوں اور برسوں رہے مگر وہ مسافر ہی رہے گا اور قصر کرتا رہے گا۔ البتہ فقہا یہ ضرور کہتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی کسی مقام پر اس طرح رُکا ہوا ہو کہ ہر وقت اس کے کوچ کر جانے کا امکان ہو اور ٹھیرنے کی نیت نہ ہو، تو خواہ وہاں اُسے مہینوں رُکا رہ جانا پڑے، وہ قصر کر سکتا ہے۔ انھی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں پندرہ دن اور فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں اٹھارہ دن قصر فرمایا[1] (مسند احمد و ابو داؤد) اور انھی وجوہ سے صحابہ کرام کا لشکر آذربائیجان کی مہم میں دو مہینے قصر کرتا رہا۔[2] (مسند احمد)

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۳۲۴-۳۲۵)

تردد اور قید کی حالت میں نمازِ قصر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کوئی صریح حکم مروی نہیں ہے۔ اور اگر کسی جگہ آدمی مجبوراً رُکا ہوا ہو اور ہر وقت یہ

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، سوم، اکتوبر ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۸۔

۲- ایضاً، ص ۱۹۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خیال ہو کہ مجبوری دور ہوتے ہی وطن واپس ہو جائے گا تو تمام علما کا اتفاق ہے کہ ایسی جگہ بلا تعین مدت قصر کیا جاتا رہے گا۔ صحابہ کرامؓ سے بکثرت مثالیں ایسی منقول ہیں کہ انھوں نے ایسے حالات میں دو دو سال مسلسل قصر کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل اسی پر قیاس کر کے قیدی کو بھی اس کے پورے زمانہ قید میں قصر کی اجازت دیتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۸۸-۳۹۰، النساء، حاشیہ ۱۳۲)

حالتِ امن میں قصر قرآن کے خلاف نہیں

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۭ (النساء ۴:۱۰۱) اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کر دو (خصوصاً) جبکہ تمھیں اندیشہ ہو کہ کافر تمھیں ستائیں گے۔

ظاہریوں اور خارجیوں نے اس فقرے کا یہ مطلب لیا ہے کہ قصر صرف حالتِ جنگ کے لیے ہے اور حالت امن کے سفر میں قصر کرنا قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن حدیث میں مستند روایت سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب یہی شبہہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صَدَقَۃٌ تَصَدَّقَ اللّٰہُ بِھَا عَلَیْکُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَہٗ۔[1] یہ قصر کی اجازت ایک انعام ہے جو اللہ نے تمھیں بخشا ہے، لہٰذا اس کے انعام کو قبول کرو۔

یہ بات قریب قریب تواتر سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امن اور خوف دونوں حالتوں کے سفر میں قصر فرمایا ہے۔ ابن عباس تصریح کرتے ہیں کہ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَرَجَ مِنَ الْمَدِیْنَۃِ اِلٰی مَکَّۃَ لَا یَخَافُ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ فَصَلّٰی رَکْعَتَیْنِ۔[2] (ترمذی، نسائی، بیہقی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے مکہ تشریف لے گئے اور اس وقت رب العٰلمین کے سوا کسی کا خوف نہ تھا، مگر آپؐ نے دو ہی رکعتیں پڑھیں۔ اسی بنا پر میں نے ترجمہ میں خصوصاً کا لفظ قوسین میں بڑھا دیا ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۳۹۰، النساء، حاشیہ ۱۳۳)

س: صلوٰۃ قصر کے بارے میں قرآن وضاحت کرتا ہے کہ صرف پُر خطر سفرِ جہاد میں ہی نماز میں قصر کیا جا سکتا ہے کیا عام پُر امن سفر میں قصر خلاف قرآن نہیں ہے؟

ج: قرآن کے منشا کی تعبیر میں قرآن لانے والے رسول کی توضیح و تشریح کو نظر انداز کر دینا ایک بہت بڑی اصولی غلطی ہے......... قرآن صرف حالتِ خوف میں قصر کی صورت بتاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس حالت میں امام کے سوا دوسروں کے لیے صرف ایک رکعت بھی کفایت کرتی ہے۔ اس حکم میں کہیں حالتِ امن کے قصر کی نفی نہیں ہے۔ یہ دوسرا حکم ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، سوم، اکتوبر ۱۹۹۷ء، ص ۱۹۸۔

۲- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، سوم، اکتوبر ۱۹۹۷ء، ص ۱۹۹۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے ذریعے سے پہنچا ہے اور وہ یہ ہے کہ سفر کی حالت میں صبح اور مغرب کے فرض تو پورے پڑھے جائیں، البتہ ظہر، عصر اور عشا کے فرضوں میں صرف دو دو رکعتیں پڑھ لی جائیں۔ اس قصر کو جو شخص خلافِ قرآن کہتا ہے وہ دو بڑی غلطیاں کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ کسی حکم کے قرآن میں نہ ہونے اور خلافِ قرآن ہونے کو ایک چیز سمجھتا ہے، حالانکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ نبیؐ کے واسطے کو درمیان سے ہٹا کر براہِ راست قرآن کو لینا چاہتا ہے، حالانکہ قرآن اس کے پاس براہِ راست نہیں آیا، بلکہ نبیؐ کے واسطے سے آیا ہے، اور خدا نے یہ واسطہ اسی لیے اختیار کیا ہے کہ نبیؐ اسے قرآن کا منشا سمجھائے۔ کیا وہ شخص یہ کہنا چاہتا ہے کہ خدا نے یہ واسطہ فضول ہی اختیار کیا؟

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۷۱-۷۲)

جدید دور کی سفری سہولتوں میں قصر

س: مولانا! کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سفر میں نمازِ قصر کی اجازت اسی دور کے لیے تھی جب لوگ اونٹوں اور گھوڑوں پر سفر کرتے تھے، لیکن اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ اب سفر بالعموم ریل گاڑیوں اور بسوں وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اس میں اتنی سہولتیں ہوتی ہیں کہ نمازِ قصر کی رخصت سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ لازم ہے کہ پوری نماز ادا کی جائے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: بسوں کے سفر کا حال تو سب پر عیاں ہے۔ یہ سفر جتنی 'سہولت' کے ساتھ ہوتا ہے، اس سے اکثر لوگوں کو سابقہ پڑتا رہتا ہے.......... جو لوگ ریل گاڑیوں کی سہولت پر اپنے اس موقف کی بنیاد رکھ رہے ہیں کہ قصر نماز کے بجائے پوری نماز پڑھی جائے، انھوں نے شاید کبھی تھرڈ کلاس میں سفر نہیں کیا جس میں بعض مرتبہ تو اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ آدمی اپنی جگہ پر کھڑا حرکت تک نہیں کر سکتا اگر ان کا خیال یہ ہو کہ جب گاڑی کسی سٹیشن پر کھڑی ہو تو پوری نماز پڑھ لی جائے تو یہ بھی عملاً ممکن نہیں۔ پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ گاڑیاں نمازوں کے اوقات کے مطابق ایک سٹیشن سے دوسرے سٹیشن تک پہنچ جاتی ہوں اور اس وقت تک کھڑی رہتی ہوں جب تک لوگ وضو کر کے نماز سے فارغ نہ ہو جائیں.......... لیکن ان ساری باتوں سے قطع نظر تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ اس سلسلے میں جملہ سہولتیں میسر آ جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو سہولت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دی ہے، اسے ان سے چھیننے کا کسی کو کیا حق ہے؟ کیا خدا کو علم نہ تھا کہ ایک دور ایسا بھی آئے گا جب میرے بندے اونٹوں اور گھوڑوں کے بجائے ریل گاڑیوں اور بسوں اور ہوائی جہازوں سے سفر کرنا شروع کر دیں گے؟.......... فی الحقیقت نماز قصر کا تعلق، سفر کی سہولتوں سے نہیں بلکہ خود سفر سے ہے۔ سفر میں انسان ایک مقررہ یا محدود وقت میں کوئی کام نمٹانے کے لیے نکلتا ہے اس لیے وہ سفر کے دوران میں ہر بات اور ہر معاملے میں عجلت سے کام لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ بعض حالات میں تو ایک ایک منٹ قیمتی ہوتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی دیکھنے میں آتی رہتی ہے کہ کچھ معاملات ادھورے چھوڑ کر واپس لوٹنا پڑتا ہے۔ ایک سفر کی نوعیت دوسرے سفر سے مختلف ہو سکتی ہے، لیکن وقت کی کمی، عجلت، گھبراہٹ یا روزمرہ کے معمولات میں فرق پیدا ہو جانے کی کیفیت عام طور پر ہر سفر میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مشترک ہوتی ہے۔ آمد و رفت کے ذرائع بدل جانے سے ان حقائق پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سفر ہر حال میں سفر ہی ہوتا ہے۔

س: گویا سفر میں سہولت ہو تو اس کے باوجود حالتِ سفر میں ہونے کی جو مدت ہے اس میں قصر کرنا چاہیے؟

ج: اس کی اہمیت کو آپ یوں سمجھ لیں کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جب ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قصر کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدقہ ہے، تمھارا جی چاہے تو اسے رد کر دو۔

یہ ارشاد ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رعایت سے فائدہ نہ اٹھانا کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے۔

(۵-اے ذیلدار پارک، اول، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۱۶۸-۱۷۰)

فوجیوں کے لیے قصر

س: ......فوج اپنی چھاؤنی سے دور محاذ پر ہے۔ چھاؤنی سے محاذ کا فاصلہ کم ہوتا رہتا ہے اور پڑاؤ بھی بدلتا رہتا ہے۔ یہ علم نہیں ہوتا کہ ایک مقام پر کتنے روز قیام رہے گا۔ [ان صورتوں میں] نمازِ قصر ہوگی یا نہیں؟

ج: فوج جب اپنی چھاؤنی سے نکلا تو اب اس کے لیے قصر جائز ہے، جب تک وہ واپس چھاؤنی میں نہ آئے گا، قصر کرتا رہے گا۔ کیونکہ فوج جب کوچ کرتی ہے تو نہ قافلے کو علم ہوتا ہے کہ کہاں جانا ہے اور نہ میعاد معیّن ہوتی ہے، کہ کتنے روز ایک جگہ پڑاؤ رہے گا۔ البتہ یہ بات ہے کہ ہو سکے تو نماز فجر کی سنتیں اور عشا کے وتر بھی ادا کیے جائیں۔ دوسرے اوقات کی سنتیں اگر پڑھ سکیں تو پڑھیں اور اگر فوجی ضروریات اس کی اجازت نہ دیں تو صرف فرض قصر کر کے پڑھتے رہیں۔

(۵-اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۴۰)

❁ ❁ ❁

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ششم

نمازِ جمعہ[1]

فرضیت و اہمیت

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (الجمعۃ ۶۲:۸) اے لوگو، جو ایمان لائے ہو! جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعے کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔

اس فقرے میں تین باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں نماز کے لیے مُنادی کرنے کا ذکر ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی ایسی نماز کی مُنادی کا ذکر ہے جو خاص طور پر صرف جمعہ کے دن ہی پڑھی جانی چاہیے۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں چیزوں کا ذکر اس طرح نہیں کیا گیا ہے کہ تم نماز کے لیے مُنادی کرو اور جمعے کے روز ایک خاص نماز پڑھا کرو، بلکہ اندازِ بیان اور سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ نماز کی منادی اور جمعہ کی مخصوص نماز، دونوں پہلے سے جاری تھیں، البتہ لوگ یہ غلطی کر رہے تھے کہ جمعہ کی منادی سُن کر نماز کے لیے دوڑنے میں تساہل برتتے تھے اور خرید و فروخت کرنے میں لگے رہتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت صرف اس غرض کے لیے نازل فرمائی کہ لوگ اس منادی اور اس خاص نماز کی اہمیت محسوس کریں اور فرض جان کر اس کی طرف دوڑیں۔ ان تینوں باتوں پر اگر غور کیا جائے تو ان سے یہ اُصولی حقیقت قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ ایسے احکام بھی دیتا تھا جو قرآن میں نازل نہیں ہوئے، اور وہ احکام بھی اسی طرح واجب الاطاعت تھے جس طرح قرآن میں نازل ہونے والے احکام۔ نماز کی منادی وہی اذان ہے جو آج ساری دنیا میں ہر روز پانچ وقت ہر مسجد میں دی جا رہی ہے۔ مگر قرآن میں کسی جگہ نہ اس کے الفاظ بیان کیے گئے ہیں، نہ کہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ نماز کے لیے لوگوں کو اس طرح پکارا کرو۔ یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ ہے۔ قرآن میں دو جگہ صرف اُس کی توثیق کی گئی ہے، ایک اس آیت میں، دوسرے سورۂ مائدہ کی آیت ۵۸ میں۔ اسی طرح جمعہ کی یہ خاص نماز جو آج ساری دنیا کے مسلمان ادا کر رہے ہیں، اس کا بھی قرآن میں نہ حکم دیا گیا ہے نہ وقت اور طریقِ ادا بتایا گیا ہے۔ یہ طریقہ بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جاری کردہ ہے، اور قرآن کی یہ آیت صرف اُس کی اہمیت اور اس کے وجوب کی شدت بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اس صریح دلیل کے باوجود جو شخص یہ کہتا ہے کہ شرعی احکام صرف وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ دراصل سنت کا نہیں، خود قرآن کا منکر ہے۔

۱۔ ماخوذ از تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۹۲-۵۰۱، الجمعہ، حواشی ۱۴-۱۸۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آگے بڑھنے سے پہلے جمعہ کے بارے میں چند امور اور بھی جان لینے چاہییں۔

جمعہ ایک مخصوص اسلامی اصطلاح

جمعہ دراصل ایک اسلامی اصطلاح ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب اِسے یومِ عَرُوبَہ کہا کرتے تھے۔ اسلام میں جب اس کو مسلمانوں کے اجتماع کا دن قرار دیا گیا تو اس کا نام جمعہ رکھا گیا۔ اگرچہ مورخین کہتے ہیں کہ کعب بن لُوَی، یا قُصَیّ بن کلاب نے بھی اِس دن کے لیے یہ نام استعمال کیا تھا، کیونکہ اس روز وہ قریش کے لوگوں کا اجتماع کیا کرتا تھا (فتح البادی)۔ لیکن اس کے اس فعل سے قدیم نام تبدیل نہیں ہوا، بلکہ عام اہلِ عرب اسے عَرُوبہ ہی کہتے تھے۔ نام کی حقیقی تبدیلی اس وقت ہوئی جب اسلام میں اس دن کا یہ نیا نام رکھا گیا۔

اسلام سے پہلے ہفتے کا ایک دن عبادت کے لیے مخصوص کرنے اور اس کو شعارِ ملت قرار دینے کا طریقہ اہلِ کتاب میں موجود تھا۔ یہودیوں کے ہاں اس غرض کے لیے سَبْت (ہفتہ) کا دن مقرر کیا گیا تھا، کیونکہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دی تھی۔ عیسائیوں نے اپنے آپ کو یہودیوں سے ممیز کرنے کے لیے اپنا شعارِ ملت اتوار کا دن قرار دیا۔ اگرچہ اس کا کوئی حکم نہ حضرت عیسیٰؑ نے دیا تھا، نہ انجیل میں کہیں اس کا ذکر آیا ہے، لیکن عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ صلیب پر جان دینے کے بعد حضرت عیسیٰؑ اِسی روز قبر سے نکل کر آسمان کی طرف گئے تھے۔ اسی بنا پر بعد کے عیسائیوں نے اسے اپنی عبادت کا دن قرار دے لیا اور پھر ۳۲۱ء میں رومی سلطنت نے ایک حکم کے ذریعے سے اس کو عام تعطیل کا دن مقرر کر دیا۔ اسلام نے ان دونوں ملتوں سے اپنی ملت کو ممیز کرنے کے لیے یہ دونوں دن چھوڑ کر جمعے کو اجتماعی عبادت کے لیے اختیار کیا۔

جمعہ کی فرضیت کا حکم کب ہوا؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو مسعود انصاریؓ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی فرضیت کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہجرت سے کچھ مدت پہلے مکہ معظمہ ہی میں نازل ہو چکا تھا۔ لیکن اُس وقت آپؐ اس پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ مکہ میں کوئی اجتماعی عبادت ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے آپؐ نے اُن لوگوں کو جو آپؐ سے پہلے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچ چکے تھے، یہ حکم لکھ بھیجا کہ وہاں جمعہ قائم کریں۔ چنانچہ ابتدائی مہاجرین کے سردار حضرت مُصْعَب بن عُمیرؓ نے ۱۲ آدمیوں کے ساتھ مدینے میں پہلا جمعہ پڑھا[1] (طبرانی، دار قطنی)۔ حضرت کعب بن مالکؓ اور ابن سیرین کی روایت یہ ہے کہ اس سے بھی پہلے مدینے کے انصار نے بطورِ خود (قبل اس کے کہ حضورؐ کا حکم ان کو پہنچا ہوتا) آپس میں یہ طے کیا تھا کہ ہفتے میں ایک دن مل کر اجتماعی عبادت کریں گے۔ اس غرض کے لیے انھوں نے یہودیوں کے سَبْت اور عیسائیوں کے اتوار کو چھوڑ کر جمعے کا دن انتخاب کیا اور پہلا جمعہ حضرت اسعد بن زُرارہؓ نے بنی بیاضہ کے علاقے میں پڑھا جس میں ۴۰ آدمی شریک ہوئے (مسند احمد،

۱- تفہیم الاحادیث، سوم، ص ۳۴۹۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابو داؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، عبد بن حمید، عبدالرزاق، بیہقی)۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ذوق خود اُس وقت یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ایسا ایک دن ہونا چاہیے جس میں زیادہ سے زیادہ مسلمان جمع ہو کر اجتماعی عبادت کریں، اور یہ بھی اسلامی ذوق ہی کا تقاضا تھا کہ وہ دن ہفتے اور اتوار سے الگ ہو، تا کہ مسلمانوں کا شِعارِ ملت یہود و نصاریٰ کے شِعارِ ملت سے الگ رہے۔ یہ صحابہ کرامؓ کی اسلامی ذہنیت کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ بسا اوقات ایک حکم آنے سے پہلے ہی اُن کا ذوق کہہ دیتا تھا کہ اسلام کی رُوح فلاں چیز کا تقاضا کر رہی ہے۔

ہجرت کے بعد آپؐ کا اولین کام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جو اولین کام کیے ان میں سے ایک جمعہ کی اقامت بھی تھی۔ مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے آپؐ پیر کے روز قبا پہنچے، چار دن قیام فرمایا، پانچویں روز جمعہ کے دن وہاں سے مدینے کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں بنی سالم بن عوف کے مقام پر تھے کہ نماز جمعہ کا وقت آ گیا، اُسی جگہ آپ نے پہلا جمعہ ادا فرمایا[۱]۔(ابن ہشام)

نماز جمعہ کا وقت

اس نماز کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زوال کے بعد کا وقت مقرر فرمایا تھا، یعنی وہی وقت جو ظہر کی نماز کا وقت ہے۔ ہجرت سے پہلے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو جو تحریری حکم آپؐ نے بھیجا تھا اس میں آپ کا ارشاد یہ تھا کہ فَاِذَا مَالَ النَّهَارُ عَنْ شَطْرِهٖ عِنْدَ الزَّوَالِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَتَقَرَّبُوْا اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى بِرَكْعَتَيْنِ (دار قطنی) جب جمعہ کے روز دن نصف النہار سے ڈھل جائے تو دو رکعت نماز کے ذریعے سے اللہ کے حضور تقرُّب حاصل کرو۔

یہی حکم ہجرت کے بعد آپؐ نے قولاً بھی دیا اور عملاً بھی اسی وقت آپؐ جمعہ کی نماز پڑھاتے رہے۔ حضرت انسؓ، حضرت سلمہؓ بن اکوع، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت سہل بن سعدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت بلالؓ سے اس مضمون کی روایات کتب حدیث میں منقول ہوئی ہیں کہ حضورؐ جمعے کی نماز زوال کے بعد ادا فرمایا کرتے تھے[۲] (مسند احمد، بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی)

رکعتوں کی تعداد

یہ امر بھی آپؐ کے عمل سے ثابت ہے کہ اس روز آپؐ ظہر کے بجائے جمعے کی نماز پڑھاتے تھے، اس نماز کی صرف دو رکعتیں ہوتی تھیں، اور اس سے پہلے آپؐ خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ یہی فرق جمعے کی نماز اور عام دنوں کی نماز ظہر میں تھا۔ حضرت عمرؓ فرماتے

۱- تفہیم الاحادیث، سوم، ص ۳۴۶۔

۲- تفہیم الاحادیث، سوم، ص ۳۵۰۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں: صَلٰوةُ الْمُسَافِرِ رَكْعَتَانِ وَصَلٰوةُ الْفَجْرِ رَكْعَتَانِ وَ صَلٰوةُ الْجُمُعَةِ رَكْعَتَانِ تَمَامٌ غَيْرُ قَصْرٍ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اِنَّمَا قُصِرَتِ الْجُمُعَةُ لِاَجْلِ الْخُطْبَةِ[1] (احکام القرآن للجصاص) تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے حکم کی رو سے مسافر کی نماز دو رکعت ہے، فجر کی نماز دو رکعت ہے اور جمعے کی نماز دو رکعت ہے۔ یہ پوری نماز ہے، قصر نہیں ہے اور جمعے کو خطبے کی خاطر ہی مختصر کیا گیا ہے۔

نمازِ جمعہ کی اذان

جس اذان کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد وہ اذان ہے جو خطبے سے [متصل] پہلے دی جاتی ہے، نہ کہ وہ اذان جو خطبے سے کافی دیر پہلے لوگوں کو یہ اطلاع دینے کے لیے دی جاتی ہے کہ جمعے کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ حدیث میں حضرت سائبؓ بن یزید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صرف ایک ہی اذان ہوتی تھی، اور وہ امام کے منبر پر بیٹھنے کے بعد دی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی یہی عمل ہوتا رہا۔ پھر حضرت عثمانؓ کے دور میں جب آبادی بڑھ گئی تو انھوں نے پہلے ایک اور اذان دلوانی شروع کر دی جو مدینے کے بازار میں ان کے مکان زوراء پر دی جاتی تھی۔ (بخاری، ابوداؤد، نسائی، طبرانی)

ذکر اللہ سے مراد

اس حکم میں ذکر سے مراد خطبہ ہے، کیونکہ اذان کے بعد پہلا عمل جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے، وہ نماز نہیں بلکہ خطبہ تھا اور نماز آپؐ ہمیشہ خطبے کے بعد ادا فرماتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعے کے روز ملائکہ ہر آنے والے کا نام اُس کی آمد کی ترتیب کے ساتھ لکھتے جاتے ہیں۔ پھر اِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ حَضَرَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ جب امام خطبہ دینے کے لیے نکلتا ہے تو وہ نام لکھنے بند کر دیتے اور ذکر (یعنی خطبہ) سننے میں لگ جاتے ہیں۔ (مسند احمد، بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی) اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ ذکر سے مراد خطبہ ہے۔ خود قرآن کا بیان بھی اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ پہلے فرمایا: فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ۔ خدا کے ذکر کی طرف دوڑو۔

پھر آگے چل کر فرمایا: فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ۔ جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے روز عمل کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے ذکر اللہ اور پھر نماز۔ مفسرین کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ ذکر سے مراد یا تو خطبہ ہے یا پھر خطبہ اور نماز دونوں۔

خطبے کے لیے 'ذکر اللہ' کا لفظ استعمال کرنا خود یہ معنی رکھتا ہے کہ اس میں وہ مضامین ہونے چاہییں جو اللہ کی یاد سے مناسبت

۱- تفہیم الاحادیث، سوم، ص ۳۵۱۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رکھتے ہوں۔ مثلاً اللہ کی حمد وثنا، اس کے رسولؐ پر درود وصلوٰۃ، اس کے احکام اور اس کی شریعت کے مطابق عمل کی تعلیم وتلقین، اس سے ڈرنے والے نیک بندوں کی تعریف وغیرہ۔ اسی بنا پر زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ خطبے میں ظالم حکمرانوں کی مدح وثنا، یا ان کا نام لینا اور ان کے لیے دعا کرنا، ذکر اللہ سے کوئی دور کی مناسبت بھی نہیں رکھتا بلکہ یہ تو ذکر الشیطان ہے۔

ذکر کی طرف دوڑنے کا مطلب

'اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھاگتے ہوئے آؤ، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جلدی سے وہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔ اردو زبان میں بھی ہم دوڑ دھوپ کرنا، بھاگ دوڑ کرنا، سرگرم کوشش کے معنی میں بولتے ہیں، نہ کہ بھاگنے کے معنی میں، اسی طرح عربی میں بھی سعی کے معنی بھاگنے ہی کے نہیں ہیں۔ قرآن میں اکثر مقامات پر سعی کا لفظ کوشش اور جدوجہد کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ [1] [النجم ۵۳:۳۹]۔ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا [2] [بنی اسرائیل ۱۷:۱۹] فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ [3] [الصافات ۳۷:۱۰۲] وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا [4] [البقرۃ ۲:۲۰۵] مفسرین نے بھی بالاتفاق اس کو اہتمام کے معنی میں لیا ہے، ان کے نزدیک سعی یہ ہے کہ آدمی اذان کی آواز سن کر فوراً مسجد پہنچنے کی فکر میں لگ جائے۔ اور معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ حدیث میں بھاگ کر نماز کے لیے آنے کی صاف ممانعت وارد ہوئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: جب نماز کھڑی ہو تو اس کی طرف سکون و وقار کے ساتھ چل کر آؤ۔ بھاگتے ہوئے نہ آؤ، پھر جتنی نماز بھی مل جائے اُس میں شامل ہو جاؤ، اور جتنی چھوٹ جائے اسے بعد میں پورا کر لو۔ (صحاح ستہ)

حضرت ابو قتادہ انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضور کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے کہ یکا یک لوگوں کے بھاگ بھاگ کر چلنے کی آواز آئی۔ نماز ختم کرنے کے بعد حضورؐ نے ان لوگوں سے پوچھا یہ کیسی آواز تھی؟ ان لوگوں نے عرض کیا: ہم نماز میں شامل ہونے کے لیے بھاگ کر آرہے تھے۔ فرمایا: ایسا نہ کیا کرو، نماز کے لیے جب بھی آؤ، پورے سکون کے ساتھ آؤ۔ جتنی مل جائے اس کو امام کے ساتھ پڑھ لو، جتنی چھوٹ جائے وہ بعد میں پوری کر لو۔ (بخاری، مسلم)

تمام مصروفیات چھوڑنے کا حکم

'خرید وفروخت چھوڑ دو' کا مطلب صرف خرید وفروخت ہی چھوڑنا نہیں ہے، بلکہ نماز کے لیے جانے کی فکر اور اہتمام کے

۱- انسان کے لیے کچھ نہیں ہے، مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔

۲- جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے۔

۳- وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا۔

۴- جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سوا ہر دوسری مصروفیت چھوڑ دینا ہے۔ بیع کا ذکر خاص طور پر صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ جمعے کے روز تجارت خوب چمکتی تھی، آس پاس کی بستیوں کے لوگ سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے۔ تاجر بھی اپنا مال لے کر وہاں پہنچ جاتے تھے۔ لوگ بھی اپنی ضروریات کی چیزیں خریدنے میں لگ جاتے تھے۔ لیکن ممانعت کا حکم صرف بیع تک محدود نہیں ہے، بلکہ دوسرے تمام مشاغل بھی اس کے تحت آ جاتے ہیں، اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف ان سے منع فرما دیا ہے، اس لیے فقہائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ جمعے کی اذان کے بعد بیع اور ہر قسم کا کاروبار حرام ہے۔[1]

فرضیت جمعہ کے چند دلائل

یہ حکم قطعی طور پر نماز جمعہ کے فرض ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اول تو اذان سنتے ہی اس کے لیے دوڑنے کی تاکید بجائے خود اس کی دلیل ہے۔ پھر بیع جیسی حلال چیز کا اس کی خاطر حرام ہو جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ فرض ہے۔ مزید برآں ظہر کی فرض نماز کا جمعے کے روز ساقط ہو جانا اور نماز جمعہ کا اس کی جگہ لے لینا بھی اس کی فرضیت کا صریح ثبوت ہے۔ کیونکہ ایک فرض اسی وقت ساقط ہوتا ہے جبکہ اس کی جگہ لینے والا فرض اس سے زیادہ اہم ہو۔ اسی کی تائید بکثرت احادیث کرتی ہیں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعے کی سخت ترین تاکید کی ہے اور اسے صاف الفاظ میں فرض قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: میرا جی چاہتا ہے کہ کسی اور شخص کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لیے کھڑا کر دوں اور جا کر ان لوگوں کے گھر جلا دوں جو جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے نہیں آتے۔[2] (مسند احمد، بخاری)

حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم نے جمعے کے خطبے میں حضورؐ کو یہ فرماتے سنا ہے: لوگوں کو چاہیے کہ جمعہ چھوڑنے سے باز آ جائیں، ورنہ اللہ ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دے گا اور وہ غافل ہو کر رہ جائیں گے۔[3] (مسند احمد، مسلم، نسائی)

حضرت ابو الجعد ضمریؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ کی روایات میں حضورؐ کے جو ارشادات منقول ہوئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص کسی حقیقی ضرورت اور جائز عذر کے بغیر، محض بے پروائی کی بنا پر مسلسل تین جمعے چھوڑ دے، اللہ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔ بلکہ ایک روایت میں تو الفاظ یہ ہیں کہ اللہ اس کے دل کو منافق

۱- جس وقت آپ نماز جمعہ کی پہلی آواز سنیں تو اسی وقت اس میں شریک ہونے کی تیاری شروع کر دیں۔ خطبے کی اذان ہو تو کاروبار بند کر دیں اور نماز میں شریک ہو جائیں۔ دوسری اذان سے حرمت شروع ہو جاتی ہے اور نماز کے ختم ہونے تک یہ قائم رہتی ہے۔ اس کے بعد آپ حسب معمول اپنے کاروبار میں حصہ لے سکتے ہیں۔ (استفسارات، اول، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۴۸)

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، سوم، ص ۳۴۵، اگست ۲۰۰۴ء۔

۳- ایضاً۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا دل بنا دیتا ہے۔[1] (مسند احمد، ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، حاکم، ابن حبان، بزار، طبرانی فی لکبیر)

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: آج سے لے کر قیامت تک جمعہ تم لوگوں پر فرض ہے جو شخص اسے ایک معمولی چیز سمجھ کر یا اس کا حق نہ مان کر اسے چھوڑے، خدا اس کا حال درست نہ کرے، نہ اسے برکت دے۔ خوب سن رکھو، اس کی نماز نماز نہیں، اس کی زکوٰۃ زکوٰۃ نہیں، اس کا حج حج نہیں، اس کا روزہ روزہ نہیں، اس کی کوئی نیکی نیکی نہیں جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے۔ پھر جو توبہ کر لے اللہ اسے معاف فرمانے والا ہے۔[2] (ابن ماجہ، بزار)

اسی سے قریب المعنی ایک روایت طبرانی نے اَوْسط میں ابن عمرؓ سے نقل کی ہے۔ علاوہ بریں بکثرت روایات ہیں جن میں حضورؐ نے جمعہ کو بالفاظِ صریح فرض اور حقِ واجب قرار دیا ہے۔[3] حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: جمعہ ہر اس شخص پر فرض ہے جو اس کی اذان سُنے۔ (ابو داؤد، دار قطنی)

جابر بن عبد اللہؓ اور ابو سعید خُدریؓ کہتے ہیں کہ آپ نے خطبے میں فرمایا: جان لو کہ اللہ نے تم پر نمازِ جمعہ فرض کی ہے۔ (بیہقی)

البتہ آپؐ نے عورت، بچے، غلام، مریض اور مسافر کو اس فرضیت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ حضرت حفصہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: جمعے کے لیے نکلنا ہر بالغ پر واجب ہے۔ (نسائی)

حضرت طارق بن شہاب کی روایت میں آپؐ کا ارشاد یہ ہے کہ جمعہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ پڑھنا واجب ہے۔ سوائے غلام، عورت، بچے اور مریض کے۔ (ابو داؤد، حاکم)

حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی روایت میں آپؐ کے الفاظ یہ ہیں: جو شخص اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اس پر جمعہ فرض ہے۔ اِلّا یہ کہ عورت ہو یا مسافر ہو، یا غلام، یا مریض ہو (دار قطنی، بیہقی)۔

قرآن و حدیث کی انہی تصریحات کی وجہ سے جمعے کی فرضیت پر پوری امت کا اجماع ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۹۵-۴۹۷۔ الجمعۃ، حاشیہ ۱۵)

زمین میں پھیل جانے کا حکم

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ

۱- تفہیم الاحادیث، سوم، اگست ۲۰۰۴ء، ص ۳۴۷-۳۴۹۔

۲- تفہیم الاحادیث، سوم، اگست ۲۰۰۴ء، ص ۲۹۷-۳۰۰۔

۳- تفہیم الاحادیث، سوم، اگست ۲۰۰۴ء، ص ۲۹۸-۳۰۰۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تُفْلِحُوْنَ○ (الجمعۃ ۶۲: ۱۰) پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید کہ تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جمعے کی نماز کے بعد زمین میں پھیل جانا اور تلاشِ رزق کی دوڑ دھوپ میں لگ جانا ضروری ہے۔ بلکہ یہ ارشاد اجازت کے معنی میں ہے۔ چونکہ جمعے کی اذان سُن کر سب کاروبار چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا تھا اس لیے فرمایا گیا کہ نماز ختم ہو جانے کے بعد تمھیں اجازت ہے کہ منتشر ہو جاؤ اور اپنے جو کاروبار کرنا چاہو کرو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت کرنے کے بعد فرمایا: وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا ۚ (المائدۃ ۵: ۲) جب احرام کھول چکو تو شکار کرو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احرام کھولنے کے بعد ضرور شکار کرو۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے بعد شکار پر کوئی پابندی باقی نہیں رہتی۔ چاہو تو شکار کر سکتے ہو۔ یا مثلاً سورۂ نساء میں ایک سے زائد نکاح کی اجازت فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ کے الفاظ میں دی گئی ہے۔ یہاں اگرچہ فَانْكِحُوا بصیغۂ امر ہے۔ مگر کسی نے بھی اس کو حکم کے معنی میں نہیں لیا ہے۔

ایک اصولی مسئلہ

اس سے یہ اصولی مسئلہ نکلتا ہے کہ صیغۂ امر ہمیشہ وجوب ہی کے معنی میں نہیں ہوتا بلکہ کبھی یہ اجازت اور کبھی استحباب کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ یہ بات قرائن سے معلوم ہوتی ہے کہ کہاں یہ حکم کے معنی میں ہے اور کہاں اجازت کے معنی میں اور کہاں اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اللہ کو ایسا کرنا ناپسند ہے۔ لیکن یہ مراد نہیں ہوتی کہ یہ فعل فرض و واجب ہے۔ خود اسی فقرے کے بعد متصلاً دوسرے ہی فقرے میں ارشاد ہوا ہے: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا۔ [الجمعہ ۶۲: ۱۰] اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔

یہاں بھی صیغۂ امر موجود ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ استحباب کے معنی میں ہے نہ کہ وجوب کے معنی ہیں۔

ہفتہ وار چھٹی اور جمعہ

اس مقام پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ قرآن میں یہودیوں کے سَبْت اور عیسائیوں کے اتوار کی طرح جمعے کو عام تعطیل کا دن قرار نہیں دیا گیا ہے لیکن اس امر سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ جمعہ ٹھیک اُسی طرح مسلمانوں کا شعارِ ملّت ہے جس طرح ہفتہ اور اتوار یہودیوں و عیسائیوں کے شعارِ ملّت ہیں اور اگر ہفتے میں کوئی ایک دن عام تعطیل کے لیے مقرر کرنا ایک تمدّنی ضرورت ہو تو جس طرح یہودی اس کے لیے فطری طور پر ہفتے کو اور عیسائی اتوار کو منتخب کرتے ہیں اسی طرح مسلمان (اگر اس کی فطرت میں کچھ اسلامی حس موجود ہو) لازماً اس غرض کے لیے جمعہ ہی کو منتخب کرے گا۔ بلکہ عیسائیوں نے تو دوسرے ایسے ملکوں پر بھی اپنے اتوار کو مسلط کرنے میں تامّل نہ کیا جہاں عیسائی آبادی آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھی۔ یہودیوں نے جب فلسطین میں اپنی اسرائیلی ریاست قائم کی تو اولین کام جو انھوں نے کیا وہ یہ تھا کہ اتوار کے بجائے ہفتے کو چھٹی کا دن مقرر کیا۔ قبلِ تقسیم کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہندوستان میں برطانوی ہند اور مسلمان ریاستوں کے درمیان نمایاں فرق یہ نظر آتا تھا کہ ملک کے ایک حصے میں اتوار کی چھٹی ہوتی تھی اور دوسرے حصے میں جمعے کی۔ البتہ جہاں مسلمانوں کے اندر اسلامی حس موجود نہیں ہوتی وہاں وہ اپنے ہاتھ میں اقتدار آنے کے بعد بھی اتوار ہی کو سینے سے لگائے رہتے ہیں جیسا کہ ہم پاکستان میں دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ جب بے حسی طاری ہوتی ہے تو جمعے کی چھٹی منسوخ کر کے اتوار کی چھٹی رائج کی جاتی ہے، جیسا کہ مصطفیٰ کمال نے ترکی میں کیا[1]۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۹۷-۴۹۸، الجمعۃ، حاشیہ ۱۶)

اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہنے کا حکم

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (الجمعہ ۶۲ : ۱۰) اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید کہ تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔

یعنی اپنے کاروبار میں لگ کر بھی اللہ کو بھولو نہیں، بلکہ ہر حال میں اس کو یاد رکھو اور اس کا ذکر کرتے رہو۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۹۸، الجمعۃ، حاشیہ ۱۷)

اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زبان پر ہر وقت زندگی کے ہر معاملے میں کسی نہ کسی طرح خدا کا نام آتا رہے۔ یہ کیفیت آدمی پر اُس وقت تک طاری نہیں ہوتی جب تک اس کے دل میں خدا کا خیال بس کر نہ رہ گیا ہو۔ انسان کے شعور سے گزر کر اس کے تحت الشعور اور لاشعور تک میں جب یہ خیال گہرا اتر جاتا ہے تب ہی اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کام اور جو بات بھی وہ کرے گا اس میں خدا کا نام ضرور آئے گا۔ کھائے گا تو بسم اللہ کہہ کر کھائے گا۔ فارغ ہوگا تو الحمدِ للّٰہ کہے گا۔ سوئے گا تو اللہ کو یاد کر کے اور اٹھے گا تو اللہ ہی کا نام لیتے ہوئے۔ بات چیت میں بار بار اس کی زبان سے بسم اللہ، الحمدِ للّٰہ، ان شاء اللہ، ماشاء اللہ اور اسی طرح کے دوسرے کلمات نکلتے رہیں گے۔ اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد مانگے گا۔ ہر نعمت ملنے پر اس کا شکر ادا کرے گا۔ ہر آفت آنے پر اس کی رحمت کا طلب گار ہوگا۔ ہر مشکل میں اس سے رجوع کرے گا۔ ہر برائی کا موقع سامنے آنے پر اس سے ڈرے گا۔ ہر قصور سرزد ہو جانے پر اس سے معافی چاہے گا۔ ہر حاجت پیش آنے پر اس سے دعا مانگے گا۔ غرض اُٹھتے بیٹھتے اور دنیا کے سارے کام کاج کرتے ہوئے اس کا وظیفہ خدا ہی کا ذکر ہوگا۔ یہ چیز درحقیقت اسلامی زندگی کی جان ہے۔ دوسری جتنی بھی عبادات ہیں ان کے لیے بہرحال کوئی وقت ہوتا ہے جب وہ ادا کی جاتی ہیں۔ اور انھیں ادا کر چکنے کے بعد آدمی فارغ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ وہ عبادت ہے جو ہر وقت جاری رہتی ہے اور یہی انسان کی زندگی کا مستقل رشتہ اللہ اور اس کی بندگی کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ خود عبادات اور تمام دینی کاموں میں بھی جان اسی چیز سے پڑتی ہے کہ آدمی کا دل محض ان خاص اعمال کے وقت ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت خدا کی طرف راغب اور اس کی زبان دائماً اس کے ذکر سے تر رہے۔ یہ حالت انسان کی ہو تو اس کی زندگی میں عبادات اور دینی کام ٹھیک اُسی طرح پروان چڑھتے اور نشوونما پاتے ہیں، جس طرح ایک پودا ٹھیک اپنے

۱- اور پھر خود پاکستان میں بھی یہ تاریخ دہرائی گئی۔ (مرتبین)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مزاج کے مطابق آب وہوا میں لگا ہوا ہو۔ اس کے برعکس جو زندگی اس دائمی ذکرِ خدا سے خالی ہو اس میں محض مخصوص اوقات میں یا مخصوص مواقع پر ادا کی جانے والی عبادات اور دینی خدمات کی مثال اُس پودے کی سی ہے جو اپنے مزاج سے مختلف آب وہوا میں لگا یا گیا ہو اور محض باغبان کی خاص خبر گیری کی وجہ سے پل رہا ہو۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں یوں واضح فرماتے ہیں:

عَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسِ الْجُهَنِيِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَجُلاً سَاَلَهُ اَيُّ الْمُجَاهِدِيْنَ اَعْظَمُ اَجْرًا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ اَكْثَرُهُمْ لِلّٰهِ تَعَالٰى ذِكْرًا. قَالَ اَيُّ الصَّائِمِيْنَ اَكْثَرُ اَجْرًا؟ قَالَ اَكْثَرُهُمْ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ذِكْرًا. ثُمَّ ذَكَرَ الصَّلٰوةَ وَالزَّكٰوةَ وَالْحَجَّ وَالصَّدَقَةَ كُلُّ ذٰلِكَ يَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْثَرُهُمْ لِلّٰهِ ذِكْرًا. (مسند احمد) معاذ بن انس جُہنی روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! جہاد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا: جو ان میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہے۔ اس نے عرض کیا: روزہ رکھنے والوں میں سب سے زیادہ اجر کون پائے گا؟ فرمایا: جو ان میں سب سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ پھر اس شخص نے اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے متعلق پوچھا اور حضورؐ نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ جو اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہو۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۹۶-۹۷، الاحزاب، حاشیہ ۶۳)

احکامِ جمعہ کا خلاصہ

یہاں چونکہ جمعہ کے احکام ختم ہو گئے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذاہبِ اربعہ میں قرآن، حدیث، آثارِ صحابہؓ اور اسلام کے اصولِ عامہ سے جو احکامِ جمعہ مرتب کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ دے دیا جائے۔

مذہب حنفی

www.kitabosunnat.com

حنفیہ کے نزدیک جمعہ کا وقت وہی ہے جو ظہر کا وقت ہے۔ نہ اس سے پہلے جمعہ ہو سکتا ہے، نہ اس کے بعد۔ بیع کی حرمت پہلی اذان ہی سے شروع ہو جاتی ہے، نہ کہ اُس دوسری اذان سے جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے بعد دی جاتی ہے، کیونکہ قرآن میں اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ کے الفاظ مطلقاً ارشاد ہوئے ہیں۔ اس لیے زوال کے بعد جب جمعے کا وقت شروع ہو جائے اُس وقت جو اذان بھی نمازِ جمعہ کے لیے دی جائے، لوگوں کو اُسے سن کر خرید و فروخت چھوڑ دینی چاہیے۔ لیکن اگر کسی شخص نے اُس وقت خرید و فروخت کر لی ہو تو وہ بیع فاسد یا فسخ نہ ہو جائے گی، بلکہ یہ صرف ایک گناہ ہو گا۔ جمعہ ہر بستی میں نہیں بلکہ صرف مصرِ جامع میں ہو سکتا ہے، اور مصرِ جامع کی معتبر تعریف یہ ہے کہ وہ شہر جس میں بازار ہوں، قیامِ امن کا انتظام موجود ہو اور آبادی اتنی ہو کہ اگر اس کی بڑی سے بڑی مسجد میں بھی نمازِ جمعہ کے مکلف سب لوگ جمع ہو جائیں تو اس میں سما نہ سکیں۔ جو لوگ شہر سے باہر رہتے ہوں اُن پر جمعہ اُس صورت میں شہر آ کر پڑھنا فرض ہے جبکہ ان تک اذان کی آواز پہنچتی ہو، یا وہ زیادہ سے زیادہ شہر

www.KitaboSunnat.com

سے ٦ میل کے فاصلے پر رہوں۔ نماز کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مسجد ہی میں ہو۔ وہ کھلے میدان بھی ہوسکتی ہے اور ایسے میدان میں بھی ہوسکتی ہے جو شہر کے باہر ہو مگر اس کا ایک حصہ شمار ہوتا ہو۔ نمازِ جمعہ صرف اُس جگہ ہوسکتی ہے جہاں ہر شخص کے لیے شریک ہونے کا اذنِ عام ہو۔ کسی بند جگہ، جہاں ہر ایک کو آنے کی اجازت نہ ہو، خواہ کتنے ہی آدمی جمع ہو جائیں، جمعہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ صحتِ جمعہ کے لیے ضروری ہے کہ جماعت میں کم از کم (بقول ابوحنیفہؒ) امام کے سوا تین آدمی یا (بقول ابو یوسفؒ و محمدؒ) امام سمیت دو آدمی ایسے موجود ہوں جن پر جمعہ فرض ہے۔ جن عذرات کی بنا پر ایک شخص سے جمعہ ساقط ہو جاتا ہے وہ یہ ہیں:

آدمی حالتِ سفر میں ہو، یا ایسا بیمار ہو کہ چل کر نہ آسکتا ہو، یا دونوں ٹانگوں سے معذور ہو، یا اندھا ہو (مگر امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اندھے پر سے صرف اس وقت جمعے کی فرضیت ساقط ہوتی ہے جب کہ وہ کوئی ایسا آدمی نہ پاتا ہو جو اسے چلا کر لے جائے، یا کسی ظالم سے اس کو جان اور آبرو کا، یا ناقابلِ برداشت مالی نقصان کا خطرہ ہو، یا سخت بارش اور کیچڑ پانی ہو، یا آدمی قید کی حالت میں ہو۔ قیدیوں اور معذروں کے لیے یہ بات مکروہ ہے کہ وہ جمعے کے روز ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھیں۔ جن لوگوں کا جمعہ چھوٹ گیا ہو اُن کے لیے بھی ظہر کی نماز جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے۔ خطبہ صحتِ جمعہ کی شرائط میں سے ایک شرط ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی جمعے کی نماز خطبے کے بغیر نہیں پڑھی ہے، اور وہ لازماً نماز سے پہلے ہونا چاہیے اور دو خطبے ہونے چاہییں۔ خطبے کے لیے جب امام منبر کی طرف جائے، اُس وقت سے اختتامِ خطبہ تک ہر قسم کی بات چیت ممنوع ہے، اور نماز بھی اُس وقت نہیں پڑھنی چاہیے، خواہ امام کی آواز اُس مقام تک پہنچتی ہو یا نہ پہنچتی ہو جہاں کوئی شخص بیٹھا ہو۔ (ھدایہ، فتح القدیر، احکام القرآن للجصاص، الفقہ علی المذاہب الأربعہ، عمدۃ القاری)۔

مذہبِ شافعی

شافعیہ کے نزدیک جمعہ کا وقت وہی ہے جو ظہر کا ہے۔ بیع کی حرمت اور سعی کا وجوب اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب دوسری اذان ہو (یعنی وہ اذان جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے بعد دی جاتی ہے)۔ تاہم اگر کوئی شخص اس وقت بیع کرے تو وہ فسخ نہیں ہوتی۔ جمعہ ہر اس بستی میں ہوسکتا ہے جس کے مستقل باشندوں میں ۴۰ ایسے آدمی موجود ہوں جن پر نمازِ جمعہ فرض ہے۔ بستی سے باہر کے اُن لوگوں پر جمعہ کے لیے حاضر ہونا لازم ہے جن تک اذان کی آواز پہنچ سکتی ہو۔ جمعہ لازماً بستی کے حدود میں ہونا چاہیے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ مسجد ہی میں پڑھا جائے۔ جو لوگ صحرا میں خیموں کے اندر رہتے ہیں ان پر جمعہ واجب نہیں ہے۔ صحتِ جمعہ کے لیے ضروری ہے کہ جماعت میں امام سمیت کم از کم ۴۰ ایسے آدمی شریک ہوں جن پر جمعہ فرض ہے۔ جن عذرات کی بنا پر کسی شخص سے جمعہ کا فرض ساقط ہو جاتا ہے وہ یہ ہیں:

سفر کی حالت میں ہو، یا کسی مقام پر چار دن یا اس سے کم قیام کا ارادہ رکھتا ہو، بشرطیکہ سفر جائز نوعیت کا ہو۔ ایسا بوڑھا یا مریض ہو کہ سواری پر بھی جمعے کے لیے نہ جاسکتا ہو۔ اندھا ہو اور کوئی ایسا آدمی نہ پاتا ہو جو اسے نماز کے لیے لے جائے۔ جان یا مال یا آبرو کا خوف لاحق ہو۔ قید کی حالت میں ہو، بشرطیکہ اس کی قید اس کے اپنے کسی قصور کی وجہ سے نہ ہو۔ نماز سے پہلے دو خطبے ہونے چاہییں۔ خطبے کے دوران میں خاموش رہنا مسنون

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے، مگر بات کرنا حرام نہیں ہے۔ جو شخص امام سے اتنا قریب بیٹھا ہو کہ خطبہ سُن سکتا ہو اس کے لیے بولنا مکروہ ہے، لیکن سلام کا جواب دے سکتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سُن کر بآواز بلند درود پڑھ سکتا ہے۔ (مغنی المحتاج، الفقه علی المذاهب الاربعة)۔

مذہب مالکی

مالکیہ کے نزدیک جمعہ کا وقت زوال سے شروع ہو کر مغرب سے اتنے پہلے تک کہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے خطبہ اور نماز ختم ہو جائے۔ بیع کی حرمت اور سعی کا وجوب دوسری اذان سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگر بیع واقع ہو تو وہ فاسد ہے اور فسخ ہوگی۔ جمعہ صرف اُن بستیوں میں ہو سکتا ہے جن کے باشندے وہاں مستقل طور پر گھر بنا کر رہتے ہوں، اور جاڑے گرمی میں منتقل نہ ہوتے ہوں، اور ان کی ضروریات اُسی بستی میں فراہم ہوتی ہوں اور اپنی تعداد کی بنا پر وہ اپنی حفاظت کر سکتے ہوں۔ عارضی قیام گاہوں میں خواہ کتنے ہی لوگ ہوں اور خواہ کتنی ہی مدت ٹھیریں، جمعہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ جس بستی میں جمعہ قائم کیا جاتا ہو اس سے تین میل کے فاصلے تک رہنے والے لوگوں پر جمعہ میں حاضر ہونا فرض ہے۔ نمازِ جمعہ صرف ایسی مسجد میں ہو سکتی ہے جو بستی کے اندر یا اس سے متصل ہو اور جس کی عمارت بستی کے عام باشندوں کے گھروں سے کم تر درجے کی نہ ہو۔ بعض مالکیوں نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ مسجد مسقف ہونی چاہیے اور اس میں پنج وقتہ نماز کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔ لیکن مالکیہ کا راجح مسلک یہ ہے کہ کسی مسجد میں صحتِ جمعہ کے لیے اس کا مسقف ہونا شرط نہیں ہے، اور ایسی مسجد میں بھی جمعہ ہو سکتا ہے جو صرف نمازِ جمعہ کے لیے بنائی گئی ہو اور پنج وقتہ نماز کا اس میں اہتمام نہ ہو۔ جمعے کی نماز صحیح ہونے کے لیے جماعت میں امام کے سوا کم از کم ۱۲ ایسے آدمیوں کا موجود ہونا ضروری ہے جن پر جمعہ فرض ہو۔ جن عذرات کی بنا پر کسی شخص پر سے جمعہ کا فرض ساقط ہو جاتا ہے وہ یہ ہیں:

سفر کی حالت ہو یا بحالتِ سفر کسی جگہ چار دن سے کم قیام کا ارادہ رکھتا ہو۔ ایسا مریض ہو کہ مسجد میں آنا اس کے لیے دشوار ہو۔ اس کی ماں یا باپ یا بیوی یا بچہ بیمار ہو، یا وہ کسی ایسے اجنبی مریض کی تیمارداری کر رہا ہو جس کا اور کوئی تیماردار نہ ہو، یا اس کا کوئی قریبی رشتہ دار سخت بیماری میں مبتلا ہو یا مرنے کے قریب ہو۔ اس کے ایسے مال کو، جس کا نقصان قابلِ برداشت نہ ہو، خطرہ لاحق ہو، یا اسے اپنی جان یا آبرو کا خطرہ ہو، یا وہ مار یا قید کے خوف سے چھپا ہوا ہو بشرطیکہ وہ اس معاملے میں مظلوم ہو۔ سخت بارش اور کیچڑ پانی یا سخت گرمی یا سردی مسجد تک پہنچنے میں مانع ہو۔ دو خطبے نماز سے پہلے لازم ہیں، حتیٰ کہ اگر نماز کے بعد خطبہ ہو تو نماز کا اعادہ ضروری ہے۔ اور یہ خطبے لازماً مسجد کے اندر ہونے چاہییں۔ خطبے کے لیے جب امام منبر کی طرف بڑھے اس وقت سے نفل پڑھنا حرام ہے اور جب خطبہ شروع ہو تو بات کرنا بھی حرام ہے، خواہ آدمی خطبے کی آواز نہ سن رہا ہو۔ لیکن اگر خطیب اپنے خطبے میں ایسی لغو باتیں کرے جو نظامِ خطبہ سے خارج ہوں، یا کسی ایسے شخص کو گالیاں دے جو گالی کا مستحق نہ ہو، کسی ایسے شخص کی تعریفیں شروع کر دے جس کی تعریف جائز نہ ہو، یا خطبے سے غیر متعلق کوئی چیز پڑھنے لگے، تو لوگوں کو اُس پر احتجاج کرنے کا حق ہے۔ نیز خطبے میں بادشاہِ وقت کے لیے دعا مکروہ ہے اِلّا یہ کہ خطیب کو اپنی جان کا خطرہ ہو۔ خطیب لازماً وہی شخص ہونا چاہیے جو نماز پڑھائے۔ اگر خطیب کے سوا کسی اور نے نماز پڑھائی ہو تو وہ باطل ہو گی۔ (حاشیه الدّسوقی علی الشرح الکبیر۔ احکام القرآن ابن عربی۔ الفقه علی المذاهب الاربعة)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مذہب حنبلی

حنابلہ کے نزدیک جمعہ کی نماز کا وقت صبح کو سورج کے بقدر یک نیزہ بلند ہونے کے بعد سے عصر کا وقت شروع ہونے تک ہے۔ لیکن زوال سے پہلے جمعہ صرف جائز ہے، اور زوال کے بعد واجب اور افضل۔ بیع کی حرمت اور سعی کے وجوب کا وقت دوسری اذان سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو بیع ہو وہ سرے سے منعقد ہی نہیں ہوتی۔ جمعہ صرف اُس جگہ ہوسکتا ہے جہاں ۴۰ ایسے آدمی جن پر جمعہ فرض ہو، مستقل طور پر گھروں میں (نہ کہ خیموں میں) آباد ہوں، یعنی جاڑے اور گرمی میں منتقل نہ ہوتے ہوں۔ اس غرض کے لیے بستی کے گھروں اور محلوں کے باہم متصل یا متفرق ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ان سب کے مجموعے کا نام ایک ہو تو وہ ایک ہی بستی ہے خواہ اس کے ٹکڑے ایک دوسرے سے میلوں کے فاصلے پر واقع ہوں۔ ایسی بستی سے جو لوگ تین میل کے اندر رہتے ہوں ان پر جمعہ کے لیے حاضر ہونا فرض ہے۔ جماعت میں امام سمیت ۴۰ آدمیوں کی شرکت ضروری ہے۔ نماز کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مسجد ہی میں ہو۔ کھلے میدان میں بھی ہوسکتی ہے۔ جن عذرات کی بنا پر کسی شخص سے جمعہ کا فرض ساقط ہو جاتا ہے وہ یہ ہیں:

مسافر ہو اور جمعہ کی بستی میں چار دن یا اس سے کم قیام کا ارادہ رکھتا ہو، ایسا مریض ہو کہ سواری پر آنا بھی اس کے لیے مشکل ہو، اندھا ہو، اِلّا یہ کہ خود راستہ ٹٹول کر آسکتا ہو۔ کسی دوسرے شخص کے سہارے آنا اندھے کے لیے واجب نہیں ہے۔ سخت سردی یا سخت گرمی یا سخت بارش اور کیچڑ، نماز کی جگہ پہنچنے میں مانع ہو، کسی ظالم کے ظلم سے بچنے کے لیے چھپا ہوا ہو۔ جان یا آبرو کا خطرہ یا ایسے مالی نقصان کا خوف ہو جو قابل برداشت نہ ہو۔ نماز سے پہلے دو خطبے ہونے چاہییں۔ خطبے کے دوران میں اُس شخص کے لیے بولنا حرام ہے جو خطیب سے اتنا قریب ہو کہ اس کی آواز سن سکتا ہے۔ البتہ دور کا آدمی جس تک خطیب کی آواز نہ پہنچتی ہو، بات کرسکتا ہے۔ خطیب خواہ عادل ہو یا غیر عادل، لوگوں کو خطبے کے دوران میں چپ رہنا چاہیے۔ اگر جمعہ کے روز عید ہو جائے تو جو لوگ عید پڑھ چکے ہوں ان پر سے جمعہ کا فرض ساقط ہے۔ اس مسئلے میں حنابلہ کا مسلک ائمہ ثلاثہ کے مسلک سے مختلف ہے۔ (غایة المنتهٰی۔ الفقه علی المذاهب الاربعة)

اس امر میں تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ جس شخص پر جمعہ فرض نہیں ہے وہ اگر نماز جمعہ میں شریک ہو جائے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اس کے لیے پھر ظہر پڑھنا فرض نہیں رہتا۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۹۸-۵۰۱، الجمعہ، حاشیہ ۱۸)

احکام جمعہ کا سبب نزول

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (الجمعہ ۶۲:۱۱) اور جب انھوں نے تجارت اور کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے اور تمھیں کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ سب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

یہ ہے وہ واقعہ جس کی وجہ سے اوپر کی آیات میں جمعہ کے احکام ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ اس کا قصہ جو کتب حدیث میں حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو مالکؓ اور حضرات حسن بصری، ابن زید، قتادہ، اور مقاتل بن حیان سے منقول ہوا ہے، یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں شام سے ایک تجارتی قافلہ عین نمازِ جمعہ کے وقت آیا اور اس نے ڈھول تاشے بجانے شروع کیے تاکہ بستی کے لوگوں کو اس کی آمد کی اطلاع ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ ڈھول تاشوں کی آوازیں سن کر لوگ بے چین ہو گئے اور ۱۲ آدمیوں کے سوا باقی سب بقیع کی طرف دوڑ گئے جہاں قافلہ اُترا ہوا تھا۔ اس قصے کی روایات میں سب سے زیادہ معتبر روایت حضرت جابر بن عبداللہ کی ہے جسے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوعوانہ، عبد بن حمید، ابویعلیٰ وغیرھم نے متعدد سندوں سے نقل کیا ہے۔ اس میں اضطراب صرف یہ ہے کہ کسی روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ نماز کی حالت میں پیش آیا تھا، اور کسی میں یہ ہے کہ یہ اس وقت پیش آیا جب حضورؐ خطبہ دے رہے تھے۔ لیکن حضرت جابرؓ اور دوسرے صحابہ و تابعین کی تمام روایات کو جمع کرنے سے صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ دورانِ خطبہ کا واقعہ ہے اور حضرت جابرؓ نے جہاں یہ کہا ہے کہ یہ نماز جمعہ کے دوران میں پیش آیا، وہاں دراصل انھوں نے خطبے اور نماز کے مجموعے پر نمازِ جمعہ کا اطلاق کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ اُس وقت ۱۲ مردوں کے ساتھ سات عورتیں باقی رہ گئی تھیں (ابن مَرْدُوْیَہ)۔ قتادہ کا بیان ہے کہ ۱۲ مردوں کے ساتھ ایک عورت تھی (ابن جریر، ابن ابی حاتم) دارقطنی کی ایک روایت میں ۴۰ [چالیس] افراد اور عبد بن حُمید کی روایت میں سات نفر بیان کیے گئے ہیں اور فراء نے ۸ نفر لکھے ہیں۔ لیکن یہ سب ضعیف روایات ہیں۔ اور قتادہ کی یہ روایت بھی ضعیف ہے کہ اس طرح کا واقعہ تین مرتبہ پیش آیا تھا (ابن جریر)۔ معتبر روایت حضرت جابر بن عبداللہؓ کی ہے جس میں باقی رہ جانے والوں کی تعداد ۱۲ بتائی گئی ہے۔ اور قتادہ کی ایک روایت کے سوا باقی تمام صحابہ و تابعین کی روایات اس پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا۔ باقی رہ جانے والوں کے متعلق مختلف روایات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت سالم مولیٰ حذیفہؓ اور حضرت جابرؓ بن عبداللہ شامل تھے۔ حافظ ابویعلیٰ نے حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی جو روایت نقل کی ہے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب لوگ اس طرح نکل کر چلے گئے اور صرف بارہ اصحاب باقی رہ گئے تو ان کو خطاب کر کے حضورؐ نے فرمایا: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْتَتَابَعْتُمْ حَتّٰی لَمْ یَبْقَ مِنْکُمْ اَحَدٌ لَسَالَ بِکُمُ الْوَادِیْ نَارًا اگر تم سب چلے جاتے اور ایک بھی باقی نہ رہتا تو یہ وادی آگ سے بہ نکلتی۔

اسی سے ملتا جلتا مضمون ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اور ابن جریر نے قتادہ سے نقل کیا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شیعہ حضرات کا طعن اور اس کا جواب

شیعہ حضرات نے اس واقعے کو بھی صحابہؓ پر طعن کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کی اتنی بڑی تعداد کا خطبے اور نماز چھوڑ کر تجارت اور کھیل تماشے کی طرف دوڑ جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن یہ ایک سخت بے جا اعتراض ہے جو صرف حقائق سے آنکھیں بند کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ واقعہ ہجرت کے بعد قریبی زمانے ہی میں پیش آیا تھا۔ اُس وقت ایک طرف تو صحابہ کی اجتماعی تربیت ابتدائی مراحل میں تھی۔ اور دوسری طرف کفارِ مکہ نے اپنے اثر سے مدینہ طیبہ کے باشندوں کی سخت معاشی ناکہ بندی کر رکھی تھی جس کی وجہ سے مدینے میں اشیائے ضرورت کمیاب ہو گئی تھیں۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اُس وقت مدینے میں لوگ بھوکوں مر رہے تھے اور قیمتیں چڑھی ہوئی تھیں (ابن جریر)۔ اس حالت میں جب ایک تجارتی قافلہ آیا تو لوگ اس اندیشے سے کہ کہیں ہمارے نماز سے فارغ ہوتے ہوتے سامان فروخت نہ ہو جائے، گھبرا کر اس کی طرف دوڑ گئے۔ یہ ایک ایسی کمزوری اور غلطی تھی جو اس وقت اچانک تربیت کی کمی اور حالات کی سختی کے باعث رونما ہو گئی تھی۔ لیکن جو شخص بھی ان صحابہ کی وہ قربانیاں دیکھے گا جو اس کے بعد انھوں نے اسلام کے لیے کیں، اور یہ دیکھے گا کہ عبادات اور معاملات میں ان کی زندگیاں کیسے زبردست تقویٰ کی شہادت دیتی ہیں، وہ ہرگز یہ الزام رکھنے کی جرأت نہ کر سکے گا کہ ان کے اندر دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا کوئی مرض پایا جاتا تھا، اِلّا یہ کہ اس کے اپنے دل میں صحابہ سے بُغض کا مرض پایا جاتا ہو۔

صحابہؓ کے بارے میں غلوِ عقیدت

تاہم یہ واقعہ جس طرح صحابہؓ کے معترضین کی تائید نہیں کرتا اُسی طرح اُن لوگوں کے خیالات کی تائید بھی نہیں کرتا جو صحابہؓ کی عقیدت میں غلو کر کے اس طرح کے دعوے کرتے ہیں کہ ان سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی، یا ہوئی بھی ہو تو اس کا ذکر نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ ان کی غلطی کا ذکر کرنا اور اسے غلطی کہنا اُن کی توہین ہے، اور اس سے ان کی عزت و وقعت دلوں میں باقی نہیں رہتی، اور اس کا ذکر اُن آیات و احادیث کے خلاف ہے جن میں صحابہؓ کے مغفور اور مقبول بارگاہ الٰہی ہونے کی تصریح کی گئی ہے۔ یہ ساری باتیں سراسر مبالغہ ہیں جن کے لیے قرآن و حدیث میں کوئی سند موجود نہیں ہے۔ یہاں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس غلطی کا ذکر کیا ہے جو صحابہؓ کی ایک کثیر تعداد سے صادر ہوئی تھی۔ اُس کتاب میں کیا ہے جسے قیامت تک ساری امت کو پڑھنا ہے اور اُسی کتاب میں کیا ہے جس میں ان کے مغفور اور مقبولِ بارگاہ ہونے کی تصریح کی گئی ہے۔ پھر حدیث و تفسیر کی تمام کتابوں میں صحابہ سے لے کر بعد کے اکابر اہل سنت تک نے اس غلطی کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر انھی صحابہ کی وقعت دلوں سے نکالنے کے لیے کیا ہے جن کی وقعت وہ خود دلوں میں قائم فرمانا چاہتا ہے؟ اور کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہؓ اور تابعین اور محدثین و مفسرین نے اس قصے کی ساری تفصیلات اُس شرعی مسئلے سے ناواقفیت کی بنا پر بیان

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

کردی ہیں جو یہ غالی حضرات بیان کیا کرتے ہیں؟اور کیا فی الواقع سورۂ جمعہ پڑھنے والے اور اس کی تفسیر کا مطالعہ کرنے والے لوگوں کے دلوں سے صحابہؓ کی وقعت نکل گئی ہے؟ اگر ان میں سے ہر سوال کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے، تو وہ سب بے جا اور مبالغہ آمیز باتیں غلط ہیں جو احترامِ صحابہؓ کے نام سے بعض لوگ کیا کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صحابۂ کرام کوئی آسمانی مخلوق نہ تھے بلکہ اسی زمین پر پیدا ہونے والے انسانوں میں سے تھے۔ وہ کچھ بھی بنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے بنے۔ یہ تربیت بتدریج سالہا سال تک ان کو دی گئی۔ اس کا جو طریقہ قرآن و حدیث میں ہم کو نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ جب کبھی ان کے اندر کسی کمزوری کا ظہور ہوا، اللہ اور اس کے رسولؐ نے بروقت اس کی طرف توجہ فرمائی، اور فوراً اُس خاص پہلو میں تعلیم و تربیت کا ایک پروگرام شروع ہو گیا جس میں وہ کمزوری پائی گئی تھی۔ اسی نمازِ جمعہ کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب قافلۂ تجارت والا واقعہ پیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ جمعہ کا یہ رکوع نازل فرما کر اس پر تنبیہ کی اور جمعہ کے آداب بتائے۔ پھر اس کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل اپنے خطباتِ مبارکہ میں فرضیتِ جمعہ کی اہمیت لوگوں کے ذہن نشین فرمائی،...... اور تفصیل کے ساتھ اُن کو آدابِ جمعہ کی تعلیم دی۔ چنانچہ احادیث میں یہ ساری ہدایات ہم کو بڑی واضح صورت میں ملتی ہیں۔[1]

آدابِ جمعہ

حضرت ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہر مسلمان کو جمعہ کے روز غسل کرنا چاہیے، دانت صاف کرنے چاہییں، جو اچھے کپڑے اُس کو میسر ہوں پہننے چاہییں اور اگر خوشبو میسر ہو تو لگانی چاہیے۔ (مسند احمد، بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی)

حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: جو مسلمان جمعہ کے روز غسل کرے اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو پاک صاف کرے، سر میں تیل لگائے یا جو خوشبو گھر میں موجود ہو لگائے، پھر مسجد جائے اور دو آدمیوں کو ہٹا کر ان کے بیچ میں نہ گھسے، پھر جتنی کچھ اللہ توفیق دے اتنی نماز (نفل) پڑھے، پھر جب امام بولے تو خاموش رہے، اُس کے قصور ایک جمعے سے دوسرے جمعہ تک معاف ہو جاتے ہیں۔ (بخاری، مسند احمد)

قریب قریب اسی مضمون کی روایات حضرت ابوایوب انصاریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت نُبَیْشَةَ الْهُذَلِیؓ نے بھی حضورؐ سے نقل کیا ہے۔ (مسند احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، طبرانی)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب امام خطبہ دے رہا ہو اس وقت جو شخص بات کرے وہ اس گدھے کے مانند ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں، اور جو شخص اُس سے کہے کہ چپ رہ، اس کا بھی کوئی

۱- تفہیم الاحادیث، سوم، ص ۳۰۱-۳۱۴، اگست ۲۰۰۴ء۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جمعہ نہیں ہوا (مسند احمد)۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اگر تم نے جمعہ کے روز خطبے کے دوران میں بات کرنے والے شخص سے کہا 'چپ رہ' تو تم نے بھی لغو حرکت کی۔ (بخاری، مسلم، نسائی، ترمذی، ابوداؤد)

اسی سے ملتی جلتی روایات امام احمد، ابوداؤد اور طبرانی نے حضرت علیؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ سے نقل کی ہیں۔ اس کے ساتھ آپؐ نے خطیبوں کو بھی ہدایت فرمائی کہ لمبے لمبے خطبے دے کر لوگوں کو تنگ نہ کریں۔ آپؐ خود جمعہ کے روز مختصر خطبہ ارشاد فرماتے اور نماز بھی زیادہ لمبی نہ پڑھاتے تھے۔ حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ طویل خطبہ نہیں دیتے تھے۔ وہ بس چند مختصر کلمات ہوتے تھے (ابوداؤد)۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ کہتے ہیں کہ آپ کا خطبہ نماز کی بہ نسبت کم ہوتا تھا اور نماز اس سے زیادہ طویل ہوتی تھی (نسائی)۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: آدمی کی نماز کا طویل ہونا اور خطبے کا مختصر ہونا اس بات کی علامت ہے کہ وہ دین کی سمجھ رکھتا ہے (مسند احمد، مسلم)۔ تقریباً یہی مضمون بزار نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ نے کس طرح لوگوں کو جمعہ کے آداب سکھائے یہاں تک کہ اس نماز کی وہ شان قائم ہوئی جس کی نظیر دنیا کی کسی قوم کی اجتماعی عبادت میں نہیں پائی جاتی۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۵۰۲-۵۰۵، الجمعہ، حاشیہ ۱۹)

نماز جمعہ اور دو رکعت نفل

س: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں فرمایا کہ تم میں سے جو کوئی جمعہ کے دن نماز کے لیے آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو اسے چاہیے کہ دو رکعت ہلکی پڑھ کر بیٹھ جائے۔ لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خطبے کے دوران میں دو رکعتیں پڑھنے سے منع فرمایا ہے کیا یہ اس حدیث کے خلاف نہیں ہے؟ براہ کرم وضاحت فرمائیے۔

ج: اس مسئلے میں اختلاف ہے اور اختلاف کی بنیاد، جیسا کہ میں ایک اور مسئلے کے جواب میں بتا چکا ہوں بہرحال دلیل ہی ہے۔ جن لوگوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے کہ جمعہ کے خطبے کے دوران میں جو لوگ پہنچیں وہ دو رکعت پڑھ لیں، وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ جو اس کو صحیح نہیں سمجھتے، وہ اس سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امام خطبہ دینے کے لیے نکل آئے تو نہ صلوٰۃ ہے نہ کلام ہے۔ یعنی جب امام خطبہ دینے کے لیے آئے تو اس وقت کی عبادت خطبہ سننا ہے۔ فقہا نے عام طور پر اسی بات کو ترجیح دی ہے۔ شریعت میں ہمیشہ جو جس وقت کی عبادت ہو اس وقت وہی اہمیت رکھتی ہے۔ اس عبادت کی بجائے آپ دوسری عبادت کریں گے تو گویا اس عبادت کو آپ نے ضائع کیا۔ ایک وقت ہے کہ جب مسجد میں جائیں تو نماز پڑھیں۔ دوسرا وقت ہے کہ جب خطبہ پڑھا جا رہا ہو تو خطبہ سنیں۔ تیسرا وقت ہے کہ جب امام جمعہ کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نماز پڑھانے کھڑا ہو تو اس وقت جمعہ کی نماز پڑھیں۔ اب ایک ایک وقت کی ایک ایک عبادت ہے۔ خطبے کے وقت کی عبادت خطبہ ہی سننا ہے۔ اس وقت اگر ایک آدمی نماز پڑھنے میں لگ جائے تو نہ نماز ٹھیک طریقے سے ادا کر سکے گا کیونکہ بار بار خطبے کی آوازیں آ رہی ہیں اور خطبے کا مضمون اس کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ نہ خطبہ ہی پوری طرح سن سکے گا کہ نماز میں مشغول ہے۔

اس کے علاوہ آپ دیکھیے کہ جماعتوں کے جو آداب ہیں ان کے لحاظ سے بھی یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ خطبے کے دوران میں آپ خطبہ سنیں۔ اگر خطیب خطبہ دے رہا ہے، اللہ کے احکام سنا رہا ہے اور جگہ جگہ لوگ خطبے کے دوران میں اِدھر اُدھر سے آ آ کر نماز پڑھتے رہیں تو اس پورے مجمعے میں جس کے سامنے خطیب خطبہ دیے جا رہا ہے مسلسل disturbance پیدا ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں کوئی آدمی تقریر نہیں کر سکتا۔ تو معنی کے اعتبار سے بھی وہ حدیث قوی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے کہ اِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ فَلَا صَلٰوۃَ وَلَا کَلَامَ جب امام نکل آئے تو پھر نہ نماز ہے اور نہ باتیں۔

جن لوگوں نے اسے صحیح سمجھا ہے وہ اسے جائز نہیں رکھتے کہ خطبے کے دوران میں نماز پڑھی جائے۔ جن لوگوں نے دوسری حدیث کو صحیح سمجھا ہے اس کے مطابق عمل کیا ہے۔ بہرحال دونوں کا استدلال ایک ایک حدیث سے ہے اور کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ اگر ایک طریقے پر کوئی شخص عمل کر رہا ہو تو دوسرا خواہ مخواہ اس پر اعتراض کرے کیونکہ دونوں کے لیے دلیل موجود ہے۔ اس لیے جو جس پر عمل کر رہا ہے، ٹھیک کر رہا ہے۔ آپ جس چیز کو ٹھیک سمجھتے ہیں اس پر عمل کیجیے۔ دوسرا مسلمان اگر دوسری چیز کو ٹھیک سمجھ کر اس کے مطابق اللہ کی عبادت کر رہا ہے تو اس سے جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔

(استفسارات، اول، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۵۲-۵۴)

مجاہدین کے لیے نماز جمعہ

محاذ جنگ پر لڑنے والوں کے لیے نماز جمعہ فرض نہیں ہے لیکن اگر وہ جمعہ کی نماز ادا کر لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

(۵-اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۳۹)

خطبہ جمعہ کی زبان

س: علمائے کرام کے نزدیک عیدین اور جمعہ کا خطبہ مخاطبین کی مادری زبان میں دیا جانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟ کہا جائے گا کہ عیدین اور جمعہ کا خطبہ عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں دیا جانا سنتِ نبوی کے خلاف ہے اس لیے ناجائز ہے۔ لیکن سنتِ نبوی یہ تھی کہ ایسے خطبے کے دوران جو کچھ حضورؐ پرنور کی زبان فیض ترجمان سے نکلے اس کو سامعین سنیں اور سمجھیں اور اس میں جو کچھ اوامر و نواہی ہوں اُن پر کاربند ہونے کی کوشش کریں اور جو کچھ حکم اور نصائح ہوں ان سے سبق آموز ہوں۔ وہ صورت جس میں سامعین میں سے ۹۹ فیصد خطبے کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتے ہوں وہ اُن اوامر و نواہی سے جو خطبے میں بیان کیے جائیں کیونکر کسی قسم کا استفادہ کر سکتے ہیں اور ایسا خطبہ کیونکر سنتِ نبوی کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے؟!

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عیدین اور جمعہ کے خطبے کو عربی زبان تک محدود رکھنے سے جو مواقع شارع اسلام نے اوامر و نواہی شرعیہ کی اشاعت کی کافتہ المسلمین کے لیے پیدا فرمائے ہیں، ان کا سدّ باب ہوتا ہے یا نہیں؟ اور خطیب کا خطبہ ایسی صورت میں ایک فعلِ عبث ہو جاتا ہے یا نہیں، جبکہ اس کے مفہوم کو سامعین میں سے کوئی یا اکثر نہیں سمجھتے............

ج: اس مسئلے میں یہ ایک عام غلطی ہے کہ خطبے کی زبان کے سوال کو نماز کی زبان کے سوال سے مربوط کر دیا جاتا ہے۔ اس سے بڑا خلطِ مبحث واقع ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے ہم اسی امر کی توضیح کریں گے کہ نماز اور خطبے کی حیثیتوں میں کیا فرق ہے۔

خطبہ نمازِ جمعہ کا حصہ نہیں

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خطبہ نماز جمعہ کا جز ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ظہر کی چار رکعتوں میں سے دو رکعتیں خطبے ہی کے لیے کم کی گئی ہیں، جیسا کہ احادیث میں حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ اِنَّمَا قُصِرَتِ الْجُمُعَةُ لِاَجْلِ الْخُطْبَةِ اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ خطبہ چونکہ نماز کی دو رکعتوں کا قائم مقام ہے لہٰذا اس کی حیثیت بھی وہی ہے جو نماز کی ہے۔ اور جب نماز غیر عربی میں پڑھنا درست نہیں تو خطبہ بھی غیر عربی میں پڑھنا درست نہیں۔

لیکن یہ محض ایک سطحی رائے ہے۔ دونوں کے احکام کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جو اُمور نماز کے لیے شرط ہیں وہ خطبے کے لیے شرط نہیں ہیں۔

نماز کے لیے طہارت شرط ہے، مگر خطبے کے لیے شرط نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر سہواً حالتِ جنابت میں بھی خطبہ پڑھ دیا ہو تو اعادے کی ضرورت نہیں۔

نماز کے لیے قبلہ رُخ ہونا ضروری ہے۔ مگر خطبۂ جمعہ کے لیے نہ صرف یہ کہ استقبال قبلہ ضروری نہیں ہے بلکہ قبلہ کی طرف پشت کر کے مقتدیوں کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہے۔

نماز میں گفتگو کرنے سے فساد واقع ہو جاتا ہے۔ مگر خطبہ میں کلام کیا جا سکتا ہے اور خود نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ سے یہ فعل ثابت ہے، جیسا کہ آگے چل کر ہم بیان کریں گے۔

نماز کے لیے وقت بھی مشروط ہے، لیکن خطبہ اگر وقت سے پہلے شروع کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

نمازِ جمعہ میں حنفیہ کے نزدیک کم از کم تین آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن خطبہ میں اگر امام کے سوا صرف ایک آدمی ہو تب بھی کافی ہے۔

نمازِ جمعہ اگر فاسد ہو جائے تو اس کا اعادہ کیا جائے گا۔ لیکن خطبے کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ سب امور اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خطبہ نماز جمعہ کا جزو نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

قَالَ بَعْضُ مَشَائِخِنَا: اَلْخُطْبَةُ تَقُوْمُ مَقَامَ رَكْعَتَيْنِ وَ لِهٰذَا لَا تَجُوْزُ اِلَّا بَعْدَ دُخُوْلِ الْوَقْتِ وَالْاَصَحُّ اَنَّهَا لَا تَقُوْمُ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مَقَامَ شَطْرِ الصَّلٰوۃِ۔ (المبسوط، ج۸، کتاب الجمعۃ) ہمارے بعض مشائخ کہتے ہیں کہ خطبہ چونکہ دو رکعت کا قائم مقام ہے اس لیے ظہر کا وقت شروع ہونے سے پہلے خطبہ پڑھنا جائز نہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ خطبے کی حیثیت نماز کے ایک حصے کی نہیں ہے۔

اور شرح العنایة علی الهدایة میں ہے:

اِنَّهَا لَيْسَتْ بِرُكْنٍ لِاَنَّ رُكْنَ الشَّيْءِ مَا يَقُوْمُ بِهٖ ذَالِكَ الشَّيْءُ وَ صَلٰوةُ الْجُمُعَةِ لَا تَقُوْمُ بِالْخُطْبَةِ وَ اِنَّمَا تَقُوْمُ بِاَرْكَانِهَا فَكَانَتْ شَرْطاً۔ خطبہ رکنِ نماز نہیں ہے۔ کیونکہ کسی چیز کا رکن تو وہ ہوتا ہے جس سے وہ چیز قائم ہوتی ہے، اور نماز جمعہ خطبے سے قائم نہیں ہوتی بلکہ اپنے ارکان سے قائم ہوتی ہے، لہٰذا خطبہ جمعہ کے لیے رکن نہیں بلکہ شرط ہے۔

نماز اور خطبے کے مقاصد کا فرق

اس میں شک نہیں کہ خطبہ بھی نماز کی طرح ایک عبادت ہے۔ لیکن دونوں کے مقاصد مختلف ہیں۔ نماز سے جو کچھ مقصود ہے وہ بغیر اس کے بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان اُن عبارات کو سمجھے جن کو وہ نماز میں پڑھتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا خدا کی فرض کی ہوئی عبارت کو فرض سمجھنا، اور نماز کا وقت آنے پر ادائے فرض کے لیے اٹھنا، اور اس کا اہتمام کرنا، پھر پوری شرائط اور تمام ارکان کے ساتھ نماز کو اس طرح ادا کرنا کہ گویا اسے اس امر کا شعور ہے کہ خدا اس کی خفی سے خفی باتوں کو بھی سن رہا ہے، اور یہ کہ اگر وہ نماز میں کوئی چیز بھی کم کر دے گا تو خدا کو اس کا علم ہو جائے گا، پھر اس کا یہ سمجھنا کہ یہ رکوع و سجود اور قیام و قعود جو کچھ بھی میں کر رہا ہوں صرف خدا کے لیے ہے، اور خدا کے سوا میں کسی کا عبادت گزار نہیں ہوں، یہ سب امور اُس مقصد کی تحصیل کے لیے بالکل کافی ہیں جس کے لیے نماز فرض کی گئی ہے۔ لیکن خطبہ جس غرض کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ بغیر اس کے حاصل نہیں ہو سکتی کہ سامعین اس کو سمجھیں۔ اس لیے کہ خطبے کا مقصد محض خدا کی یاد اور ذاتِ حق کی طرف رجوع اور خشیت اور انابت ہی نہیں ہے، بلکہ احکامِ دین کی تبلیغ و تعلیم اور وعظ و تذکیر بھی ہے۔ اور یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ لوگ اُن احکام اور مواعظ کو نہ سمجھیں جو خطبے میں بیان کیے جاتے ہیں۔

بعض لوگ اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ خطبے کا مقصد تبلیغ احکام اور وعظ و تذکیر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خطبے کو ذکر اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ (فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ) لہٰذا خطبہ بھی ویسی ہی عبادت ہے جیسی کہ نماز ہے اور اس کے لیے بھی یہ ضروری نہیں کہ لوگ اس کو سمجھیں۔ اس کی تائید میں وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ خطبے کی شرط پوری کرنے کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کافی ہے، اور عرفِ عام میں جس چیز کو خطبے سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ نمازِ جمعہ کے لیے شرط نہیں ہے۔ نیز وہ سیدنا عثمانؓ کے اس واقعے سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ جب آپ خلیفہ ہوئے اور خطبہ دینے کے لیے اُٹھے تو آپ پر مجمع کا رعب طاری ہو گیا اور صرف الحمد للہ کہہ کر بیٹھ گئے اور صحابہ کرام کی جماعت نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

لیکن یہ استدلال متعدد وجوہ سے غلط ہے۔

اوّلاً یہ یقینی نہیں کہ آیا فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ میں ذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد خطبۂ جمعہ ہے۔ ذکر سے مراد نماز بھی ہو سکتی ہے، بلکہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن میں اکثر اس لفظ سے نماز ہی مراد لی گئی ہے۔ مفسرین اور اہلِ فقہ میں یہ امر مختلف فیہ ہے کہ آیا ذکر سے مراد صرف خطبہ ہے یا صرف نماز یا نماز اور خطبہ دونوں[1]۔ مگر آیت کے سیاق پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ذکر کو نماز کے معنی میں لینا زیادہ درست ہے، کیونکہ پہلے اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فرمایا، پھر اس کی جزا یہ بیان کی کہ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں ذکر سے مراد نماز ہی ہے۔ اور خطبہ محض ضمناً ذکر میں شامل ہو جاتا ہے۔ ورنہ اگر ذکر سے مراد صرف خطبہ ہوتا تو اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَالصَّلٰوۃِ فرمایا جاتا۔

ثانیاً: ذِکْرِ اللّٰہِ کو اگر نماز کے معنی میں نہ لیا جائے بلکہ یادِ خدا کے معنی میں لیا جائے تو یہ کس دلیل سے ثابت ہوا کہ خدا کی یاد صرف عربی زبان ہی میں ہونی چاہیے؟ اللہ کے ذکر کو عربی زبان تک محدود کرنا تو عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔ قرآن اور حدیث میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ خدا کو یاد کرنا ہو تو صرف عربی میں کرو۔ چنانچہ اسی بنا پر امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اَلذِّکْرُ الْمُفِیْدُ لِلتَّعْظِیْمِ یَحْصُلُ بِ خدائے بزرگ ہست کَمَا یَحْصُلُ بِقَوْلِہٖ اَللّٰہُ اَکْبَرُ یعنی اللہ کی بڑائی بیان کرنے کے لیے جس طرح اللہ اکبر کہنا مفید ہے اسی طرح فارسی میں 'بزرگ است' کہنا بھی مفید ہے۔ اور امام محمد ان کی تائید میں کہتے ہیں اَلذِّکْرُ یَحْصُلُ بِکُلِّ لِسَانٍ خدا کی یاد ہر زبان میں ہو سکتی ہے۔

ثالثاً: خطبے کی شرط پوری کرنے کے لیے اگر حنفیہ نے محض حمد وثنا کو کافی سمجھا ہے تو اس کے معنی یہ کب ہیں کہ خطبے کا جو مقصد ہے وہ بس حمد وثنا ہی سے حاصل ہو جاتا ہے اور اس کے سوا دوسری چیزیں محض زوائد ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں۔[2] حنفیہ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ نمازِ جمعہ کے لیے جماعت کی شرط صرف تین آدمیوں سے پوری ہو جاتی ہے۔ پھر کیا اس کا مطلب یہ لینا درست ہوگا کہ جمعہ کی اقامت سے جو مقصد ہے وہ بس اسی مختصر سی جماعت سے حاصل ہو جاتا ہے اور جماعتِ کثیرہ کا فراہم ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

رابعاً: خود اکابر حنفیہ ہی نے یہ تصریح کی ہے کہ خطبے سے مقصود ذکر اور موعظت ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے وَلَوْ خَطَبَ

۱- ابن ہمام کہتے ہیں: فاسعوا الی ذکر الله، فالظاهران المراد بالذكر الصلوٰة و يجوزكون المراد به الخطبة (فتح القدیر) صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: والمراد بذكر الله الخطبة والصّلوٰة وستظهرآن المراد به الصّلوٰة ويجوز كون المراد به الخطبة. سعید ابن المسیب کے نزدیک ذکر سے مراد موعظۃ الامام ہے۔ (احکام القرآن للجصاص) علامہ ابوبکر جصاص کی رائے یہ ہے کہ ذکر سے مراد صرف خطبہ ہے ویدل ان المراد بالذكر ههنا هو الخطبة. لان الخطبة هي التي تلي النداء و قدامر بالسعي اليه فدل على ان المراد الخطبة. (مؤلف)

۲- حضرت عثمانؓ کے واقعے سے اس معاملے میں جو استدلال کیا جاتا ہے وہ درست نہیں ہے۔ اول تو اس واقعے میں خود اس امر کی تصریح ہے کہ حضرت عثمان نے قصداً ایسا نہیں کیا تھا، بلکہ مجمع سے مرعوب ہو جانے کی وجہ سے ان کی قوت گویائی جواب دے گئی تھی اس لیے انھوں نے خطبے کو مختصر کر دیا۔ دوسرے یہ بھی غلط ہے کہ انھوں نے صرف حمد وثنا پر اکتفا کی تھی۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ جب انھوں نے دیکھا کہ قوت گویائی جواب دے رہی ہے تو صرف اتنا کہہ کر بیٹھ گئے کہ ان ابا بكر و عمر كان ليعدّان لهذا المقام مقالا و انتم الى امام فعال احوج منكم الى امام قوال و ستاتيكم الخطب بعد واستغفر الله لى ولكم. یعنی اس موقع کے لیے ابوبکرؓ اور عمرؓ تقریر تیار کر کے آتے تھے۔ اور تم کو اصل حاجت تو کام کرنے والے امام کی ہے نہ کہ بولنے والے امام کی۔ رہیں تقریریں تو وہ بھی آگے چل کر پیش کی جائیں گی۔ اور میں اللہ سے اپنے لیے اور تم سب کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قاعداً اَوْ عَلٰی غَیْرِ طَہَارَۃٍ جَازَ لِحُصُوْلِ الْمَقْصُوْدِ اگر امام بیٹھ کر خطبہ دے یا غیر طاہر ہونے کی حالت میں دے تب بھی جائز ہے کیونکہ مقصود اس طرح بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

اور علامہ ابن ہمام اس مقصود کی شرح یہ کرتے ہیں کہ وھو الذکر و الموعظۃ۔ یعنی اس سے مراد ذکرِ خدا اور نصیحت ہے۔ ایک حنفیہ پر ہی کیا موقوف ہے، متقدمین میں سب کے سب خطبے کا مقصد یہی سمجھتے تھے اور اسی بنا پر ان کی زبان میں اکثر خطبے کے لیے موعظۃ الامام کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ علامہ ابن حجر فتح الباری میں ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَمِنْ حِکْمَۃِ اِسْتِقْبَالِھِمُ الْاِمَامَ التَّھَیُّؤُ لِسَمَاعِ کَلَامِہٖ وَ سُلُوْکُ الْاَدَبِ مَعَہٗ فِیْ اِسْتِمَاعِ کَلَامِہٖ فَاِذَا اسْتَقْبَلَہٗ بِوَجْھِہٖ وَ اَقْبَلَ عَلَیْہِ بِجَسَدِہٖ وَ بِقَلْبِہٖ وَ حُضُوْرِ ذِھْنِہٖ کَانَ اَدْعٰی لِتَفَھُّمِ مَوْعِظَتِہٖ وَ مُوَافَقَتِہٖ فِیْمَا شُرِعَ لَہُ الْقِیَامُ لِاَجْلِہٖ حاضرین کو جو امام کی طرف رخ کر کے بیٹھنے کی ہدایت کی گئی اس کی حکمت یہ ہے کہ وہ اس کے کلام کو سننے کے لیے تیار ہوں اور کلام کی سماعت میں اس کے ساتھ ادب کو ملحوظ رکھیں۔ جب سننے والا اپنا چہرہ اس کی طرف رکھے گا اور اپنے جسم و قلب کے ساتھ اس کی جانب متوجہ ہوگا اور حضورِ ذہن کے ساتھ سنے گا تو امام کی موعظت اچھی طرح اس کی سمجھ میں آئے گی اور یہ اس مقصد کے لیے مددگار ہوگا جس کے لیے امام کو کھڑے ہو کر خطبہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ (فتح الباری، ج ۲، ص ۲۷۳)

خامساً: یہ امر غور طلب ہے کہ اگر خطبے کا طریقہ جاری کرنے سے شارع کا مقصد محض اللہ کا ذکر ہی کرنا ہوتا تو کیا اس کے لیے نماز کافی نہ تھی، حالانکہ وہ اس مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ نماز جیسی کامل و اکمل عبادت کو مختصر کر کے اس کے وقت کا ایک حصہ خطبے کو دیا گیا اور اس کو جمعہ کی شرائط میں داخل کیا گیا؟

سادساً: نماز جمعہ کے لیے خطبے کا شرط ہونا جس چیز سے فقہا نے نکالا ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا متواتر عمل ہے۔ چونکہ آنحضرتؐ اور آپؐ کے خلفا اور صحابہ کرام نے کبھی جمعہ بغیر خطبے کے نہیں پڑھا اس لیے یہ حکم مستنبط کیا گیا کہ جمعہ کے لیے خطبہ شرط ہے۔ بالکل اسی طرح آپؐ کے اور صحابہ کرام کے متواتر عمل سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ محض حمد و ثنا ہی پر مشتمل نہ ہوتا تھا، بلکہ اس میں خوفِ خدا کی تلقین بھی ہوتی تھی، شریعت کے احکام بیان ہوتے تھے، اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لیے نصیحتیں ہوتی تھیں، قومی اور شخصی معاملات پر توجہ کی جاتی تھی، حتیٰ کہ عین خطبے کی ہی حالت میں امام کسی خاص شخص کی کوئی غلطی دیکھتا تو اس کی اصلاح کرتا، کسی مصیبت زدہ کو دیکھتا تو اس کی مدد کے لیے لوگوں کو توجہ دلاتا، عوام سے کسی کی شکایت ہوتی تو وہ امام کے سامنے اس کو پیش کرتا اور امام اس کی طرف متوجہ ہوتا۔ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے کوئی جمعہ بغیر خطبے کے نہیں پڑھا اسی طرح آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہؓ نے کوئی خطبہ ایسا بھی نہیں پڑھا جو مذکورہ بالا خصوصیات سے عاری ہو۔

چند خُطَب ماثورہ

اس مطلب کی توضیح کے لیے ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند خطبات یہاں نقل کرتے ہیں[1] جن سے معلوم ہوگا کہ شارع

۱- تفہیم الاحادیث، سوم، ص ۳۸۷-۳۸۹ نیز ۴۰۲۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی نگاہ میں خطبۂ جمعہ کی دراصل کیا حیثیت تھی۔

عَنْ عُبَيْدِ بْنِ السَّبَّاقِ مُرْسَلاً قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِيْ جُمُعَةٍ مِّنَ الْجُمَعِ: يَامَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ! اِنَّ هٰذَا يَوْمٌ جَعَلَهُ اللّٰهُ عِيْدًا فَاغْتَسِلُوْا وَمَنْ كَانَ عِنْدَهٗ طِيْبٌ فَلَا يَضُرُّهٗ اَنْ يَّمَسَّ مِنْهُ، عَلَيْكُمْ بِالسِّوَاكِ (موطا، ابن ماجہ) عبید بن السباق سے مرسلاً مروی ہے کہ حضور نے ایک مرتبہ جمعہ کے خطبے میں فرمایا: اے مسلمانو! اس دن کو اللہ نے عید مقرر کیا ہے۔ لہٰذا تم آج کے دن غسل کرو۔ اور جس کے پاس خوشبو موجود ہو وہ اگر استعمال کرلے تو کیا نقصان ہے۔ اور دیکھو مسواک ضرور کرو۔

ابوسعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ مجھے تمھارے حق میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ زمین کی برکات ہیں۔ کسی نے پوچھا: یارسول اللہ زمین کی برکات سے کیا مراد ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا: دنیا کی زینت وشوکت۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا بھلائی سے بھی برائی آتی ہے؟ حضورؐ سن کر کچھ دیر خاموش رہے یہاں تک کہ لوگوں نے گمان کیا کہ کوئی چیز آپؐ پر اُتر رہی ہے۔ پھر آپؐ نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور فرمایا: وہ سائل کہاں ہے؟ اس نے کہا: میں حاضر ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: بھلائی صرف بھلائی سے آتی ہے۔ اس دنیا کا مال بہت خوشنما اور شیریں ہے۔ فصل بہار میں جب یہ خوب پھلتی ہے تو اسے پیٹ بھر کر کھانے والا جانور بدہضمی سے مرجاتا ہے یا مرنے کے قریب جالگتا ہے۔ البتہ وہ جانور بچ جاتا ہے جس نے دیکھا کہ کھاتے کھاتے کوکھیں پھول گئی ہیں تو کھانا چھوڑ دیا، دھوپ میں چلا پھرا، کچھ جگالی کی، کچھ بول وبراز کی راہ سے نکالا اور جب پیٹ خالی ہوگیا تب دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس مال کو جو شخص حق کی راہ سے لے گا اور حق کی راہ میں نکال دے گا اس کے لیے تو یہ بہترین مددگار ہے۔ اور جو حق کے بغیر لے گا اس کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو کھاتا چلا جائے اور شکم سیر نہ ہو (بخاری، کتاب الرقاق وکتاب الزکوٰۃ)

عمرو بن تغلب کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ کے پاس کچھ مال آیا تھا جس کو آپؐ نے بعض لوگوں میں بانٹ دیا اور بعض کو چھوڑ دیا۔ بعد میں آپؐ کو معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو چھوڑ دیا گیا انھیں رنج ہے۔ اس کے متعلق آپؐ نے خطبے میں فرمایا کہ میں ایک شخص کو دیتا ہوں اور دوسرے کو نہیں دیتا۔ جس کو میں نہیں دیتا وہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہوتا ہے جس کو میں دیتا ہوں۔ ایک جماعت کو دیتا ہوں۔ جبکہ ان کے دلوں میں بیتابی اور بے چینی دیکھتا ہوں اور ایک جماعت کو اس کی بے نیازی اور نیکی کے حوالے کردیتا ہوں جو اللہ نے ان کے دلوں میں پیدا کی ہے۔ (بخاری)

مشہور حدیث ہے کہ ایک شخص نمازِ جمعہ میں حاضر ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ آپؐ نے پکار کر اس سے پوچھا: اے شخص! کیا تو نماز پڑھ چکا ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: تو اُٹھ اور نماز پڑھ۔ دراصل یہ شخص پھٹے حالوں تھا۔ آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس کی بدحالی کو دیکھ لیں۔ جب وہ نماز پڑھ چکا تو آپؐ نے لوگوں کو صدقے کی ترغیب دلائی۔ اس حدیث کے اطراف قریب قریب تمام صحاح اور سنن اور مسانید میں آئے ہیں۔ امام احمد نے جو حدیث نقل کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے اُس میں خود حضورؐ کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ یہ شخص جب مسجد میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ بہت شکستہ حال ہے اس لیے میں نے اسے حکم دیا کہ دو رکعت نماز پڑھ لے۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی شخص اس کی حالت دیکھ لے اور اس کو کچھ صدقہ دے دے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ خطبہ دے رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک شخص لوگوں کے اوپر سے پھاندتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ آپؐ نے پکار کر فرمایا: بیٹھ جاؤ، تم نے لوگوں کو تکلیف دی۔ (ابو داؤد، نسائی)

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک روز حضورؐ خطبہ دے رہے تھے اور قحط سالی کا زمانہ تھا۔ ایک شخص نے فریاد کی کہ یا رسول اللہؐ! جانور مر گئے اور بال بچے فاقے کر رہے ہیں، اللہ سے دعا فرمایئے کہ بارش ہو جائے۔ آپؐ نے اسی وقت دُعا فرمائی۔ خدا کے فضل سے بارش شروع ہو گئی اور دوسرے جمعے تک لگاتار جاری رہی۔ پھر دوسرے جمعے کو آپؐ خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو وہی شخص پھر اُٹھا اور بولا کہ یا رسول اللہ! مکان گر گئے اور مال و اسباب تباہ ہو رہے ہیں۔ خدا سے دُعا فرمایئے۔ آپؐ نے پھر دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ خطبہ دے رہے تھے۔ اتنے میں حضرت عثمانؓ تشریف لائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جمعہ کی اذان کے بعد نماز کے لیے آنے میں دیر کرتے ہیں۔ پھر حضرت عثمانؓ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا یہ کون سا وقت ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں کام میں لگا ہوا تھا۔ اذان کی آواز سنی تو گھر جانے کے بجائے وضو کر کے سیدھا یہاں چلا آ رہا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا: خوب! آنے میں دیر تو لگائی ہی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ آپ صرف وضو ہی پر اکتفا کر آئے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے روز غسل کرنے کا حکم دیا ہے۔ (بخاری، مؤطا، مسلم)

یہ اُن کثیر التعداد خطبوں میں سے چند ہیں جو معتبر روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے منقول ہیں۔ ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کا خطبہ جن کے متواتر عمل کی بدولت مشروع سمجھا گیا ہے اُن کے ہاں خطبے کے معنی محض ذکر اللہ کے نہ تھے بلکہ وہ اس سے تبلیغ، تعلیم، اصلاح، ہدایت اور بہت سے قومی و شخصی معاملات کی انجام دہی کا کام لیتے تھے۔ دراصل یہ چیز اس لیے مشروع نہیں کی گئی تھی کہ لوگ ہفتے میں ایک بار نماز سے پہلے رسمی طور پر اسی قسم کی ایک چیز سن لیں جیسی مسیحی گرجاؤں میں درس (sermon) کے نام سے سنائی جاتی ہے۔ بلکہ اس کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا ایک متحرک اور کارفرما پرزہ بنایا گیا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ہفتے میں ایک مرتبہ لازمی طور پر تمام مسلمانوں کو جمع کر کے اللہ کے احکام سنائے جائیں، دین کی تعلیمات ان کے ذہن نشین کی جائیں، ان کی جماعت میں یا اُن کے افراد میں جو کچھ خرابیاں رونما ہوں ان کی اصلاح کی جائے، اور قومی فلاح و بہبود کے کاموں کے طرف انھیں توجہ دلائی جائے۔ نیز مرکزِ حکومت میں امام (head of the state) براہِ راست خود اپنی حکومت کی پالیسی پبلک کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہیں عوام الناس میں سے ہر ایک کو اس سے سوال کرنے اور اس کے سامنے اپنی بات کہنے کا موقع حاصل ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نماز اور خطبے کا ایک اور فرق

نماز اور خطبۂ جمعہ کے درمیان ایک فرق اور بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ نماز میں جتنی چیزیں پڑھی جاتی ہیں وہ سب لفظاً لفظاً معیّن کر دی گئی ہیں۔ جو شخص عربی نہ جانتا ہو، وہ تھوڑا سا وقت صرف کر کے بآسانی اُن کا ترجمہ یاد کر سکتا ہے، یا اُن کے مفہومات ذہن نشین کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے نماز کی عربی میں ہونے سے اس امر کا کوئی خوف نہیں ہے کہ عربی نہ جاننے والے ان عبارات کے معنوی فوائد سے بالکل محروم رہ جائیں گے جنھیں نماز میں وہ پڑھتے ہیں۔ بخلاف اس کے خطبۂ جمعہ کے لیے کوئی عبارت مقرر نہیں ہے۔ ہر جمعہ کو ایک نیا خطبہ ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ پہلے سے یاد کر لینا، یا اس کا مفہوم ذہن نشین کر کے آنا لوگوں کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا خطبے کے لیے عربی کو لازم کر دینے کا نتیجہ قطعاً یہی ہے کہ غیر عربی دان لوگوں کے حق میں وہ محض ایک بے معنی چیز اور ایک بے جان مذہبی رسم بن کر رہ جائے، اور شارع کے وہ تمام مقاصد فوت ہو جائیں جن کے لیے اس نے جمعہ کا خطبہ مشروع کیا ہے۔ ایک معمولی عقل کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ترکی بولنے والوں کے سامنے سنسکرت میں تقریر کرنا اور فارسی زبان والوں کو جرمن زبان میں مخاطب کرنا محض ایک مہمل حرکت ہے۔ پھر شارع حکیم کے متعلق یہ کیونکر گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ احکامِ دین کی تفہیم اور مکارمِ اخلاق کی تعلیم کے لیے کسی ایسی زبان میں وعظ کرنے کا حکم دے گا جس کو سامعین سمجھتے ہی نہ ہوں۔

خلاصۂ مباحث

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے تین باتیں واضح ہو جاتی ہیں:

ایک یہ کہ خطبہ نماز کا جزو نہیں ہے، لہٰذا نماز کے لیے عربی زبان کے لازم ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خطبے کے لیے بھی عربیت واجب ہو۔

دوسرے یہ کہ خطبے کا طریقہ مقرر کرنے سے شارع کے پیشِ نظر جس قدر مقاصد ہیں وہ سب کے سب ایسی حالت میں فوت ہو جاتے ہیں جبکہ خطبہ کسی ایسی زبان میں پڑھا جائے جس کو سامعین نہ سمجھتے ہوں۔ بخلاف اس کے نماز جن مقاصد کے لیے شارع نے فرض کی ہے ان میں سے کوئی اہم مقصد مصلّیوں کے عدمِ فہم سے فوت نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ عدمِ فہم سے نماز میں تو محض ایک جزئی سا نقصان آتا ہے مگر خطبے میں اس سے کلی نقصان واقع ہو جاتا ہے۔

تیسرے یہ کہ نماز میں عدمِ فہم سے جو ایک جزئی سا نقصان واقع ہوتا ہے وہ بھی نماز کا ترجمہ یاد کر کے بآسانی رفع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن خطبے میں اس سے جو کلی نقصان واقع ہوتا ہے اسے رفع کرنے کی کوئی سبیل نہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تعیینِ خطبۂ غیر عربیہ کے دلائل

اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ غیر عربی خطبے کے جواز میں کوئی امرِ شرعی تو مانع نہیں ہے؟ اس سلسلے میں جب ہم قرآن اور سنت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو کہیں صراحتاً کیا معنی، کنایتاً بھی کوئی حکم ایسا نہیں ملتا جس سے خطبے کے لیے عربی زبان ضروری سمجھی جا سکے۔ جو لوگ عربیت کے لزوم پر زور دیتے ہیں انھوں نے بھی کوئی آیت یا حدیث پیش نہیں کی ہے۔ ان کا استدلال صرف یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اور سلفِ صالح نے ہمیشہ عربی زبان ہی میں خطبہ پڑھا ہے اور کبھی خطبے کے لیے عربی کے سوا دوسری زبان استعمال نہیں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں کبھی کبھی غیر عرب بھی موجود ہوتے تھے، مگر کسی روایت میں نہیں آیا کہ آپؐ نے ان کی تفہیم کے لیے غیر عربی میں خطبہ دیا ہو یا عجمی زبانیں جاننے والے صحابہ میں سے کسی کو ان کی تفہیم پر مامور کیا ہو۔ حضور کے بعد صحابہؓ سب سے بڑھ کر تبلیغِ دین اور تذکیر و ارشاد کا جذبہ رکھتے تھے، اور اُن کے عہد میں بکثرت عجمی ممالک بھی فتح ہو چکے تھے جن کے باشندے عربی نہ سمجھتے تھے۔ مگر ان بزرگوں نے بھی عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں خطبہ جاری نہیں کیا۔ اسی بنا پر متقدمین اور متاخرین میں سے ایک گروہِ کثیر نے یہ رائے قائم کی ہے کہ صحتِ خطبہ اور ادائے سنت کے لیے خطبے کا عربی میں ہونا شرط ہے۔ صرف ایک امام ابوحنیفہؒ ہیں جو غیر عربی خطبے کو مطلقاً جائز رکھتے ہیں۔ ان کے سوا سلف میں اور کوئی نہیں جو اس کے جواز کا قائل ہو۔[1]

استدلالِ مذکور پر تنقیدی نظر

ہمارے نزدیک اس استدلال میں متعدد اصولی غلطیاں ہیں۔ اولین غلطی یہ ہے کہ یہ حضرات شرعی عمل اور عادی و طبیعی عمل میں فرق نہیں کرتے جس کی طرف ہم ابتداً اپنے چوتھے مقدمے میں اشارہ کر آئے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان عربی تھی۔ آپؐ کے مخاطب بھی عرب تھے یا ایسے عجمی تھے جو عرب میں رہتے تھے اور عربی جان گئے تھے، مثلاً سلمانِ فارسیؓ۔ اگر آپؐ ان کے سامنے عربی میں خطبہ نہ دیتے تو اور کس زبان میں دیتے؟ نبی عربی کا اہلِ عرب کے سامنے عربی میں تقریر کرنا ایک طبعی فعل ہے۔ اس کو حجتِ شرعی بنانا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ اگر آپؐ نے یہ فرمایا ہوتا کہ خطبہ عربی ہی میں دیا کرو اور کوئی دوسری زبان اس غرض کے لیے نہ استعمال کرو تو بلاشبہ یہ ارشاد حجتِ شرعی ہوتا۔ لیکن جب کہ آپؐ نے ایسا نہیں فرمایا تو خطبۂ عربیہ کو محض اس بنا پر 'سنت' قرار نہیں دیا جا سکتا کہ حضورؐ نے ہمیشہ عربی میں خطبہ دیا ہے۔ اس طرح کے طبیعی اور عادی افعال کو شرعی اصطلاح میں سنت قرار دینے کے تو یہ معنی ہوں گے کہ عربی زبان میں گفتگو کرنے کو بھی مسنون ٹھیرایا جائے۔ کیونکہ حضورؐ نے تمام عمر اسی زبان میں کلام فرمایا ہے اور غیر عربی میں گفتگو کرنا آپؐ سے ثابت نہیں ہے۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ آپؐ کا عربی میں نماز

1- امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے متعلق بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ خطبے کے مسئلے میں امام اعظم سے متفق ہیں۔ اور بعض روایات میں یہ ہے کہ وہ صرف اُس شخص کے لیے غیر عربی خطبہ کو جائز رکھتے ہیں جو عربی زبان میں خطبہ دینے پر قادر نہ ہو۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پڑھنا بھی تو ایک طبعی فعل تھا۔ پھر تم اس کو کس بنا پر شرعی فعل قرار دیتے ہو؟ تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ نماز کے لیے عربیت کا وجوب محض اس بنا پر نہیں ہے کہ حضورؐ نے ہمیشہ عربی میں نماز پڑھی ہے۔ بلکہ اس طبعی عمل کے ساتھ شرعی حکم بھی موجود ہے اور متعدد مصالحِ شرعیہ بھی اس کے ساتھ وابستہ ہیں، جن کو پہلے ہم بیان کر چکے ہیں، اس لیے عربی زبان میں نماز ادا کرنا واجب قرار پایا ہے۔ بخلاف اس کے عربی نہ جاننے والے لوگوں کے سامنے عربی میں خطبہ دینا کسی مصلحتِ شرعی کا حامل نہیں۔ بلکہ اس سے شریعت کے مقاصد اُلٹے فوت ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کو محض اس دلیل سے لازم قرار نہیں دیا جا سکتا کہ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی جاننے والے لوگوں کے سامنے ہمیشہ عربی میں خطبہ دیا ہے۔

استدلالِ مذکور کی دوسری غلطی یہ ہے کہ اس میں زمانے اور حالات کے اختلاف سے قطع نظر کر لیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جو عجمی الاصل لوگ مجالسِ نبویہ میں حاضر ہوتے تھے وہ زیادہ تر وہی تھے جو عربی زبان سے واقف تھے۔ اور اگر بفرضِ محال ان میں کوئی اِکا دُکا ایسا ہو بھی جو عربی سے ناواقف ہو تو ظاہر ہے کہ عربی بولنے والوں کے کثیر التعداد گروہ کو چھوڑ کر اُس ایک شخص یا دو چار شخصوں کی خاطر خطبے کی زبان نہیں بدلی جا سکتی تھی[1]۔ پھر عہدِ نبوی کے بعد جب صحابہ کرام فتح وظفر کے جھنڈے لے کر عجمی ممالک میں پہنچے تو ان کی حیثیت ایک حاکم قوم کی تھی۔ ان کے پاس سیاسی طاقت تھی۔ وہ غالب تھے، مغلوب نہ تھے۔ وہ دوسروں کے سمجھانے کے حاجت مند نہ تھے بلکہ دوسرے خود ان سے سمجھنے کے حاجت مند تھے۔ ان کے اندر اتنا بل بوتا تھا کہ اپنی زبان کو دوسرے ملکوں میں پھیلا دیں اور درحقیقت انھوں نے بخارا سے سپین تک اسے پھیلا کر ہی چھوڑا۔ حتیٰ کہ ان کے فتح کردہ اکثر و بیشتر ممالک کی اصلی زبانیں عربی زبان کے مقابلے میں قریب قریب فنا ہو گئیں۔ پھر ان کو کیا ضرورت تھی کہ اپنی زبان کو چھوڑ کر مفتوح قوموں کی زبانوں میں خطبے دیتے؟ لیکن آج وہ حالت نہیں ہے۔ مدتیں ہوئیں کہ عربیت کا غلبہ ختم ہو چکا ہے۔ دنیائے اسلام کے بیشتر ممالک میں اب صدیوں سے عربی زبان کا چرچا نہیں ہے اور سیاسی و علمی ضعف کی بنا پر روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ عربیت کے پاس اب وہ طاقت ہی نہیں ہے جس سے وہ پھیلے اور زبانوں پر چھائے۔ اس کمزوری کی حالت میں اُس طرزِ عمل پر اصرار کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے جو صحابہؓ کرام اور ان کے قریب العہد لوگوں نے غلبہ و طاقت کے عہد میں اختیار کیا تھا؟

تیسری غلطی یہ ہے کہ سلفِ صالح نے جو رائے مخصوص حالات میں قائم کی تھی اس کو شرعی معنوں میں اجماع کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں صدرِ اول کے تمام اکابر غالب اور فاتح قوم کے لوگ تھے۔ اگرچہ اسلام نے ان کو وطنی اور نسلی اور لسانی عصبیتوں سے پاک ضرور کر دیا تھا، مگر یہ کیونکر ممکن تھا کہ ان کے اندر وہ کیفیات پیدا نہ ہوتیں جو طبعاً ہر قوم میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا مفتوح قوموں کی زبانوں سے پرہیز کرنا، اور اپنے آپ کو ان کی بولیوں سے بچانا، اور ان کے اندر اپنی زبان پھیلانے کی کوشش کرنا ایک طبعی امر تھا اور غلبہ و طاقت کی فطرت ہی اس کی مقتضی تھی کہ یہ بات اُن میں پیدا ہو۔ اس پر مزید

۱۔ اس مقام پر یہ جاننا فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر عرب لوگوں سے خط و کتابت کرنے کے لیے اپنے سیکرٹری حضرت زید بن ثابت کو سریانی زبان کی تعلیم دلوائی تھی۔ (الاستیعاب لابن عبد البر، جلد اول، ص ۱۸۹) اسی طرح بعض دوسرے صحابہ کے متعلق یہ ذکر ملتا ہے کہ انھوں نے غیر زبانیں سیکھی تھیں۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ کہ اُن کی زبان قرآن وسنت کی زبان تھی۔ اسلام کا سارا سرمایہ اسی زبان میں تھا۔ اسلام کی اصلی اسپرٹ کا تحفظ خالص عربیت کے تحفظ ہی پر موقوف تھا۔ اس چیز نے ان کے اندر زبان کی حد تک عربیت کا تعصب اور بھی زیادہ پیدا کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکابرِ سلف کسی حال میں بھی عجمی زبان بولنے کو پسند نہ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ عجمی الفاظ کا استعمال بھی ان کو گوارا نہ تھا۔ سیدنا عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ لا تتعلموا رطانة الاعاجم عجمیوں کی بولی نہ سیکھو۔

سیدنا علیؓ کے سامنے ایک مرتبہ نوروز کا ہدیہ پیش کیا گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا: کیا ہے؟ عرض کیا گیا: آج نوروز ہے۔ آپ نوروز کا لفظ سن کر چیں بجیں ہو گئے۔ محمد بن سعید ابی وقاصؓ نے ایک جماعت کو فارسی بولتے سنا تو کہنے لگے: ما بال المجوسية بعد یہ مجوسیت لوگوں میں کہاں سے گھس آئی؟ امام احمد ابن حنبل سے پوچھا گیا کہ عجمی زبان میں دعا کرنا کیسا ہے؟ فرمانے لگے: لسانُ سوءٍ بری زبان ہے۔ امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ عجمی زبان میں نہ دُعا مانگو اور نہ قسم کھاؤ۔ امام شافعی عربی زبان کے سوا ہر دوسری زبان میں بات چیت کرنے کو مکروہ قرار دیتے تھے۔ یہی حال اُس زمانے کے اکثر فقہا کا تھا۔ وہ عجمی زبان کے استعمال کو عموماً اور دعا و ذکر میں اس کے استعمال کو خصوصاً برا سمجھتے تھے۔ ان بزرگوں کے اس طرزِ عمل پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ دراصل کسی شرعی بنیاد پر نہ تھا بلکہ ایک بڑی حد تک اس طرزِ عمل کی بنا فطری اسباب پر تھی، اور حالات کی طاقت نے ان کو ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ورنہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ اسلام کو وطنی اور لسانی عصبیت سے کوئی علاقہ نہیں۔ وہ کسی خاص قوم کا مذہب نہیں ہے۔ نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ کسی خاص زبان کی حمایت کرے اور بس ایک ہی زبان بولنے والوں کا دین بن کر رہ جائے۔

بزرگانِ سلف نے عجمی زبانوں کی کراہت اور ان سے اجتناب اور دینی و دنیوی اغراض کے لیے ان کے استعمال کی ممانعت پر جو زور دیا تھا اس کا ایک سبب اور بھی تھا۔ صدرِ اوّل کی تاریخ پر آپ نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُس زمانے میں عرب کے سوا دوسری قومیں عموماً غیر مسلم تھیں اور اسلام زیادہ تر عربی قوم میں ہی تھا۔ اس صورتِ حال نے اس وقت عربیت کو اسلام کا اور عجمیت کو کفر کا ہم معنی بنا رکھا تھا۔ عجمی قوموں کے جو افراد اسلام لاتے تھے اُن کا رشتہ ملتِ کفر سے توڑنے کے لیے اور ملتِ اسلام میں اُن کو جذب کرنے کے لیے ناگزیر تھا کہ ان کو عربیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جاتی، اور ان کی معاشرت، لباس، آداب واطوار، بول چال، ہر چیز کو بدل ڈالا جاتا۔ کیونکہ باطنی تغیر کی تکمیل خارجی تغیر کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اگر ان کو محض مسلمان بنا کر چھوڑ دیا جاتا، اور تمدنی ولسانی اور ادبی حیثیت سے وہ بدستور کفار اقوام کا جز بنے رہتے تو کفر کے سمندر میں اسلام کے یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے پیدا ہونے کے ساتھ ہی فنا بھی ہوتے چلے جاتے۔ یہ حالت ایک طویل مدت تک رہی۔ اس کے بعد جب دوسرے ممالک کی بڑی بڑی قومیں مسلمان ہو گئیں تو عربیت اور اسلام کے ہم معنی ہونے کی وہ کیفیت جو ابتدائی صدیوں میں تھی باقی نہ رہی۔ اب ترکی، فارسی، اردو اور دوسری مسلمان قوموں کی زبانیں کفار کی زبانیں نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کی زبانیں ہیں۔ اب عربی لباس اور عربی طرزِ معاشرت بھی لازمی طور پر شعارِ اسلام نہیں ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کا جو عام لباس ہے وہ بھی اسی طرح شعارِ اسلام ہے جس طرح عربی لباس۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ہر وہ لباس اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہر وہ طرزِ معاشرت، جس سے مسلمان غیر مسلموں کے مقابلے میں ممیز ہوتے ہیں، یقیناً اسلامی شعار ہی ہے۔ پس اب حالات کے بدل جانے کے باوجود فقہائے اسلام کا عربیت پر اُس طرح زور دینا درست نہیں جس طرح صدرِ اوّل کے فقہا بالکل مختلف حالات میں زور دیتے تھے۔ ہمارے نزدیک متاخرین کی یہ ایک اصولی غلطی ہے کہ وہ متقدمین کے زمانے اور ان کے حالات کو نہیں دیکھتے اور آنکھیں بند کر کے اُن کے اقوال سے استناد کرنے لگتے ہیں۔

دوسری دلیل

خطبۂ عربیہ کے لزوم پر ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ خدا کا کلام اور اسلام کے تمام احکام زبانِ عربی میں ہیں اور ہر مسلمان پر عربی سے واقف ہونا لازم ہے۔ اگر لوگ عربی کی تحصیل میں غفلت کرتے ہیں اور عربی نہیں سمجھتے تو یہ ان کا قصور ہے۔ ان کی خاطر خطبے کی زبان بدلنا کیا ضرور؟

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے عربی سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے اس کے بغیر انھیں اپنے دین کی سمجھ حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ مسلمانوں میں گمراہیوں کے پھیلنے کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ علمِ دین کے اصل مآخذ تک ان کی رسائی نہیں۔ اسی لیے ہم نے خود بارہا اس ضرورت کا اظہار کیا ہے اور ہماری قطعی راے یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم میں عربی کو لازمی طور پر شامل ہونا چاہیے۔ لیکن 'ہے' اور 'ہونا چاہیے' میں بہت فرق ہے۔ جو کچھ ہونا چاہیے اس کے لیے کوشش کیجیے۔ مگر جو کچھ فی الواقع ہے اس سے آنکھیں بند نہ کر لیجیے۔ شریعت نے آپ کو یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ بس 'چاہیے' کے پیچھے پڑے رہیے اور واقعات کی پروا نہ کیجیے۔ آپ کے حالات تو یہ ہیں کہ آپ کے ہاں مسلمانوں کے لیے عربی تو درکنار دین کی ابتدائی تعلیم تک لازم نہیں ہے، اور اس پر آپ کے تحکم کی کیفیت یہ ہے کہ مسلمان اگر عربی نہیں سمجھتے تو آپ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس کی پروا نہیں، ہم تو عربی ہی میں خطبہ سنائیں گے۔ کیا عربی خطبے پر آپ کے اصرار کا یہ نتیجہ نکلنے کی کوئی اُمید ہے کہ مسلمان محض اس کو سمجھنے کے لیے عربی زبان سیکھنے پر مجبور ہو جائیں؟

تیسری دلیل

تیسری دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ نسبتاً زیادہ وزنی ہے۔ یعنی یہ کہ عربی زبان کے سوا دوسری زبانوں میں خطبے کے جاری ہونے سے اسلام میں لسانی قومیتوں کی بنا پڑنے کا خوف ہے۔ جمعہ تو تمام مسلمانوں کو بلا لحاظِ نسل اور زبان و وطن ایک جگہ جمع کرنا چاہتا ہے، مگر غیر عربی خطبہ اُن کو چھانٹ دے گا اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے جمعہ الگ الگ کرا کے چھوڑے گا۔

یہ خطرہ یقیناً اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اس کا علاج کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ خطبے کا ایک حصہ لازماً عربی زبان میں ہو، اور اسے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے آل و اصحاب پر صلوٰۃ و سلام، اور آیاتِ قرآنی کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تلاوت کے لیے مخصوص کردیا جائے۔ اس کے بعد دوسرا حصہ جس میں احکام اور مواعظ اور ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے اسلامی تعلیمات ہوں وہ ایسی زبان میں ہونا چاہیے جس کو حاضرین یا اُن کی اکثریت سمجھتی ہو، اس غرض کے لیے بھی زیادہ تر اُن زبانوں کو ترجیح دی جانی چاہیے جو مسلمانوں میں بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہوں۔ مثلاً ہندستان میں صوبے دار زبانوں اور مقامی بولیوں کے بجائے زیادہ تر اردو زبان کا خطبہ ہونا چاہیے، کیونکہ اسے قریب قریب ہر صوبے کے مسلمان سمجھتے ہیں۔ البتہ دور دراز کے گوشوں میں جہاں اردو سمجھنے والے کم ہیں، مقامی زبانوں کو خطبے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جہاں مسلمانوں کا بین الاقوامی اجتماع ہو وہاں عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں خطبہ نہ ہونا چاہیے۔

عملی مشکلات

یہاں تک جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے وہ صرف شرعی مسئلے سے متعلق تھا۔ یعنی قانون کی حد تک ہمارے نزدیک غیر عربی خطبے میں کوئی حکمِ شرعی مانع نہیں ہے، اور جو لوگ اس کو ناجائز یا مکروہِ تحریمی یا خلافِ سنت قرار دیتے ہیں وہ ہماری رائے میں غلطی کرتے ہیں۔ لیکن اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ احکام سے نہیں بلکہ عملی مشکلات اور قباحتوں سے تعلق رکھتا ہے۔

عام فہم زبان میں خطبہ ہونے کی ضرورت جس بنا پر ظاہر کی جاتی ہے وہ تو یہی ہے کہ لوگ جب اس کو سمجھیں گے تو فائدہ اٹھائیں گے۔ گویا اصل مقصود سمجھنا نہیں بلکہ فائدہ اُٹھانا ہے لیکن اگر صورت یہ ہو کہ بجائے فائدے کے اُلٹا نقصان ہونے لگے، تو ایسی صورت میں غالباً ہر صاحبِ عقل یہی کہے گا کہ ایسا سمجھنے سے نہ سمجھنا بہتر ہے۔

اب ذرا اپنی قوم کی حالت کا جائزہ لیجیے۔ آپ کے ہاں امامت کا معیار حد سے زیادہ پست ہوچکا ہے۔ جو منصب مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں سب سے زیادہ اہم تھا وہ اب سب سے زیادہ غیر اہم ہے۔ جس منصب کے لیے بہتر سے بہتر آدمی منتخب کرنے کا حکم تھا اب اس کے لیے بدتر سے بدتر آدمی چھانٹا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں اب امام کا تصور یہ ہے کہ جو شخص دنیا کے کسی اور کام کا نہ ہو اس کو مسجد کا امام ہونا چاہیے۔ دس پانچ روپیہ تنخواہ اور دونوں وقت کی روٹی مقرر کردی اور کسی نیم خواندہ مُلا کو رکھ لیا۔ یہ گویا مسجد کی امامت کا انتظام ہوگیا۔ امامت کو اس درجہ پست کردینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مسجدیں، وہی مسجدیں جنھوں نے کبھی ہماری قوم کے قصرِ فلک بوس کی تعمیر کی تھی، آج ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو بے علم، تنگ نظر، پست حوصلہ اور دنی الاخلاق ہیں۔ کیا آپ ان لوگوں سے اُمید رکھتے ہیں کہ یہ اردو میں خطبے دے کر آپ کی دینی و دنیوی رہنمائی کرسکیں گے؟

اس گروہ کو چھوڑ کر اگر آپ نے جمعہ کی امامت کے لیے کسی دوسرے گروہ کا انتخاب کرنا چاہا تو لامحالہ اس کے لیے آپ کو علما ہی کے طبقے کی طرف رجوع کرنا ہوگا، اور باستثنائے چند اس طبقے کے سوادِ اعظم کا جو حال ہے اسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔ ان حضرات کو اگر آپ نے عام فہم زبان میں من مانے خطبے دینے کا موقع دیا تو یقین جانیے کہ آئے دن مسجدوں پر سر پھٹول ہوگی۔ اس لیے کہ ان میں کا ہر شخص اپنا ایک الگ مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اس کے نزدیک گناہ سے کم نہیں۔ پھر اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کیے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا۔ وہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پا کر آتا ہے، اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے، وہاں دین کی مہمات اور قوم کے مصالح کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تمام دلچسپیاں سمٹ کر چند چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس لیے لامحالہ جب وہ زبان کھولے گا انھی مسائل پر کھولے گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ کے گھر میں گالم گلوچ اور جوتی پیزار ہو گی اور آخر کار ہر مشرب کے مسلمان اپنے جمعے الگ الگ قائم کرنے لگیں گے۔ یہ تو مذہبی ذہنیت رکھنے والوں کا حال ہوا۔ رہے نئے تعلیم یافتہ حضرات، جو ان مسائل سے دلچسپی نہیں رکھتے تو ان پر ایک دوسری مصیبت نازل ہو گی۔ وہ ہر جمعہ کو رسول اللہ کے منبر سے وہ موضوع اور ضعیف روایتیں اور لاطائل کہانیاں اور احکامِ اسلامی کی غلط تعبیریں سنیں گے جن کو سن کر غیر مسلموں کا مسلمان ہونا تو درکنار، ذی ہوش مسلمانوں کا مسلمان رہنا بھی مشکل ہے۔

مذہبی دھڑے بندیوں کے علاوہ اب مسلمانوں میں سیاسی دھڑے بندی کا بھی زور ہو رہا ہے۔ جہاں کہیں مولوی قسم کے مِسٹروں، یا مِسٹر قسم کے مولویوں کو امامت و خطابت کا موقع مل گیا ہے، وہاں وہ نہایت منہ پھٹ اور بے لگام طریقے سے اپنے سیاسی مسلک کی تائید اور مسلکِ مخالف کے لوگوں کی تذلیل و تفضیح و تفسیق کرنے لگے ہیں۔ یہ ایک اور فتنہ ہے جو اگر کچھ زیادہ بڑھ گیا تو مسلمانوں کے لیے مل کر نماز پڑھنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ مسجدوں میں وہ کچھ ہونے [لگے گا] جو پولنگ اسٹیشنوں پر ہوا کرتا ہے اور بالآخر ہر سیاسی مسلک کے لوگوں کی مسجدیں الگ ہو کر رہیں گی۔

خطبۂ غیر عربیہ کے اجرا سے پہلے آپ کو ان خرابیوں کا کوئی علاج سوچنا چاہیے۔ میری رائے میں ان کا علاج صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اہلِ علم کی کوئی معتدل جماعت خطباتِ جمعہ کی تیاری کا کام اپنے ہاتھ میں لے اور ایسے خطبے لکھے جو نزاعی مسائل سے پاک ہوں اور مسلمانوں میں صحیح دینی روح پھونکنے والے ہوں۔ پھر ہندوستان میں ہر جگہ صحیح الخیال اور بااثر لوگ کوشش کریں کہ اسی مرکزی جماعت کے تیار کیے ہوئے خطبے نمازِ جمعہ میں پڑھے جائیں۔ اگر ایسی کوئی تنظیم ہو جائے (جس کی امید کم ہی نظر آتی ہے) تو خطبہ غیر عربیہ کے اجرا میں میری تحقیق کی حد تک کوئی امرِ شرعی مانع نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ تنظیم نہ ہو سکے تو مصلحت کا اقتضا یہی ہے کہ عربی کے انھی پرانے خطبوں کو چلنے دیا جائے جن سے کوئی مفید نہیں تو مضر نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا۔ البتہ اگر خوش قسمتی سے کوئی موزون خطیب میسر آ جائے اور وہ اس خدمت کو باحسن وجوہ انجام دے سکے تو اس سے فائدہ اٹھانے میں دریغ بھی نہ کرنا چاہیے۔

(تفہیمات، دوم، نومبر ۱۹۸۱ء، ص ۳۸۶-۳۲۲)

خطبۂ جمعہ کی زبان پر مزید بحث

مسئلے کا ایک پہلو فقہی ہے اور اس نقطہ نظر سے صرف یہ امر بحث طلب ہے کہ آیا خطبے کو عربی زبان میں پڑھنا شرعاً ضروری

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے یا نہیں؟ اس سوال کے متعلق کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لیے حسب ذیل امور کی تحقیق ہونی چاہیے:

کیا خطبہ عربیہ کے وجوب پر کوئی نص ہے؟ اگر نص نہیں ہے اور یہ حکم صرف شارع کے عمل سے ماخوذ ہے تو کیا شارع کا یہ عمل سنت کی تعریف میں آتا ہے؟ آیا اصطلاحِ شرع میں سنت ہر اُس عمل کو کہتے ہیں جو شارع نے کیا ہو، اس باب میں شرعی عمل اور عادی وطبعی عمل میں کیا فرق کیا گیا ہے؟ اگر فرق ہے تو شارع کا عربی میں خطبہ دینا کس قسم کا فعل ہے، شرعی یا طبعی؟

مسئلے کا دوسرا پہلو مصالح سے تعلق رکھتا ہے اور اس بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے حسبِ ذیل امور کا تصفیہ ضروری ہے:

خطبے کا مقصد کیا ہے؟ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے شارع نے اور صدرِ اوّل کے ائمہ نے جو طریقہ اختیار کیا تھا اُس کی پابندی سے آج بھی وہ مقصد حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ شریعت میں مقصد زیادہ اہمیت رکھتا ہے یا وہ وسیلہ جو اس کو حاصل کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہو؟ اگر مقصد زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور کسی خاص صورتِ حال میں طریقہ متوارثہ کی پابندی سے وہ فوت ہو رہا ہو اور اس صورتِ حال کو بدلنے پر ہم قادر نہ ہوں تو کیا ہم اصولِ شرع کے تحت طریقۂ متوارثہ میں کوئی تغیر کر سکتے ہیں؟ اگر تغیر کرنے کا حق ہم کو حاصل ہے تو حالات کے لحاظ سے ہمیں کتنا اور کس طرح کا تغیر کرنا چاہیے؟

یہ ہیں وہ تنقیحات جن کے تصفیے پر زبانِ خطبہ کے سوال کا حل منحصر ہے۔ اگر مراسلہ نگار نے ان تنقیحات کو پیشِ نظر رکھ کر بحث کی ہوتی تو ہم کو یہ معلوم کرنے میں آسانی ہوتی کہ انھیں کن امور میں ہم سے اتفاق ہے اور کن امور میں اختلاف۔ پھر جو اُمور مختلف فیہ باقی رہ جاتے ان پر مزید بحث کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی جاسکتی تھی، لیکن جو طریقِ بحث انھوں نے اختیار کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل اُمور تنقیح طلب ان کے سامنے واضح نہیں ہیں بلکہ وہ محض چند ضمنی مباحث میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ بہر حال چونکہ وہ خطبے کے مسئلے میں مانعینِ تغیر کے عام خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں، اس لیے ہم ان کے مضمون کو شائع کر کے اختصار کے ساتھ ان غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کی وجہ سے ان کو اور اسی طرزِ خیال کے دوسرے لوگوں کو اس مسئلے میں الجھن پیش آئی ہے۔

صاحبِ مضمون نے زبان کے متعلق جو طریقِ استدلال اختیار کیا ہے وہ قریب قریب اسی طرح کا استدلال ہے جس کی بنا پر ایک گروہ اس سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کرنے کی مخالفت کر چکا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر ان دلائل کو تسلیم کر لیا جائے تو قرآن مجید کا ترجمہ کرنا بھی اسی طرح ناجائز قرار پائے گا جس طرح غیر عربی میں خطبہ دینا ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ عربی زبان اسلام کی سرکاری زبان ہے جو لوگ اسلام کے محکوم ہیں ان پر اس زبان سے واقف ہونا لازم ہے اور اگر وہ عربی سے واقفیت پیدا نہیں کرتے تو یہ ان کا قصور ہے، لہٰذا ان کو سمجھانے کے لیے قرآن کے مطالب کو ان کی مادری زبان یا بالفاظِ دیگر کسی 'غیر سرکاری زبان' میں بیان نہیں کیا جائے گا۔ اسی طریقے سے آپ یہ بھی کہہ دیجیے کہ ان کے سامنے اسلامی احکام، اسلامی عقائد، اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور دوسری 'سرکاری' چیزوں کو بھی صرف 'سرکاری' زبان ہی میں بیان کیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جائے گا۔ کوئی چیز غیر سرکاری زبان میں نہ بیان ہوگی خواہ وعظ کی صورت میں ہو یا تحریر کی صورت میں۔

فرمایئے! اگر کوئی شخص یہ موقف اختیار کرے تو کیا آپ اس کو قبول کریں گے؟ غالباً نہیں۔ اس لیے کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ایسا کرنے سے مسلمانوں کی تقریباً ۸۰ فی صدی آبادی اسلام کے علم سے بالکل بے بہرہ ہو جائے گی۔ اسی بنا پر آپ قرآن حکیم کے ترجمے دوسری زبانوں میں کرنے کو صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری سمجھتے ہیں اور اسی بنا پر آپ 'غیر سرکاری زبان' میں 'سرکاری' مضامین کی اشاعت کو مواعظ اور تحریروں کی شکل میں صرف گوارا ہی نہیں بلکہ پسند کرتے ہیں۔ جب حال یہ ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ یہ تمام بحثیں صرف خطبۂ جمعہ کے مسئلے میں پیدا ہوتی ہیں؟ مسجد میں اگر کوئی شخص نماز کے بعد یا خطبے سے پہلے عجمی زبان میں وعظ کہے تو جائز بلکہ مفید اور انھی مضامین کو اگر وہی شخص منبر کی دو سیڑھیوں پر چڑھ کر خطبۂ جمعہ کی حیثیت سے بیان کرنے لگے تو ناجائز بلکہ بدعت! یہ کھلی ہوئی ناہمواری جو آپ کے طرزِ عمل میں پائی جاتی ہے، اس کو شریعت کی طرف منسوب کرنے سے پہلے اپنے نفس کو ٹٹول کر دیکھیے کہ وہاں کوئی غیر شرعی محرک تو چھپا ہوا نہیں ہے؟

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ عادتِ قدیمہ کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں، اور جب کوئی مجتہد، حالات کے تغیر اور زمانے کی بدلی ہوئی ضروریات کو محسوس کر کے طریقۂ متوارثہ میں ترمیم کی جراُت کرتا ہے، تو وہ محض اس بنا پر اس کی مخالفت کرنے لگتے ہیں کہ اس نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ان کے طبائع مانوس نہیں ہیں۔ مگر جب یہ نیا طریقہ چل پڑتا ہے اور اجنبیت دور ہو جاتی ہے تو لوگ اس کو نہ صرف جائز بلکہ مفید سمجھنے لگتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جب قرآن مجید کا ترجمہ فارسی میں کیا تو اسی بنا پر ان کی مخالفت کی گئی تھی۔ اُن سے پہلے ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جس میں عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں دُعا کرنا، وعظ کہنا اور دینی مسائل پر اظہارِ خیال کرنا ایک نئی چیز تھی، اور لوگ اس پر معترض ہوتے تھے۔ ٹرکی میں جب پہلی مرتبہ جدید طرز پر فوجوں کو مرتب کرنے اور نئے آلاتِ جنگ کا استعمال رائج کرنے کی کوشش کی گئی تو ایک جماعت نے اس پر سخت اعتراض کیا تھا۔ ان میں سے ہر موقع پر یہی کہا گیا کہ یہ بدعت اور احداث فی الدین ہے۔ مگر آج کوئی نہیں جس کو ان چیزوں پر اعتراض ہو۔ اعتراض تو درکنار آج عامی اور عالم سب ان کو جائز بلکہ مستحسن سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ پر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کے اعتراضات دراصل غیر شرعی محرکات سے پیدا ہوتے ہیں، پھر ان کی تائید میں شریعت سے استدلال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اسلام میں عربی زبان کی حیثیت کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں صحیح اور غلط دونوں کی آمیزش ہے۔ یہاں تک تو آپ کی بات بالکل درست ہے کہ اسلام سے عربی زبان کا خاص تعلق ہے۔ قرآن عربی میں نازل ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام کی سیرت کے متعلق تمام معلومات عربی میں ہیں۔ اسلام کا صحیح علم حاصل ہونا، جس پر انسان کے مسلمان ہونے کا مدار ہے، عربی زبان کی واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔ امتِ مسلمہ کی وحدت برقرار رکھنے کے لیے بھی عربی زبان ایک ضروری اور ناگزیر ذریعہ ہے۔ انھی وجوہ سے ہر زمانے کے علما نے عربی کی تعلیم پر زور دیا ہے اور انھی وجوہ سے آج بھی ہر صاحبِ عقل وفہم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مسلمان یہ ضروری سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم میں عربی کو بحیثیت ایک ثانوی زبان کے لازمی طور پر شامل ہونا چاہیے۔ یہ تمام باتیں بالکل برحق ہیں اور ان میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں، لیکن جیسا کہ اس سے پہلے میں عرض کر چکا ہوں 'ہے' اور 'ہونا چاہیے' میں بڑا فرق ہے۔ جو کچھ ہونا چاہیے اس کے لیے ضرور کوشش کیجیے، لیکن اگر عالمِ واقعہ میں موجود نہیں ہے تو اپنے طرزِ عمل کو واقعات کے مطابق بنانے سے انکار نہ کر دیجیے۔ عقل اور دین دونوں کا اقتضا یہ ہے کہ مقصد کو وسیلے پر مقدم رکھا جائے۔ ایک وسیلہ اگر زیادہ بہتر ہے، لیکن اب کارگر نہیں رہا تو دوسرا وسیلہ اختیار کیجیے جو کارگر ہو، اگرچہ بہتر نہ ہو۔ لیکن اگر آپ وسیلے پر اصرار کر کے اصل مقصد کو کھو دیں گے تو یہ نہ عقل مندی ہے نہ دین داری۔

اب آپ خود غور کیجیے کہ دین کا اصل مقصد کیا ہے؟ آیا یہ ہے کہ عربی زبان کو 'سرکاری' اور قومی زبان کی حیثیت سے پھیلایا جائے؟ یا یہ کہ خدا کے بندوں کو اس کی تعلیم اور اس کے احکام سے واقف کرایا جائے؟ ظاہر ہے کہ اصل مقصد دوسری چیز ہے۔ پس جب حال یہ ہے اور ہر شخص اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ غیر عربی ممالک میں دو فی صدی آدمی بھی عربی زبان سمجھنے والے باقی نہ رہے، اور ہم اس طاقت سے محروم ہو چکے ہیں جس سے صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے عربی کے علم کو پھیلایا تھا، تو آپ کو سوچنا چاہیے کہ ہمارے لیے صحیح طریق کار کیا ہے؟ یہ کہ مقصدِ اصلی کو کسی دوسرے ممکن ذریعے سے حاصل کریں؟ یا یہ کہ قدیم ذریعے پر اصرار کر کے مقصد کو فوت ہو جانے دیں؟

آپ نے جن دلائل سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ 'دین کی اشاعت ایک ہی زبان میں ہونی ضروری ہے' وہ درحقیقت نہایت کمزور ہیں، اور اگر آپ زیادہ غور و فکر سے کام لیں گے تو ان کی کمزوری آپ پر خود ہی واضح ہو جائے گی۔ دین ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ انسانی زبانوں میں سے کسی کے ساتھ اس کا مختص بالذات رشتہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اصل مقصد دین کو اپنے بندوں تک پہنچانا ہے، اور اس مقصد کے لیے جس طرح وہ ایک انسان کو وسیلہ بناتا ہے اسی طرح ایک زبان کو بھی وسیلہ بناتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اسی دین کو پہنچانے کے لیے وہ دوسری قوموں کے انسانوں اور دوسری قوموں کی زبانوں کو بھی وسیلہ بنا چکا ہے۔ پس اگر آخری تبلیغ کے موقع پر اس نے عربی قوم اور عربی زبان کو وسیلہ بنایا تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ اب صرف عربی زبان ہی سے اسلام کا رشتہ ہو گیا ہے اور دوسری زبانوں کو تبلیغِ دین کے لیے استعمال کرنا ناجائز یا مکروہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صریح ہدایت فرما دیتے کہ عربی زبان کے سوا کسی زبان کو تبلیغِ دین کے لیے قیامت تک استعمال نہ کرنا۔ حالانکہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کو غیر زبانیں سیکھنے کا حکم دیا تھا اور عہدِ صحابہ میں حضرت سلمان فارسیؓ جیسے غیر عربی الاصل حضرات عجمیوں کو ان کی اپنی زبانوں میں دین کی تعلیمات سمجھاتے تھے۔

رہی یہ بات کہ قیصرِ روم اور شاہِ ایران کو جو دعوت نامے بھیجے گئے تھے وہ عربی میں کیوں بھیجے گئے، تو اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط ان لوگوں کو بھیجے تھے وہ ایک ملک کے فرمانروا کی طرف سے دوسرے ملک کے فرمانرواؤں کی جانب تھے، اور ایسی مراسلت میں اپنے ملک کی زبان کے بجائے مخاطب کے ملک کی زبان استعمال کرنا اس مملکت کی توہین ہے جس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا فرمانروا کمتر موقف اختیار کرے۔ اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر حضور تبلیغ کی خاطر ہر مخاطب فرمانروا کو اسی کی زبان میں خطاب فرمانا چاہتے بھی تو اس وقت عملاً اس کا انتظام مشکل تھا، کیونکہ صحابہ میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو غیر عربی زبانیں جانتے ہوں، اور جو لوگ جانتے تھے وہ بھی ان زبانوں کے ایسے ادیب نہ تھے کہ ایک نبی کے شایانِ شان فصیح و بلیغ خط لکھ سکتے۔ نیز یہ بات بھی حضور کو معلوم تھی کہ جن بادشاہوں کے نام آپ دعوت نامے بھیج رہے ہیں ان کو ایسے لوگ میسر آ سکتے ہیں جو ان خطوط کا صحیح مفہوم انھیں سمجھا سکتے ہیں[1]۔ پس حضور کا عربی میں اسلام کے دعوت نامے بھیجنا عملی زندگی کے موانع کا نتیجہ تھا اور اس کی حیثیت بالکل ایسی ہی تھی جیسے پانی نہ ملنے کی صورت میں آپ نے تیمم بھی کیا ہے اور قیام کی طاقت نہ ہونے کی حالت میں بیٹھ کر بھی نماز پڑھی ہے۔ حالانکہ اگر اللہ چاہتا تو ہر جگہ آپ کے لیے ایک چشمہ پیدا کر سکتا تھا، اور آپ کو ہمیشہ بیماری اور ضعف سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ ایسی مثالوں سے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز درست نہیں کہ شریعت دین کی تبلیغ کو صرف عربی زبان تک محدود رکھنا چاہتی ہے، اور اس کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ اس زبان سے واقف نہ ہوں ان کو ضلالت اور جہالت میں مبتلا رہنے دیا جائے۔

صحابۂ کرام اور ائمۂ متقدمین کی غیر زبانوں سے نفرت اور عربیت پر ان کا اصرار کے متعلق میں نے 'تعصب' کا لفظ جو استعمال کیا تھا اس سے آپ غلط فہمی میں پڑ گئے۔ آپ نے یہ سمجھا کہ میں ان کی طرف 'عصبیتِ جاہلیہ' کو منسوب کر رہا ہوں۔ حالانکہ میرا مقصد کچھ اور تھا۔ تعصب محض جاہلیت ہی کا نہیں ہوتا۔ ایک قسم کا تعصب وہ ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ہوتا ہے اور جس کو عیب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک ہندستانی جب چین جائے گا تو وہاں کی زبان، عادات، خصائل، طرزِ بود و ماند ہر چیز سے اجنبیت محسوس کرے گا۔ ان پر ناک بھوں چڑھائے گا اور اس کو پسند نہ کرے گا کہ اس کے اہل و عیال 'چینیت' اختیار کریں۔ یہ ایک فطری منافرت ہے جو ہر انسان کی طبیعت میں اجنبی چیزوں سے ہوتی ہے۔ صحابۂ کرام بھی بہرحال انسان تھے اور عجمیت سے ان کی نفرت ایک حد تک اس بنا پر بھی تھی۔ اس میں مزید اضافہ اس وجہ سے ہو گیا کہ عجمی اقوام اس وقت سب کی سب کافر تھیں اور ان کے جو افراد مسلمان ہو جاتے تھے، ان کو صحابہ کرام عربیت کے رنگ میں رنگ لینا ضروری سمجھتے تھے تاکہ وہ کفار کی جمعیت سے الگ ہو کر اہل اسلام کی جمعیت میں جذب ہو جائیں۔ نیز صحابۂ کرام یہ بھی پسند نہ کرتے تھے کہ مسلمان (جو اس وقت تمام تر عرب ہی تھے) عجمی ممالک میں اہلِ عجم کی سی بولیاں بولنا اور ان کے سے لباس پہننا شروع کر دیں۔ کیونکہ اس طرح کفار کی اکثریت میں ان کے جذب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ پس صحابۂ کرام نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس کی بنیاد دو وجوہ پر تھی۔ ایک وجہ فطری تھی اور دوسری وجہ حالات کے اقتضا سے تعلق رکھتی تھی۔ ان میں سے پہلی وجہ کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتی اس لیے اس کو حجت بنانا درست نہیں۔ رہی دوسری وجہ تو اب وہ حالات باقی نہیں ہیں۔ اردو، فارسی، ترکی، جاوی اور ایسی ہی دوسری زبانیں بھی عربی کی طرح اب مسلمانوں کی زبانیں ہیں اور ان سے کسی اسلامی مصلحت کے تحت نفرت و اجتناب کی کوئی وجہ باقی

۱- واضح رہے کہ ایرانی اور رومی، دونوں سلطنتوں کے حدود میں، اور ان کے زیر اثر علاقوں میں عربی ریاستیں موجود تھیں، بڑے بڑے عرب قبائل آباد تھے، اور عرب سرداروں کی رسائی قیصر و کسریٰ کے درباروں میں تھی۔ اسی طرح مصر اور حبش کے ساتھ بھی عرب کے وسیع تجارتی تعلقات تھے اور دونوں ملکوں کے اپنے حدود میں عربی بولنے والی آبادیاں پائی جاتی تھیں۔ (مؤلف)

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

نہیں رہی ہے۔

(تفہیمات، دوم، نومبر ۱۹۸۱ء، ص ۴۲۸-۴۳۵)

خطبہ غیر عربیہ کو لازم قرار دینا

یہ ایک دلچسپ صورتِ حال ہے۔ ایک جماعت عجمی زبان کے خطبے کو مکروہِ تحریمی ثابت کر رہی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا فاعل گناہ گار ہو۔ دوسری جماعت اسی چیز کو واجب ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا تارک گناہ گار ہو۔ حالانکہ نہ ایک فریق کے پاس اس کی حرمت کا کوئی شرعی ثبوت ہے اور نہ دوسرے کے پاس اس کے وجوب کا۔ اس معاملے میں یہ بات ہر شخص کو بطورِ ایک اصول کے سمجھ لینی چاہیے کہ شریعت میں فرض و واجب یا حرام و ناجائز صرف وہی امور ہیں جن کو شارع نے خود یہ حیثیت دی ہو، اور جن کے بارے میں کتاب و سنت سے اس طرح کا کوئی حکم ثابت ہو۔ ایسے ہی امور کے فعل یا ترک پر گناہ کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ باقی رہے وہ امور جو ہم قیاس و استدلال کے ذریعے سے شارع کے قول یا عمل سے مستنبط کرتے ہیں، تو اُن کو فرض یا واجب قرار دینا، یا حرام یا ناجائز ٹھیرانا اور ان کی بنا پر ثواب یا عقاب کا حکم لگانا اصلاً غلط ہے۔ اس لیے کہ انسان کو انسان پر کوئی چیز فرض و واجب کرنے یا حرام و ناجائز ٹھیرانے کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے اور عذاب و ثواب خدا کے اختیار میں ہیں نہ کہ انسان کے اختیار میں۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ؕ (النحل ۱۶:۱۱۶) [اور یہ جو تمھاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔]

ایک بڑے سے بڑا عالم اور امام جلیل القدر بھی زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہنے کا حق رکھتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ میں کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ سے ایسا سمجھتا ہوں، میرے نزدیک فلاں بات کی جا سکتی ہے یا اس کا کرنا اَولیٰ ہے، یا فلاں بات نہیں کی جا سکتی، یا اس کا کرنا درست نہیں۔ اگرچہ رائے کا اختلاف اس صورت میں بھی باقی رہتا ہے، اس لیے کہ ایک شخص کا فہم دوسرے شخص کے فہم سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ اختلاف احکامِ شریعت میں نہیں بلکہ انسانی اجتہاد میں ہوگا اور اس کی وجہ سے وہ فتنے نہ پیدا ہو سکیں گے جو اجتہادی اختلافات کی بنیاد پر فرض اور حرام کا فرق پیدا کرنے اور پھر ایک دوسرے کو گناہ گار اور گمراہ ٹھیرانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

......شارع نے ایسی کوئی تصریح نہیں فرمائی ہے کہ خطبہ فلاں زبان میں دینا واجب ہے۔ یا فلاں زبان میں دینا مکروہِ تحریمی ہے۔ اسی طرح شارع نے اُن مقاصد کی تفصیل بھی بیان نہیں کی ہے جن کے لیے خطبے کو نمازِ جمعہ کے ساتھ لازم کیا گیا ہے۔ اس باب میں جتنی مختلف باتیں مختلف خیالات کے اہلِ علم بیان کرتے ہیں وہ شارع کے کسی صریح حکم پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صاحب شریعت کے عمل کو دیکھ کر اپنی فہم کے مطابق مختلف امور اخذ کیے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک گروہ کا فہم صحیح ہو، ہوسکتا ہے کہ دوسرے گروہ کا فہم صحیح ہو۔ دونوں کو اپنے اپنے دلائل پیش کرنے کا حق ہے۔ لیکن کسی کو یہ حق نہیں کہ اپنے فہم سے جو حکم وہ نکال رہا ہے اسے واجب ٹھیرائے اور اس کے تارک کو گناہ گار قرار دے، یا اسے حرام ٹھیرائے اور اس کے فاعل کو مجرم ٹھیرائے۔ لوگوں کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جس کے دلائل کو وہ زیادہ وزنی سمجھیں اور جس کی رائے پر ان کو اطمینان ہوجائے اس کا اتباع کرلیں۔ شارع کا تصریح نہ کرنا خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے لوگوں کو اس باب میں آزادی بخشی ہے۔ اگر اس میں لوگوں کے طریقے مختلف ہوجائیں تو کوئی حرج نہیں۔ جس کا مسلک زیادہ قوی دلائل پر مبنی ہوگا، اور جس کی رائے مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر کو زیادہ مطمئن کرنے والی ہوگی، اُسی کے اتباع پر بالآخر سوادِ اعظم مجتمع ہوجائے گا اور اختلاف عمل کا دائرہ خود بخود گھٹتا چلا جائے گا۔

خطبۂ عربیہ کو واجب قرار دینے کے لیے جو طریقِ استدلال ہمارے مراسلہ نگار نے اختیار کیا ہے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ نماز کے مقاصد میں سے اہم ترین مقصد رجوع الی اللہ ہے، اور رجوع الی اللہ بغیر خشوع وخضوع کے ممکن نہیں۔ اور جس چیز پر فرض کے مقصد کا حصول موقوف ہو وہ بھی فرض ہونی چاہیے، لہٰذا خشوع وخضوع نماز ہی کی طرح فرض ہے۔ یہ طرزِ استدلال ممکن ہے کہ منطق کی رو سے درست ہو، مگر شرع کی رو سے درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ شخص امت پر ایسی چیز فرض کرتا ہے جسے خدا نے فرض نہیں کیا۔

شریعت میں صرف وہی چیز فرض یا حرام ہے جس کو خدا نے فرض یا حرام قرار دیا ہے۔ ہم کو منطقی استدلال سے فرائض اور حُرمات کی فہرست میں اضافہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ پچھلی امتوں نے یہی غلط طریقہ اختیار کرکے اپنے اوپر بہت سی چیزیں لازم کرلی تھیں جو خدا نے ان کے اوپر لازم نہیں کی تھیں، اور یہی وہ بوجھ اور پھندے تھے جن سے انسانیت کو آزاد کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے، وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف ۷:۱۵۷)[اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔]

پس زبانِ خطبہ کے متعلق جو رائے میں نے ظاہر کی ہے، اور اس کے خلاف جو رائے بعض علمائے کرام ظاہر فرماتے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ لوگوں پر اس کا ماننا واجب ہو اور اس کی خلاف ورزی کرنے سے ان پر کوئی گناہ لازم آتا ہو۔ اگر کوئی شخص تحکم کے انداز میں اپنی رائے بیان کرتا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔

میں نے زبانِ خطبہ کو بدلنے سے پہلے جن امور کی اصلاح کو ضروری قرار دیا ہے ان پر صاحبِ مراسلہ نے پوری طرح غور نہیں فرمایا۔ اسی بنا پر وہ شبہات پیدا ہوئے جو انھوں نے بیان کیے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ شرعی نظام کے درہم برہم ہوجانے کی وجہ سے اسلام کا کوئی حکم اپنی اصل پر باقی نہیں رہا ہے۔ جمعہ اور خطبہ ہمارے شرعی نظام کے اہم ترین اجزا میں سے تھے۔ ایک عظیم الشان اجتماعی مقصد تھا جس کی تحصیل کے لیے دوسرے اجزا کے ساتھ ان دونوں چیزوں کو بھی خاص حکیمانہ تناسب سے ایک نظام میں نصب کیا گیا تھا۔ اب وہ نظام ٹوٹ گیا، اجزا پراگندہ ہوگئے، ان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا باہمی ربط اور اجتماعی زندگی کے ساتھ ان سب کا مجموعی ربط ٹوٹ گیا، اور سرے سے وہ عظیم الشان مقصد ہی اب دلوں میں محو ہوتا جا رہا ہے جس کے لیے یہ تمام اجزا فراہم کیے گئے تھے۔ اس حالت کی صحیح اصلاح تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ شرعی نظام پھر سے قائم کیا جائے اور اس کے بکھرے ہوئے اجزا کو پھر اسی طرح جمع کر کے ایک مشین کے پرزوں کی طرح نصب کر دیا جائے تاکہ اس کی حرکت کے ساتھ ساتھ وہ نتائج برآمد ہوتے چلے جائیں جو اس سے مطلوب ہیں۔ تاہم اگر یہ نہیں ہو سکتا تو کم از کم اتنا ہی ہو کہ مسلمانوں میں ایک رائے عام پیدا کر دی جائے، بڑے پیمانے پر نہیں تو چھوٹے پیمانے پر ہی ان کو اپنے اجتماعی کام ایک نظم کے ساتھ انجام دینے کی عادت ڈالی جائے، اور رائے عام کی طاقت سے ان مضرتوں کا سدِ باب کیا جائے جو غیر ذمہ دار لوگوں کی منتشر حرکات سے پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو پھر اصلاح کا نام نہ لیجیے، اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کو اسی طرح ہونے دیجیے۔ کیونکہ ہر شخص اپنے ذہن میں اصلاح کا جو مفہوم سمجھے بیٹھا ہے، اگر وہ اسی کے مطابق انفرادی طور پر عمل شروع کر دے تو بے شمار مصلحین، ایک دوسرے کے خلاف عمل کرنے والے پیدا ہو جائیں گے اور ان کی کارگزاریوں کا نتیجہ اصلاح کے بجائے مزید فساد ہوگا۔

نظامِ شرعی میں خطیبِ جمعہ کی حیثیت محض ایک واعظ کی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت رکھتا ہے جس پر اپنے حلقے کی جماعتِ مسلمین کی نگرانی کرنے اور ان کی اجتماعی زندگی کو مفاسد سے بچانے اور ان سب کو عام قومی پالیسی کے مطابق چلانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ذمہ داری بجائے خود ایک معلم ہے۔ جس شخص پر اس کا بار پڑتا ہے، وہ خود ذمہ داری سے ہی سیکھ لیتا ہے کہ اس سے کیوں کر عہدہ برآ ہو، بخلاف اس کے غیر ذمہ دار شخص، جو نہ کسی نظامِ جماعت سے تعلق رکھتا ہو، نہ کسی کے سامنے جواب دہ ہو، نہ اس امر کا کوئی تصور رکھتا ہو کہ اس کا خطبہ جماعت کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے بلکہ اثر انداز ہوتا بھی ہے یا نہیں، ایسا شخص خطبۂ جمعہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ جماعت کی فلاح و بہبود کن چیزوں کی مقتضی ہے؟ کون سے مفاسد ہیں جن کی اصلاح اس کو پہلے کرنی چاہیے؟ کن تعلیمات کی تلقین اور کن احکام کی تبلیغ مقدم ہے اور اس کام کو کس طرح انجام دیا جائے کہ فائدۂ مطلوب حاصل ہو؟ ہمارے جمعوں کے امام چونکہ کوئی ذمہ دارانہ حیثیت ہی نہیں رکھتے اس لیے درحقیقت وہ خطیب کے ان فرائض کو ادا کرنے کے ناقابل ہیں۔ وہ اگر عالم بھی ہوں تو ان کی حیثیت ایک واعظ اور مبلغ کی رہے گی۔ وہ محض اپنے شخصی اختیار تمیزی کی بنا پر تعلیم و تبلیغ کریں گے۔ اور اس سے کوئی خاص اجتماعی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس ان کے غیر ذمہ دارانہ مواعظ سے یہ تھوڑی بہت اجتماعیت بھی، جو اب حاصل ہوتی ہے، پراگندہ ہو جائے گی۔

اگر نظامِ شرعی کا احیا اس وقت ممکن نہیں ہے، جیسا کہ بظاہر نظر آ رہا ہے، تو آخری صورت وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ اہلِ علم کی ایک جماعت، جو کسی حد تک ذمہ دارانہ حیثیت رکھتی ہو، خطباتِ جمعہ مرتب کرنے کے لیے مقرر ہونی چاہیے، اور اس کو ایسے خطبات مرتب کرنے چاہییں جن میں اصولِ اسلام کو غیر اختلافی طریقوں سے بیان کیا جائے، مسلمانوں میں وحدتِ ملی کا احساس پیدا کیا جائے، ان کو عام اخلاقی مفاسد اور خلافِ شریعت اعمال پر (جو متفق علیہ ہیں) متنبہ کیا جائے، اور ایسے احکام بیان کیے جائیں جن سے مسلمانوں کے کسی فرقے کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ اجتماعِ جمعہ کے مقاصد کی تحصیل کا کم سے کم ذریعہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہی ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ مختلف فرقوں کے جمعے جو الگ الگ ہونے لگے ہیں، ان کو بند کیا جائے اور ایسی صورتیں پیدا کی جائیں کہ کم از کم جمعہ میں تمام یا اکثر فرقوں کے مسلمان ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں۔ جمعوں کا الگ ہونا غایت درجہ نقصان دہ چیز ہے۔ اس کو مٹانے کی ضرورت ہے۔ نہ یہ کہ ایسے اسباب پیدا کیے جائیں جن سے یہ بیماری اور زیادہ ترقی کرے۔ واعظوں کو اگر اپنے نقطۂ نظر کے مطابق وعظ کہنا ہے اور وہ اپنے مسلک کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں تو وہ مسجدوں سے باہر جہاں چاہیں لب کشائی کریں۔ مسجدیں جمع کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں، نہ کہ تفریق کرنے کے لیے۔ ان کو مساجد ضرار بنانا ایک بدترین فعل ہے جسے کسی حال میں گوارا نہیں کیا جاسکتا۔

(تفہیمات، دوم، نومبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۴۲-۲۴۷)

دیہات میں نماز جمعہ

دیہات میں نمازِ جمعہ قائم کرنے کا مسئلہ ایک سخت اختلافی مسئلہ ہے اور اس پر قدیم زمانے سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ ایسے مسائل میں کوئی ایسی بحث تو نہیں کی جاسکتی جو اختلافات کو بالکل رفع کر دے۔ البتہ میں کوشش کروں گا کہ اس مسئلے میں میرے نزدیک جو مسلک درست ہے اُسے واضح طور پر بیان کردوں۔

جمعہ کی شرعی حیثیت اور مقصد

سب سے پہلے ضروری ہے کہ جمعہ کی شرعی حیثیت، اور اقامتِ جمعہ سے شارع کے مقصود کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ میں اقامتِ جمعہ کے متعلق کیا ہدایات دی گئی ہیں اور ان ہدایات میں کیا مصالح پوشیدہ ہیں۔ نیز اس امر کی تحقیق بھی کی جائے کی ان ہدایات کی بنا پر اقامتِ جمعہ فی القریٰ کے جواز اور عدم جواز میں ائمہ مجتہدین کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں، ان میں سے ہر ایک گروہ نے شارع کے پیشِ نظر مقاصد و مصالح کو کس حد تک ملحوظ رکھا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکے گی کہ اب انھی مقاصد و مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے جواز و عدم جواز میں سے کون سا پہلو اختیار کرنا زیادہ صحیح مناسب ہوگا۔

اسلام کی اجتماعیت

شریعتِ اسلامی کے احکام میں تدبر کرنے سے یہ بات ہم کو واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ شریعت صرف انفرادی اصلاح و تزکیہ ہی کو اپنا آخری اور انتہائی مقصود نہیں بناتی ہے بلکہ اصلاح یافتہ اور تزکیہ شدہ افراد کو باہم جوڑ کر متقین و صالحین کی ایک ایسی جماعت بھی بنانا چاہتی ہے جو زمین میں خلافتِ الٰہی کے فرائض کو ادا کرے، اور ایک ایسا تمدن وجود میں لائے جس میں انسانی فطرت کی بھلائیوں کو نشوونما دینے اور برائیوں کو دبا دینے کی قوت ہو۔ یہ چیز شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے تمام احکام کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رجحان خالص انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کی طرف ہے۔وہ اگرچہ اپنی پوری قوت افراد کے تزکیہ وتصفیہ پرصرف کرتی ہے مگراس کام میں اُس کے پیشِ نظرمحض فرد کو بحیثیتِ فرد ہی کے پاک کر دینا نہیں ہوتا، بلکہ اسے پاک کر کے ایک بہترین سوسائٹی کی رکنیت اور کارکنی کے لیے تیار کرنا بھی ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس نے افراد کے لیے جتنی تدبیریں اختیار کی ہیں کم وبیش سب کی سب ایسی ہیں جو فرداً فرداً ان کا تزکیہ بھی کرتی ہیں اوراس کے ساتھ اُن کو باہم جوڑ کر ایک اعلیٰ درجہ کی جماعت بھی بناتی ہیں۔

مثال کے طور پر روزے کو لیجیے۔یہ بجائے خود صرف فرد کے تزکیۂ نفس کا ذریعہ ہے۔لیکن شارع نے ایک ہی زمانے میں تیس دن کے روزے تمام مسلمانوں پر فرض کیے تاکہ وہ اُسی مزکی ومطہر حالت میں اس اجتماعی عبادت کے ذریعہ سے صالحین و متقین کی ایک جماعت بن جائیں۔زکوٰۃ کو دیکھیے۔اس کی بنیاد ہی اجتماعیت پر ہے۔یہ ایک نفس کا تزکیہ ہی اس طرح کرتی ہے کہ وہ دوسرے نفس یا نفوس کی امدادواعانت کرے۔حج کو دیکھیے۔اس میں اجتماع کا پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ اس کو نمایاں کرنے کی حاجت ہی نہیں۔ان سب کے بعد نماز کو لیجیے جو اِن سب سے زیادہ اہم ہے اور افراد کو صلاح وتقویٰ کی تربیت دینے کے لیے سب سے زیادہ کارگر تدبیر ہے۔وہ ہر روز پانچ مرتبہ وہی کام کرتی ہے جو سال میں تیس مرتبہ روزہ،اور سال میں ایک مرتبہ صدقہ اور عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرتا ہے۔اس عبادت میں بھی شارع نے تربیتِ افراد کے ساتھ مدنیتِ صالحہ کی تاسیس اور جماعتِ متقین کی تنظیم کا مقصد پیشِ نظر رکھا ہے۔وہ روزانہ پانچ مرتبہ نماز کو باجماعت ادا کرنے کا حکم دیتا ہے تاکہ کم یا زیادہ جتنے بھی مسلمان کہیں جمع ہوں،یا جمع ہو سکتے ہوں،وہ سب مل کر فریضہ ادا کریں۔پھر وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ایک خاص وقت اس غرض کے لیے مقرر کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان یک جا مجتمع ہوں اور مل کر باقاعدگی کے ساتھ خدا کا ذکر سنیں اور اس کی عبادت بجالائیں۔اس ہفتہ وار اجتماع کے بعد وہ ہر سال اختتامِ ماہِ صیام اور یادگار اسوۂ ابراہیمی جیسے اہم نفسیاتی مواقع پر ان کو اجتماعِ عام کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسی عمارت کی تکمیل ہو جس کی نماز پنج گانہ تاسیس کرتی ہے اور نماز جمعہ توسیع وترصیص۔

فرضیتِ جمعہ کی حکمت

اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام فرض عبادات میں شارع کا رجحان اجتماعیت کی جانب ہے،اور وہ ان میں سے ہر ایک میں موقع ومحل کی مناسبت کے لحاظ سے انفرادیت اور انتشار کو زیادہ سے زیادہ گھٹانے اور اجتماعیت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔نمازِ پنجگانہ میں اس کا موقع نہ تھا کہ جماعت کو فرض کر دیا جاتا،کیونکہ ہر روز ہر شخص کے لیے پانچ مرتبہ جماعت کے التزام کو فرض کر دینے میں بہت زیادہ حرج تھا۔اس لیے صرف جماعت کی تاکید کر کے چھوڑ دیا گیا اور اجازت دے دی گئی کہ اگر کوئی شخص کسی وقت کی نماز باجماعت ادا نہ کر سکے وہ تنہا پڑھ لے۔یہ ڈھیل جو شخصی حالات وضروریات کے لحاظ سے دی گئی تھی اس کی تلافی کے لیے ہفتہ میں ایک مرتبہ ایک ایسی نماز فرض کر دی گئی جو بغیر جماعت کے ادا ہی نہیں ہوتی۔یہی نمازِ جمعہ ہے۔اور یہ فرض چونکہ اس رعایت کے نقصان کو پورا کرنے کے لیے عائد کیا گیا ہے جو نماز پنج گانہ میں انفرادیت اور انتشار کو ایک حد تک راہ دیتی ہے،اس لیے شارع کا منشا یہ ہے کہ اس فرض کو ادا کرنے میں زیادہ سے زیادہ اجتماع ہو اور جہاں تک ہو سکے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفریق و انتشار کو دور کیا جائے۔

فرضیتِ جمعہ کی اہمیت

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جمعہ کی فرضیت پر کتاب و سنت میں اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے اور اس کی اقامت کو اتنی اہمیت کس لیے دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ (الجمعۃ ۶۲:۹) اے ایمان والو! جب جمعہ کے روز نماز کے لیے پکارا جائے تو دوڑ و خدا کی یاد کی طرف اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ رَجُلاً يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ ثُمَّ أُحَرِّقَ عَلٰى رِجَالٍ يَتَخَلَّفُوْنَ عَنِ الْجُمُعَةِ بُيُوْتَهُمْ (مسلم، احمد) میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی جگہ کسی کو نماز پڑھانے کے لیے کھڑا کر جاؤں اور ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو جمعہ کی نماز کے لیے نہیں آتے۔

مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ مِنْ غَيْرِ ضَرُوْرَةٍ كُتِبَ مُنَافِقاً فِيْ كِتَابٍ لَا يُمْحٰى وَلَا يُبَدَّلُ (رواہ الشافعی) جو شخص بلا ضرورت جمعہ چھوڑ دے اس کا نام منافق کی حیثیت سے اس کتاب میں لکھا جائے گا جس کا لکھا نہ مٹایا جا سکتا ہے اور نہ بدلا جا سکتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَعَلَيْهِ الْجُمُعَةُ......... فَمَنِ اسْتَغْنٰى بِلَهْوٍ أَوْ تِجَارَةٍ اِسْتَغْنَى اللّٰهُ عَنْهُ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (دار قطنی) جو کوئی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس پر جمعہ کے دن نمازِ جمعہ لازم ہے............ پھر جو کسی کھیل تماشے یا کاروبار کی خاطر اس سے لاپروائی برتے اللہ اس سے بے نیازی برتے گا اور اللہ پاک بے نیاز ہے۔

مَنْ سَمِعَ النِّدَآءَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلَمْ يَأْتِهَا ثُمَّ سَمِعَ النِّدَآءَ وَلَمْ يَأْتِهَا ثَلَاثاً طُبِعَ عَلٰى قَلْبِهٖ فَجُعِلَ قَلْبَ مُنَافِقٍ (طبرانی) جس نے جمعہ کی اذان سنی اور نماز کے لیے نہ آیا، پھر دوسرے جمعہ اذان کی آواز سنی اور پھر نہ آیا۔ اسی طرح مسلسل تین جمعہ تک کرتا رہا اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور اس کا دل ایک منافق کا دل بنا دیا جاتا ہے۔

غور کیجیے، یہ جمعہ کے لیے دوڑنے اور کاروبار چھوڑنے کی تاکید کیوں ہے؟ یہ نبی کریمؐ جیسے روف و رحیم انسان کے دل میں تارکینِ جمعہ کے گھروں کو آگ لگا دینے کا جذبہ کس لیے پیدا ہوتا ہے؟ آخر جمعہ میں کیا ہے جس کی وجہ سے ترکِ جمعہ اور نفاق کو ہم معنی قرار دیا گیا اور اس پر اتنی سخت وعیدیں بیان فرمائی گئیں؟ اس کی علت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ جمعہ کی اقامت سے دراصل امتِ مسلمہ کا قوام ہے۔ اس سے نمازِ پنج گانہ کے مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ اسلام کے اُس مقصدِ عظیم کی تحصیل کا ایک اہم ذریعہ ہے جو حیاتِ دنیا کی حد تک اس کا منتہائے مطلوب ہے، یعنی مدنیتِ فاضلہ کی تاسیس اور جمعیتِ صالحہ کی تشکیل۔ اس کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ضائع ہونا گویا اسلام کے مقصد کا ضائع ہونا ہے اور اس کی بنا کو صدمہ پہنچنا گویا اسلام کی عمارت کو صدمہ پہنچنا ہے۔

دو اصولی باتیں

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سے دو باتیں معلوم ہو گئیں:

ایک یہ کہ جمعہ کی فرضیت عام نمازوں کی فرضیت سے زیادہ مؤکد ہے اور اس کی اقامت اسلام کے مقاصدِ اصلیہ کی تکمیل کے لیے غایت درجہ اہمیت رکھتی ہے، لہٰذا فروعی واجتہادی مسائل میں ان پہلوؤں سے بچنا اولیٰ ہے جن سے جمعہ ضائع ہوتا ہے اور ان پہلوؤں کو اختیار کرنا انسب ہے جن سے جمعہ قائم ہوتا ہو۔

دوسرے یہ کہ اقامتِ جمعہ میں شارع کے پیشِ نظر مدنیت واجتماعیت ہے، اور وہ اس ذریعے سے انتشار دور کر کے اہلِ ایمان کو اجتماع کی طرف لانا چاہتا ہے۔ لہٰذا جمعہ کو قائم کرنے میں اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جماعتیں منتشر نہ ہوں بلکہ زیادہ سے زیادہ اجتماع ہو۔

عملی تفصیلات جو متفق علیہ ہیں

اب آگے بڑھیے۔ کتاب اللہ میں جمعہ کی فرضیت اور اس کی تاکید تو اس قوت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اس کی طرف دوڑنے اور اس کے لیے سب کاروبار چھوڑ دینے کا حکم ہے۔ مگر ان سوالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی کہ نماز کب پڑھی جائے؟ کہاں پڑھی جائے؟ کون پڑھے اور کون نہ پڑھے؟ کن حالات میں پڑھی جائے اور کن میں نہ پڑھی جائے؟ ان سب سوالات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر چھوڑ دیا گیا اور اہلِ ایمان سے صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ط (الجمعہ ۶۲:۹) جب پکارا جائے جمعے کی نماز کے لیے تو خدا کی یاد کی طرف دوڑو اور کاروبار چھوڑ دو۔

مذکورۂ بالا سوالات کے متعلق تفصیلی ہدایات ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپؐ کے متواتر عمل سے ملتی ہیں اور مزید روشنی اُن بزرگوں کے اقوال واعمال سے حاصل ہوتی ہے جنھوں نے براہِ راست حضورؐ سے تعلیم پائی تھی۔ ان ذرائع سے ہم کو قطعی طور پر جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:

۱- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابۂ کرام نے جمعہ کی نماز ہمیشہ ظہر کے وقت پڑھی ہے۔ لہٰذا جمعہ کا وقت ظہر کا وقت ہے۔

۲- آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہؓ نے کبھی خطبے کے بغیر جمعہ نہیں پڑھا۔ لہٰذا جمعہ کی نماز کے ساتھ خطبہ ضروری ہے۔

۳- جمعہ کی فرضیت سے غلام، عورتیں، بچے، مسافر، اور مریض مستثنیٰ ہیں۔ فرض جن پر عائد ہوتا ہے وہ صرف ایسے عاقل وبالغ مرد ہیں جو آزاد ہوں اور صحیح وتندرست ہوں۔

۴- عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ میں جمعہ کبھی ویرانوں اور جنگلوں اور عارضی فرودگاہوں اور کیمپوں میں نہیں پڑھا گیا، لہٰذا اقامت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جمعہ کے لیے ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں مستقل آبادی ہو۔

۵- جمعہ کبھی پرائیوٹ مکانوں میں نہیں پڑھا گیا بلکہ ہمیشہ ایسی جگہ پڑھا گیا ہے جہاں ہر مسلمان کو حاضر ہونے کی آزادی ہو۔ لہٰذا جمعہ کے لیے اذن عام ضروری ہے۔

اختلافات اور ان کے وجوہ

یہ وہ اُمور ہیں جن پر تمام امت کا اتفاق ہے، کیونکہ یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ ان کے علاوہ جتنے جزئی امور ہیں ان میں سے کوئی بھی قطعی طور پر ثابت نہیں ہے۔ اسی لیے ان میں فقہا کے درمیان اختلافات ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ نصاب جماعت کیا ہو؟ جمعہ کون قائم کرے؟ خطبے دو ہونے چاہییں یا ایک ہی کافی ہے؟ وغیرہ

اسی قبیل سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ جمعہ کے لیے کس قسم کی بستی ہونی چاہیے اور اُس بستی سے کتنے فاصلے تک کے لوگوں کو نماز کے لیے آنا چاہیے۔

امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ ایسے قریوں میں جمعہ ناجائز ہے جن کے باشندے گرمی یا جاڑے میں کہیں اور منتقل ہو جاتے ہوں۔ ان کے سوا ایسے تمام قریوں میں جمعہ کی نماز ہو سکتی ہے جن میں چالیس یا اس سے زیادہ عاقل و بالغ آزاد مرد موجود ہوں۔ اس کی تائید میں وہ اُس روایت سے استدلال کرتے ہیں جو ابن عباس سے مروی ہے کہ مدینہ کے بعد پہلا جمعہ جو پڑھا گیا وہ بحرین کے ایک قریہ جواثی میں تھا۔ نیز یہ روایت بھی ان کے دلائل میں سے ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہلِ بحرین کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ جمعہ ادا کرو جہاں کہیں بھی ہو۔ مگر ان میں سے پہلی روایت میں محض قریہ کا لفظ ہے جس کا کوئی مفہوم متعین نہیں۔ کم از کم اس سے چالیس مردوں کی قید تو کسی طرح نہیں نکلتی۔ اور ہم کچھ نہیں جانتے کہ امام صاحب کے نزدیک اس قید کا ماخذ کیا ہے۔ رہی دوسری روایت تو وہ جس قدر امام صاحب کی تائید میں ہے اسی قدر ان کے خلاف بھی ہے۔ اس سے تو جنگل اور ویرانے میں بھی اقامتِ جمعہ کا جواز نکالا جا سکتا ہے، حالانکہ امام صاحب اس کے ناجائز ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔

امام احمد کا مسلک امام شافعی سے ملتا جلتا ہے اور ان کے دلائل بھی وہی ہیں۔

امام مالک کے نزدیک جمعہ کی نماز ہر ایسے قریہ میں ہو سکتی ہے جس کی آبادی مستقل ہو، خواہ اس کی آبادی چالیس مردوں سے بھی کم ہو۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جمعہ صرف مصر یعنی شہر میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ دیہات میں قائم کرنا جائز نہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مصر جامع کی شرط اور اس کی تشریح

حنفیہ نے جمعہ کے لیے یہ جو مصر جامع کی شرط لگائی ہے اس کے حق میں اُن کا استدلال اس روایت سے ہے جو حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ لَاجُمُعَةَ وَلَاتَشْرِيقَ وَلَا فِطْرَ وَلَا أَضْحٰى إِلَّا فِيْ مِصْرٍ جَامِعٍ[1] [نمازِ جمعہ، تکبیرات تشریق، نماز فطر اور نماز اضحیٰ نہیں ہیں مگر شہرِ جامع میں] نیز وہ اس بات سے بھی دلیل لاتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب ممالک فتح کیے تو دیہات میں کہیں بھی منبر نصب نہیں کیے۔ یہ گویا جمعہ کے لیے مصر کے شرط ہونے پر صحابہ کا اجماع ہے۔

لیکن مصر کی تعریف میں خود حنفیہ کے درمیان بہت اختلافات ہیں، حتیٰ کہ خود امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے بھی دو مختلف قول ہیں۔ مثال کے طور پر چند اقوال ملاحظہ ہوں:

۱- مصر جامع وہ مقام ہے جہاں امیر اور قاضی ہو جو احکام نافذ کرنے اور حدود جاری کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔

۲- مصر وہ ہے جہاں کی سب سے بڑی مسجد میں اگر سب باشندے جمع ہوں تو نہ سما سکیں۔

۳- مصر اس جگہ کو کہتے ہیں، جہاں بازار اور سڑکیں اور محلے ہوں اور کوئی ایسا حاکم ہو جو ظالم سے مظلوم کا انصاف لے، اور کوئی عالم ایسا ہو جس کی طرف مسائل میں رجوع کیا جا سکے۔

۴- امام جس مقام کو مصر قرار دے اور اقامتِ جمعہ کا حکم کرے وہی مصر ہے۔

۵- مصر وہ ہے جہاں ہر پیشے کا آدمی اپنے پیشے سے بسر اوقات کر سکتا ہو۔

۶- جس کی آبادی دس ہزار ہو صرف اسی جگہ کو مصر کہا جا سکتا ہے۔

۷- جس کی آبادی تین ہزار سے کم نہ ہو وہ مصر ہے۔

اس قسم کی بیسیوں تعریفیں اور بھی ہیں جو فقہا نے بیان کی ہیں۔

اب یہ امر غور طلب ہے کہ اول تو 'مصر' کے شرط ہونے پر امت کا اجماع نہیں ہے، بلکہ محدثین اور فقہا کی ایک کثیر جماعت اس سے اختلاف رکھتی ہے۔ دوسرے یہ شرط اگر ثابت بھی ہو تو واضح طور پر یہ معلوم نہیں کہ مصر کہتے کس کو ہیں۔ ایسی حالت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی مختلف فیہ اور مبہم شرط کے فقدان پر کیا نمازِ جمعہ جیسے مؤکد اور اہم فریضہ کو مسلمانوں کی آبادی کے ایک کثیر حصے پر سے ساقط قرار دینا مناسب ہے؟ میں سمجھتا ہوں ایک طرف تقویٰ اور دوسری طرف تفقہ اس کا مقتضی ہے کہ اسقاطِ فرض کا فتویٰ دینے سے پہلے ہم یہ تحقیق کرنے کی کوشش کریں کہ ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے اختلافات کا منشا کیا ہے، وہ جمعہ کے معاملے میں شارع کا مقصد کیا سمجھے ہیں، اور اسے پورا کرنے کے لیے جو عملی شکلیں انھوں نے اختیار کی ہیں ان کی اندرونی حکمت کیا ہے۔ شاید کہ اس طرح ہمیں ایک ایسا معتدل مسلک ہاتھ آ جائے جس سے ہماری آبادیوں کا ایک بڑا حصہ

۱- اس روایت کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنّف میں اور عبدالرزاق نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ لیکن دونوں کے ہاں یہ حضرت علیؓ کے اپنے قول ہی کی حیثیت سے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کو منسوب نہیں کیا گیا۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جمعہ کی برکات سے متمتع ہو سکے۔

اختلافات کا اصل منشا

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں اقامتِ جمعہ میں دو امور بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک جمعہ کی فرضیت، جو عام نمازوں سے بھی زیادہ مؤکد ہے اور ہر عاقل و بالغ آزاد اور تندرست مرد پر عائد ہوتی ہے۔

دوسرے اجتماعیت، جس کا مقصد انتشار کو دور کرنا اور مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اجتماع اور تالّف پیدا کرنا ہے۔

ائمہ مجتہدین میں سے ہر ایک نے ان دونوں پہلوؤں پر نظر رکھی ہے اور دونوں کو مرعی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس معاملے میں اشکال یہ واقع ہوتا ہے کہ بعض حالات میں یہ دونوں پہلو جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر فرضیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تو اجتماعیت کا پہلو چھوٹ جاتا ہے، کیونکہ فرضیت کا تقاضا یہ ہے کہ دو چار آدمی بھی جہاں موجود ہوں وہیں فرض ادا کر دیا جائے۔ اگر اجتماعیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تو فرضیت کا پہلو کمزور ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں کافی اجتماع نہ ہوں وہاں افراد پر سے فرض ساقط کر دیا جائے۔ ائمہ مجتہدین نے اِس اشکال کو دور کرنے کے لیے دونوں پہلوؤں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے چالیس آدمیوں کے اجتماع کو جمعہ کے لیے کافی سمجھا اور ہر ایسے قریہ میں اقامت جمعہ کا حکم دے دیا جہاں اجتماع کا یہ نصاب پورا ہوتا ہو۔ اس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی فتویٰ دیا کہ اس قریہ سے جہاں جہاں تک اذان کی آواز پہنچتی ہو وہاں کے ہر بالغ اور آزاد مرد پر نماز کے لیے آنا فرض ہے۔

امام مالکؒ نے اجتماع کے لیے کم سے کم ۱۲ آدمیوں کی موجودگی کو کافی قرار دیا۔ لہٰذا ان کے مسلک کی بنیاد پر نسبتاً زیادہ چھوٹے قریوں میں بھی اقامتِ جمعہ کا حکم دیا گیا اور ان سب لوگوں پر جمعہ کی حاضری لازمی قرار دے دی گئی جو مقامِ جمعہ سے چھ میل کی حد میں ہوں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے محسوس کیا کہ اس طرح قریہ قریہ میں اقامتِ جمعہ کی اجازت دینے سے انتشار پیدا ہوتا ہے اور اجتماع سے شارع کا جو مقصد ہے وہ پوری طرح حاصل نہیں ہوتا۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ عراق و شام وغیرہ ممالک میں جہاں عہدِ صحابہؓ کے آثار اس وقت بالکل تازہ تھے، کہیں دیہات میں نہ منبر پائے جاتے ہیں اور نہ جامع مسجدوں کا پتہ چلتا ہے۔ اُن تک حضرت علیؓ کا وہ اثر بھی پہنچا جس میں تصریح ہے کہ جمعہ صرف امصار (شہروں) میں قائم کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی سنا کہ جب حجاج بن یوسف نے اہواز میں جمعہ قائم کیا تو امام حسن بصریؒ نے فرمایا: لَعَنَ اللّٰهُ الْحَجَّاجَ یَتْرُکُ الْجُمُعَةَ فِی الْاَمْصَارِ وَ یُقِیْمُهَا فِیْ حَلَاقِیْمِ الْبِلَادِ خدا کی لعنت ہو حجاج پر، یہ کم بخت شہروں کو چھوڑ کر ملک کے گوشوں میں جمعہ قائم کرتا ہے۔

ان سب باتوں پر نظر کر کے انھوں نے فتویٰ دیا کہ ہر علاقے کے صدر مقام میں جمعہ قائم کیا جائے اور جن جن لوگوں پر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جمعہ کا فرض عائد ہوتا ہو وہ تین تین میل کے مضافات سے صدر مقام پر اکٹھے ہو جایا کریں۔

مسلکِ حنفی کے اصل منشا کی تحقیق

اب ہمیں ایک نظر اُس زمانے کے حالات پر بھی ڈالنی چاہیے۔ وہ اسلامی حکومت کا زمانہ تھا۔ جگہ جگہ پرگنوں اور قصبوں میں قاضی اور اصحابِ شرطہ (تھانہ دار) مقرر تھے جو خصومات کے فیصلے کرتے اور مظالم کی دادرسی کرتے تھے۔ ایک کثیر جماعت کے مجتمع ہونے میں چونکہ فتنہ و فساد پیدا ہونے کا بھی احتمال ہوتا ہے۔ اس لیے اجتماع کی غرض سے ایسی ہی جگہ زیادہ مناسب تھی جہاں امن قائم کرنے والے موجود ہوں۔ پھر اکابر احناف کا زمانہ وہ تھا جب عراق اور الجزیرہ اور فارس وغیرہ ممالک کی آبادی بہت زیادہ اور گھنی تھی۔ قصبات اور دیہات کثرتِ آبادی کے سبب سے باہم پیوستہ ہو گئے تھے۔ تمدن بھی انتہائی عروج پر تھا۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے فروغ نے قصبوں کو بھی شہر بنا دیا تھا۔ انھی وجوہ سے 'شہر' کی وہ تعریفیں کی گئیں جو آپ نے اوپر دیکھی ہیں۔ ورنہ فی نفسہٖ قاضی اور کوتوال کو، یا بازار اور سڑکوں کو، یا دس ہزار اور تین ہزار کی آبادی کو فرضیتِ جمعہ کے اشتراط میں کوئی بھی دخل نہیں ہے۔ اصل شرط 'مصر' ہے اور اس کے مدلول کو متعین کرنے کے لیے ہر فقیہ مجتہد نے وہ خصوصیات بیان کی ہیں جو اس کے پیشِ نظر امصار میں پائی جاتی تھیں۔

ان خصوصیات سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے کہ وہ چیز کیا ہے جس کی بنا پر 'مصر' کو شرطِ جمعہ قرار دیا گیا ہے، تو معلوم ہو گا کہ وہ 'مرکزیت' کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جو مقام کسی علاقے میں مرکزی حیثیت رکھتا ہو، یا جمعہ کی غرض کے لیے مرکزی مقام ٹھیرا لیا جائے، وہ 'مصر' ہے۔ اور اس کے سوا گرد و پیش کے مقامات پر اقامت جمعہ کا ناجائز ہونا اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ ان مقامات کے لوگوں سے جمعہ کا فرض ساقط ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو جمعہ کے لیے اس مرکزی مقام پر آنا چاہیے۔ اگر بغیر عذرِ شرعی کے وہ نہ آئیں گے تو گنہگار ہوں گے۔

اس باب میں فقہائے حنفیہ کے اقوال کی چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کی شرط عائد کرنے اور دیہات میں اقامت جمعہ کو ناجائز قرار دینے سے ان کا منشا بھی وہی تھا جو ہم نے سمجھا ہے۔

علامہ ابن ہُمام لکھتے ہیں:

وَلَوْ مَصَّرَ الْاِمَامُ مَوْضِعاً وَ اَمَرَهُمْ بِالْاِقَامَةِ فِيْهِ جَازَ (فتح القدیر، جلد ا، ص ۴۰۹) اگر امام کسی مقام کو مصر قرار دے اور لوگوں کو وہاں جمعہ پڑھنے کا حکم دے تو جائز ہوگا۔

یہاں 'مصر قرار دینے' کا مجاز امام کو ٹھیرایا گیا ہے، اس لیے کہ صحیح معنوں میں اسلامی زندگی بغیر امام اور امیر کے نہیں ہو سکتی۔ لیکن جہاں بدقسمتی سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں امامت و امارت کا منصب باقی نہ رہا ہو، کیا ناجائز ہوگا اگر وہاں امام مالک رحمۃ اللہ کے اصول پر مسلمانوں کی جماعت باہمی اتفاق سے اپنے علاقے کے کسی بڑے گاؤں یا قصبے کو، جہاں مسلمانوں کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آبادی نسبتاً زیادہ ہو اور جہاں کوئی بڑی مسجد بھی موجود ہو، جمعہ کی اغراض کے لیے 'مصر' قرار دے لے؟

آگے چل کر علامہ موصوف لکھتے ہیں:

وَمَنْ كَانَ فِیْ تَوَابِعِ الْمِصْرِ فَحُكْمُهٗ حُكْمُ اَهْلِ الْمِصْرِ فِیْ وُجُوْبِ الْجُمُعَةِ عَلَيْهِ بِاَنْ يَّأْتِیَ الْمِصْرَ فَلْيُصَلِّهَا فِيْهِ وَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ فَعَنْ اَبِیْ يُوْسُفَ اَنَّهَا تَجِبُ فِیْ ثَلٰثَةِ فَرَاسِخَ وَ قَالَ بَعْضُهُمْ قَدْرِ مِيْلٍ وَ قِيْلَ قَدْرِ مِيْلَيْنِ وَ قِيْلَ سِتَّةِ اَمْيَالٍ۔ وَعَنْ مَالِكٍ سِتَّةٍ وَ قِيْلَ اِنْ اَمْكَنَهٗ اَنْ يَّحْضُرَ الْجُمُعَةَ وَ يَبِيْتَ بِاَهْلِهٖ مِنْ غَيْرِ تَكَلُّفٍ تَجِبُ عَلَيْهِ الْجُمُعَةُ وَ اِلَّا فَلَا، قَالَ فِی الْبَدَائِعِ وَ هٰذَا حَسَنٌ (فتح القدیر، ج۱،ص۴۱۱) اور جو شخص مصر کے مضافات کا رہنے والا ہو اس پر بھی اہلِ مصر کی طرح جمعہ فرض ہے اور لازم ہے کہ وہ وہاں جا کر نماز پڑھے۔ مضافاتِ شہر کی حد میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ابو یوسف کہتے ہیں کہ وہ تین کوس کی حد میں واجب ہے۔ بعض نے ایک میل، بعض نے دو میل، بعض نے چھ میل کی حد قرار دی ہے۔ امام مالکؒ نے بھی چھ میل کہا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جمعہ میں شریک ہونے کے بعد رات آنے سے پہلے بلا کسی زحمت و تکلیف کے اپنے گھر پہنچ سکتا ہو اس پر جمعہ کی حاضری واجب ہے ورنہ نہیں۔ صاحب بدائع نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔

بعض احادیث سے بھی اس مؤخر الذکر قول کی تائید نکلتی ہے۔ چنانچہ ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے:

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ اَلْجُمُعَةُ عَلٰی مَنْ اٰوَاهُ اللَّيْلُ اِلٰی اَهْلِهٖ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ اُس پر فرض ہے جو رات تک اپنے بال بچوں میں پہنچ سکتا ہو۔

بخاری میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَتْ كَانَ النَّاسُ يَنْتَابُوْنَ الْجُمُعَةَ مِنْ مَّنَازِلِهِمْ وَالْعَوَالِیْ فَيَأْتُوْنَ فِی الْغُبَارِ فَيُصِيْبُهُمُ الْغُبَارُ وَالْعَرَقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُمُ الْعَرَقُ فَاَتٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْسَانٌ مِّنْهُمْ هُوَعِنْدِیْ فَقَالَ لَوْ اَنَّكُمْ تَطَهَّرْتُمْ لِيَوْمِكُمْ هٰذَا حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ لوگ اپنی فرودگاہوں اور عوالی سے نماز جمعہ کے لیے آیا کرتے تھے اور ان پر گرد اور پسینے کی تہیں چڑھ جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف رکھتے تھے کہ ان لوگوں میں سے ایک شخص آپؐ کے پاس حاضر ہوا۔ آپؐ نے فرمایا بہتر ہوتا اگر تم لوگ آج کے دن غسل کر لیا کرتے۔

پہلی حدیث تو صاف ہے۔ رہی دوسری حدیث تو اس میں یہ ذکر ہے کہ لوگ شرکتِ جمعہ کے لیے عوالی سے آیا کرتے تھے۔ عوالی اُن دیہات کا نام ہے جو مدینہ منورہ کے مضافات میں واقع تھے۔ اور علامہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ دیہات مدینہ سے چار میل اور اس سے زیادہ مختلف فاصلوں پر تھے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ عوالی سے اونٹ پر یا پیدل جمعہ کے لیے آتے ہوں گے۔ وہ اس ریگ زار میں شام کے لگ بھگ ہی اپنے گھروں کو واپس پہنچتے ہوں گے۔ یہ اُس زمانے کی کیفیت ہے جب بسیں اور لاریاں نہ چلتی تھیں۔ سائیکلیں اور موٹر سائیکلیں بھی نہ تھیں۔ ریل کا بھی وجود نہ تھا۔ پختہ سڑکیں تک نہ تھیں۔ اُس زمانے میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جب لوگوں کو چھ چھ میل کے فاصلوں سے آنے کے لیے کہا گیا تو آج جب کہ حمل ونقل کی آسانیاں بہت بڑھ گئی ہیں، لوگوں کے لیے بیس بیس میل سے بھی جمعہ کے لیے آنا کچھ مشکل نہیں۔ تاہم اختلافِ احوال کو پیشِ نظر رکھ کر یہ مناسب نہیں کہ فاصلہ کی مقدار میلوں کے حساب سے متعین کی جائے بلکہ وہی قید بہتر ہے جو شارع نے بیان فرمائی ہے، یعنی جو شخص نماز کے بعد مغرب تک اپنے گھر آسانی پہنچ سکتا ہو وہ اپنے علاقے کے صدر مقام میں جا کر جمعہ پڑھے، اور جو نہ پہنچ سکتا ہو وہ اپنے ہی گاؤں ظہر کی نماز پڑھ لیا کرے۔

اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فقہائے کرام نے مصر کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ بالکل ناقابل لحاظ نہیں ہیں۔ کسی دیہاتی علاقے کے مسلمان جب اپنے علاقے کے کسی قصبے کو جمعہ کی اغراض کے لیے 'مصر' قرار دینا چاہیں تو انھیں انتخاب میں حسب ذیل خصوصیات کو ترجیح دینی چاہیے:

۱- وہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ سے زیادہ ہو۔

۲- کوئی بڑی مسجد موجود ہو جس میں زیادہ سے زیادہ اجتماع ہو سکتا ہو۔

۳- کوئی ایسا عالم موجود ہو جو مسائلِ شرعیہ کی تعلیم دے سکے اور وعظ وتذکیر کی اچھی قابلیت رکھتا ہو۔

۴- جہاں سرکاری حکام میں سے کوئی ایسا حاکم موجود ہو جو امن قائم رکھنے کا ذمہ دار ہو۔

۵- جہاں اس کا بھی امکان ہو کہ آس پاس کے دیہات والے اپنی ضروریات وہاں سے خرید لے جائیں۔

یہ امور اقامتِ جمعہ کے شرائط میں سے نہیں ہیں، بلکہ مقامِ جمعہ کے انتخاب میں ان کو ملحوظ رکھنا انسب اور اولیٰ ہے۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصّواب۔

(تفہیمات، دوم، نومبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۶۹-۲۸۴)

مسلک حنفی کی مزید تشریح

جمعہ فی القریٰ کے مسئلے پر اس سے پہلے جو بحث کی گئی تھی اُس کی بنا چونکہ زیادہ تر آثار وسنن اور قیاسِ شرعی پر رکھی گئی تھی، اس وجہ سے غالباً بعض حضرات کو یہ شبہ ہوا کہ میں مسلکِ حنفی کا مخالف ہو کر خود ایک مجتہدانہ (جسے عرفِ عام میں غیر مقلدانہ کہا جاتا ہے) رائے ظاہر کر رہا ہوں۔ لہٰذا اب میں چاہتا ہوں کہ صرف مسلکِ حنفی کے مطابق اپنے دلائل بیان کروں۔

ہمارے سامنے چار امور تنقیح طلب ہیں، جن کے تصفیہ پر اس مسئلے کے تصفیہ کا مدار ہے:

۱- جمعہ کی فرضیت کیسی ہے؟

۲- جمعہ کی شرائط کیا ہیں اور کس نوعیت کی ہیں؟

۳- کیا ان شرائط میں کبھی ترمیم ہوئی ہے، اور کسی مزید ترمیم کی گنجائش بھی ہے؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۴- اور کیا یہ جائز ہے کہ اس فرض کو ادا کرنے کے لیے ایک ایسا نظام اختیار کیا جا سکے جو فقہائے حنفیہ کے فتاویٰ سے چاہے مختلف ہو، مگر ان کے اصول کے خلاف نہ ہو؟

میں ان چاروں تنقیحات پر ترتیب وار بحث کروں گا۔

فرضیتِ جمعہ کی نوعیت

تمام علمائے امت کا اس امر پر اجماع ہے کہ جمعہ فرضِ عین ہے۔ فقہائے حنفیہ بھی اس اجماع میں شریک ہیں۔ چنانچہ علامہ سرخسی اپنی کتاب المبسوط میں لکھتے ہیں:

جمعہ از روئے کتاب وسنت فرض ہے.........اس کی فرضیت پر اُمت کا اجماع ہے۔

علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

جمعہ ایک ایسا فرض ہے جس کو محکم کرنے والی چیز کتاب وسنت ہے اور اس کے منکر کے کفر پر اُمت کا اجماع ہے۔ (فتح القدیر، ج ا، ص ۴۰۷)

پھر نہایت تفصیل کے ساتھ دلائلِ فرضیت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ہم نے فرضیت کے باب میں ایک طرح کے طولِ کلام سے اس لیے کام لیا ہے کہ بعض جاہلوں کے متعلق سننے میں آیا ہے کہ وہ جمعہ کی عدم فرضیت کا خیال مذہب حنفی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اُن کی یہ غلط فہمی دراصل قدوری کے اس قول سے ہوئی جس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے کہ ”جس نے جمعہ کے روز بغیر کسی عذر کے گھر ہی پر ظہر کی نماز پڑھ لی اس کی نماز تو ہوگئی مگر ایسا کرنا مکروہ ہے“۔ اس قول میں مکروہ سے مراد دراصل حرام ہے، اور نمازِ ظہر کے صحیح ہو جانے کا جو مطلب ہے وہ ہم آگے بیان کریں گے۔ بہرحال ہمارے اصحاب (حنفیہ) نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ جمعہ کی فرضیت ظہر کی فرضیت سے بھی زیادہ سخت ہے، اور یہ کہ جمعہ کا منکر کافر ہے۔ (فتح القدیر، ج ا، ص ۴۰۸)

علامہ بابرتی شرح العنایہ علی الھدایہ میں لکھتے ہیں:

ہم کو اقامتِ جمعہ کی خاطر نمازِ ظہر چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور ظہر لامحالہ فرض ہے، اور فرض صرف اسی چیز کے لیے چھوڑا جا سکتا ہے جو اس سے زیادہ فرض ہو۔ (ج ا، ص ۴۰۸)

ان اقوال سے معلوم ہوا کہ نمازِ جمعہ استنباطی اور اجتہادی واجبات میں سے نہیں ہے، بلکہ نصوصِ صریحہ نے اس کو مسلمانوں پر فرض کیا ہے، اور اس کی فرضیت اس نوع کی ہے کہ اس سے (یعنی اس کی فرضیت سے) انکار انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فرض کو مسلمانوں کے کسی گروہ پر سے ساقط کرنے میں سخت احتیاط اور خشیت کی ضرورت ہے۔

اوّل تو فرضِ منصوص کو صرف نص ہی ساقط کر سکتی ہے۔ کسی انسان کا قول اس درجہ کی حجت نہیں ہے کہ اس بنیاد پر اُسے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ساقط کیا جا سکے۔

دُوسرے اگر کسی امام یا فقیہ کے کسی قول سے اس کے اسقاط کا پہلو نکلتا ہو تو نہایت احتیاط کے ساتھ یہ تحقیق کرنا چاہیے کہ قائل کا مدعا حقیقت میں ہے کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جن حالات اور جن وجوہ سے اس نے یہ پہلو اختیار کیا تھا وہ اپنی جگہ درست ہوں، اور ہم وجوہ واحوال سے صرف نظر کر کے مجرداس کے الفاظ کی پیروی کرنے میں غلطی کر رہے ہوں؟

پھر کسی فرض کو کسی حال یا مقام پر غیر فرض قرار دینے میں جتنی احتیاط کی ضرورت ہے اُس سے بدرجہا زیادہ احتیاط کی ضرورت اُسے ممنوع اور حرام اور گناہ قرار دینے میں برتنی چاہیے۔ فرضِ منصوص اور حرمت و معصیّت کے درمیان بہت بڑی مسافت ہے، اِس مسافت کو قطع کرنے کے لیے بڑی محکم سواری کی ضرورت ہے۔ کمزور سواریوں کے بل پر اس راہ میں آگے بڑھنا خطرناک ہے۔

شرائطِ جمعہ

اب دیکھنا چاہیے کہ جمعے کی وہ شرائط جن کے فقدان سے فرض کے سقوط کا حکم لگایا جا سکتا ہے، کون کون سی ہیں، اور ان کی نوعیت کیا ہے۔

حنفیہ کے نزدیک جمعہ کی شرائط دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو مصلّی کی ذات میں پائی جانی چاہییں۔ دوسری وہ جو خارج میں متحقق ہونی چاہییں۔

پہلی قسم کی شرائط یہ ہیں کہ مصلّی مقیم ہو، مسافر نہ ہو۔ آزاد ہو، مملوک نہ ہو۔ مردِ بالغ ہو، بچہ یا عورت نہ ہو۔ صحیح و تندرست ہو، بیمار یا معذور نہ ہو۔ (المبسوط، جلد دوم، ص ۲۲)

ان شرائط کا ماخذ علمائے حنفیہ نے ذیل کی حدیث کو قرار دیا ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَعَلَيْهِ الْجُمُعَةُ اِلَّا مُسَافِرٌ وَ مَمْلُوْكٌ وَ صَبِيٌّ وَامْرَاَةٌ وَ مَرِيْضٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہو اس پر جمعہ فرض ہے۔ مگر مسافر، غلام بچہ، عورت، اور مریض اس سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ رعایت جو مسافروں، غلاموں، عورتوں اور مریضوں کے ساتھ کی گئی ہے اس کے معنی صرف یہی ہیں کہ اگر یہ جمعہ میں شریک نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کسی شخص نے بھی اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا کہ ان کے لیے نمازِ جمعہ ممنوع ہے۔ نہ کسی نے یہ کہا کہ اگر وہ شریکِ جمعہ ہوں تو ترکِ ظہر کی وجہ سے گنہگار ہوں گے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتیں جمعہ کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ غلام بھی شریک ہوتے تھے۔ اندھوں کو بھی اگر کوئی ہاتھ پکڑ کر پہنچا دینے والا مل جاتا تو وہ گھر نہ بیٹھے رہتے تھے۔ ان میں سے کسی شخص سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ تم پر سے جمعہ کا فرض ساقط ہو گیا، تم کو جمعہ کے بجائے ظہر کی نماز

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پڑھنی چاہیے، ورنہ ترکِ ظہر کی وجہ سے گنہگار ہوں گے۔ علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

یہ وجوب کی شرائط ہیں نہ کہ ادا کی شرائط۔ اگر مسافر اور غلام اور عورت اور مریض نماز جمعہ میں شریک ہوجائیں تو جائز ہوگا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ، کی حدیث ہے کہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ پڑھتی تھیں اور ان سے کہا جاتا تھا کہ خوشبو لگا کر نہ آیا کرو۔ ان لوگوں سے فرض کے سقوط کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس نماز میں کوئی ایسی بات ہے جو ان کی شرکت سے مانع ہو۔ بلکہ صرف ان کو تکلیف سے بچانے کے لیے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اگر یہ اس تکلیف کو برداشت کرلیں تو پھر ادائے نماز میں یہ بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ مساوی ہوں گے۔ (المبسوط، ج ۲، ص ۲۳)

دوسری قسم کی شرائط کو شرائطِ ادا یا شرائطِ صحت قرار دیا گیا ہے، یعنی اگر یہ نہ ہوں تو جمعہ ادا ہی نہ ہوگا۔ یہ چھ شرطیں ہیں۔ مصر، وقت، خطبہ، جماعت، سلطان، اذنِ عام ان میں سے پہلی شرط یعنی مصر کی شرط ہی یہاں زیر بحث ہے، لیکن اس پر کلام کرنے سے پہلے یہ تحقیق کرنا ضروری ہے کہ بجائے خود ان شرائط کی نوعیت کیا ہے؟[1]

ان میں سے بعض شرائط ایسی ہیں جو نصوصِ قولی و عملی سے صریحاً ثابت ہیں، مثلاً وقت کہ اس کا وقتِ ظہر ہونا ثابت ہے۔ اسی طرح خطبہ بھی صریحاً شرط جمعہ ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خطبہ کے بغیر جمعہ نہیں پڑھا اور قرآن میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اِسی طرح جماعت کا بھی شرائطِ جمعہ میں سے ہونا ثابت ہے، اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ بھی ہوا ہے مقدارِ جماعت میں ہوا ہے۔ اذنِ عام بھی رسول اکرم اور صحابہ اور ائمہ کے متواتر عمل سے ثابت ہے اور اہم مصالحِ شرعیہ اس کی مقتضی ہیں۔

بخلاف اس کے مصر اور سلطان کی شرائط ایسی ہیں جن کا ماخذ کوئی نصِ صریح نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر ان کا مدار استنباط و اجتہاد پر ہے، اور اسی لیے ان کا شرطِ ادا ہونا بھی مختلف فیہ ہے۔

سلطان کی شرط کا ماخذ یہ حدیث ہے:

...... فَمَنْ تَرَكَهَا تَهَاوُنًا وَاسْتِخْفَافًا بِحَقِّهَا وَلَهُ إِمَامٌ جَائِرٌ أَوْ عَادِلٌ فَلَا جَمَعَ اللّٰهُ شَمْلَهُ أَلَا فَلَا صَلَاةَ لَهُ أَلَا فَلَا صَوْمَ لَهُ إِلَّا أَنْ يَتُوبَ، فَإِنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ.......... پس جس نے جمعہ کو ایک معمولی چیز سمجھ کر اور اس کے حق کو ہلکا جان کر چھوڑ دیا درآنحالیکہ اس کا کوئی ظالم یا عادل امام موجود ہو، تو خدا اس کی پراگندگی کو دور نہ کرے۔ جان رکھو کہ نہ اس کی نماز درست، نہ اس کا روزہ درست، جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے۔ اگر توبہ کرے گا تو اس کی توبہ اللہ قبول کرے گا۔

نیز حضرت حسن بصری کا یہ قول، جس کو ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے:

۱۔ نماز جمعہ میں شرط مصر کے متعلق مجھے علمائے حنفیہ سے اختلاف ہے، میری تحقیق یہ ہے کہ بعد کے لوگوں نے خود امام ابوحنیفہؒ ہی کے استدلال و استنباط کو اس معاملہ میں نہیں سمجھا۔ امام صاحب کا مدعا صرف یہ تھا کہ اقامتِ جمعہ ایسی آبادیوں میں ہو جو اپنے علاقوں کے اندر مرکزی حیثیت رکھتی ہوں اور یہ حدیث کے عین مطابق ہے لیکن بعد کے لوگوں نے مصر کا مدلول متعین کرنے میں کھینچ تان کی اور متعدد ایسی شرطیں بڑھادیں جن کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ (رسائل و مسائل، اوّل، جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۱۹۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اَرْبَعٌ اِلَى السُّلْطَانِ، مِنْهَا: اِقَامَةُ الْجُمُعَةِ وَ الْعِيْدَيْنِ چار چیزیں سلطان سے متعلق ہیں جن میں سے اقامت جمعہ وعیدین بھی ہے۔

لیکن اوپر کی حدیث اور یہ اثر دونوں اس باب میں ناطق نہیں ہیں کہ امام یا سلطان کے بغیر اقامتِ جمعہ جائز ہی نہیں ہے۔ حدیث سے تو صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں اسلامی نظامِ جماعت قائم ہو وہاں جمعہ کو ترک کرنا اور بھی زیادہ شدید گناہ ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ جس نے مسجد میں چوری کی اس پر خدا کی لعنت۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس شخص کے نزدیک چوری کا حرام ہونا اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس کا ارتکاب مسجد میں ہو، بلکہ دراصل وہ ارتکاب فی المسجد کو ایک مزید وجہ شناعت کی حیثیت سے بیان کر رہا ہے۔ بالکل اسی طرح حضور نے بھی امام المسلمین کی موجودگی، یا بالفاظِ دیگر اسلامی نظامِ جماعت کی موجودگی کو ترک جمعہ کے لیے ایک اور سببِ مردودیت کی حیثیت سے بیان فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری احادیث جن میں فرضیتِ جمعہ کی تاکید آئی ہے، امام کے ذکر سے خالی ہیں، اور دوسری احادیث میں تارکِ جمعہ کی جتنی توبیخ کی گئی ہے، اس حدیث میں اس سے زیادہ توبیخ پائی جاتی ہے۔ اسی طرح وہ اثر بھی جو ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے جمعہ کے لیے سلطان کے اشتراط پر دال نہیں ہے۔ اس میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ چار چیزوں کا اہتمام سلطان کو کرنا چاہیے۔ جن میں سے ایک اقامتِ جمعہ وعیدین ہے۔ اس سے یہ مطلب کیونکر نکالا جا سکتا ہے کہ اگر سلطان نہ ہو تو یہ کام بند رہیں۔ اگر کوئی کہے کہ لڑکی کی شادی کرنا باپ کا کام ہے تو اس کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ باپ نہ ہو تو لڑکی بیٹھی رہے۔

رہی مصر کی شرط تو اس کا ماٴخذ یہ حدیث ہے:

لَا جُمُعَةَ وَلَا تَشْرِيْقَ اِلَّا فِيْ مِصْرٍ جَامِعٍ[1] جمعہ اور عیدین مصر جامع کے سوا کہیں نہ پڑھی جائیں۔

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اثر کہ:

لَا جُمُعَةَ وَ لَا تَشْرِيْقَ وَلَا فِطْرَ وَلَا اُضْحٰى اِلَّا فِيْ مِصْرٍ جَامِعٍ جمعہ اور تشریق اور عید فطر اور عید اضحیٰ مصر جامع کے سوا کہیں نہ پڑھی جائیں۔

لیکن 'مصر جامع' کی کوئی تعریف کسی نص سے ماخوذ نہیں ہے۔ میں نے حتی الامکان پوری جستجو کی، مگر مجھے ابھی تک کسی حدیث یا کسی اثر سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ مصر کی حد کیا ہے۔ فقہائے حنفیہ کی کتابوں میں مصر کی جو تعریفات بیان ہوئی ہیں، ان میں سے کسی میں بھی کسی حدیث یا اثر کا حوالہ نہیں دیا گیا۔

یہ ہے ان دونوں شرطوں کا حال، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے شرائطِ صحت وادا ہونے میں کلام کیا جا سکتا ہے، اور کیا گیا ہے۔ خود علمائے احناف نے وقتاً فوقتاً ان شرائط میں ترمیمیں کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلکِ حنفی میں اتنی گنجائش ہے کہ حسب موقع و ضرورت ان میں قواعدِ شرعیہ کو ملحوظ رکھ کر مزید ترمیم کی جا سکے۔

۱۔ یہ حدیث حضرت علی کے واسطے سے مرفوعاً روایت ہوئی ہے مگر امام احمد کہتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ (نیل الاوطار، ج ۳، ص ۱۹۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قابلِ ترمیم شرائط

سب سے پہلے سلطان کی شرط کو لیجیے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ نے تو اس کے شرطِ جمعہ ہونے سے ابتدا ہی میں انکار کر دیا تھا، مگر خود فقہائے حنفیہ بھی بعد میں اس شرط کے اسقاط پر مجبور ہو گئے۔ جب تک ایسے سلاطین و اُمرا برسرِ اقتدار رہے جو کسی حد تک اپنے فرائضِ دینی کا احساس رکھتے تھے، اس وقت تو حنفیہ کو اپنے اس فتوے میں بظاہر کوئی قباحت نظر نہ آئی کہ جمعہ کی اقامت اذنِ سلطان کے ساتھ مشروط ہے اور سلطان کے بغیر اقامتِ جمعہ جائز نہیں، مگر جب دین سے غافل حکام و سلاطین کا دور آیا تو فقہا نے محسوس کیا کہ شرطِ سلطان نے ایک دینی فرض کو دنیوی سلاطین کی مرضی پر موقوف کر دیا ہے، حتّٰی کہ اگر وہ نہ چاہیں تو فرض ہی ساقط ہوا جاتا ہے۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ اگر حکام غفلت برتیں تو جمعہ مسلمانوں کی باہمی رضامندی پر قائم کیا جائے۔ پھر وہ دور آیا جب اسلامی ممالک پر کفار مسلط ہونے لگے اور بڑی بڑی اسلامی آبادیاں سلطانِ اسلام سے کلیتاً محروم ہو گئیں۔ اس وقت فقہا کو یہ فتویٰ دینا پڑا:

وَ اَمَّا فِی الْبِلَادِ عَلَیْھَا وُلَاۃٌ کُفَّارٌ فَیَجُوْزُ لِلْمُسْلِمِیْنَ اِقَامَۃُ الْجُمَعِ وَالْاَعْیَادِ وَ یَصِیْرُ الْقَاضِی قَاضِیاً بِتَرَاضِی الْمُسْلِمِیْنَ وَ یَجِبُ عَلَیْھِمْ طَلَبُ وَ الٍ مُسْلِمٍ۔ (شامی) رہے وہ ممالک جن پر کافر حکام مسلط ہیں، تو ان میں مسلمانوں کے لیے اقامت جمعہ وعیدین کا خود انتظام کر لینا جائز ہے اور وہاں مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے جو قاضی مقرر ہو وہ قاضی ہو سکتا ہے اور ان پر مسلمان حاکم کی طلب واجب ہے۔

اس طرح وہی شرط، جو پہلے شرطِ ادا سمجھی گئی تھی شرطِ وجوب بھی نہ رہی اور تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ سلطانِ اسلام کی موجودگی سرے سے شرطِ جمعہ ہی نہیں ہے۔

یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے۔ نبی کی بصیرت براہِ راست علمِ الٰہی سے مستفاد ہوتی ہے اس لیے اس کے احکام تمام ازمنہ واحوال کے لیے مناسب ہوتے ہیں۔ مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان و مکان کے تعیّنات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا، نہ اس کی نظر تمام ازمنہ واحوال پر وسیع ہو سکتی ہے، لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔

جن لوگوں کو اللہ نے تفقہ فی الدین کی نعمت سے نوازا تھا وہ چوتھی صدی ہجری کے بعد بھی اس راز کو سمجھتے تھے اور تغیرِ احوال کے ساتھ اپنے مذہبِ فقہی کے جزدی احکام میں مناسب ترمیم کر دیتے تھے، اور ان کی ترمیمات، اجتہادی ترمیمات ہونے کے باوجود اُسی مذہب کا ایک جزو بن جاتی تھیں جس کے وہ متبع ہوتے تھے۔ مگر افسوس کہ دورِ انحطاط کے لوگ امام کی نص کو خدا اور رسول کی نص کی طرح محکم اور اٹل سمجھنے لگے، اور انھوں نے اس بات کو گناہ سمجھ لیا کہ مجتہد کے کسی قول پر جو فتویٰ مبنی ہو اس میں تغیرِ احوال کے ساتھ کوئی ترمیم کی جائے، خواہ اس سے خدا اور رسول ہی کا کوئی حکمِ منصوص کیوں نہ ساقط ہو جائے۔ چنانچہ اسی قسم کے بعض

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فقہائے جامد نے انگریزی تسلّط کے بعد ہندوستان میں فتوے دینے شروع کر دیے تھے کہ اب یہاں اقامت جمعہ جائز نہیں کیونکہ سلطانِ اسلام کے اُٹھ جانے سے اقامتِ جمعہ کی ایک شرط مفقود ہو گئی ہے۔ مگر خوش قسمتی سے اس وقت ہندستان میں ایسے علما بھی موجود تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے علمِ حق سے سرفراز فرمایا تھا۔ انھوں نے اُٹھ کر سختی کے ساتھ اس تحریک کی مخالفت کی، حتیٰ کہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے زیادہ درشت الفاظ میں یہاں تک لکھ دیا:

اِنَّہٗ لَا شَکَّ فِیْ وُجُوْبِ الْجُمْعَۃِ وَ صِحَّۃِ اَدَائِھَا فِیْ بِلَادِ الْھِنْدِ الَّتِیْ غَلَبَتْ عَلَیْہِ النَّصَارٰی وَ جَعَلُوْا عَلَیْھَا وُلَاۃَ کُفَّارًا وَ ذَالِکَ بِاتِّفَاقِ الْمُسْلِمِیْنَ وَ تَرَاضِیْھِمْ وَمَنْ اَفْتٰی بِسُقُوْطِ الْجُمْعَۃِ لِفَقْدِ شَرْطِ السُّلْطَانِ فَقَدْ ضَلَّ وَ اَضَلَّ اس میں شک نہیں کہ بلادِ ہند میں جہاں نصاریٰ کا غلبہ ہو گیا ہے اور انھوں نے کافر حکام مقرر کر دیے ہیں، جمعہ واجب ہے، اور مسلمانوں کے باہمی اتفاق اور رضامندی سے اس کو ادا کرنا درست ہے۔ جس کسی نے سقوطِ جمعہ کا فتویٰ دیا وہ خود بھی گمراہ ہوا اور اس نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تمام ہندستان کے حنفی، عالم اور عامی سب اس ملک میں جمعہ پڑھ رہے ہیں[1]۔ حالانکہ ھدایہ کی یہ عبارت اب بھی پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے کہ لَا یَجُوْزُ اِقَامَتُھَا اِلَّا لِسُلْطَانٍ اَوْ لِمَنْ اَمَرَہُ السُّلْطَانُ[2]۔ اگر احوال کے لحاظ سے مجتہدین کے احکام میں جزوی ترمیم کرنا بھی غیر مقلدیت ہے تو ایسی غیر مقلدیت میں تمام احنافِ ہند پہلے مبتلا ہو چکے ہیں۔

شرطِ مصر

شرطِ سلطان کی طرح شرطِ مصر کو بھی امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ جنگلوں اور خیموں اور عارضی فرودگاہوں میں جمعہ قائم کرنا درست نہیں۔ یہ امر بھی متفق علیہ ہے کہ جمعہ کے لیے ایک نوع کا تمدن ضروری ہے۔ مگر اس امر میں اختلاف ہے کہ جمعہ کتنی بڑی بستی میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس جگہ کم از کم چالیس آدمیوں کی مستقل بستی ہو (یعنی وہ گرمی جاڑے میں مہاجرت نہ کرتے رہتے ہوں) وہ مقام اقامتِ جمعہ کا ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک چالیس آدمیوں سے کم کی بستی میں بھی اقامتِ جمعہ ہو سکتی ہے۔ مگر حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اقامت جمعہ کے لیے 'مصر جامع' ہونا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ 'مصر جامع' کا لفظ حدیث میں آیا ہے، مگر جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، اس کی کوئی حد نہ اس حدیث میں مذکور ہے نہ کسی دوسری مرفوع یا موقوف روایت میں۔ اسی لیے اس میں اجتہاد کی گنجایش ہے، اور اجتہاد ہی سے مختلف زمانوں میں مختلف حدیں مقرر کی گئی ہیں، حتیٰ کہ ایک ہی امام نے مختلف اوقات میں اس کی مختلف حدیں بیان کی ہے۔

امام ابو یوسف رحمہُ اللہ سے تین مختلف تعریفیں منقول ہیں:

۱- حقیقت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ غلطی جڑ پکڑ گئی ہوتی تو آج ہم اپنے بڑے بوڑھوں ہی سے یہ سنتے کہ اس ملک میں کبھی نمازِ جمعہ بھی ہوا کرتی تھی۔ (مؤلف)

۲- اور جائز نہیں ہے جمعہ کا قائم کرنا سوائے سلطان کے یا ایسے شخص کے جس کو سلطان نے حکم دیا ہو۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۱- مصرِ جامع وہ ہے جہاں امیر اور قاضی احکامِ اسلامی کی تنفیذ اور حدودِ شرعی کی اقامت کرتا ہو۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی ایک قول اسی مضمون کا منقول ہے۔ اور کرخی وغیرہ فقہانے اس کو اختیار کیا ہے۔

۲- مصروہ مقام ہے جس کے باشندے (یعنی وہ لوگ جن پر جمعہ فرض ہے) اگر سب کے سب وہاں کی سب سے بڑی مسجد میں جمع ہو جائیں تو وہ ان کے لیے کافی نہ ہو اور ایک دوسری مسجد بنانے کی ضرورت پڑ جائے۔ اس رائے کو ابنِ شجاع نے پسند کیا ہے۔ اور ابوعبداللہ الثلجی نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔

۳- مصروہ جگہ ہے جہاں کم از کم دس ہزار کی آبادی ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں تعریفیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور ایک ہی امام نے ان کو مختلف اوقات میں اختیار کیا ہے۔ پھر بعد کے مختلف فقہانے اپنی پسند کے مطابق ان میں سے بعض کو رد اور بعض کو قبول کیا حالانکہ وہ مجتہدِ مطلق نہ تھے۔

امام ابوحنیفہ رحمہُ اللہ سے ایک قول تو وہ منقول ہے جو اوپر بیان ہوا۔ اور انھی سے دوسرا قول یہ روایت کیا گیا ہے کہ:

مصروہ ہے جہاں سڑکیں اور بازار ہوں، محلے ہوں، کوئی والی ظالم سے مظلوم کا انصاف لینے والا ہو اور کوئی عالم موجود ہو جس سے مسائلِ شرعیہ میں رجوع کیا جا سکے۔[1]

اسی طرح امام اعظمؒ نے دو مرتبہ اور امام ابویوسف نے تین مرتبہ مصر کی تعریف میں ترمیم فرمائی۔

اس کے بعد مختلف لوگوں نے مختلف تعریفیں کیں اور ترمیمات کا سلسلہ جاری رہا۔ مثلاً علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

ہمارے بعض مشائخ کا قول ہے (بلا اس تصریح کے کہ وہ مشائخ ہیں کون؟) کہ مصروہ ہے جہاں ہر پیشے کا آدمی اسی مقام پر کام کر کے گزر بسر کر سکتا ہو۔ اور اسے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔[2]

ایک اور تعریف برجندی نے کنز العباد سے نقل کی ہے کہ بعض فقہا کے نزدیک:

مصروہ ہے جہاں ہر روز ایک بچہ پیدا ہو اور ایک آدمی مرے۔

ایک اور تعریف کنز العباد میں کسی نامعلوم الاسم فقیہ سے نقل کی گئی ہے کہ:

مصروہ ہے جس کی مردم شماری بغیر انتہائی تکلیف اور سخت مشقت کے معلوم نہ کی جا سکے۔

اِسی قسم کی اور تعریفات کا سلسلہ قریب قریب ہر زمانے میں برابر جاری رہا ہے۔ حتیٰ کہ ہم سے بہت قریبی دور میں بھی مختلف علمانے مختلف تعریفیں کی ہیں جن کی تعداد درجنوں سے متجاوز ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصر کی تعریف خود حنفیہ میں مختلف فیہ ہے، مصر کوئی متعین چیز نہیں ہے۔ اگر اب اس کی کوئی نئی تعریف کی جائے تو حنفیت سے خارج ہو کر غیر مقلدیت کے دائرے میں چلے جانے کا خطرہ نہیں ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ اگر حنفیہ ہی کے اصول پر مصر کے مفہوم کا تعین اس طرح کیا

۱- ملاحظہ ہو: ہدایۃ، فتح القدیر و شرح العنایۃ علی الھدایۃ، جلد اوّل، ص ۴۰۹-۴۱۱۔

۲- ملاحظہ ہو: کتاب المبسوط، ج ۲، ص ۲۴۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جائے کہ اس سے اسقاطِ فرض کے بجائے اقامتِ فرض میں مدد ملتی ہو تو وہ اہلِ تقویٰ کے لیے زیادہ قابلِ قبول ہونا چاہیے۔

آخری تنقیح

اب میں آخری تنقیح کی طرف توجہ کرتا ہوں جس پر مسئلے کے تصفیہ کا مدار ہے۔ اس تنقیح کے الفاظ پھر ایک مرتبہ ملاحظہ فرما لیجیے:

کیا یہ جائز ہے کہ اس فرض کو ادا کرنے کے لیے ایک ایسا نظام اختیار کیا جا سکے جو فقہائے حنفیہ کے فتاویٰ سے چاہے مختلف ہو، مگر ان کے اصول کے خلاف نہ ہو۔

اُوپر میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے۔ اگر شرطِ سلطان کو بالکل ساقط کر دینے اور مصر کی تعریفات میں پے در پے ترمیمات کرنے کے باوجود حنفیت کے دائرے سے کوئی شخص خارج نہیں ہوتا، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس مذہب کے دائرے میں ادائے فرض کے کسی ایسے نظام کی گنجایش نہ ہو جو اصولِ مذہب حنفی پر پورا اترتا ہو۔ لہٰذا اب مجھ پر صرف اس امر کا بارِ ثبوت رہ جاتا ہے کہ جو نظام میں تجویز کر رہا ہوں وہ اصولِ مذہب حنفی کے مطابق ہے۔

میں نے جہاں تک احکام پر غور کیا ہے، اس سے مجھے شریعت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ جمعہ کو منتشر طور پر چھوٹے چھوٹے قریوں میں الگ الگ ادا کرنا مقاصدِ جمعہ کے لیے مفید نہیں ہے اس لیے شارع نے حکم دیا کہ جمعہ 'مصر جامع' میں ادا کیا جائے۔ 'مصر جامع' کا لفظ خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے مراد کوئی ایسی بستی ہے جو چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو یکجا کرنے والی، یا جامع الجماعات ہو۔ یعنی جہاں بہت سی چھوٹی بستیوں کے لوگ اکٹھے ہو کر جمعہ ادا کریں۔ اس غرض کے لیے دوکانوں اور بازاروں اور آبادی کی تعداد، اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو مصر کی جامعیت میں کوئی دخل نہیں ہے۔ نہ اقامتِ جمعہ سے ان اجزائے مصر کا براہِ راست کوئی تعلق ہے کہ جمعہ کی نماز اپنی صحت کے لیے بازار اور بہت سی دوکانیں مانگتی ہو۔ اس کے لیے صرف ایک بستی کی ضرورت ہے جو مرکزی حیثیت رکھتی ہو تاکہ اطراف کے منتشر مسلمان وہاں مجتمع ہو جائیں۔ اگر کوئی بڑا شہر موجود ہو، جسے تمدن نے خود ہی ایک مرکزی حیثیت دے رکھی ہو تو بہت اچھا، ورنہ امامِ وقت جس بستی کو مناسب سمجھے 'مصرِ جامع' قرار دے کر اطراف کے لوگوں کو وہاں جمع ہونے کا حکم دے سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ وَلَوْ مَصَّرَ الْاِمَامُ مَوْضِعاً وَ اَمَرَهُمْ بِالْاِقَامَةِ فِيْهِ جَازَ وَلَوْ مَنَعَ اَهْلُ مِصْرٍ اَنْ يَّجْمَعُوْا لَمْ يَجْمَعُوْا یعنی اگر امام کسی جگہ کو مصر ٹھہرا دے اور لوگوں کو وہاں جمعہ قائم کرنے کا حکم دے تو وہاں نماز جائز ہے اور اگر کسی مقام کے باشندوں کو جمعہ قائم کرنے سے منع کر دے تو ان کو قائم نہ کرنا چاہیے۔ (فتح القدیر، اوّل، ص ۴۰۹)

لیکن اگر امام موجود نہ ہو تو جس طرح مسلمانوں کی تراضی سے جمعہ قائم ہو سکتا ہے، اور جس طرح ان کی تراضی سے قاضی مقرر ہو سکتا ہے، اسی طرح ان کی تراضی، امام کی قائم مقام بن کر، کسی بستی کو 'مصر جامع' بھی ٹھہرا سکتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کون سی نص مانع ہے، یا یہ بات اصول میں سے کس اصل کے خلاف پڑتی ہے۔

مصر جامع کی شرط لگانے سے شارع کا منشا تو یہ تھا کہ دیہات کے لوگ فریضۂ جمعہ کو منتشر طور پر ادا کرنے کے بجائے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک مرکزی مقام پر مجتمع ہو کر ادا کریں گے۔ مگر نہ معلوم کن وجوہ سے اس شرط کے معنی بالکل اُلٹ دیے گئے اور دیہات کے لوگوں کو اجتماع کا حکم دینے کے بجائے اُلٹا فریضۂ جمعہ ہی سے سبکدوش کر دیا گیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوئی کہ لفظِ 'مصر' سے علما کا ذہن 'شہر' کے عرفی مفہوم کی طرف منتقل ہو گیا اور انھوں نے حدیث کا مطلب یہ سمجھا کہ جمعہ صرف شہروں میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ پھر چونکہ شہر بہت دور دور ہوتے ہیں اور مسافتِ بعیدہ طے کر کے ان کی طرف جانے سے آدمی مسافر کی تعریف میں آ جاتا ہے، جس پر جمعہ از روئے نص فرض ہی نہیں ہے، اس لیے بات یہاں تک پہنچ گئی کہ مضافاتِ شہر کے سوا باقی تمام دیہات کے باشندوں پر سے فریضۂ جمعہ ساقط ہے۔ حالانکہ جس چیز کو قرآن اور احادیثِ مشہورہ اور سنت و اجماع نے مسلمانوں پر فرضِ عین ٹھیرایا ہوا سے دیہات کے رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کے لیے غیر فرض بنا دینا، اور وہ بھی ایک ضعیف الاسناد مختلف فیہ اور مبہم المعنی حدیث کی بنا پر، کسی طرح مقتضائے احتیاط نہیں ہے۔ حدیث نے تو اقامتِ جمعہ کے لیے محض 'مصرِ جامع' کی شرط لگائی ہے۔ مردم شماری کی ایک خاص مقدار اور دو کانوں کی ایک خاص تعداد اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی تصریح اس میں نہیں ہے۔ لہٰذا یہ چیزیں بجائے خود اقامتِ جمعہ کے لیے شرطِ منصوص نہیں ہیں، بلکہ ان کو اُس مفہوم نے شرط بنایا ہے جو لفظِ مصر سے علما نے سمجھا۔ بالفاظِ دیگر فریضۂ منصوصہ کو دیہات کے مسلمانوں پر سے ساقط کرنے والی چیز خود نص نہیں ہے، بلکہ وہ مفہوم ہے جو نص سے اخذ کیا گیا ہے۔ اگر اس مفہوم کے سوا نص کا کوئی اور مفہوم نہ ہوتا، یا نص اپنے الفاظ میں صریح ہوتی، تو بلاشبہ اس کی بنا پر اسقاطِ فرض درست ہوتا۔ مگر جب کہ اس کا کوئی دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے، تو میرے نزدیک تقویٰ اور خشیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسقاطِ فرض کا راستہ کھولنے والے مفہوم کی بہ نسبت اقامتِ فرض کا راستہ کھولنے والا مفہوم زیادہ لائقِ ترجیح ہو۔

میں نے مصر کی جو تعریف کی ہے اس کو اختیار کرنے سے اکثر و بیشتر دیہاتی مسلمانوں کے لیے، بلکہ خانہ بدوش مسلمانوں کے لیے بھی، صحیح شرعی طریق پر جمعہ ادا کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دیہی علاقوں کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کیا جائے جن کا دور [یعنی دائرہ] مقامی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ۴-۵ میل سے لے کر ۸-۹ میل تک ہو۔ ان حلقوں میں ایک مرکزی مقام کو مسلمان باشندوں کی باہمی رضامندی سے مصرِ جامع قرار دے دیا جائے اور گرد و پیش کے دیہات کو توابعِ مصر قرار دے کر اعلان کر دیا جائے کہ ان کے مسلمان باشندے وہاں آ کر جمعہ کی نماز ادا کریں۔ یہ نظام نہ صرف احادیثِ صحیحہ کی رو سے درست ہو گا بلکہ فقہائے حنفیہ کی تصریحات کے بھی خلاف نہ ہو گا۔ فقہا نے توابعِ مصر کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ بعض لوگوں نے توابعِ مصر کی حد ۹ میل مقرر کی ہے۔ بعض نے دو میل، بعض نے چھ میل، اور بعض کہتے ہیں کہ جس مقام سے مصر میں آ کر نماز ادا کرنے کے بعد آدمی رات ہونے سے پہلے پہلے گھر پہنچ سکے وہ توابعِ مصر میں شمار ہو گا۔ صاحب بدائع نے اسی آخری تعریف کو پسند کیا ہے، اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ترمذی میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْجُمُعَةُ عَلٰى مَنْ اٰوَاهُ اللَّيْلُ اِلٰى اَهْلِهٖ[1] (ترمذی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

۱- اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے، لیکن یہ مضمون متعدد طریقوں سے حضرت ابوہریرۃ حضرت انس، حضرت ابن عمر اور حضرت معاویہ سے منقول ہوا ہے۔ اور اسے نافع، حسن، اور عکرمہ، اور ابراہیم نخعی، اور عطا، اور اوزاعی، اور ابوثور نے قبول کیا ہے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جمعہ اس پر فرض ہے جو رات سے پہلے اپنے گھر پہنچ جائے۔

اور بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:

كَانَ النَّاسُ يَنْتَابُوْنَ الْجُمُعَةَ مِنْ مَنَازِلِهِمْ وَالْعَوَالِيْ (بخاری) لوگ جمعہ کے روز اپنی فرودگاہوں اور عوالی سے آیا کرتے تھے۔

اور ایک دوسری حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَلاَ هَلْ عَسٰى اَحَدُكُمْ اَنْ يَّتَّخِذَ الصُّبَّةَ مِنَ الْغَنَمِ عَلٰى رَأْسِ مِيْلٍ اَوْ مِيْلَيْنِ فَتَعَذَّرَ عَلَيْهِ الْكَلاَءُ فَيَرْتَفِعَ ثُمَّ تَجِئُ الْجُمُعَةُ فَلاَ يَجِئُ وَلاَ يَشْهَدُهَا (ثلاثا) حَتّٰى يُطْبَعَ عَلٰى قَلْبِهٖ[1] حضورؐ نے فرمایا کہ سنو! تم میں سے ایک شخص بکریوں کا ریوڑ لیے ہوئے چارے کی تلاش میں تو میل دو میل چلا جائے مگر جب جمعہ آئے تو اس میں شریک ہونے کے لیے یہاں نہ آئے! (یہ جملہ آپ نے تین مرتبہ دہرایا، پھر وہاں) ایسے شخص کے دل پر مہر لگائی جائے گی۔

ان احادیث سے اور فقہا کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ توابع مصر کی حد چھ سات میل یا اس کے قریب قریب ہے، جہاں کے باشندے نماز پڑھ کر شام تک اپنے گھر پہنچ سکیں۔ اس حد کے اندر رہنے والے تمام مسلمانوں پر، خواہ وہ مستقل دیہات میں رہتے ہوں، یا خانہ بدوش ہوں، مصرِ جامع میں حاضر ہو کر نمازِ جمعہ ادا کرنا فرض ہے۔ جیسا کہ ابن ہمام نے فتح میں لکھا ہے:

وَمَنْ كَانَ مِنْ مَكَانٍ مِنْ تَوَابِعِ الْمِصْرِ فَحُكْمُهٗ حُكْمُ اَهْلِ الْمِصْرِ فِيْ وُجُوْبِ الْجُمُعَةِ عَلَيْهِ بِاَنْ يَّاْتِيَ الْمِصْرَ فَلْيُصَلِّهَا فِيْهِ (فتح القدیر، ج ا، ص ۴۱۱) اور جو شخص توابع مصر میں سے کسی جگہ ہو اس کے لیے خود اہلِ مصر کی طرح جمعہ واجب ہے۔ اسے مصر میں حاضر ہو کر نماز ادا کرنی چاہیے۔

خلاصۂ کلام

اب میں اپنے مدعا کی تسہیل کے لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ پچھلے مباحث کا ایک خلاصہ آپ کے سامنے پیش کر دوں، تاکہ بیک نظر آپ کو معلوم ہو جائے کہ اقامتِ جمعہ فی القریٰ کے لیے جو نظام میں تجویز کر رہا ہوں وہ کہاں تک مسلکِ حنفی کے خلاف یا موافق ہے۔

۱۔ حنفیہ کے نزدیک الگ الگ دیہات میں جمعہ قائم کرنا جائز نہیں .... میں بھی اسی کا قائل ہوں۔

۲۔ حنفیہ کی رائے میں جمعہ صرف 'مصرِ جامع' میں قائم ہونا چاہیے .... میں اس امر میں بھی ان کا متبع ہوں۔

۳۔ حنفیہ صرف دو قسم کے مقامات کو مصر جامع تسلیم کرتے ہیں۔ ایک وہ جن کو تمدن نے خود بخود جامع بنا دیا ہو، جیسے شہر اور قصبے۔ دوسرے وہ جن کو امام وقت جمعہ قائم کرنے کے لیے مصر ٹھیرا دے .... اس میں صرف اتنی ترمیم میں نے تجویز

۱۔ تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، سوم، ص ۳۷۱، اگست ۲۰۰۴ء۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی ہے کہ جہاں امام موجود نہ ہو وہاں عامۃ المسلمین کے اتفاق کو امام کا قائم مقام قرار دیا جائے، اور ان کے اس اختیار کو تسلیم کیا جائے کہ وہ کسی علاقے میں کسی مقام کو مصر جامع قرار دے لیں۔ چونکہ اقامتِ جمعہ کے معاملے میں حنفیہ نے مسلمانوں کی تراضی کو امام کا قائم مقام تسلیم کیا ہے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ تعیینِ مصر کے معاملے میں ایسا کرنا حنفیہ کے اصول کے خلاف سمجھا جائے۔

۴۔ حنفیہ نے دیہاتیوں کے حق میں جمعے کے عدمِ فرضیت کا حکم صرف اس لیے لگایا ہے کہ اُمرا و سلاطین نے اقامتِ جمعہ کے لیے کوئی نظام قائم کرنے سے بے پروائی برتی، جس کی وجہ سے جمعہ محض پہلی قسم کے امصارِ جامعہ، یعنی شہروں اور بڑے بڑے قصبوں تک محدود ہو کر رہ گیا، اور چونکہ شہر دور دور ہوتے ہیں، اس لیے مجبوراً حنفیہ کو یہ فتویٰ دینا پڑا کہ دیہات کے باشندوں پر جمعہ فرض نہیں۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ دیہاتی کا محض دیہاتی ہونا اس پر سے جمعہ کے ساقط ہونے کا سبب نہیں ہے۔ چنانچہ جو دیہات توابعِ مصر میں ہوں، یعنی 'مصر' سے سات آٹھ یا نو میل کی حد میں ہوں، ان پر حنفیہ کے نزدیک جمعہ اسی طرح فرض ہے جس طرح اہلِ مصر پر فرض ہے .... میں کہتا ہوں کہ جو فتویٰ اس مجبوری کی بنا پر دیا گیا ہے، اس کے سبب کو دور کرنا ہم پر لازم ہے، تاکہ سبب زائل ہونے کے ساتھ فتویٰ خود بخود زائل ہو جائے اور مسلمانوں کے لیے ایک فرض مکتوب کے ادا کرنے کا راستہ کھلے۔ بخلاف اس کے بعض علما فرماتے ہیں کہ سبب کو قائم رکھو، تاکہ وہ پرانا فتویٰ جو قدامت کی وجہ سے مقدس ہو چکا ہے، اٹل رہے، چاہے فرض مکتوب کی رحمتوں سے کروڑوں مسلمان محروم رہ جائیں۔

تغیرِ فتویٰ کی دینی ضرورت

بحث کے اس خلاصے کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقامتِ جمعہ کا جو نظام میں تجویز کر رہا ہوں، اس کے لیے مذہب حنفی میں پوری گنجائش موجود ہے، اور اسے ناجائز ٹھیرانے کے لیے حقیقتاً کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ اب میں مختصراً یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس قسم کا ایک نظام تجویز کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی ہے، اور شرعی نقطۂ نظر سے اس ضرورت کی اہمیت کیا ہے۔

ہندوستان میں جب تک مسلمانوں کی حکومت تھی، خواہ وہ شرعی حیثیت سے کتنی ہی ناقص ہو، بہر حال اس کی وجہ سے اسلام کا اجتماعی نظام کسی نہ کسی حد تک ضرور قائم تھا۔ کم از کم اتنا تو تھا کہ اسلامی قوانین مسلمان حاکموں کے ذریعے سے نافذ ہوتے تھے، اور ہماری قوم کے عوام و خواص، شہری و دیہاتی اپنی زندگی کے معاملات میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ افرادِ امت کو ایک دینی سررشتہ سے وابستہ رکھنے کا یہ ایک قوی ذریعہ تھا۔ مگر جب وہ نیم اسلامی حکومت بھی ختم ہو گئی تو امت کو باہم مربوط رکھنے کے لیے کوئی نظام باقی نہ رہا۔ اب لے دے کر ہماری جمعیت، بلکہ حیاتِ ملی کا تمام تر انحصار اُن روابط پر رہ گیا ہے جو عقائد، عبادات اور تمدن و معاشرت کے شرعی قوانین سے پیدا ہوتے ہیں۔ انھی کی طاقت سے ہماری طاقت ہے، ان کی کمزوری سے ہماری کمزوری ہے، اور اُن کی موت سے ہماری موت ہے۔ ابھی تک بے شمار مخالف اسباب کی کارفرمائی کے باوجود شہروں میں یہ روابط نسبتاً کافی طاقتور ہیں، مگر دیہات میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی منتشر آبادیاں جو لاکھوں میل کے رقبہ پر پھیلی ہوئی ہیں، ان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کو دینی رابطہ میں جوڑنے والا سر رشتہ اب اس درجہ کمزور ہو چکا ہے کہ ایک اشارے میں ٹوٹ سکتا ہے۔ وہ منتشر بھیڑوں کی طرح ہر گمراہ کن بھیڑیے کے لیے آسان شکار بن گئے ہیں اور جہاں وہ قلیل التعداد ہیں، وہاں تو ان کی جان و مال اور عزت و آبرو تک محفوظ نہیں۔ اس صورت حال کی اصلاح اگر جلدی نہ کی گئی تو آپ دیکھیں گے کہ دیہات کی مسلمان آبادیاں فوج در فوج امت سے کٹتی چلی جائیں گی اور ان کا کٹ جانا گویا امت کا ختم ہو جانا ہے، کیونکہ ہماری آٹھ کروڑ آبادی میں سے کم از کم ساڑھے چھ کروڑ افراد دیہات میں آباد ہیں۔

اب اگر محض غیر قوموں کی تقلید کرنی ہو تو دیہات سُدھار کے بہت سے پروگرام بن سکتے ہیں، اور بن رہے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسے پروگرام سے اسلامی جمعیت اور دینی شیرازہ بندی ممکن نہیں۔ اسلامی جمعیت تو صرف رابطۂ دینی کو مضبوط کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے، اور اس کو مضبوط کرنے کے جتنے طریقے ہیں اُن میں سے کوئی بھی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ دیہات میں اقامت جمعہ کا نظام قائم نہ کر دیا جائے۔ دینی اصلاح و تنظیم کی راہ میں پہلا قدم، منتشر افراد اور پراگندہ ٹکڑیوں میں دین کے واسطے سے ربط و مرکزیت پیدا کرنا ہے اور اس ربط و مرکزیت کو پیدا کرنے کی بہترین صورت جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے پسند فرمائی ہے وہ اقامتِ جمعہ ہے۔

(تفہیمات، دوم، نومبر ۱۹۸۱ء، ص ۴۸۶-۵۰۴)

❁ ❁ ❁

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ہفتم

نمازِ عید

نمازِ عید کا طریقہ

[دورِ نبوی میں] عید کے روز صبح کو تمام مسلمان، عورت، مرد، بچے سب غسل کرتے تھے اور اچھے سے اچھے کپڑے جو خدا نے ان کو دیے ہوں پہن کر نکلتے تھے۔ رمضان کی عید میں نماز کے لیے جانے سے پہلے تمام خوش حال لوگ ایک مقرر مقدار میں کھانے کا سامان یا اس کی قیمت غریبوں کو دیتے تھے تاکہ کوئی شخص عید کے روز بھوکا نہ رہ جائے۔ بقرعید میں اس کے برعکس نماز کے بعد گھر واپس آ کر قربانی کی جاتی تھی اور اس کا گوشت تقسیم کیا جاتا تھا۔ ذرا دن چڑھنے پر سب لوگ گھروں سے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ حکم تھا کہ عورت، مرد، بچے سب نکلیں تاکہ مسلمانوں کی کثرت اور ان کی شان کا اظہار ہو، خدا سے دعا مانگنے میں بھی سب شریک ہوں اور اس اجتماعی مسرت میں بھی سب کو شرکت کا موقع مل جائے۔ عید کی نماز مسجد کے بجائے بستی کے باہر میدان میں ہوتی تھی تاکہ بڑا مجمع ہوسکے۔ نماز کے لیے جاتے وقت سارے مسلمان یہ تکبیر پڑھتے ہوئے چلتے تھے:

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ ہی سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی سب سے بڑا ہے، ساری تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔

ہر گلی، ہر کوچے، ہر محلّے، ہر بازار اور ہر سڑک پر یہی نعرے لگتے تھے، جن سے ساری بستی گونج اٹھتی تھی۔

عیدگاہ کے میدان میں جب سب لوگ جمع ہو جاتے تو صفیں باندھ کر سارا مجمع رسولِ خدا کی امامت میں پُوری باقاعدگی کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کرتا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دیتے۔ جمعہ کی نماز کے برعکس یہ خطبہ نماز کے بعد ہوتا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ آدمی اپنے لیڈر کی اُس اہم تقریر کے وقت موجود رہیں جس کا موقع سال میں صرف دو ہی مرتبہ آتا ہے۔ پہلے ایک تقریر مردوں کے سامنے ہوتی۔ پھر آپ میدان کے اُس حصے کی طرف تشریف لے جاتے جہاں عورتیں جمع ہوتی تھیں اور وہاں بھی تقریر فرماتے تھے۔ ان تقریروں میں تعلیم و تلقین اور وعظ و نصیحت کے علاوہ اسلامی جماعت کے متعلق اُن تمام اہم مسائل پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی جو اس وقت درپیش ہوتے تھے۔ کوئی فوجی یا سیاسی مہم اگر پیشِ نظر ہوتی تو اس کا انتظام بھی وہیں اسی مجمع میں کر دیا جاتا۔ جماعتی ضروریات کی طرف بھی لوگوں کی توجہ دلائی جاتی اور ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق ان کے پورا کرنے میں حصہ لیتا، حتّٰی کہ روایات میں آیا ہے کہ عورتیں اپنے زیور تک اُتار اُتار کر خدا کے دین اور جماعتِ مسلمین کی خدمت کے لیے پیش کر دیتی تھیں۔

پھر یہ مجمع عیدگاہ سے پلٹتا تھا اور حکم یہ تھا کہ جس راستے سے آئے ہو۔ اس کے خلاف دوسرے راستے سے گھروں کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طرف واپس جاؤ تا کہ بستی کا کوئی حصہ تمھاری چہل پہل سے اور تمھاری تکبیروں کی گونج سے خالی نہ رہ جائے۔

(نشری تقریریں، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص ۹۱-۹۳)

نماز عید کے بعد مصافحہ اور معانقہ

جہاں تک مصافحہ کا تعلق ہے، محض خوشی کے مواقع پر ہی نہیں بلکہ ہمیشہ ہر ملاقات کے موقع پر وہ نہ صرف جائز بلکہ مستحب اور مسنون ہے، ابوداؤد میں براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب دو مسلمان آپس میں مل کر مصافحہ کرتے ہیں اور اللہ کی حمد اور اس سے استغفار کرتے ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرما دیتا ہے۔ ترمذی میں ارشاد مبارک کے الفاظ یہ ہیں: جب دو مسلمان آپس میں ملاقات کے وقت مصافحہ کرتے ہیں اللہ ان کے جدا ہونے سے پہلے ان کی مغفرت فرما دیتا ہے۔

یعنی ان کا ایک دوسرے سے مصافحہ کرنا چوں کہ مسلمان سے مسلمان کی محبت اور باہمی اکرام کا اظہار ہے، اس لیے یہ ان کی مغفرت کا موجب ہوتا ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ حضرت ابوذرؓ سے پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کے وقت لوگوں سے مصافحہ فرمایا کرتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا: کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں حضورؐ سے ملا ہوں اور آپؐ نے مجھ سے مصافحہ نہ کیا ہو۔ اسی بنا پر مصافحہ کے بارے میں فقہا کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مگر معانقہ کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض فقہا، جن میں امام ابو یوسفؒ بھی شامل ہیں، اسے بلا کراہت جائز سمجھتے ہیں، بعض صرف سفر سے واپسی پر یا ایسے ہی کسی غیر معمولی موقع پر اس کو جائز اور عام حالات میں مکروہ قرار دیتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ مطلقاً مکروہ ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ معانقہ کے بارے میں احادیث مختلف ہیں۔ ترمذی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنے کسی بھائی سے ملے تو اس کے آگے جھکے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں اس نے پوچھا: کیا اس سے معانقہ کرے اور اس کا بوسہ لے؟ فرمایا: نہیں۔ اس نے پوچھا: کیا اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔

ترمذی ہی میں ایک اور روایت ہے جس میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب زید بن خالد بن حارثہ مدینہ پہنچے تو انھوں نے آ کر ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی سے اٹھ کر باہر تشریف لے گئے اور انھیں گلے سے لگا کر ان کا منہ چوما۔

ابوداؤد میں حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے مجھے طلب فرمایا تو میں گھر میں موجود نہ تھا۔ بعد میں جب مجھے معلوم ہوا کہ حضورؐ نے مجھے یاد فرمایا ہے تو میں اُن کی خدمت مبارک میں پہنچا۔ آپؐ نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ ان روایات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر مصافحہ پر اکتفا فرمایا کرتے تھے، معانقہ آپؐ کا عام معمول نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی خاص موقع پر آپؐ نے معانقہ بھی فرما لیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ فعل ناجائز بھی نہیں ہے۔

(رسائل و مسائل، پنجم، اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۱۹۸-۲۰۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ہشتم

نماز جنازہ

منافق کی نماز جنازہ پڑھانے کی ممانعت

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ○ (التوبۃ ۹: ۸۴) اور آیندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا کیونکہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے۔

تبوک سے واپسی پر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین مر گیا۔ اس کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہ جو مخلص مسلمانوں میں سے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کفن میں لگانے کے لیے آپؐ کا کُرتا مانگا۔ آپؐ نے کمال فراخ دلی کے ساتھ عطا کر دیا۔ پھر انھوں نے درخواست کی کہ آپؐ ہی اس کی نماز جنازہ پڑھائیں۔ آپؐ اس کے لیے بھی تیار ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے باصرار عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا آپ اس شخص پر نماز جنازہ پڑھیں گے جو یہ اور یہ کر چکا ہے؟ مگر حضورؐ ان کی یہ سب باتیں سن کر مسکراتے رہے اور اپنی اس رحمت کی بنا پر، جو دوست دشمن سب کے لیے عام تھی، آپؐ نے اس بدترین دشمن کے حق میں بھی دعائے مغفرت میں تأمل نہ کیا۔ آخر جب آپؐ نماز پڑھانے کھڑے ہی ہو گئے تو یہ آیت نازل ہوئی اور براہ راست حکم خداوندی سے آپؐ کو روک دیا گیا۔ کیونکہ اب یہ مستقل پالیسی مقرر کی جا چکی تھی کہ مسلمانوں کی جماعت میں منافقین کو کسی طرح پنپنے نہ دیا جائے اور کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے اس گروہ کی ہمت افزائی ہو۔

اسی سے یہ مسئلہ نکلا ہے کہ فساق اور فجار اور مشہور بہ فسق لوگوں کی نماز جنازہ مسلمانوں کے امام اور سربرآوردہ لوگوں کو نہ پڑھانی چاہیے نہ پڑھنی چاہیے۔ ان آیات کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ ہو گیا تھا کہ جب آپ کو کسی جنازے پر تشریف لانے کے لیے کہا جاتا تو آپ پہلے مرنے والے کے متعلق دریافت فرماتے تھے کہ کس قسم کا آدمی تھا، اور اگر معلوم ہوتا کہ برے چلن کا آدمی تھا تو آپؐ اس کے گھر والوں سے کہہ دیتے تھے کہ تمھیں اختیار ہے، جس طرح چاہو اس کو دفن کر دو۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۲۲۰-۲۲۱، التوبہ، حاشیہ ۸۸)

غائبانہ نماز جنازہ

غائبانہ نماز جنازہ کے معاملے میں فقہا کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک جائز ہے اور بعض کے نزدیک جائز نہیں، دونوں طرف دلائل موجود ہیں۔ اس لیے کسی ایک جانب شدت اختیار کرنا صحیح نہیں۔

(مکتوباتِ مودودی، ۱۹۸۳ء، ص ۴۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل نہم

نماز کے بعد سنتیں

سنتوں کی اہمیت

س: مولانا! بعض ممالک میں لوگ بس فرض ہی پڑھتے ہیں اور سنتیں چھوڑ دیتے ہیں۔ کیا ان کا یہ فعل درست ہے؟

ج: قطعی غلط ہے۔ ایسے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سنتیں بعد کے لوگوں نے خود گھڑی ہیں اور شروع شروع میں صرف فرض ہی پڑھے جاتے تھے۔ یہ لوگ جو دلائل دیتے ہیں وہ سرے سے بے بنیاد ہیں۔ جن لوگوں کے ذریعے سے ہم تک قرآن پہنچا ہے، انھی کے ذریعے سے سنت اور احادیث بھی ملی ہیں اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ان لوگوں نے قرآن تو ہم تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا اور سنت اور احادیث غلط پہنچائیں۔ عقل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ قرآن اور سنت پہنچانے والے یا سچے ہیں یا جھوٹے۔ اگر وہ قرآن کے بارے میں سچے ہیں تو لامحالہ سنت کے بارے میں بھی انھوں نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ درست ہے۔ اور اگر انھوں نے سنت کے بارے میں خیانت کی ہے اور اسے ہم تک غلط پہنچایا ہے تو ان کا پہنچایا ہوا قرآن کیسے درست ہو سکتا ہے؟ جب ہم قرآن کو درست مانتے ہیں تو منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی پہنچائی ہوئی سنت اور احادیث کو درست تسلیم کریں۔

(استفسارات، اوّل، ۱۹۹۲ء، ص ۶۳-۶۴)

نماز فجر کی دو سنتیں

س: فجر کی نماز باجماعت کھڑی ہے، اس حال میں سنتیں پڑھیں یا نہ پڑھیں؟

ج: اس مسئلے میں تین مسلک ہیں:

۱- سنتیں اس وقت نہ پڑھی جائیں بلکہ فرضوں کے فوراً بعد میں پڑھ لی جائیں۔

۲- اس وقت نہ پڑھی جائیں اور نہ فوراً بعد، بلکہ سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد۔

۳- اگر سنتیں رہ جائیں تو بعد میں پڑھنا ضروری نہیں۔

اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد سورج نکلنے تک کوئی نماز نہیں۔ جن لوگوں نے اس سے فجر کے فرض مراد لیے، انھوں نے بعد میں سنتیں پڑھنے کی ممانعت کا مسلک اختیار کیا اور جن لوگوں نے فجر کی نماز سے فرض اور سنتیں دونوں مراد لیں انھوں نے فوراً بعد پڑھنے میں مضائقہ نہ سمجھا۔ دونوں مسلک درست ہیں، جس مسلک پر کسی کا اطمینان ہو،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اختیار کر سکتا ہے، جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔

(استفسارات، اوّل، ۱۹۹۲ء، ص ۳۰)

نفل کا مفہوم

انفال جمع ہے نفل کی۔ عربی زبان میں نفل اس چیز کو کہتے ہیں جو واجب سے یا حق سے زائد ہو۔ جب یہ تابع کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وہ رضا کارانہ خدمت ہوتی ہے جو ایک بندہ اپنے آقا کے لیے فرض سے بڑھ کر تطوّعاً بجالاتا ہے اور جب یہ متبوع کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وہ عطیہ وانعام ہوتا ہے جو آقا اپنے بندے کو اس کے حق سے زائد دیتا ہے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۱۲۹، الانفال، حاشیہ ۱)

وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۹) اور رات کو تہجد پڑھو، یہ تمھارے لیے نفل ہے۔

نفل کے معنی ہیں 'فرض سے زائد' اس سے خود بخود یہ اشارہ نکل آیا کہ وہ پانچ نمازیں جن کے اوقات کا نظام پہلی آیت میں بیان کیا گیا تھا، فرض ہیں اور یہ چھٹی نماز فرض سے زائد ہے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۳۷، بنی اسرائیل، حاشیہ ۹۶-۹۷)

باجماعت نوافل

نوافل پڑھے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ بندہ تنہائی میں اپنے رب سے عرض معروض کرے اگر انھیں بھی باجماعت ادا کیا جائے تو ان کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ صرف تراویح کے نوافل باجماعت جائز ہیں۔

(استفسارات، اوّل، ۱۹۹۲ء، ص ۴۹)

نماز تہجد

وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۹) اور رات کو تہجد پڑھو یہ تمھارے لیے نفل ہے۔

تہجد کے معنی ہیں نیند توڑ کر اٹھنے کے۔ پس رات کے وقت تہجد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رات کا ایک حصہ سونے کے بعد پھر اٹھ کر نماز پڑھی جائے۔

☐ **نماز تہجد کی فضیلت:** حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رمضان کے بعد سب سے افضل روزے محرم کے مہینے کے ہیں اور فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل نماز صلوٰۃ اللیل (یعنی تہجد کی نماز) ہے۔ (مسلم)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ نماز جو آدمی خاموشی کے ساتھ رات کی تنہائی میں پڑھتا ہے وہ نوافل جن کا علم خود آدمی کے اور اس کے خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ کے نزدیک فرائض کے بعد سب سے زیادہ افضل اور پسندیدہ ہیں......

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسری کوئی نماز کسی طرح کی فضیلت نہیں رکھتی یا کم تر درجے کی فضیلت رکھتی ہے......

احادیث میں موکدہ سنتوں کی بھی بہت زیادہ فضیلت بیان ہوئی ہے چنانچہ (وہ) بھی بڑی فضیلت رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ تہجد کی نماز بھی اپنی جگہ پر بڑی فضیلت کی حامل ہے دونوں حدیثوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے۔

فرض نمازوں کے بعد تہجد کی فضیلت جس بنا پر ہے وہ یہ ہے کہ فرض نماز تو رکن اسلام ہے اور اسلام کے اس رکن کو قائم کرنے کے لیے فرض نمازوں کا علانیہ اور منظم طریقے سے انجام دینا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اسلام کی عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی......لیکن اس کے برعکس تہجد کی نماز بڑے اخفا کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اور جب تک آدمی کے اندر اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق، بہت زیادہ محبت اور مخلصانہ ایمان موجود نہ ہو اس وقت تک یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی راتوں کو اٹھ کر خاموشی کے ساتھ اس طریقے سے یہ نماز ادا کرے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ یہ چیز غیر معمولی اخلاص وللّٰہیت کے بغیر ممکن نہیں ہے ____ فرض نماز میں توریا کاری کا امکان ہوتا ہے کیونکہ جو شخص باقاعدگی کے ساتھ مسجد میں نماز کے لیے آتا ہے اس کی غرض دنیا کو یہ دکھانا ہو سکتی ہے کہ یہ صاحب بڑے نمازی ہیں لیکن ظاہر بات ہے کہ تہجد میں اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ تہجد تو وہی شخص ادا کرے گا جس کا اللہ کے ساتھ نہایت گہرا اور مخلصانہ تعلق ہو اور وہ لوگوں میں نام پیدا کرنے کا نہیں بلکہ اللہ کو خوش کرنے کا آرزومند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تہجد کو اس قدر فضیلت حاصل ہے۔

حضورؐ کو قیام اللیل کا حکم

يَآأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ إِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝ (المزمل ۷۳: ۱-۶) اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات، یا اس سے کچھ کم کر لو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو۔ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کی لیے زیادہ موزوں ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ حضورؐ کو مخاطب کرنے اور پھر یہ حکم دینے سے کہ آپؐ اٹھیں اور راتوں کو عبادت کے لیے کھڑے رہا کریں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت یا تو آپؐ سو چکے تھے یا سونے کے لیے چادر اوڑھ کر لیٹ گئے تھے۔ اس موقع پر آپؐ کو اے نبی، یا اے رسول کہہ کر خطاب کرنے کی بجائے 'اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' کہہ کر پکارنا ایک لطیف اندازِ خطاب ہے جس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اب وہ دور گزر گیا جب آپؐ آرام سے پاؤں پھیلا کر سوتے تھے۔ اب آپؐ پر ایک کارِ عظیم کا بوجھ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ڈال دیا گیا ہے جس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔

[قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا] کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ رات نماز میں کھڑے رہ کر گزارو اور اس کا کم حصہ سونے میں صرف کرو۔ دوسرا یہ کہ پوری رات نماز میں گزار دینے کا مطالبہ تم سے نہیں ہے بلکہ آرام بھی کرو اور رات کا ایک قلیل حصہ عبادت میں بھی صرف کرو۔ لیکن آگے کے مضمون سے پہلا مطلب ہی زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور اسی کی تائید سورۂ دہر کی آیت ۲۶ سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے: وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا۔ [الدہر ۷۶:۲۶] رات کو اللہ کے آگے سجدہ ریز ہو اور رات کا طویل حصہ اُس کی تسبیح کرتے ہوئے گزارو۔

مقدارِ وقت

[نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا] یہ اُس مقدارِ وقت کی تشریح ہے جسے عبادت میں گزارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس میں آپ کو اختیار دیا گیا کہ خواہ آدھی رات نماز میں صرف کریں یا اس سے کچھ کم کر دیں یا اس سے کچھ زیادہ۔ لیکن اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قابلِ ترجیح آدھی رات ہے، کیونکہ اُسی کو معیار قرار دے کر کمی و بیشی کا اختیار دیا گیا ہے۔

ترتیل کا حکم

[وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا۔ اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو] یعنی تیز تیز رواں دواں نہ پڑھو، بلکہ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرو اور ایک ایک پر ٹھیرو، تاکہ ذہن پوری طرح کلام الٰہی کے مفہوم و مدعا کو سمجھے اور اس کے مضامین سے متاثر ہو۔ کہیں اللہ کی ذات و صفات کا ذکر ہے تو اس کی عظمت و ہیبت دل پر طاری ہو۔ کہیں اس کی رحمت کا بیان ہے تو دل جذباتِ تشکر سے لبریز ہو جائے۔ کہیں اس کے غضب اور اس کے عذاب کا ذکر ہے تو دل پر اس کا خوف طاری ہو۔ کہیں کسی چیز کا حکم ہے یا کسی چیز سے منع کیا گیا ہے تو سمجھا جائے کہ کس چیز کا حکم دیا گیا ہے اور کس چیز سے منع کیا گیا ہے۔ غرض یہ قراءت محض قرآن کے الفاظ کو زبان سے ادا کر دینے کے لیے نہیں بلکہ غور و فکر اور تدبر کے ساتھ ہونی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کا طریقہ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ آپ الفاظ کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر بتایا کہ آپؐ اللہ، رحمان اور رحیم کو مدّ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری)

حضرت اُمّ سلمہؓ سے یہی سوال کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ حضورؐ ایک ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے اور ہر آیت پر ٹھیرتے جاتے تھے، مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ پڑھ کر رک جاتے، پھر الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ پر ٹھہرتے اور اس کے بعد رک کر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۭ کہتے۔ (مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی)

دوسری ایک روایت میں حضرت اُمِ سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ حضورؐ ایک ایک لفظ واضح طور پر پڑھا کرتے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تھے۔(ترمذی، نسائی)

حضرت حذیفہؓ بن یمان کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات کی نماز میں حضورؐ کے ساتھ کھڑا ہو گیا تو آپؐ کی قراءت کا یہ انداز دیکھا کہ جہاں تسبیح کا موقع آتا وہاں تسبیح فرماتے، جہاں دُعا کا موقع آتا وہاں دعا مانگتے، جہاں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا موقع آتا وہاں پناہ مانگتے۔(مسلم، نسائی)

حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رات کی نماز میں جب حضورؐ اس مقام پر پہنچے: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ [المائدۃ ۵:۱۱۸] (اگر تو انھیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو ان کو معاف فرمادے تو تو غالب اور دانا ہے) تو اسی کو دہراتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔(مسند احمد، بخاری)

رات کی نماز کا حکم کیوں دیا گیا؟

[اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ○ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں] مطلب یہ ہے کہ تم کو رات کی نماز کا یہ حکم اس لیے دیا جارہا ہے کہ ایک بھاری کلام ہم تم پر نازل کر رہے ہیں جس کا بار اٹھانے کے لیے تم میں اُس کے تحمل کی طاقت پیدا ہونی ضروری ہے، اور یہ طاقت تمھیں اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ راتوں کو اپنا آرام چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھو اور آدھی رات یا کچھ کم و بیش عبادت میں گزارو۔ قرآن کو بھاری کلام اس بنا پر بھی کہا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنا، اس کی تعلیم کا نمونہ بن کر دکھانا، اس کی دعوت کو لے کر ساری دنیا کے مقابلے میں اٹھنا، اور اس کے مطابق عقائد و افکار، اخلاق و آداب اور تہذیب و تمدن کے پورے نظام میں انقلاب برپا کر دینا ایک ایسا کام ہے جس سے بڑھ کر کسی بھاری کام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور اس بنا پر بھی اس کو بھاری کلام کہا گیا ہے کہ اس کے نزول کا تحمل بڑا دشوار کام تھا۔ حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اِس حالت میں نازل ہوئی کہ آپ اپنا زانو میرے زانو پر رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ میرے زانو پر اس وقت ایسا بوجھ پڑا کہ معلوم ہوتا تھا اب ٹوٹ جائے گا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سخت سردی کے زمانے میں حضورؐ پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے، آپ کی پیشانی سے اس وقت پسینہ ٹپکنے لگتا تھا۔(بخاری، مسلم، مالک، ترمذی، نسائی)

ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی آپ پر اس حالت میں وحی نازل ہوتی کہ آپ اونٹنی پر بیٹھے ہوں تو اونٹنی اپنا سینہ زمین پر ٹکا دیتی تھی اور اس وقت تک حرکت نہ کر سکتی تھی جب تک نزولِ وحی کا سلسلہ ختم نہ ہو جاتا۔(مسند احمد، حاکم، ابن جریر)

رات کے اٹھنے کا مفہوم

اصل میں لفظ نَاشِئَةَ الَّيْلِ استعمال کیا گیا ہے جس کے متعلق مفسرین اور اہل لغت کے چار مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ ہے کہ ناشئہ سے مراد نفس ناشئہ ہے، یعنی وہ شخص جو رات کو اٹھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد رات کے اوقات ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں رات کو اٹھنا۔ اور چوتھا قول یہ ہے کہ اس لفظ کا اطلاق محض رات کو اٹھنے پر نہیں ہوتا بلکہ سو کر اٹھنے پر ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ اور مجاہدؒ نے اسی چوتھے قول کو اختیار کیا ہے۔

نفس پر قابو پانے کے معنی

اصل میں لفظ اَشَدُّ وَطْاً استعمال ہوا ہے جس کے معنی میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں اسے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رات کو عبادت کے لیے اٹھنا اور دیر تک کھڑے رہنا چونکہ طبیعت کے خلاف ہے اور نفس اُس وقت آرام کا مطالبہ کرتا ہے، اس لیے یہ فعل ایک ایسا مجاہدہ ہے جو نفس کے دبانے اور اس پر قابو پانے کی بڑی زبردست تاثیر رکھتا ہے۔ اِس طریقے سے جو شخص اپنے آپ پر قابو پالے اور اپنے جسم و ذہن پر تسلط حاصل کر کے اپنی اس طاقت کو خدا کی راہ میں استعمال کرنے پر قادر ہو جائے وہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ دینِ حق کی دعوت کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے کام آ سکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ دل اور زبان کے درمیان موافقت پیدا کرنے کا بڑا موثر ذریعہ ہے، کیونکہ رات کے ان اوقات میں بندے اور خدا کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا اور اس حالت میں آدمی جو کچھ زبان سے کہتا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی کے ظاہر و باطن میں مطابقت پیدا کرنے کا بڑا کارگر ذریعہ ہے، کیونکہ رات کو تنہائی میں جو شخص اپنا آرام چھوڑ کر عبادت کے لیے اٹھے گا وہ لامحالہ اخلاص ہی کی بنا پر ایسا کرے گا، اس میں ریاکاری کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔

چوتھا مطلب یہ ہے کہ یہ عبادت چونکہ دن کی عبادت کی بہ نسبت آدمی پر زیادہ گراں ہوتی ہے اس لیے اس کا التزام کرنے سے آدمی میں بڑی ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے، وہ خدا کی راہ میں زیادہ مضبوطی کے ساتھ چل سکتا ہے اور اس راہ کی مشکلات کو زیادہ استقامت کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص۱۲۶-۱۲۸، المزمل، حاشیہ ۱-۷)

ذکرِ الٰہی کا حکم

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ (المزمل ۷۳:۸) اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔

دن کے اوقات کی مصروفیتوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ ارشاد کہ 'اپنے رب کے نام کا ذکر کرو' خود بخود یہ مفہوم ظاہر کرتا ہے کہ دنیا میں ہر طرح کے کام کرتے ہوئے بھی اپنے رب کی یاد سے کبھی غافل نہ ہو اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا ذکر کرتے رہو۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص۱۳۹، المزمل، حاشیہ ۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ کیفیت آدمی پر اُس وقت تک طاری نہیں ہوتی جب تک اس کے دل میں خدا کا خیال بس کر نہ رہ گیا ہو۔ انسان کے شعور سے گزر کر اس کے تحت الشعور اور لاشعور تک میں جب یہ خیال گہرا اتر جاتا ہے تب ہی اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کام اور جو بات بھی وہ کرے گا اس میں خدا کا نام ضرور لے گا۔ کھائے گا تو بِسۡمِ اللّٰهِ کہہ کر کھائے گا۔ فارغ ہوگا تو اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ کہے گا۔ سوئے گا تو اللہ کو یاد کر کے اور اٹھے گا تو اللہ ہی کا نام لیتے ہوئے۔ بات چیت میں بار بار اس کی زبان سے بِسۡمِ اللّٰهِ، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ، اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ، مَاشَآءَ اللّٰهُ اور اسی طرح کے دوسرے کلمات نکلتے رہیں گے۔ اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد مانگے گا۔ ہر نعمت ملنے پر اس کا شکر ادا کرے گا۔ ہر آفت آنے پر اس کی رحمت کا طلب گار ہوگا۔ ہر مشکل میں اس سے رجوع کرے گا۔ ہر برائی کا موقع سامنے آنے پر اس سے ڈرے گا۔ ہر قصور سرزد ہو جانے پر اس سے معافی چاہے گا۔ ہر حاجت پیش آنے پر اس سے دعا مانگے گا۔ غرض اٹھتے، بیٹھتے اور دنیا کے سارے کام کرتے ہوئے اس کا وظیفہ خدا ہی کا ذکر ہوگا۔ یہ چیز درحقیقت اسلامی زندگی کی جان ہے۔ دوسری جتنی بھی عبادات ہیں ان کے لیے بہرحال کوئی وقت ہوتا ہے جب وہ ادا کی جاتی ہیں اور انھیں ادا کر چکنے کے بعد آدمی فارغ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ وہ عبادت جو ہر وقت جاری رہتی ہے اور یہی انسان کی زندگی کا مستقل رشتہ اللہ اور اس کی بندگی کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ خود عبادات اور تمام دینی کاموں میں بھی جان اسی چیز سے پڑتی ہے کہ آدمی کا دل محض ان خاص اعمال کے وقت ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت خدا کی طرف راغب اور اس کی زبان دائماً اس کے ذکر سے تر رہے۔ یہ حالت انسان کی ہو تو اس کی زندگی میں عبادات اور دینی کام ٹھیک اُسی طرح پروان چڑھتے اور نشوونما پاتے ہیں جس طرح ایک پودا ٹھیک اپنے مزاج کے مطابق آب و ہوا میں لگا ہوا ہو۔ اس کے برعکس جو زندگی اس دائمی ذکر سے خالی ہو اس میں محض مخصوص اوقات میں یا مخصوص مواقع پر ادا کی جانے والی عبادات اور دینی خدمات کی مثال اُس پودے کی سی ہے جو اپنے مزاج سے مختلف آب و ہوا میں لگایا گیا ہو اور محض باغبان کی خاص خبر گیری کی وجہ سے پل رہا ہو۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں یوں واضح فرماتے ہیں:

عَنۡ مُعَاذِ بۡنِ اَنَسِ الۡجُهَنِيِّ عَنۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَجُلاً سَأَلَهُ: اَيُّ الۡمُجَاهِدِيۡنَ اَعۡظَمُ اَجۡرًا يَارَسُوۡلَ اللّٰهِ؟ قَالَ اَكۡثَرُهُمۡ لِلّٰهِ تَعَالٰى ذِكۡرًا. قَالَ اَيُّ الصَّائِمِيۡنَ اَكۡثَرُ اَجۡرًا؟ قَالَ اَكۡثَرُهُمۡ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ذِكۡرًا. ثُمَّ ذَكَرۡنَا الصَّلٰوةَ وَالزَّكٰوةَ وَالۡحَجَّ وَالصَّدَقَةَ، كُلُّ ذٰلِكَ يَقُوۡلُ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ: اَكۡثَرُهُمۡ لِلّٰهِ ذِكۡرًا. (مسند احمد) معاذ بن انس جُہنی روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ! جہاد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا: جو اُن میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہے۔ اس نے عرض کیا روزہ رکھنے والوں میں سب سے زیادہ اجر کون پائے گا؟ فرمایا: جو ان میں سب سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ پھر اس شخص نے اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے متعلق پوچھا اور حضورؐ نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ 'جو اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہو'۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۹۶-۹۷، الاحزاب، حاشیہ ۶۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نماز تہجد میں تخفیف کا حکم

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ (المزمل ۷۳: ۲۰) اے نبی! تمھارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو، اور تمھارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ یہ عمل کرتا ہے۔ اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے۔

یہ آیت جس کے اندر تہجد کے حکم میں تخفیف کی گئی ہے، اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے مسند احمد، مسلم اور ابو داؤد میں یہ روایت منقول ہے کہ پہلے حکم کے بعد یہ دوسرا حکم ایک سال کے بعد نازل ہوا اور رات کا قیام فرض سے نفل کر دیا گیا۔ دوسری روایت حضرت عائشہؓ ہی سے ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے یہ نقل کی ہے کہ یہ حکم پہلے حکم کے ۸ مہینے بعد آیا تھا، اور ایک تیسری روایت جو ابن ابی حاتم نے انھی سے نقل کی ہے اس میں سولہ مہینے بیان کیے گئے ہیں۔ ابوداؤد، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک سال کی مدت نقل کی ہے۔ لیکن حضرت سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ اس کا نزول دس سال بعد ہوا ہے۔ (ابن جریر و ابن ابی حاتم)

ہمارے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ رکوع کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ وہ مکہ معظمہ میں نازل ہوا ہے اور وہاں بھی اُس کا نزول ابتدائی دور میں ہوا ہے جب کہ حضورؐ کی نبوت کا آغاز ہونے پر زیادہ سے زیادہ چار سال گزرے ہوں گے۔ بخلاف اس کے یہ دوسرا رکوع اپنے مضامین کی صریح شہادت کے مطابق مدینے کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے جب کفار سے جنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم بھی آ چکا تھا۔ اس بنا پر لامحالہ ان دونوں رکوعوں کے زمانۂ نزول میں کم از کم دس سال کا فاصلہ ہی ہونا چاہیے۔

اگرچہ ابتدائی حکم آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش کھڑے رہنے کا تھا، لیکن چونکہ نماز کی محویت میں وقت کا اندازہ نہ رہتا تھا، اور گھڑیاں بھی موجود نہ تھیں کہ اوقات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو سکیں، اس لیے کبھی دو تہائی رات تک عبادت گزر جاتی اور کبھی یہ مدت گھٹ کر ایک تہائی رہ جاتی تھی۔

ابتدائی حکم میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا تھا، اور آپؐ ہی کو قیام لیل کی ہدایت فرمائی گئی تھی، لیکن مسلمانوں میں اُس وقت حضورؐ کے اتباع اور نیکیاں کمانے کا جو غیر معمولی جذبہ پایا جاتا تھا اس کی بنا پر اکثر صحابہ کرامؓ بھی اس نماز کا اہتمام کرتے تھے۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۱۳۲-۱۳۳، المزمل، حواشی ۱۸-۲۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تہجد اور قراءت کا قانونی حکم

عَلِمَ اَنۡ لَّنۡ تُحۡصُوۡهُ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ‌ؕ عَلِمَ اَنۡ سَيَكُوۡنُ مِنۡكُمۡ مَّرۡضٰى ۙ وَاٰخَرُوۡنَ يَضۡرِبُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ يَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ‌ ۙ وَاٰخَرُوۡنَ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ ۖ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنۡهُ ۙ (المزمل ۷۳ : ۲۰) اُسے معلوم ہے کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے، لہٰذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔ اُسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں، اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس جتنا قرآن بآسانی پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو۔

چونکہ نماز میں طول زیادہ تر قرآن کی طویل قراءت ہی سے ہوتا ہے، اس لیے فرمایا کہ تہجد کی نماز میں جتنا قرآن بسہولت پڑھ سکو پڑھ لیا کرو، اس سے نماز کی طوالت میں آپ سے آپ تخفیف ہو جائے گی۔ اس ارشاد کے الفاظ اگر چہ بظاہر حکم کے ہیں، لیکن یہ امر متفق علیہ ہے کہ تہجد فرض نہیں ہے بلکہ نفل ہے۔ حدیث میں بھی صراحت ہے کہ ایک شخص کے پوچھنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ اس نے پوچھا، کیا اس کے سوا بھی کوئی چیز مجھ پر لازم ہے؟ جواب میں ارشاد ہوا "نہیں، اِلّا یہ کہ تم اپنی خوشی سے کچھ پڑھو" (بخاری، مسلم)

اِس آیت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ نماز میں جس طرح رکوع و سجود فرض ہے اسی طرح قرآن مجید کی قراءت بھی فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح دوسرے مقامات پر رکوع یا سجود کے الفاظ استعمال کر کے نماز مراد لی ہے، اسی طرح یہاں قرآن کی قراءت کا ذکر کیا ہے اور مراد اس سے نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔

نفلوں میں فرض!

اس استنباط پر اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب نماز تہجد خود نفل ہے تو اس میں قرآن پڑھنا کیسے فرض ہو سکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نفل نماز بھی جب آدمی پڑھے تو اس میں نماز کی تمام شرائط پوری کرنا اور اس کے تمام ارکان و فرائض ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ نفل نماز کے لیے کپڑوں کی طہارت، جسم کا پاک ہونا، وضو کرنا، اور ستر چھپانا واجب نہیں ہے اور اس میں قیام وقعود اور رکوع و سجود بھی نفل ہی ہیں۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۱۳۳، المزمل، حاشیہ ۲۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دہم

ذکر و دعا

نماز کے بعد دعا

س: مولانا! کیا فرض نماز اور پوری نماز ختم کرنے کے بعد دعا مانگنا ضروری ہے؟ عرب ممالک میں دیکھا گیا ہے کہ نماز کے بعد دعا نہیں مانگی جاتی۔ کیا اس بات کی بھی کوئی سند موجود ہے؟

ج: فرض نماز یا پوری نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگنا لازمی تو نہیں ہے، البتہ جو دعا مانگنا چاہیں، وہ مانگ سکتے ہیں۔ دعا مانگنے کا وقت صرف نماز کے بعد ہی نہیں شب و روز میں آدمی جس وقت چاہے دعا مانگ سکتا ہے۔ سفر میں، حضر میں، گھر کے اندر، گھر کے باہر، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ہر جگہ اور ہر وقت دعا مانگی جا سکتی ہے۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ صرف نماز کے بعد ہی دعا مانگی جائے۔ چونکہ دعا فرائض نماز میں شامل نہیں ہے، اس لیے اکثر عرب محض نماز ادا کر کے اٹھ جاتے ہیں۔

(استفسارات، اول، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۸)

دعا میں ہاتھ اٹھانے کا مسئلہ

س: مقامی حلقوں میں میرے خلاف بعد نماز ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔ یہاں بہت زیادہ آبادی ایک ایسے مسلک کے پیروؤں کی ہے جن کا امتیازی شعار ہی یہ ہے کہ دعا میں ہاتھ نہ اٹھائے جائیں۔ یہ حضرات میرے خلاف اپنے اعتراض میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً [الاعراف ۷:۵۵] کے ارشاد کا تقاضا یہی ہے کہ دعا میں حد درجہ اخفا برتا جائے۔ بخلاف اس کے ہاتھ اٹھانے سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ بدیں وجہ دعا میں ہاتھ اٹھانا قرآن کے منشا کے خلاف ہے۔ نیز احادیث سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کا التزام کیا ہو۔ اب عوام کو دلائل سے تو کچھ مطلب نہیں ہوتا وہ لکیر کی فقیری کا مطالبہ کرتے ہیں چنانچہ مجھے صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ میں ان کی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس حکم کے نافذ کرنے والوں میں بعض حضرات خوب اچھے تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ خیر یہ جاہلیت کے کرشمے ہیں۔ مجھے صرف مذکورۃ الصدر آیت کی روشنی میں اصل مسئلے کو سمجھائیے۔

ج: ان حضرات سے دریافت کیجیے کہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً (اپنے رب کو پکارو عاجزی کے ساتھ اور چپکے چپکے) کا اگر وہی تقاضا ہے جو آپ لوگ سمجھتے ہیں تو یہ نماز کے لیے بلند آواز سے اذان، پھر علانیہ مسجدوں میں لوگوں کا مجتمع ہونا، پھر جماعت سے نماز پڑھنا، پھر نماز میں جہری قراءت کرنا۔ یہ سب کچھ بھی تو پھر اس آیت کے خلاف قرار پائے گا۔ نماز اصل میں تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک دعا ہی ہے۔ اگر دعا کے لیے اخفا ایسا ہی لازمی ہے کہ اظہار کی کوئی شکل اس میں ہونی ہی نہ چاہیے، تو ظاہر ہے کہ نماز باجماعت کی پوری صورت ہی اس کے خلاف ہے۔

پھر جو کچھ یہ حضرات فرماتے ہیں وہ حدیث کے بھی خلاف ہے۔ حدیث میں ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جب دعا مانگی جائے تو ہاتھ اٹھا کر مانگی جائے اور دعا سے فارغ ہو کر چہرے پر ہاتھ مل لیے جائیں۔ ابو داؤد، ترمذی اور بیہقی میں اس مضمون کی متعدد روایات موجود ہیں۔ ایک حدیث میں سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ اِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحْيِ مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اَنْ يَّرُدَّهُمَا صِفْرًا۔ تمھارا رب بڑا با حیا اور کریم ہے۔ بندہ جب اس کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اُسے شرم آتی ہے کہ اُس کو خالی ہاتھ واپس کر دے۔

دوسری روایت میں حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا مانگتے تھے تو ہاتھ اٹھا کر مانگتے تھے اور اس کے بعد اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر لیتے تھے۔ حاکم نے مستدرک میں حضرت علیؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ دعا میں ہاتھ اُٹھانا اللہ کے آگے عاجزی اور مسکنت کے اظہار کے لیے ہے۔[1]

اس میں شک نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ طریقہ رائج نہ تھا جو اب رائج ہے کہ نماز باجماعت کے بعد امام اور مقتدی سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔ اس بنا پر بعض علما نے اس طریقے کو بدعت ٹھیرایا ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اگر اس کو لازم نہ سمجھ لیا جائے، اور اگر نہ کرنے والے کو ملامت نہ کی جائے، اور اگر کبھی کبھی قصداً اس کو ترک بھی کر دیا جائے، تو پھر اسے بدعت قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ خدا سے دعا مانگنا بجائے خود تو کسی حال میں برا فعل نہیں ہو سکتا۔

(رسائل و مسائل، اول، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۱۶۹-۱۷۱)

صبح و شام ذکر الٰہی کا حکم

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِىْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ○ (الاعراف ۷:۲۰۵) اے نبیؐ! اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی، ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

یاد کرنے سے مراد نماز بھی ہے اور دوسری قسم کی یاد بھی خواہ وہ زبان سے ہو یا خیال سے۔ صبح و شام سے مراد یہی دونوں وقت بھی ہیں اور ان اوقات میں اللہ کی یاد سے مقصود نماز ہے اور صبح و شام کا لفظ 'دائما' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس سے مقصود ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہنا ہے۔ یہ آخری نصیحت ہے اور اس کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ تمھارا حال کہیں غافلوں کا سا نہ ہو جائے۔ دنیا میں جو کچھ گمراہی پھیلی ہے اور انسان کے اخلاق و اعمال میں جو فساد بھی رونما ہوا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۳۵۴۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس بات کو بھول جاتا ہے کہ خدا اُس کا رب ہے اور وہ خدا کا بندہ ہے اور دنیا میں اُس کو آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے اور دنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد اسے اپنے رب کو حساب دینا ہوگا۔ پس جو شخص راہِ راست پر چلنا اور دنیا کو اُس پر چلانا چاہتا ہو اُس کو سخت اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ بھول کہیں خود اُس کو لاحق نہ ہو جائے۔ اسی لیے نماز اور ذکر الٰہی اور دائمی توجہ الی اللہ کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۱۱۵، الاعراف ۱۵۴)

ذکر اور اس کے طریقے

س: ذکر الٰہی کے مسنون یا غیر مسنون ہونے کے معاملے میں مجھے بعض ذہنی اشکالات پیش آ رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک اثر بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے اپنے بعض شاگردوں کو دیکھا کہ وہ ذکر کے لیے ایک مقررہ جگہ پر جمع ہوا کرتے ہیں تو غصے میں فرمایا کہ کیا تم اصحاب رسول اللہ سے بھی زیادہ ہدایت یافتہ ہو؟ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ کے زمانے میں تو میں نے اس طرح کا ذکر نہیں دیکھا، پھر تم لوگ کیوں یہ نیا طریقہ نکال رہے ہو؟

دوسری طرف مشکوٰۃ میں متعدد احادیث ایسی ہیں جن سے اجتماعی ذکر کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت انسؓ روای ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کے حلقوں کو جنت کے باغوں سے تشبیہ دی ہے۔[1] حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ نہیں بیٹھتی کوئی قوم ذکر الٰہی کے لیے مگر یہ کہ گھیر لیتے ہیں اسے فرشتے اور چھا جاتی ہے اس پر رحمت۔[2]

اسی طرح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ فرشتے ذکرِ الٰہی کی مجالس کو ڈھونڈتے ہیں اور ان میں بیٹھتے ہیں[3]

ان احادیث کی روشنی میں حلقۂ ذکر کا بدعت ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ واضح کریں کہ ارشادات نبوی کی موجودگی میں حضرت ابن مسعودؓ سے مروی اثر کی کیا صحیح توجیہ ہو سکتی ہے؟

ج: لفظ 'ذکر' کا اطلاق بہت سی چیزوں پر ہوتا ہے۔ اس کے ایک معنی دل میں اللہ کو یاد کرنے یا یاد رکھنے کے ہیں۔

دوسرے معنی اٹھتے بیٹھتے ہر حال میں طرح طرح سے اللہ کا ذکر کرنے کے ہیں۔ مثلاً موقع بموقع الحمدللہ، ماشاءاللہ، ان شاءاللہ، سبحان اللہ وغیرہ کہنا، بات بات میں کسی نہ کسی طریقے سے اللہ کا نام لینا، رات دن کے مختلف احوال میں اللہ سے دعا مانگنا اور اپنی گفتگوؤں میں اللہ کی نعمتوں اور حکمتوں اور اس کی صفات اور اس کے احکام وغیرہ کا ذکر کرنا۔

تیسرے معنی قرآن مجید اور شریعتِ الٰہیہ کی تعلیمات بیان کرنے کے ہیں، خواہ وہ درس کی شکل میں ہوں، یا باہم مذاکرہ کی شکل میں، یا وعظ و تقریر کی شکل میں۔

چوتھے معنی تسبیح و تہلیل و تکبیر کے ہیں۔

۱- تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۵۱۰۔

۲- تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۴۸۸۔

۳- تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۵۰۴-۵۰۵۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جن احادیث میں ذکرِ الٰہی کے حلقوں اور مجلسوں میں حضورؐ کے اظہارِ تحسین کا ذکر آیا ہے، ان سے مراد تیسری قسم کے حلقے ہیں اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے جس چیز پر اظہارِ ناراضی کیا ہے، اس سے مراد چوتھی قسم کا حلقہ ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں حلقے بنا کر تسبیح و تہلیل کا ذکر جہری کرنا رائج نہ تھا، نہ حضورؐ نے اس کی تعلیم دی اور نہ صحابہؓ نے یہ طریقہ کبھی اختیار کیا۔

رہا پہلے دو معنوں میں ذکرِ الٰہی، تو ظاہر ہے کہ وہ سرے سے حلقے بنا کر ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ وہ لازماً انفرادی ذکر ہی ہو سکتا ہے۔

(رسائل و مسائل، پنجم، اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۳۵۰-۳۵۲)

ہمہ وقت تسبیح کرنے کا حکم

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ۭ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝ (الفتح ۴۸: ۸-۹) اے نبیؐ! ہم نے تم کو شہادت دینے والا، بشارت دینے والا اور خبردار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ اے لوگو، تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کا ساتھ دو، اس کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔

بعض مفسرین نے وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ۭ کی ضمیروں کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور تُسَبِّحُوْهُ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم رسول کا ساتھ دو اور اس کی تعظیم و توقیر کرو، اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔

صبح و شام تسبیح کرنے سے مراد صرف صبح و شام ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت تسبیح کرتے رہنا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں فلاں بات کا شہرہ مشرق و مغرب میں پھیلا ہوا ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ صرف مشرق اور مغرب کے لوگ اس بات کو جانتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا میں اس کا چرچا ہو رہا ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۴۸-۴۹، الفتح، حاشیہ ۱۶)

تسبیح و استغفار کے اہم مواقع

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ (النصر ۱۱۰: ۳) اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

حمد سے مراد اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا کرنا بھی ہے اور اُس کا شکر ادا کرنا بھی، اور تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کو ہر لحاظ سے پاک اور منزّہ قرار دینا ہے۔ اس موقع پر یہ ارشاد کہ اپنے رب کی قدرت کا یہ کرشمہ جب تم دیکھ لو تو اُس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس میں حمد کا مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کامیابی کے متعلق تمھارے دل میں کبھی اِس خیال کا کوئی شائبہ تک نہ آئے کہ یہ تمھارے اپنے کمال کا نتیجہ ہے، بلکہ اس کو سراسر اللہ کا فضل و کرم سمجھو، اس پر اُس کا شکر ادا کرو، اور قلب و زبان سے اس امر کا اعتراف کرو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہ اس کامیابی کی ساری تعریف اللہ ہی کو پہنچتی ہے۔ اور تسبیح کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو اس سے پاک اور منزہ قرار دو کہ اُس کے کلمے کا بلند ہونا تمھاری کسی سعی و کوشش کا محتاج یا اُس پر منحصر تھا۔ اس کے برعکس تمھارا دل اس یقین سے لبریز رہے کہ تمھاری سعی و کوشش کی کامیابی اللہ کی تائید ونصرت پر منحصر تھی، وہ اپنے جس بندے سے چاہتا اپنا کام لے سکتا تھا اور یہ اس کا احسان ہے کہ اُس نے یہ خدمت تم سے لی اور تمھارے ہاتھوں اپنے دین کا بول بالا کرایا۔ اس کے علاوہ تسبیح، یعنی سبحان اللہ کہنے میں ایک پہلو تعجب کا بھی ہے۔ جب کوئی محیر العقول واقعہ پیش آتا ہے تو آدمی سبحان اللہ کہتا ہے، اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ ہی کی قدرت سے ایسا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا ہے ورنہ دنیا کی کسی طاقت کے بس میں نہ تھا کہ ایسا کرشمہ اُس سے صادر ہوسکتا۔

اپنے رب سے دعا مانگو کہ جو خدمت اس نے تمھارے سپرد کی تھی اُس کو انجام دینے میں تم سے جو بھول چوک یا کوتاہی بھی ہوئی ہو اُس سے چشم پوشی اور درگزر فرمائے۔ یہ ہے وہ ادب جو اسلام میں بندے کو سکھایا گیا ہے۔ کسی انسان سے اللہ کے دین کی خواہ کیسی ہی بڑی سے بڑی خدمت انجام پائی ہو، اُس کی راہ میں خواہ کتنی ہی قربانیاں اُس نے دی ہوں اور اس کی عبادت و بندگی بجالانے میں خواہ کتنی ہی جانفشانیاں اس نے کی ہوں، اُس کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آنا چاہیے کہ میرے اوپر میرے رب کا جو حق تھا وہ میں نے پورا کا پورا ادا کر دیا ہے، بلکہ اسے ہمیشہ یہی سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نہیں کر سکا، اور اسے اللہ سے یہی دعا مانگنی چاہیے کہ اُس کا حق ادا کرنے میں جو کوتاہی بھی مجھ سے ہوئی ہو اس سے درگزر فرما کر میری حقیر سی خدمت قبول فرمالے۔ یہ ادب جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا گیا جن سے بڑھ کر خدا کی راہ میں سعی و جہد کرنے والے کسی انسان کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا، تو دوسرے کسی کا یہ مقام کہاں ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے عمل کو کوئی بڑا عمل سمجھے اور اس غرّے میں مبتلا ہو کہ اللہ کا جو حق اُس پر تھا وہ اس نے ادا کر دیا ہے۔ اللہ کا حق اس سے بہت بالا و برتر ہے کہ کوئی مخلوق اسے ادا کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے یہ سبق دیتا ہے کہ اپنی کسی عبادت و ریاضت اور کسی خدمت دین کو بڑی چیز نہ سمجھیں، بلکہ اپنی جان راہِ خدا میں کھپا دینے کے بعد بھی یہی سمجھتے رہیں کہ 'حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا' اسی طرح جب کبھی انھیں کوئی فتح نصیب ہو، اُسے اپنے کسی کمال کا نہیں بلکہ اللہ کے فضل ہی کا نتیجہ سمجھیں اور اس پر فخر و غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے رب کے سامنے عاجزی کے ساتھ سر جھکا کر حمد و تسبیح اور توبہ و استغفار کریں۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۵۱۷، النصر، حواشی ۳-۴)

مشرکین کے لیے دعائے مغفرت کی ممانعت

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ○ (التوبۃ ۹: ۱۱۳) نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں ہے کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔

کسی شخص کے لیے معافی کی درخواست لازماً یہ معنی رکھتی ہے کہ اول تو ہم اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھتے ہیں،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسرے یہ کہ ہم اس کے قصور کو قابل معافی سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اس شخص کے معاملے میں تو درست ہیں جو وفاداروں کے زمرے میں شامل ہو اور صرف گناہ گار ہو۔ لیکن جو شخص کھلا ہوا باغی ہو، اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود ہماری اپنی وفاداری مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم محض اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے، یہ چاہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا تعلق خدا کی وفاداری کے مقتضیات کی بہ نسبت زیادہ قیمتی ہے اور یہ کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ نہیں ہے اور یہ کہ جو لاگ ہم نے خدا کے باغیوں کے ساتھ لگا رکھی ہے ہم چاہتے ہیں کہ خدا خود بھی اسی لاگ کو قبول کر لے اور ہمارے رشتہ دار کو تو ضرور بخش دے خواہ اسی جرم کا ارتکاب کرنے والے دوسرے مجرموں کو جہنم میں جھونک دے۔ یہ تمام باتیں غلط ہیں، اخلاص اور وفاداری کے خلاف ہیں اور اُس ایمان کے منافی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بالکل بے لاگ ہو، خدا کا دوست ہمارا دوست ہو اور اس کا دشمن ہمارا دشمن۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ 'مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا نہ کرو' بلکہ یوں فرمایا ہے کہ 'تمھارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ تم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو' یعنی ہمارے منع کرنے سے اگر تم باز رہے تو کچھ بات نہیں، تم میں تو خود وفاداری کی حس اتنی تیز ہونی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا تم کو اپنے لیے نازیبا محسوس ہو۔

یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ جو ہمدردی ممنوع ہے وہ صرف وہ ہمدردی ہے جو دین کے معاملے میں دخل انداز ہوتی ہو۔ رہی انسانی ہمدردی اور دنیوی تعلقات میں صلۂ رحمی، مُواساۃ اور رحمت و شفقت کا برتاؤ، تو یہ ممنوع نہیں ہے بلکہ محمود ہے۔ رشتہ دار خواہ کافر ہو یا مومن، اس کے دنیوی حقوق ضرور ادا کیے جائیں گے۔ مصیبت زدہ انسان کی بہر حال مدد کی جائے گی۔ حاجت مند آدمی کو بہر صورت سہارا دیا جائے گا۔ بیمار اور زخمی کے ساتھ ہمدردی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے گی۔ یتیم کے سر پر یقیناً شفقت کا ہاتھ رکھا جائے گا۔ ایسے معاملات میں ہرگز یہ امتیاز نہ کیا جائے گا کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۲۴۱، التوبہ، حاشیہ ۱۱۱)

حضرت ابراہیمؑ کی اپنے مشرک باپ کے لیے دعا

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ أَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرٰهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ○ (التوبہ ۹: ۱۱۴) ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی وہ تو اُس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا، مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا، حق یہ ہے کہ ابراہیمؑ بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔

اشارہ ہے اُس بات کی طرف جو اپنے مشرک باپ سے تعلقات منقطع کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ نے کہی تھی کہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا۔ (مریم ۱۹:۴۷) آپ کو سلام ہے، میں آپ کے لیے اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کردے، وہ میرے اوپر نہایت مہربان ہے۔

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ (الممتحنہ ۶۰:۴) میں آپ کے لیے معافی ضرور چاہوں گا، اور میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے کہ آپ کو اللہ کی پکڑ سے بچوالوں۔

چنانچہ اسی وعدے کی بنا پر آنجناب نے اپنے باپ کے لیے یہ دعا مانگی تھی کہ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ۝ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ (الشعراء ۲۶:۸۶-۸۹) اور میرے باپ کو معاف کردے، بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے تھا، اور اس دن مجھے رسوا نہ کر جبکہ سب انسان اٹھائے جائیں گے، جبکہ نہ مال کسی کے کچھ کام آئے گا نہ اولاد۔ نجات صرف وہ پائے گا جو اپنے خدا کے حضور بغاوت سے پاک دل لے کر حاضر ہوا ہو۔

یہ دعا اول تو خود انتہائی محتاط لہجے میں تھی۔ مگر اس کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ کی نظر اس طرف گئی کہ میں جس شخص کے لیے دعا کر رہا ہوں وہ تو خدا کا کھلم کھلا باغی تھا، اور اس کے دین سے سخت دشمنی رکھتا تھا، تو وہ اس سے بھی باز آگئے اور ایک سچے وفادار مومن کی طرح انھوں نے باغی کی ہمدردی سے صاف صاف تبرّی کردی، اگرچہ وہ باغی ان کا باپ تھا جس نے کبھی محبت سے ان کو پالا پوسا تھا۔

متن میں اَوَّاہٌ اور حَلِیْمٌ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اَوَّاہٌ کے معنی ہیں بہت آہیں بھرنے والا، زاری کرنے والا، ڈرنے والا، حسرت کرنے والا۔ اور حلیم اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مزاج پر قابو رکھتا ہو، نہ غصے اور دشمنی اور مخالفت میں آپے سے باہر ہو، نہ محبت اور دوستی اور تعلقِ خاطر میں حد اعتدال سے تجاوز کر جائے۔ یہ دونوں لفظ اس مقام پر دوہرے معنی دے رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کی کیونکہ وہ نہایت رقیق القلب آدمی تھے، اس خیال سے کانپ اٹھتے تھے کہ میرا یہ باپ جہنم کا ایندھن بن جائے گا۔ اور حلیم تھے، اُس ظلم و ستم کے باوجود جو ان کے باپ نے اسلام سے ان کو روکنے کے لیے ان پر ڈھایا تھا، ان کی زبان اس کے حق میں دعا ہی کے لیے کھلی۔ پھر انھوں نے یہ دیکھ کر کہ ان کا باپ خدا کا دشمن ہے اس سے تبرّی کی، کیونکہ وہ خدا سے ڈرنے والے انسان تھے اور کسی کی محبت میں حد سے تجاوز کرنے والے نہ تھے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۲۴۲-۲۴۳، التوبہ، حاشیہ ۱۱۲-۱۱۳)

فارغ اوقات میں اللہ کی طرف رغبت

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ (الم نشرح ۹۴:۷-۸) لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشقت میں لگ جاؤ اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فارغ ہونے سے مراد اپنے مشاغل سے فارغ ہونا ہے، خواہ وہ دعوت و تبلیغ کے مشاغل ہوں یا اسلام قبول کرنے والوں کی تعلیم و تربیت کے مشاغل یا اپنے گھر بار اور دنیوی کاموں کے مشاغل۔ حکم کا منشا یہ ہے کہ جب کوئی اور مشغولیت نہ رہے تو اپنا فارغ وقت عبادت کی ریاضت و مشقت میں صرف کرو اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر صرف اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۳۸۲، الم نشرح، حاشیہ ۵)

اللہ کو اچھے ناموں سے یاد کرنے کا حکم

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ (الاعلیٰ ۸۷:۱) اپنے ربِّ برتر کے نام کی تسبیح کرو۔

لفظی ترجمہ ہوگا: 'اپنے ربِّ برتر کے نام کو پاک کرو'۔ اس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور سب ہی مراد ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ کو ان ناموں سے یاد کیا جائے جو اس کے لائق ہیں اور ایسے نام اس کی ذاتِ برتر کے لیے استعمال نہ کیے جائیں جو اپنے معنی اور مفہوم کے لحاظ سے اُس کے لیے موزوں نہیں ہیں، یا جن میں اُس کے لیے نقص یا گستاخی یا شرک کا کوئی پہلو نکلتا ہے، یا جن میں اس کی ذات یا صفات یا افعال کے بارے میں کوئی غلط عقیدہ پایا جاتا ہے۔ اس غرض کے لیے محفوظ ترین صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے وہی نام استعمال کیے جائیں جو اس نے خود قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں، یا جو دوسری زبان میں ان کا صحیح ترجمہ ہوں۔

۲- اللہ کے لیے مخلوقات کے سے نام، یا مخلوقات کے لیے اللہ کے ناموں جیسے نام استعمال نہ کیے جائیں۔ اور اگر کچھ صفاتی نام ایسے ہوں جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص نہیں ہیں بلکہ بندوں کے لیے ان کا استعمال جائز ہے، مثلاً رؤف، رحیم، کریم، سمیع، بصیر وغیرہ، تو ان میں یہ احتیاط ملحوظ رہنی چاہیے کہ بندے کے لیے ان کا استعمال اُس طریقے پر نہ ہو جس طرح اللہ کے لیے ہوتا ہے۔

۳- اللہ کا نام ادب اور احترام کے ساتھ لیا جائے، کسی ایسے طریقے پر یا ایسی حالت میں نہ لیا جائے جو اس کے احترام کے منافی ہو، مثلاً ہنسی مذاق میں یا بیت الخلا میں یا کوئی گناہ کرتے ہوئے اس کا نام لینا، یا ایسے لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کرنا جو اسے سن کر گستاخی پر اُتر آئیں یا ایسی مجلسوں میں اس کا نام لینا جہاں لوگ بے ہودگیوں میں مشغول ہوں اور اس کا ذکر سن کر مذاق میں اڑا دیں یا ایسے موقع پر اس کا نام پاک زبان پر لانا جہاں اندیشہ ہو کہ سننے والا اُسے ناگواری کے ساتھ سنے گا۔ امام مالکؒ کے حالات میں منقول ہے کہ جب کوئی سائل ان سے کچھ مانگتا اور وہ اس وقت اسے کچھ نہ دے سکتے تو عام لوگوں کی طرح اللہ دے گا نہ کہتے بلکہ کسی اور طرح معذرت کر دیتے تھے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ سائل کو جب کچھ نہ دیا جائے اور اس سے معذرت کر دی جائے تو لامحالہ اسے ناگوار ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر میں اللہ کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اسے ناگواری کے ساتھ سنے۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۳۱۰، الاعلیٰ، حاشیہ ۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اپنے رب کو پکارنے کا حکم

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المؤمن ۴۰: ۶۰) تمھارا رب کہتا ہے' مجھے پکارو' میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا۔

یعنی دعائیں قبول کرنے اور نہ کرنے کے جملہ اختیارات میرے پاس ہیں، لہٰذا تم دوسروں سے دعائیں نہ مانگو بلکہ مجھ سے مانگو۔ اس آیت کی روح کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے تین باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں۔

اوّل یہ کہ دعا آدمی صرف اُسی ہستی سے مانگتا ہے جس کو وہ سمیع و بصیر اور فوق الفطری اقتدار (supernatural powers) کا مالک سمجھتا ہے اور دعا مانگنے کا محرک دراصل آدمی کا یہ اندرونی احساس ہوتا ہے کہ عالمِ اسباب کے تحت فطری ذرائع و وسائل اس کی کسی تکلیف کو رفع کرنے یا کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں یا کافی ثابت نہیں ہو رہے ہیں، اس لیے کسی فوق الفطری اقتدار کی مالک ہستی سے رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ اس ہستی کو آدمی بے دیکھے پکارتا ہے۔ ہر وقت، ہر جگہ، ہر حال میں پکارتا ہے۔ خلوت کی تنہائیوں میں پکارتا ہے۔ بآواز بلند ہی نہیں، چپکے چپکے بھی پکارتا ہے، بلکہ دل ہی دل میں اس سے مدد کی التجائیں کرتا ہے۔ یہ سب کچھ لازماً اس عقیدے کی بنا پر ہوتا ہے کہ وہ ہستی اُس کو ہر جگہ ہر حال میں دیکھ رہی ہے۔ اس کے دل کی بات بھی سن رہی ہے اور اس کو ایسی قدرت مطلقہ حاصل ہے کہ اسے پکارنے والا جہاں بھی ہو وہ اس کی مدد کو پہنچ سکتی ہے اور اس کی بگڑی بنا سکتی ہے۔ دعا کی اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ سمجھنا آدمی کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور ہستی کو مدد کے لیے پکارتا ہے وہ درحقیقت قطعی اور خالص اور صریح شرک کا ارتکاب کرتا ہے، کیونکہ وہ اس ہستی کے اندر اُن صفات کا اعتقاد رکھتا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفات ہیں۔ اگر وہ اس کو ان خدائی صفات میں اللہ کا شریک نہ سمجھتا تو اس سے دعا مانگنے کا تصور تک کبھی اس کے ذہن میں نہ آسکتا تھا۔

دوسری بات جو اس سلسلے میں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ کسی ہستی کے متعلق آدمی کا اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ اختیارات کی مالک ہے، اس سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ وہ فی الواقع مالک اختیارات ہو جائے۔ مالک اختیارات ہونا تو ایک امرِ واقعی ہے جو کسی کے سمجھنے یا نہ سمجھنے پر موقوف نہیں ہے۔ جو درحقیقت اختیارات کا مالک ہے وہ بہرحال مالک ہی رہے گا، خواہ آپ اسے مالک سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ اور جو حقیقت میں مالک نہیں ہے، اس کو محض یہ بات کہ آپ نے اسے مالک سمجھ لیا ہے، اختیارات میں ذرہ برابر بھی کوئی حصہ نہ دلوا سکے گی۔ اب یہ بات ایک امرِ واقعی ہے کہ قادرِ مطلق اور مدبرِ کائنات اور سمیع و بصیر ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور وہی کلی طور پر اختیارات کا مالک ہے۔ دوسری کوئی ہستی بھی اس پوری کائنات میں ایسی نہیں ہے جو دعائیں سننے اور ان پر قبولیت یا عدمِ قبولیت کی صورت میں کوئی کارروائی کرنے کے اختیارات رکھتی ہو۔ اس امر واقعی کے خلاف اگر لوگ اپنی جگہ کچھ انبیا اور اولیا اور فرشتوں اور جنوں اور سیاروں اور فرضی دیوتاؤں کو اختیارات میں شریک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سمجھ بیٹھیں تو اس سے حقیقت میں ذرّا برابر بھی کوئی فرق رونما نہ ہوگا۔ مالک، مالک ہی رہے گا اور بے اختیار بندے، بندے ہی رہیں گے

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے دعا مانگنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص درخواست لکھ کر ایوانِ حکومت کی طرف جائے مگر اصل حاکمِ ذی اختیار کو چھوڑ کر وہاں جو دوسرے سائلین اپنی حاجتیں لیے بیٹھے ہوں انھی میں سے کسی ایک کے آگے اپنی درخواست پیش کر دے اور پھر ہاتھ جوڑ جوڑ کر اس سے التجائیں کرتا چلا جائے کہ حضور ہی سب کچھ ہیں، آپ ہی کا یہاں حکم چلتا ہے، میری مراد آپ ہی بر لائیں گے تو بر آئے گی۔ یہ حرکت اول تو بجائے خود سخت حماقت و جہالت ہے، لیکن ایسی حالت میں یہ انتہائی گستاخی بھی بن جاتی ہے جبکہ اصل حاکم ذی اختیارات سامنے موجود ہو اور عین اُس کی موجودگی میں اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کے سامنے درخواستیں اور التجائیں پیش کی جا رہی ہوں۔ پھر یہ جہالت اپنے کمال پر اُس وقت پہنچ جاتی ہے جب وہ شخص جس کے سامنے درخواست پیش کی جا رہی ہو خود بار بار اُس کو سمجھائے کہ میں تو خود تیری ہی طرح کا ایک سائل ہوں، میرے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے، اصل حاکم سامنے موجود ہیں، تو ان کی سرکار میں اپنی درخواست پیش کر، مگر اس کے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود یہ احمق کہتا ہی چلا جائے کہ میرے سرکار تو آپ ہیں، میرا کام آپ ہی بنائیں گے تو بنے گا۔ ان تین باتوں کو ذہن میں رکھ کر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ مجھے پکارو، تمھاری دعاؤں کا جواب دینے والا میں ہوں، انھیں قبول کرنا میرا کام ہے۔

دعا عینِ عبادت اور جانِ عبادت ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ۔ (المومن ۴۰:۶۰) جو لوگ گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

اس آیت میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ دعا اور عبادت کو یہاں مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پہلے فقرے میں جس چیز کو دعا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا، اُسی کو دوسرے فقرے میں عبادت کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ دعا عینِ عبادت ہے اور جانِ عبادت ہے دوسرے یہ کہ اللہ سے دعا نہ مانگنے والوں کے لیے 'گھمنڈ' میں آ کر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سے دعا مانگنا عین تقاضائے بندگی ہے، اور اس سے منہ موڑنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی تکبر میں مبتلا ہے اس لیے اپنے خالق و مالک کے آگے اعترافِ عبودیت کرنے سے کتراتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں آیت کے ان دونوں مضامین کو کھول کر بیان فرما دیا ہے۔ حضرت نعمانؓ بن بشیر کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اِنَّ الدُّعَآءَ هُوَ الْعِبَادَةُ ثُمَّ قَرَأَ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ...... یعنی دعا عینِ عبادت ہے، پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجه، ابن ابی حاتم، ابن جریر)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ 'دعا مغز عبادت ہے' (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: مَنْ لَمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ (ترمذی)[1] جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر غضبناک ہوتا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر وہ عُقدہ بھی حل ہو جاتا ہے جو بہت سے ذہنوں میں اکثر الجھن ڈالتا رہتا ہے۔ لوگ دعا کے معاملے پر اس طرح سے سوچتے ہیں کہ جب تقدیر کی برائی اور بھلائی اللہ کے اختیار میں ہے اور وہ اپنی غالب حکمت و مصلحت کے لحاظ سے جو فیصلہ کر چکا ہے وہی کچھ لازماً رونما ہو کر رہنا ہے تو پھر ہمارے دعا مانگنے کا حاصل کیا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو آدمی کے دل سے دعا کی ساری اہمیت نکال دیتی ہے، اور اس باطل خیال میں مبتلا رہتے ہوئے اگر آدمی دعا مانگے بھی تو اس کی دعا میں کوئی روح باقی نہیں رہتی۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت اس غلط فہمی کو دو طریقوں سے رفع کرتی ہے۔ اولاً اللہ تعالیٰ بالفاظ صریح فرما رہا ہے کہ 'مجھے پکارو، میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا' اس سے معلوم ہوا کہ قضا اور تقدیر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس نے ہماری طرح معاذ اللہ، خود اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بھی باندھ دیے ہوں اور دعا قبول کرنے کے اختیارات اُس سے سلب ہو گئے ہوں۔ بندے تو بلاشبہہ اللہ کے فیصلوں کو ٹالنے یا بدل دینے کی طاقت نہیں رکھتے، مگر اللہ تعالیٰ خود یہ طاقت ضرور رکھتا ہے کہ کسی بندے کی دعائیں اور التجائیں سن کر اپنا فیصلہ بدل دے۔ دوسری بات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دعا خواہ قبول ہو یا نہ ہو، بہر حال ایک فائدے اور بہت بڑے فائدے سے وہ کسی صورت میں بھی خالی نہیں ہوتی، اور وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کر کے اور اس سے دعا مانگ کر اس کی آقائی و بالا دستی کا اعتراف اور اپنی بندگی و عاجزی کا اقرار کرتا ہے۔ یہ اظہارِ عبودیت بجائے خود عبادت، بلکہ جانِ عبادت ہے جس کے اجر سے بندہ کسی حال میں بھی محروم نہ رہے گا قطع نظر اس سے کہ وہ خاص چیز اُس کو عطا کی جائے یا نہ کی جائے جس کے لیے اس نے دعا کی تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ان دونوں مضامین کی بھی پوری وضاحت ہمیں مل جاتی ہے پہلے مضمون پر حسب ذیل احادیث روشنی ڈالتی ہیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لَا يَرُدُّ الْقَضَآءَ اِلَّا الدُّعَآءُ۔ (ترمذی)[1] قضا کو کوئی چیز نہیں ٹال سکتی مگر دعا۔

یعنی اللہ کے فیصلے کو بدل دینے کی طاقت کسی میں نہیں ہے 'مگر اللہ خود اپنا فیصلہ بدل سکتا ہے، اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب بندہ اس سے دعا مانگتا ہے۔

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا مِنْ اَحَدٍ يَدْعُوْ بِدُعَآءٍ اِلَّا اٰتَاهُ اللّٰهُ مَا سَأَلَ اَوْ كَفَّ

ا- آئندہ سطور میں مذکور تمام احادیث کی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۴۲۳-۴۴۷۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهٗ مَا لَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْقَطِيْعَةِ رَحِمٍ۔ (ترمذی) آدمی جب کبھی اللہ سے دعا مانگتا ہے اللہ اسے یا تو وہی چیز دیتا ہے جس کی اس نے دعا کی تھی یا اُسی درجے کی کوئی بلا اس پر آنے سے روک دیتا ہے' بشرطیکہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔

اسی سے ملتا جلتا مضمون ایک دوسری حدیث میں ہے جو حضرت ابوسعیدؓ خدری نے حضورؐ سے روایت کی ہے۔ اُس میں آپ کا ارشاد یہ ہے: مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يَدْعُوْ بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيْهَا اِثْمٌ وَلَا قَطِيْعَةُ رَحِمٍ اِلَّا اَعْطَاهُ اللّٰهُ اِحْدٰى ثَلَاثٍ، اِمَّا اَنْ يُّعَجِّلَ لَهٗ وَاِمَّا اَنْ يَّدَّخِرَهَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ، وَاِمَّا اَنْ يَّصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا۔ (مسند احمد) ایک مسلمان جب بھی کوئی دعا مانگتا ہے، بشرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں قبول فرماتا ہے۔ یا تو اس کی وہ دعا اسی دنیا میں قبول کر لی جاتی ہے۔ یا اسے آخرت میں اجر دینے کے لیے محفوظ رکھ لیا جاتا ہے۔ یا اُسی درجے کی کسی آفت کو اس پر آنے سے روک دیا جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اِذَا دَعَا اَحَدُكُمْ فَلَا يَقُلْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِىْ اِنْ شِئْتَ، اِرْحَمْنِىْ اِنْ شِئْتَ، اُرْزُقْنِىْ اِنْ شِئْتَ، وَلْيَعْزِمْ مَسْئَلَتَهٗ۔ (بخاری) جب تم میں سے کوئی شخص دعا مانگے تو یوں نہ کہے کہ خدایا مجھے بخش دے اگر تو چاہے، مجھ پر رحم کر اگر تو چاہے، مجھے رزق دے اگر تو چاہے، بلکہ اسے قطعیت کے ساتھ کہنا چاہیے کہ خدایا میری فلاں حاجت پوری کر۔

دوسری روایت حضرت ابوہریرہؓ ہی سے ان الفاظ میں آئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اُدْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ۔ (ترمذی) اللہ سے دعا مانگو اس یقین کے ساتھ کہ وہ قبول فرمائے گا۔

ایک اور روایت میں حضرت ابوہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَالَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ مَالَمْ يَسْتَعْجِلْ، قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْاِسْتِعْجَالُ؟ قَالَ يَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ اَرَ يُسْتَجَابُ لِىْ فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذٰلِكَ وَيَدَعُ الدُّعَآءَ (مسلم) بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے اور جلد بازی سے کام نہ لے۔ عرض کیا گیا کہ جلد بازی کیا ہے یارسول اللہ؟ فرمایا جلد بازی یہ ہے کہ آدمی کہے میں نے بہت دعا کی، بہت دعا کی، مگر میں دیکھتا ہوں کہ میری دعا قبول ہی نہیں ہوتی، اور یہ کہہ کر آدمی تھک جائے اور دعا مانگنی چھوڑ دے۔

دوسرے مضمون کو حسب ذیل احادیث واضح کرتی ہیں

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لَيْسَ شَيْءٌ اَكْرَمَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الدُّعَآءِ۔ (ترمذی، ابن ماجہ) اللہ کی نگاہ میں دعا سے بڑھ کر کوئی چیز باوقعت نہیں ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: سَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُّسْأَلَ۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(ترمذی) اللہ سے اس کا فضل مانگو کیونکہ اللہ اسے پسند فرماتا ہے کہ اُس سے مانگا جائے۔

حضرت ابن عمرؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اِنَّ الدُّعَآءَ یَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ یَنْزِلْ فَعَلَیْکُمْ عِبَادَ اللّٰہِ بِالدُّعَآءِ (ترمذی، مسند احمد) دعا بہرحال نافع ہے اُن بلاؤں کے معاملے میں بھی جو نازل ہو چکی ہیں اور ان کے معاملے میں بھی جو نازل نہیں ہوئیں۔ پس اے بندگانِ خدا! تم ضرور دعا مانگا کرو۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: یَسْأَلُ اَحَدُکُمْ رَبَّہٗ حَاجَتَہٗ کُلَّہٗ حَتّٰی یَسْأَلَ شِسْعَ نَعْلِہٖ اِذَا انْقَطَعَ (ترمذی) تم میں سے ہر شخص کو اپنی ہر حاجت خدا سے مانگنی چاہیے، حتّٰی کہ اگر اس کی جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا سے دعا کرے۔

یعنی جو معاملات بظاہر آدمی کو اپنے اختیار میں محسوس ہوتے ہیں اُن میں بھی تدبیر کرنے سے پہلے اسے خدا سے مدد مانگنی چاہیے، اس لیے کہ کسی معاملے میں بھی ہماری کوئی تدبیر خدا کی توفیق و تائید کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی، اور تدبیر سے پہلے دعا کے معنی یہ ہیں کہ بندہ ہر وقت اپنی عاجزی اور خدا کی بالادستی کا اعتراف کر رہا ہے۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۴۱۸-۴۲۲، المومن، حاشیہ ۸۳-۸۴)

سوار ہوتے وقت دعا کا حکم

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّھَا وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْکِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْکَبُوْنَ ۝ لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُھُوْرِہٖ ثُمَّ تَذْکُرُوْا نِعْمَۃَ رَبِّکُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْہِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝ (الزخرف ۴۳: ۱۲-۱۴) وہی جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کیے، اور جس نے تمھارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب اُن پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انھیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔

زمین کی تمام مخلوقات میں سے تنہا انسان کو کشتیاں اور جہاز چلانے اور سواری کے لیے جانور استعمال کرنے کی مقدرت اللہ تعالیٰ نے اس لیے تو نہیں دی تھی کہ وہ غلے کی بوریوں کی طرح ان پر لد جائے اور کبھی نہ سوچے کہ آخر وہ کون ہے جس نے ہمارے لیے بحرِ ذخّار[1] میں کشتیاں دوڑانے کے امکانات پیدا کیے، اور جس نے جانوروں کی بے شمار اقسام میں سے بعض کو اس طرح پیدا کیا کہ وہ ہم سے بدرجہا زیادہ طاقتور ہونے کے باوجود ہمارے تابع فرمان بن جاتے ہیں اور ہم ان پر سوار ہو کر جدھر چاہتے ہیں انھیں لیے پھرتے ہیں۔ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانا اور نعمت دینے والے کو فراموش کر دینا دل کے مردہ اور عقل و ضمیر کے بے حس ہونے کی علامت ہے۔ ایک زندہ اور حساس قلب و ضمیر رکھنے والا انسان تو ان سواریوں پر جب بیٹھے گا تو اس کا دل احساسِ نعمت اور شکرِ نعمت کے جذبے سے لبریز ہو جائے گا۔ وہ پکار اٹھے گا کہ پاک ہے وہ ذات جس نے میرے لیے ان چیزوں

۱- تفہیم القرآن میں جہاں سے اخذ کیا گیا ہے، یہ لفظ 'ذخار' ذال کے ساتھ درج ہے، مگر درست 'زخّار' زاء کے ساتھ ہے۔ (مرتبین)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کو مسخر کیا۔ پاک ہے اس سے کہ اُس کی ذات وصفات اور اختیارات میں کوئی اس کا شریک ہو۔ پاک ہے اس کمزوری سے کہ اپنی خدائی کا کام خود چلانے سے وہ عاجز ہو اور دوسرے مددگار خداؤں کی اسے حاجت پیش آئے۔ پاک ہے اس سے کہ میں ان نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے میں اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کروں۔

اس آیت کے منشا کی بہترین عملی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اذکار ہیں جو سواریوں پر بیٹھتے وقت آپؐ کی زبان مبارک پر جاری ہوتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ جب سفر پر جانے کے لیے سواری پر بیٹھتے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہتے، پھر یہ آیت پڑھتے، اور اس کے بعد یہ دعا مانگا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُکَ فِیْ سَفَرِیْ ھٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰی، وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰی، اَللّٰھُمَّ ھَوِّنْ لَنَا السَّفَرَ وَاطْوِلَنَا الْبَعِیْدَ، اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ، وَالْخَلِیْفَۃُ فِی الْاَھْلِ، اَللّٰھُمَّ اَصْحِبْنَا فِیْ سَفَرِنَا وَاخْلُفْنَا فِیْٓ اَھْلِنَا۔ (مسند احمد، مسلم، ابوداؤد، نسائی، دارمی، ترمذی)[1] خدایا میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے اس سفر میں مجھے نیکی اور تقویٰ اور ایسے عمل کی توفیق دے جو تجھے پسند ہو۔ خدایا ہمارے لیے سفر کو آسان کردے اور لمبی مسافت کو لپیٹ دے، خدایا تو ہی سفر کا ساتھی اور ہمارے پیچھے ہمارے اہل وعیال کا نگہبان ہے، خدایا ہمارے سفر میں ہمارے ساتھ اور پیچھے ہمارے گھر والوں کی خبر گیری فرما۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ کہہ کر رکاب میں پاؤں رکھا، پھر سوار ہونے کے بعد فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا.......... پھر تین مرتبہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور تین دفعہ اللہ اکبر کہا، پھر فرمایا: سُبْحَانَکَ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ، قَدْظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ۔ اس کے بعد آپ ہنس دیے۔ میں نے پوچھا: یارسول اللہ! آپ ہنسے کس بات پر؟ فرمایا: بندہ جب ربّ اغْفِرْلِی کہتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس کی یہ بات بڑی پسند آتی ہے، وہ فرماتا ہے کہ میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا مغفرت کرنے والا کوئی اور نہیں ہے۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی وغیرہ)

ایک صاحب ابومجلز بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں جانور پر سوار ہوا اور میں نے آیت سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا پڑھی۔ حضرت حسنؓ نے فرمایا: کیا اس طرح کرنے کا تمھیں حکم دیا گیا ہے؟ میں نے عرض کیا: پھر کیا کہوں؟ فرمایا: یوں کہو کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمیں اسلام کی ہدایت دی، شکر ہے اُس کا کہ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر ہم پر احسان فرمایا، شکر ہے اس کا کہ اس نے ہمیں اُس بہترین امت میں داخل کیا جو خلقِ خدا کے لیے نکالی گئی ہے، اس کے بعد یہ آیت پڑھو۔ (ابن جریر، احکام القرآن للجصاص)

ہر سفر پر جاتے ہوئے یاد کرلو کہ آگے ایک بڑا اور آخری سفر بھی درپیش ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ہر سواری کو استعمال کرنے میں یہ امکان بھی ہوتا ہے کہ شاید کوئی حادثہ اسی سفر کو آدمی کا آخری سفر بنادے، اس لیے بہتر ہے کہ ہر مرتبہ وہ اپنے رب کی طرف واپسی کو یاد کرکے چلے تا کہ اگر مرنا ہی ہے تو بے خبر نہ مرے۔

۱۔ تخریج کے لیے: تفہیم الاحادیث، ج ۷، ص ۵۳۵۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس تعلیم کے اخلاقی نتائج

یہاں تھوڑی دیر ٹھیر کر ذرا اس تعلیم کے اخلاقی نتائج کا بھی اندازہ کر لیجیے۔ کیا آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ جو شخص کسی سواری پر بیٹھتے وقت سمجھ بوجھ کر پورے شعور کے ساتھ اس طرح اللہ کو اور اس کے حضور اپنی واپسی اور جواب دہی کو یاد کر کے چلا ہو وہ آگے جا کر کسی فسق و فجور یا کسی ظلم و ستم کا مرتکب ہو گا؟ کیا کسی فاحشہ سے ملاقات کے لیے، یا کسی کلب میں شراب خوری اور قمار بازی کے لیے جاتے وقت بھی کوئی شخص یہ کلمات زبان سے نکال سکتا ہے یا ان کا خیال کر سکتا ہے؟ کیا کوئی حاکم، یا سرکاری افسر، یا تاجر، جو یہ کچھ سوچ کر اور اپنے منہ سے کہہ کر گھر سے چلا ہو، اپنی جائے عمل پر پہنچ کر لوگوں کے حق مار سکتا ہے؟ کیا کوئی سپاہی بے گناہوں کا خون بہانے اور کمزوروں کی آزادی پر ڈاکہ مارنے کے لیے جاتے وقت بھی اپنے ہوائی جہاز یا ٹینک پر قدم رکھتے ہوئے یہ الفاظ زبان پر لا سکتا ہے؟ اگر نہیں، تو یہی ایک چیز ہر اُس نقل و حرکت پر بند باندھ دینے کے لیے کافی ہے جو معصیت کے لیے ہو۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۵۲۸-۵۳۰، الزخرف، حاشیہ ۱۳-۱۴)

حمد و تسبیح سے مراد

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝ (ق ۵۰: ۳۹-۴۰) پس اے نبیؐ! جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو، طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے پہلے، اور رات کے وقت پھر اُس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔

رب کی حمد اور اس کی تسبیح سے مراد یہاں نماز ہے اور جس مقام پر بھی قرآن میں حمد و تسبیح کو خاص اوقات کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے وہاں اس سے مراد نماز ہی ہوتی ہے۔ 'طلوع آفتاب سے پہلے' فجر کی نماز ہے۔ 'غروب آفتاب سے پہلے' دو نمازیں ہیں، ایک ظہر، دوسری عصر۔ 'رات کے وقت' مغرب اور عشا کی نمازیں ہیں اور تیسری تہجد بھی رات کی تسبیح میں شامل ہے[1]۔ رہی وہ تسبیح جو 'سجود سے فارغ ہونے کے بعد' کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، تو اس سے مراد ذکر بعد الصلوٰۃ بھی ہو سکتا ہے اور فرض کے بعد نفل ادا کرنا بھی۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ بن علی، حضرت ابو ہریرہؓ، ابن عباسؓ، شعبیؒ، مجاہدؒ، عکرمہؒ، حسن بصریؒ، قتادہؒ، ابراہیم نخعیؒ اور اوزاعیؒ اس سے مراد نماز مغرب کے بعد کی دو رکعتیں لیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ عمرو بن العاصؓ اور ایک روایت کے بموجب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی یہ خیال ہے کہ اس سے مراد ذکر بعد الصلوٰۃ ہے۔ اور ابنِ زید کہتے ہیں کہ اس ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد بھی نوافل ادا کیے جائیں۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ غریب مہاجرین نے حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہؐ! مال دار لوگ تو بڑے درجے لوٹ لے گئے۔ حضورؐ نے فرمایا: 'کیا ہوا؟' انھوں نے عرض کیا: وہ بھی نمازیں پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں

۱- مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، دوم، بنی اسرائیل، حواشی ۹۱-۹۷، سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۱۱۱، الروم، حواشی ۲۳-۲۴۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور روزے رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں، مگر وہ صدقہ کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے، وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمھیں ایسی چیز بتاؤں جسے اگر تم کرو تو تم دوسرے لوگوں سے بازی لے جاؤ گے بجز اُن کے جو وہی عمل کریں جو تم کرو گے؟ وہ عمل یہ ہے کہ تم ہر نماز کے بعد ۳۳، ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کہا کرو۔ کچھ مدت کے بعد اُن لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارے مال دار بھائیوں نے بھی یہ بات سن لی ہے اور وہ بھی یہی عمل کرنے لگے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ[1] [المائدۃ ۵:۵۴] ایک روایت میں ان کلمات کی تعداد ۳۳، ۳۳ کے بجائے دس دس بھی منقول ہوئی ہے۔

حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ہدایت فرمائی تھی کہ ہم ہر نماز کے بعد ۳۳، ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ اور الحمد للہ کہا کریں اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہیں۔ بعد میں ایک انصاری نے عرض کیا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ کوئی کہتا ہے کہ تم ۲۵، ۲۵ مرتبہ یہ تین کلمے کہو اور پھر ۲۵ مرتبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ حضورؐ نے فرمایا: اچھا اسی طرح کرو۔[1] (احمد، نسائی، دارمی)

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر جب پلٹتے تھے تو میں نے آپؐ کو یہ الفاظ کہتے سنا ہے: سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۚ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۚ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ [الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۸۰-۱۸۲]۔ (احکام القرآن للجصاص)[2]

اس کے علاوہ بھی ذکر بعد الصلوٰۃ کی متعدد صورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہیں۔ جو حضرات قرآن مجید کی اس ہدایت پر عمل کرنا چاہیں وہ مشکوٰۃ، باب الذکر بعد الصلوٰۃ میں سے کوئی ذکر جو اُن کے دل کو سب سے زیادہ لگے، چھانٹ کر یاد کر لیں اور اس کا التزام کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے بتائے ہوئے ذکر سے بہتر اور کون سا ذکر ہو سکتا ہے۔ مگر یہ خیال رکھیں کہ ذکر سے اصل مقصود چند مخصوص الفاظ کو زبان سے گزار دینا نہیں ہے بلکہ ان کے معانی کو ذہن میں تازہ اور مستحکم کرنا ہے جو ان الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے جو ذکر بھی کیا جائے اس کے معنی اچھی طرح سمجھ لینے چاہییں اور پھر معنی کے استحضار کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۱۲۵-۱۲۶، ق، حاشیہ ۵۱)

قبولیتِ دعا کے لیے قبروں پر چلہ کشی

س: مشائخ وصوفیا کے بعض تذکروں میں ملتا ہے کہ فلاں صاحب نے فلاں بزرگ کی قبر پر مراقبہ اور چلّہ کیا اور یہ بھی کہ فلاں بزرگ کا یہ قول اور تجربہ ہے کہ فلاں قبر پر اللہ سے دعا مانگنا قبولیت کا سبب ہوتا ہے۔ اس کی دین میں کیا اصل ہے؟

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، سوم، اگست ۲۰۰۴ء، ص ۶۸-۶۹۔
۲- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، سوم، اگست ۲۰۰۴ء، ص ۶۸-۶۹۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ج: اوّل تو دین میں اصل چیز کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ہے، نہ کہ بزرگوں کے اقوال وافعال۔ دوسرے خود بزرگوں کے اقوال وافعال کے متعلق جو مواد تذکروں میں ملتا ہے وہ بھی ایسا مستند نہیں ہے کہ اس کی بنا پر یہ اطمینان کیا جاسکے کہ واقعی ان بزرگوں کے اقوال وافعال وہی تھے جو ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ ایسی چیزوں کو ماخذ مان کر ان کی پیروی کرنا میرے نزدیک سخت بے احتیاطی ہے۔ محفوظ طریقہ وہی ہے جو ہمیں قرآن وحدیث سے ملتا ہے، جس کے دورِ صحابہ اور دورِ تابعین میں رائج ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور جس کو امت کے محدثین اور فقہا نے منقح اور مدون کر کے رکھ دیا ہے۔ لہٰذا جو شخص دین کی یقینی اور قابلِ اعتماد راہ پر چلنا چاہتا ہو، اس کو اس محفوظ طریقے سے تجاوز کا کبھی خیال بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ باہر جو کچھ ہے وہ کم از کم خطرے سے تو خالی نہیں ہے۔

اب اسی معاملے کو لیجیے جس کے متعلق آپ سوال کر رہے ہیں۔ جن تذکروں میں یہ ذکر ملتا ہے کہ فلاں فلاں بزرگوں نے یہ کام کیا تھا ان کی روایات کا حدیث کی کسی ضعیف سے ضعیف روایت کے مقابلہ میں بھی آخر کیا پایہ ہے؟ کسی سند کی بنا پر یہ اعتماد یا گمان غالب ہوسکتا ہے کہ ان بزرگوں نے واقعی ایسا کیا تھا؟ فرض کیجیے کہ حقیقت میں انھوں نے ایسا نہ کیا ہو۔ اس صورت میں اُن بے سند روایات کی پیروی کر کے ہم آخرت میں کس چیز کا سہارا لے کر جواب دہی کرسکیں گے؟ اگر عاقبت کی ہمیں فکر ہو اور ہم خود اپنی خیر چاہتے ہوں تو یہ کام کرنے سے پہلے ہم کو دین کے محفوظ طریقے کی طرف رجوع کر کے اطمینان کر لینا چاہیے کہ وہاں کسبِ فیض یا قبولیتِ دعا کے لیے یہ راستہ بتایا گیا ہے یا نہیں؟ صحابہ نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک پر کبھی چلہ کھینچا یا مراقبہ کیا؟ تابعین نے کبھی کسی صحابی کی قبر پر یہ کام کیا؟ فقہا و محدثین میں سے کسی نے اس کو مشروع طریقہ بتایا؟ سب سے بڑھ کر خود اللہ میاں نے قرآن میں کہیں یہ تعلیم دی کہ قبروں پر حصولِ فیض یا استجابتِ دعا کے لیے جاؤ؟ یا اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریق کار کی طرف کوئی اشارہ کیا؟ ان ذرائع سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہو تو اطمینان کے ساتھ یہ کام کیا جاسکتا ہے ورنہ یہ بالکل غلط نہ سہی، مشتبہ تو ماننا ہی پڑے گا۔ ایسا مشتبہ کام کر کے کیا میں یہ خطرہ مول نہ لوں گا کہ شاید آخرت میں وہ غلط ثابت ہو اور میں اللہ تعالیٰ کو اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکوں کہ جب دین کی حقیقی راہ معلوم کرنے کے قابلِ اعتماد ذرائع موجود تھے تو میں مشتبہ ذرائع کی طرف کیوں گیا؟

(رسائل و مسائل، سوم، جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۶۲-۳۶۴)

اللہ قریب ہے

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ○ (البقرۃ ۲:۱۸۶) اور اے نبیؐ! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو انھیں بتا دو کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ یہ بات تم انھیں سنا دو، شاید کہ وہ راہِ راست پالیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اگر چہ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے اور نہ اپنے حواس سے مجھ کو محسوس کر سکتے ہو، لیکن یہ خیال نہ کرو کہ میں تم سے دور ہوں۔ نہیں، میں اپنے ہر بندے سے اتنا قریب ہوں کہ جب وہ چاہے، مجھ سے عرض معروض کر سکتا ہے، حتیٰ کہ دل ہی دل میں وہ جو کچھ مجھ سے گزارش کرتا ہے میں اُسے بھی سن لیتا ہوں اور صرف سنتا ہی نہیں، فیصلہ بھی صادر کرتا ہوں۔ جن بے حقیقت اور بے اختیار ہستیوں کو تم نے اپنی نادانی سے الٰہ اور رب قرار دے رکھا ہے، ان کے پاس تو تمھیں دوڑ دوڑ کر جانا پڑتا ہے اور پھر بھی نہ وہ تمھاری شنوائی کر سکتے ہیں اور نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ تمھاری درخواستوں پر کوئی فیصلہ صادر کر سکیں۔ مگر میں یہ کائناتِ بے پایاں کا فرماں روائے مطلق، تمام اختیارات اور تمام طاقتوں کا مالک، تم سے اتنا قریب ہوں کہ تم خود بغیر کسی واسطے، وسیلے اور سفارش کے براہ راست ہر وقت اور ہر جگہ مجھ تک اپنی عرضیاں پہنچا سکتے ہو۔ لہٰذا تم اپنی اس نادانی کو چھوڑ دو کہ ایک بے اختیار بناوٹی خدا کے در پر مارے مارے پھرتے ہو۔ میں جو دعوت تمھیں دے رہا ہوں، اس پر لبیک کہہ کر میرا دامن پکڑ لو، میری طرف رجوع کرو، مجھ پر بھروسہ کرو اور میری بندگی و اطاعت میں آجاؤ۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۴۴، البقرہ، حاشیہ ۱۸۸)

استغفار کا حکم اور اس کی برکتیں

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ (نوح ۷۱: ۱۰-۱۲) میں نے کہا: اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کر دے گا۔

یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ خدا سے بغاوت کی روش صرف آخرت ہی میں نہیں، دنیا میں بھی انسان کی زندگی کو تنگ کر دیتی ہے اور اس کے برعکس اگر کوئی قوم نافرمانی کے بجائے ایمان و تقویٰ اور احکام الٰہی کی اطاعت کا طریقہ اختیار کرلے تو یہ آخرت ہی میں نافع نہیں ہے بلکہ دنیا میں بھی اُس پر نعمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے: اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ (۲۰: ۱۲۴)

سورہ مائدہ میں فرمایا گیا ہے: اور اگر ان اہل کتاب نے توراۃ اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں تو ان کے لیے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا۔ (۵: ۶۶)

سورۂ اعراف میں فرمایا: اور اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ (۷: ۹۶)

سورۂ ہود میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا: اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا اور تمھاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ (۱۱: ۵۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے بھی اسی سورۂ ہود میں اہل مکہ کو مخاطب کر کے یہ بات فرمائی گئی: اور یہ کہ اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مقرر وقت تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا۔ (۱۱:۳)

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے لوگوں سے فرمایا کہ ایک کلمہ ہے جس کے تم قائل ہو جاؤ تو عرب وعجم کے فرمانروا ہو جاؤ گے۔[۱]

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۱۰۰-۱۰۱، نوح، حاشیہ ۱۲)

[سورۂ ہود آیت ۳ میں ارشاد ہے:] وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ (ہود ۱۱:۳) اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔

دنیا میں تمھارے ٹھیرنے کے لیے جو وقت مقرر ہے اس وقت تک وہ تم کو بری طرح نہیں بلکہ اچھی طرح رکھے گا۔ اس کی نعمتیں تم پر برسیں گی۔ اس کی برکتوں سے سرفراز ہو گے۔ خوش حال و فارغ البال رہو گے۔ زندگی میں امن اور چین نصیب ہوگا۔ ذلت وخواری کے ساتھ نہیں بلکہ عزت وشرف کے ساتھ جیو گے۔ یہی مضمون دوسرے موقع پر اس طرح ارشاد ہوا ہے کہ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (النحل ۱۶:۹۷) جو شخص بھی ایمان کے ساتھ نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، ہم اس کو پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔

اس سے لوگوں کی اُس عام غلط فہمی کو رفع کرنا مقصود ہے جو شیطان نے ہر نادان دنیا پرست آدمی کے کان میں پھونک رکھی ہے کہ خداترسی اور راست بازی اور احساسِ ذمہ داری کا طریقہ اختیار کرنے سے آدمی کی آخرت بنتی ہو تو بنتی ہو، مگر دنیا ضرور بگڑ جاتی ہے۔ اور یہ کہ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں فاقہ مستی وخستہ حالی کے سوا کوئی زندگی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی تردید میں فرماتا ہے کہ اس راہ راست کو اختیار کرنے سے تمھاری صرف آخرت ہی نہیں بلکہ دنیا بھی بنے گی۔ آخرت کی طرح اس دنیا کی حقیقی عزت وکامیابی بھی ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے جو سچی خداپرستی کے ساتھ صالح زندگی بسر کریں۔ جن کے اخلاق پاکیزہ ہوں، جن کے معاملات درست ہوں، جن پر ہر معاملے میں بھروسا کیا جا سکے، جن سے ہر شخص بھلائی کا متوقع ہو، جن سے کسی انسان کو یا کسی قوم کو شر کا اندیشہ نہ ہو۔

۱- قرآن مجید کی اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک مرتبہ قحط کے موقع پر حضرت عمرؓ بارش کی دعا کرنے کے لیے نکلے اور صرف استغفار پر اکتفا فرمایا۔ لوگوں نے عرض کیا: امیر المومنین! آپ نے بارش کے لیے تو دعا کی ہی نہیں۔ فرمایا: میں نے آسمان کے اُن دروازوں کو کھٹکھٹا دیا ہے جہاں سے بارش نازل ہوتی ہے، اور پھر سورۂ نوح کی یہ آیات لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں۔ (ابن جریر و ابن کثیر) اسی طرح ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؒ کی مجلس میں ایک شخص نے خشک سالی کی شکایت کی۔ انھوں نے کہا: اللہ سے استغفار کرو۔ دوسرے شخص نے تنگ دستی کی شکایت کی، تیسرے نے کہا: میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی، چوتھے نے کہا: میری زمین کی پیداوار کم ہو رہی ہے۔ ہر ایک کو وہ یہی جواب دیتے چلے گئے کہ استغفار کرو۔ لوگوں نے کہا: یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ سب کو مختلف شکایتوں کا ایک ہی علاج بتا رہے ہیں؟ انھوں نے جواب میں سورۂ نوح کی یہ آیات سنا دیں۔ (کشاف) [تفہیم القرآن، ششم، ص ۱۰۱، نوح حاشیہ ۱۲]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے علاوہ 'متاع حسن' کے الفاظ میں ایک اور پہلو بھی ہے جو نگاہ سے اوجھل نہ رہ جانا چاہیے۔ دنیا کا سامانِ زیست قرآن مجید کی رو سے دو قسم کا ہے۔ ایک وہ سروسامان ہے جو خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو فتنے میں ڈالنے کے لیے دیا جاتا ہے اور جس سے دھوکا کھا کر ایسے لوگ اپنے آپ کو دنیا پرستی و خدا فراموشی میں اور زیادہ گم کر دیتے ہیں۔ یہ بظاہر تو نعمت ہے مگر بباطن خدا کی پھٹکار اور اس کے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ قرآن مجید اسی کو 'متاع غرور' کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ دوسرا وہ سروسامان ہے جس سے انسان خوشحال اور قوی بازو ہو کر اپنے خدا کا اور زیادہ شکر گزار بنتا ہے، خدا اور اس کے بندوں کے اور خود اپنے نفس کے حقوق زیادہ اچھی طرح ادا کرتا ہے، خدا کے دیے ہوئے وسائل سے طاقت پا کر دنیا میں خیر و صلاح کی ترقی اور شر و فساد کے استیصال کے لیے زیادہ کارگر کوشش کرنے لگتا ہے۔ یہ قرآن کی زبان میں 'متاع حسن' ہے یعنی اچھا سامان زندگی جو محض عیش دنیا ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نتیجہ میں عیش آخرت کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۳۲۲-۳۲۴، ہود، حاشیہ ۳)

[اور یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوائی گئی ہے:] وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ (ہود ۱۱: ۵۲) اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمھاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرموں کی طرح منہ نہ پھیرو۔

یہ وہی بات ہے جو پہلے رکوع میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوائی گئی تھی کہ اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ تم کو اچھا سامان زندگی دے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آخرت ہی میں نہیں اس دنیا میں بھی قوموں کی قسمتوں کا اتار چڑھاؤ اخلاقی بنیادوں ہی پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عالم پر جو فرمانروائی کر رہا ہے وہ اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے نہ کہ اُن طبعی اصولوں پر جو اخلاقی خیر و شر کے امتیاز سے خالی ہوں۔ یہ بات کئی مقامات پر قرآن میں فرمائی گئی ہے کہ جب ایک قوم کے پاس نبی کے ذریعے سے خدا کا پیغام پہنچتا ہے تو اس کی قسمت اُس پیغام کے ساتھ معلق ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اسے قبول کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اگر رد کر دیتی ہے تو اسے تباہ کر ڈالا جاتا ہے۔ یہ گویا ایک دفعہ ہے اُس اخلاقی قانون کی جس پر اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ معاملہ کر رہا ہے۔ اسی طرح اس قانون کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ جو قوم دنیا کی خوشحالی سے فریب کھا کر ظلم و معصیت کی راہوں پر چل نکلتی ہے اس کا انجام بربادی ہے۔ لیکن عین اس وقت جبکہ وہ اپنے اس بُرے انجام کی طرف بگ ٹُٹ چلی جا رہی ہو، اگر وہ اپنی غلطی کو محسوس کر لے اور نافرمانی چھوڑ کر خدا کی بندگی کی طرف پلٹ آئے تو اس کی قسمت بدل جاتی ہے، اس کی مہلت عمل میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور مستقبل میں اس کے لیے عذاب کے بجائے انعام، ترقی اور سرفرازی کا فیصلہ لکھ دیا جاتا ہے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۳۴۶، ہود، حاشیہ ۵۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (الجن ۷۲: ۱۸) اور یہ کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، لہٰذا اُن میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔

مفسرین نے بالعموم 'مساجد' کو عبادت گاہوں کے معنی میں لیا ہے اور اسی معنی کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ عبادت گاہوں میں اللہ کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کی جائے۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ زمین پوری کی پوری عبادت گاہ ہے اور آیت کا منشا یہ ہے کہ خدا کی زمین پر کہیں بھی شرک نہ کیا جائے۔ ان کا استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہے کہ جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طُهُوْرًا۔[1] میرے لیے پوری زمین عبادت کی جگہ اور طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔

حضرت سعیدؒ بن جبیر نے مساجد سے مراد وہ اعضاء لیے ہیں جن پر آدمی سجدہ کرتا ہے، یعنی ہاتھ، گھٹنے، قدم اور پیشانی۔ اس تفسیر کی رو سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعضا اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان پر اللہ کے سوا کسی اور کے لیے سجدہ نہ کیا جائے۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۱۱۹، الجن، حاشیہ ۱۹)

نماز کی دعاؤں کے متعلق چند شبہات

ایک مسلمان کو ماں کی گود ہی میں جو اولین درس ملتا ہے وہ یہ ہے 'اللہ ہی لائق عبادت ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں' پھر:

۱- اذان بلاوا ہے خالصتاً اللہ کی عبادت کے لیے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں، تو اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ ہی اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے کیا معنی؟

۲- نماز میں سورۂ فاتحہ، اخلاص یا کوئی اور سورہ جو ہم پڑھتے ہیں ان میں صرف اللہ ہی کی حمد وثنا اور عظمت و بزرگی کا بیان ہے۔ اسی طرح رکوع وسجود میں اُسی کی تسبیح وتہلیل بیان ہوتی ہے۔ لیکن جیسے ہی ہم تشہد کے لیے بیٹھتے ہیں تو حضور سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ تشہد اور دونوں درود شریف وغیرہ۔ کیا اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی عبادت میں شریک نہیں ہو جاتے؟

۳- دونوں درود شریف جو ہم پڑھتے ہیں ظاہر ہے کہ حضورؐ اس طرح نہیں پڑھتے ہوں گے۔ کیونکہ ہم تو پڑھتے ہیں اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ (اے اللہ رحمت فرما محمدؐ پر اور محمدؐ کی آل پر) یہ دونوں درود شریف درحقیقت دعائیں ہیں اور اسی طرح تشہد اور دعا: رب اجعلنی بھی۔ عبادت، نام دعاؤں کا نہیں بلکہ اُس خالق ارض وسما کی حمد وثنا بیان کرنے کا ہے تو کیا یہ زیادہ مناسب نہیں کہ عبادت کے اختتام پر دعائیں مانگی جائیں، بہ نسبت اس کے کہ عین عبادت میں دعائیں مانگنی شروع کر دی جائیں؟ میرا خیال ہے کہ حضورؐ خود تشہد اور درود شریف وغیرہ نہیں پڑھتے ہوں گے۔ کیونکہ آپؐ سے یہ بعید ہے کہ عین نماز میں آپؐ اپنے لیے دعائیں مانگنے لگتے۔ پھر ذرا تشہد پر غور فرمائیے۔ ظاہر ہے کہ درود کی طرح اگر حضورؐ تشہد بھی پڑھتے تھے تو وہ بھی الگ ہوگا۔ کیونکہ 'اے نبی! تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، سوم، ص ۱۸، اشاعت اگست ۲۰۰۴ء۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوں' کی جگہ آپ ' پڑھتے ہوں گے' مجھ پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں؟'۔

۴۔ اللہ کی جو عبادت ہم بجالاتے ہیں اس کا نام الصلوٰۃ یعنی نماز ہے۔ پھر یہ فرض، سنت، وتر، نفل کیا چیز ہیں اور یہ پڑھ کر ہم کس کی عبادت کرتے ہیں۔ جاتے تو ہم ہیں اللہ کی عبادت بجالانے اور پڑھنے لگتے ہیں نماز سنت۔ جس کی نیت یوں باندھتے ہیں، دو رکعت نماز سنت، سنت رسول اللہ کی وغیرہ وغیرہ۔ کیا اس طرح بھی حضورؐ کا اللہ کی عبادت میں شریک ہو جانا ثابت نہیں ہوتا؟

۵۔ نماز کے آخر میں جو سلام ہم پھیرتے ہیں اس کا مخاطب کون ہے؟

۶۔ کیا حضورؐ بھی روزانہ پانچ نمازیں بجالاتے تھے؟ اور اتنی ہی رکعتیں پڑھتے تھے جتنی ہم پڑھتے ہیں؟ اس سوال کی قدرے میں نے تحقیق کی لیکن کوئی مستند حوالہ فی الحال ایسا نہیں ملا کہ اس سوال کا جواب ہوتا۔ بخلاف اس کے بخاری شریف میں یہ حدیث نظر آئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر کی دو دو رکعتیں پڑھیں۔ اسی طرح مؤطا کتاب الصلوٰۃ میں یہ لکھا دیکھا کہ رات دن کی نماز دو دو رکعت ہے۔ یہ دونوں حدیثیں دو دو رکعت نماز ثابت کرتی ہیں۔

ان خیالات و شکوک نے ذہن کو پراگندہ کر رکھا ہے اور اکثر مجھے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ ہماری موجودہ نماز وہ نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہوگی۔ خدارا میری الجھن کو دور فرمائیے اور مجھے گمراہ ہونے سے بچائیے۔ مجھے نماز چھوٹ جانے کا خطرہ ہے۔

ج: آپ کے دل میں اگر وساوس پیدا ہوا کریں تو ان کی وجہ سے نماز ترک نہ کریں۔ بلکہ نماز پڑھتے رہیں اور اپنے وساوس کے متعلق کسی جاننے والے سے پوچھ کر اپنا اطمینان کر لیا کریں۔

جو سوالات آپ نے کیے ہیں ان کے جوابات یہ ہیں:

۱۔ اذان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی شہادت دی جاتی ہے نہ کہ خدا ہونے کی۔ پھر آپ کے دل میں یہ شبہ کیوں پیدا ہوا کہ رسالت کی شہادت دینے سے عبادت میں شرک واقع ہو جائے گا؟ رسالت کی شہادت تو اسی لیے دی جاتی ہے کہ ہم خدا کی عبادت اُس عقیدے اور طریقے کے مطابق کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھایا ہے۔ ہم نے خود اپنی فکر سے یہ طریقہ اور عقیدہ ایجاد نہیں کر لیا ہے۔

۲۔ تشہد کی پوری عبارت پر آپ غور کریں۔ پہلے آپ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنا سلام پیش کرتے ہیں۔ پھر رسولؐ کے لیے رحمت و برکت کی دعا کرتے ہیں۔ پھر اپنے حق میں اور تمام نیک بندوں کے حق میں سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ پھر اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دیتے ہیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں جو دراصل اللہ تعالیٰ ہی سے اس امر کی دعا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی نوازشات کی بارش فرمائے۔ پھر اللہ سے اپنے حق میں اور اپنے والدین کے حق میں بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ ان سارے مضامین کو آپ خود دیکھیں۔ ان میں کیا چیز ہے جسے آپ شرک کہہ سکتے ہیں؟ یہ تو ساری دعائیں اللہ تعالیٰ ہی سے ہیں۔ کیا اللہ سے دعا کرنا شرک ہے؟ کیا اللہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے رسول کو رسول ماننا بھی شرک ہے؟

۳- یہ غلط فہمی آپ کو کہاں سے ہوگئی کہ عبادت صرف اللہ کی حمد وثنا کرنے کا نام ہے اور اللہ سے دعا کرنا عبادت نہیں ہے۔ دعا تو روحِ عبادت ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ان مشرکین کو جو غیر اللہ سے دعائیں مانگتے ہیں، غیر اللہ کی عبادت کرنے والا قرار دیا گیا ہے، حتیٰ کہ اکثر مقامات پر یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کہنے کے بجائے یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور حکم دیا گیا ہے کہ اللہ ہی سے دعا مانگو۔

یہ تشہد جو ہم پڑھتے ہیں، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو سکھایا تھا اور انھیں ہدایت فرمائی تھی کہ تم یہ پڑھا کرو۔ اس لیے ہم کو نماز میں یہی پڑھنا چاہیے۔ رہا حضورؐ کا اپنا تشہد، تو اس کے متعلق احادیث میں کوئی صراحت نہیں ہے کہ حضورؐ خود کیا پڑھتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے تشہد میں الفاظ کچھ مختلف ہوتے ہوں۔ اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ حضورؐ خود بھی یہی تشہد پڑھتے ہوں۔ اگر ہم نماز میں اپنے لیے دعا کرتے ہیں تو آخر آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے کہ حضورؐ بھی نماز میں اپنے لیے دعا فرماتے ہوں؟ اسی طرح اگر ہم حضورؐ کے نبی ہونے کی شہادت نماز میں دیتے ہیں تو اس میں آخر کیا خرابی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی نبوت کی شہادت دیتے ہوں؟

۴- فرض نماز کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ عبادت جو اس کے عائد کردہ فریضۂ صلوٰۃ کو ادا کرنے کے لیے کم سے کم لازم ہے، جس کے بغیر حکم کی تعمیل سے ہم قاصر رہ جائیں گے۔ سنت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ عبادت جو فرض کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ادا کیا کرتے تھے اور جس کی آپ نے ہمیں تاکید کی ہے۔ نفل سے مراد ہے خدا کی وہ عبادت جو ہم اپنی خوشی سے کرتے ہیں جسے ہم پر نہ لازم کیا گیا ہے اور نہ جس کی تاکید کی گئی ہے۔[۵] اب فرمائیے کہ اس میں شرک کہاں سے آ گیا؟ 'سنت رسول اللہ کی' کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ رسول اللہ کی نماز پڑھی جارہی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرض سے زائد پڑھا کرتے تھے اور آپ کے اتباع میں ہم بھی پڑھتے ہیں۔

۵- کسی عمل کو ختم کرنے کے لیے آخر میں اس کی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ نماز ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ جو قبلہ رو بیٹھ کر عبادت کر رہے تھے، اب دونوں طرف منہ پھیر کر اس عمل کو ختم کردیں۔ اب منہ پھیرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ چپکے سے منہ پھیر دیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ خدا سے تمام خلق کے لیے سلامتی کی دعا کرتے ہوئے منہ پھیریں۔ آپ کو ان میں سے کون سی صورت پسند ہے؟

۶- جن احادیث کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہ ابتدائی دور کی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل جب کہ نماز کے احکام بتدریج مکمل ہو چکے تھے یہی تھا کہ آپ پانچوں وقت وہی رکعتیں پڑھتے تھے جو اب تمام مسلمانوں میں رائج ہیں۔ یہ چیز دوسری متعدد احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ حضرت عمرؓ کا جو قول آپ نے نقل کیا ہے وہ نوافل سے متعلق ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۰۰-۳۰۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل یازدہم

رفع الیدین اور آمین بالجہر

رفع یدین کی فقہی حیثیت

'رفع یدین' اور 'آمین بالجہر' .... کے فعل اور ترک دونوں کی تائید میں دلائل مجھ کو تقریباً مساوی الوزن نظر آتے ہیں۔ اس لیے جو ان افعال کو کرتا ہے وہ بھی حدیث کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے اور جو انھیں ترک کرتا ہے اسے بھی مخالفِ حدیث کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ صاحب شریعت علیہ السلام نے مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے عمل کیا ہے، اور اسی طرح صحابۂ کرام نے بھی۔ اب ایک شخص جس طریقے کی بھی پیروی کرتا ہے وہ صاحب شریعت ہی کا متبع ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے غیریت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے، یا اسے اپنے ہی پسندیدہ طریقے کی طرف تشدّد سے کھینچا جائے۔ ہاتھ اٹھایا نہ اٹھانا اور آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا کوئی ایسی اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک کا التزام اور دوسرے کے ترک کا اہتمام کیا جاتے۔

(رسائل و مسائل، اول، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۱۹۴)

رفع یدین کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ مختلف طرزِ عمل منقول ہیں:

۱- ابن عمرؓ کی روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ تین مواقع پر رفع یدین کرتے تھے: افتتاح صلوٰۃ کے وقت، رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اُٹھ کر۔

۲- مالک بن حُویرث کی روایت جس میں دو موقعوں پر رفع یدین کا ذکر ملتا ہے: افتتاح صلوٰۃ کے وقت اور رکوع سے اُٹھ کر۔

۳- وائل بن حجر کی روایت جس میں چار مواقع پر اس کا ہونا مذکور ہے: افتتاح صلوٰۃ کے وقت، رکوع میں جاتے ہوئے، رکوع سے اُٹھتے ہوئے، سجدہ کے موقع پر۔

۴- ابو حمید ساعدی کی روایت، اس میں بھی چار مواقع پر رفع یدین کا ذکر ہے، مگر چوتھا موقع سجدہ کی بجائے تیسری رکعت میں قعدے سے اُٹھنے پر، بیان کیا گیا ہے۔

۵- عبداللہ بن مسعودؓ اور براء بن عازب کی روایت جس میں صرف ایک مرتبہ رفع یدین کا ذکر ہے، یعنی افتتاح صلوٰۃ کے موقع پر۔[1]

ان مختلف روایات میں سے [پہلی روایت] کو امام شافعیؒ، احمدؒ اور ابو ثورؒ نے، نیز اہل الحدیث اور اہل الظاہر کی اکثریت نے اختیار کیا اور ایک روایت امام مالکؒ سے بھی یہی ہے کہ وہ اس کو ترجیح دیتے تھے۔ [چوتھی روایت] کو اہل الحدیث کے ایک گروہ نے مرجح ٹھہرایا۔ اور [پانچویں روایت] کو ابراہیم نخعیؒ، شعبیؒ، سفیان ثوریؒ، ابو حنیفہؒ اور تمام فقہائے کوفہ نے ترجیح دی۔

۱- مذکورہ بالا احادیث کی تخریج: تفہیم الاحادیث، سوم، ص ۲۵۵ تا ۲۷۳ پر ملاحظہ ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیکن یہ واضح رہے کہ سوال صرف ترجیح کا ہے نہ کہ ردّ و قبول کا۔ ائمہ سلف میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ جن مختلف طریقوں کا ذکر مذکورۂ بالا احادیث میں آیا ہے ان میں سے کسی پر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عمل نہیں کیا تھا۔ بلکہ کہتے صرف یہ ہیں کہ جس خاص طریقے کو ہم نے مرجح قرار دیا ہے وہ حضورؐ کا عام معمول تھا اور دوسرے طریقوں پر آپ کبھی کبھی عمل کر لیتے تھے۔ پس جب معاملے کی حقیقت یہ ہے تو ان طریقوں میں سے جس پر بھی کوئی عمل کر رہا ہے، حدیث ہی کی پیروی کر رہا ہے۔ اور اس پر نکیر کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اتباعِ پیغمبر پر نکیر کی جاتی ہے جس کی جرأت مقلدین کو بھی زیبا نہیں کجا کہ اہلِ حدیث اس کا ارتکاب کریں۔ پھر اگر کوئی شخص ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر جامد ہونے کے بجائے وقتاً فوقتاً ان سب طریقوں پر عمل کرتا ہے جو حدیث میں مذکور ہیں تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ صحیح و مکمل پیروی ہوگی، اور لفظ عمل بالحدیث کا اطلاق اس طرزِ عمل پر زیادہ صحیح معنی میں ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ابتدا میں ایک طریقے کو ترجیح دینے اور باقی سب طریقوں کو ترک کر دینے کے بجائے ان سب طریقوں کو نماز میں اختیار کرنے کی گنجائش رکھی جاتی تو شاید بعد کے ادوار میں وہ جمود و تعصب پیدا ہی نہ ہوتا جس کی بدولت نوبت یہ آ گئی ہے کہ لوگ نماز کی جس صورت کے عادی ہیں، اس سے ذرا سی مختلف صورت بھی جہاں انھوں نے دیکھی اور بس وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس شخص کا دین بدل گیا ہے اور یہ ہماری اُمّت سے نکل کر دوسری اُمّت میں جا ملا ہے۔

یہ رائے جو میں عرض کر رہا ہوں صرف میری انفرادی رائے ہی نہیں ہے بلکہ پہلے بھی متعدد اہلِ تحقیق اسی خیال کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس وقت میرے پاس سفر[1] میں کتابیں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے میں زیادہ وسیع پیمانے پر شواہد پیش نہیں کر سکتا، لیکن حجۃ اللہ البالغہ خوش قسمتی سے مل گئی ہے۔ اس سے چند حوالے یہاں نقل کرتا ہوں۔ شاہ صاحب پہلے تو یہ اصولی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ اَلْاَصْلُ اَنْ یُّعْمَلَ بِکُلِّ حَدِیْثٍ اِلَّا اَنْ یَّمْتَنِعَ الْعَمَلُ بِالْجَمِیْعِ لِلتَّنَاقُضِ (حجۃ اللہ البالغۃ، باب القضاء فی الاحادیث المختلفہ) اصولی بات یہ ہے کہ آدمی ہر حدیث پر عمل کرے، الا یہ کہ کسی مسئلے میں سب حدیثوں پر عمل کرنا تناقض کی وجہ سے غیر ممکن ہو۔

پھر آگے چل کر فَصْلٌ فِیْ عِدَّۃِ اُمُوْرٍ مُّشْکِلَۃٍ مِّنَ التَّقْلِیْدِ وَ اِخْتِلَافِ الْمَذَاهِبِ میں فرماتے ہیں:

اِنَّ اَکْثَرَ صُوَرِ الْاِخْتِلَافِ بَیْنَ الْفُقَهَاءِ لَاسِیَّماً فِی الْمَسَائِلِ الَّتِیْ ظَهَرَ اَقْوَالُ الصَّحَابَۃِ فِی الْجَانِبَیْنِ کَتَکْبِیْرَاتِ التَّشْرِیْقِ وَ تَکْبِیْرَاتِ الْعِیْدَیْنِ وَ نِکَاحِ الْمُحْرِمِ وَ تَشَهُّدِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَالْاِخْفَاءِ بِالْبَسْمَلَۃِ وَ بِآمِیْنِ وَ الْاِشْفَاعِ وَالْاِیْتَارِ فِی الْاِقَامَۃِ وَ نَحْوِ ذٰلِکَ، اِنَّمَا هُوَ فِیْ تَرْجِیْحِ اَحَدِ الْقَوْلَیْنِ وَ کَانَ السَّلَفُ لَا یَخْتَلِفُوْنَ فِی الْمَشْرُوْعِیَّۃِ وَ اِنَّمَا خِلَافُهُمْ فِیْ اَوْلَی الْاَمْرَیْنِ وَ نَظِیْرُهٗ اِخْتِلَافُ الْقُرَّاءِ فِیْ وُجُوْهِ الْقِرَاءَۃِ وَقَدْ عَلَّلُوْا کَثِیْرًا مِّنْ هٰذَا الْبَابِ بِاَنَّ الصَّحَابَۃَ مُخْتَلِفُوْنَ وَ اِنَّهُمْ جَمِیْعًا عَلَی الْهُدٰی واقعہ یہ ہے کہ فقہا کے درمیان اختلاف کی اکثر صورتیں، بالخصوص ان مسائل میں جن میں صحابہ کے اقوال دونوں طرف پائے جاتے ہیں، مثلاً تکبیراتِ تشریق، تکبیراتِ عیدین، نکاحِ محرم، تشہد ابن عباس و ابن مسعود، بسم اللہ اور آمین کا اخفا، تکبیر اقامت میں کلمات کو ایک ایک مرتبہ یا دو دو مرتبہ پڑھنا وغیرہ۔ ان میں اختلاف

۱۔ اس خط کا جواب دہلی میں لکھا گیا تھا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دراصل اس امر میں ہے کہ دو اقوال میں سے کس کو کس پر ترجیح ہے۔ ورنہ ان مختلف طریقوں کے بجائے خود مشروع ہونے میں سلف کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ ان کا اختلاف تو صرف اس اعتبار سے تھا کہ دو مختلف امور میں سے اَولیٰ کون سا ہے۔ اور یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسے قراءت کی مختلف صورتوں میں قاریوں کے درمیان اختلاف ہے۔ اس معاملے میں بیشتر امور کے اختلاف کی وجہ سلف نے یہ بتائی ہے کہ صحابہ کرام خود ان میں مختلف تھے اور ظاہر ہے کہ صحابہ سب کے سب ہدایت پر تھے۔

پھر بَابُ اَذْکَارِ الصَّلٰوۃِ وَ هَیْئَاتِهَا الْمَنْدُوْبِ اِلَیْهَا میں فرماتے ہیں:

وَهُوَ (اَیْ رَفْعُ الْیَدَیْنِ) مِنَ الْهَیْئَاتِ وَ فَعَلَهُ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ مَرَّةً وَ تَرَکَهُ مَرَّةً وَالْکُلُّ سُنَّةٌ وَ اَخَذَ بِکُلِّ وَاحِدٍ جَمَاعَةٌ مِّنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِیْنَ وَ مَنْ بَعْدَهُمْ وَ هٰذَا اَحَدُ الْمَوَاضِعِ الَّتِیْ اِخْتَلَفَ فِیْهَا الْفَرِیْقَانِ، اَهْلُ الْمَدِیْنَةِ وَ الْکُوْفَةِ وَ لِکُلٍّ وَاحِدٍ اَصْلٌ اَصِیْلٌ وَالْحَقُّ عِنْدِیْ فِیْ مِثْلِ ذٰلِکَ اَنَّ الْکُلَّ سُنَّةٌ اور وہ (یعنی رفع الیدین) نماز کی ان ہیئتوں میں سے ہے، جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کیا ہے اور کبھی نہیں کیا۔ اور یہ دونوں طریقے سنت ہیں، صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں میں سے ایک ایک جماعت نے ان میں سے ایک ایک طریقے کو اختیار کیا ہے اور یہ من جملہ ان معاملات کے ہیں جن میں اہلِ مدینہ اور اہلِ کوفہ کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ لیکن ہر ایک کے لیے ایک ثابت شدہ اصل شریعت میں موجود ہے اور ایسے مسائل میں میرے نزدیک حق یہ ہے کہ سب مختلف طریقے سنت ہیں۔

شاہ صاحب کی ان تصریحات کے بعد اس امر کی ضرورت نہیں رہتی کہ میں آمین کے مسئلے کے متعلق الگ بحث کروں، تاہم اس معاملے میں صاحب الجوہر النقی کا یہ قول نقل کر دینا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ وَ الصَّوَابُ اَنَّ الْخَبَرَیْنِ بِالْجَهْرِبِهَا وَالْمَخَافَةِ صَحِیْحَانِ وَ عَمِلَ بِکُلٍّ مِّنْ فِعْلَیْهِ جَمَاعَةٌ مِّنَ الْعُلَمَاءِ۔ اور صحیح یہ ہے کہ آمین زور سے کہنے اور آہستہ کہنے دونوں کی روایتیں صحیح ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر علما کی ایک ایک جماعت نے عمل کیا ہے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۲۰۸-۲۱۲)

مختلف مکاتب فکر کے طریقوں پر نماز

س: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نماز ایک ہی طریقے پر پڑھی ہوگی، پھر یہ مختلف فرقوں کے مختلف طریقوں کا اسلام میں کیا مقام ہے؟ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کون سا فرقہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق پر نماز ادا کرتا ہے؟ اور میں کس کے مسلک پر رہوں۔ یہ بھی جاننا چاہتا ہوں۔ کہ خود آپ کس طریق پر نماز ادا کرتے ہیں؟

ج: اہلِ حدیث، حنفی، مالکی، حنبلی اور شافعی حضرات جن جن طریقوں سے نماز پڑھتے ہیں وہ سب طریقے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور ہر ایک نے معتبر روایات ہی سے ان کو لیا ہے۔ اسی بنا پر ان میں سے کسی گروہ کے اکابر علما نے یہ نہیں کہا کہ ان کے طریقے کے سوا جو شخص کسی دوسرے طریقے پر نماز پڑھتا ہے اس کی نماز نہیں ہوتی۔ یہ صرف بے علم لوگوں کا ہی کام ہے کہ وہ کسی شخص کو اپنے طریقے کے سوا دوسرے طریقے پر نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر اسے ملامت کرتے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وسلم نے مختلف اوقات میں ان سب طریقوں سے نماز پڑھی ہے۔ اختلاف اگر ہے تو صرف اس امر میں کہ آپ عموماً کس طریقے پر عمل فرماتے تھے۔ جس گروہ کے نزدیک جو طریقہ آپ کا معمول بہ طریقہ ثابت ہوا ہے اس نے وہی طریقہ اختیار کرلیا ہے۔

میں خود حنفی طریقے پر نماز پڑھتا ہوں، مگر اہل حدیث، شافعی، مالکی، حنبلی سب کی نمازوں کو درست سمجھتا ہوں اور سب کے پیچھے پڑھ لیا کرتا ہوں۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۳۵۰-۳۵۱)

اولاد کو اپنے فقہی مسلک پر مجبور نہیں کیا جاسکتا

.... جہاں تک اصول دین کا تعلق ہے، والدین کو نہ صرف یہ حق ہے بلکہ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اعتقادی ضلالت یا اخلاقی فساد سے روکنے کی کوشش کریں۔ لیکن جہاں تک فقہی معاملات کا تعلق ہے، والدین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اولاد کو اپنے مسلکِ خاص کی پیروی پر مجبور کریں۔ خصوصاً جبکہ اولاد صاحب علم ہو اور تحقیق کی بنا پر والدین سے مختلف کسی دوسرے مسلکِ فقہی کو اختیار کرنا چاہے تو والدین کے لیے یہ مطالبہ کرنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیق کے خلاف عمل کرے۔ اس معاملے میں سلف کا صحیح اتباع یہ ہے کہ والدین اور اولاد دونوں کو تحقیق کی آزادی اور اپنی تحقیق پر عمل کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ اس حق کو سلب کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ایک شخص اہلِ حدیث یا حنفی یا شافعی ہو تو وہ اپنی آیندہ نسل کو بھی اہل حدیث، حنفی یا شافعی بنانے پر اصرار کرے گا۔ اور دو چار پشتیں گزر جانے کے بعد یہ طریقے محض فقہی مسلک نہ رہیں گے بلکہ نسلی امتیں بن جائیں گے، جن میں تعصب ہوگا، جمود ہوگا اور آبائی مسلک سے ہٹنا ارتداد کا ہم معنی قرار پائے گا۔

(رسائل و مسائل، اوّل، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۲۱۳-۲۱۴)

فقہی اختلافات کی بنا پر نمازوں کی علیحدگی

س: فقہی اختلافات کی بنا پر بعض صورتوں میں حنفی، اہل حدیث اور شافعی حضرات علیحدہ علیحدہ پڑھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ اول وقت نماز پڑھنے کو ترجیح دیتا ہے اور دوسرا تاخیر کو افضل سمجھتا ہے۔ اب ان سب کا مل کر ایک جماعت میں نماز پڑھنا کسی نہ کسی کو افضل نماز سے محروم ہی کرے گا۔ اگر 'افضل نماز' کی کوئی اہمیت ہے تو پھر آپ کیوں اس 'ایک ہی جماعت' کے اصولوں پر اتنا زور دیتے ہیں؟

ج: آپ کے نزدیک اگر کسی وقت پر نماز پڑھنا افضل اور اولیٰ ہو اور دوسرے مسلمانوں کے نزدیک کسی دوسرے وقت میں پڑھنا افضل ہو تو اس اختلاف کی بنا پر جماعت سے الگ ہو کر نماز پڑھنا یا اپنے ہم خیالوں کی جماعت الگ قائم کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ افضل وقت کو چھوڑنے کی برائی سے جماعت کو ترک کرنے اور جماعتیں الگ کرلینے کی برائی زیادہ ہے۔

س: ایک صاحب نے ہمارے ایک سوال کے جواب میں آپ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ غیر صالح العقیدہ لوگوں کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پیچھے بھی عام مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھ لینی چاہیے اور تفرقہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہمیں یاد ہے کہ آپ نے ایک خط میں ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں یہ فرمایا تھا کہ جس کے متعلق مشرکانہ عقائد رکھنا بالکل متحقق ہو جائے اس کے پیچھے تو نماز پڑھنے سے احتراز کرنا چاہیے، مگر جس شخص کے عقاید کی حقیقت معلوم نہ ہو اس کی امامت میں نماز پڑھنا چاہیے۔ ان دونوں جوابات میں جو فرق ہے اس کی وجہ سے یہاں بہت پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ ذرا وضاحت کے ساتھ صحیح مسلک کی نشان دہی فرمائیے۔

ج: آپ کو جو جواب یہاں سے دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ کوئی صریح مشرکانہ فعل یا قول یا عقیدہ جس کے لیے تاویل کی قطعاً گنجایش نہ ہو اور جس کے ماننے والے یا کرنے والے کے لئے یہ فیصلہ کئے بغیر چارہ نہ ہو کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے، ایسے قول یا فعل کے مرتکب کے پیچھے نماز نہ پڑھنی چاہیے، لیکن عام طور پر مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان بحثوں اور مناظروں اور نزاعوں نے یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ ہر گروہ دوسرے کو گمراہ ٹھیرانے اور اس سے دور بھاگنے کے لیے دلیلیں ڈھونڈتا ہے اور بات بات پر فرقے بنتے ہیں، مسجدیں الگ ہوتی ہیں اور شادی بیاہ کے تعلقات منقطع ہوتے ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ جو لوگ سب کی اصلاح کے لیے اٹھے ہوں، اُن کے لیے صحیح طریقہ یہی ہے کہ وہ سب مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں اور ان میں جو اخلاقی اور اعتقادی خرابیاں پائیں، ان کو ہمدردی اور محبت کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ نمازیں الگ کر لینے کا فائدہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ ہم بھی ایک فرقہ بن کر رہ جائیں گے اور ہمارے اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو جائے گی جسے عبور کرنا محال ہو جائے گا۔

رہا یہ اندیشہ کہ جس شخص کو آپ اپنے نزدیک گمراہی اور شرک میں مبتلا پاتے ہیں اس کی نماز چونکہ آپ کے عقیدے کے مطابق مقبول نہیں ہے اس لیے اگر آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے تو آپ کی نماز نہ ہوگی، تو یہ اصلاً غلط ہے۔ اول تو آپ یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہی نہیں ہیں کہ کس کی نماز مقبول ہوگی اور کس کی نہ ہوگی۔ ایسے فیصلے کرنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنی نماز کی مقبولیت کے لیے بھی دعا کریں اور دوسروں کی نماز کی مقبولیت کے لیے بھی۔ دوسرے یہ کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ پوری جماعت کی نماز امام کی نماز کے ماتحت ایک مجموعے کی شکل میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوتی ہو اور اگر امام کی نماز مقبول نہ ہو تو سارے مقتدیوں کی نماز بھی غیر مقبول ہو جائے۔ جماعت کی پابندی تو مسلمانوں کو ایک امت بنانے کے لیے ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد کی نماز انفرادی حیثیت ہی سے خدا کے حضور پیش ہوتی ہے اور اگر وہ مقبول ہونے کے قابل ہو تو بہر حال مقبول ہو کر رہتی ہے خواہ امام کی نماز مقبول ہو یا نہ ہو۔

س: میرا تعلق جس فرقے سے تھا اس کے بعض سنجیدہ علما یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب آپ فقہی مسلک میں جماعت اسلامی کے ارکان کو آزادی دیتے ہیں اور واقعتاً جزئی معاملات میں مختلف گروہ متحد الخیال ہیں بھی نہیں تو پھر آپ نماز کی جماعت میں سب کی شرکت کو لازمی کیوں قرار دیتے ہیں؟ خود نماز سے متعلقہ مسائل میں بہت اختلاف ہیں اور ان کی بنا پر لوگ اپنی نمازیں الگ پڑھنا چاہتے ہیں!

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ج: فقہی اختلافات کی بنا پر نمازوں کو الگ کرنے کا کوئی ثبوت سلف میں نہیں ہے۔ یہ فقہی اختلافات صحابہ کرام کے درمیان بھی تھے اور تابعین کے درمیان بھی اور تبع تابعین کے درمیان بھی۔ لیکن یہ سب لوگ ایک ہی جماعت میں نماز پڑھتے تھے۔ یہی طریقہ ائمہ مجتہدین کا بھی رہا۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ نماز دین کی بنیادوں میں سے ہے اور فقہی اختلافات بہرحال فروعی ہیں۔ ان فروعی اختلافات کی بنا پر نمازیں الگ کرنا تفرق فی الدین ہے، جس کو قرآن نے گمراہی قرار دیا ہے۔ نمازیں الگ کر لینے کے بعد مسلمانوں کی ایک امت نہیں رہ سکتی اور اس کا امکان نہیں ہے کہ جو لوگ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتے وہ دین کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کی سعی میں متحد ہو کر کام کر سکیں گے۔ یہ چیز اب نظری نہیں رہی ہے بلکہ صدیوں کے عملی تجربے نے اسے ثابت کر دیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اپنے فرقی اختلافات کی وجہ سے نمازوں کی علیحدگی پر اصرار کرتے ہیں وہ دراصل دین کی جڑ پر ضرب لگاتے ہیں۔

(رسائل و مسائل، اوّل، جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۲۰۰-۲۰۳)

اختلافی مسائل پر امت سازی

اصولی حیثیت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ شرعی مسائل میں کسی شخص یا گروہ کا کسی خاص طریق تحقیق و استنباط یا کسی مخصوص مذہب فقہی کی پیروی کرنا اور چیز ہے اور اس کا اپنے خاص طریقہ یا مذہب کے لیے متعصب ہونا اور اس کی بنا پر جتھہ بندی کرنا اور اس سے مختلف مذہب رکھنے والوں سے مغایرت و منافرت برتنا اور اس کی پابندی ترک کرنے والوں کو اس طرح ملامت کرنا کہ گویا ان کے دین میں کوئی نقص آ گیا ہے، بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ پہلی چیز کے لیے تو شریعت میں پوری گنجائش ہے، بلکہ خود صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے طرز عمل سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے اور دین میں اس سے کوئی خرابی رونما نہیں ہوتی۔ لیکن دوسری چیز بعینہٖ وہ تفرق فی الدین ہے جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے، اور اس تفرق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لوگ فقہی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھتے ہیں، پھر ان مسائل میں ذرا ذرا سے اختلاف پر ان کے درمیان الگ الگ امتیں بنتی ہیں، پھر ان فروعی بحثوں میں وہ اس قدر الجھتے اور ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے امت مسلمہ کی زندگی کے اصل مقصد (یعنی اعلائے کلمۃ اللہ) اور اقامتِ دین کی خاطر مل کر جدوجہد کرنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔

مسلکِ فقہی کے اعتبار سے کسی کا طریقِ اہلِ حدیث یا طریقِ حنفی یا طریقِ شافعی وغیرہ پر چلنا بجائے خود کسی قباحت کا موجب نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ چیز آگے بڑھ کر یہ صورت اختیار کر لے کہ مسلمان فی الحقیقت ایک امت نہ رہیں، بلکہ اہل حدیث، احناف، شوافع وغیرہ ناموں کے ساتھ الگ الگ مستقل امتیں بن جائیں، اور شرعی اعمال کی جو خاص صورتیں ان مختلف گروہوں نے اختیار کی ہیں وہ ہر ایک گروہ کے مخصوص شعائر قرار پا جائیں جن کی بنا پر ان گروہوں میں مغایرت اور امتیاز واقع ہو، تو پھر یقیناً یہ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دین اسلام میں اس تقسیم اور تعصب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ رفع یدین کرنا یا نہ کرنا۔ آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا، اور ایسے ہی دوسرے امور صرف اُسی وقت تک شرعی اعمال ہیں جب تک کوئی شخص ان کے ترک یا فعل کو اس بنا پر اختیار کرے کہ اُس کی تحقیق میں صاحبِ شریعت سے ایسا ہی ثابت ہے۔ یا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ کہ ایسا کرنا دلائلِ شرعیہ کی بنا پر ارجح اور اولیٰ ہے۔ مگر جب یہی اعمال کسی مخصوص فرقے کے شعار بن جائیں اور ان کا ترک یا فعل وہ علامت قرار پائے جس کی بنا پر فیصلہ کیا جانے لگے کہ آپ کس فرقہ میں داخل اور کس سے خارج ہیں اور پھر انھی علامتوں کے لحاظ سے یہ طے ہونے لگے کہ کون اپنا ہے اور کون غیر، تو اس صورت میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا یا آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا ایسے ہی دوسرے امور کا ترک اور فعل دونوں یکساں بدعت ہیں۔ اس لیے کہ سنت رسول اللہ میں بجائے خود تو ان اعمال کا ثبوت ملتا ہے، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان اعمال کو مسلمانوں کے اندر گروہ بندیوں اور فرقہ سازیوں کے لیے علامات اور شعائر بنایا جائے۔ ایسا کرنا دراصل حدیث کا نام لے کر صاحب حدیث علیہ السلام کے منشاء کے بالکل برعکس کام کرنا ہے اور اس اصل کام کو غارت کرنا ہے جس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۲۰۶-۲۰۷)

❁ ❁ ❁

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوازدہم

نماز کی زبان کا مسئلہ[1]

قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں

نماز صرف عربی زبان ہی میں ادا کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ نماز کا سب سے اہم جز قرآن کی تلاوت ہے جو عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور اس کا ترجمہ خواہ کتنا ہی صحیح ہو بہرحال قرآن نہیں ہے۔ نہ اس پر کلام اللہ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ دوسری جو چیزیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں وہ سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کی ہیں اور جن الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تعلیم دی ہے انھی میں ان کو پڑھنا چاہیے۔ دوسری زبان کے الفاظ اوّل تو ان کے صحیح معنی نہیں ادا کرتے، اور کسی حد تک وہ ادا کریں بھی تو بہرحال وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے الفاظ کے قائم مقام نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع سے آج تک کے تمام فقہائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ نماز عربی زبان ہی میں ادا کی جانی چاہیے۔ نہ قرآن کے اصل الفاظ کی جگہ ان کا ترجمہ پڑھا جا سکتا ہے اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے الفاظ کو دوسرے الفاظ سے بدلا جا سکتا ہے۔

نومسلموں کے لیے حکم

البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ جو غیرِ عرب انسان نیا نیا مسلمان ہو اور فوراً ہی عربی زبان میں قرآن اور دوسرے اذکارِ صلوٰۃ پڑھنے کے قابل نہ ہو سکے تو وہ کیا کرے؟ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ (امام ابو حنیفہؒ کے دو فاضل شاگردوں) کی رائے یہ ہے کہ ایسا شخص اپنی زبان میں ترجمہ پڑھ سکتا ہے، مگر اسے جلدی سے جلدی کوشش کرنی چاہیے کہ عربی زبان میں نماز پڑھنے کے قابل ہو جائے۔ امام ابو حنیفہؒ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ عربی زبان کی قدرت رکھنے والے شخص کے لیے بھی غیر عربی میں نماز پڑھنا جائز ہے، مگر بعد میں انھوں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور وہی رائے اختیار کی جو ان کے دونوں جلیل القدر شاگردوں، امام ابو یوسفؒ اور امام محمد نے ظاہر کی ہے۔ لیکن امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ نماز کسی حال میں بھی عربی کے سوا دوسری زبان میں ادا نہیں کی جا سکتی۔ جو شخص عربی تلفظ پر قادر نہ ہو وہ نماز میں سبحان اللہ اور الحمد للہ جیسے مختصر الفاظ پڑھتا رہے اور اس امر کی کوشش کرے کہ جلدی سے جلدی عربی میں نماز ادا کرنے کی قدرت اسے حاصل ہو جائے۔[2]

۱۔ یہ دراصل ایک سوال کا جواب ہے۔ سائل، جو ایک انگریز نومسلم ہے، پوچھتا ہے کہ مجھے عربی میں نماز پڑھتے ہوئے یہ مشکل پیش آ رہی ہے کہ قرآن کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا، جس کی وجہ سے میں اس روحانیت سے محروم ہوں جو قرآن کا مفہوم سمجھنے کی صورت میں مجھے حاصل ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا میں انگریزی میں نماز پڑھ سکتا ہوں؟ (مرتب)

۲۔ آپ اس سلسلے کی تحقیق کرنا چاہیں تو ھدایہ کی مشہور شرح فتح القدیر جلد اول، ص ۱۹۹-۲۰۱، امام سرخسی کی المبسوط جلد اول، ص ۳۷ اور بزدوی کی کشف الاسرار، ص ۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عربی میں نماز کے لزوم کی مصلحتیں

ایک ایسی زبان میں نماز پڑھنا جس کو آدمی نہ سمجھتا ہو، اور جس کے صرف الفاظ ہی وہ زبان سے ادا کر رہا ہو، بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے اور سرسری نگاہ میں آدمی اس کو کچھ غیر فطری سا محسوس کرتا ہے۔ لیکن آپ ذرا گہری نگاہ سے دیکھیں تو اس کی عظیم مصلحتیں آپ کے سامنے واضح ہو جائیں گی۔

ایک مذہب کے اپنی اصل شکل اور روح کے ساتھ برقرار رہنے کا انحصار زیادہ تر اس بات پر ہے کہ اس کی تعلیم اپنے اصل الفاظ میں محفوظ رہے۔ ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں کبھی اصل کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ نہ اصل کی پوری روح اور اس کی کامل معنویت دوسری زبان میں منتقل کی جا سکتی ہے۔ ترجمہ ہر شخص اپنی فہم کے مطابق کرے گا اور دو مترجموں کے ترجمے کبھی متفق نہ ہو سکیں گے۔ یہ معاملہ تو انسانی تصنیفوں کے ترجمے میں ہم آئے دن دیکھتے ہیں۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا کے کلام اور پیغمبرانہ الفاظ کو پوری روح اور معنویت کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کیا جا سکے۔ اور یہ کہا جا سکے کہ یہ ترجمہ اصل کا قائم مقام ہے۔

دنیا کے مذاہب کو بگاڑنے میں ایک بہت بڑا دخل اس چیز کا ہے کہ ان کی بنیادی کتابیں اپنی اصل زبان مین محفوظ نہیں رہیں اور ان کے پیروؤں کا سارا انحصار مختلف زبانوں کے مختلف ترجموں پر ہو گیا جن میں باہم کوئی موافقت نہیں ہے اور جن کے اندر آئے دن ترمیمیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔

مسلمانوں کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ ان کے مذہب کا مدار جس کتاب پر اور جس پیغمبر کی ہدایات پر ہے وہ کتاب بھی اپنی اصل زبان میں موجود ہے اور اس پیغمبر کی تعلیمات بھی اسی زبان میں محفوظ ہیں جس میں وہ دی گئی تھیں۔ اب یہ ہماری طرف سے بڑی نادانی ہوگی کہ ہم اس نعمت کی قدر نہ کریں اور اپنے مذہب کا مدار بھی ترجموں ہی پر رکھنے کا دروازہ کھول دیں۔ سب سے بڑی طاقت جو ہمیں قرآن اور تعلیم پیغمبر سے وابستہ رکھتی ہے، یہی نماز ہے جسے ہم روزانہ پانچ وقت پڑھتے ہیں۔ اس کی زبان بدل دینے کے بعد مشکل ہی سے اپنے دین کے اصل سرچشموں سے ہمارا رشتہ قائم رہ سکے گا۔

ایک مذہب کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ چیز بھی نہایت ضروری ہے کہ اس کی عبادات اپنی اصل شکل پر قائم رہیں اور لوگ ان کے اندر اپنے حسبِ منشا رد و بدل کر لینے میں آزاد نہ ہوں۔ مذہب کا سب سے اہم حصہ اس کی عبادات ہوتی ہیں۔ انھی کے اتباع اور احترام اور التزام سے بقیہ تعلیماتِ دین کو قوت نفاذ حاصل ہوتی ہے۔ اور خود ان عبادات کو جو چیز پیروانِ مذہب کے لیے مقدس و محترم اور واجب الاتباع بناتی ہے وہ یہ یقین ہے کہ ان کا ہر جز و اور ہر لفظ اُس اقتدارِ اعلیٰ کا مقرر کردہ ہے جس پر وہ ایمان لائے ہیں۔ یہ یقین ایسی صورت میں ختم ہو جائے گا جب کہ عبادت کی شکلیں اور ان کے الفاظ مقرر کرنے میں لوگوں کی اپنی رائے اور مرضی کا دخل شروع ہو جائے گا، اور اس کے متزلزل ہوتے ہی پورے دین کے مسخ ہونے اور اس کے احکام کی پیروی سے لوگوں کے آزاد ہونے کا راستہ کھل جائے گا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تیسری اہم بات یہ ہے کہ تمام دنیا میں ہر قوم اور ہر ملک کے لیے اور ہر زبان بولنے والوں کے لیے اذان اور نماز کی ایک ہی زبان ہونا وہ عظیم الشان قوت رابطہ ہے جو دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک ملت اور ایک عالم گیر برداری بناتی ہے۔ آپ خواہ اس کرۂ زمین کے کسی گوشے میں چلے جائیں اذان کی آواز سنتے ہی محسوس کرلیں گے کہ یہاں آپ کی ملت کا کوئی شخص یا گروہ موجود ہے اور وہ نماز کے لیے بلا رہا ہے، نماز کے لیے آپ جہاں بھی جائیں گے وہی ایک جانی پہچانی آواز سنیں گے خواہ آپ لندن میں ہوں یا نائیجریا میں یا انڈونیشیا میں، اپنے ساتھی مسلمانوں کی زبان کا ایک لفظ بھی چاہے آپ نہ جانتے ہوں، مگر نماز میں نہ آپ ان کے لیے اجنبی ہوں گے نہ وہ آپ کے لیے۔ اس کے بجائے اگر نماز ہر ایک اپنی مادری زبان میں پڑھنے لگے اور اذان بھی ہر جگہ مقامی زبان ہی میں دی جانے لگے تو یہ عالم گیر برادری بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ براعظم ہندو پاک میں تین سو سے زائد زبانیں ہیں۔ صرف اسی سرزمین میں ایک مسلم ملت کے اتنے ہی ٹکڑے ہو جائیں گے جتنی یہاں زبانیں ہیں، اور ایک مسلمان اپنے علاقے سے باہر نکل کر نہ اذان کو پہچان سکے گا، نہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھ سکے گا۔ یہی کیفیت دنیا کے دوسرے خطوں میں پیش آئے گی اور پھر حج کے موقع پر تو شاید منارہ بابل کی سی حالت رونما ہو۔ یہ دراصل مسلمانوں میں اسی (nationalisation of the church) کی ابتدا ہوگی جس میں مسیحی دنیا مبتلا ہو کر [باہم] نبرد آزما قومیتوں میں بٹ گئی ہے۔ کیا آپ کو اس نعمت کا احساس نہیں ہے کہ قوم پرستی، نسل پرستی، رنگ پرستی، اور زبان پرستی سے پارہ پارہ ہو جانے والی انسانیت کے لیے اسلام نے عالم گیر وحدت کا یہ کتنا بڑا ذریعہ پیدا کیا ہے جو دنیا بھر کے لیے عربی اذان، عربی نماز، عربی کلمہ اور عربی زبان کی چند معروف اور مشترک مذہبی اصطلاحات کی شکل میں آپ کو نظر آ رہا ہے؟ اسی 'سرکاری زبان' کی بدولت ہی تو مسلمان ہر جگہ مسلمان کو پہچانتا اور اس کے ساتھ اس طرح مل جاتا ہے جیسے ازل سے ان دونوں کی روحوں میں کوئی قریبی رشتہ ہو۔

جہاں تک نماز کو سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت کا تعلق ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ ضرورت اس بڑے نقصان کو، جس کا اوپر ذکر کر چکا ہوں، انگیز کیے بغیر بھی پوری کی جا سکتی ہے، نماز کے لیے قرآن کی چند سورتیں کافی ہیں، اور قرآن کے سوا باقی تمام اذکار جو نماز میں پڑھے جاتے ہیں صرف چند فقروں پر مشتمل ہیں۔ ان کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ بآسانی ذہن نشین کیا جا سکتا ہے، اور اس طرح وہ ضرورت پوری ہو جاتی ہے جسے آپ بجا طور پر روحانی قدر سے تعبیر کرتے ہیں۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۲۷۰-۲۷۸)

امام ابوحنیفہؒ اور غیر عربی میں نماز کی اجازت

امام ابوحنیفہؒ نے صرف اس وقت تک غیر عرب لوگوں کو اپنی زبان میں نماز ادا کرنے کی اجازت دی تھی جب تک وہ عربی زبان میں نماز یاد کرنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ لیکن اس کو یہ معنی پہنانا کہ امام اعظمؒ کے مسلک کی رو سے تمام غیر عرب مسلمانوں کے لیے اپنی اپنی زبانوں میں نماز پڑھنا جائز ہے، امام اعظم پر سراسر تہمت ہے۔

(مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، دوم، نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۳۴۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک غلط استدلال اور اس کا جواب

نماز کی زبان کے متعلق آج کل عام طور پر اسی آیت سے استدلال کیا جاتا ہے جس کا حوالہ سوال میں دیا گیا ہے یعنی لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (النساء ۴: ۴۳) نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تاوقتیکہ تم یہ نہ جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

لیکن درحقیقت اس آیت سے استدلال درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حَتّٰى تَعْلَمُوْا فرمایا ہے، حَتّٰى تَفْقَهُوْا یا حَتّٰى تَفْهَمُوْا نہیں فرمایا۔ علم اور فقہ وفہم میں جو باریک فرق ہے اس کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ دوران نماز میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے کے معنی ومفہوم کو سمجھنا اور ہر لفظ کے معنی کی طرف ملتفت رہنا ضروری ہے، اور جب تک یہ فہم اور التفات حاصل نہ ہو، نماز صحیح نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ بداہتاً غلط ہے۔ اگر ایک عربی نہ جاننے والے کی نماز محض اس وجہ سے صحیح نہیں ہوسکتی کہ وہ نماز میں جو کچھ پڑھتا ہے اسے نہیں سمجھتا، تو ایک عربی دان کی نماز بھی ایسی حالت میں درست نہ ہونی چاہیے جبکہ وہ سمجھ سمجھ کر نہ پڑھ رہا ہو، اول سے لے کر آخر تک پوری نماز میں ایک ایک لفظ کے معنی کی طرف ملتفت نہ ہو۔ ایسی کڑی شرط کے ساتھ تو شاید مشکل ہی سے کوئی شخص روزانہ پانچوں وقت کی نمازیں صحیح ادا کرسکتا ہے۔ زندگی میں انسان پر ہر طرح کے حالات گزرتے ہیں۔ کبھی رنجیدہ ہوتا ہے، کبھی متفکر ہوتا ہے، کبھی کسی کام میں اس کا ذہن مشغول ہوتا ہے، کبھی غیر محسوس طور پر خیالات اور وسوسے اس کے ذہن میں داخل ہوجاتے ہیں اور کافی دیر تک اس کو یہ شعور بھی نہیں ہوتا کہ میرا ذہن کہیں بھٹک گیا ہے۔ اگر نماز کے لیے یہ شرط ہو کہ ان سب دماغی وقلبی کیفیات سے بالکل خالی ہوکر انسان پورے شعور اور التفات کے ساتھ کھڑا ہو تو نماز ادا کرنا ہی مشکل ہوجائے گا۔

یہ وہ سختیاں ہیں جو انسان خود اپنی عقل سے اپنے لیے پیدا کرتا ہے۔ شارع نے اس پر ایسی سختی نہیں کی، کیونکہ وہ اس کی فطری کمزوریوں کو خوب جانتا ہے۔ اُس نے سمجھ اور التفات اور استغراق اور خشوع وخضوع کو نماز کا کمال اور اس کا حسن تو ضرور قرار دیا ہے، اور اس کی خواہش یہی ہے کہ انسان کی نماز ایسی ہی کامل اور حسین ہو، لیکن اس نے ان چیزوں کو شرطِ نماز قرار نہیں دیا کہ بغیر ان کے نماز درست ہی نہ ہو۔

آیت کا مفہوم

اب ذرا آیت کے الفاظ پر پھر غور کیجیے۔ اگر سمجھنا اور معانی کی طرف ملتفت ہونا ہی صحتِ نماز کے لیے ضروری تھا اور اسی بنا پر حالتِ سکر میں نماز سے دور رہنے کا حکم دیا گیا، تو پھر سکر ہی میں کون سی خصوصیت تھی؟ یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ جب تم متفکر ہو تو نماز سے دور رہو، جب تمھیں رنج یا پریشانی یا کسی اور قسم کی ذہنی مشغولیت لاحق ہو تب بھی نماز کے پاس نہ آؤ۔ جب تمھیں محسوس ہو کہ دورانِ نماز میں تمھارے خیالات کسی اور طرف بھٹک گئے ہیں تب بھی نماز توڑ دو اور پھر سے شروع کرو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان میں سے کوئی قید بھی نہیں لگائی بلکہ صرف حالتِ سُکر میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس حالت میں تم کو علم نہیں ہوتا کہ کیا کہہ رہے ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ سُکر میں کسی اور قسم کی بے خبری ہوتی ہے جو عدمِ فہم اور عدمِ التفات سے مختلف ہے۔ اس حالت میں انسان کو یہ بھی شعور نہیں ہوتا کہ وہ عبادت کے لیے کھڑا ہو رہا ہے یا کسی اور کام کے لیے، قرآن پڑھ رہا ہے یا کچھ اور، قبلہ رخ بھی ہے یا نہیں۔ اس پر کچھ ایسی مدہوشی طاری ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپے میں نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے قرآن پڑھتے پڑھتے کوئی شعر گانے لگے۔ یا خدا کا ذکر کرتے کرتے کچھ اول فول بک جائے۔ یا قبلہ رخ کھڑے کھڑے کسی دوسری طرف ڈھلک پڑے۔ یا نماز پڑھتے پڑھتے بھول جائے کہ نماز پڑھ رہا ہوں اور ادھوری نماز چھوڑ کر کسی سے باتیں کرنے لگے۔ یا مصلّے پر سے کہیں چل کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا مقصد حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ سے دراصل ایسی ہی بے شعوری کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جب تم اپنی حماقت سے اپنے اوپر ایسی حالت طاری کرلو جس میں تم کو اپنی زبان اور اپنے دل و دماغ پر قابو نہ رہتا ہو تو ہمارے دربار حاضر ہونے کی جرأت نہ کرو۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آیت مذکورۃ الصدر کا کوئی تعلق نماز کی زبان کے مسئلے سے نہیں ہے اور اس سے یہ استدلال کرنا درست نہیں کہ نماز اُس زبان میں پڑھنا ضروری ہے جسے مصلّی اچھی طرح سمجھتا ہو۔

ائمہ مجتہدین کے اختلافات

اب یہ سوال باقی رہ گیا ہے کہ آیا نماز کا عربی زبان میں ہونا ضروری ہے؟ اور کیا غیر عربی میں نماز ناجائز ہے؟ اس سوال کا حل اپنے طریق پر عرض کرنے سے پہلے ہم ان اختلافات کو بیان کیے دیتے ہیں جو اس باب میں ائمہ مجتہدین کے درمیان ہوئے ہیں، تاکہ مسئلے کی صحیح شرعی حیثیت کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

□ **امام ابوحنیفہؒ کا مذہب:** امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ فارسی میں (اور فارسی کی کچھ خصوصیت نہیں ہے، ہر زبان میں)[1] نماز پڑھنا یا خدا کا نام لے کر ذبح کرنا، یا اذان دینا (بشرطیکہ وہ غیر عربی اذان معروف ہو اور اس کو سُن کر لوگ جان لیں کہ یہ اذان ہے) جائز ہے خواہ ایسا کرنے والا عربی پڑھنے پر قادر ہو یا نہ ہو۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ○ (الشعراء ۲۶:۱۹۶) وہ پچھلی کتابوں میں بھی ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن اپنے موجودہ نظم کے ساتھ پچھلی کتابوں میں نہ تھا۔ پس لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ان کتابوں میں اپنے معنی کے اعتبار سے تھا۔ اور جب وہ معنوی ہونے کے باوجود 'قرآن' ہی تھا تو یہ ماننے میں کیا قباحت ہے کہ قرآن کا فارسی ترجمہ بھی معناً قرآن ہے اور نماز میں اس کا پڑھنا جائز ہے۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۴۴) اگر ہم اس کو عجمی قرآن بناتے۔

۱- ابوسعید البردعی نے امام صاحب کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ فارسی کے سوا کسی دوسری زبان میں پڑھنا درست نہیں۔ لیکن کرخی نے لکھا ہے کہ امام اعظم کا صحیح مسلک یہ ہے کہ ہر زبان میں پڑھنا جائز ہے۔ صاحب ہدایہ نے بھی اس کو صحیح قرار دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: وَيَجُوْزُ بِاَيِّ لِسَانٍ كَانَ سِوَى الْفَارِسِيَّةِ هُوَ الصَّحِيْحُ۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس سے معلوم ہوا کہ اگر عجمی زبان میں بھی یہ معنی ادا کیے جاتے تب بھی وہ قرآن ہی ہوتا۔ مزید برآں روایات میں آیا ہے کہ ایران کے نو مسلموں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے درخواست کی تھی کہ سورۂ فاتحہ ہم کو فارسی میں لکھ دیجیے۔ چنانچہ انھوں نے لکھ دی اور وہ اس کو نمازوں میں پڑھتے رہے یہاں تک کہ جب ان کی زبانیں نرم ہوگئیں اور وہ عربی پڑھنے پر قادر ہو گئے تو انھوں نے عربی میں پڑھنی شروع کر دی۔ ان دلائل کی بنا پر امام صاحب کی رائے یہ ہے کہ اگر غیر عربی میں نماز پڑھی جائے تو ادا ہو جائے گی۔ مگر وہ اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں، کیونکہ یہ سنت متوارثہ کے خلاف ہے۔ بلکہ ابوبکر رازی نے تو لکھا ہے کہ امام صاحب نے آخر میں اپنی اس رائے سے بھی رجوع کر لیا تھا اور امام ابو یوسف اور امام محمد کی رائے قبول کر لی تھی۔

□ **صاحبین کا مذہب:** امام ابو یوسف اور امام محمد کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عربی پڑھنے پر قدرت رکھتا ہو تو غیر عربی میں نماز پڑھنا درست نہیں۔ ہاں اگر وہ عربی کا تلفظ کرنے پر قادر ہی نہ ہو تو غیر عربی میں پڑھ سکتا ہے۔ اُن کا استدلال یہ ہے کہ نماز میں قرآن پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے: فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ[1] (المزمل ۷۳: ۲۰) اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔

اور ظاہر ہے کہ قرآن کے ترجمہ پر 'قرآن' کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لہٰذا جس نماز میں قرآن کے بجائے اس کا ترجمہ پڑھا جائے وہ نماز ہی نہ ہوگی، مگر جو شخص عربی کے 'تلفظ' پر قادر نہ ہو اس کے لیے مجبوری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے۔ ایسے شخص کی نماز بالکل اُسی طرح ہو جائے گی جس طرح اُس شخص کی نماز جو رکوع و سجود سے عاجز ہو اور اشارے سے ادا کرے۔

□ **امام شافعیؒ کا مذہب:** امام شافعیؒ کا ایک قول وہی ہے جو صاحبین کا اوپر مذکور ہوا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جو شخص عربی تلفظ پر قادر نہ ہو وہ بغیر قراءت کے نماز ادا کرے۔ اگر اس نے دوسری زبان میں ترجمہ پڑھا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ کیونکہ کلام اللہ کا ترجمہ کلام اللہ نہیں، کلام الناس ہے۔ اللہ کا کلام صرف عربی قرآن ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا[1]۔ (یوسف ۱۲: ۲) ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں۔

مسئلے کی پوری تحقیق

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ سلف صالح کے پیشِ نظر سوال کی نوعیت صرف یہ تھی کہ اگر نماز غیر عربی میں پڑھی جائے تو آیا ہو بھی جائے گی یا نہیں؟ کسی نے کہا کہ ہو گی مگر مکروہ ہو گی۔ کسی نے کہا سرے سے ہو گی ہی نہیں۔ کسی نے کہا کہ عاجز کی نماز ہو جائے گی، بالکل اُسی طرح جیسے معذور کی نماز اشارے سے ہو جاتی ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے 'مجتہدین' کے سامنے سوال کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ وہ اس سوال پر اس حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں کہ غیر عربی دان کی نماز عربی میں ادا ہوتی

۱۔ اس بحث کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب المبسوط للسرخسی جز اوّل صفحہ ۳۷، اور فتح القدیر و شرح العنایہ علی الہدایہ جز اول صفحہ ۱۹۹-۲۰۱۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بھی ہے یا نہیں؟ اور غیر عرب کے لیے عربی میں نماز اولیٰ ہے یا اپنی مادری زبان میں؟ اب چونکہ صورت مسئلہ بدل گئی ہے، لہٰذا جواب مسئلہ کی صورت بھی بدل جانی چاہیے۔

مصالح شرعیہ

نماز کے لیے کون سی زبان انسب اور اولیٰ ہے؟ اس سوال کے صحیح حل کا انحصار ایک دوسرے سوال کے صحیح حل پر ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں نماز کی حیثیت کیا ہے؟ اور اس سے کون کون سے شرعی مصالح وابستہ ہیں؟

اس سے پہلے ہم اس حقیقت کی طرف بارہا اشارہ کر چکے ہیں کہ اسلام کا اصل مقصد محض فرد کی تہذیب نفس اور اس کا تزکیہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ افراد کو فرداً فرداً پاک اور متقی بنانے کے بعد انھیں باہم جوڑ کر ایک ایسی اعلیٰ درجے کی صالح جماعت بنانا چاہتا ہے جو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت کے فرائض ادا کرے۔ اس غرض کے لیے اس نے تمام عبادات اس طریقے پر فرض کی ہیں کہ افراد میں رجوع الی اللہ کے ذریعے سے تقویٰ کی روح پھونکنے کے ساتھ ساتھ ان کو صالحین کی ایک جماعت بھی بناتی چلی جائیں۔ ان عبادات میں سب سے اہم عبادت نماز ہے جو تہذیب نفس بھی کرتی ہے، قرآنی ہدایات کی اشاعت بھی کرتی ہے، قرآن کی حفاظت بھی کرتی ہے اور مسلمانوں کو ایک جماعت بھی بناتی ہے۔ نماز کی ان مختلف حیثیات اور اسلام کے ان متعدد مقاصد پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز محض ایک بندے کی اپنے خدا سے مناجات ہی نہیں ہے، اور محض ایک ایک فرد میں الگ الگ روحِ تقویٰ پھونکنے کا ذریعہ ہی نہیں ہے، بلکہ وہ اسلام کا قِوام بھی ہے اور انفرادی مصلحت سے عظیم تر مصالح بھی اس سے وابستہ ہیں۔

اب دیکھیے کہ جہاں تک انفرادی مصالح کا تعلق ہے ان کے لحاظ سے ضروری ہے کہ انسان نماز میں جو کچھ پڑھے، اس کو سمجھے بھی تاکہ تہذیب نفس اور تزکیہ روح کا مقصد پوری طرح حاصل ہو سکے۔ اس غرض کے لیے نماز کا اُس زبان میں ہونا مفید ہوگا جسے مصلّی جانتا ہو اور سمجھتا ہو۔ لیکن انفرادی مصالح سے اہم تر جو مصالح شارع کے پیش نظر ہیں ان کو یہ چیز نقصان پہنچا دے گی۔

اولاً قرآن کی حفاظت کا عظیم الشان مقصد اس سے بڑی حد تک فوت ہو جائے گا۔ جب قرآن کے ترجمے کو بھی لوگ قرآن سمجھنے لگیں گے اور یہ خیال عام ہو جائے گا کہ عبادت اور تلاوت کے مقاصد کے لیے ترجمہ اصل کتاب کا قائم مقام ہے تو اصل کتاب سے اعتنا کم ہو جائے گا، اس کو یاد کرنے کا ذوق بھی باقی نہ رہے گا، اور ترجمہ ہی کو عملاً بطور اصل لے لیا جائے گا۔

ثانیاً اصل کتاب اللہ سے بے اعتنائی اور تراجم کی طرف روز افزوں التفات کا نتیجہ دین کی خرابی کے سوا کچھ نہ ہوگا، کیونکہ ناقص اور باہم مختلف متعارض ترجموں کے الگ الگ جماعتوں اور الگ الگ قوموں میں معتبر بن جانے سے اسلام کا انجام بھی وہی ہوگا جو مسیحیت اور یہودیت کا ہوا۔

ثالثاً اس سے امت کی وحدت کا خاتمہ ہو جائے گا اور اسلام میں لسانی قومیتوں کی بنیاد پڑ جائے گی۔ ہر زبان کے بولنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

والوں کی نمازیں اور جماعتیں الگ الگ ہوں گی۔ نہ ایرانی عرب کے پیچھے نماز پڑھے گا اور نہ ترک ہندیوں کی جماعت میں شریک ہوگا۔ ایک ہی جگہ بنگالیوں اور مدراسیوں اور پنجابیوں کی جماعتیں لسانی قومیت کی بنیاد پر الگ الگ قائم ہوں گی اور نماز ٹکڑے ہوتے ہی امت کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

ان عظیم تر اجتماعی نقصانات سے بچنے کے لیے ناگزیر ہے کہ نماز کے لیے ایک ہی بین الملی زبان ہو اور وہ وہی زبان ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ رہا انفرادی نقصان تو اس کو دور کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ نماز کا بیشتر حصہ وہ ہے جس کے لیے ایک ہی عبارت مقرر ہے۔ تکبیر، تسبیح، تسمیہ، تعوذ، سورۂ فاتحہ، تشہد، ان سب کا ترجمہ زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹوں میں با سانی ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ عام طور پر جو سورتیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں وہ بھی دس بارہ سے زیادہ نہیں ہیں اور بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ان کے ترجمے یاد کر لینا بھی مشکل نہیں۔ اس کے بعد قرآن کریم کی لمبی لمبی سورتیں باقی رہ جاتی ہیں جو کبھی کبھار سورۂ فاتحہ کے ساتھ ملائی جاتی ہیں۔ سو اگر بعض یا بیشتر مصلی ان کو نہ سمجھیں تو یہ ایسی کون سی قباحت ہے جس سے بچنے کے لیے تمام اجتماعی مصالح کی قربانی گوارا کر لی جائے۔

دلائل شرعیہ

مصالح اور حکمتوں سے قطع نظر کر کے جب ہم منصوص احکام پر غور کرتے ہیں تو ہمیں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا مسلک سب سے زیادہ صحیح نظر آتا ہے اور قرین قیاس یہی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے بھی آخر کار اسی کی طرف رجوع فرمایا ہوگا۔

۱- قرآن مجید میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ نماز میں قرآن کی تلاوت کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ [(المزمل ۷۳: ۱-۴) اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے، رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔]

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ .... فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ [(المزمل ۷۳: ۲۰) تمھارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو اور تمھارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ یہ عمل کرتا ہے.......... لہٰذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔]

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ [(بنی اسرائیل ۱۷: ۷۸) نماز قائم کرو زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے۔]

یہ تمام آیات نماز میں تلاوت قرآن کا حکم دیتی ہیں اور ان میں 'القرآن' (الف لام تعریفی کے ساتھ) پڑھنے کا حکم دیا گیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے جس کا اطلاق ترجمۂ قرآن پر نہ لغوی حیثیت سے ہوسکتا ہے نہ معنوی حیثیت سے۔

۲۔ قرآن میں متعدد مقامات پر تصریح ہے کہ 'قرآن' صرف عربی قرآن کا نام ہے اور کلام اللہ وہی ہے جو عربی الفاظ کے ساتھ خدا نے نازل فرمایا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے جو معنی بیان کیے جائیں گے، خواہ وہ عربی زبان ہی میں کیوں نہ بیان ہوں، وہ نہ صرف یہ کہ قرآن نہ ہوں گے بلکہ اس کے مثل بھی نہ ہوں گے لہٰذا وہ کبھی قرآن کے قائم مقام ہو ہی نہیں سکتے۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا۔ [(طٰہٰ ۲۰:۱۱۳) اسی طرح ہم نے اسے قرآن عربی بنا کر نازل کیا ہے۔]

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا۔ [(یوسف ۱۲:۲) ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں۔]

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ۔ [(الزمر ۳۹:۲۸) ایسا قرآن جو عربی زبان میں ہے، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے۔]

تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا۔ [(حٰم السجدۃ ۴۱:۲-۳) یہ خدائے رحمٰن ورحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔]

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ۔ [(مریم ۱۹:۹۷) اس کلام کو ہم نے آسان کر کے تمھاری زبان میں نازل کیا ہے۔]

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ۔ [(بنی اسرائیل ۱۷:۸۸) کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔]

۳۔ یہ تصریح بھی قرآن ہی میں ہے کہ تحریف سے حفاظت کا وعدہ صرف اُس کتاب سے متعلق ہے جو خدا کے پاس سے نازل ہوئی ہے۔ انسانوں کے کیے ہوئے تراجم سے متعلق نہیں ہے۔ ان میں ہر طرح سے تحریف کا دروازہ کھلا ہوا ہے، خواہ وہ ارادی تحریف ہو یا مترجمین کے عجز اور ان کے عدمِ فہم اور اُن کی قلت علم کی بنا پر ہو۔ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ [(حٰم السجدۃ ۴۱:۴۱-۴۲) حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے، باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے، یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ چیز ہے۔]

لہٰذا نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھنے والا یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ معنیٔ قرآن کی صحیح تلاوت کر رہا ہے۔

۴۔ رجوع الی اللہ اور انابت اور خشیت جو نماز کی اصل جان ہے، اس کو پیدا کرنے کی خاصیت جیسی قرآنِ منزل من اللہ میں ہے ویسی کسی اور کلام میں نہ ہو سکتی ہے نہ پائی جا سکتی ہے۔ اس پر بھی خود قرآن شاہد ہے: اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ [(الزمر ۳۹:۲۳) اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزا ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔ اسے سن کر اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

والے ہیں، اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔]

ایسے صریح اور محکم شرعی دلائل کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے کہ جو نماز ترجمہ قرآن پڑھ کر ادا کی جائے وہ درست ہو جاتی ہے۔ مکروہ ہونا کیسا، ہم تو کہتے ہیں کہ وہ کسی درجے میں بھی ادائے فرض کے لیے کافی نہیں۔ البتہ جیسا کہ صاحبین نے فرمایا ہے، اُس شخص کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے جو عربی تلفظ پر قادر ہی نہ ہو۔ اس کے حق میں یہی فتویٰ مناسب ہے کہ جب تک وہ عربی میں نماز پڑھنے کے قابل نہ ہو جائے، اس کا فریضہ غیر عربی کے ساتھ ادا ہو جائے گا۔ اس لیے کہ وہ رخصت اضطرار کے تحت آ جاتا ہے۔

(تفہیمات، دوم، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۳۹۲-۴۰۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سیزدہم

متفرقات

نماز میں جدید آلات کا استعمال

لاؤڈ سپیکر

[پنجاب کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان دریافت کرتے ہیں کہ نماز جمعہ میں آلۂ مکبر الصوت (لاؤڈ سپیکر) کے استعمال کا شرعی حکم کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ] .... یہ اُن اسباب عالم میں سے ایک سبب ہے جنھیں خدا نے ہمارے لیے پیدا کیا ہے۔ اس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ قدرتی طور پر جو آواز نکلتی ہے، یہ آلہ اسی آواز کو لے کر زیادہ بلند کر دیتا ہے۔ چونکہ اس پر حال ہی میں ہم کو دسترس حاصل ہوئی ہے اس لیے اس کے متعلق کوئی حکم سنت اور اجتہادات متقدمین میں تلاش کرنا اصلاً غلط ہے۔ البتہ شرع نے جو اصول ہم کو کسی چیز کی اباحت یا حرمت معلوم کرنے کے لیے دیے ہیں ان کے لحاظ سے اس کے مطلقاً مباح ہونے میں کسی شک کی گنجایش نہیں۔ رہے استعمالات، تو باطل کی آواز بلند کرنے اور فواحش کا بول بالا کرنے میں اس کا استعمال حرام ہے۔ جائز آوازوں کے بلند کرنے میں اس کا استعمال جائز ہے۔ اور خدا کا نام بلند کرنے میں خدا ہی کی پیدا کی ہوئی اس طاقت سے کام لینا بالیقین مستحسن ہے۔ یہ بالکل ایک عجیب بات ہوگی کہ کفار تو خدا کے مسخر کیے ہوئے اس خادم سے مدد لے کر باطل کا آوازہ بلند کریں، اور ہم حق کا آوازہ بلند کرنے کے لیے اس سے خدمت لینے میں تامل کرتے رہیں۔

اب صرف ایک شک باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ نماز میں امام کے سوا کسی اور کی آواز پر مقتدیوں کا حرکت کرنا مفسدِ صلوٰۃ ہے، لہٰذا اگر لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر مقتدی رکوع وسجود کریں گے تو ان کی نماز نہ ہوگی۔ لیکن یہ شک متعدد حیثیات سے غلط ہے۔

اوّلاً، لاؤڈ اسپیکر سے جو آواز نکلتی ہے وہ غیر امام کی آواز نہیں ہے بلکہ بعینہٖ وہی آواز ہے جو امام کے منہ سے نکلتی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ بجلی کی طاقت سے وہ زیادہ بلند ہو جاتی ہے، اور اس لحاظ سے اس کی حیثیت قریب قریب اس گونج کی سی ہے جو مسجد کی محراب سے امام کی آواز پر بلند ہوتی ہے۔

ثانیاً، اصولِ فقہ کا متفقہ مسئلہ ہے کہ التابع تابع۔ یعنی جو حکم متبوع کا ہے وہی تابع کا ہے۔ اسی قاعدے کی بنا پر بڑی جماعتوں میں جو مکبر کھڑے کیے جاتے ہیں ان کی آواز پر رکوع وسجود اور قیام کرنا مقتدیوں کے لیے جائز ہے، کیونکہ اگرچہ وہ غیر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

امام ہیں، مگر امام کے تابع ہیں، اس لیے ان کی آواز کا حکم امام کی آواز کا حکم ہے۔ پس اگر بالفرض لاؤڈ اسپیکر کی آواز غیر امام کی آواز بھی ہو تب بھی وہ تابع امام ہونے کی حیثیت سے اُس مقتدی کے مانند ہے جو صفوں کے درمیان تکبیر بلند کرنے کے لیے کھڑا کیا جاتا ہے۔ بلکہ جب ہم زیادہ غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تابع ہونے میں یہ آلہ مقتدی سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ مقتدی تو خود بھی آواز نکالنے پر قادر ہوتا ہے، حتیٰ کہ اگر جماعت میں کوئی منافق موجود ہو تو وہ امام کے خلاف تکبیریں بلند کر کے ہزاروں آدمیوں کی نمازیں خراب کر سکتا ہے۔ لیکن لاؤڈ اسپیکر اس قدر کامل طور پر امام کا تابع ہے کہ جب تک امام نہ بولے گا وہ بھی نہ بولے گا، جو آواز امام کی زبان سے نکلے گی ٹھیک وہی آواز بلا ادنیٰ تغیر اس سے بھی بلند ہوگی، حتیٰ کہ امام کا لہجہ اور اس کا تلفظ تک جوں کا توں منتقل ہوگا، اور جو شخص امام کی آواز پہچانتا ہو وہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز سن کر پہچان لے گا کہ یہ امام ہی کی آواز ہے۔ اتنے کمال درجے کے تابع کا حکم متبوع کے حکم سے کیسے مختلف ہو سکتا ہے؟ اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مکبر نماز میں شریک ہوتا ہے، لیکن آلۂ مکبّر الصوت شریک نماز نہیں ہوتا تو اسے ہم صرف یہ آیت یاد دلائیں گے کہ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۔ [(بنی اسرائیل ۱۷: ۴۴) کوئی چیز ایسی نہیں جو اُس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔]

قرآن کی رو سے تو مسلمان جب نماز پڑھتا ہے تو وہ تنہا نہیں پڑھتا بلکہ ساری کائنات اس کے ساتھ شریک نماز ہوتی ہے، اگرچہ ناواقفانِ راز اُن غیر ناطق اشیا کی نماز کو سمجھ نہیں سکتے۔

ثالثاً، اگر کوئی شخص اس جگہ آیت مذکورۃ الصدر کے اطلاق کو تسلیم نہ کرے اور آلۂ مکبّر الصوت کو خارج از صلوٰۃ قرار دے کر اس کو تابع امام نہ مانے تو ہم کہیں گے کہ نماز میں غیر امام کی آواز پر حرکت کرنا مطلقاً مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر:

۱- اگر آدمی نماز میں ہو اور کوئی سلام کرے تو اشارے سے جواب دینا مفسدِ صلوٰۃ نہیں۔ ترمذی میں حضرت بلالؓ سے اور نسائی میں حضرت صہیبؓ سے مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حالتِ نماز میں سلام کیا جاتا تو آپؐ ہاتھ کے اشارے سے جواب دیتے تھے۔

۲- نماز میں اگر کسی شخص سے کسی ضروری بات کے متعلق سوال کیا جائے تو اشارے سے جواب دینا بھی مفسدِ صلوٰۃ نہیں۔ چنانچہ خلاصہ میں ہے کہ مصلّی کو سلام کیا جائے اور وہ ہاتھ یا سر کے اشارے سے جواب دے، یا اسے کسی چیز کی خبر دی جائے اور وہ سر کی حرکت سے ہاں یا نہیں کا اشارہ کر دے، یا اس سے پوچھا جائے کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں اور وہ انگلیوں کے اشارے سے بتا دے تو یہ مفسدِ صلوٰۃ نہیں۔ (فتح القدیر، جلد اوّل، ص ۲۹۲)

۳- اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور کوئی اسے پکارے اور وہ اس کو یہ بتانے کے لیے کہ میں نماز میں ہوں زور سے لا الٰہ الا اللّٰہ کہہ دے تو اس سے نماز میں کوئی خرابی نہیں آتی۔ (ہدایہ، باب ما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیہا)

۴- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جب کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تو نماز مختصر کر دیتے تھے تاکہ بچے کی ماں اگر شریکِ جماعت ہو تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ پریشان نہ ہونے پائے۔ (بخاری اور مسلم میں اس مضمون کی متعدد روایتیں ہیں)

۵۔حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض سخت ہوگیا تو آپؐ کے حکم سے حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھانے لگے۔ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض میں کمی محسوس فرمائی اور نماز میں شریک ہونے کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب آپؐ کے آنے کی آہٹ پائی تو پیچھے ہٹنے لگے۔ مگر آپؐ نے اشارے سے ان کو منع کیا۔ چنانچہ وہ اپنی جگہ کھڑے رہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بائیں جانب جا کر بیٹھ گئے۔ (متفق علیہ)

۶۔مسجدِ قبا میں لوگ نماز پڑھ رہے تھے کہ تحویلِ قبلہ کی منادی اُن کے کانوں میں پہنچی اور انھوں نے اسی حالت میں اپنا رُخ کعبہ کی طرف پھیر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل کو نہ صرف جائز رکھا بلکہ پسند فرمایا۔ اسی سے فقہا نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر کوئی شخص سمتِ قبلہ سے ناواقف ہو اور گمانِ غالب کی بنا پر کسی رُخ پر نماز پڑھ رہا ہو، پھر اسی حالت میں کوئی اسے قبلہ کی صحیح سمت بتادے، تو اسی وقت اس کو صحیح سمت کی طرف پھر جانا چاہیے۔ (ہدایہ، باب شروط الصلوٰۃ التی تتقدمہا)

اسی طرح کی اور بھی بکثرت مثالیں احادیث و آثار میں موجود ہیں اور ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر غیر مصلّی کے ذریعہ سے بھی مقتدیوں کو امام کے رکوع و سجود اور قیام و قعود کی اطلاع پہنچے، اور وہ ذریعہ قابلِ اعتماد ہو، تو اس کے مطابق حرکت کرنے سے نماز میں کوئی قباحت واقع نہیں ہوتی۔ قاطعِ صلوٰۃ جو چیز ہے وہ دراصل اس نوعیت کا فعل ہے جس میں آپ کو مشغول دیکھ کر ناواقف آدمی یہ گمان کرے کہ آپ نماز نہیں پڑھ رہے ہیں، یا پھر مصلّی اور غیر مصلّی کے درمیان ایسا معاملہ ہو جو مکالمہ اور تعلیم و تعلّم کی حد تک پہنچا ہوا ہو.......... جب لاؤڈ سپیکر کی آواز پر رکوع و سجود کرنا نہ فعلِ کثیر ہے، نہ تعلیم و تعلّم و مکالمہ کی تعریف میں آتا ہے، تو اس کے مفسدِ صلوٰۃ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور جبکہ نماز میں بہت سے ایسے افعال کو بھی جائز رکھا گیا ہے جن کا نفسِ نماز سے کوئی تعلق بھی نہیں، تو فقط اتنی سی بات کہ ایک آلہ کے ذریعہ سے امام کے الفاظ کی نقل سُن کر آدمی رکوع یا سجدے میں چلا جائے، کس طرح مفسدِ صلوٰۃ ہو سکتی ہے؟

یہ دلائل ہیں کہ جن کی بنا پر میں نماز میں لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو نہ صرف جائز بلکہ احسن سمجھتا ہوں اور میرا وجدان یہ گواہی دیتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یہ آلہ موجود ہوتا تو آپ یقیناً اس کو نماز اور اذان اور خطبے میں استعمال فرماتے، جس طرح آپ نے غزوہ خندق میں خندق کھودنے کا ایرانی طریقہ بلا تامّل اختیار فرمایا۔ تاہم اگر کوئی عالم دین میری اس رائے کو دلائل شرعیہ سے (نہ کہ غیر مقلدیت کے طعنوں سے) غلط ثابت فرمادیں تو مجھے اس سے رجوع کرنے میں بھی تامّل نہ ہوگا۔

اِنْ اَظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَ مَا اَنَا بِمُسْتَيْقِنٍ وَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اُخْطِئُ وَاُصِيْبُ، فَانْظُرُوْا فِیْ رَأْيِیْ فَكُلَّمَا وَافَقَ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ فَخُذُوْا بِهٖ وَكُلَّمَالَمْ يُوَافِقِ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ فَاتْرُكُوْهُ۔ [یہ میرا گمان ہے۔ مجھے اس پر پورا یقین نہیں ہے۔ میں ایک انسان ہوں، کبھی غلطی پر ہوتا ہوں کبھی حق پر۔ آپ میری رائے پر غور کریں، اگر وہ کتاب و سنت کے موافق ہو تو اُسے قبول کریں اور اُس کے موافق نہ ہو تو چھوڑ دیں]۔

((تفہیمات، دوم، دسمبر ۱۹۷۴ء، ص ۴۴۸، ۴۵۵-۴۶۱))

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مذکورۂ بالا بحث کو پڑھ کر ایک صاحب نے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مرحوم و مغفور کا، جو اس وقت بقیدِ حیات تھے، ایک فتویٰ بھیجا اور خواہش ظاہر کی کہ اس پر بھی اظہار رائے کیا جائے۔ فتویٰ حسب ذیل تھا:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں، کہ ایک مشین ایسی ایجاد ہوئی ہے کہ مقرر کی آواز کو بہت فاصلے تک اُسی طرح پہنچا دیتی ہے جس طرح پاس کے اشخاص کو پہنچتی ہے۔ پس کیا جائز ہے کہ ان مشینوں کے ذریعے سے خطیب کی آواز کو تمام سامعین تک پہنچا دیا جائے۔

جواب: اول ایک قاعدہ سمجھ لیا جاوے جو کہ عقلی بھی ہے اور نقلی بھی۔ اور فقہائے حنفیہ نے اس قاعدے پر بہت سے احکام کو متفرع کیا ہے۔ وہ یہ کہ جو مباح یا مندوب درجہ ضرورت و مقصودیت فی الشرع تک نہ پہنچا ہو، اور اس میں کوئی مَفسدہ باحتمال قریب محتمل ہو تو اس مباح یا مندوب کا ترک اور اس کا منع کرنا لازم ہے۔ عقلی ہونا تو اس کا ظاہر ہے اور قبولِ فقہا کے بعد اس کے ماخذِ نقلی کی نقل ضروری نہ تھی۔ مگر تبرعاً اس کو بھی نقل کرتا ہوں۔ سو اس کے نقلی ہونے کی تقریر یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ[1] (الانعام ۶:۱۰۸) [اور دشنام مت دو ان کو، جن کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، کیونکہ پھر وہ براہ جہل حد سے گزر کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے۔][1]

سَبِّ اٰلِهَۃٍ باطلہ [جھوٹے خداؤں پر تنقید کرنا] مباح تو ضرور ہی ہے اور بعض حالات میں مندوب بھی۔ مگر مقصود مستقل نہیں۔ کیونکہ اس کی غایت دوسرے طریق سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ یعنی حکمت و موعظت اور مجادلۂ حسنہ سے۔ اور اس میں مَفسدہ سبِّ مشرکین لِلالٰہ الحق کا ہے۔ اس لیے اس سے نہی فرما دی گئی ہے۔ اور اس قاعدے کی تمہید کے بعد جواب ظاہر، کہ تبلیغِ صوت، سامعینِ بعید تک شرعاً غیر ضروری ہے، کیونکہ بعیدین کو دوسرے غیر مخدوش ذریعے سے تبلیغ ممکن ہے، اور اس میں یہ مفسدہ محتمل کہ لوگ اس سے گنجایش سمجھ جاویں گے اس آلہ کو، لہو میں استعمال کرنے کی، یا دوسرے آلاتِ لہو کے استعمال کرنے کی۔ لہٰذا ترک اور منع لازم ہوگا۔ یہ تو اس وقت ہے جب خطیب سے مراد مطلق واعظ اور لکچرار ہو۔ اور اگر اس سے مراد خطیبِ جمعہ و عیدین کا ہے تو اس وقت تبلیغ صوت کا غیر ضروری ہونا اظہر ہے، اس لیے کہ خطبے میں حضور مقصود ہے نہ کہ سماعِ صوت، اور مفسدہ اقویٰ ہے، کیونکہ اس آلے کو مسجد میں داخل کرنا ہوگا جو کہ اس کے احترام کے خلاف ہے۔ نیز تشبُّہ ہے مجالسِ غیر مشروعہ کے ساتھ۔ اسی تشبُّہ کی بنا پر فقہا نے غرسِ اشجار فی المسجد کو منع فرمایا ہے اور تشبُّہ بالبیعہ والکنیسہ سے معلل کیا ہے۔ واللہ اعلم

اس کے جواب میں حسب ذیل مضمون لکھا گیا:

یہ ایک ایسے جلیل القدر عالم کا فتویٰ ہے جو اس وقت دنیائے اسلام کے ممتاز ترین علما کی صف اول میں ہیں۔ میرے علم کو ان کے علم سے وہ نسبت ہے جو ذرّے کو آفتاب سے ہوتی ہے۔ اگر اس نسبت کا لحاظ کروں تو مجھے نہ صرف یہ کہ اس پر کلام نہ کرنا چاہیے بلکہ اپنی تحقیق کو چھوڑ کر حضرت ممدوح کی تحقیق قبول کر لینی چاہیے۔ لیکن جب میں سلف کے طریق پر نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا

۱۔ اضافہ از بیان القرآن، مولانا اشرف علی تھانویؒ۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوں کہ وہاں من قال کو نہیں بلکہ ما قال کو دیکھنے کا قاعدہ جاری تھا۔ شاگرد اُستاد کی تحقیق کے مقابلے میں، اور چھوٹے بڑے کی رائے کے مقابلے میں اپنی رائے اور تحقیق بے تکلف پیش کیا کرتے تھے۔ نہ اس زعم کے ساتھ کہ بڑوں کے علم سے ان کا علم زیادہ یا ان کے برابر ہے، بلکہ یہ سمجھ کر کہ حق کی تلاش و تحقیق ہر طالب علم پر فرض ہے، اور اس تلاش و تحقیق میں اس کو شخصی عظمتوں سے خالی الذہن ہو کر نفس حقائق کو دیکھنا چاہیے۔ اُن کے نزدیک یہ ضروری نہ تھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کے برابر یا اس سے زیادہ علم رکھتا ہو تب ہی اس کے مقابلے میں اپنی تحقیق پیش کرے، ورنہ چپ رہے اور اپنی فکر و نظر کو معطل کر کے اس کی تحقیق کو مان لے۔ اگر یہ ذہنیت اس زمانے میں ہوتی تو امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے مقابلہ میں امام شافعی اور امام شافعی کے مقابلے میں امام احمد کوئی مذہب اختیار ہی نہ فرماتے (رحمہم اللہ)۔ یہ حضرات رشد و ہدایت کے امام تھے اور ان کا طریقہ ہر زمانے میں طالبانِ علم کے لیے بہترین نشانِ راہ ہے، اس لیے ان کی پیروی کرتے ہوئے میں بھی حضرت مولانا تھانوی کے مقابلے میں اپنی عملی بے مائگی کو جاننے کے باوجود اس فتوے پر کلام کر رہا ہوں۔

فتوے کی بنا جس قاعدے پر رکھی گئی ہے وہ یقیناً مسلّم ہے۔ صرف فقہائے حنفیہ ہی نے نہیں بلکہ دوسرے ائمۂ اسلام نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، اور ایک آیت ہی نہیں بلکہ کتاب و سنت کی متعدد تصریحات اس کا ماخذ ہیں۔ لیکن یہ امر محل نظر ہے کہ آیا اس خاص جزئیہ میں بھی یہ قاعدہ جاری ہو سکتا ہے یا نہیں۔

آلۂ مکبّر الصوت کو کسی حیثیت سے بھی آلۂ لہو [یعنی آلۂ موسیقی] نہیں کہا جا سکتا۔ آلۂ لہو کا اطلاق اصلاً تو اُس آلے پر ہوتا ہے جو لہو ہی کے لیے بنایا گیا ہو، اور اس کا کوئی دوسرا استعمال بجز لہو کے نہ ہو، مثلاً بانسری یا ہارمونیم۔ اور تبعاً اس کا اطلاق ایسے آلے پر بھی ہو سکتا ہے جو اگرچہ بجائے خود لہو کے لیے نہ بنایا گیا ہو، لیکن اس کا غالب استعمال لہو میں ہو۔ مثلاً گراموفون۔ مکبّر الصوت ان دونوں صنفوں میں سے کسی صنف میں داخل نہیں۔ اس کو صرف اس لیے بنایا گیا ہے کہ چھوٹی آواز کو بڑا کر دے اور دور دور تک پہنچائے۔ اس کا استعمال لہو اور غیر لہو دونوں میں ہوتا ہے، اور غیر لہو میں بہ نسبت لہو کے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے شیشے کا گلاس، اس میں شراب بھی پی جاتی ہے اور حلال مشروبات بھی۔ یا بجلی کا لیمپ اور برقی پنکھا کہ یہ چیزیں تھیٹروں اور رقص خانوں اور فحش کدوں میں بھی استعمال ہوتی ہیں اور پاک مجلسوں اور مباح اغراض میں بھی۔ اب اگر ناجائز استعمال کی وجہ سے ان چیزوں کو آلۂ لہو یا آلۂ منکر نہیں کہا جا سکتا، تو مکبّر الصوت کو بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر گلاس اور پنکھے اور لیمپ کے استعمال میں مجالسِ غیر مشروعہ سے تشبّہ نہیں ہے تو مکبر الصوت میں بھی نہیں ہے۔ اگر شیشے کا گلاس استعمال کرنے سے اس مفسدہ کا احتمال نہیں ہے کہ لوگ اس کو شراب نوشی میں استعمال کرنے کی گنجایش نکال لیں گے، اور اگر مسجدوں میں بجلی کی روشنی اور پنکھا لگانے سے یہ مفسدہ پیدا نہیں ہوتا کہ لوگوں کے لیے رقص خانوں میں جانے کی گنجایش نکل آئے گی، تو مکبر الصوت کے استعمال میں بھی ایسے کسی مفسدہ کا احتمال نہیں۔ جب برقی پنکھے اور روشنی کے قمقمے لگانا احترامِ مسجد کے خلاف نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مکبر الصوت لگانا اہانتِ مسجد کا موجب ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس میں شک نہیں کہ مکبر الصوت اس زمانے میں زیادہ تر معروف کے بجائے منکر کی خدمت کر رہا ہے۔ لیکن آج کون سی چیز ہے، جو منکر کی خدمت نہیں کر رہی ہے؟ قلم دوات سے لے کر چھاپے کی مشین، ریل، موٹر، ہوائی جہاز اور ریڈیو تک ہر چیز کا غالب استعمال آج فحشاء و منکر ہی کے لیے ہو رہا ہے۔ ہر چیز سے ظلم و عصیان کی خدمت لی جا رہی ہے۔ ہر آلہ اور ہر طاقت سے اُس تہذیب کو فروغ دیا جا رہا ہے، جس کی بنیاد نا خدا شناسی بلکہ خدا سے بغاوت پر رکھی گئی ہے۔ اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ خدا کی پیدا کی ہوئی طاقتوں کی دریافت کرنے اور ان سے خدمت لینے کا سارا کام آج وہ لوگ کر رہے ہیں جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں انھوں نے اسبابِ عالم کو قابو میں لانے اور ان سے معروف کی خدمت لینے کا کام چھوڑ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے پورا انسانی تمدن ناپاک ہو گیا ہے اور دنیا کی ہر چیز آلۂ منکر بن کر رہ گئی ہے۔

اب اگر ہم ایک ایک چیز کو اس بنا پر چھوڑتے چلے جائیں کہ فلاں چیز آلۂ منکر ہے اور فلاں چیز کو استعمال کرنے سے فاسقین و ظالمین کے ساتھ تشبّہ ہو جائے گا، تو ہمیں تمدن ہی سے الگ ہو جانا پڑے گا، اور یہ مزید غلطی ہو گی۔ اس سے خدا پرستانہ تہذیب اور زیادہ مغلوب اور ظالمانہ و فاسقانہ تہذیب اور زیادہ غالب ہوتی چلی جائے گی۔ اس لیے کہ جو تہذیب مشینوں کے زور سے پھیل رہی ہو اس کے مقابلے میں وہ تہذیب کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جو تمام کارگر ذرائع اور طاقت ور اسباب سے خود ہی دست بردار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ موٹر پر دوڑنے والے کا مقابلہ چھکڑے پر چلنے والا نہیں کر سکتا۔ جو لوگ ریڈیو کے زور سے ایک سکنڈ کے اندر باطل کی آواز کرۂ زمین کے ایک ایک کونے میں پہنچا دیں، اور کروڑہا انسانوں کے خیالات کو ایک جنبشِ زبان سے مسموم کر کے رکھ دیں، اُن کے مقابلے میں وہ لوگ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں جو ایک جلسے کے سامعین تک بھی حق کی آواز پہنچانے میں خدا کی پیدا کی ہوئی طاقت سے کام لیتے ہوئے جھجکتے ہوں؟ منکر کی آواز بلند کرنے والے تو ایک شخص کو بھی اپنی بات سنائے بغیر چھوڑنا پسند نہ کریں اور معروف کی آواز بلند کرنے والوں کا اندازِ فکر یہ ہو کہ سامعینِ بعید تک تبلیغِ صوت شرعاً ضروری تو ہے نہیں، لہٰذا کیوں اس کی کوشش کی جائے؟

اس طرزِ عمل کا انجام جو کچھ ہو گا، بلکہ ہو رہا ہے اس کو ہر شخص بادنیٰ تامّل جان سکتا ہے۔ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ ہم ایک ایک ہتھیار کو یہ کہہ کر پھینکتے جائیں کہ دشمن کے استعمال سے وہ گندہ ہو گیا ہے، اور دشمن ان سب ہتھیاروں کو اٹھا کر ہم پر حملہ کرتا چلا جائے۔

یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ دور کے سامعین تک آواز پہنچانا شرعاً ضروری نہیں ہے مگر یہ درست نہیں ہے کہ آواز پہنچانا اور سامعین کا اُسے سننا شریعت میں مقصودیت کا درجہ ہی نہیں رکھتا۔ نماز میں قرآن اسی لیے پڑھا جاتا ہے کہ مقتدی اس کو سنیں۔ خود قرآن میں اس مقصد کی تصریح موجود ہے کہ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا۔ [(الاعراف ۷: ۲۰۴) جب قرآن تمھارے سامنے پڑھا جائے تو اُسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔]

خطبہ بھی اسی لیے دیا جاتا ہے کہ لوگوں کو سنایا جائے اور شارع نے اسی غرض سے خطبے کے وقت بات چیت سے منع

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیا ہے۔ استماع کا مقصود ہونا تو نقلاً بھی ثابت ہے اور عقلاً بھی۔ ظاہر ہے کہ کلام اسی لیے ہوتا ہے کہ لوگ اس کو سنیں۔ منہ سے آواز اسی لیے نکالی جاتی ہے کہ کانوں تک پہنچے۔ اب رہا یہ امر کہ شارع نے اس کو ضروری کیوں نہیں قرار دیا؟ تو میں عرض کروں گا کہ یہ رخصت کے قبیل سے ہے۔ چونکہ اُس زمانے میں کوئی ایسا ذریعہ موجود نہ تھا جس سے دور تک آواز پہنچائی جا سکے، اور آج بھی ہر وقت ہر جگہ مکبر الصوت مہیا نہیں ہو سکتا، اس لیے استماع کو لازم نہیں کیا گیا کہ اس کے بغیر نماز ہی نہ ہو، یا حضورِ خطبہ کا ثواب ہی حاصل نہ ہو سکے۔ مگر اس نرمی اور رخصت کو جو محض طبعی موانع کا لحاظ کر کے عطا کی گئی ہے، اس امر کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ تبلیغِ صوت کا اہتمام سرے سے غیر ضروری ہے، حتّٰی کہ اگر اس کے لیے کوئی ذریعہ مہیا ہو جائے تب بھی اسے قصداً ترک کر دیا جائے۔

آخر میں یہ بات بھی صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مسئلے پر میرے بار بار لکھنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے خاص طور پر لاؤڈ سپیکر سے کوئی دلچسپی ہے۔ بلکہ دراصل میرا مقصد یہ ہے کہ سائنٹفک ایجادات اور تمدنِ جدید کے آلات و وسائل کے متعلق مسلمان اپنا رویہ بدلیں۔ یہ آلات بجائے خود ناپاک نہیں ہیں۔ اصل میں وہ طریقِ استعمال ناپاک ہے جو مغرب کی باغیانہ تہذیب نے اختیار کر رکھا ہے۔ خداوند عالم نے جن چیزوں کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے وہ بالیقین پاک اور مطہر ہیں اور ان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ ان سے خدائی قانون کے مطابق کام لیا جائے۔ مگر ان پر دوہرا ظلم ہو رہا ہے کہ جن کے پاس خدائی قانون موجود ہے وہ ان سے کام نہیں لیتے اور جو ان سے کام لے رہے ہیں وہ شیطانی قانون کے متبع ہیں۔

(تفہیمات، دوم، دسمبر ۱۹۷۴ء، ص ۴۴۸-۴۶۷)

ریڈیو اور گراموفون وغیرہ

س: ریڈیو ایک ایسا آلہ ہے، جو ایک شخص کی آواز کو سیکڑوں میل دور پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح گراموفون کے ریکارڈوں میں انسانی آواز کو محفوظ کر لیا جاتا ہے اور پھر اسے خاص طریقوں سے دہرایا جا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی امام ہزاروں میل کے فاصلے سے بذریعہ ریڈیو امامت کرائے یا کسی امام کی آواز کو گراموفون ریکارڈ میں منضبط کر لیا گیا ہو اور اسے دہرایا جائے، تو کیا آلاتی آوازوں کی اقتدا میں نماز کی جماعت کرنا جائز ہے؟

ج: ریڈیو پر ایک شخص کی امامت میں دور دراز کے مقامات کے لوگوں کا نماز پڑھنا یا گراموفون کے ذریعے نماز کا ریکارڈ بنانا اور پھر کسی جماعت کا اس کی اقتدا میں نماز پڑھنا اصولاً صحیح نہیں ہے۔ اس کے وجوہ پر آپ غور کریں تو خود آپ کی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

امام کا کام محض نماز پڑھانا ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک طرح سے مقامی جماعت کا رہنما ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اپنے مقام کے لوگوں سے شخصی ارتباط قائم کرے۔ اُن کے اخلاق، معاملات اور مقامی حالات پر نظر رکھے، اور حسب موقع و ضرورت اپنے خطبوں میں یا دوسرے مفید مواقع پر اصلاح و ارشاد کے فرائض انجام دے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمانوں کی دوسری چیزوں کے ساتھ اس ادارے میں بھی اب انحطاط رونما ہو گیا ہے۔ لیکن بہر حال نفسِ ادارہ کو تو اپنی اصلی صورت پر قائم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رکھنا ضروری ہے۔ اگر ریڈیو پر نمازیں ہونے لگیں یا گراموفون سے امامت و خطابت کا کام لیا جانے لگے تو امامت کی اصلی روح ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی۔

نماز دوسرے مذاہب کی عبادتوں کی طرح محض 'پوجا' نہیں ہے لہٰذا اس کی امامت سے شخصیت کو خارج کر دینا اور اس میں 'مشینیت' پیدا کر دینا دراصل اس کی قدر و قیمت کو ضائع کر دینا ہے۔

علاوہ بریں اگر کسی مرکزی مقام سے کوئی شخص ریڈیو یا گراموفون کے ذریعے سے امامت و خطابت کے فرائض انجام دے اور مقامی امامتوں کا خاتمہ کر دیا جائے تو یہ ایک ایسی مصنوعی یکسانیت ہوگی جو اسلام کی جمہوری روح کو ختم کر دے گی اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ کو ترقی دے گی۔ یہ چیز اُن نظامات کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے جن میں پوری پوری آبادیوں کو ایک مرکز سے کنٹرول کرنے اور تمام لوگوں کو ایک لیڈر کا بالکلیہ تابع بنا دینے کا اصول اختیار کیا گیا ہے، جیسے فاشزم اور کمیونزم۔ لیکن اسلام ایک مرکزی امام یا امیر کے اقتدار کو ایسا ہمہ گیر بنانا نہیں چاہتا کہ مقامی لوگوں کی باگ ڈور بالکل اُس کے ہاتھوں میں چلی جائے۔ اور خود ان کے اندر اپنے مفاد کو سوچنے، اپنے معاملات کو سمجھنے اور ان کو طے کرنے کی صلاحیت ہی نشو و نما نہ پا سکے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرنِ خیر القرون میں 'امام' محض پجاری کی حیثیت نہیں رکھتے تھے جن کا کام چند مذہبی مراسم کو ادا کر دینا ہو بلکہ وہ مقامی لیڈر کے طور پر مقرر کیے جاتے تھے۔ اُن کا کام تعلیم و تزکیہ اور اصلاح تمدن و معاشرت تھا اور مقامی جماعتوں کو اس غرض کے لیے تیار کرنا تھا کہ وہ بڑی اور مرکزی جماعت کی فلاح و بہبود میں اپنی قابلیتوں کے مطابق حصہ لیں۔ ایسے اہم مقاصد ریڈیو سیٹ یا گراموفون سے کیوں کر پورے ہو سکتے ہیں۔ آلات انسان کا بدل کبھی نہیں ہو سکتے۔ صرف مددگار ہو سکتے ہیں۔ ان وجوہ سے میں سمجھتا ہوں کہ 'مشینی امامت' اسلام کی روح کے بالکل خلاف ہے۔

(رسائل و مسائل، اول، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۱۶۳-۱۶۵)

سُترہ اور اس کے احکام

سُترہ اس چیز کو کہتے ہیں، جسے کھلی جگہ پر نماز پڑھتے وقت ایک آدمی اس غرض سے سامنے رکھ لیتا ہے کہ وہ آگے سے گزرنے والوں کے اور اس نمازی کے درمیان آڑ کا کام دے۔

امام مسلم نے [اپنی کتاب صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ باب سترہ المصلی میں] وہ پورا مواد جمع کیا ہے جو سترے کے مسئلے سے متعلق ان کو معتبر سندوں سے پہنچا تھا اور اس کے سارے پہلو ہمارے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ اس کی کسی ایک روایت کو لے کر کوئی نتیجہ نکال بیٹھنا صحیح نہیں ہے، بلکہ ساری روایتوں پر جامع نگاہ ڈالنے ہی سے آدمی صحیح نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ اصل بات جو ان احادیث سے معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازی کو اپنے آگے سترہ رکھنے کا حکم دیا تھا اور اس کی وجہ سمجھاتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ اگر آدمی سترہ رکھے بغیر نماز کے لیے کسی کھلی جگہ کھڑا ہو جائے گا تو عورتیں، کتے، گدھے سب اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے سامنے سے گزریں گے۔ اس بات کو سن کر بعض لوگ اس مسئلے کو یوں بیان کرنے لگے کہ عورت، کتے، اور گدھے کے گزرنے سے نماز قطع ہو جاتی ہے۔ یہ باتیں جب حضرت عائشہؓ کو پہنچیں تو انھوں نے فرمایا اِنَّ الْمَرْأَةَ لَدَابَّةُ سُوْءٍ (پھر تو عورت بڑی بری جانور ہوئی) عَدَلْتُمُوْنَا بِالْكِلَابِ وَالْحُمُرِ (تم لوگوں نے تو ہم کو گدھوں اور کتوں کے برابر کر دیا) اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ وَ اَنَا مُعْتَرِضَةٌ بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْقِبْلَةِ كَاِعْتِرَاضِ الْجَنَازَةِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو رات کو نماز پڑھتے تھے اور میں اُن کے اور قبلے کے درمیان جنازے کی طرح پڑی ہوتی تھی۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۴۰-۴۱)

نمازی کے سامنے سے گزرنا

س: اگر مسجد میں کوئی نمازی نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے سامنے سے گزرنے کے لیے فاصلہ کیا ہونا چاہیے؟ کیونکہ وہاں سترہ رکھنے کا تو کوئی موقع نہیں ہوتا۔

ج: اس میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک چالیس قدم کا فاصلہ ضروری ہے اور بعض کے نزدیک سجدہ گاہ تک کا فاصلہ کافی ہے۔ اس سے زیادہ قریب سے نہیں گزرنا چاہیے۔

(استفسارات، اوّل، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۶۰-۶۱)

ننگے سر نماز پڑھنا

س: ننگے سر نماز پڑھنا کیسا ہے، جبکہ ٹوپی یا کپڑا موجود ہو؟ کیا کوئی حدیث ایسی ہے جس سے ننگے سر نماز پڑھنے کا جواز ملتا ہے؟

ج: نماز میں سر ڈھانکنے کا کوئی حکم، یا ننگے سر نماز پڑھنے کی کوئی نہی میرے علم میں نہیں ہے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام عمامہ یا ٹوپی پہنے ہوئے ہی نماز پڑھتے تھے۔ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔ [(الاعراف ۷:۳۱) ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو] کے حکم کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نماز اچھا لباس پہن کر پڑھی جائے، اور ٹوپی یا عمامہ بھی اس میں داخل ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص ننگے سر نماز پڑھے تو اس کی نماز ہو جائے گی۔

(رسائل و مسائل، پنجم، اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۲۴۱)

میری قطعی رائے یہ ہے کہ جان بوجھ کر ننگے سر نماز نہ پڑھی جائے اس لیے کہ [یہ] آدابِ نماز کے خلاف ہے۔ قرآن میں ہے کہ اپنی پوری زینت کے ساتھ نماز پڑھو اور اس زینت میں سر کا لباس بھی شامل ہے۔

(تصریحات، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۲۵)

نماز میں سر ڈھانپنے کا کوئی قطعی حکم نہیں ہے اور نہ حدیث میں کہیں اس کی صراحت ملتی ہے۔ لیکن دوسری طرف معلوم ہوتا ہے کہ ایسا بھی کبھی نہیں ہوا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود یا صحابہ نے کھلے سر نماز پڑھی ہو۔ راہِ اعتدال یہ ہے کہ آدمی خود ننگے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سر نماز پڑھنے سے احتراز کرے، لیکن اگر کوئی دوسرا پڑھ رہا ہو تو اسے سختی سے نہ روکے۔

(استفسارات، اوّل، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۳)

جوتے پہن کر نماز پڑھنا

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ (طٰہٰ ۲۰: ۱۱-۱۲) وہاں پہنچا تو پکارا گیا: اے موسیٰؑ میں ہی تیرا رب ہوں، جوتیاں اتار دے، تو وادیِ مقدس طُویٰ میں ہے۔

غالباً اسی واقعے کی وجہ سے یہودیوں میں یہ شرعی مسئلہ بن گیا کہ جوتے پہنے ہوئے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے فرمایا: خَالِفُوا الْيَهُوْدَ فَاِنَّهُمْ لَا يُصَلُّوْنَ فِيْ نِعَالِهِمْ وَلَا خِفَافِهِمْ (ابو داؤد) یہودیوں کے خلاف عمل کرو، کیونکہ وہ جوتے اور چمڑے کے موزے پہن کر نماز نہیں پڑھتے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ضرور جوتے ہی پہن کر نماز پڑھنی چاہیے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے، اس لیے دونوں طرح عمل کرو۔ ابو داؤد میں عمرو بن عاصؓ کی روایت ہے کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ مسند احمد اور ابو داؤد میں ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی مسجد آئے تو جوتے کو پلٹ کر دیکھ لے۔ اگر کوئی گندگی لگی ہو تو زمین سے رگڑ کر صاف کر لے اور انھی جوتوں کو پہنے ہوئے نماز پڑھ لے۔[1]

ابو ہریرہؓ کی روایت میں حضورؐ کے یہ الفاظ ہیں: اگر تم میں سے کسی نے اپنے جوتے سے گندگی کو پامال کیا ہو تو مٹی اس کو پاک کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اور حضرت ام سلمہؓ کی روایت میں ہے: يُطَهِّرُهُ مَا بَعْدَهُ یعنی ایک جگہ گندگی لگی ہو گی تو دوسری جگہ جاتے جاتے خود زمین ہی اس کو پاک کر دے گی۔ ان کثیر التعداد روایات کی بنا پر امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام اوزاعیؒ اور اسحاق بن راہویہؒ وغیرہ فقہا اس بات کے قائل ہیں کہ جوتا ہر حال میں زمین کی مٹی سے پاک ہو جاتا ہے۔ ایک ایک قول امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کا بھی اس کی تائید میں ہے۔ مگر امام شافعی کا مشہور قول اس کے خلاف ہے۔ غالباً وہ جوتا پہن کر نماز پڑھنے کو ادب کے خلاف سمجھ کر منع کرتے ہیں، اگرچہ سمجھا یہی گیا ہے کہ ان کے نزدیک جوتا مٹی پر رگڑنے سے پاک نہیں ہوتا۔ (اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسجد نبوی میں چٹائی تک کا فرش نہ تھا، بلکہ کنکریاں بچھی ہوئی تھیں۔ لہٰذا ان احادیث سے استدلال کر کے اگر کوئی شخص آج کی مسجدوں کے فرش پر جوتے لے جانا چاہے تو یہ صحیح نہ ہو گا۔ البتہ گھاس پر یا کھلے میدان میں جوتے پہنے پہنے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو میدان میں نماز جنازہ پڑھتے وقت بھی جوتے اتارنے پر اصرار کرتے ہیں وہ دراصل احکام سے ناواقف ہیں)۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۸۸-۸۹، طٰہٰ، حاشیہ ۷)

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، سوم، ص ۱۴۲-۱۴۴، اشاعت اگست ۲۰۰۴ء۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جیب میں تصویر والا شناختی کارڈ اور نماز

س: آج کل شناختی کارڈ بنوانے پر زور دیا جا رہا ہے۔ ان شناختی کارڈوں پر تصویر چسپاں کی جاتی ہے۔ اگر ایسا کارڈ جیب میں پڑا ہو، تو کیا نماز ہو جاتی ہے؟

ج: کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ کی جیب میں جو کرنسی نوٹ ہوتے ہیں آخر ان پر بھی تصویر ہوتی ہے۔

(۵- اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۲۵)

اجرت پر قرآن سنانے والے کے پیچھے نماز

جو شخص تراویح میں قران پڑھنے کے لیے اجرت کا مطالبہ کرے اور طے کر کے پھر قرآن سنائے اس کے پیچھے تراویح پڑھنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس کی اپنی ہی نماز عبادت کی بجائے مزدوری ہے اس کے پیچھے دوسرے کی عبادت کیسے ہو سکتی ہے؟ البتہ اگر کوئی شخص تراویح میں قرآن سنائے اور بعد میں لوگ اس کو کچھ روپیہ یا چیز بطور خود دیں تو یہ درست ہے۔ اس صورت میں یہ شبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ شاید اس نے اسی امید پر قرآن پڑھا ہوگا کہ بعد میں کچھ ملے گا۔

(مکتوبات سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بنام حکیم محمد شریف مسلم، جنوری ۱۹۸۶ء، ص ۸۹)

گم شدہ چیز کا مسجد میں اعلان

س: حدیث میں آیا ہے کہ مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان نہ کیا جائے لیکن ہمارے ہاں تو مساجد میں گم شدہ بچوں کا اعلان اکثر و بیشتر کیا جاتا ہے۔ کیا یہ حدیث کی خلاف ورزی نہیں ہے؟

ج: کیا آپ 'گم شدہ چیز' اور 'گم شدہ بچے' میں فرق محسوس نہیں کر سکتے؟ اور پھر حدیث میں اعلان کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اس بات کی ممانعت ہے کہ کوئی چیز کسی کے گھر میں گم ہو جائے اور تلاش اس کی مسجد میں شروع کر دی جائے۔ یہ بات یوں بھی بدتمیزی ہے اور نمازیوں کے لیے بھی تکلیف دہ ہے۔

س: اگر کوئی چیز مسجد ہی میں گم ہوئی ہو تو کیا اس کی تلاش بھی ناجائز ہوگی؟

ج: نہیں وہ تو ناگزیر صورت ہے۔

(۵- اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۱۹۳)

مسجدوں کی آبادکاری

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰۗىِٕكَ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ (التوبہ ۹: ۱۷-۱۸) مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور و خادم بنیں درآنحالیکہ اپنے اوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔ ان کے تو سارے اعمال ضائع ہو گئے اور جہنم میں انھیں ہمیشہ رہنا ہے۔ اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (مجاور و خادم) تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخر کو مانیں اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ انھی سے یہ توقع ہے کہ سیدھی راہ چلیں گے۔

جو مساجد خدائے واحد کی عبادت کے لیے بنی ہوں ان کے متولی، مجاور، خادم اور آباد کار بننے کے لیے وہ لوگ کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتے جو خدا کے ساتھ خداوندی کی صفات، حقوق اور اختیارات میں دوسروں کو شریک کرتے ہوں۔ پھر جبکہ وہ خود بھی توحید کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر چکے ہوں اور انھوں نے صاف صاف کہہ دیا ہو کہ ہم اپنی بندگی و عبادت کو ایک خدا کے لیے مخصوص کر دینا قبول نہیں کریں گے تو آخر انھیں کیا حق ہے کہ کسی ایسی عبادت گاہ کے متولی بنے رہیں جو صرف خدا کی عبادت کے لیے بنائی گئی تھی۔

یہاں اگرچہ بات عام کہی گئی ہے اور اپنی حیثیت کے لحاظ سے یہ عام ہے بھی، لیکن خاص طور پر یہاں اس کا ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ اور مسجدِ حرام پر سے مشرکین کی تولیت کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس پر ہمیشہ کے لیے اہل توحید کی تولیت قائم کر دی جائے۔

کسی زیارت گاہ کی سجادہ نشینی، مجاوری اور چند نمائشی مذہبی اعمال کی بجا آوری، جس پر دنیا کے سطح بین لوگ بالعموم شرف اور تقدس کا مدار رکھتے ہیں، خدا کے نزدیک کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتی۔ اصل قدر و قیمت ایمان اور راہِ خدا میں قربانی کی ہے۔ ان صفات کا جو شخص بھی حامل ہو وہ قیمتی آدمی ہے خواہ وہ کسی اونچے خاندان سے تعلق نہ رکھتا ہو اور کسی قسم کے امتیازی طرّے اس کو لگے ہوئے نہ ہوں۔ لیکن جو لوگ ان صفات سے خالی ہیں وہ محض اس لیے کہ بزرگ زادے ہیں سجادہ نشینی ان کے خاندان میں مدتوں سے چلی آرہی ہے اور خاص خاص موقعوں پر کچھ مذہبی مراسم کی نمائش وہ بڑی شان کے ساتھ کر دیا کرتے ہیں، نہ کسی مرتبے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور نہ یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایسے بے حقیقت 'موروثی' حقوق کو تسلیم کر کے مقدس مقامات اور مذہبی ادارے ان نالائق لوگوں کے ہاتھوں میں رہنے دیے جائیں۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۱۸۲-۱۸۳، التوبہ، حواشی ۱۹-۲۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حصہ دوم

زکوٰۃ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب اوّل

احکامِ زکوٰۃ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

زکوٰۃ کی اہمیت وضرورت

زکوٰۃ کی اصل روح

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ط اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ط وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (التوبہ ۹:۱۰۳) اے نبیؐ! تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انھیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو کیونکہ تمھاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہوگی، اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

لغوی اور اصطلاحی معنی

زکوٰۃ کے لغوی معنی طہارت اور نمو کے ہیں۔ انھی دونوں صفتوں کے لحاظ سے اصطلاح میں 'زکوٰۃ' اس مالی عبادت کو کہتے ہیں جو ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر اس لیے فرض کی گئی ہے کہ خدا اور بندوں کا حق ادا کر کے اس کا مال پاک ہو جائے اور اس کا نفس نیز وہ سوسائٹی جس میں وہ رہتا ہے، بُخل، خود غرضی، بغض وغیرہ جذبات ردیّہ سے پاک ہو اور اس میں محبت واحسان، فراخ دلی اور باہمی تعاون ومواساۃ کے اوصاف نشوونما پائیں۔

فقہا نے زکوٰۃ کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔ مثلاً:

حَقٌّ يَّجِبُ فِي الْمَالِ (المغنی لابنِ قدامہ، ج ۲، ص ۴۳۳) وہ ایک حق ہے جو مال میں واجب ہوتا ہے۔

اِعْطَاءُ جُزْءٍ مِّنَ النِّصَابِ اِلٰى فَقِيْرٍ وَّ نَحْوِهٖ غَيْرِ مُتَّصِفٍ بِمَانِعٍ شَرْعِيٍّ يَّمْنَعُ مِنَ الصَّرْفِ اِلَيْهِ (نیل الاوطار، ج ۴، ص ۹۸) نصاب میں سے ایک جزء کسی محتاج اور اس کے مانند شخص کو دینا جو کسی ایسے مانع شرعی سے متصف نہ ہو جس کی بنا پر اسے زکوٰۃ نہ دی جا سکے۔

تَمْلِيْكُ مَالٍ مَّخْصُوْصٍ لِّمُسْتَحِقِّهٖ بِشَرَائِطَ مَخْصُوْصَةٍ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، ج ۱، ص ۵۹۰) ایک مخصوص مال کو مخصوص شرائط کے مطابق اس کے مستحق کی ملکیت میں دینا۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۹-۱۲۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زکوٰۃ بمعنی پاکیزگیٔ نفس

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ۝ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُونَ ۝ (حٰم السجدۃ ۴۱: ۶-۷) تباہی ہے اُن مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں۔

یہاں زکوٰۃ کے معنی میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن عباسؓ اور ان کے جلیل القدر شاگرد عکرمہ اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس مقام پر زکوٰۃ سے مراد وہ پاکیزگیٔ نفس ہے جو توحید کے عقیدے اور اللہ کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ ہوگا کہ تباہی ہے ان مشرکین کے لیے جو پاکیزگی اختیار نہیں کرتے۔ دوسرا گروہ جس میں قتادہ، سُدّی، حسن بصری، ضحّاک، مُقاتل اور ابن السائب جیسے مفسرین شامل ہیں، اس لفظ کو یہاں بھی زکوٰۃ مال ہی کے معنی میں لیتا ہے۔ اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جو شرک کر کے خدا کا اور زکوٰۃ نہ دے کر بندوں کا حق مارتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، چہارم، ص ۴۴۲، حٰم السجدۃ، حاشیہ ۹)

زکوٰۃ کی اہمیت

نماز کے بعد اسلام کا سب سے بڑا رکن زکوٰۃ ہے۔ عام طور پر چونکہ عبادات کے سلسلے میں نماز کے بعد روزے کا نام لیا جاتا ہے۔ اس لیے لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ نماز کے بعد روزے کا نمبر ہے۔ مگر قرآن مجید سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں نماز کے بعد سب سے بڑھ کر زکوٰۃ کی اہمیت ہے۔ یہ دو بڑے ستون ہیں جن پر اسلام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ ان کے ہٹنے کے بعد اسلام قائم نہیں رہ سکتا......

یہی وجہ ہے کہ سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب عرب کے بعض قبیلوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو جناب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے اُن سے اُس طرح جنگ کی جیسے کافروں سے کی جاتی ہے، حالانکہ وہ لوگ نماز پڑھتے تھے اور خدا اور رسول کا اقرار کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کے بغیر نماز، روزہ اور ایمان کی شہادت سب بے کار ہیں، کسی چیز کا بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۰۱-۲۰۲)

انفاق کا عام اور خاص حکم

[انفاق کا] ایک حکم عام ہے اور ایک خاص۔ ایک طرف تو یہ ہے کہ بخل اور تنگ دستی سے بچو کہ یہ برائیوں کی جڑ ہے اور بدیوں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی ماں ہے۔ اپنے اخلاق میں اللہ کا رنگ اختیار کرو جو ہر وقت بے حد وحساب مخلوق پر اپنے فیض کے دریا بہا رہا ہے، حالانکہ کسی کا اس پر کوئی حق اور دعویٰ نہیں ہے۔ راہِ خدا میں جو کچھ خرچ کر سکتے ہو کرو۔ اپنی ضرورتوں سے جتنا بچا سکتے ہو بچاؤ اور اس سے خدا کے دوسرے ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرو۔ دین کی خدمت میں اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے میں جان اور مال سے کبھی دریغ نہ کرو۔ اگر خدا سے محبت رکھتے ہو تو مال کی محبت کو خدا کی محبت پر قربان کر دو۔ یہ تو ہے عام حکم۔

اور اس کے ساتھ ہی خاص حکم یہ ہے کہ اس قدر مال اگر تمھارے پاس جمع ہو تو اس میں سے کم از کم اتنا خدا کی راہ میں ضرور صرف کرو اور اتنی پیداوار تمھاری زمین میں ہو تو اس میں سے کم از کم اتنا حصہ تو ضرور خدا کی نذر کر دو، پھر جس طرح چند رکعت نماز فرض کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس یہ رکعتیں پڑھتے وقت ہی خدا کو یاد کرو اور باقی سارے وقتوں میں اس کو بھول جاؤ، اسی طرح مال کی ایک چھوٹی سی مقدار راہِ خدا میں صرف کرنا جو فرض کیا گیا ہے، اس کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کے پاس اتنا مال ہو بس انھی کو راہِ خدا میں صرف کرنا چاہیے اور جو اس سے کم مال رکھتے ہوں انھیں اپنی مٹھیاں بھینچ لینی چاہییں اور اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ مال دار لوگوں پر جتنی زکوٰۃ فرض کی گئی ہے بس وہ اتنا ہی خدا کی راہ میں صرف کریں اور اس کے بعد کوئی ضرورت مند آئے تو اسے جھڑک دیں یا دین کی خدمت کا کوئی موقع آئے تو کہہ دیں کہ ہم تو زکوٰۃ دے چکے۔ اب ہم سے ایک پائی کی بھی امید نہ رکھو۔ زکوٰۃ فرض کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ کم از کم اتنا مال تو ہر مال دار کو راہِ خدا میں دینا ہی پڑے گا اور اس سے زیادہ جس شخص سے جو کچھ بن آئے وہ اس کو صرف کرنا چاہیے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۳۵-۲۳۶)

اللہ کے ہاں زکوٰۃ کی قدر

قرآن مجید میں زکوٰۃ اور صدقات کے لیے جگہ جگہ انفاق فی سبیل اللہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یعنی 'خدا کی راہ میں خرچ کرنا'۔ بعض بعض مقامات پر یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ تم راہِ خدا میں صرف کرتے ہو یہ اللہ کے ذمہ قرضِ حسنہ ہے گویا تم اللہ کو قرض دیتے ہو اور اللہ تمھارا قرض دار ہو جاتا ہے۔ بکثرت مقامات پر یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم دو گے اس کا بدلہ اللہ کے ذمہ ہے اور وہ صرف اتنا ہی تم کو واپس نہ کرے گا بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ دے گا...... یہ اس کی شانِ کریمی ہے کہ وہ آپ سے خود آپ ہی کے فائدے کے لیے، آپ ہی کی بھلائی کے لیے، آپ ہی کے کام میں خرچ کرنے کو فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ خرچ میری راہ میں ہے، مجھ پر قرض ہے، میرے ذمہ اس کا بدلہ ہے اور میں تمھارا احسان مانتا ہوں۔ تم اپنی قوم کے محتاجوں اور مسکینوں کو دو۔ اس کا بدلہ وہ غریب کہاں سے دیں گے، ان کی طرف سے میں دوں گا۔ تم اپنے غریب رشتہ داروں کی مدد کرو۔ اس کا احسان اُن پر نہیں مجھ پر ہے، میں تمھارے اس احسان کو اُتاروں گا۔ تم اپنے یتیموں، اپنی بیواؤں، اپنے معذوروں، اپنے مسافروں، اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کو جو کچھ دو اُسے میرے حساب سے لکھ لو۔ تمھارا مطالبہ اُن کے ذمہ نہیں، میرے ذمہ ہے اور میں اس کو ادا کر دوں گا۔ تم اپنے پریشان حال بھائیوں کو قرض دو اور ان سے سود نہ مانگو، اُن کو تنگ نہ کرو، اگر وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ادا کرنے کے قابل نہ ہوں تو ان کو سول جیل نہ بھجواؤ، اُن کے کپڑے اور گھر کے برتن فروخت نہ کراؤ، اُن کے بال بچوں کو گھر سے بے گھر نہ کردو۔ تمھارا قرض اُن کے ذمہ نہیں، میرے ذمہ ہے۔ اگر وہ اصل ادا کردیں تو ان کی طرف سے سود میں ادا کروں گا اور وہ اصل بھی ادا نہ کرسکیں گے تو میں اصل اور سود دونوں تمھیں دوں گا۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۲۵-۲۲۶)

[سورۂ مزمل میں ارشاد ہے:]

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ط (المزمل ۷۳: ۲۰) نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔

مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد پنج وقتہ فرض نماز اور فرض زکوٰۃ ادا کرنا ہے۔

ابنِ زید کہتے ہیں کہ اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ اپنا مال خدا کی راہ میں صرف کرنا ہے، خواہ وہ جہاد فی سبیل اللہ ہو یا بندگانِ خدا کی مدد ہو، یا رفاہِ عام ہو، یا دوسرے بھلائی کے کام۔ اللہ کو قرض دینے اور اچھا قرض دینے کے مطلب کی تشریح ہم اس سے پہلے متعدد مقامات پر کرچکے ہیں۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۱۳۴، المزمل، حاشیہ ۲۵)

'قرضِ حسن' کا لفظی ترجمہ 'اچھا قرض' ہے اور اس سے مراد ایسا قرض ہے، جو خالص نیکی کے جذبے سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے۔ اس طرح جو مال راہِ خدا میں خرچ کیا جائے، اُسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کروں گا بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ ہو قرضِ حسن، یعنی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے بلکہ محض اللہ کی خاطر اُن کاموں میں صرف کیا جائے جن کو وہ پسند کرتا ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۸۵، البقرہ، حاشیہ ۲۶۷)

[سورہ مائدہ میں ارشاد ہے:]

وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ (المائدہ ۵: ۱۲) اور تم اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے۔

یعنی خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے رہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اُس ایک ایک پائی کو، جو انسان اس کی راہ میں خرچ کرے، کئی گنے زیادہ انعام کے ساتھ واپس کرنے کا وعدہ فرماتا ہے، اس لیے قرآن میں جگہ جگہ راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کو 'قرض' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ 'اچھا قرض' ہو یعنی جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت خرچ کی جائے، خدا کے قانون کے مطابق خرچ کی جائے اور خلوص وحسنِ نیت کے ساتھ خرچ کی جائے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۴۵۱، المائدہ، حاشیہ ۳۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

[سورۂ حدید میں ارشاد ہے:]

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ؏ (الحدید ۵۷:۱۱) کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض تا کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے، اور اس کے لیے بہترین اجر ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی ہے کہ آدمی اگر اس کے بخشے ہوئے مال کو اُسی کی راہ میں صرف کرے تو اسے وہ اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے، بشرطیکہ وہ قرض حسن (اچھا قرض) ہو، یعنی خالص نیت کے ساتھ کسی ذاتی غرض کے بغیر دیا جائے، کسی قسم کی ریا کاری اور شہرت و ناموری کی طلب اُس میں شامل نہ ہو، اُسے دے کر کسی پر احسان نہ جتایا جائے، اُس کا دینے والا صرف اللہ کی رضا کے لیے دے اور اُس کے سوا کسی کے اجر اور کسی کی خوشنودی پر نگاہ نہ رکھے۔ اس قرض کے متعلق اللہ کے دو وعدے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس کو کئی گنا بڑھا بڑھا کر واپس دے گا، دوسرے یہ کہ وہ اس پر اپنی طرف سے بہترین اجر بھی عطا فرمائے گا۔

مخلص اہلِ ایمان کا طرزِ عمل

حدیث میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور حضورؐ کی زبان مبارک سے لوگوں نے اس کو سنا تو حضرت ابوالدَّحداح انصاری نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا: ہاں، اے ابوالدَّحداح۔ انھوں نے کہا: ذرا اپنا ہاتھ مجھے دکھایئے۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے آپؐ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: میں نے اپنے رب کو اپنا باغ قرض دے دیا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اس باغ میں کھجور کے ۶ سو درخت تھے، اُسی میں ان کا گھر تھا، وہیں ان کے بال بچے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات کر کے وہ سیدھے گھر پہنچے اور بیوی کو پکار کر کہا: دَحداح کی ماں! نکل آؤ، میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے۔ وہ بولیں: تم نے نفع کا سودا کیا، دَحداح کے باپ۔ اور اسی وقت اپنا سامان اور اپنے بچے لے کر باغ سے نکل گئیں۔ (ابن ابی حاتم)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخلص اہل ایمان کا طرزِ عمل اُس وقت کیا تھا اور اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ کیسا قرض حَسَن ہے جسے کئی گنا بڑھا کر واپس دینے اور پھر اوپر سے اجر کریم عطا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۱۰، الحدید، حاشیہ ۱۶)

تمام امتوں کو زکوٰۃ کا حکم

قرآن مجید اٹھا کر دیکھیے، آپ کو نظر آئے گا کہ قدیم زمانے سے تمام انبیاؑ کی امتوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم لازمی طور پر دیا گیا ہے۔ دین اسلام کبھی کسی نبی کے زمانے میں بھی ان دو چیزوں سے خالی نہیں رہا۔ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل کے انبیا کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ (الانبیاء ۲۱:۷۳) ہم نے ان کو انسانوں کا پیشوا بنایا۔ وہ ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ ہم نے وحی کے ذریعے سے ان کو نیک کام کرنے اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تعلیم دی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:

وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝ (مریم ۱۹:۵۵) وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ اللہ کے نزدیک برگزیدہ تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے دعا کی کہ خدایا! ہمیں اس دنیا کی بھلائی بھی عطا کر اور آخرت کی بھلائی بھی۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (الاعراف ۷:۱۵۶) میں اپنے عذاب سے جسے چاہوں گا گھیر لوں گا، اگرچہ میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے مگر اس رحمت کو میں انھی لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو مجھ سے ڈریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔

......اللہ تعالیٰ نے اتنے جلیل القدر پیغمبر کی دعا کے جواب میں صاف فرمادیا کہ تمھاری امت اگر زکوٰۃ کی پابندی کرے گی تب تو اس کے لیے میری رحمت کا وعدہ ہے ورنہ ابھی سے صاف سن رکھو کہ وہ میری رحمت سے محروم ہو جائے گی اور میرا عذاب اُسے گھیر لے گا......

رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم سے پہلے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے، سو ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کا ساتھ ساتھ حکم دیا، جیسا کہ سورۂ مریم میں ہے:

وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ (مریم ۱۹:۳۱) اللہ تعالیٰ نے مجھے برکت دی جہاں بھی میں ہوں اور مجھے ہدایت فرمائی کہ نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دیتا رہوں، جب تک زندہ رہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دینِ اسلام ابتدا سے ہر نبی کے زمانے میں نماز اور زکوٰۃ کے ان دو بڑے ستونوں پر قائم ہوا ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا پر ایمان رکھنے والی کسی امت کو بھی ان دو فرضوں سے معاف کیا گیا ہو۔

امّتِ مسلمہ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم

☐ **ذریعۂ ہدایت:** حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں یہ دونوں فرض کس طرح ساتھ ساتھ لگے ہوئے ہیں؟ قرآن مجید کھولتے ہی سب سے پہلے جن آیات پر آپ کی نظر پڑتی ہے وہ کیا ہیں؟ یہ کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۚ فِيْهِ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ۙ (البقرۃ ۲:۲-۳) یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ پرہیزگاروں کو دنیا میں زندگی کا سیدھا راستہ بتاتا ہے اور پرہیزگار وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پھر فرمایا: أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○ (البقرہ ۲:۵) ایسے ہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور فلاح ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے۔

یعنی جن میں ایمان نہیں اور جو نماز اور زکوٰۃ کے پابند نہیں وہ نہ ہدایت پر ہیں اور نہ انھیں فلاح نصیب ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اسی سورۂ بقرہ کو پڑھتے جایئے۔ چند صفحوں کے بعد پھر حکم ہوتا ہے:

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ○ (البقرہ ۲:۴۳) نماز کی پابندی کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو (یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھو)۔

□ **اصل نیکی:** پھر تھوڑی دور آگے چل کر اسی سورہ میں ارشاد ہوا:

لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۖ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ○ (البقرہ ۲:۱۷۷) نیکی محض اس کا نام نہیں ہے کہ مشرق یا مغرب کی طرف تم نے منہ کر لیا بلکہ نیکی اس شخص کی ہے جس نے اللہ اور آخرت اور ملائکہ اور کتاب الٰہی اور پیغمبروں پر ایمان رکھا اور اللہ کی محبت میں اپنے حاجت مند رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سائلوں پر اپنا مال خرچ کیا اور (قرض یا اسیری) سے گردنیں چھڑانے میں مدد دی اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ ادا کی اور نیک لوگ وہ ہیں جو عہد کرنے کے بعد اپنے عہد کو پورا کریں اور مصیبت اور نقصان اور جنگ کے موقع پر صبر کے ساتھ راہِ حق پر ڈٹ جائیں۔ ایسے ہی لوگ سچے مسلمان ہیں اور ایسے ہی لوگ متقی و پرہیزگار ہیں۔

□ **اہل ایمان کی اہم ترین صفت:** پھر آگے دیکھیے، سورۂ مائدہ میں کیا ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ○ وَمَن يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ○ (المائدۃ ۵:۵۵-۵۶) مسلمانو! تمھارے حقیقی دوست اور مددگار صرف اللہ اور رسول اور ایمان دار لوگ ہیں یعنی ایسے لوگ جو نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے اور خدا کے آگے جھکتے ہیں۔ پس جو شخص اللہ اور رسول اور ایمان دار لوگوں کو دوست بنائے وہ اللہ کی پارٹی کا آدمی ہے اور اللہ کی پارٹی ہی غالب ہونے والی ہے۔

اس عظیم الشان آیت میں ایک بڑا قاعدہ بیان کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان صرف وہ لوگ ہیں جو نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ ان دو ارکان اسلام سے جو لوگ روگردانی کریں۔ اُن کا دعوائے ایمان ہی جھوٹا ہے۔ پھر اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان کی ایک پارٹی ہے اور ایمان دار آدمی کا کام یہ ہے کہ سب سے الگ ہو کر اسی پارٹی میں شامل ہو جائے، جو مسلمان اس پارٹی سے باہر رہنے والے کسی شخص کو خواہ وہ باپ ہو، بھائی ہو، بیٹا ہو، ہمسایہ ہو، یا ہم وطن ہو یا کوئی بھی ہو، اگر وہ اس کو اپنا دوست بنائے گا اور اس سے محبت اور مددگاری کا تعلق رکھے گا تو اسے یہ امید نہ رکھنی چاہیے کہ اللہ اس سے مددگاری کا تعلق رکھنا پسند فرمائے گا۔ سب سے آخر میں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان کو غلبہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب وہ یکسو ہو کر اللہ اور رسول اور صرف اہلِ ایمان ہی کو اپنا ولی، مددگار، دوست اور ساتھی بنائیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

□ **اسلامی اخوت کی بنیاد:** سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار و مشرکین سے جنگ کا حکم دیا ہے اور مسلسل کئی رکوعوں تک جنگ ہی کے متعلق ہدایات دی ہیں۔ اس سلسلے میں ارشاد ہے:

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ (التوبۃ ۹:۱۱) پھر اگر وہ کفر و شرک سے توبہ کریں۔ ایمان لے آئیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔

یعنی محض کفر و شرک سے توبہ کرنا اور ایمان کا اقرار کر لینا کافی نہیں ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ وہ واقعی کفر و شرک سے تائب ہو گئے ہیں اور حقیقت میں ایمان لائے ہیں، صرف اسی طرح مل سکتا ہے کہ وہ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں۔ لہٰذا اگر وہ اپنے اس عمل سے اپنے ایمان کا ثبوت دے دیں تب تو تمھارے دینی بھائی ہیں، ورنہ ان کو بھائی نہ سمجھو اور ان سے جنگ بند نہ کرو۔

پھر آگے چل کر اسی سورہ میں فرمایا:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيعُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ أُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ (التوبۃ ۹:۷۱) مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں اور ان مومن مردوں اور عورتوں کی صفات یہ ہیں کہ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں، بدی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں، اور خدا اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں پر اللہ رحمت کرے گا۔

گویا کوئی شخص مسلمانوں کا دینی بھائی بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ اقرارِ ایمان کر کے عملاً نماز اور زکوٰۃ کی پابندی نہ کرے۔ ایمان، نماز اور زکوٰۃ یہ تین چیزیں مل کر ایمان داروں کی جماعت بناتی ہیں۔ جو لوگ ان تینوں کے پابند ہیں۔ وہ اس پاک جماعت کے اندر ہیں اور انھی کے اندر میں اور انھی کے درمیان میں دوستی، محبت، رفاقت، مددگاری کا تعلق ہے اور جو ان کے پابند نہیں، وہ اس جماعت کے باہر ہیں خواہ وہ نام کے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔

□ **نصرتِ خداوندی کا ذریعہ:** اور آگے چلیے۔ سورۂ حج میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ الَّذِينَ إِنْ مَكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ (الحج ۲۲:۴۰-۴۱) اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے اور اللہ زبردست قوت والا اور سب پر غالب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں حکومت بخشیں تو یہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے اور سب چیزوں کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔

ان آیات میں مسلمانوں سے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر زمین میں طاقت حاصل کر کے تم نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ دو گے اور نیکیاں پھیلاؤ گے اور بدیوں کو مٹاؤ گے، تب تو میں تمھارا مددگار ہوں اور جس کا میں مددگار ہوں اسے کون دبا سکتا ہے۔ لیکن اگر تم نے زکوٰۃ سے منہ پھیرا اور زمین میں حکومت حاصل کر کے نیکیوں کے بجائے بدیاں پھیلائیں اور بدیوں کے بجائے نیکیوں کو مٹانا شروع کیا تو میری مدد تمھارے ساتھ نہ ہوگی۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۰۲-۲۲۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زکوٰۃ نہ دینے کی سزا

قرآن کی رُو سے کلمۂ طیبہ کا اقرار ہی بے معنی ہے اگر آدمی اس کے ثبوت میں نماز اور زکوٰۃ کا پابند نہ ہو۔ اسی بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں کو کافر سمجھ کر ان کے خلاف تلوار اٹھائی تھی۔ صحابۂ کرامؓ کو ابتدا میں شبہ تھا کہ آیا وہ مسلمان جو خدا اور رسول کا اقرار کرتا ہے اور نماز بھی پڑھتا ہے، اُن لوگوں کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں، جن پر تلوار اٹھانے کا حکم ہے۔ مگر جب حضرت ابوبکرؓ جن کو اللہ نے مقام نبوت کے قریب درجہ عطا فرمایا تھا، اپنی بات پر اڑ گئے اور انھوں نے اصرار کے ساتھ فرمایا کہ خدا کی قسم! اگر یہ لوگ اسی زکوٰۃ میں سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دیا کرتے تھے، اونٹ باندھنے کی ایک رسّی بھی روکیں گے تو میں ان پر تلوار اٹھاؤں گا، تو بالآخر تمام صحابہؓ کے دلوں کو اللہ نے حق کے لیے کھول دیا اور سب نے یہ بات تسلیم کر لی کہ زکوٰۃ سے انکار کرنے والے پر جہاد کرنا چاہیے۔ قرآن تو صاف کہتا ہے کہ زکوٰۃ نہ دینا ان مشرکین کا کام ہے جو آخرت کے منکر ہیں: وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (حٰم السجدہ ۴۱:۶-۷) تباہی ہے ان مشرکین کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۱۱-۲۱۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

بنیادی احکام

زکوٰۃ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تین جگہ الگ الگ احکام بیان فرمائے ہیں۔

زرعی پیداوار

۱- سورۂ بقرہ میں فرمایا: اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ (البقرہ ۲:۲۶۷) جو پاک مال تم نے کمائے ہیں اور جو پیداوار ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالی ہے۔ اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرو۔

۲- سورۂ انعام میں فرمایا کہ ہم نے تمھارے لیے زمین سے باغ اُگائے ہیں اور کھیتیاں پیدا کی ہیں۔ لہٰذا كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۡ (الانعام ۶:۱۴۱) اس کی پیداوار جب نکلے تو اس میں سے کھاؤ اور فصل کٹنے کے دن اللہ کا حق نکال دو۔

یہ دونوں آیتیں زمین کی پیداوار کے متعلق ہیں اور فقہائے حنفیہ فرماتے ہیں: خودرَو پیداوار مثلاً لکڑی اور گھانس اور بانس کے سوا باقی جتنی چیزیں غلہ، ترکاری اور پھلوں کی قسم سے نکلیں ان سب میں سے اللہ کا حق نکالنا چاہیے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جو پیداوار آسمانی بارش سے ہو اس میں اللہ کا حق دسواں حصہ ہے اور جو پیداوار انسان کی اپنی کوشش یعنی آب پاشی سے ہو اس میں اللہ کا حق بیسواں حصہ ہے اور یہ حصہ پیداوار کٹنے کے ساتھ ہی واجب ہو جاتا ہے۔

دیگر اموال

۳- اس کے بعد سورۂ توبہ میں آتا ہے: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (التوبہ ۹:۳۴-۳۵) جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور اس میں سے راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دو، اس دن کے عذاب کی جب ان کے اس سونے اور چاندی کو آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیوں اور ان کے پہلوؤں اور پیٹھوں میں داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، اب اپنے ان خزانوں کا مزہ چکھو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پھر فرمایا:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○ (التوبہ ٩:٦٠) صدقات (یعنی زکوٰۃ) اللہ کی طرف سے مقرر کردہ فرض ہے فقرا کے لیے اور مساکین کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب منظور ہو اور گردنیں چھڑانے کے لیے اور قرض داروں کے لیے اور راہِ خدا میں اور مسافروں کے لیے۔ اللہ بہتر جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا۔ (التوبہ ٩:١٠٣) ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ وصول کرکے ان کو پاک اور صاف کردو۔

ان تینوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ جو مال جمع کیا جائے اور بڑھایا جائے، اور اس میں سے راہِ خدا میں صرف نہ کیا جائے وہ ناپاک ہوتا ہے۔ اس کے پاک کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ اس میں سے خدا کا حق نکال کر اس کے بندوں کو دیا جائے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب سونا اور چاندی جمع کرنے والوں پر عذاب کی دھمکی آئی تو مسلمان سخت پریشان ہوئے کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہوتے تھے کہ ایک درہم بھی اپنے پاس نہ رکھو، سب خرچ کر ڈالو، آخر کار حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قوم کی پریشانی کا حال عرض کیا۔ آپؐ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو تم پر اسی لیے فرض کیا ہے کہ باقی اموال تمھارے لیے پاک ہو جائیں۔

ایسی ہی روایت حضرت ابوسعید خُدریؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب تو نے اپنے مال میں سے زکوٰۃ نکال دی تو جو حق تجھ پر واجب تھا وہ ادا ہو گیا۔

آیاتِ مذکورہ بالا میں تو صرف زمین کی پیداوار اور سونے اور چاندی کی زکوٰۃ کا حکم ملتا ہے۔ لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی مال، اونٹ، گائے اور بکریوں میں بھی زکوٰۃ ہے۔

(خطبات، ستمبر ٢٠٠٣ء، ص ٢٤٥-٢٤٨)

زکوٰۃ کے علاوہ ناداروں کا حق

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ○ (الذّٰریٰت ٥١:١٩) اور ان کے مالوں میں حق تھا، سائل اور محروم کے لیے۔

اس مقام پر یہ بات جان لینی چاہیے کہ اہلِ ایمان کے اموال میں سائل اور محروم کے جس حق کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ اُس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے مراد زکوٰۃ نہیں ہے جسے شرعاً اُن پر فرض کر دیا گیا ہے بلکہ یہ وہ حق ہے جو زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی ایک صاحب استطاعت مومن اپنے مال میں خود محسوس کرتا ہے اور اپنے دل کی رغبت سے اس کو ادا کرتا ہے بغیر اس کے کہ شریعت نے اسے لازم کیا ہو۔ ابن عبّاس، مجاہد اور زید بن اسلم وغیرہ بزرگوں نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ درحقیقت اس ارشادِ الٰہی کی اصل روح یہ ہے کہ ایک مُتقی و مُحسن انسان کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوتا کہ خدا اور اس کے بندوں کا جو حق میرے مال میں تھا، زکوٰۃ ادا کر کے میں اُس سے بالکل سبک دوش ہو چکا ہوں۔ اب میں نے اس بات کا کوئی ٹھیکہ نہیں لے لیا ہے کہ ہر ننگے، بھوکے، مصیبت زدہ آدمی کی مدد کرتا پھروں۔ اس کے برعکس جو اللہ کا بندہ واقعی مُتقی و مُحسن ہوتا ہے وہ ہر وقت ہر اُس بھلائی کے لیے جو اُس کے بس میں ہو، دل و جان سے تیار رہتا ہے اور جو موقع بھی اسے دنیا میں کوئی نیک کام کرنے کے لیے ملے، اُسے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اُس کے سوچنے کا یہ انداز ہی نہیں ہوتا کہ جو نیکی مجھ پر فرض کی گئی تھی وہ میں کر چکا ہوں، اب مزید نیکی کیوں کروں؟ نیکی کی قدر جو شخص پہچان چکا ہو وہ اسے بار سمجھ کر برداشت نہیں کرتا بلکہ اپنے ہی نفع کا سودا سمجھ کر زیادہ سے زیادہ کمانے کا حریص ہو جاتا ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۱۴۰، الذاریات، حاشیہ ۱۷)

زکوٰۃ کے علاوہ ٹیکس

حدیث میں اصول بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ آدمی کے مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی حق ہے۔

اس اصولی ارشاد کی موجودگی میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کیا ایک اسلامی حکومت زکوٰۃ کے سوا دوسرے محاصل عائد کر سکتی ہے۔ پھر جبکہ قرآن میں زکوٰۃ کے لیے چند مخصوص مصارف معین کر دیے گئے ہیں تو لامحالہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان مصارف کے ماسوا جو دوسرے فرائض حکومت کے ذمّے عائد ہوں، ان کو بجا لانے کے لیے وہ دوسرے محاصل پبلک پر عائد کرے۔ نیز قرآن میں یہ اصولی ہدایت بھی دی گئی ہے کہ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ [البقرۃ ۲:۲۱۹] تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ کہو عفو۔

عفو کا لفظ (economic surplus) کا ہم معنی ہے اور اس میں نشان دہی کی گئی ہے کہ 'عفو' ٹیکس کا صحیح محل ہے۔ مزید برآں ایسے نظائر بھی موجود ہیں کہ خلفائے راشدین کے عہد میں دوسرے محاصل عائد کیے گئے ہیں۔ مثلاً حضرت عمرؓ کے عہد میں محصولِ درآمد مقرر کیا گیا اور اس کا شمار 'زکوٰۃ' میں نہیں بلکہ 'فے' (حکومت کی عام آمدنیوں) میں تھا۔ علاوہ بریں شریعت میں کوئی ایسی ہدایت موجود نہیں ہے، جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ حکومت اجتماعی ضروریات کے لیے کوئی دوسرا ٹیکس نہیں لگا سکتی اور اصول یہ ہے کہ جس چیز سے منع نہ کیا گیا ہو وہ مباح ہے۔ فقہائے اسلام سے بھی، جہاں تک ہم کو معلوم ہے، ایک غیر معروف شخصیت ضحّاک بن مُزاحم کے سوا کوئی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ نَسَخَتِ الزَّکٰوۃُ کُلَّ حَقٍّ فِی الْمَالِ (زکوٰۃ نے مال میں ہر دوسرے حق کو منسوخ کر دیا ہے) ضحاک کی اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رائے کو کسی قابلِ ذکر فقیہ نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ (المُحَلّٰی لِابنِ حزم، ج ۲، ص ۱۵۸)

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۲-۱۴۳)

س: کیا اسلام میں زکوٰۃ وصول کرنے کے ساتھ ساتھ انکم ٹیکس عائد کرنا بھی جائز ہے؟

ج: جی ہاں! اسلامی ریاست میں یہ دونوں چیزیں جائز ہو سکتی ہیں۔ زکوٰۃ کے مصارف بالکل متعین ہیں جو کہ سورہ توبہ میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ اسی طرح اس کا نصاب اور اس کی شرح بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دی ہے۔ ان امور میں کوئی ترمیم و تنسیخ جائز نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ریاست کو اگر دوسری مزید ضروریات درپیش ہوں تو ان کے لیے وہ قوم سے مالی مدد حاصل کر سکتی ہے۔ اگر یہ وصولی جبری ہو تو ٹیکس ہے، اگر رضاکارانہ ہو تو چندہ ہے اور واپسی کی شرط ہو تو قرضہ (loan) ہے۔ زکوٰۃ اور یہ دوسری وصولیاں نہ ایک دوسرے کی جگہ لے سکتی ہیں اور نہ ایک دوسرے کو ساقط کر سکتی ہیں۔ یہ تو اس کا اصولی جواب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں آپ کو یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک میں ایک صحیح اسلامی حکومت قائم ہو جائے اور دیانت داری سے اس کا نظام چلایا جائے تو اتنے ٹیکسوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی جتنے آج موجود ہیں۔ موجودہ زمانے میں ٹیکسوں کے معاملے میں جتنی بدعنوانیاں اور بددیانتیاں ہوتی ہیں وہ آپ خوب جانتے ہیں۔ ایک طرف تو جس مقصد کے لیے ٹیکس لگایا جاتا ہے اس کا بمشکل دس فیصد اس مقصد کے لیے صرف ہوتا ہے۔ دوسری طرف ٹیکس سے بچنے (evasion) کی ایک عام ذہنیت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر نظام درست ہو جائے تو موجودہ ٹیکسوں کا ایک چوتھائی حصہ بھی کفایت کرے گا اور افادیت چار پانچ گنی زیادہ ہو جائے گی۔

(رسائل و مسائل، چہارم، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۱۵۵-۱۵۶)

س: وہ ایسے کون سے ٹیکس ہیں جو ایک اسلامی ریاست اپنے شہریوں سے ازروئے قرآن و سنت وصول کرنے کی مجاز ہے؟

ج: قرآن و سنت نے ٹیکسوں کا کوئی نظام تجویز نہیں کیا ہے بلکہ مسلمانوں پر زکوٰۃ بطور عبادت اور غیر مسلموں پر جزیہ (بطور علامتِ اطاعت) لازم کرنے کے بعد یہ بات حکومت کی صوابدید پر چھوڑی ہے کہ جیسی ملک کی ضروریات ہوں ان کے مطابق باشندوں پر ٹیکس عائد کریں۔ خراج اور محاصل درآمد و برآمد اس کی ایک مثال ہیں جنھیں قرآن و سنت میں شرعاً مقرر نہیں کیا گیا تھا اور حکومت اسلامی نے اپنی صوابدید کے مطابق انھیں خود مقرر کیا۔ اس معاملے میں اصل معیار ملک کی حقیقی ضروریات ہیں۔ اگر کوئی فرماں روا اپنے تصرّف میں لانے کے لیے ٹیکس وصول کرے تو حرام ہے۔ ملک کی حقیقی ضروریات پر صرف کرنے کے لیے لوگوں کی رضامندی سے ان پر عائد کرے تو حلال ہے۔

(رسائل و مسائل، چہارم، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۲۳۷-۲۳۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زکوٰۃ اور ٹیکس میں فرق

س: موجودہ آزاد تمدنی دور میں بھی کیا غربا و مساکین کے لیے اُمرا و رؤسا سے زکوٰۃ فنڈ جبراً وصول کیا جانا مناسب ہوگا جبکہ وہ دیگر کئی ٹیکسوں کے علاوہ انکم ٹیکس بھی ادا کرتے ہوں؟

ج: زکوٰۃ کے متعلق پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ یہ ٹیکس نہیں ہے بلکہ عبادت اور رکنِ اسلام ہے، جس طرح نماز، روزہ اور حج ارکانِ اسلام ہیں۔ جس شخص نے بھی کبھی قرآن مجید کو آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ دیکھ سکتا ہے کہ قرآن بالعموم نماز اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے اور اسے اُس دین کا ایک رکن قرار دیتا ہے جو ہر زمانے میں انبیائے کرام کا دین رہا ہے۔ اس لیے اس کو ٹیکس سمجھنا اور ٹیکس کی طرح اس سے معاملہ کرنا پہلی بنیادی غلطی ہے۔ ایک اسلامی حکومت جس طرح اپنے ملازموں سے دفتری کام اور دوسری خدمات لے کر یہ نہیں کہہ سکتی کہ اب نماز کی ضرورت باقی نہیں کیونکہ انھوں نے سرکاری ڈیوٹی دے دی ہے۔ اسی طرح وہ لوگوں سے ٹیکس لے کر یہ نہیں کہہ سکتی کہ اب زکوٰۃ کی ضرورت باقی نہیں کیونکہ ٹیکس لے لیا گیا ہے۔ اسلامی حکومت کو اپنے نظام الاوقات لازماً اس طرح مقرر کرنے ہوں گے تاکہ اس کے ملازمین نماز وقت پر ادا کرسکیں۔ اسی طرح اس کو اپنے ٹیکسیشن کے نظام میں زکوٰۃ کی جگہ نکالنے کے لیے مناسب ترمیمات کرنی ہوں گی۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ حکومت کے موجودہ ٹیکسوں میں کوئی ٹیکس اُن مقاصد کے لیے اس طرح استعمال نہیں ہوتا ہے جس کے لیے قرآن میں زکوٰۃ فرض کی گئی ہے اور جس طرح اس کے تقسیم کرنے کا حکم ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۳۰۷-۳۰۸)

زکوٰۃ کوئی 'ٹیکس' نہیں ہے بلکہ ایک مالی عبادت ہے۔ 'ٹیکس' اور 'عبادت' میں بنیادی تصور اور اخلاقی روح کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حکومت کے کارندوں اور زکوٰۃ دینے والوں میں اگر 'عبادت' کے بجائے 'ٹیکس' کی ذہنیت پیدا ہوجائے تو یہ ان اخلاقی و روحانی فوائد کو بالکل ہی ضائع کردے گی جو زکوٰۃ سے اصل مقصود ہیں، اور اجتماعی فوائد کو بھی بہت بڑی حد تک نقصان پہنچائے گی۔ [زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم] حکومت کے سپرد...... کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ ایک سرکاری محصول ہے بلکہ دراصل اس عبادت کا انتظام اس وجہ سے حکومت کے سپرد کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تمام اجتماعی عبادات میں نظم پیدا کرنا ایک اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ اور امارتِ حج بھی اسی طرح اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے جس طرح تحصیل و تقسیمِ زکوٰۃ......

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۲)

وہ لوگ جن پر زکوٰۃ واجب ہے

عاقل و بالغ، مسلمان مرد و زن اگر صاحبِ نصاب ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور اس کی ادائیگی کے وہ خود ذمہ دار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ نابالغ بچوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک مسلک یہ ہے کہ یتیم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ دوسرا مسلک یہ ہے کہ یتیم کے سنِ رشد کو پہنچنے پر اس کا ولی اس کا مال اس کے حوالے کرتے وقت اس کو زکوٰۃ کی تفصیل بتا دے، پھر یہ اس کا اپنا کام ہے کہ اپنے ایام یتیمی کی پوری زکوٰۃ ادا کرے۔ تیسرا مسلک یہ ہے کہ یتیم کا مال اگر کسی کاروبار میں لگایا گیا ہے اور نفع دے رہا ہے تو اس کا ولی اس کی زکوٰۃ ادا کرے ورنہ نہیں۔ چوتھا مسلک یہ ہے کہ یتیم کے مال کی زکوٰۃ واجب ہے اور اس کو ادا کرنا اس کے ولی کے ذمے ہے۔ ہمارے نزدیک یہی چوتھا مسلک زیادہ صحیح ہے۔ حدیث میں آیا ہے: اَلاَ مَنْ وَلِیَ یَتِیْماً لَهُ مَالٌ فَلْیَتَّجِرْلَهُ فِیْهِ وَلاَ یَتْرُکْهُ فَتَاْکُلَهُ الصَّدَقَةُ (ترمذی، دار قطنی، بیہقی، کتاب الاموال لابی عُبَید) خبردار! جو شخص کسی ایسے یتیم کا ولی ہو جو مال رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ اس کے مال سے کوئی کاروبار کرے اور اسے یوں ہی نہ رکھ چھوڑے کہ اس کا سارا مال زکوٰۃ کھا جائے۔

اسی کے ہم معنی ایک حدیث امام شافعیؒ نے مرسلاً اور ایک دوسری حدیث طَبرانی اور ابو عُبَید نے مرفوعاً نقل کی ہے اور اس کی تائید صحابہ و تابعین کے متعدد آثار و اقوال سے ہوتی ہے جو حضرت سمرہ، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت علی، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے مجاہد، عطاء، حسن بن زید، مالک ابن اَنَس اور زُہری سے منقول ہیں۔

فاترالعقل لوگوں کے معاملے میں بھی اسی نوعیت کا اختلاف ہے جو اوپر مذکور ہوا ہے اور اس میں ہمارے نزدیک قولِ راجح یہی ہے کہ مجنون کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے اور اس کا ادا کرنا مجنون کے ولی کے ذمے ہے۔ امام مالک اور ابن شہاب زُہری نے اس رائے کی تصریح کی ہے۔

قیدی پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ جو کوئی اس کے پیچھے اس کے کاروبار یا اس کے مال کا متولی ہو وہ اس کی طرف سے جہاں اس کے دوسرے واجبات ادا کرے گا، زکوٰۃ بھی ادا کرے گا۔ ابن قدامہ اس کے متعلق اپنی کتاب المغنی میں لکھتے ہیں: اگر مال کا مالک قید ہو جائے تو زکوٰۃ اس پر سے ساقط نہ ہوگی، خواہ قید اس کے اور اس کے مال کے درمیان حائل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو کیونکہ اپنے مال میں اس کا تصرّف قانوناً نافذ ہوتا ہے۔ اس کی بیع، اس کا ہبہ اور اس کا مختار نامہ، سب کچھ قانوناً جائز ہے۔ (المغنی، ج ۲، ص ۶۴۴)

مسافر پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مسافر ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ کا مستحق ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر وہ صاحبِ نصاب ہے تو زکوٰۃ کا فرض اس پر سے ساقط ہو جائے گا۔ اس کا سفر اسے زکوٰۃ کا مستحق بناتا ہے اور اس کا مال دار ہونا اس پر زکوٰۃ فرض کرتا ہے۔

پاکستان کا مسلمان باشندہ اگر کسی غیر ملک میں مقیم ہو تو اس پر زکوٰۃ اُس صورت میں عائد ہوگی جب کہ اس کا مال یا جائداد یا کاروبار پاکستان میں بقدرِ نصاب موجود ہو۔ کسی مسلمان مملکت کا مسلمان باشندہ اگر پاکستان میں مقیم ہو اور یہاں اس کے پاس مال یا جائداد یا کاروبار بقدرِ نصاب ہو تو اس سے بھی زکوٰۃ وصول کی جائے گی، رہا وہ مسلمان جو کسی غیر مسلم حکومت کی رعایا ہو اور پاکستان میں رہتا ہو تو اسے ادائے زکوٰۃ پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اِلاّ یہ کہ وہ خود بخوشی دینا چاہے۔ اس لیے کہ اس کی آئینی حیثیت اس حکومت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی غیر مسلم رعایا سے مختلف نہیں ہے: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ۔ (الانفال ۸: ۷۲) رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آنہیں گئے تو اُن سے تمھارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

وجوب زکوٰۃ کی عمر

س: زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہونے کے لیے کتنی عمر کے شخص کو بالغ سمجھنا چاہیے؟

ج: زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہونے کے لیے کسی عمر کی قید نہیں ہے۔ جب تک کوئی یتیم سنِ رشد کو نہ پہنچے، اس کی زکوٰۃ اس کے ولی کے ذمے ہے اور جب وہ سنِ رشد کو پہنچ کر اپنے مال میں خود تصرف کرنے لگے تو وہ اپنی زکوٰۃ خود ادا کرنے کا ذمہ دار ہے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۰-۱۲۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

محل زکوٰۃ اشیا

شریعت میں جو اشیا محل زکوٰۃ ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

زرعی پیداوار، فصل کٹنے کے بعد، سونا چاندی، جبکہ وہ سال کے آغاز و اختتام پر بقدر نصاب یا اس سے زائد موجود ہوں، اسی طرح نقد روپیہ جو سونے چاندی کا قائم مقام ہو۔ مواشی جبکہ وہ افزائش نسل کے لیے پالے گئے ہوں اور سال کے آغاز و اختتام پر بقدر نصاب ہوں۔ اموالِ تجارت، جبکہ وہ سال کے آغاز و اختتام پر بقدر نصاب ہوں[1]۔ معادن و رکاز

الف: نقدی، سونے، چاندی اور زیورات پر زکوٰۃ ہے۔ زیور کی زکوٰۃ میں صرف اس سونے یا چاندی کے وزن کا اعتبار کیا جائے گا جو ان میں موجود ہو۔ جواہر خواہ زیور میں جڑے ہوئے ہوں یا کسی اور صورت میں ہوں زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص جواہر کی تجارت کرتا ہو تو اس پر وہی زکوٰۃ عائد ہو گی جو دوسرے اموالِ تجارت پر ہے۔ یعنی ان کی قیمت کا اڑھائی فیصدی۔ الفقه على المذاهب الاربعة میں لکھا ہے: موتی، یاقوت اور دوسرے تمام جواہر پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے جبکہ وہ تجارت کے لیے نہ ہوں۔ اس پر تمام مذاہب کا اتفاق ہے۔ (ج ۱، ص ۵۹۵)

ب: دھات کے سکّے اور کاغذی سکّے محلِ زکوٰۃ ہیں، کیونکہ ان کی قیمت ان کی دھات یا ان کے کاغذ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اُس قوتِ خرید کی بنا پر ہے جو قانوناً ان کے اندر پیدا کر دی گئی ہے، جس کی وجہ سے وہ سونے اور چاندی کے قائم مقام ہیں۔ الفقه على المذاهب الاربعة میں ہے: جمہور فقہا کی رائے یہ ہے کہ اوراقِ مالیہ پر زکوٰۃ ہے کیونکہ وہ تعامل میں سونے اور چاندی کے قائم مقام ہیں اور ان کو بلا تکلف سونے اور چاندی سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے ائمہ میں سے تین: ابوحنیفہؒ، مالکؒ اور شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ ان پر زکوٰۃ ہے۔ (ج ۱، ص ۶۰۵)

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۶-۱۲۷)

۱- معادِن اور زرعی پیداوار کے سوا تمام صورتوں میں وجوب زکوٰۃ کے لیے یہ شرط ہے کہ قدر نصاب یا اس سے زائد مال پر ایک سال گزر جائے۔ معادِن اور رکاز کے لیے سال گزرنے کی شرط نہیں ہے اور زرعی پیداوار پر فصل کٹنے کے ساتھ ہی زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، خواہ سال میں دو یا زائد فصلیں کاٹی جائیں۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (الانعام ۶:۱۴۱) اور اللہ کا حق ادا کرو جب فصل کاٹو۔
(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۴-۱۳۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مویشی

مویشی (اونٹ، گائے، بھینس، بکری اور جو اِن کے مانند ہوں) اگر افزائش نسل کی غرض سے پالے جائیں اور بقدرِ نصاب یا اس سے زائد ہوں تو ان پر وہ زکوٰۃ عائد ہوگی جو شریعت میں مواشی کے لیے مقرر ہے۔[1] اور اگر وہ تجارت کے لیے ہوں تو ان پر تجارتی زکوٰۃ ہے۔ یعنی اگر ان کی قیمت بقدرِ نصاب (دوسو درہم) یا اس سے زائد ہو تو ان پر ڈھائی فیصدی زکوٰۃ لی جائے گی اور اگر ان سے زراعت یا حمل و نقل کا کام لیا جاتا ہو، یا کسی شخص نے ان کو اپنے ذاتی استعمال کے لیے پالا ہو، تو ان کی تعداد خواہ کتنی ہی ہو ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔

مویشی کی زکوٰۃ نقدی کی صورت میں بھی وصول کی جا سکتی ہے اور خود مویشی بھی زکوٰۃ میں لیے جا سکتے ہیں۔ اس پر حضرت علیؓ کا فتویٰ ہے۔ (کتاب الاموال، ص ۳۶۸)

پولٹری فارم وغیرہ

مرغیاں اور دوسرے جانور اگر شوقیہ پالے جائیں تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ اگر تجارت کے لیے ہوں تو ان پر تجارتی زکوٰۃ ہے۔ اور اگر انڈوں کی فروخت کے لیے مرغی خانہ قائم کیا جائے تو اس کا وہی حکم ہے جو شیر خانہ اور دوسرے کارخانوں کا ہے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۲-۱۳۳)

آلاتِ پیدائش

کارخانوں کی مشینوں اور آلات پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی۔ صرف اس مال کی قیمت پر جو آخر سال میں ان کے پاس خام یا مصنوع شکل میں، اور اس نقد روپے پر جو ان کے خزانے میں موجود ہو عائد ہوگی۔ اسی طرح تاجروں کے فرنیچر، اسٹیشنری، دکان یا مکان اور اس نوعیت کی دوسری اشیا پر زکوٰۃ عائد نہ ہوگی۔ صرف اُس مال کی قیمت پر جو اُن کی دکان میں، اور اس نقد روپے پر جو ان کے خزانے میں ختم سال پر موجود ہو، عائد ہوگی۔[2] اس معاملے میں اصول یہ ہے کہ ایک شخص اپنے کاروبار میں جن عواملِ پیدائش سے کام لے رہا ہو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ لَيْسَ فِي الْإِبِلِ الْعَوَامِلِ صَدَقَةٌ (کتاب الاموال) یعنی کوئی شخص جن اونٹوں سے آب پاشی کا کام لیتا ہو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے کیونکہ اُن کی زکوٰۃ اس زرعی پیداوار سے وصول کر لی جاتی ہے جو ان کے عمل سے حاصل کی گئی ہو۔ اسی پر قیاس کر کے فقہا نے بالاتفاق دوسرے تمام

۱- اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سیرت النبی مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی، ج ۵، ص ۱۶۵-۱۶۷۔ (مؤلف)

۲- جو کاروبار اس نوعیت کے ہوں کہ ان کی زکوٰۃ کا حساب اس طرح نہ لگایا جا سکے (مثلاً اخبار) ان کے کاروبار کی مالیت، ان کی سالانہ آمدنی کے لحاظ سے رائج الوقت قاعدوں کے مطابق مشخص کی جائے اور اس پر زکوٰۃ عائد کی جائے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آلاتِ پیدائش کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

(رسائل ومسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۵)

زیورات

زیور کی زکوٰۃ کے بارے میں کئی مسلک ہیں۔ ایک مسلک یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اسے عاریتاً دینا ہی اس کی زکوٰۃ ہے۔ یہ انس بن مالکؓ، سعید بن مسیبؒ، قتادہ اور شعبی کا قول ہے۔ دوسرا مسلک یہ ہے کہ عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ زیور پر زکوٰۃ دے دینا کافی ہے اور تیسرا مسلک یہ ہے کہ جو زیور عورت ہر وقت پہنے رہتی ہو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے اور جو زیادہ تر رکھا رہتا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ چوتھا مسلک یہ ہے کہ ہر قسم کے زیور پر زکوٰۃ ہے۔ ہمارے نزدیک یہی آخری قول صحیح ہے۔ اوّل تو جن احادیث سے چاندی سونے پر زکوٰۃ کے وجوب کا حکم بیان ہوا ہے ان کے الفاظ عام ہیں۔ مثلاً یہ کہ فِیْ رِقَةٍ رُبْعُ الْعُشْرِ وَ لَیْسَ فِیْ مَادُوْنَ خَمْسِ اَوَاقٍ صَدَقَةٌ (چاندی میں [اڑھائی] فیصدی زکوٰۃ ہے اور پانچ اوقیہ سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے)۔ پھر متعدد احادیث و آثار میں تصریح ہے کہ زیور پر زکوٰۃ واجب ہے۔ چنانچہ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں قوی سند کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس کے ساتھ اس کی ایک لڑکی تھی جس کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے۔ آپؐ نے اس سے پوچھا کہ تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اَیَسُرُّكِ اَنْ يُّسَوِّرَكِ اللّٰهُ بِهِمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَوَارَيْنِ مِنَ النَّارِ (کیا تجھے پسند ہے کہ خدا قیامت کے روز تجھے ان کے بدلے آگ کے کنگن پہنائے؟) نیز مؤطا، ابوداؤد اور دارقطنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے: مَا اَدَّيْتَ زَكٰوتَهٗ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ (جس زیور کی زکوٰۃ تو نے ادا کر دی وہ کنز نہیں ہے) ابن حزم نے محلّٰی میں بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو جو فرمان بھیجا تھا اس میں یہ ہدایت بھی تھی: مُرْ نِسَآءَ الْمُسْلِمِيْنَ يُزَكِّيْنَ عَنْ حُلِيِّهِنَّ (مسلمان عورتوں کو حکم دو کہ اپنے زیوروں کی زکوٰۃ ادا کریں) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فتویٰ پوچھا گیا کہ زیور کا کیا حکم ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: اِذَا بَلَغَ مِائَتَيْنِ فَفِيْهِ الزَّكٰوةُ [جب وہ دو سو درہم کی مقدار کو پہنچ جائے تو اس میں زکوٰۃ ہے]۔ اسی مضمون کے اقوال صحابہ میں سے ابن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ اور حضرت عائشہؓ سے، تابعین میں سے سعید بن مسیّب، سعید بن جُبیر، عطاء، مجاہد، ابن سیرین اور زُہری سے اور ائمۂ فقہ میں سے سفیان ثوری، ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب سے منقول ہیں۔

(رسائل ومسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۳-۱۲۴)

بینکوں کی امانتوں کا حکم

بینکوں میں جو امانتیں رکھی ہوں وہ محلِ زکوٰۃ ہیں۔ دوسرے ادارے اگر رجسٹرڈ ہوں اور حکومت ان کے حساب کتاب کی پڑتال کر سکتی ہو، تو ان میں رکھی ہوئی امانتوں کا وہی حکم ہے جو بینک کی امانتوں کا ہے اور اگر وہ رجسٹرڈ نہ ہوں، نہ ان کے حساب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کتاب کی پڑتال کرنا حکومت کے لیے ممکن ہو، تو اُن میں رکھی ہوئی امانتیں اموالِ باطنہ کی تعریف میں آتی ہیں، جن کی زکوٰۃ وصول کرنا حکومت کا کام نہیں ہے۔ ان کے مالک خود ان کی زکوٰۃ نکالنے کے ذمہ دار ہیں۔

لیے ہوئے قرضوں کی زکوٰۃ

لیے ہوئے قرضے اگر ذاتی حوائج کے لیے لیے گئے ہوں اور خرچ ہو جائیں تو ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اگر قرض لینے والا سال بھر تک ان کو رکھے رہے اور وہ بقدر نصاب ہوں تو ان پر زکوٰۃ ہے اور اگر ان کو تجارت میں لگا لیا جائے تو وہ قرض لینے والے کا تجارتی سرمایہ شمار ہوں گے اور اس کی تجارتی زکوٰۃ وصول کرتے وقت اس کے ایسے قرضوں کو مستثنیٰ نہ کیا جائے گا۔

دیے ہوئے قرضوں کی زکوٰۃ

دیے ہوئے قرضے اگر بآسانی واپس مل سکتے ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بعض فقہا کے نزدیک ان کی زکوٰۃ سال بہ سال ادا کرنی ہوگی۔ یہ حضرت عثمانؓ، ابنِ عمرؓ، جابرؓ بن عبداللہ، طاؤسؒ، ابراہیم نخعیؒ اور حسن بصریؒ کا مسلک ہے اور بعض کے نزدیک جب وہ قرضے وصول ہوں تو تمام گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ یہ حضرت علیؓ، ابوثورؒ، سفیان ثوریؒ اور حنفیہ کا قول ہے۔ اور اگر ان قرضوں کی واپسی مشتبہ ہو تو اس بارے میں ہمارے نزدیک قولِ راجح یہ ہے کہ جب رقم واپس ملے اُس وقت صرف ایک سال کی زکوٰۃ نکالی جائے۔ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حسنؒ، لیثؒ، اوزاعیؒ اور مالکؒ کا قول ہے اور اس میں بیت المال اور صاحبِ مال، دونوں کے مفاد کی منصفانہ رعایت پائی جاتی ہے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۷-۱۲۸)

متوفی کے ترکے میں زکوٰۃ

متوفی کے ترکے سے پہلے وہ قرضے ادا کیے جائیں گے جو اس نے دوسرے لوگوں سے لیے ہوں، پھر زکوٰۃ کے بقایا، پھر وصیّت اور اس کے بعد جو کچھ بچے گا وہ وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ صاحبِ مال کی موت کی وجہ سے اس کی زکوٰۃ ساقط نہیں ہو جاتی۔ اُس نے چاہے وصیّت کی ہو یا نہ کی ہو، وہ اس کے مال میں سے نکالی جائے گی۔ عطاءؒ، زُہریؒ، قتادہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام محمدؒ، اسحاق بن راہویہؒ اور ابوثورؒ کی رائے قریب قریب یہی ہے۔ بعض فقہا نے یہ رائے دی ہے کہ اگر صاحبِ مال نے زکوٰۃ کے لیے وصیت کی ہو تو وہ نکالی جائے گی ورنہ نہیں۔ مگر ہماری رائے میں اس کا تعلق صرف اموالِ باطنہ سے ہے، کیونکہ اس میں اس امر کا احتمال ہے کہ صاحبِ مال نے اپنی موت سے پہلے زکوٰۃ نکال دی ہو اور دوسروں کو اس کی خبر نہ ہو۔ لیکن جبکہ اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کا باقاعدہ انتظام حکومت کر رہی ہو تو ایسا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا۔ اس لیے زکوٰۃ کے بقایا اس شخص کے ذمے بمنزلۂ قرض ہوں گے۔ پہلے اس کے مال میں سے افراد کا قرض وصول کیا جائے اور اس کے بعد خدا اور جماعت کا۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۹-۱۴۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مرہونہ جائداد پر زکوٰۃ

مرہونہ جائداد کی زکوٰۃ اس شخص سے وصول کی جائے گی، جس کے قبضے میں وہ ہو۔ مثلاً مرہونہ زمین اگر مرتہن کے قبضے میں ہے تو اس کا عشر اس سے وصول کیا جائے گا۔

متنازعہ جائداد کی زکوٰۃ

متنازع فیہ جائداد کی زکوٰۃ دورانِ نزع میں اس شخص سے لی جائے گی، جس کے قبضے میں وہ ہو اور فیصلہ ہونے کے بعد اس کی زکوٰۃ کا ذمہ دار وہ ہوگا جس کے حق میں فیصلہ ہو۔

قابل ارجاعِ نالش جائیداد کا حکم

قابلِ ارجاع نالش جائیداد کا بھی وہی حکم ہے جو اوپر بیان ہوا۔ وہ بالفعل جس شخص کے قبضے میں ہو اور جب تک رہے، اس کی زکوٰۃ اسی کے ذمے رہے گی، کیونکہ جو شخص کسی چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس کے واجبات بھی اسی کو ادا کرنے ہوں گے۔

عطیے کی زکوٰۃ

عطیہ اگر بقدر نصاب ہو اور اس پر سال گزر جائے تو جس شخص کو وہ دیا گیا ہو اس سے زکوٰۃ لی جائے گی۔

بیمے اور پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ

بیمہ اور پراویڈنٹ فنڈ اگر جبری ہوں تو ان کا حکم وہی ہے جو عسیر الحصول قرضوں اور امانتوں کا ہے۔ یعنی جب ان کی رقم واپس مل جائے تو صرف ایک سال کی زکوٰۃ نکالنی ہوگی اور اگر وہ اختیاری ہوں تو ہمارے نزدیک ہر سال کے خاتمے پر جتنی رقم ایک شخص کے حساب میں بیمہ کمپنی یا پراویڈنٹ فنڈ میں جمع ہو اس پر زکوٰۃ وصول کی جانی چاہیے کیونکہ اگرچہ یہ رقم اب اس کے لیے قبل از وقت قابلِ وصول نہیں ہے، لیکن اس نے اپنے مال کو باختیار خود اس حالت میں ڈالا ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ وہ زکوٰۃ سے بچ جائے۔

ڈیری فارم کے مویشیوں پر زکوٰۃ

شیر خانہ (ڈیری فارم) کے مویشی عوامل کی تعریف میں آتے ہیں۔ اس لیے ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ البتہ شیر خانے کی مصنوعات پر اسی طریقے سے زکوٰۃ عائد ہوگی جس طرح دوسرے کارخانوں پر۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پھلوں، پھولوں اور سبزیوں کی زکوٰۃ

زرعی پیداوار میں جو چیزیں ذخیرہ کرکے رکھنے کے قابل ہوں [اُن] پر عُشر یا نصف عُشر ہے اور یہی حکم ان پھلوں کا بھی ہے جو ذخیرہ کرکے رکھے جاسکتے ہوں جیسے خشک میوہ اور چھوہارے۔ جو زراعت بارانی زمینوں میں ہو اس پر عُشر واجب ہوگا اور جس میں مصنوعی ذرائع سے آب پاشی کی جائے اس پر نصف عُشر۔[1] سبزی، ترکاری، پھول اور پھل جو ذخیرہ کرکے نہیں رکھے جاسکتے، اُن پر عُشر تو نہیں ہے۔ لیکن اگر زمیندار انھیں مارکیٹ میں فروخت کرتا ہے تو اس پر تجارتی زکوٰۃ عائد ہوگی جبکہ وہ بقدر نصاب ہو۔ اس معاملے میں نصاب وہی ہوگا جو تجارت میں معتبر ہے، یعنی اس کاروبار کا تجارتی سرمایہ سال کے آغاز و اختتام پر دو سو درہم یا اس سے زائد ہو۔

معدنیات کی زکوٰۃ

معدنیات کے بارے میں ہمارے نزدیک سب سے بہتر مسلک حنابلہ کا ہے۔ یعنی وہ تمام چیزیں جو زمین سے نکلتی ہیں، خواہ وہ دھات کی قسم سے ہوں یا مائعات (پٹرول، پارہ وغیرہ) کی قسم سے، ان سب پر ڈھائی فیصدی زکوٰۃ ہے جبکہ ان کی قیمت بقدرِ نصاب ہو اور جبکہ وہ پرائیویٹ ملکیت میں ہوں۔ اس مسلک پر عمر بن عبدالعزیز کی حکومت میں عمل بھی تھا۔ (المغنی لابن قدامہ، ج ۲، ص ۵۸۱)

برآمد شدہ دفینہ اور آثارِ قدیمہ

برآمد شدہ دفینہ (رکاز) کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ فِی الرِّکَازِ الْخُمُسُ یعنی اس میں خمس (۲۰ فیصدی) لیا جائے گا۔ آثارِ قدیمہ، یعنی وہ قیمتی نوادرات جو کسی نے بطور یادگار اپنے گھر میں رکھ چھوڑے ہوں، ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ بغرضِ تجارت ہوں تو ان پر تجارتی زکوٰۃ ہے۔

۱۔ س: کیا مالیہ ادا کرتے ہوئے بھی ہم عُشر نکالنے کے پابند ہیں؟

ج: جی ہاں! جس طرح ٹیکس ادا کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم ختم نہیں ہوجاتا، اسی طرح مالیہ عُشر پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔

کچھ توقف کے بعد مزید فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ جب اسلامی حکومت قائم ہوگی، تو مالیہ ختم کردے گی۔ اس سے جتنا کچھ حاصل ہوتا ہے وہ بہت کم ہوتا ہے اور کاروبارِ مملکت چلانے میں مالیے کی آمدنی کا کوئی خاص حصہ بھی نہیں ہوتا۔

س: کیا زکوٰۃ اور عُشر کی نوعیت ایک ہی ہے؟

ج: زکوٰۃ اور عُشر کی بنیاد ایک ہی ہے کہ جس طرح بندے کے مال میں خدا کا حق ہے، اسی طرح اس کی زمین میں بھی خدا کا حق ہے۔ پھر جس طرح زکوٰۃ صرف غرباء کے لیے ہے اسی طرح عُشر بھی غریبوں کے لیے ہے۔ (۵-اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۴۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شہد کی زکوٰۃ

شہد کے بارے میں یہ بات مختلف فیہ ہے کہ آیا بجائے خود شہد کی ایک مقدار میں سے زکوٰۃ وصول کی جانی چاہیے یا اس کی تجارت پر وہی زکوٰۃ عائد کی جائے جو تجارتی مال پر ہے۔ حنفیہ اس بات کے قائل ہیں کہ شہد بجائے خود محلِ زکوٰۃ ہے اور یہی مسلک احمدؒ، اسحاق بن راہویہؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ، ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ کا ہے اور امام شافعیؒ کا بھی ایک قول اس کے حق میں ہے۔ بخلاف اس کے امام مالک اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ شہد بجائے خود محلِ زکوٰۃ نہیں ہے۔ امام شافعیؒ کا بھی مشہور قول یہی ہے اور امام بخاری کہتے ہیں کہ لَیْسَ فِیْ زَکٰوۃِ الْعَسَلِ شَیْءٌ یَّصِحُّ شہد کی زکوٰۃ کے معاملے میں کوئی حدیث صحیح موجود نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ شہد کی تجارت پر زکوٰۃ عائد کی جائے۔

آبی پیداوار کی زکوٰۃ

مچھلی بجائے خود محلِ زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ اس کی تجارت پر وہی زکوٰۃ واجب ہے جو اموال تجارت پر عائد ہوتی ہے۔ موتی، عنبر اور دوسری وہ چیزیں جو سمندر سے نکلتی ہیں، وہ ہمارے نزدیک معدنیات کے حکم میں ہیں اور ان پر وہی زکوٰۃ عائد ہونی چاہیے جو معدنیات میں بیان ہو چکی ہے۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے اور اسی پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکومت کا عمل رہا ہے۔

(کتاب الاموال، ص ۳۴۹، المغنی لابن قدامہ، ج ۲، ص ۵۸۴)

درآمدات و برآمدات کی زکوٰۃ

برآمد پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ درآمد پر جو محصول حضرت عمرؓ کے زمانے میں لیا جاتا تھا، اس کی حیثیت زکوٰۃ کی نہ تھی، بلکہ وہ صرف جواب تھا، اس محصول کا جو ہمسایہ حکومتیں اسلامی مملکت کے مال کی درآمد پر اپنے ملک میں وصول کرتی تھیں۔

سکوں کی زکوٰۃ

ہر قسم کے سکوں پر زکوٰۃ عائد ہوگی، جو سکے رائج نہیں ہیں یا جو خراب ہیں، یا جو حکومت نے واپس لے لیے ہیں، ان میں اگر چاندی یا سونا موجود ہو، تو ان پر چاندی یا سونے کی اُس مقدار کے لحاظ سے زکوٰۃ عائد ہوگی جو ان کے اندر پائی جاتی ہے۔

دوسرے ملکوں کے سکے، اگر ہمارے ملک کے سکوں سے بآسانی تبدیل کیے جاسکتے ہوں تو ان کا حکم نقدی کا ہے اور اگر تبدیل نہ کیے جاسکتے ہوں تو ان پر صرف اس صورت میں زکوٰۃ عائد ہوگی جبکہ ان کے اندر بقدرِ نصاب سونا یا چاندی موجود ہو۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۸:۔ ۱۳۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرایہ پر دی جانے والی اشیا

جو اشیا کرایہ پر دی جاتی ہیں ان کی مالیت رائج الوقت قواعد کے مطابق ان کے منافع سے تشخیص کی جائے، اور اس پر ڈھائی فیصدی زکوٰۃ لی جائے۔ لیث بن سعد کہتے ہیں: میں نے دیکھا ہے کہ جو اونٹ کرائے پر چلائے جاتے ہیں ان پر مدینے میں زکوٰۃ لی جاتی تھی۔ (کتاب الاموال، ص ۳۷٦)

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۲)

س: [اوپر] کرایہ پر دی جانے والی اشیا کے قابلِ زکوٰۃ ہونے کی رائے ظاہر کی گئی ہے۔ اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس اصول کا اطلاق کرایہ پر چلائی جانے والی ٹیکسی، ٹرک اور بسوں کی مالیت پر بھی ہونا چاہیے۔ اسی طرح جو شخص متعدد مکانات اور دکانوں کا مالک ہو اور ان کو کرایہ پر اٹھاتا ہو اس سے بھی مکانات کی جملہ مالیت کا ڈھائی فیصد ٹیکس وصول کرنا چاہیے۔ مجھے ان دونوں شکلوں میں زکوٰۃ کے وجوب پر دو وجوں سے شبہ ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ سلف سے آج تک کرایہ پر دیے جانے والے مکانات کی جملہ مالیت پر زکوٰۃ واجب ہونے کی رائے یا اس پر عمل سننے میں نہیں آیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کتاب الاموال، ص ۳۷٦ کی لیث بن سعد کی جو روایت آپ نے دلیل کے طور پر پیش کی ہے۔ اس سے یہاں استدلال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کرایہ کے اونٹوں کا کرایہ پر چلانا وجوبِ زکوٰۃ کا سبب نہیں ہے بلکہ وجوبِ زکوٰۃ کی بنا ان کا اونٹ ہونا ہے۔ امید ہے کہ اس مسئلے پر مزید روشنی ڈال کر یہ کھٹک دُور کریں گے۔

ج: کرایہ پر دی جانے والی اشیا کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ مختصر تھا۔ اس لیے بات واضح نہ ہو سکی۔ میرا مدعا یہ ہے کہ جو لوگ فرنیچر یا موٹریں یا ایسی دوسری چیزیں کرائے پر چلانے کا کاروبار کرتے ہیں ان کے کاروبار کی مالیت اُس منافع کے لحاظ سے مشخص کرنی چاہیے جو اس کاروبار میں ان کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس فرنیچر یا ان موٹروں کی قیمت پر زکوٰۃ محسوب کی جائے جسے وہ کرائے پر چلاتے ہیں کیونکہ یہ تو وہ آلات ہیں جن سے وہ کام کرتے ہیں اور آلات کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں لگتی۔ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کاروبار جو منافع دے رہا ہے اُس کی بنا پر یہ رائے قائم کی جائے گی کہ اس قدر منافع دینے والے کاروبار کی مالیت کیا قرار پانی چاہیے۔ رہے کرایہ کے مکانات تو ان کے بارے میں مجھے بھی اس پر تأمل ہے کہ سلف سے ان پر زکوٰۃ لگائے جانے کا ثبوت نہیں ملتا۔

الابل العوامل [کام کرنے والے اونٹوں] پر زکوٰۃ نہ لگنے کی وجہ وہی ہے جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ ایک آدمی جن آلات یا حیوانات کے ذریعے سے کام کرتا ہو ان پر زکوٰۃ نہیں لگتی۔ مثلاً ہل چلانے والے بیل یا بار برداری کے جانور۔ ان پر زکوٰۃِ مواشی عائد نہ ہوگی۔ اسی طرح ڈیری فارم کے جانوروں پر زکوٰۃِ مواشی عائد نہ ہوگی۔ ان کی زکوٰۃ تو اُس پیداوار پر زکوٰۃ لگنے کی صورت میں وصول ہو جاتی ہے، جو ان کے ذریعے سے حاصل کی گئی ہو۔ کرایہ پر چلائے جانے والے اونٹوں پر بھی عوامل کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لیے ان پر بھی زکوٰۃِ مواشی عائد نہ ہونی چاہیے اور نہ ان کی مالیت پر زکوٰۃ لگنی چاہیے بلکہ اس کرایہ کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کاروبار کی جو (good will) مشخص ہو اس پر زکوٰۃ لگنی چاہیے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۳۲۸-۳۳۱)

س: کرایہ پر چلائی جانے والی اشیا کی زکوٰۃ کا مسئلہ...... واضح نہیں ہوا۔ آپ نے جو شکل تجویز فرمائی ہے یعنی کاروبار کی (good will) اور منافع کی بنیاد پر اس کی مجموعی مالیت کا اندازہ لگایا جائے۔ اس پر متعدد اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس طرح قابلِ زکوٰۃ مال کا حساب کم سے کم ان اشیا کی مجموعی قیمت کے برابر اور بعض اوقات اس سے زیادہ آئے گا کیونکہ اگر کاروباری ادارہ پرانا اور اچھا ہے تو (good will) کی مالیت خاصی ہوگی۔ دوسرا یہ کہ اس شکل کو اختیار کرنے کی شرعی دلیل کیا ہے؟ سلف سے اس طرح کی کوئی شکل منقول نہیں جبکہ کشتیوں، سواری کے جانوروں، مکانات و دکانوں وغیرہ کو کرایہ پر چلانے کا رواج قدیم ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ شریعت نے بعض واضح مصالح کے پیشِ نظر مالِ ظاہر اور مالِ باطن کے درمیان فرق کیا ہے اور مالِ باطن[1] کی مقدار کا اعلان صاحب مال کے اوپر چھوڑ دیا ہے۔ اگر محصّلِ زکوٰۃ اور اس شخص کے درمیان اختلاف ہوتا ہے جو کرایہ پر چلانے کا کاروبار کرتا ہے تو فیصلہ کیسے ہوگا؟ امید ہے کہ مسئلے کے ان پہلوؤں پر غور فرما کر اپنی رائے سے مطلع فرمائیں گے۔

ج: کرایہ پر چلانے کے کاروبار کی زکوٰۃ کا معاملہ اچھا خاصا پیچیدہ ہے۔ اس میں متعدد اصولی مشکلات کو میں خود بھی محسوس کرتا ہوں اور اس باب میں احادیث و آثار سے بھی کوئی واضح رہنمائی نہیں ملتی۔ اس میں بڑی مشکل یہ ہے کہ جس سامان کو کرایہ پر چلایا جاتا ہے وہ مالِ تجارت کی تعریف میں نہیں آتا بلکہ آلاتِ پیدائش سے اشبہ ہے۔ اس لیے اس کی قیمت پر زکوٰۃ عائد کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس کو خارج کرنے کے بعد اس کاروبار میں ختمِ سال پر بجز نقد موجود (cash in hand) یا بینک بیلنس کے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی، جس پر زکوٰۃ عائد ہو۔ حالانکہ کاروبار لاکھوں کا ہوتا ہے بلکہ اب تو اس نوعیت کے کاروبار بہت بڑے پیمانے پر چل رہے ہیں۔ ان وجوہ سے میں نے کاروبار کی مالیت کا ایک فارمولا سوچا ہے، لیکن یہ بالکل اجتہادی چیز ہے اور اس پر دوسرے اہلِ علم کو بھی غور کرنا چاہیے۔

مالِ ظاہر اور مالِ باطن میں فرق کرتے ہوئے آپ نے جو اعتراض کیا ہے وہ کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے۔ اگر کسی مال کے مالِ باطن ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہو، یا مالِ باطن کا جو اعلان صاحب مال نے کیا ہو، اسے محصّل تسلیم نہ کر رہا ہو، تو ان دونوں صورتوں کا فیصلہ ایک غیر جانب دار عدالت کر سکتی ہے۔ یہ کوئی ایسی پیچیدگی نہیں ہے جسے حل نہ کیا جا سکتا ہو۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۳۳۲-۳۳۴)

۱- مالِ ظاہر وہ ہے جس کا معائنہ اور تشخیص عاملینِ حکومت کر سکتے ہوں اور مالِ باطن وہ جو عاملینِ حکومت کے لیے قابلِ معائنہ و تشخیص نہ ہو۔ بینکوں میں جمع شدہ رقوم مالِ ظاہر کی تعریف میں آتی ہیں۔ مالِ نامی وہ ہے جو یا تو طبعاً افزائش کے قابل ہو، یا جسے سعی و عمل سے بڑھایا جا سکے۔ اس تعریف کی رو سے زکوٰۃ انھی اموال پر عائد کی گئی ہے جو نامی ہیں اور جمع شدہ روپے پر اس لیے عائد کی جاتی ہے کہ اس کے مالک نے اسے نمو سے روک رکھا ہے۔ (رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مضاربت کی صورت میں زکوٰۃ

س: دو آدمی شرکت میں کاروبار شروع کرتے ہیں۔ شریکِ اوّل سرمایہ لگاتے ہیں اور محنت بھی کرتے ہیں۔ شریکِ ثانی صرف محنت کے شریک ہیں۔ منافع کی تقسیم اس طرح پر طے پاتی ہے کہ کل منافع کے تین حصے کیے جائیں گے۔ ایک حصہ سرمایہ کا اور ایک ایک حصہ ہر دو شُرکا کا ہوگا۔ اس کاروبار کی زکوٰۃ کے متعلق دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے جوابات سے مطلع فرمائیں:

(ا) اگر کاروبار کے مجموعی سرمایے سے یکجا زکوٰۃ نکالی جائے تو شریک ثانی کو یہ اعتراض ہے کہ کاروبار کا سرمایہ صاحبِ سرمایہ کی ملکیت ہے اور اس پر اسے علیٰحدہ منافع بھی ملتا ہے، لہٰذا سرمایہ پر زکوٰۃ سرمایہ دار کو ہی دینی چاہیے۔ کیا شریکِ ثانی کا یہ اعتراض درست ہے؟

(ب) کاروبار میں نفع اور نقصان دونوں کا امکان ہے۔ زکوٰۃ کا نفع و نقصان سے نہیں بلکہ سرمایے سے تعلق ہے۔ کاروبار میں نقصان کی صورت میں بھی موجود سرمایے پر زکوٰۃ دی جائے گی۔ اگر نقصان کی صورت میں کاروبار سے زکوٰۃ نکالی جائے تو شریکِ ثانی کے حصے کی زکوٰۃ کی ایک تہائی رقم اس کے اگلے سال کے منافع سے نکالی جائے گی۔ ایسی صورت میں شریکِ ثانی کے لیے یہ زکوٰۃ نہیں رہی بلکہ سرمایہ دار کے سرمایے کی زکوٰۃ کا ایک حصہ ادا کرنے کا ٹیکس ہو جاتا ہے۔ کیا یہ صورت زکوٰۃ کے اصل مقصد کے منافی نہیں ہے؟

ج: آپ کے دونوں سوالوں کے جوابات درج ذیل ہیں:

(ا) شریکِ ثانی کا اعتراض درست نہیں ہے۔ زکوٰۃ صرف اُس سرمایے پر نہیں لگتی ہے جس سے کاروبار شروع کیا گیا ہو بلکہ کل کاروبار کی مالیت پر لگتی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پورے کاروبار سے پہلے زکوٰۃ نکال لی جائے۔ پھر منافع اسی نسبت سے فریقین کے درمیان تقسیم ہو، جو ان کے درمیان طے ہو چکی ہو۔

(ب) اموالِ تجارت کی زکوٰۃ کا اصول یہ ہے کہ کوئی مالِ تجارت اگر قدرِ نصاب سے زائد ہو تو اُس سے زکوٰۃ نکالی جانی چاہیے۔ اب جو شخص صرف کام کا شریک ہے، اس کی محنت نے بہر حال اس تجارت میں مالیت پیدا کرنے میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہے۔ یہ مالیت صرف ابتدائی سرمایے ہی کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس لیے اس زکوٰۃ کے دو حصے سرمایہ دار کو ادا کرنے چاہییں اور ایک حصہ شریکِ محنت کو ادا کرنا چاہیے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۸-۱۵۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کمپنیوں کی زکوٰۃ

س: کیا کمپنیوں کو زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے یا ہر حصے دار کو اپنے اپنے حصے کے مطابق فرداً فرداً زکوٰۃ ادا کرنے کا ذمہ دار ٹھیرایا جائے؟

ج: کمپنیوں کے بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ جو حصہ دار قدرِ نصاب سے کم حصے رکھتے ہوں، یا جو ایک سال سے کم مدت تک اپنے حصے کے مالک رہے ہوں ان کو مستثنیٰ کر کے باقی تمام حصہ داروں کی اکٹھی زکوٰۃ کمپنیوں سے وصول کی جانی چاہیے۔ اس میں انتظامی سہولت بھی ہے اور اس طریقے میں کوئی بات ایسی بھی نہیں ہے جو اصولِ شرع میں سے کسی اصل کے خلاف پڑتی ہو۔ ہماری یہ رائے امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور متعدد دوسرے فقہا کے مسلک کے مطابق ہے۔ (بدایۃ المجتھد، ج ا، ص ۲۲۵)

س: جن کمپنیوں کے حصص قابلِ انتقال ہیں، ان کے سلسلے میں تشخیص زکوٰۃ کے وقت کس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی؟ حصص کے خریدنے والے یا فروخت کرنے والے پر؟

ج: کمپنیوں کے جو حصے قابلِ فروخت ہوں وہ جب سال کے دوران میں فروخت کر دیے جائیں تو اس سال نہ ان کے بائع پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ مشتری پر۔ کیونکہ دونوں میں سے کسی کی ملکیت پر بھی سال نہ گزرے گا۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۴-۱۲۶)

تجارتی حصص کی زکوٰۃ

س: کسی مشترکہ کاروبار مثلاً کسی کمپنی کے حصص کی زکوٰۃ کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آ سکا۔ حصہ بجائے خود تو کوئی قیمتی چیز نہیں ہے، محض ایک کاغذ کا ٹکڑا[1] ہے۔ صرف اس دستاویز کے ذریعے حصہ دار کمپنی کی املاک و جائداد مشترکہ میں شامل ہو کر بقدر اپنے حصہ کے مالک یا حصہ دار قرار پاتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کمپنی کے املاک کیا اور کس نوعیت کے ہیں۔ اگر کمپنی کی جائداد تعمیرات (بلڈنگ) اراضیات اور مشینری پر مشتمل ہو تو حصہ دار کی شراکت بھی ایسے ہی املاک کی ہوگی جس پر آپ کے بیان کردہ اصول کے ماتحت زکوٰۃ نہیں آتی۔ حصہ دار کے حصے کی مالیت تو ضرور ہے لیکن وہ اس تمام مالیت کا جزو ہے جو غیر منقولہ جائداد کی شکل میں کمپنی کو مجموعی حیثیت سے حاصل ہے۔ پھر حصہ دار کے حصے پر زکوٰۃ کیوں عائد ہونی چاہیے؟

۱- 'حصہ' کے متعلق سائل نے بہت ہی غلط تصور پیش کیا ہے۔ کاغذ کا ٹکڑا نہ حصہ ہوتا ہے نہ اصل اہمیت رکھتا ہے بلکہ وہ ایک دستاویز ہوتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ فلاں شخص فلاں کاروبار میں اس تناسب سے حصہ دار ہے۔ اگر دو آدمی ایک دکان میں برابر کے شریک ہوں اور وہ اپنی شراکت کے لیے دستاویز لکھ کر رکھ لیں تو دستاویز ان کا اصل حصہ' شرکت نہیں ہوگی بلکہ ان کی حصہ داری کا ثبوت ہوگی۔ یہی صورت زیادہ حصہ داروں کے مشترک کاروبار کی ہے۔ یہ بھی غلط کہا گیا ہے کہ 'حصہ بجائے خود تو کوئی قیمتی چیز نہیں' ہے حالانکہ دراصل حصہ ہی بجائے خود قیمتی چیز ہے کیونکہ 'حصہ' نام ہے کسی تناسب سے ایک کاروبار اور اس کے سرمایے اور متعلقہ املاک کے حقوقِ مالکانہ میں شریک ہونے کا اور حصہ کی قیمت دراصل انھی حقوقِ مالکانہ کی قیمت ہوتی ہے۔ حصہ کوئی خیالی وجود نہیں بلکہ ایک ٹھوس مادّی حقیقت ہے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ج: کمپنی کے جس حصے دار کے حصے کی مالیت بقدرِ نصاب ہے، اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ قدرِ نصاب کا مالک ہے۔ اب اگر اس نے اپنے اس روپے کو کمپنی کے کاروبار میں لگا رکھا ہے تو اُس سے اُس کے حصے کی مالیت کے لحاظ سے انفرادی طور پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی بلکہ کمپنی سے تجارتی زکوٰۃ کے قواعد کے مطابق تمام ایسے حصہ داروں کی زکوٰۃ اکٹھی لے لی جائے گی جن کو زکوٰۃ ادا کرنے کے قابل قرار دیا گیا ہو۔ کمپنی کی زکوٰۃ کا حساب لگانے میں مشینری، مکان، فرنیچر وغیرہ عواملِ پیدائش کو مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔ اس کے باقی ماندہ املاک جو اموالِ تجارت پر مشتمل ہوں اور اس کے خزانے کی رقم جو ختم سال پر موجود ہو ان سب پر زکوٰۃ لے لی جائے گی اور اگر کمپنی کا کاروبار اس نوعیت کا نہ ہو تو اس کی سالانہ آمدنی کے لحاظ سے اس کی مالی حیثیت مشخص کی جائے گی اور اس پر زکوٰۃ لگا دی جائے گی۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۶-۱۴۸)

س: اب تک تجارتی حصص پر زکوٰۃ کے متعلق آپ کی جو تحریریں میری نظر سے گزری ہیں ان میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ اسلامی ریاست یا کم از کم تحصیلِ زکوٰۃ کا ایک مرکزی نظام موجود ہے۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کس مرحلہ پر اور کس سے وصول کی جائے گی۔ جب تک کوئی مرکزی تنظیمِ زکوٰۃ قائم نہ ہو اس وقت تک حصص پر زکوٰۃ کی کیا صورت ہوگی؟ اس وقت بہت سے لوگوں کے پاس تجارتی حصے ہیں، وہ ان پر کس شرح سے زکوٰۃ ادا کریں؟

میں نے اپنے حصص کو روپے کا نعم البدل قیاس کرتے ہوئے ان کی مالیت پر ڈھائی فیصد نکالنا چاہا تھا لیکن حصص کی سالانہ آمدنی ٹیکس کٹ کٹا کر جتنی ملتی ہے وہ پوری ان کی زکوٰۃ میں چلی جاتی ہے۔ بعض حصص سے آمدنی اتنی کم ہوتی ہے کہ الٹا جیب سے زکوٰۃ ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ صورت قطعاً غیر تشفی بخش ہے......

ج: تجارتی حصص کی زکوٰۃ اس اصول پر نہیں نکالی جائے گی کہ گویا حصے کی رقم آپ کے پاس جمع ہے اور آپ جمع شدہ روپے کی زکوٰۃ نکال رہے ہیں بلکہ ان کی زکوٰۃ تجارتی مال کی زکوٰۃ کے اصول پر نکالی جائے گی۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ کاروبار شروع ہونے کی تاریخ پر جب ایک سال گزر جائے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کے پاس تجارتی مال (stock in trade) کس قدر موجود ہے اور وہ کس مالیت کا ہے اور نقد روپیہ (cash in hand) کتنا ہے۔ دونوں کے مجموعے پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔ اسی قاعدے پر دیکھا جائے گا کہ کمپنی یا کمپنیوں میں آپ کے جو حصے ہیں، اس وقت بازاری قیمت کے لحاظ سے ان کی قیمت کیا ہے۔ سال کے دوران میں آدمی نے خواہ کتنی ہی مرتبہ پہلا حصہ فروخت کیا ہو اور دوسرا خریدا ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پہلا حصہ جب آپ نے خریدا اس وقت سے سال شمار کیا جائے گا اور سال کے خاتمے پر آپ کے حصوں کی جو بازاری قیمت ہو اس کے لحاظ سے زکوٰۃ کا تعین کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ آپ کے پاس نقد کس قدر موجود ہے۔ دونوں کے مجموعے پر ۱/۴۰ کی شرح سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

رہی یہ بات کہ ٹیکس لگ کر آپ کی بقیہ آمدنی اتنی کم رہ جاتی ہے کہ زکوٰۃ دینے کی صورت میں وہ پوری کی پوری زکوٰۃ ہی میں چلی جاتی ہے تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ یہ تو ایسی حکومتوں کے ماتحت رہنے کی سزا ہے جو ٹیکس عائد کرتے وقت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سرے سے زکوٰۃ کا کوئی لحاظ ہی نہیں کرتیں۔ یہ سزا ہمیں لازماً اس وقت تک بھگتنی ہوگی جب تک اس حکومت کا نظام ہم بدل نہ دیں، جس میں ہم رہتے ہوں۔

(رسائل ومسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۳۱۶-۳۲۲)

س: تجارتی حصص کی زکوٰۃ کے بارے میں...... آپ کی تحریریں سامنے ہیں۔

اصول کا تقاضا یہ ہے کہ شرکت پر دیے ہوئے سرمائے کی زکوٰۃ صرف ایک بار وصول کی جائے۔ اس اصول کے مطابق اگر آپ کی نومبر ۱۹۵۰ء [صفحہ ۳۳۳] کی تحریر کے مطابق کمپنی سے زکوٰۃ یکجا وصول کر لی جائے[1] تو پھر افراد سے ان کے مملوکہ تجارتی حصص پر نہیں وصول کرنا چاہیے۔ یہ بات بھی محل نظر ہے کہ جو حصہ دار قدر نصاب سے کم حصے رکھتے ہوں یا جو ایک سال سے کم اپنے حصے کے مالک رہے ہوں.........ان کو مستثنیٰ کرکے کمپنی سے حصص پر زکوٰۃ لی جائے۔ اکثر اوقات اس کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ جو حصہ دار ایک مخصوص کمپنی میں نصاب سے کم قیمت کے حصے کا مالک ہے وہ خود صاحب نصاب ہے یا نہیں؟

www.kitabosunnat.com

مسئلے کا ایک اور پہلو قابلِ توجہ ہے۔ افراد سے ان کے مملوکہ حصص پر زکوٰۃ لینے اور کمپنی کے جملہ حصص پر زکوٰۃ لینے کے معاشی اثرات بالکل مختلف ہوں گے۔ کمپنی کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ سالانہ زکوٰۃ کی رقم کو اپنی لاگت کا ایک مستقل جز سمجھ کر اسی حساب سے اپنے مال کی قیمت بڑھانے کی کوشش کرے کیونکہ ضروری نہیں کہ پوری زکوٰۃ نفع ہی سے ادا کرنا ہمیشہ ممکن ہو یا ہمیشہ زکوٰۃ دینے کے بعد بھی حصہ داروں کو دینے کے لیے کچھ نفع بچ رہے۔ افراد سے زکوٰۃ لی جائے تو قیمتوں پر یہ اثر نہیں مرتب ہوگا۔

ج: زکوٰۃ کے متعلق نومبر ۱۹۵۰ء کے ترجمان میں [صفحہ ۳۳۳ پر] جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حکومت کے سوالنامے کا جواب تھا۔ اُس میں جواب اس مفروضہ پر دیا گیا تھا کہ سرکاری طور پر کمپنیوں سے زکوٰۃ وصل کی جائے گی۔ جولائی ۱۹۶۲ء کے ترجمان میں [پچھلے صفحے پر] ایک سوال کا جواب اس مفروضہ پر دیا گیا ہے کہ کمپنی زکوٰۃ نہیں نکالے گی بلکہ ایک ایک حصہ دار اپنی زکوٰۃ خود نکالے گا۔ اس فرق کو نگاہ میں رکھ کر آپ دونوں جوابات کو پڑھیں۔ کمپنی جب زکوٰۃ نکال دے گی تو ایک ایک حصہ دار کی الگ الگ زکوٰۃ نکلنے کا پھر کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ کمپنی کے لیے یہ مشکل ہے کہ ایک ایک حصہ دار کے متعلق یہ تحقیق کرے کہ وہ بجائے خود صاحب زکوٰۃ ہے کہ نہیں۔ یہ تو ایسے حصہ داروں کا اپنا کام ہے کہ وہ کمپنی کو اپنے صاحب نصاب نہ ہونے کی اطلاع دیں تاکہ ان کے ذمے کی زکوٰۃ محسوب نہ ہو۔

تحصیلِ زکوٰۃ اگر سرکاری انتظام میں ہو تو محصل زکوٰۃ سے یہ بات نہیں چھپ سکتی کہ کمپنی نے اپنی نکالی ہوئی زکوٰۃ کو اپنے کاروباری مصارف میں شمار کرکے قیمتیں بڑھائی ہیں۔ اس چیز کی روک تھام سرکاری طور پر ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر سرکاری انتظام نہ ہو تو اس صورت میں صرف وہی کمپنی بطور خود اپنی زکوٰۃ نکالے گی جس کے چلانے والوں میں کوئی دینی حس موجود ہوگی۔ ایسے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لوگوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایک ہاتھ سے زکوٰۃ نکال کر دوسرے ہاتھ سے اس کو وصول کرنے کی تدبیریں اختیار کریں گے اور بالفرض اگر وہ ایسا کریں تو دوسرے سال ان پر زکوٰۃ زیادہ لگ جائے گی۔ پھر قیمتیں بڑھائیں گے تو زکوٰۃ کے حساب میں مزید اضافہ ہوگا۔ یہاں تک کہ آخر کار قیمتیں بڑھانا ممکن نہ رہے گا۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۳۲۶-۳۳۰)

س: تجارتی حصص کی زکوٰۃ سے متعلق آپ کی وضاحت کے بعد بھی ایک مسئلہ حل طلب رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ تحصیلِ زکوٰۃ کے اعتبار سے ان دو شکلوں کو برابر کی متبادل شکلوں کی حیثیت نہیں دی جاسکتی کہ حصہ داروں سے حصص کے بازاری نرخ کے مطابق زکوٰۃ وصول کرلی جائے یا کمپنی سے تجارت کی زکوٰۃ کے اصول پر زکوٰۃ وصول کی جائے۔ دونوں شکلوں میں وصول کی جانے والی زکوٰۃ میں مقدار کے اعتبار سے زبردست فرق ہونا لازم ہے۔

حسابِ زکوٰۃ میں اس تفاوت کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ یہ بات متعین کردی جائے کہ زکوٰۃ دونوں طریقوں میں سے کس طریقے سے وصول کی جائے گی......

ج: کمپنیوں کی زکوٰۃ کے معاملے میں دو ہی شکلیں ممکن ہیں۔ یا تو اسلامی حکومت موجود ہوگی اور تحصیلِ زکوٰۃ کا باقاعدہ انتظام کرے گی، یا کوئی اجتماعی انتظام ہوگا اور احساسِ فرض رکھنے والے افراد کو خود اپنی زکوٰۃ نکالنی ہوگی۔ پہلی صورت میں کمپنی کے سارے حسابات دیکھ کر فیصلہ کیا جائے گا اور جن اثاثوں پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی ان کو حساب سے ساقط کردیا جائے گا۔ لیکن دوسری صورت میں منفرد حصہ داروں کے لیے اس طرح کے حسابات معلوم کرنا مشکل ہے۔ وہ تو لامحالہ اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کی ہی زکوٰۃ نکالیں گے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۳۳۱-۳۳۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

نصابِ زکوٰۃ اور شرحِ ادائیگی

مختلف اموال میں شرحِ زکوٰۃ

جن مختلف سامانوں پر زکوٰۃ واجب ہے، ان کی شرح حسب ذیل ہے:

زرعی پیداوار	:	۱۰ فیصدی جب کہ وہ بارانی زمینوں سے حاصل ہو۔
		۵ فیصدی جب کہ وہ مصنوعی آبپاشی سے حاصل ہو۔
نقدی اور سونا چاندی	:	اڑھائی فیصدی
معادِن	:	اڑھائی فیصدی
اموالِ تجارت	:	اڑھائی فیصدی
رکاز	:	۲۰ فیصدی
کارخانوں کے اموال	:	اڑھائی فیصدی

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۳)

چند اشیا کا نصابِ زکوٰۃ

چاندی کا نصاب	:	دوسو درہم یعنی ساڑھے باون تولے کے قریب ہے
سونے کا نصاب	:	ساڑھے سات تولے
اونٹ کا نصاب	:	۵ اونٹ
بکریوں کا نصاب	:	۴۰ بکریاں
گائے کا نصاب	:	۳۰ گائیں
تجارتی مال کا نصاب	:	ساڑھے باون تولے چاندی کے بقدر مالیت۔

جس شخص کے پاس اتنا مال موجود ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس میں سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ کا نکالنا واجب ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چاندی اور سونے کے متعلق حنفیہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ دونوں الگ الگ بقدرِ نصاب نہ ہوں لیکن دونوں مل کر کسی ایک کے نصاب کی حد تک ان کی قیمت پہنچ جائے تو ان میں سے بھی زکوٰۃ نکالنی واجب ہے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۸)

سونے چاندی کے نصاب کی تحقیق

نقدی، چاندی، اموالِ تجارت، معادن، رکاز اور کارخانوں کے اموال میں نصاب دو سو درہم ہے۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی کی تحقیق یہ ہے کہ دو سو درہم کی چاندی ہمارے ملک کے معیاری وزن کے حساب سے ۳۶ تولہ ۵ ماشہ ۴ رتی ہوتی ہے۔ مگر مشہور ساڑھے باون تولہ چاندی ہے۔

۲۰ طلائی مثقال کے متعلق مولانا عبدالحیٔ صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ۵ تولہ ۲ ماشہ ۴ رتی سونے کے برابر ہیں اور عام طور پر مشہور یہ ہے کہ ساڑھے سات تولے کے برابر۔

کتاب الاموال لابی عبید میں جو حساب لگایا گیا ہے اس کی رو سے دس درہم کا وزن پونے تریاسی [ ] جو بنتا ہے اور وہ ۷ مثقال طلائی کے برابر ہے......

سونے کے نصاب میں تبدیلی ممکن ہے کیونکہ اس کا نصاب ۲۰ مثقال جس روایت میں آیا ہے اس کی سند بہت ضعیف ہے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۴)

سونے اور چاندی کا الگ الگ نصاب

س: تمام کتب فقہ میں مذکور ہے کہ چاندی کا نصاب زکوٰۃ دو سو درہم (ساڑھے باون تولہ) ہے اور سونے کا ۲۰ دینار (ساڑھے سات تولہ) اور علما فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس چاندی اور سونا دونوں ہوں اور ہر ایک نصابِ مقررہ سے کم ہو تو اس صورت میں سونے کی قیمت چاندی سے لگا کر یا چاندی کی قیمت سونے سے لگا کر............ دونوں میں سے جو صورت بھی انفع للفقراء ہو.......... مجموعہ کو دیکھیں گے۔ یہاں تک تو بات صاف ہے۔ لیکن وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر صرف چاندی ہو تو چاندی کا نصاب ہوگا اور اگر صرف سونا ہو تو سونے کا نصاب حساب کی اساس ہوگا۔ اس بنا پر لازم آتا ہے کہ اگر کسی کے پاس ۶۰ روپے ہوں تو اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی مگر جس کے پاس ۶ تولہ سونا ہے وہ زکوٰۃ سے بری ہے۔ حالانکہ مال دار ہونے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ موجودہ نرخ کے مطابق تقریباً ۵۰۰ روپے کا مالک ہے[1]۔ بہر حال علما کے فتوے شخصِ اوّل پر زکوٰۃ فرض قرار دیتے ہیں اور شخصِ ثانی پر زکوٰۃ عائد ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن کم

۱۔ واضح رہے کہ یہ جواب جون ۱۹۴۶ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ (مرتب)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مال دار سے زکوٰۃ لینا اور زیادہ مال دار کو چھوڑ دینا تعجب انگیز بات ہے۔

میں تو اپنی جگہ یہ سمجھا ہوں کہ زمانۂ قدیم میں چاندی اور سونے کی مالیت میں وہ نسبت نہ تھی جو آج کل ہے۔ آج کل تو ۷۵:۱ یا ۸۰:۱ کی نسبت ہے مگر دورِ نبوی میں تقریباً ۷:۱ کی تھی۔ زکوٰۃ کی فرضیت میں مالیت کا اعتبار کیا گیا ہے اور ۱۴۰ مثقال چاندی کنوز کا بنیادی نصاب زکوٰۃ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کا نصاب معین کرتے ہوئے اسی چاندی کی مقدار کو ذکر فرمایا۔ اُس دور میں ۱۴۰ مثقال چاندی کی مالیت کا سونا چونکہ ۲۰ مثقال (ساڑھے سات تولہ) ہی بنتا تھا اس لیے یہ نصاب قرار پایا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تا قیامِ قیامت سونے کی زکوٰۃ کے لیے ساڑھے سات تولہ ہی مستقل نصاب معین رہے بلکہ سونے کی وہ مقدار نصاب زکوٰۃ ہوگی جو ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے برابر ہو یعنی جس شخص کے پاس سونا ہو وہ اس کی قیمت لگا کر دیکھے۔ اگر وہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کو پہنچ جاتی ہے یا اس سے بڑھ جاتی ہے تو اس پر زکوٰۃ ادا کرے۔

- میرے اس خیال کی تائید نہ کسی فقہی کتاب کی عبارات کرتی ہیں، نہ علمائے وقت ہی اسے تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔ اس وجہ سے مجھے اپنی رائے پر اعتماد نہیں ہے۔ آپ جس پہلو کو مرجح قرار دیں، میرے لیے موجب اطمینان ہوگا۔

ج: آپ کا خیال اس حد تک تو درست ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاندی اور سونے کی قیمتوں میں وہی نسبت تھی جو نصاب کی مقدار سے معلوم ہوتی ہے، یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی = ساڑھے سات تولہ سونا۔ لیکن آپ کے اس خیال سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ اب نسبتوں میں جو فرق عظیم ہو گیا ہے اس کی وجہ سے سونے کے نصاب کو بدل کر اُس کے لیے بھی چاندی ہی کی قیمت کو نصاب بنا دیا جائے۔ اس کی وجوہ یہ ہیں:

۱- یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اصل سونے کو قرار دیا جائے یا چاندی کو؟ سونے کا نصاب چاندی کی قیمت کے معیار پر کم و بیش کیا جائے یا چاندی کے نصاب کو سونے کی قیمت کے معیار پر گھٹایا اور بڑھایا جاتا رہے؟ ان میں سے جس کو بھی اصل اور معیار قرار دیا جائے گا وہ ایک غیر شرعی فعل ہوگا کیونکہ شارع نے دونوں کا حکم الگ الگ مستقلاً بیان کیا ہے اور اشارۃً و کنایۃً بھی کوئی بات ایسی نہیں فرمائی ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہو کہ سونے اور چاندی میں سے کسی ایک کو دوسرے کے لیے اصل اور معیار قرار دینا شارع کا منشا تھا۔

۲- محض انفع للفقراء ہونا کوئی ایسی قطعی اور ثابت شدہ اصل نہیں ہے، جس پر اعتماد کر کے شارع کے ایک منصوص حکم میں ترمیم کرنے کی جرأت کر ڈالی جائے۔

۳- سونے اور چاندی کی نسبتوں میں آئے دن تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اگر ان کی مقداروں کا الگ الگ مستقل نصاب نہ ہو اور ایک کے نصاب کو دوسرے کی آئے دن بدلنے والی قیمتوں پر موقوف کر دیا جائے تو ان دائمی تغیرات کی وجہ سے کوئی ایک مستقل شرعی حکم باقی نہ رہے گا اور عوام الناس کو تعمیل حکم میں عملی زحمتیں بھی پیش آئیں گی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۴۔ جو مشکل آپ سونے اور چاندی کے معاملے میں پیش کر رہے ہیں وہی بکریوں، اونٹوں، گائیوں، بھینسوں اور گھوڑوں کے نصاب میں بھی پیش آتی ہے۔ ان کی قیمتوں کی باہمی نسبتوں میں بھی مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بہت بڑا فرق ہوتا رہتا ہے اور ان کے بارے میں بھی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس کی قیمت کو اصل قرار دے کر دوسری سب انواع کے نصاب کو اس کے مطابق بدلا جاتا رہے۔

ان وجوہ سے مناسب یہی ہے کہ مختلف اشیا کی زکوٰۃ کے لیے خود شارع نے جو نصاب مقرر کر دیا ہے اور جس مقدار یا تعداد پر جو زکوٰۃ عائد کر دی ہے، اسی کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔

(رسائل و مسائل، اوّل، جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۱۲۰-۱۲۳)

شرحِ زکوٰۃ میں تبدیلی

س: زکوٰۃ کے متعلق ایک صاحب نے فرمایا کہ شرح میں حالات اور زمانے کی مناسبت سے تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ حضورِ اکرمؐ نے اپنے زمانے کے لحاظ سے اڑھائی فیصد شرح مناسب تصور فرمائی تھی، اب اگر اسلامی ریاست چاہے تو حالات کی مناسبت سے اسے گھٹا یا بڑھا سکتی ہے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ قرآن پاک میں زکوٰۃ پر جا بجا گفتگو آئی ہے لیکن شرح کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا، اگر کوئی خاص شرح لازمی ہوتی تو اسے ضرور بیان کیا جاتا۔ اس کے برعکس میرا دعویٰ یہ تھا کہ حضورؐ کے احکام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہیں اور ہم ان میں تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ رہی صاحبِ موصوف کی دلیل تو وہ کل یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نمازیں اتنی نہ ہوں بلکہ اتنی ہوں اور یوں نہ پڑھی جائیں، یوں پڑھی جائیں جیسا کہ ان کے نزدیک حالات اور زمانے کا اقتضا ہو۔ پھر تو رسولِ خدا کے احکام احکام نہ ہوئے کھیل ہو گئے۔ دوسری چیز جو میں نے کہی تھی وہ یہ تھی کہ اگر اسلامی ریاست کو زیادہ ضروریات درپیش ہوں تو وہ حدیث اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ کی رو سے مزید رقوم وصول کر سکتی ہے۔ خود یہی حدیث زکوٰۃ کی شرح کے مستقل ہونے پر اشارۃً دلالت بھی کرتی ہے۔ اگر زکوٰۃ کی شرح بدلی جاسکتی تو اس حدیث کی ضرورت ہی کیا تھی؟ لیکن وہ صاحب اپنے مؤقف کی صداقت پر مصر ہیں۔ براہِ کرم آپ ہی اس معاملے میں وضاحت فرما دیجیے۔

ج: زکوٰۃ کے معاملے میں آپ نے جو استدلال کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ شارع کے مقرر کردہ حدود اور مقادیر میں رد و بدل کرنے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ یہ دروازہ اگر کھل جائے تو پھر ایک زکوٰۃ ہی کے نصاب اور شرح پر زد نہیں پڑتی بلکہ نماز، روزہ، حج، نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ کے بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں ترمیم و تنسیخ شروع ہو جائے گی اور یہ سلسلہ کہیں جا کر ختم نہ ہو سکے گا نیز یہ کہ اس دروازے کے کھلنے سے وہ توازن و اعتدال ختم ہو جائے گا جو شارع نے فرد اور جماعت کے درمیان انصاف کے لیے قائم کر دیا ہے۔ اس کے بعد پھر افراد اور جماعت کے درمیان کھینچ تان شروع ہو جائے گی۔ افراد چاہیں گے کہ نصاب اور شرح میں تبدیلی ان کے مفاد کے مطابق ہو اور جماعت چاہے گی کہ اس کے مفاد کے مطابق۔ انتخابات میں یہ چیز ایک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مسئلہ بن جائے گی۔ نصاب گھٹا کر اور شرح بڑھا کر اگر کوئی قانون بنایا گیا تو جن افراد کے مفاد پر اس کی زد پڑے گی وہ اسے اُس خوش دلی کے ساتھ نہ دیں گے جو عبادت کی اصل روح ہے بلکہ ٹیکس کی طرح چٹی سمجھ کر دیں گے اور حیلہ سازی (tactics) اور گریز (evasion) دونوں ہی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ یہ بات جواب ہے کہ حکمِ خدا اور رسول سمجھ کر ہر شخص سر جھکا دیتا ہے اور عبادت کے جذبے سے بخوشی رقم نکالتا ہے، اس صورت میں کبھی باقی رہ ہی نہیں سکتی جبکہ پارلیمنٹ کی اکثریت اپنے حسب منشا کوئی نصاب اور کوئی شرح لوگوں پر مسلّط کرتی رہے۔

(رسائل ومسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۴-۱۴۶)

خلفائے راشدین کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے نصاب اور شرح زکوٰۃ میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی، نہ اب اس کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور ہمارا خیال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ سلم کے بعد کوئی آپؐ کی مقرر کردہ مقادیر میں ترمیم کا مجاز نہیں ہے۔

(رسائل ومسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۴)

اموالِ زکوٰۃ کی فہرست میں اضافہ

خلافتِ راشدہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے اموالِ زکوٰۃ کی فہرست میں کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا گیا جو اپنی ایک مستقل بالذات نوعیت رکھتا ہو، بلکہ ایسی چیزوں کا اضافہ کیا گیا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے اموالِ زکوٰۃ میں سے کسی پر قیاس کی جا سکتی تھیں۔ مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھینس کو گائے پر قیاس کیا اور اس پر وہی زکوٰۃ عائد کی جو گائے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کی تھی۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل پنجم

مصارفِ زکوٰۃ

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ (التوبہ ۹:۶۰) یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور اُن لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور اُن کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

قرآنی فہرست

قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصرف بیان کیے گئے ہیں:

فقراء، مساکین، عاملینِ زکوٰۃ، مولفۃ القلوب، رقاب، غارمین، فی سبیل اللہ، ابن السبیل۔

۱۔ **فقرا:** فقیر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی بسر اوقات کے لیے دوسروں کا محتاج ہو۔ یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لیے عام ہے، خواہ وہ بڑھاپے یا کسی جسمانی نقص کی وجہ سے مستقل طور پر محتاجِ اعانت ہو گئے ہوں، یا کسی عارضی سبب سے سردست مدد کے محتاج ہوں اور کچھ سہارا پا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہوں، جیسے یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بے روزگار لوگ اور وہ لوگ جو کسی وقتی حادثے کے شکار ہو گئے ہوں۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۵)

یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس کچھ نہ کچھ مال تو [ہو] مگر ان کی ضرورت کے لیے کافی نہ ہو۔ تنگدستی میں گزر بسر کرتے ہوں اور کسی سے مانگتے نہ ہوں۔ امام زُہریؒ، امام ابوحنیفہؒ، ابن عباسؓ، حسن بصریؒ، ابوالحسنؒ، کرخیؒ اور دوسرے بزرگوں نے فقیر کی یہی تعریف فرمائی ہے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۹)

۲۔ **مساکین:** مسکنت کے لفظ میں عاجزی، درماندگی، بے چارگی اور ذلت کے مفہومات شامل ہیں۔ اس اعتبار سے مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ایسے لوگوں کو مستحق امداد ٹھیرایا ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پا رہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوں اور سخت تنگ حال ہوں، مگر نہ تو ان کی خودداری کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ان کی ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انھیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ چنانچہ حدیث میں اس کی تشریح یوں آتی ہے کہ اَلْمِسْكِيْنُ الَّذِیْ لَايَجِدُ غِنًى يُغْنِيْهِ وَلَا يُفْطَنُ لَهٗ فَيُتَصَدَّقَ عَلَيْهِ وَلَا يَقُوْمُ فَيَسْئَالُ النَّاسَ مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے، گویا وہ ایک ایسا شریف آدمی ہے جو غریب ہو۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۲۰۵، التوبہ، حاشیہ ۶۲)

اس لحاظ سے مسکین اس شریف آدمی کو کہتے ہیں جو اپنی روزی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہو مگر اپنی ضرورت کے قابل روزی نہ پا سکتا ہو، لوگ اسے برسرروزگار پاکر اس کی مدد نہیں کرتے اور وہ اپنے شرافت کی وجہ سے مدد مانگتا نہیں پھرتا۔

(رسائل ومسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۶)

یہ بہت ہی تباہ حال لوگ ہیں جن کے پاس اپنے تن کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی کچھ نہ ہو، حضرت عمرؓ ایسے لوگوں کو بھی مساکین میں شمار فرماتے ہیں جو کمانے کی طاقت رکھتے ہوں مگر انھیں روزگار نہ ملتا ہو۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۹)

۳۔ **عاملین:** یعنی وہ لوگ جو صدقات وصول کرنے اور وصول شدہ مال کی حفاظت کرنے اور ان کا حساب کتاب لکھنے اور انھیں تقسیم کرنے میں حکومت کی طرف سے استعمال کیے جائیں۔ ایسے لوگ خواہ فقیر و مسکین نہ ہوں، اُن کی تنخواہیں بہر حال صدقات ہی کی مدد سے دی جائیں گی۔ یہ الفاظ اور اسی سورت کی آیت ۱۰۳ کے الفاظ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات اور اپنے خاندان (یعنی بنی ہاشم) پر زکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے خود بھی صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام ہمیشہ بلا معاوضہ کیا اور بنی ہاشم کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ اگر وہ اس خدمت کو بلا معاوضہ انجام دیں تو جائز ہے، لیکن معاوضہ لے کر اس شعبے کی کوئی خدمت کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ آپؐ کے خاندان کے لوگ اگر صاحبِ نصاب ہوں تو زکوٰۃ دینا ان پر فرض ہے، لیکن اگر وہ غریب و محتاج یا قرض دار یا مسافر ہوں تو زکوٰۃ لینا ان کے لیے حرام ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ خود بنی ہاشم کی زکوٰۃ بھی بنی ہاشم لے سکتے ہیں یا نہیں۔ امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ لے سکتے ہیں۔ لیکن اکثر فقہا اس کو بھی جائز نہیں رکھتے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۲۰۵-۲۰۶، التوبہ، حاشیہ ۶۳)

۴۔ **مؤلفۃ القلوب:** مؤلفۃ القلوب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اسلام اور اسلامی مملکت کے مفاد کی مخالفت سے روکنا یا اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مفاد کی خدمت پر آمادہ کرنا مقصود ہو اور اس غرض کے لیے مال دے کر تالیفِ قلب کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۶)

تالیفِ قلب کے معنی ہیں دل موہنا۔ اس حکم سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوشِ عداوت کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہو یا جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر مال سے انھیں توڑا جائے تو ٹوٹ کر مسلمانوں کے مددگار بن سکتے ہوں یا جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں اور ان کی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی استمالت نہ کی گئی تو پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے۔[1] ایسے لوگوں کو مستقل وظائف یا وقتی عطیے دے کر اسلام کا حامی و مددگار یا مطیع و فرماں بردار یا کم از کم بے ضرر دشمن بنا لیا جائے۔ اس مد پر غنائم اور دوسرے ذرائع آمدنی سے بھی مال خرچ کیا جا سکتا ہے[2] اور اگر ضرورت ہو تو زکوٰۃ کی مد سے بھی اور ایسے لوگوں کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ فقیر و مسکین یا مسافر ہوں تب ہی ان کی مدد زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہے بلکہ وہ مال دار اور رئیس ہونے پر بھی زکوٰۃ دیے جانے کے مستحق ہیں۔[3]

یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت سے لوگوں کو تالیفِ قلب کے لیے وظیفے اور عطیے دیے جاتے تھے لیکن اس امر میں اختلاف ہو گیا ہے کہ آیا آپؐ کے بعد بھی یہ مد باقی رہی یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ مد ساقط ہو گئی ہے اور اب مؤلفۃ القلوب کو کچھ دینا جائز نہیں۔ امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ فاسق مسلمانوں کو تالیفِ قلب کے لیے زکوٰۃ کی مد سے دیا جا سکتا ہے مگر کفار کو نہیں اور بعض دوسرے فقہا کے نزدیک مؤلفۃ القلوب کا حصہ اب بھی باقی ہے اگر اس کی ضرورت ہو۔

حنفیہ کا استدلال اِس واقعہ سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد عُیَیْنَہ بن حِصْن اور اَقْرَع بن حابِس حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور انھوں نے ایک زمین آپ سے طلب کی۔ آپ نے ان کو عطیہ کا فرمان لکھ دیا۔ انھوں نے چاہا کہ مزید پختگی کے لیے دوسرے اعیانِ صحابہ بھی اس فرمان پر گواہیاں ثبت کر دیں۔ چنانچہ گواہیاں بھی ہو گئیں۔ مگر جب یہ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس گواہی لینے گئے تو انھوں نے فرمان پڑھ کر اسے ان کی آنکھوں کے سامنے

۱- ان میں وہ نو مسلم بھی داخل ہیں جنھیں مطمئن کرنے کی ضرورت ہو۔ اگر کوئی شخص اپنی کافر قوم کو چھوڑ کر مسلمانوں میں آ ملنے کی وجہ سے بے روزگار یا تباہ حال ہو گیا ہو تب تو اس کی مدد کرنا مسلمانوں پر ویسے ہی فرض ہے۔ لیکن وہ مال دار ہو تب بھی اسے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے تاکہ اس کا دل اسلام پر جم جائے۔ (خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۹)

۲- جنگِ حنین کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت میں سے نو مسلموں کو بہت مال دیا، حتیٰ کہ ایک شخص کے حصہ میں سو سو اونٹ آئے۔ انصار نے اس کی شکایت کی تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ ابھی ابھی کفر سے اسلام میں آئے ہیں۔ میں ان کے دل کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔ اسی بنا پر امام زہریؒ نے مؤلفۃ القلوب کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ "جو عیسائی یا یہودی یا غیر مسلم اسلام میں داخل ہوا ہو اگرچہ مال دار ہی کیوں نہ ہو" (خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۵۰)

۳- یہ لوگ اسلامی مملکت کے باشندے بھی ہو سکتے ہیں اور کسی بیرونی مملکت کے بھی...... (رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چاک کر دیا اور ان سے کہا کہ بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی تالیفِ قلب کے لیے تمھیں دیا کرتے تھے مگر وہ اسلام کی کمزوری کا زمانہ تھا۔ اب اللہ نے اسلام کو تم جیسے لوگوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس پر وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس شکایت لے کر آئے اور آپ کو طعنہ دیا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ لیکن نہ تو حضرت ابوبکرؓ ہی نے اس پر کوئی نوٹس لیا اور نہ دوسرے صحابہ میں سے ہی کسی نے حضرت عمرؓ کی اس رائے سے اختلاف کیا۔ اس سے حنفیہ یہ دلیل لاتے ہیں کہ جب مسلمان کثیر التعداد ہو گئے اور ان کو یہ طاقت حاصل ہو گئی کہ اپنے بل بوتے پر کھڑے ہو سکیں تو وہ سبب باقی نہیں رہا جس کی وجہ سے ابتداءً مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا گیا تھا اس لیے باجماعِ صحابہ یہ حصہ ہمیشہ کے لیے ساقط ہو گیا۔

امام شافعیؒ کا استدلال یہ ہے کہ تالیفِ قلب کے لیے کفار کو مالِ زکوٰۃ دینا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت نہیں ہے۔ جتنے واقعات حدیث میں ہم کو ملتے ہیں ان سب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے کفار کو تالیفِ قلب کے لیے جو کچھ دیا وہ مالِ غنیمت سے دیا نہ کہ مالِ زکوٰۃ سے۔

ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ قیامت تک کے لیے ساقط ہو جانے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلاشبہ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح تھا۔ اگر اسلامی حکومت تالیفِ قلب کے لیے مال صرف کرنے کی ضرورت نہ سمجھتی ہو تو کسی نے اس پر فرض نہیں کیا ہے کہ ضرور ہی اس مد میں کچھ نہ کچھ صرف کرے۔ لیکن اگر کسی وقت اس کی ضرورت محسوس ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو گنجایش رکھی ہے اسے باقی رہنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ اور صحابہ کرامؓ کا اجماع جس امر پر ہوا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ان کے زمانے میں جو حالات تھے ان میں تالیفِ قلب کے لیے کسی کو کچھ دینے کی وہ حضرات ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ صحابہؓ کے اجماع نے اُس مد کو قیامت تک کے لیے ساقط کر دیا جو قرآن میں بعض اہم مصالح دینی کے لیے رکھی گئی تھی۔

رہی امام شافعی کی رائے تو وہ اس حد تک تو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جب حکومت کے پاس دوسری مداتِ آمدنی سے کافی مال موجود ہو تو اسے تالیفِ قلب کی مد پر زکوٰۃ کا مال صرف نہ کرنا چاہیے۔ لیکن جب زکوٰۃ کے مال سے اس کام میں مدد لینے کی ضرورت پیش آ جائے تو پھر یہ تفریق کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ فاسقوں پر اسے صرف کیا جائے اور کافروں پر نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ قرآن میں مؤلفۃ القلوب کا جو حصہ رکھا گیا ہے وہ ان کے دعوائے ایمان کی بنا پر نہیں ہے کہ بلکہ اس بنا پر ہے کہ اسلام کو اپنے مصالح کے لیے ان کی تالیفِ قلب مطلوب ہے اور وہ اس قسم کے لوگ ہیں کہ ان کی تالیفِ قلب صرف مال ہی کے ذریعے سے ہو سکتی ہے۔ یہ حاجت اور یہ صفت جہاں بھی متحقق ہو وہاں امامِ مسلمین بشرطِ ضرورت زکوٰۃ کا مال صرف کرنے کا ازروئے قرآن مجاز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر اس مد سے کفار کو کچھ نہیں دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کے پاس دوسری مدات کا مال موجود تھا۔ ورنہ اگر آپؐ کے نزدیک کفار پر اس مد کا مال صرف کرنا جائز نہ ہوتا تو آپؐ اس کی تشریح فرماتے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۵- **رقاب:** گردنیں چھڑانے سے مراد یہ ہے کہ غلاموں کی آزادی میں زکوٰۃ کا مال صرف کیا جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس غلام نے اپنے مالک سے یہ معاہدہ کیا ہو کہ اگر میں اتنی رقم تمھیں ادا کر دوں تو تم مجھے آزاد کر دو، اسے آزادی کی قیمت ادا کرنے میں مدد دی جائے۔ دوسرے یہ کہ خود زکوٰۃ کی مد سے غلام خرید کر آزاد کیے جائیں۔ ان میں پہلی صورت پر تو سب فقہا متفق ہیں۔ لیکن دوسری صورت کو حضرت علیؓ، سعید بن جُبَیر، لَیث، ثَوری، ابراہیم نخَعی، شعبی، محمد بن سیرین، حنفیہ اور شافعیہ ناجائز کہتے ہیں اور ابن عباسؓ، حسن بصری، مالک، احمد اور ابو ثور جائز قرار دیتے ہیں۔

۶- **غارمین:** یعنی ایسے قرض دار جو اگر اپنے مال سے اپنا پورا قرض چکا دیں تو ان کے پاس قدر نصاب سے کم مال بچ سکتا ہو۔ وہ خواہ کمانے والے ہوں یا بے روزگار اور خواہ عرف عام میں فقیر سمجھے جاتے ہوں یا غنی، دونوں صورتوں میں ان کی اعانت زکوٰۃ کی مد سے کی جاسکتی ہے۔ مگر متعدد فقہا کی رائے یہ ہے کہ جس شخص نے بداعمالیوں اور فضول خرچیوں میں اپنا مال اڑا کر اپنے آپ کو قرضداری میں مبتلا کیا ہو اس کی مدد نہ کی جائے جب تک وہ توبہ نہ کرے۔

۷- **فی سبیل اللہ:** راہِ خدا کا لفظ عام ہے۔ تمام وہ نیکی کے کام جن میں اللہ کی رضا ہو، اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں میں صرف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے اور ائمۂ سلف کی بڑی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی وہ جدوجہد جس سے مقصود نظامِ کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظامِ اسلامی کو قائم کرنا ہو۔ اس جدوجہد میں جو لوگ کام کریں ان کو سفر خرچ کے لیے، سواری کے لیے، آلات و اسلحہ اور سروسامان کی فراہمی کے لیے زکوٰۃ سے مدد دی جاسکتی ہے خواہ وہ بجائے خود کھاتے پیتے لوگ ہوں اور اپنی ذاتی ضروریات کے لیے ان کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اسی طرح جو لوگ رضا کارانہ اپنی تمام خدمات اور اپنا تمام وقت، عارضی طور پر یا مستقل طور پر اس کام کے لیے دے دیں ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی زکوٰۃ سے وقتی یا استمراری اعانتیں دی جاسکتی ہیں۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ ائمۂ سلف کے کلام میں بالعموم اس موقع پر غزوہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو قتال کا ہم معنی ہے، اس لیے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ زکوٰۃ کے مصارف میں فی سبیل اللہ کی جو مد رکھی گئی ہے، وہ صرف قتال کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ، قتال سے وسیع تر چیز کا نام ہے اور اس کا اطلاق ان تمام کوششوں پر ہوتا ہے جو کلمۂ کفر کو پست اور کلمۂ خدا کو بلند کرنے اور اللہ کے دین کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کے لیے کی جائیں، خواہ وہ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی مرحلے میں ہوں یا قتال کے آخری مرحلے میں۔

۸- **ابن السبیل:** مسافر خواہ اپنے گھر میں غنی ہو، لیکن حالتِ سفر میں اگر وہ مدد کا محتاج ہو جائے تو اس کی مدد زکوٰۃ کی مد سے کی جائے گی۔

یہاں بعض فقہا نے یہ شرط لگائی ہے کہ جس شخص کا سفر معصیت کے لیے نہ ہو صرف وہی اس آیت کی رو سے مدد کا مستحق

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ مگر قرآن وحدیث میں ایسی کوئی شرط موجود نہیں ہے، اور دین کی اصولی تعلیمات سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مدد کا محتاج ہو اس کی دستگیری کرنے میں اس کی گناہ گاری مانع نہ ہونی چاہیے بلکہ فی الواقع گناہ گاروں اور اخلاقی پستی میں گرے ہوئے لوگوں کی اصلاح کا بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ مصیبت کے وقت ان کو سہارا دیا جائے اور حسنِ سلوک سے ان کے نفس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۲۰۶-۲۰۸، التوبہ، حاشیہ ۶۴-۶۸)

زکوٰۃ کا مستحق کون!

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ یہ آٹھ گروہ جو بیان ہوئے ہیں ان میں سے کس شخص کو کس حال میں زکوٰۃ دینی چاہیے اور کس حال میں نہ دینی چاہیے۔ اس کی بھی تھوڑی سی تفصیل آپ کے سامنے بیان کر دیتا ہوں۔

۱- کوئی شخص اپنے باپ یا اپنے بیٹے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا۔ شوہر اپنی بیوی کو اور بیوی اپنے شوہر کو بھی زکوٰۃ نہیں دے سکتی۔ اس میں فقہا کا اتفاق ہے۔ بعض فقہا یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایسے قریبی عزیزوں کو بھی زکوٰۃ نہیں دینی چاہیے جن کا نفقہ تم پر واجب ہو یا جو تمھارے شرعی وارث ہوں البتہ دور کے عزیز زکوٰۃ کے حق دار ہیں بلکہ دوسروں سے زیادہ حق دار ہیں۔ مگر امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ نکال کر اپنے ہی عزیزوں کو نہ ڈھونڈتے پھرو۔

۲- زکوٰۃ صرف مسلمان کا حق ہے، غیر مسلم کا حق نہیں ہے۔ حدیث میں زکوٰۃ کی تعریف یہ آتی ہے کہ تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآءِكُمْ وَ تُرَدُّ فِيْ فُقَرَآءِكُمْ یعنی وہ تمھارے مال داروں سے لی جائے گی اور تمھارے ہی فقیروں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ البتہ غیر مسلم کو عام خیرات میں سے حصہ دیا جا سکتا ہے بلکہ عام خیرات میں یہ تمیز کرنا اچھا نہیں ہے کہ مسلمان کو دی جائے اور کوئی غیر مسلم مدد کا محتاج ہو تو اس سے ہاتھ روک لیا جائے۔

۳- امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہر بستی کی زکوٰۃ اُسی بستی کے غریبوں میں صرف ہونی چاہیے۔ ایک بستی سے دوسری بستی میں بھیجنا اچھا نہیں ہے اِلّا یہ کہ وہاں کوئی حق دار نہ ہو یا دوسری جگہ کوئی ایسی مصیبت آ گئی ہو کہ دور ونزدیک کی بستیوں سے مدد پہنچنی ضروری ہو، جیسے سیلاب یا قحط وغیرہ۔ قریب قریب یہی رائے امام مالکؒ اور امام سفیان ثوریؒ کی بھی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ زکوٰۃ بھیجنا ناجائز ہے۔

۴- بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ جس شخص کے پاس دو وقت کے کھانے کا سامان ہو اسے زکوٰۃ نہ لینی چاہیے۔ بعض بزرگ فرماتے ہیں کہ جس کے پاس ۱۰ روپے اور بعض فرماتے ہیں کہ جس کے پاس ساڑھے بارہ روپے موجود ہوں، اُسے زکوٰۃ نہ لینی چاہیے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ اور تمام حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ جس کے پاس پچاس روپے سے کم ہوں وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ اس میں مکان اور گھر کا سامان اور گھوڑا اور خادم شامل نہیں ہیں۔ یعنی یہ سب سامان رکھتے ہوئے بھی جو شخص پچاس روپے سے کم مال رکھتا ہو وہ زکوٰۃ لینے کا حق دار ہے۔ اس معاملے میں ایک چیز تو ہے قانون اور دوسری چیز ہے درجہ فضیلت،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان دونوں میں فرق ہے۔ درجۂ فضیلت تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص صبح و شام کی روٹی کا سامان رکھتا ہو وہ اگر سوال کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اپنے حق میں آگ جمع کرتا ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ ایک شخص لکڑیاں کاٹے اور اپنا پیٹ بھرے بہ نسبت اس کے کہ سوال کے لیے ہاتھ پھیلاتا پھرے۔ تیسری حدیث میں ہے کہ جس کے پاس کھانے کو ہو یا جو کمانے کی طاقت رکھتا ہو اس کا یہ کام نہیں کہ زکوٰۃ لے۔ لیکن یہ اولوا العزمی کی تعلیم ہے۔ رہا قانون تو اس میں ایک آخری حد بتانی ضروری ہے کہ کہاں تک آدمی زکوٰۃ لینے کا حق دار ہو سکتا ہے۔ سو وہ دوسری حدیثوں میں ملتا ہے۔ مثلاً: آپؐ نے فرمایا: لِلسَّآئِلِ حَقٌّ وَ اِنْ جَآءَ عَلَى الْفَرَسِ یعنی سائل کا حق ہے اگر چہ وہ گھوڑے پر سوار آیا ہو۔ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے پاس دس روپے ہیں، کیا میں مسکین ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ ایک مرتبہ دو آدمیوں نے آکر حضورؐ سے زکوٰۃ مانگی۔ آپؐ نے نظر اٹھا کر انھیں غور سے دیکھا، پھر فرمایا: اگر تم لینا چاہتے ہو تو میں دے دوں گا لیکن اس مال میں غنی اور کمانے کے قابل ہٹے کٹے لوگوں کا حصہ نہیں ہے۔

ان سب احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص بقدر نصاب مال سے کم رکھتا ہو وہ فقرا کے ذیل میں آجاتا ہے اور اسے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ زکوٰۃ لینے کا حق دراصل اصلی حاجت مندوں ہی کو پہنچتا ہے۔

زکوٰۃ کے لیے اجتماعی نظام کی ضرورت

......اسلام میں تمام کام نظامِ جماعت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ انفرادیت اسلام پسند نہیں کرتا۔ آپ مسجد سے دور ہوں اور الگ نماز پڑھ لیں تو ہو جائے گی، مگر شریعت تو یہی چاہتی ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں۔ اسی طرح نظامِ جماعت نہ ہو تو الگ الگ زکوٰۃ نکالنا اور خرچ کرنا بھی صحیح ہے لیکن کوشش یہی ہونی چاہیے کہ زکوٰۃ کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے تاکہ وہاں سے وہ ایک ضابطے کے ساتھ خرچ ہو۔ اسی چیز کی طرف قرآن مجید میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ (التوبۃ ۹: ۱۰۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپؐ ان سے زکوٰۃ وصول کریں، مسلمانوں سے یہ نہیں فرمایا کہ تم زکوٰۃ نکال کر الگ الگ خرچ کر دو۔

اسی طرح عاملینِ زکوٰۃ کا حق مقرر کرنے سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا امام اس کو باقاعدہ وصول کرے اور باقاعدہ خرچ کرے۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُمِرْتُ اَنْ اٰخُذَ الصَّدَقَةَ مِنْ اَغْنِيَآءِكُمْ وَ اَرُدَّهَا فِيْ فُقَرَآءِكُمْ یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمھارے مال داروں سے زکوٰۃ وصول کروں اور تمھارے فقراء میں تقسیم کر دوں۔

اسی طریقے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا عمل بھی تھا۔ تمام زکوٰۃ حکومتِ اسلامی کے کارکن جمع کرتے تھے اور مرکز کی طرف سے اس کو تقسیم کیا جاتا تھا۔ آج اگر اسلامی حکومت نہیں ہے اور زکوٰۃ جمع کر کے باضابطہ تقسیم کرنے کا انتظام بھی نہیں ہے تو آپ علیحدہ علیحدہ زکوٰۃ نکال کر شرعی مصارف میں خرچ کر سکتے ہیں، مگر تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ زکوٰۃ جمع کرنے اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تقسیم کرنے کے لیے ایک اجتماعی نظام بنانے کی فکر کریں، کیونکہ اس کے بغیر زکوٰۃ کی فرضیت کے فوائد ادھورے رہ جاتے ہیں۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۵۱-۲۵۴)

جنگی ضروریات کے لیے زکوٰۃ کا استعمال

زکوٰۃ کا روپیہ جہاد میں استعمال کرنے کی شریعت نے اجازت ضرور دی ہے لیکن اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جس زمانے میں یہ اجازت دی گئی تھی، اس وقت مستقل تنخواہ دار فوج (standing army) نہیں تھی بلکہ جہاد کی اپیل پر لوگ رضا کارانہ اپنی خدمات پیش کرتے تھے اور ان کو ہتھیار اور سواریاں بھی زیادہ تر خود ہی لانی پڑتی تھیں۔ ایسے لوگوں کی مدد زکوٰۃ سے کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ نیز زکوٰۃ کے مال سے گھوڑے اور اونٹ اور اسلحے کا ذخیرہ حکومت بھی اس غرض کے لیے تیار رکھتی تھی کہ جو والنٹیر لڑنے کے لیے آئیں اور ان کے پاس یہ چیزیں نہ ہوں تو انھیں حکومت اس سروسامان سے مدد دے سکے۔ دوسری بات یہ بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اس زمانے کی جنگ کے مصارف کو آج کی جنگ کے مصارف سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ اُس وقت تلوار، نیزے، گھوڑے، اونٹ، بس یہی کچھ سروسامان تھا جس سے جنگ کی جاتی تھی یا پھر لڑنے والوں کی خوراک کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔ آج حالت یہ ہے کہ لڑائی رائفلوں، توپوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے ہوتی ہے۔ اس وقت اگر ایسا کوئی فتویٰ دیا جائے گا کہ لوگ زکوٰۃ کا روپیہ جنگ میں استعمال کرنے کے لیے حکومت کو دیں تو اس وقت کی مستقل فوج اور اس کے سپاہیوں جنرلوں تک کی تنخواہ اور ان کے بیش قیمت ہتھیار ملک کی ساری زکوٰۃ کھا جائیں گے اور غریبوں کی مدد کے لیے ایک پیسہ بھی نہ بچ سکے گا۔ اس وقت حکومت فوجی اور جنگی ضروریات کے لیے بے شمار دوسرے ٹیکسوں کے ذریعے سے روپیہ حاصل کر رہی ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ ساری زکوٰۃ بھی اس میں کھپا دی جائے؟ البتہ اگر ایسی غیر معمولی صورتِ حال پیدا ہو جائے کہ حکومت کے تمام دوسرے ذرائع جنگی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہوں اور زکوٰۃ کا استعمال ناگزیر ہو جائے تو ایسے موقع پر حکومت زکوٰۃ کے لیے اپیل کر سکتی ہے اور وقتی طور پر علما اس کا فتویٰ دے سکتے ہیں۔

(مکاتیبِ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، دوم، نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۳۲۹-۳۳۰)

ایک وضاحت

یہ ضروری نہیں ہے کہ زکوٰۃ کی رقم اُن تمام مصارف میں صرف کی جائے جو قرآن میں مقرر کیے گئے ہیں۔ حکومت حسبِ موقع و ضرورت اِن میں سے جن جن مصارف میں جس جس قدر مناسب سمجھے خرچ کر سکتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر ضرورت پڑ جائے تو ایک ہی مصرف میں ساری زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی ہے۔

صاحبِ نصاب مستحقین

مستحقینِ زکوٰۃ میں سے فقیر اور مسکین اس صورت میں زکوٰۃ لے سکتا ہے جبکہ وہ صاحبِ نصاب نہ ہو۔ [illegible]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

القلوب صاحبِ نصاب ہوں تب بھی ان کو زکوٰۃ کی مد سے دیا جا سکتا ہے۔غلام کا غلام ہونا بجائے خود اسے اس بات کا مستحق بناتا ہے کہ اس کی آزادی پر زکوٰۃ صرف کی جائے۔قرض دار اس حالت میں زکوٰۃ لے سکتا ہے جبکہ وہ اپنا پورا قرض ادا کر کے صاحبِ نصاب نہ رہ سکتا ہو۔راہِ خدا میں جہاد کرنے والے اگر بجائے خود صاحبِ نصاب بھی ہوں تو اس جہاد کے مصارف کے لیے انھیں زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ابن السبیل ایسی صورت میں زکوٰۃ پا سکتا ہے جبکہ حالتِ سفر میں وہ مدد کا محتاج ہو۔

بنی ہاشم کو زکوٰۃ دینا

بنی ہاشم پر زکوٰۃ لینا حرام ہے۔مگر آج پاکستان میں یہ تحقیق کرنا بہت مشکل ہے کہ کون ہاشمی ہے اور کون نہیں ہے؟ اس لیے حکومت تو ہر شخص کو زکوٰۃ دے گی جو اس کا حاجت مند نظر آئے۔یہ لینے والے کا اپنا کام ہے کہ اگر وہ اپنے ہاشمی ہونے کا یقین رکھتا ہو تو زکوٰۃ نہ لے۔

زکوٰۃ سے ادارے قائم کرنا

زکوٰۃ جب حکومت کے خزانے میں جمع ہو جائے تو وہ افراد اور اداروں سب کو دے سکتی ہے اور خود بھی زکوٰۃ سے ایسے ادارے قائم کر سکتی ہے جو مصارفِ زکوٰۃ سے متعلق ہوں............

زکوٰۃ سے وظائف مقرر کرنا

جو لوگ زکوٰۃ کے مستقل یا عارضی طور پر محتاج ہوں ان کو مستقل طور پر یا عارضی طور پر وظائف دیے جا سکتے ہیں......

زکوٰۃ اور رفاہِ عامہ

مصارفِ زکوٰۃ کی مدفی سبیل اللہ اتنی عام نہیں ہے کہ رفاہِ عام کی ہم معنی قرار پائے[1]۔

زکوٰۃ سے قرضہ دینا

زکوٰۃ کی مد سے قرضِ حَسن دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ موجودہ حالات میں حاجت مند لوگوں کو قرض دینے کے لیے بیت المال میں ایک مد مخصوص کر دینا ہمارے نزدیک مستحسن ہے۔

(رسائل ومسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۷-۱۳۸)

۱- سلف میں سے کسی نے بھی اس لفظ کو رفاہِ عام کے معنی میں نہیں لیا ہے۔ان کے نزدیک بالاتفاق اس کا مفہوم اُن مساعی تک محدود ہے جو خدا کے دین کو قائم کرنے، اس کی اشاعت کرنے اور اسلامی مملکت کا دفاع کرنے کے لیے کی جائیں۔(رسائل ومسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک علاقے کی زکوٰۃ دوسرے علاقے میں منتقل کرنا

عام حالات میں تو یہی مناسب ہے کہ ایک علاقے کی زکوٰۃ اسی علاقے کے حاجت مندوں پر صرف کی جائے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے زمانے میں ایک مرتبہ رَے کی زکوٰۃ کوفہ منتقل کر دی گئی تو انھوں نے حکم دیا کہ وہ رَے واپس کی جائے۔ (کتاب الاموال، ص ۵۹۰)۔ البتہ اگر دوسرے کسی علاقے میں کوئی زیادہ شدید ضرورت پیش آ جائے تو ایسے علاقوں کی زکوٰۃ، جہاں زکوٰۃ کے بقایا موجود ہوں، یا جہاں کی ضروریات کم تر درجے کی ہوں، ضرورت مند علاقے[1] میں لے جا کر صرف کی جا سکتی ہے۔ ملک سے باہر بھی اگر کوئی بڑی مصیبت پیش آ جائے تو انسانی ہمدردی اور تالیفِ قلوب کی خاطر زکوٰۃ بھیجی جا سکتی ہے، مگر اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ خود ملک کے اندر جو حاجت مند ہیں وہ محروم نہ رہ جائیں۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۹)

ہنگامی دفاعی فنڈ میں زکوٰۃ دینا

س: کیا زکوٰۃ کی رقم بھارتی جارحیت کا شکار ہونے والوں اور دفاعی فنڈ میں دی جا سکتی ہے؟

ج: میرے خیال میں زکوٰۃ کی رقم بھارتی جارحیت کا شکار ہونے والوں کے لیے خرچ کرنا بالکل جائز ہے۔ رہا دفاعی فنڈ میں اس کو خرچ کرنا تو بعض علما کا اس مسئلہ پر اختلاف ہے لیکن میرے نزدیک جائز ہے کیونکہ قرآن پاک میں زکوٰۃ کے جو آٹھ مصارف بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک فی سبیل اللہ ہے اور جہاد اسی تعریف میں آتا ہے۔

(۵-اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۴۶)

زکوٰۃ کی رقم سے کارخانے قائم کرنا

س: اسلامی نظام نافذ ہوگا تو زکوٰۃ کا روپیہ یکجا کیا جایا کرے گا۔ کیا اس سے حکومت کارخانے بھی قائم کر سکتی ہے؟

ج: ایسے کاموں کے لیے معاشرے میں روپے کی کمی نہیں ہوتی۔ کارخانے وغیرہ قائم کرنے کے لیے زکوٰۃ کی رقم صرف کرنا صحیح نہیں۔ زکوٰۃ کے روپے کو حکومت کاروباری مقاصد کے لیے استعمال نہیں کر سکتی۔ اس سے براہِ راست مستحقین کی مدد کی جائے گی۔ اگر ایسا وقت آ جائے کہ یہ روپیہ بچنے لگے تو اس سے غریبوں کے مفت علاج کے لیے ہسپتال بنائے جا سکتے ہیں اور انھیں رہایشی کوارٹرز بنا کر دیے جا سکتے ہیں۔

(۵-اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۱۶۵-۱۶۶)

۱- علاقے سے مراد انتظامی حلقے ہیں۔ اس سے مراد ضلع قسمت اور صوبہ تینوں ہو سکتے ہیں۔ ملک کے لحاظ سے ایک علاقہ صوبہ ہوگا۔ صوبہ کے لحاظ سے قسمت اور قسمت کے لحاظ سے ضلع۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ششم

تحصیل و تقسیمِ زکوٰۃ

تحصیلِ زکوٰۃ کا طریقِ کار

صدرِ اوّل میں حکومت کی طرف سے محصّلین مقرر تھے جو اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ اُن مقامات پر خود ہی جا کر وصول کرتے تھے جہاں وہ اموال ہوں۔ زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے الگ خزانے نہیں تھے بلکہ حکومت کے خزانہ عامہ ہی میں وہ جمع ہوتی تھی، البتہ اس کا حساب کتاب الگ رہتا تھا اور زکوٰۃ کی تقسیم حکومت کے وہ عمّال کرتے تھے جن کے سپرد دوسری سرکاری خدمات بھی ہوتی تھیں۔ تقسیمِ زکوٰۃ کے لیے کسی الگ محکمے کا وجود ہمارے علم میں نہیں ہے، لیکن یہ ایسے انتظامی معاملات ہیں جن میں آج کے احوال و ضروریات کے لحاظ سے ہم جس طرح مناسب سمجھیں عملی صورتیں اختیار کر سکتے ہیں۔

زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا انتظام

زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا انتظام کرنے والے عملے کی حیثیت تنخواہوں، الاؤنسوں، پنشنوں اور شرائطِ ملازمت کے لحاظ سے دوسرے سرکاری ملازمین سے مختلف نہ ہونی چاہیے۔ البتہ تمام سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کے معاملے میں حکومت کو اپنے طریقِ کار میں بنیادی تبدیلیاں کرنی چاہییں۔ موجودہ افراط و تفریط اگر بحال رہے تو نہ زکوٰۃ کی تحصیل صحیح طریقے سے ہو سکے گی اور نہ اس کی تقسیم۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۳-۱۴۴)

ہماری رائے میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا انتظام صوبوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے اور مرکز کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ ایک صوبے کی وافر زکوٰۃ دوسرے ایسے صوبوں میں بھجوا سکے جہاں کی زکوٰۃ معمولی یا غیر معمولی مقامی ضرورتوں کے لیے کافی نہ ہو رہی ہو۔ نیز مرکز کو یہ بھی اختیار ہونا چاہیے کہ اگر زکوٰۃ کی مد سے کچھ ایسے ادارے قائم کرنے یا کچھ ایسے کام کرنے کی ضرورت پیش آئے جن کا تعلق ملک کے اندر اور باہر 'فی سبیل اللہ' خدمات انجام دینے سے ہو یا ملک کے باہر غیر معمولی مصائب کے موقع پر مدد بھیجنے کی ضرورت ہو تو وہ صوبوں سے ان کی زکوٰۃ کا ایک حصہ طلب کر سکے۔

ہمارے نزدیک زکوٰۃ کی تحصیل کے لیے کوئی الگ محکمہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مختلف اقسام کی زکوٰۃ وصول کرنا ایسے محکموں کے سپرد ہونا چاہیے جن کے فرائض اسی قسم کے دوسرے ٹیکس وصول کرنے سے متعلق ہیں۔ مثلاً زرعی زکوٰۃ اور مواشی کی زکوٰۃ وصول کرنا محکمۂ مال کے سپرد ہو۔ اموالِ تجارت کی زکوٰۃ انکم ٹیکس کا محکمہ وصول کرے۔ کارخانوں کی زکوٰۃ اکسائز کا محکمہ، وعلیٰ ہذا القیاس۔ زکوٰۃ کی حفاظت سرکاری خزانے کے سپرد اور اس کا حساب اکاؤنٹنٹ جنرل کے محکمے کے سپرد ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اگر ہماری سفارش کے مطابق زکوٰۃ کو صوبوں کے انتظام میں دیا جائے اور تحصیلِ زکوٰۃ کے کسی شعبے کا کام کسی ایسے محکمے کے حوالے کرنا پڑے جو مرکزی محکمہ ہو، تو باہمی قرارداد سے یہ انتظام کیا جا سکتا ہے کہ تحصیلِ زکوٰۃ کی حد تک اس محکمے کے مصارف صوبہ ادا کرے۔

البتہ زکوٰۃ کی تقسیم اور مصارفِ زکوٰۃ میں اموالِ زکوٰۃ کو خرچ کرنے کے لیے ایک الگ محکمہ قائم ہونا ضروری ہے جسے کسی ایسے وزیر کے ماتحت رکھا جائے جو اوقات اور دوسرے مذہبی اداروں کی نگرانی کا کام بھی کرتا ہو۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۱-۱۴۲)

انفرادی ادائیگی

س: کیا اسلامی سلطنت میں ہر شخص کو انفرادی حیثیت میں زکوٰۃ ادا کرنی ہوتی ہے یا حکومت اس کا انتظام کرتی ہے کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرے۔ اگر یہ کام حکومت کرتی ہے تو زکوٰۃ لینے والے براہِ راست زکوٰۃ دینے والوں کے پاس کیوں چلے جاتے ہیں؟

ج: اگرچہ اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ اس کا انتظام کرے۔ لیکن ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت موجود نہ ہو، ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت موجود ہے لیکن وہ اس فریضے کو انجام نہیں دے رہی ہے۔ ایسے بھی حالات ہو سکتے ہیں جن میں اسلامی حکومت موجود ہے اور اپنے اس فریضے کو انجام دینے کی خواہش بھی رکھتی ہے لیکن وہ انتظام نہیں کر سکتی۔ ان تمام مراحل کی مثالیں ہماری تاریخ میں گزر چکی ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی سلطنت اسلامی کے قیام کے لیے جدوجہد فرما رہے تھے۔ پورے انتظامات مکمل نہیں ہوئے تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحصیلِ زکوٰۃ کے انتظامات کر لیے۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں سلطنت اتنی پھیل گئی کہ حکومت کے لیے تحصیلِ زکوٰۃ کا انتظام کرنا مشکل ہو گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ زکوٰۃ اب خود ادا کی جائے۔ گویا ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں جن میں مسلمانوں کو اپنی زکوٰۃ کی تقسیم کا انتظام خود کرنا پڑے۔ چاہے وہ مدت عارضی ہو۔

(استفسارات، اوّل، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۵۱-۵۲)

تحصیلِ زکوٰۃ کا مہینہ

چونکہ آج کل تمام مالی معاملات اور حساب کتاب شمسی سال کے لحاظ سے ہو رہے ہیں اس لیے زکوٰۃ کے معاملے میں بھی شمسی سال ہی استعمال کیا جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ قمری سال کا وجوب اس معاملے میں کسی نص سے ثابت نہیں ہے۔ تحصیلِ زکوٰۃ کے لیے کوئی خاص مہینہ شرعاً مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ حکومت جس تاریخ سے زکوٰۃ کی تحصیل کا انتظام شروع کرے اسی سے سال کا آغاز ٹھیرایا جا سکتا ہے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

غیر اسلامی حکومت کے ذریعے تحصیلِ زکوٰۃ

س: حالات حاضرہ کا پیدا کردہ ایک سوال دریافت کرتا ہوں۔ یہ کہ کیا ہماری شریعت میں کسی کافر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہم سے صدقاتِ واجبہ وصول کرے یا یہ کہ حکومتِ کفر کی قانونی قوت کے ذریعے ان کی وصولی کا اہتمام کیا جائے اور وہ اس طرح کہ اسمبلی میں ایک زکوٰۃ بل پاس کرالیا جائے۔ امید ہے کہ واضح جواب دیا جائے گا۔

ج: زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کی تقسیم کا نظام اگر قائم ہوسکتا ہے تو صرف اس طرح کہ مسلمانوں کا کوئی آزاد اجتماعی نظام ہو جو بااختیار بھی ہو اور وہ اس کو انجام دے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ایسی اسمبلی میں زکوٰۃ بل پاس کرایا جائے جس کی اکثریت غیر مسلم ہے اور جو قانونِ اسلام کو بالاتر قانون تسلیم نہیں کرتی تو یہ چیز شرعاً بالکل غلط ہے اور اس طریقے سے اگر غیر مسلم حکومت کے زیرِ اثر زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام کیا گیا تو شرعاً زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

(رسائل و مسائل، اوّل، ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۴۶۴-۴۶۵)

زکوٰۃ سے بچنے کے حیلے

زکوٰۃ سے بچنے کے حیلوں کا علاج تین طریقوں سے ہوسکتا ہے:

اوّل: یہ کہ حکومت کا انتظام ایمان دار لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو رشوتیں نہ کھائیں، زکوٰۃ کی تحصیل اور تقسیم میں جانبداری اور بددیانتی سے کام نہ لیں اور نہ اموالِ زکوٰۃ کا بڑا حصہ اپنی تنخواہوں اور الاؤنسوں پر صرف کردیں۔ محصّلین کی دیانت لوگوں میں یہ اعتماد پیدا کرے گی کہ ان کی زکوٰۃ صحیح طریقے سے وصول اور صحیح مصارف میں صرف کی جائے گی، اس لیے وہ ادائے زکوٰۃ سے بچنے کی کوشش نہ کریں گے۔

دوم: یہ کہ اجتماعی اخلاق کی اصلاح کی جائے اور لوگوں کی سیرت و کردار کو خدا کی محبت اور اس کے خوف پر تعمیر کیا جائے۔ حکومت کا کام صرف انتظامِ ملک اور دفاعِ ملک تک ہی محدود نہ رہے بلکہ وہ عوام کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دے۔

سوم: یہ کہ زکوٰۃ سے بچنے کی عام اور ممکن التصور صورتوں کے خلاف قوانین بنائے۔ مثلاً جو شخص اپنے قابلِ زکوٰۃ اموال کو ختمِ سال سے پہلے کسی غیر معمولی مقدار میں اپنے کسی عزیز کے نام منتقل کرے اس پر مقدمہ چلایا جائے اور بارِ ثبوت اس پر ڈالا جائے کہ اس نے یہ انتقال زکوٰۃ سے بچنے کے لیے نہیں کیا ہے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۰)

زکوٰۃ اور مسئلۂ تملیک

علمائے حنفیہ بالعموم ادائیگیِ زکوٰۃ کے لیے تملیکِ شخصی کو لازم قرار دیتے ہیں۔ اس لیے ان کا فتویٰ یہ ہے کہ حیلۂ تملیک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے بغیر رفاہِ عام کے اداروں مثلاً مدارس اور شفا خانوں وغیرہ کے اجتماعی مصارف میں زکوٰۃ دینا صحیح نہیں۔ اس پر ایک مستفسر نے بعض اشکالات و سوالات علمائے کرام کی خدمت میں پیش کیے تھے جو ترجمان القرآن، محرم ۷۴ ۱۳ھ [دسمبر ۱۹۵۴ء] میں بھی شائع ہوئے تھے۔ سائل کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ فقہِ حنفی میں تملیک کی جو شرط لگائی جاتی ہے اور اس کی بنا پر جو فروعی احکام بیان کیے جاتے ہیں وہ صرف اسی صورت میں قابل عمل ہیں جبکہ لوگ انفرادی طور پر زکوٰۃ نکال کر انفرادی طور پر ہی اسے خرچ کریں۔ لیکن اجتماعی طور پر مثلاً اسلامی حکومت کے ذریعے سے اگر زکوٰۃ کی وصولی و صرف کا انتظام کیا جائے تو شرط تملیک اپنے جزئی احکام کے ساتھ ایک دن بھی نہیں چل سکتی کیونکہ زکوٰۃ کے نظام کو وسیع اور مستحکم کرتے ہوئے زکوٰۃ کی تقسیم و تنظیم، حمل و نقل اور متعلقہ ساز و سامان کی فراہمی میں بے شمار شکلیں ایسی پیدا ہوں گی جن میں شرطِ تملیک کی پابندی محال ہوگی۔ ان سوالات کا جو جواب دیا گیا تھا، وہ درج ذیل ہے:

جس فتوے پر یہ سوالات کیے گئے ہیں، میرے نزدیک وہ آیت اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ...... (التوبۃ ۹: ۶۰) کی اس تاویل کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے جو حنفیہ نے اختیار فرمائی ہے۔ اس مطلب کو سمجھنے کے لیے آیت کے الفاظ پر ایک نگاہ ڈال لیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ.......... (التوبۃ ۹: ۶۰) صدقات تو فقرا کے لیے ہیں اور مساکین کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ان پر کام کرنے والے ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مقصود ہو..........

دیکھیے یہاں لام کا عمل صرف فقرا ہی پر نہیں ہو رہا ہے بلکہ مساکین عاملین علیہا اور مؤلفۃ قلوبہم پر بھی ہو رہا ہے۔ یہ لام تملیک کے لیے ہے تو، اور استحقاق یا اختصاص یا کسی اور معنی کے لیے ہے تو، بہرصورت جس معنی میں بھی یہ فقرا سے متعلق ہوگا اُسی معنی میں باقی تینوں سے بھی متعلق ہوگا۔ اب اگر حنفی تاویل کے لحاظ سے وہ تملیک کا مقتضی ہے تو زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کا مال ان چاروں میں سے جس کے حوالے بھی کر دیا جائے گا تملیک کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ آگے تملیک در تملیک کا حکم کہاں سے نکالا جاتا ہے؟ کیا فقیر یا مسکین کی مِلک میں زکوٰۃ کا مال پہنچ جانے کے بعد اس کے تصرفات پر کوئی پابندی ہے؟ اگر نہیں تو عاملین علیہا کے ہاتھ میں مال پہنچ جانے کے بعد جبکہ لام تملیک کا تقاضا پورا ہو چکا، پھر مزید تملیک کی پابندی لگانے کے لیے کیا دلیل ہے؟

لام کو تملیک ہی کے معنی میں لیا جائے تو ایک شخص جب زکوٰۃ و صدقات واجبہ کے اموال عاملین علیہا کے سپرد کر دیتا ہے تو گویا وہ انھیں اس کا مالک بنا دیتا ہے اور یہ اسی طرح ان کی مِلک بن جاتے ہیں جس طرح فَے اور غنیمت کے اموال حکومت کی مِلک بنتے ہیں۔ پھر ان پر یہ لازم نہیں رہتا کہ وہ ان اموال کو آگے جن مستحقین پر صرف کریں بصورت تملیک ہی کریں بلکہ انھیں یہ حق حاصل ہے کہ باقی ماندہ سات مصارفِ زکوٰۃ میں اس کو جس طرح مناسب اور ضروری سمجھیں صرف کریں۔ لام تملیک کے زور سے اُن پر کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ البتہ جو قید لگائی جا سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو شخص بھی زکوٰۃ کی تحصیل و صرف کے سلسلے میں کوئی عمل کرے وہ بس اس عمل کی اُجرت لے لے۔ باقی مال اُسے دوسرے مستحقین زکوٰۃ پر صرف کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ لوگ عاملین علیہا ہونے کی حیثیت سے ان اموال کے مالک بنائے جاتے ہیں نہ کہ بجائے خود مستحق ہونے کی حیثیت سے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عاملین علیھا کا لفظ خود اُس وجہ کو ظاہر کر دیتا ہے جس کے لیے زکوٰۃ ان کے حوالے کی جاتی ہے اور پھر یہی لفظ یہ بھی طے کر دیتا ہے کہ وہ عامل ہونے کی حیثیت سے اس مال کا کتنا حصہ جائز طور پر اپنے ذاتی تصرف میں لانے کا حق رکھتے ہیں۔

اس تشریح کے بعد اس حدیث پر نگاہ ڈال لیجے جو امام احمد نے حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کی ہے۔ اس میں حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اِذَا اَدَّیْتُ الزَّکٰوۃَ اِلٰی رَسُوْلِکَ فَقَدْ بَرِئْتُ مِنْھَا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ؟ جب میں نے آپؐ کے بھیجے ہوئے عامل کو زکوٰۃ ادا کر دی تو میں اللہ اور اس کے رسول کے سامنے اپنے فرض سے بری الذمہ ہو گیا نا؟ حضورؐ نے جواب دیا: نَعَمْ! اِذَا اَدَّیْتَھَا اِلٰی رَسُوْلِیْ فَقَدْ بَرِئْتَ مِنْھَا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ فَلَکَ اَجْرُھَا وَ اِثْمُھَا عَلٰی مَنْ بَدَّلَھَا ہاں! جب تو نے اسے میرے فرستادہ عامل کے حوالے کر دیا تو تُو اللہ اور اس کے رسول کے آگے اپنے فرض سے بری الذمہ ہو گیا۔ اس کا اجر تیرے لیے ہے اور جو اس میں ناجائز تصرّف کرے اس کا گناہ اسی پر ہے۔

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ زکوٰۃ دینے والا اپنی زکوٰۃ عاملین علیھا کے سپرد کر کے برء الذمہ ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر لام تملیک کا تقاضا جس طرح کسی فقیر یا مسکین کو زکوٰۃ دینے سے پورا ہوتا ہے اسی طرح عاملین علیھا کو دے دینے سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اب یہ فتویٰ کس بنیاد پر دیا جاتا ہے کہ عاملین علیھا اگر آگے تملیک ہی کے طریقے پر اموال زکوٰۃ کو صرف کرتے ہوں تو انھیں زکوٰۃ دو ورنہ نہیں؟ زکوٰۃ دینے والوں پر یہ دیکھنا کس نے فرض کیا ہے کہ عاملین کس طریقے پر عمل کرتے ہیں؟ ان کا فرض صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مستحقین کو یا ان کے لیے کام کرنے والے عاملین کو اپنے اموال زکوٰۃ کا مالک بنا دیں۔ عاملین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ جس شخص کو اس حیثیت سے زکوٰۃ دی جا رہی ہو اس کے بارے میں زکوٰۃ دینے والا یہ اطمینان کر لے کہ وہ واقعی 'عامل' ہے یا نہیں؟ حکومتِ اسلامی موجود ہو اور اس نے عاملینِ زکوٰۃ مقرر کیے ہوں تو ان کے پاس حکومت کی طرف سے تحصیل زکوٰۃ کا پروانہ موجود ہونا ہی اس اطمینان کے لیے کافی ہے۔ لیکن اگر یہ صورت نہ ہو اور مسلمانوں [کی] کسی اجتماعی تنظیم نے بطور خود زکوٰۃ کی تحصیل وصرف کا بندوبست کیا ہو تو اس کے بارے میں بس یہ تحقیق کر لینا چاہیے کہ وہ واقعی مستحقین زکوٰۃ پر اس مال کو صرف کرتی ہے اور عمل کے مصارف اسی حد تک لیتی ہے جنھیں جائز و معقول کہا جا سکے۔ تحقیق سے ان باتوں کا اطمینان ہو جائے تو اس کو زکوٰۃ دینے والا یقیناً فرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔ کوئی شرعی دلیل مجھے ایسی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر زکوٰۃ دینے والوں کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ عاملین علیھا کو زکوٰۃ دینے سے پہلے یہ بھی تحقیق کریں کہ وہ اموالِ زکوٰۃ کو بطریقِ تملیک صرف کرتے ہیں یا نہیں؟

اب یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ عاملین علیھا کے الفاظ جو قرآن میں ارشاد فرمائے گئے ہیں، ان کا اطلاق کن لوگوں پر ہوتا ہے۔ لوگ اسے صرف ان کارندوں تک محدود سمجھتے ہیں جن کو حکومتِ اسلامی اس کام کے لیے مقرر کرے۔ لیکن قرآن کے الفاظ عام ہیں جن کا اطلاق ہر اس شخص پر ہو سکتا ہے جو زکوٰۃ کی تحصیل وتقسیم کے سلسلے میں 'عمل' کرے۔ اس عام کو خاص کرنے والی کوئی دلیل میرے علم میں نہیں ہے۔ اگر حکومتِ اسلامی موجود نہ ہو یا ہو مگر اس فرض سے غافل ہو اور مسلمانوں میں کوئی گروہ یہ 'عمل' کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو تو آخر کس دلیل سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہیں تم عاملین علیھا نہیں ہو؟ میرے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نزدیک تو یہ اللہ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے کہ اُس نے عاملین حکومت کے لیے خاص کرنے کے بجائے اپنا حکم ایسے عام الفاظ میں دیا ہے جن میں یہ گنجایش پائی جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کی غیر موجودگی یا غافل حکمرانوں کی موجودگی میں مسلمان بطورِ خود بھی زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے لیے مختلف انتظامات کر سکیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے اس عام حکم کو عام ہی رہنے دیا جائے تو غریب طلبہ کی تعلیم، یتیموں کی پرورش، بوڑھوں اور معذوروں اور اپاہجوں کی نگہداشت، نادار مریضوں کے علاج اور ایسے ہی دوسرے کاموں کے لیے جو ادارے بھی قائم ہوں، اُن سب کے منتظمین بالکل بجا طور پر عاملین علیہا کی تعریف میں آئیں گے اور ان کو زکوٰۃ لینے اور حسبِ ضرورت صرف کرنے کے اختیارات حاصل ہو جائیں گے اور اُن حیلہ بازیوں کی کوئی حاجت باقی نہ رہے گی جو آج کل ہمارے عربی مدرسوں کے مہتمم حضرات زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ایسے ادارے قائم کرنے کی بھی گنجایش نکل آئے گی جو خاص طور پر تحصیل و صرفِ زکوٰۃ ہی کے لیے قائم ہوں۔ اُن کے منتظمین بھی عاملین علیہا قرار پائیں گے اور صرفِ زکوٰۃ کے معاملے میں ان کے ہاتھ بھی تملیک کے فتوے سے باندھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

میرے نزدیک اگر قرآن کے الفاظ کی عمومیت نگاہ میں رکھی جائے تو صرف مذکورہ بالا عاملین ہی پر اُن کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ دوسرے بہت سے کارکن بھی اس تعریف میں آتے ہیں مثلاً ایک یتیم کا ولی، ایک بیمار یا اپاہج کی خبر گیری کرنے والا اور ایک بے کس بوڑھے کا نگہبان بھی 'عامل' ہے۔ اسے زکوٰۃ وصول کر کے ان لوگوں کی ضروریات پر خرچ کا حق ہے اور اس میں سے معروف طریقے پر اپنے عمل کی اُجرت بھی وہ چاہے تو لے سکتا ہے۔

زکوٰۃ کی رقم ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کی ضرورت پیش آئے تو اُس میں سے ڈاک خانے یا بنک کی اُجرت دی جا سکتی ہے کیونکہ اس خدمت کو انجام دینے کی حد تک وہ بھی عاملین علیہا ہوں گے۔

زکوٰۃ وصول کرنے، زکوٰۃ کے اموال ایک جگہ سے دوسری جگہ حسبِ ضرورت لے جانے، یا مستحقینِ زکوٰۃ کی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لیے ریل، بس، ٹرک، تانگے، ٹھیلے وغیرہ جو استعمال کیے جائیں اُن کے کرائے مالِ زکوٰۃ سے دیے جا سکتے ہیں کیونکہ یہ خدمات انجام دیتے وقت یہ سب عاملین علیہا میں ہی شمار ہوں گے۔

مستحقینِ زکوٰۃ کی خدمت کے لیے جس قدر بھی ملازم اور مزدور استعمال کیے جائیں گے ان سب کی تنخواہیں اور اُجرتیں زکوٰۃ کی مد سے دی جا سکتی ہیں کیونکہ وہ عاملین علیہا میں داخل ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ کوئی ریلوے اسٹیشن پر زکوٰۃ کے غلّے کی بوریاں ڈھوئے یا کوئی غریب مریضوں کی خدمت کے لیے گاڑی چلائے یا کوئی یتیم بچوں کی نگہداشت کرے۔

اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ آیا عاملین علیہا کے تصرفات پر کوئی ایسی پابندی ہے کہ وہ مستحقین زکوٰۃ کی خدمت کے لیے عمارات نہ بنوا سکیں اور اشیائے ضرورت مثلاً گاڑیاں، دوائیں، آلات، کپڑے وغیرہ نہ خرید سکیں؟ میں کہتا ہوں کہ حنفی تاویلِ آیت کے لحاظ سے یہ پابندی صرف زکوٰۃ ادا کرنے والے پر عائد ہوتی ہے۔ وہ خود بلاشبہ ان تصرفات میں سے کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کی رُو سے زکوٰۃ جن کے لیے ہے اُن کی یا ان میں سے کسی کی مِلک میں دے دے۔ رہے عاملین علیہا تو ان پر اس طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ وہ تمام مستحقینِ زکوٰۃ کے لیے بمنزلہٗ ولی یا وکیل ہیں اور اصل مستحق اس مال میں جتنے تصرفات کر سکتا ہے۔ وہ سب تصرفات اس کے ولی یا وکیل ہونے کی حیثیت سے یہ بھی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کر سکتے ہیں۔ وہ جب فقراو مساکین کی ضروریات کے لیے کوئی عمارت یا کوئی گاڑی خریدیں تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بہت سے فقیروں اور مسکینوں نے، جن کو فرداً فرداً زکوٰۃ ملی تھی باہم مل کر ایک عمارت بنوالی یا ایک سواری خرید لی۔ جس طرح ان کے اس تصرف پر کوئی پابندی نہیں ہے اسی طرح ان کے وکیل یا ولی پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ عاملین علیہا کو زکوٰۃ دینے کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے مقرر کیا ہے اور اللہ کے رسول نے اسی لیے ان کے ہاتھ میں زکوٰۃ دے دینے والے کو فرض سے سبکدوش قرار دیا ہے کہ انھیں یہ مال دے دینا گویا تمام مستحقین کو دے دینا ہے وہ انھی کی طرف سے اسے وصول کرتے ہیں اور انھی کے نائب و سرپرست بن کر اسے صرف کرتے ہیں۔ آپ ان کے تصرفات پر اس حیثیت سے ضرور اعتراض کر سکتے ہیں کہ تم نے فلاں خرچ بلاضرورت کیا یا فلاں چیز پر ضرورت سے زیادہ خرچ کر دیا یا اپنے عمل کی اُجرت معقول حد سے زیادہ لے لی، یا کسی عامل کو معقول شرح سے زیادہ اُجرت دے دی۔ لیکن کوئی قاعدۂ شرعی میرے علم میں ایسا نہیں ہے جس کی بنا پر ان کو اس بات کا پابند کیا جاسکے کہ فلاں فلاں قسم کے تصرفات تم کر سکتے ہو اور فلاں فلاں قسم کے نہیں کر سکتے۔ قواعدِ شریعت اُنھیں ہر اُس کام کی اجازت دیتے ہیں جس کی مستحقین زکوٰۃ کے لیے ضرورت ہو۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اس معاملے میں اصل حل طلب سوالات صرف دو ہیں:

۱- ایک یہ کہ اگر زکوٰۃ دینے والوں اور زکوٰۃ کا استحقاق رکھنے والوں کی رضامندی سے چند غیر سرکاری آدمی زکوٰۃ پر کام کریں تو آیا وہ قرآن کے ارشاد کے مطابق عاملین علیہا کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں؟

۲- دوسرا یہ کہ عاملین علیہا کے ہاتھ میں زکوٰۃ دے دینے کے بعد ان کے تصرفات پر پھر تملیک کی قید عائد کرنے کے لیے کیا دلیل ہے؟ علمائے کرام کو انھی دو سوالات پر غور کر کے کوئی فیصلہ دینا چاہیے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۲۴۵-۲۵۴)

زکوٰۃ کی رقم قرض میں منہا کرنا

س: زید مال دار ہے۔ اس نے بکر کو قرض دیا ہے۔ بکر ابھی تک قرض واپس نہیں کر رہا ہے۔ اب زید اپنی زکوٰۃ کسی کو دینے کے بجائے بکر کی طرف سے وضع کر لیتا ہے اور اسے اس کی اطلاع کر دیتا ہے۔ درآں حالیکہ وہ زکوٰۃ بکر کی ملکیت میں نہیں دی گئی۔ کیا زید کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

ج: اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ زید اپنا زکوٰۃ کا مال اپنے قبضہ سے نکال کر بکر کے حوالے کر دے۔ اس کے بعد اگر وہ اسے واپس کرتا ہے یا وہ یہ کہے کہ تم مجھے زکوٰۃ کا روپیہ نہ دو، میرے قرضے میں وصول کر لو، تب زید لے سکتا ہے۔ لیکن بطور خود زکوٰۃ کے مال کو قرضے کے حساب میں وصول کر لینا اور اسے مطلع کر دینا کہ میں نے تیرے قرضے میں یہ مال وصول کر لیا ہے، صحیح طریقہ نہیں ہے۔ صحیح طریقہ یہی ہے کہ یا وہ خود کہے کہ تم اسے میرے قرض میں سے وصول کر لو یا آپ اسے دیں اور پھر وہ لا کر آپ کو قرض میں واپس کر دے۔

(استفسارات، اوّل، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۵۰-۵۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حصہ سوم

روزہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فرضیتِ صوم

روزوں کی فرضیت کا حکم

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْکُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○ (البقرۃ ۲: ۱۸۳-۱۸۵) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزے فرض کر دیے گئے' جس طرح تم سے پہلے انبیاؑ کے پیرووں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔ چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو' یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے، اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے' تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سمجھو' تو تمھارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔ رمضان وہ مہینہ ہے' جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے' جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے' اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے۔ اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو' تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ اللہ تمھارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے' سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ طریقہ تمھیں بتایا جا رہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمھیں سرفراز کیا ہے' اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔

رمضان کے روزے ہجرت کے اٹھارہ مہینے بعد فرض ہوئے۔ تحویلِ قبلہ کا حکم اس سے کوئی ڈیڑھ دو ماہ پہلے آیا تھا۔ رمضان کے روزوں کی فرضیت قرآن مجید، احادیث اور اجماعِ امت تینوں سے ثابت ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں رمضان کے روزوں کے متعلق حکم دیتے ہوئے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور کُتِبَ کا لفظ فرضیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بنا بریں قرآن مجید سے ثابت ہوا کہ رمضان کے روزے فرض ہیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوةِ وَحَجِّ الْبَیْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ یعنی اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۱- اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔

۲- نماز قائم کرنا

۳- زکوٰۃ ادا کرنا

۴- بیت اللہ کا حج کرنا

۵- رمضان کے روزے رکھنا

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزہ فرض ہی نہیں ہے بلکہ رکن اسلام ہے۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۱-۲۲)

فرضیت میں تدریج

اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں مسلمانوں کو صرف ہر مہینے تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، مگر یہ روزے فرض نہ تھے، پھر ۲ ہجری میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا۔ مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں، وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی لیکن مریض اور مسافر اور حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڈھے لوگوں کے لیے، جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا اور انھیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں جتنے رمضان میں ان سے چھوٹ گئے ہیں۔

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ[1] اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے، تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔ یعنی ایک سے زیادہ آدمیوں کو کھانا کھلائے، یا یہ کہ روزہ بھی رکھے اور مسکین کو کھانا بھی کھلائے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۴۱، البقرہ، حواشی ۱۸۳-۱۸۴)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۵، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب اوّل

اہمیت و فضیلت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

اہمیت اور فوائد

روزے کی اہمیت

اسلامی زندگی کی عمارت کو قائم ہونے اور قائم رہنے کے لیے جن سہاروں کی ضرورت ہے' ان میں سب سے مقدم سہارا یہ ہے کہ مسلمانوں کے افراد میں فرداً فرداً اور ان کی جماعت میں بحیثیت مجموعی وہ اوصاف پیدا ہوں جو خدا کی بندگی کا حق ادا کرنے اور دنیا میں خلافت الٰہی کا بار سنبھالنے کے لیے ضروری ہیں۔ وہ غیب پر سچا اور زندہ ایمان رکھنے والے ہوں' وہ اللہ کو اپنا واحد فرمانروا تسلیم کریں اور اس کے فرض شناس اور اطاعت کیش بندے ہوں، اسلام کا نظامِ فکر و نظریہ حیات ان کی رگ رگ میں ایسا پیوستہ ہو جائے کہ اسی کی بنیاد پر ان میں ایک پختہ سیرت پیدا ہو۔ اور ان کا عملی کردار اسی کے مطابق ڈھل جائے۔ اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر وہ اتنے قابو یافتہ ہوں کہ اپنے ایمان واعتقاد کے مطابق ان سے کام لے سکیں۔ ان کے اندر منافقین کی جماعت اگر پیدا ہوگئی ہو یا باہر سے گھس آئی ہو تو وہ اہلِ ایمان سے الگ ہو جائے۔ ان کی جماعت کا نظام اسلام کے اجتماعی اصولوں پر قائم ہو اور ایک مشین کی طرح پیہم متحرک رہے۔ ان میں اجتماعی ذہنیت کارفرما ہو۔ ان کے درمیان محبت ہو' ہمدردی ہو' تعاون ہو' مساوات ہو' وحدتِ روح اور وحدتِ عمل ہو' وہ قیادت اور اقتدا کے حدود کو جانتے اور سمجھتے ہوں اور پورے نظم وضبط کے ساتھ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

ان مقاصد کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے صرف نماز کو کافی نہ سمجھا گیا بلکہ اس رکن کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے ایک دوسرے رکن روزے کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے' نماز کی طرح یہ روزہ بھی قدیم ترین زمانے سے اسلام کا رکن رہا ہے۔ اگرچہ تفصیلی احکام کے لحاظ سے اس کی شکلیں مختلف رہی ہیں مگر جہاں تک نفسِ روزہ کا تعلق ہے وہ ہمیشہ الٰہی شریعتوں کا جزو لاینفک ہی رہا۔ تمام انبیا علیہم السلام کے مذہب میں یہ فرض کی حیثیت سے شامل تھا۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (البقرہ ۲: ۱۸۳) تم پر روزے فرض کر دیے گئے' جس طرح تم سے پہلے انبیا کے پیرووں پر فرض کیے گئے تھے۔

اس سے یہ بات خود بخود مترشح ہوتی ہے کہ اسلام کی فطرت کے ساتھ اس طریقِ تربیت کو ضرور کوئی مناسبت ہے۔

زکوٰۃ اور حج کی طرح روزہ ایک مستقل جداگانہ نوعیت رکھنے والا رکن نہیں ہے بلکہ دراصل اس کا مزاج قریب قریب وہی ہے جو رکنِ صلوٰۃ کا ہے اور رکنِ صلوٰۃ کے مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگایا گیا ہے۔ اس کا کام انھی اثرات کو زیادہ تیز اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زیادہ مستحکم کرتا ہے جو نماز سے انسانی زندگی پر مترتب ہوتے ہیں۔ نماز روزمرہ کا معمولی نظامِ تربیت ہے جو روز پانچ وقت تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا ہے۔ اور تعلیم وتربیت کی ہلکی ہلکی خوراکیں دے کر چھوڑ دیتا ہے اور روزہ سال بھر میں ایک مہینے کا غیر معمولی نظامِ تربیت (special training course) ہے جو آدمی کو تقریباً ۷۲۰ گھنٹے تک مسلسل اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجے میں کسے رکھتا ہے تا کہ روزانہ کی معمولی تربیت میں جو اثرات خفیف تھے، وہ شدید ہو جائیں۔ یہ غیر معمولی نظامِ تربیت کس طرح اپنا کام کرتا ہے‘ اور کس کس ڈھنگ سے نفسِ انسانی پر مطلوب اثر ڈالتا ہے۔ اس کا تفصیلی جائزہ ہم ان صفحات میں لینا چاہتے ہیں۔

(اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر، اکتوبر ۲۰۰۴ء، ص ۶۴-۶۷)

ہر کام کا ایک مقصد

ہر کام جو انسان کرتا ہے‘ اس میں دو چیزیں لازمی طور پر ہوا کرتی ہیں۔ ایک چیز تو وہ مقصد ہے جس کے لیے کام کیا جاتا ہے‘ اور دوسری چیز اس کام کی وہ خاص شکل ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔ مثلاً کھانا کھانے کے فعل کو لیجیے۔ کھانے سے آپ کا مقصد زندہ رہنا اور جسم کی طاقت کو بحال رکھنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ نوالے بناتے ہیں‘ منہ میں لے جاتے ہیں‘ دانتوں سے چباتے ہیں‘ اور حلق کے نیچے اتارتے ہیں۔ چونکہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سب سے زیادہ کارگر اور سب سے زیادہ مناسب طریقہ یہی ہو سکتا تھا‘ اس لیے آپ نے اسی کو اختیار کیا۔ لیکن آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اصل چیز وہ مقصد ہے جس کے لیے کھانا کھایا جاتا ہے‘ نہ کہ کھانے کے فعل کی یہ صورت۔ اگر کوئی شخص لکڑی کا برادہ یا راکھ یا مٹی لے کر اس کے نوالے بنائے اور منہ میں لے جائے اور دانتوں سے چبا کر حلق سے نیچے اتار لے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ اس کا دماغ خراب ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ احمق کھانے کے اصل مقصد کو نہیں سمجھتا اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ بس فعلِ خوردن کے ان چاروں ارکان کو ادا کر دینے ہی کا نام کھانا کھانا ہے۔ اسی طرح آپ اس شخص کو بھی پاگل قرار دیں گے جو روٹی کھانے کے بعد فوراً ہی حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دیتا ہو اور پھر شکایت کرتا ہو کہ روٹی کھانے کے جو فائدے بیان کیے جاتے ہیں وہ مجھے حاصل ہی نہیں ہوتے‘ بلکہ میں تو الٹا روز بروز دُبلا ہوتا جا رہا ہوں اور مر جانے کی نوبت آ گئی ہے۔ یہ احمق اپنی کمزوری کا الزام روٹی اور کھانے پر رکھتا ہے۔ حالانکہ حماقت اس کی اپنی ہے۔ اس نے اپنی نادانی سے یہ سمجھ لیا کہ کھانے کا فعل جتنے ارکان سے مرکب ہے بس ان کو ادا کر دینے ہی سے زندگی کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اب روٹی کا بوجھ اپنے معدے میں کیوں رکھوں؟ کیوں نہ اسے نکال پھینکا جائے تا کہ پیٹ ہلکا ہو جائے۔ کھانے کے ارکان تو میں ادا کر ہی چکا ہوں۔ یہ احمقانہ خیال جو اس نے قائم کیا اور پھر اس کی پیروی کی‘ اس کی سزا بھی تو آخر اسی کو بھگتنی چاہیے۔ اُس کو جاننا چاہیے تھا کہ جب تک روٹی پیٹ میں جا کر ہضم نہ ہو‘ اور خون بن کر سارے جسم میں پھیل نہ جائے‘ اس وقت تک زندگی کی طاقت حاصل نہیں ہو سکتی۔ کھانے کے ظاہری ارکان بھی اگرچہ ضروری ہیں‘ کیونکہ ان کے بغیر روٹی معدے

www.KitaboSunnat.com

تک نہیں پہنچ سکتی' مگر محض ان ظاہری ارکان کے ادا کر دینے سے کام نہیں چل سکتا۔ ان ارکان میں کوئی جادو بھرا ہوا نہیں ہے کہ انھیں ادا کرنے سے بس طلسماتی طریقے پر آدمی کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہو۔ خون پیدا کرنے کے لیے تو اللہ نے جو قانون بنایا ہے اسی کے مطابق وہ پیدا ہوگا۔ اس کو توڑ دو گے تو اپنے آپ کو خود ہلاک کرو گے۔

ظاہر کو حقیقت سمجھنے کے نتائج

یہ مثال جو اس تفصیل کے ساتھ میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے اس پر آپ غور کریں تو آپ کی سمجھ میں آسکتا ہے کہ آج آپ کی عبادتیں کیوں بے اثر ہو گئی ہیں۔ سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ آپ نے نماز روزے کے ارکان اور ان کی ظاہری صورتوں کو ہی اصل عبادت سمجھ رکھا ہے اور آپ اس خیالِ خام میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ جس نے یہ ارکان پوری طرح ادا کر دیے اس نے بس اللہ کی عبادت کر دی۔ آپ کی مثال اسی شخص کی سی ہے جو کھانے کے چاروں ارکان' یعنی نوالے بنانا' منہ میں رکھنا' چبانا' حلق سے نیچے اتار دینا' بس انھی چاروں کے مجموعے کو کھانا سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ جس نے یہ چار ارکان ادا کر دیے اس نے کھا لیا اور کھانے کے فائدے اس کو حاصل ہونے چاہییں، خواہ اس نے ان ارکان کے ساتھ مٹی اور پتھر اپنے پیٹ میں اتارے ہوں' یا روٹی کھا کر فوراً قے کر دی ہو۔ اگر حقیقت میں آپ لوگ اس حماقت میں مبتلا نہیں ہو گئے ہیں تو مجھے بتائیے کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ جو روزہ دار صبح سے شام تک اللہ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے وہ عین اس عبادت کی حالت میں جھوٹ کیسے بولتا ہے؟ غیبت کس طرح کرتا ہے؟ بات بات پر لڑتا کیوں ہے؟ اس کی زبان سے گالیاں کیوں نکلتی ہیں؟ وہ لوگوں کا حق کیسے مار کھاتا ہے؟ حرام کھانے اور حرام کھلانے کے کام کس طرح کر لیتا ہے؟ اور پھر یہ سب کام کر کے بھی اپنے نزدیک یہ کیسے سمجھتا ہے کہ میں نے خدا کی عبادت کی ہے؟ کیا اس کی مثال اس شخص کی سی نہیں ہے جو راکھ اور مٹی کھاتا ہے اور محض کھانے کے چار ارکان ادا کر دینے کو سمجھتا ہے کہ کھانا اس کو کہتے ہیں؟

پھر مجھے بتائیے یہ کیا ماجرا ہے کہ رمضان بھر میں تقریباً ۷۲۰ گھنٹے خدا کی عبادت کرنے کے بعد جب آپ فارغ ہوتے ہیں تو اس پوری عبادت کے تمام اثرات شوال کی پہلی تاریخ ہی کو کافور ہو جاتے ہیں؟ ہندو اپنے تہواروں میں جو کچھ کرتے ہیں وہی سب آپ عید کے زمانے میں کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ شہروں میں تو عید کے روز بدکاری اور شراب نوشی اور قمار بازی تک ہوتی ہے۔ اور بعض ظالم تو میں نے ایسے دیکھے ہیں جو رمضان کے زمانے میں دن کو روزہ رکھتے ہیں اور رات کو شراب پیتے اور زنا کرتے ہیں۔ عام مسلمان خدا کے فضل سے اس قدر بگڑے ہوئے تو نہیں ہیں' مگر رمضان ختم ہونے کے بعد آپ میں سے کتنے ایسے ہیں جن کے اندر عید کے دوسرے دن بھی تقویٰ اور پرہیزگاری کا کوئی اثر باقی رہ جاتا ہو؟ خدا کے قوانین کی خلاف ورزی میں کون سی کسر اٹھا رکھی جاتی ہے؟ نیک کاموں میں کتنا حصہ لیا جاتا ہے؟ اور نفسانیت میں کیا کمی آجاتی ہے؟

سوچیے اور غور کیجیے کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں' اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عبادت کا مفہوم اور مطلب ہی غلط ہو گیا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سحر سے لے کر مغرب تک کچھ نہ کھانے اور نہ پینے کا نام روزہ ہے اور بس یہی عبادت ہے۔ اس لیے روزے کی تو آپ پوری حفاظت کرتے ہیں۔ خدا کا خوف آپ کے دل میں اس قدر ہوتا ہے کہ جس چیز میں روزہ ٹوٹنے کا ذرا سا اندیشہ بھی ہو اس سے بھی آپ بچتے ہیں۔ اگر جان پر بھی بن جائے تب بھی آپ کو روزہ توڑنے میں تامل ہوتا ہے۔ لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ یہ بھوکا پیاسا رہنا اصل عبادت نہیں بلکہ عبادت کی صورت ہے اور یہ صورت مقرر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ آپ کے اندر خدا کا خوف اور خدا کی محبت پیدا ہو اور آپ کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ جس چیز میں دنیا بھر کے فائدے ہوں مگر خدا ناراض ہوتا ہو اُس سے اپنے نفس پر جبر کر کے بچ سکیں، اور جس چیز میں ہر طرح کے خطرات اور نقصانات ہوں مگر خدا اس سے خوش ہوتا ہو اس پر آپ اپنے نفس کو مجبور کر کے آمادہ کر سکیں، یہ طاقت اسی طرح پیدا ہو سکتی تھی کہ آپ روزے کے مقصد کو سمجھتے اور مہینے بھر تک آپ نے خدا کے خوف اور خدا کی محبت میں اپنے نفس کو خواہشات سے روکنے اور خدا کی رضا کے مطابق چلانے کی جو مشق کی ہے اس سے کام لیتے۔ مگر آپ تو رمضان کے بعد ہی اس مشق کو اور اُن صفات کو جو اس مشق سے پیدا ہوتی ہیں اس طرح نکال پھینکتے ہیں جیسے کھانے کے بعد کوئی شخص حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دے، بلکہ آپ میں سے بعض لوگ تو روزہ کھولنے کے بعد ہی دن بھر کی پرہیز گاری کو اُگل دیتے ہیں۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ رمضان اور اس کے روزے کوئی طلسم تو نہیں ہیں کہ بس اُن کی ظاہری شکل پوری کر دینے سے آپ کو وہ طاقت حاصل ہو جائے جو حقیقت میں روزے سے ہونی چاہیے۔ جس طرح روٹی سے جسمانی طاقت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ معدے میں جا کر ہضم نہ ہو اور خون بن کر جسم کی رگ رگ میں نہ پہنچ جائے، اُسی طرح روزے سے بھی روحانی طاقت اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آدمی روزے کے مقصد کو پوری طرح سمجھے نہیں اور اپنے دل و دماغ کے اندر اس کو اترنے اور خیال، نیت، ارادے اور عمل سب پر چھا جانے کا موقع نہ دے۔

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کا حکم دینے کے بعد فرمایا: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ یعنی تم پر روزہ فرض کیا جاتا ہے، شاید کہ تم متقی و پرہیز گار بن جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ اس سے ضرور متقی و پرہیز گار بن جاؤ گے۔ اس لیے کہ روزے کا یہ نتیجہ تو آدمی کی سمجھ بوجھ اور اس کے ارادے پر موقوف ہے جو اس کے مقصد کو سمجھے گا اور اس کے ذریعے سے اصل مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ تو تھوڑا یا بہت متقی بن جائے گا۔ مگر جو مقصد ہی کو نہ سمجھے گا اور اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کرے گا اسے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی امید نہیں۔

(خطبات، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۲-۱۶۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

روزے کا اصل مقصد

بندگیِ رب کی تربیت

غور کیجیے کہ آخر روزے میں کیا بات ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو ہر زمانے میں فرض کیا ہے؟

مقصدِ زندگی، بندگیِ رب

اسلام کا اصل مقصد انسان کی پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کی عبادت بنا دینا ہے۔ انسان 'عبد' یعنی بندہ پیدا ہوا ہے اور 'عبدیت' یعنی بندگی اس کی عین فطرت ہے۔ اس لیے 'عبادت' یعنی خیال و عمل میں اللہ کی بندگی کرنے سے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کو آزاد نہ ہونا چاہیے۔ اسے اپنی زندگی کے ہر معاملے میں ہمیشہ اور ہر وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کس چیز میں ہے' اور اس کا غضب اور ناراضی کس چیز میں۔ پھر جس طرف اللہ کی رضا ہو ادھر جانا چاہیے اور جس طرف اس کا غضب اور اس کی ناراضی ہو اس سے یوں بچنا چاہیے جیسے آگ کے انگارے سے کوئی بچتا ہے۔ جو طریقہ اللہ نے پسند کیا ہو اس پر چلنا چاہیے اور جس طریقے کو اُس نے پسند نہ کیا ہو اُس سے بھاگنا چاہیے۔ جب انسان کی ساری زندگی اس رنگ میں رنگ جائے تب سمجھو کہ اُس نے اپنے مالک کی بندگی کا حق ادا کیا اور وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ○ [(الذاریات ۵۱:۵۶) میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا اسی لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔] کا منشا پورا ہو گیا۔

عبادات کا مقصد

نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کے نام سے جو عبادتیں ہم پر فرض کی گئی ہیں ان کا اصل مقصد اسی بڑی عبادت کے لیے ہم کو تیار کرنا ہے۔ ان کو فرض کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر تم نے دن میں پانچ وقت رکوع اور سجدہ کر لیا' اور رمضان میں تیس دن تک صبح سے شام تک بھوک پیاس برداشت کر لی اور مال دار ہونے کی صورت میں سالانہ زکوٰۃ اور عمر میں ایک مرتبہ حج ادا کر دیا' تو اللہ کا جو کچھ حق تم پر تھا وہ ادا ہو گیا اور اس کے بعد تم اس کی بندگی سے آزاد ہو گئے کہ جو چاہو کرتے پھرو۔ بلکہ دراصل ان عبادتوں کو فرض کرنے کی غرض یہی ہے کہ ان کے ذریعہ سے آدمی کی تربیت کی جائے اور اس کو اس قابل بنا دیا جائے کہ اس کی پوری زندگی اللہ کی عبادت بن جائے۔ آیئے! اب اسی مقصد کو سامنے رکھ کر ہم دیکھیں کہ روزہ کس طرح آدمی کو اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

روزے کے سوا دوسری جتنی عبادتیں ہیں وہ کسی نہ کسی ظاہری حرکت سے ادا کی جاتی ہیں' مثلاً نماز میں آدمی اٹھتا اور بیٹھتا اور رکوع اور سجدہ کرتا ہے جس کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ حج میں ایک لمبا سفر کر کے جاتا ہے اور پھر ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ زکوٰۃ بھی کم از کم ایک شخص دیتا ہے اور دوسرا شخص لیتا ہے۔ ان سب عبادتوں کا حال چھپ نہیں سکتا۔ اگر آپ ادا کرتے ہیں تب بھی دوسروں کو معلوم ہو جاتا ہے' اگر ادا نہیں کرتے تب بھی لوگوں کو خبر ہو ہی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف روزہ ایسی عبادت ہے جس کا حال خدا اور بندے کے سوا کسی دوسرے پر نہیں کھل سکتا۔ ایک شخص سب کے سامنے سحری کھائے اور افطار کے وقت تک ظاہر میں کچھ نہ کھائے پیئے' مگر چھپ کر پانی پی جائے یا کچھ چوری چھپے کھا پی لے تو خدا کے سوا کسی کو بھی اس کی خبر نہیں ہو سکتی۔ ساری دنیا یہی سمجھتی رہے گی کہ وہ روزے سے ہے اور وہ حقیقت میں روزے سے نہ ہوگا۔

روزہ، ایمان کی مضبوطی کی علامت

روزے کی اس حیثیت کو سامنے رکھو' پھر غور کرو کہ جو شخص حقیقت میں روزے رکھتا ہے اور اس میں چوری چھپے بھی کچھ نہیں کھاتا پیتا' سخت گرمی کی حالت میں بھی جب کہ پیاس سے حلق چٹخا جاتا ہو' پانی کا ایک قطرہ حلق سے نیچے نہیں اُتارتا' سخت بھوک کی حالت میں بھی جب کہ آنکھوں میں دم آ رہا ہو کوئی چیز کھانے کا ارادہ تک نہیں کرتا' اسے اللہ تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے پر کتنا ایمان ہے۔ کس قدر زبردست یقین کے ساتھ وہ جانتا ہے کہ اس کی کوئی حرکت چاہے ساری دنیا سے چھپ جائے مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتی۔ کیسا خوفِ خدا اس کے دل میں ہے کہ بڑی سے بڑی تکلیف اٹھاتا ہے مگر صرف اللہ کے خوف کی وجہ سے کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اس کے روزے کو توڑنے والا ہو۔ کس قدر مضبوط اعتقاد ہے اُس کو آخرت کی جزا و سزا پر کہ مہینے بھر میں وہ کم از کم سات سو گھنٹے کے روزے رکھتا ہے اور اس دوران میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل میں آخرت کے متعلق شک کا شائبہ تک نہیں آتا اگر اسے اس بات میں ذرا سا بھی شک ہوتا کہ آخرت ہوگی یا نہ ہوگی اور اس میں عذاب و ثواب ہوگا یا نہ ہوگا تو وہ کبھی اپنا روزہ پورا نہیں کر سکتا۔ شک آنے کے بعد ممکن نہیں ہے کہ آدمی خدا کے حکم کی تعمیل میں کچھ نہ کھانے اور نہ پینے کے ارادے پر قائم رہ جائے۔

ایک ماہ کی مسلسل ٹریننگ

اس طرح اللہ تعالیٰ ہر سال کامل ایک مہینے تک مسلمان کے ایمان کو مسلسل آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس آزمائش میں جتنا جتنا آدمی پورا اُترتا ہے' اُتنا ہی اس کا ایمان مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ یہ گویا آزمائش کی آزمائش ہے اور ٹریننگ کی ٹریننگ۔ آپ جب کسی شخص کے پاس امانت رکھواتے ہیں تو گویا اس کی ایمان داری کی آزمائش کرتے ہیں۔ اگر وہ اس آزمائش میں پورا اُترے اور امانت میں خیانت نہ کرے تو اس کے اندر امانتوں کا بوجھ سنبھالنے کی اور زیادہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ زیادہ امین بنتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی مسلسل ایک مہینے تک روزانہ بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹے تک آپ کے ایمان کو کڑی آزمائش میں ڈالتا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔اور جب اس آزمائش میں آپ پورے اُترتے ہیں تو آپ کے اندر اس بات کی مزید قابلیت پیدا ہونے لگتی ہے کہ اللہ سے ڈر کر دوسرے گناہوں سے بھی پرہیز کریں' اللہ کو عالم الغیب جان کر چوری چھپے بھی اس کے قانون کو توڑنے سے بچیں' اور ہر موقع پر قیامت کا وہ دن آپ کو یاد آجایا کرے جب سب کچھ کھل جائے گا اور بغیر کسی رورعایت کے بھلائی کا بھلا اور برائی کا بُرا بدلہ ملے گا۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا کہ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (البقرۃ ۲:۱۸۳) اے اہل ایمان! تمھارے اوپر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کیے گئے تھے۔شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

اطاعت کی طویل مشق

روزے کی ایک دوسری خصوصیت بھی ہے' اور وہ یہ ہے کہ یہ ایک لمبی مدت تک شریعت کے احکام کی لگاتار اطاعت کراتا ہے۔نماز کی مدت ایک وقت میں چند منٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔زکوٰۃ ادا کرنے کا وقت سال بھر میں صرف ایک وقت آتا ہے۔ حج میں البتہ لمبی مدت صرف ہوتی ہے مگر اس کا موقع عمر بھر میں ایک دفعہ آتا ہے اور وہ بھی سب کے لیے نہیں۔ان سب کے برخلاف روزہ ہر سال پورے ایک مہینے تک شب و روز شریعتِ محمدیؐ کے اتباع کی مشق کراتا ہے۔صبح سحری کے لیے اٹھو' ٹھیک فلاں وقت پر کھانا پینا سب بند کردو۔دن بھر فلاں فلاں کام کر سکتے ہو اور فلاں فلاں کام نہیں کر سکتے۔شام کو ٹھیک فلاں وقت پر افطار کرو' پھر کھانا کھا کر آرام کرلو' پھر تراویح کے لیے دوڑو۔اس طرح ہر سال کامل مہینہ بھر صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک مسلمان کو مسلسل فوجی سپاہیوں کی طرح پورے قاعدے اور ضابطے میں باندھ کر رکھا جاتا ہے اور پھر گیارہ مہینے کے لیے اسے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ جو تربیت اس ایک مہینے میں اس نے حاصل کی ہے اس کے اثرات ظاہر ہوں' اور جو کمی پائی جائے وہ پھر دوسرے سال کی ٹریننگ میں پوری کی جائے۔

تربیت کے لیے سازگار اجتماعی ماحول

اس قسم کی تربیت کے لیے ایک شخص کو الگ الگ لے کر تیار کرنا کسی طرح موزوں نہیں ہوتا۔فوج میں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ایک شخص کو الگ الگ قواعد نہیں کرائی جاتی بلکہ پوری فوج کی فوج ایک ساتھ قواعد کرتی ہے۔سب کو ایک وقت بگل کی آواز پر اٹھنا اور بگل کی آواز پر کام کرنا ہوتا ہے تاکہ ان میں جماعت بن کر متفقہ کام کرنے کی عادت ہو' اور اس کے ساتھ ہی وہ سب ایک دوسرے کی تربیت میں مددگار بھی ہوں' یعنی ایک شخص کی تربیت میں جو کچھ نقصان رہ جائے اس کی کمی کو دوسرا اور دوسرے کی کمی کو تیسرا پورا کردے۔اسی طرح اسلام میں بھی رمضان کا مہینہ روزے کی عبادت کے لیے مخصوص کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ایک وقت میں سب کے سب مل کر روزہ رکھیں۔اس حکم نے انفرادی عبادت کو اجتماعی عبادت بنا دیا۔ جس طرح ایک کے عدد کو لاکھ سے ضرب دو تو لاکھ کا زبردست عدد بن جاتا ہے۔اس طرح ایک ایک شخص کے روزہ رکھنے سے جو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اخلاقی اور روحانی فائدے ہوسکتے ہیں' لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے مل کر روزے رکھنے سے وہ لاکھوں کروڑوں گنے زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ رمضان کا مہینہ پوری فضا کو نیکی اور پرہیز گاری کی روح سے بھر دیتا ہے۔ پوری قوم میں گویا تقویٰ کی کھیتی سرسبز ہو جاتی ہے۔ ہر شخص نہ صرف خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے' بلکہ اگر اس میں کوئی کمزوری ہوتی ہے تو اس کے دوسرے بہت سے بھائی جو اسی کی طرح روزہ دار ہیں اس کی پشت پناہ بن جاتے ہیں۔ ہر شخص کو روزہ رکھ کر گناہ کرتے ہوئے شرم آتی ہے' اور ہر ایک کے دل میں خود بخود یہ خواہش ابھرتی ہے کہ کچھ بھلائی کے کام کرے کسی غریب کو کھانا کھلائے' کسی ننگے کو کپڑا پہنائے' کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے' کسی جگہ اگر کوئی نیک کام ہو رہا ہو تو اس میں حصہ لے اور اگر کہیں علانیہ بدی ہو رہی ہو تو اسے روکے۔ نیکی اور تقویٰ کا ایک عام ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور بھلائیوں کے پھلنے پھولنے کا موسم آ جاتا ہے۔ جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اور ہر طرف کھیتوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ یُضَاعَفُ الْحَسَنَۃُ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا اِلٰی سَبْعِ مِائَۃِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَّا الصَّوْمُ فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ آدمی کا ہر عمل خدا کے ہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے ایک نیکی دس گنی سے سات سوگنی تک پھلتی پھولتی ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ خاص میرے لیے ہے اور میں اس کا جتنا چاہتا ہوں بدلہ دیتا ہوں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نیکی کرنے والے کی نیت اور نیکی کے نتائج کے لحاظ سے تمام اعمال پھلتے پھولتے ہیں اور ان کی ترقی کے لیے ایک حد ہے۔ مگر روزے کی ترقی کے لیے کوئی حد نہیں۔ رمضان چوں کہ خیر اور صلاح کے پھلنے اور پھولنے کا موسم ہے اور اس موسم میں ایک شخص نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں مسلمان مل کر اس نیکی کے باغ کو پانی دیتے ہیں، اس لیے یہ بے حد وحساب بڑھ سکتا ہے۔ جتنی زیادہ نیک نیتی کے ساتھ اس مہینے میں عمل کرو گے' جس قدر زیادہ برکتوں سے خود فائدہ اٹھاؤ گے اور اپنے دوسرے بھائیوں کو فائدہ پہنچاؤ گے اور پھر جس قدر زیادہ اس مہینے کے اثرات بعد کے گیارہ مہینوں میں باقی رکھو گے' اتنا ہی یہ پھلے پھولے گا اور اس کے پھلنے اور پھولنے کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تم خود اپنے عمل سے اس کو محدود کر لو تو یہ تمہارا اپنا قصور ہے۔

ہماری موجودہ حالت!

روزے کے یہ اثرات اور یہ نتائج سن کر آپ میں سے ہر شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ اثرات آج کہاں ہیں؟ ہم روزے بھی رکھتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں مگر یہ نتیجے جو تم بیان کرتے ہو ظاہر نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ .... یہ ہے کہ اسلام کے اجزا کو الگ الگ کر دینے کے بعد اور بہت سی نئی چیزیں اس میں ملا دینے کے بعد آپ اُن نتائج کی توقع نہیں کر سکتے جو پورے نظام کی بندھی ہوئی صورت ہی میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ ہے کہ عبادات کے متعلق آپ کا نقطہ نظر بدل گیا ہے۔ اب آپ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ محض صبح سے شام تک کچھ نہ کھانے اور پینے کا نام عبادت ہے' اور جب یہ کام آپ نے کر لیا تو عبادت پوری ہو گئی۔ اسی طرح دوسری عبادتوں کی بھی محض ظاہری شکل کو آپ عبادت سمجھتے ہیں' اور عبادت کی اصلی روح جو آپ کے ہر عمل میں ہونی چاہیے اُس سے عام طور پر آپ کے ۹۹ فی صد بلکہ اس سے بھی زیادہ آدمی غافل ہیں۔ اسی وجہ سے یہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عبادات اپنے پورے فائدے نہیں دکھاتیں۔ کیونکہ اسلام میں تو نیت اور فہم اور سمجھ بوجھ ہی پر سب کچھ منحصر ہے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۵-۱۹۲)

تربیت کا انفرادی پہلو

اسلام کا اصل مقصد صالحین کی ایسی جماعت بنانا ہے، جو انسانی تمدن کو خیر وصلاح کی بنیادوں پر تعمیر کرے۔ مگر اس غرض کے لیے وہ صرف اجتماعی اصول وضع کرنے اور ان اصولوں کی بنیاد پر ایک نظام تمدن بنا دینے پر اکتفا نہیں کرتا' بلکہ ساتھ ساتھ اپنے جماعتی نظام کے لیے افراد کو تیار کرنے کا بھی انتظام کرتا ہے تا کہ جماعت (سوسائٹی) جن افراد پر مشتمل ہو ان میں کا ایک ایک شخص اپنے خیالات' اپنی سیرت اور اپنے کردار کے لحاظ سے اس نظام کے ساتھ بیش از بیش موافقت رکھتا ہو' اور باغیانہ میلانات کے ساتھ مجبورانہ اطاعت کرنے کے بجائے اپنے نفس وروح کی پوری آمادگی' اپنے دل ودماغ کے مخلصانہ عقیدے' اور اپنی سیرت کی ذاتی قوت کے ساتھ اس کی پیروی کرے۔ اس اسکیم میں روزے کے رکن سے جو کام لیا گیا ہے وہ یہ ہے:

۱- اس تربیت کے ذریعے سے جماعت کے ہر فرد کو خداوند عالم کی حاکمیت کے مقابلے میں خود مختاری سے عمداً دستبردار ہو جانے کے لیے تیار کیا جائے' تا آں کہ وہ اپنی پوری زندگی کو الٰہی قانون کے تابع کردے۔

۲- ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الغیب والشہادہ ہونے کا اور آخرت کی باز پرس کا عقیدہ عملی مشق وتمرین کے ذریعہ سے اس طرح جاگزیں کر دیا جائے کہ وہ خود اپنی شخصی ذمہ داری کے احساس کی بنا پر' نہ کہ کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے قانون الٰہی کی خفیہ اور علانیہ اطاعت کرنے لگے۔

۳- ہر فرد کے اندر یہ روح پھونک دی جائے کہ وہ ماسوا اللہ کی بندگی واطاعت سے اعتقاداً وعملاً منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ کے لیے اس طرح خالص ہو جائے کہ جس حکم یا جس قانون یا جس اقتدار کے لیے اس کی طرف سے کوئی سند نہ ہو' اس کی اطاعت کے لیے فرد مومن کے نفس میں کوئی آمادگی بھی نہ ہو۔

۴- ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طور پر کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات پر عملاً پورا اقتدار حاصل ہو' وہ اپنے نفس وجسم کی تمام قوتوں پر اتنا قابو رکھتا ہو کہ اپنے عقیدے اور علم وبصیرت کے مطابق ان سے کام لے سکے۔ اس میں صبر' تحمل' جفاکشی' توکل علی اللہ اور ثابت قدمی ویکسوئی کی صفات پیدا ہو جائیں اور اس کے کیرکٹر میں اتنی قوت آجائے کہ وہ خارجی ترغیبات اور اپنے نفس کے ناجائز میلانات کا مقابلہ کر سکے۔

یہی وہ مقاصد ہیں جن کے لیے اسلام نے رمضان کے روزے ہر اس شخص پر فرض کیے ہیں جو اسلامی جماعت کا رکن ہو۔ کوئی عاقل وبالغ فرد' خواہ وہ عورت ہو یا مرد' اس فریضے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ بیماری' سفر اور بعض دوسرے شرعی عذرات کی بنا پر کوئی شخص اس فرض کو ادا نہ کر سکتا ہو تو اس پر قضا یا فدیہ لازم ہے۔ بہر حال اسلام کے دائرے میں رہ کر کوئی انسان روزے کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فرضیت سے چھوٹتا نہیں ہے۔

اگرچہ یہ لازم نہیں کہ روزے کی تربیت سے تمام افراد کے اندر وہ خصوصیات بدرجۂ اتم پیدا ہو جائیں جو اس سے پیدا کرنی مطلوب ہیں۔ کیوں کہ ان کی پیدائش اور تکمیل کے لیے خود تربیت لینے والے میں ذاتی استعداد بھی ضروری ہے، لیکن بجائے خود اس نظام تربیت کی فطرت میں یہ خاصہ موجود ہے کہ اس سے یہ خصوصیات انسان میں پیدا ہوں اور ان خصوصیات کو پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر، بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا نظامِ تربیت تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص صداقت پسندی کی نظر سے دیکھے تو اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ دنیا میں اسلام کے سوا کوئی اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے افراد کو تیار کرنے کا اتنا وسیع وہمہ گیر انتظام کیا ہو کہ پوری کی پوری آبادیاں اس کے دائرے میں آکر خود بخود اخلاقی تربیت پاتی چلی جائیں۔

پھر اس کا مزید کمال یہ ہے کہ سوسائٹی کے حدود میں اگر کوئی فرد ایسا ناقص نکل آئے کہ اس اجتماعی نظام کا جزو بن کر نہ رہ سکتا ہو، تو خود بخود الگ ممتاز ہو جاتا ہے۔ جہاں اس نے بغیر عذر شرعی کے روزہ ترک کیا اور فوراً ہی یہ بات سوسائٹی میں آشکارا ہو گئی کہ اس کے درمیان ایک منافق موجود ہے جو خدا کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتا اور اپنی حیوانی جبلت کا بندہ بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اس صریح علامت سے سوسائٹی کو اپنے جسم میں ایک سڑے ہوئے عضو کی موجودگی کا بروقت علم ہو جاتا ہے، اور اس کو موقع مل جاتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے زہر سے محفوظ کرے۔ کم از کم اسلام نے اپنی حد تک منافقین کی نشان دہی کا پورا انتظام کر دیا ہے اور ہر مسلم سوسائٹی کے لیے اس بات کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ عین وقت پر ان کے وجود سے آگاہ ہو کر یا تو ان کی اصلاح کرے یا انھیں اپنے دائرے سے خارج کر دے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کوئی بے حس نام نہاد مسلم سوسائٹی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائے اور ایسے لوگوں کو نہ صرف اپنی گود میں پرورش کرے بلکہ انھیں اپنے سر پر بٹھائے اور زندہ باد کے نعرے لگائے۔

اجتماعی پہلو

نماز کی طرح روزہ بھی بجائے خود ایک انفرادی فعل ہے، لیکن جس طرح نماز کے ساتھ جماعت کی شرط لگا کر اس کو انفرادی سے اجتماعی فعل میں تبدیل کر دیا گیا ہے، اسی طرح روزے کو بھی ایک ذرا سی حکیمانہ تدبیر نے انفرادی عمل کے بجائے اجتماعی عمل بنا کر اس کے فوائد ومنافع کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تدبیر بس اتنی سی ہے کہ روزے رکھنے کے لیے ایک خاص مہینہ مقرر کر دیا گیا۔ اگر شارع کے پیش نظر محض افراد کی اخلاقی تربیت ہوتی تو اس کے لیے یہ حکم دینا کافی تھا کہ ہر مسلمان سال بھر کے دوران میں کبھی تیس دن کے روزے رکھ لیا کرے۔ اس طرح وہ تمام مقاصد پورے ہو سکتے تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، بلکہ ضبطِ نفس کی مشق کے لیے یہ صورت زیادہ مناسب تھی۔ کیوں کہ اجتماعی عمل سے روزہ رکھنے میں جو آسانی افراد کے لیے پیدا ہو جاتی ہے وہ انفرادی عمل کی صورت میں نہ ہوتی اور ہر شخص کو اپنا فرض ادا کرنے میں نسبتاً زیادہ شدت کے ساتھ اپنی قوتِ ارادی استعمال کرنی پڑتی۔ لیکن اسلام کا قانون جس حکیم نے بنایا ہے اس کی نگاہ میں افراد کی ایسی تیاری کسی کام کی نہیں ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جس کے نتیجے میں ایک جماعتِ صالحہ وجود میں نہ آئے، اس لیے اس نے روزے کو محض ایک انفرادی عمل بنانا پسند نہیں کیا، بلکہ سال بھر میں ایک مہینہ روزے کے لیے مخصوص کر دیا تا کہ سب مسلمان بہ یک وقت روزہ رکھیں اور وہی نظام تربیت جس سے افراد تیار ہوں، ایک صالح اجتماعی نظام بنانے میں بھی مددگار ہو جائے۔

اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی و روحانی منافع میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کیے جاتے ہیں۔

□ **تقویٰ کی فضا:** اجتماعی عمل کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اس کام میں اس کے شریک ہوں، تو وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں بالکل اجنبی پائے گا۔ اس کی کیفیت ذہنی صرف اسی کی ذات تک محدود اور صرف اسی کی نفسی قوتوں پر منحصر رہے گی، اُس کو نشوونما پانے کے لیے ماحول سے کوئی مدد نہ ملے گی، بلکہ ماحول کے مختلف اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے الٹا گھٹا دیں گے۔ لیکن اگر وہی کیفیت پورے ماحول پر طاری ہو۔ اگر تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوئی ہوگی اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذا لے کر بے حد و حساب بڑھتی چلی جائے گی۔ ایک شخص اکیلا برہنہ ہو اور گرد و پیش سب لوگ کپڑے پہنے ہوئے ہوں تو وہ کس قدر شرمائے گا؟ بے حیائی کی کتنی بڑی مقدار اس کو برہنہ ہونے کے لیے درکار ہوگی اور پھر بھی ماحول کے مختلف اثرات سے اس کی شدید بے حیائی بھی کس طرح بار بار شکست کھائے گی؟ لیکن جہاں ایک حمام میں سب ننگے ہوں وہاں شرم بے چاری کو پھٹکنے کا موقع بھی نہ ملے گا اور ہر شخص کی بے شرمی دوسروں کی بے شرمی سے مدد پا کر افزوں در افزوں ہوتی چلی جائے گی۔ ایک ایک سپاہی کا الگ الگ جنگ کرنا اور مہالکِ جنگ برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے؟ مگر جہاں فوج کی فوج ایک ساتھ مارچ کر رہی ہو وہاں جذباتِ شہامت و حماست کا ایک طوفان امنڈ آتا ہے جس میں ہر سپاہی مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے۔ نیکی ہو یا بدی، دونوں کی ترقی میں اجتماعی نفسیات کو غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ جماعت مل کر بدی کر رہی ہو تو فحش، بے حیائی اور بدکاری کے جذبات اُبل پڑتے ہیں۔ اور جماعت مل کر نیکی کر رہی ہو تو پاکیزہ خیالات اور نیک جذبات کا سیلاب آ جاتا ہے جس میں بد بھی نیک بن جاتے ہیں، خواہ تھوڑی دیر کے لیے سہی۔

اجتماعی روزے کا مہینہ قرار دے کر رمضان سے شارع نے یہی کام لیا ہے۔ جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اور ہر طرف کھیتوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے، اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے۔ جس میں برائیاں دبتی ہیں، نیکیاں پھلتی ہیں، پوری پوری آبادیوں پر خوفِ خدا اور حُبِّ خیر کی روح چھا جاتی ہے، اور ہر طرف پرہیز گاری کی کھیتی سر سبز نظر آنے لگتی ہے۔ اس زمانے میں گناہ کرتے ہوئے آدمی کو شرم آتی ہے، ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے کسی دوسرے بھائی کو گناہ کرتے دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے، ہر ایک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ بھلائی کا کام کرے' کسی غریب کو کھانا کھلائے' کسی ننگے کو کپڑا پہنائے' کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے' کہیں کوئی نیک کام کر رہا ہو تو اس میں حصہ لے' کہیں کوئی بدی ہو رہی ہو تو اسے روکے۔ اس وقت لوگوں کے دل نرم ہو جاتے ہیں' ظلم سے ہاتھ رک جاتے ہیں' برائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے' توبہ اور خشیت و انابت کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہیں' نیک بہت نیک ہو جاتے ہیں اور بد کی بدی اگر نیکی میں تبدیل نہیں ہوتی تب بھی اس جلاب سے اس کا اچھا خاصا تنقیہ ضرور ہو جاتا ہے۔ غرض اس زبردست حکیمانہ تدبیر سے شارع نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ ہر سال ایک مہینے کے لیے پوری اسلامی آبادی کی صفائی ہوتی رہے' اس کو اوورہال کیا جاتا رہے' اس کی کایا پلٹی جائے۔ اور اس میں مجموعی حیثیت سے روح اسلامی کو از سر نو زندہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ وَ غُلِّقَتْ اَبْوَابُ جَهَنَّمَ وَسُلْسِلَتِ الشَّيَاطِيْنُ جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین باندھ دیئے جاتے ہیں۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:

اِذَا كَانَ اَوَّلُ لَيْلَةٍ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّيَاطِيْنُ وَمَرَدَةُ الْجِنِّ وَ غُلِّقَتْ اَبْوَابُ النَّارِ فَلَمْ يُفْتَحْ مِنْهَا بَابٌ وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ فَلَمْ يُغْلَقْ مِنْهَا بَابٌ وَيُنَادِىْ مُنَادٍ يَا بَاغِىَ الْخَيْرِ اَقْبِلْ وَ يَا بَاغِىَ الشَّرِّ اَقْصِرْ جب رمضان کی پہلی تاریخ آتی ہے تو شیاطین اور سرکش جن باندھ دیے جاتے ہیں۔ دوزخ کی طرف جانے کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا۔ اور جنت کی طرف جانے کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہتا۔ اس وقت پکارنے والا پکارتا ہے: اے بھلائی کے طالب آگے بڑھ اور اے برائی کے خواہش مند ٹھہر جا۔

سکتے کے مریض کا آخری امتحان اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس کی ناک کے پاس آئینہ رکھتے ہیں۔ اگر آئینے پر کچھ دھندلاہٹ سی پیدا ہو تو سمجھتے ہیں کہ ابھی جان باقی ہے' ورنہ اس کی زندگی کی آخری امید بھی منقطع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی کسی بستی کا تمھیں امتحان لینا ہو تو اسے رمضان کے مہینے میں دیکھو۔ اگر اس مہینے میں اس کے اندر کچھ تقویٰ' کچھ خوف خدا' کچھ نیکی کے جذبے کا ابھار نظر آئے تو سمجھو ابھی زندہ ہے۔ اور اگر اس مہینے میں بھی نیکی کا بازار سرد ہو' فسق و فجور کے آثار نمایاں ہوں' اور حس مردہ نظر آئے تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھ لو۔ اس کے بعد زندگی کا کوئی سانس 'مسلمان' کے لیے مقدر نہیں ہے۔[1]

□ **جماعتی احساس:** اجتماعی عمل کا دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے۔

۱- یہ تو ہے امتحان کا اسلامی معیار۔ مگر اب اس جانچ کے لیے کچھ دوسرے معیار ایجاد ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی آبادی غلام ہو تو اس کا امتحان یوں لیا جاتا ہے کہ قومی مفاد (یعنی قوم کے معاشی و سیاسی مفاد) کے لیے ان میں کتنی تڑپ ہے۔ اس مفاد کی حفاظت کے لیے وہ کہاں تک مل کر چیختے ہیں اور جلسوں میں اسلام اور اسلامی قومیت کا نام کس جوش و خروش سے لیا جاتا ہے۔ اور اگر وہ آبادی آزاد ہو تو اس کی زندگی کا امتحان لینے کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے ہوائی جہاز کتنے مہیا کیے' ریلیں کتنی بنائیں' مدرسے اور کارخانے کس قدر قائم کیے' اپنی عورتوں کو بے حیائی میں کہاں تک طاق کیا اور تہذیب' تمدن اور معاشرت میں یورپ سے لگا کھانے کی کہاں تک کامیاب کوشش کی۔ ان آزمائشوں میں اگر کوئی آبادی پوری اتر گئی تو کہا جاتا ہے کہ الحمدللہ اسلام زندہ ہے اور بس' ہوتا ہے جادہ پیما اب کارواں ہمارا۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نسل یا زبان یا مرز بوم یا معاشی اغراض کا اشتراک فطری قومیت پیدا نہیں کرتا۔ آدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے' جو خیالات اور عمل میں اس سے ملتا ہو۔ یہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے اور جس کے ساتھ خیالات اور عمل میں اتفاق نہ ہو اس سے کبھی دل نہیں ملتا' خواہ دونوں ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہوں۔ جب کوئی شخص اپنے گردوپیش کے لوگوں کو ذہنیت اور عمل میں اپنے سے مختلف پاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے۔ مگر جب بہت سے لوگ مل کر ایک ہی ذہنی کیفیت کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں تو ان میں باہم یگانگت' رفاقت' یک جہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں' ان کے درمیان کوئی اجنبیت باقی نہیں رہتی' قلب و روح کا اشتراک اور عمل کا اتفاق ان کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دیتا ہے۔

خواہ نیکی ہو یا بدی' دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتے ہیں۔ چوروں میں چوری کا اشتراک اور شرابیوں میں شراب نوشی کا اشتراک بھی یونہی برادری پیدا کرتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ بدی کے راستے میں افراد کی نفسانیت کا دخل رہتا ہے۔ جس کا فطری میلان فرد فرد کو پھاڑ کر الگ کر دینے کی طرف ہے' اس لیے ایسے راستوں میں برادری کبھی بے آلائش اور مستحکم نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے نیکی کے راستے میں نفسانیت دبتی ہے' انسانی روح کو حقیقی تسکین ملتی ہے' اور پاک جذبات کے ساتھ آدمی اس راستے پر چلتا ہے۔ اس لیے نیک خیالات اور نیک عمل کا اشتراک وہ بہترین رشتہ اخوت پیدا کرتا ہے' جس سے زیادہ مستحکم اجتماعی رابطے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

نماز باجماعت کی طرح رمضان کے اجتماعی روزے مسلمانوں میں اسی نوع کی برادری پیدا کرتے ہیں۔ تمام لوگوں کا مل کر ایک خدا کی رضا چاہنا' اسی کی رضا کے لیے بھوک پیاس کی تکلیف اٹھانا' اسی کے خوف سے برائیوں کو چھوڑنا اور ایک دوسرے کو برائیوں سے روکنا اور اسی کی محبت میں بھلائیوں کی طرف دوڑنا اور ایک دوسرے کو بھلائی پر اکسانا' یہ چیز ان میں بہترین قسم کی وحدت' صحیح ترین فطری قومیت' پاکیزہ ترین اجتماعی ذہنیت' اور ایسی ہمدردی و رفاقت پیدا کرتی ہے جو ہر کھوٹ سے خالی ہے۔

□ **امداد باہمی کی روح:** اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی طور پر تمام لوگوں کو ایک سطح پر لے آتی ہے۔ اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب غریب' لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لیے امیر پر بھی وہ کیفیت طاری کر دیتا ہے جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گذرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے' اور خدا کی رضا چاہنے کا جذبہ اسے غریب بھائیوں کی مدد کرنے پر اُکساتا ہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کے اخلاقی و تمدنی فوائد بے شمار ہیں۔ جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکالیف کا احساس اور ان کی عملی ہمدردی کا جذبہ ہو' اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو' بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کو تلاش کر کے مدد پہنچائی جاتی ہو وہاں نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں' نہ صرف یہ کہ اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے' بلکہ غربت اور امارت میں حسد کے بجائے محبت کا' شکر گذاری اور احسان مندی کا تعلق قائم ہوتا ہے اور وہ طبقاتی جنگ کبھی رونما نہیں ہو سکتی' جو ان قوموں میں ہوتی ہے جن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے مال دار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر وفاقہ کیا چیز ہوتی ہے' جو قحط کے زمانے میں تعجب سے پوچھتے ہیں کہ لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں۔ انھیں روٹی نہیں ملتی تو یہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟

یہ اسلام کا دوسرا عملی رکن ہے' جس کے ذریعے سے اسلام اپنے افراد کو فرداً فرداً ایک خاص قسم کی اخلاقی تربیت دے کر تیار کرتا ہے اور پھر انھیں جوڑ کر ایک خاص طرز کی جماعت بناتا ہے۔ اسلام کا آخری مقصد جس مدنیتِ صالحہ اور حکومتِ الٰہیہ کو وجود میں لانا ہے اس کے اجزائے ترکیبی اس طرح نماز اور روزے کے ذریعے سے چھیل بنا کر تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے اہل کار' عہدے دار اور وزرا، اس کے معلم اور پروفیسر' اس کے قاضی اور مفتی' اس کے تاجر' مزدور' کارخانے دار اور کسان' اس کے رائے دہندے' نمایندے اور شہری' سب اس تربیت کے بعد کہیں اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے اجتماع سے وہ صالح' تمدنی و سیاسی نظام بن سکے جسے 'خلافت علی منہاج النبوۃ' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ محض اَن گھڑ افراد کو لے کر خلافت الٰہیہ قائم کرنے کے لیے دوڑ جانا ایسی خام خیالی وخام کاری ہے جس سے اللہ اور اس کا رسولؐ بری ہیں۔

(اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر، جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۱۰۶-۱۱۹)

روزہ اور ضبطِ نفس

روزے کے بے شمار اخلاقی وروحانی فائدوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان میں ضبطِ نفس کی طاقت پیدا کرتا ہے۔ اس بات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم ضبطِ نفس کا مطلب سمجھ لیں' پھر یہ معلوم کریں کہ اسلام کس قسم کا ضبطِ نفس چاہتا ہے اور اس کے بعد یہ دیکھیں کہ روزہ کس طرح یہ طاقت پیدا کرتا ہے۔

ضبطِ نفس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کی خودی جسم اور اس کی طاقتوں پر اچھی طرح قابو یافتہ ہو اور نفس کی خواہشات وجذبات پر اس کی گرفت اتنی مضبوط ہو کہ وہ اس کے فیصلوں کے تابع ہو کر رہیں۔ انسان کے وجود میں خودی کا مقام وہی ہے جو ایک سلطنت میں حکمران کا مقام ہوا کرتا ہے۔ جسم اور اس کے اعضا خودی کے آلۂ کار ہیں۔ تمام جسمانی اور دماغی طاقتیں خودی کی خدمت کے لیے ہیں۔ نفس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ خودی کے حضور اپنی خواہشات کو درخواست کے طور پر پیش کرے۔ فیصلہ خودی کے اختیار میں ہے کہ وہ ان آلات اور طاقتوں کو کس مقصد کے لیے استعمال کرے اور نفس کی گزارشات میں سے کسے قبول اور کسے رد کر دے۔ اگر کوئی خودی اتنی کمزور ہو کہ جسم کی مملکت میں وہ اپنا حکم اپنے منشا کے مطابق نہ چلا سکے اور اس کے لیے نفس کی خواہشیں مطالبات اور احکام کا درجہ رکھتی ہوں تو وہ ایک مغلوب اور بے بس خودی ہے۔ اس کی مثال اس سوار کی سی ہے جو اپنے گھوڑے کے قابو میں آ گیا ہو۔ ایسے کمزور انسان دنیا میں کسی قسم کی بھی کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ تاریخِ انسانی میں جن لوگوں نے اپنا کوئی نقش چھوڑا ہے وہ وہی لوگ تھے جنھوں نے اپنے وجود کی طاقتوں کو بزور اپنا محکوم بنا کر رکھا ہے' جو خواہشاتِ نفس کے بندے اور جذبات کے غلام بن کر نہیں بلکہ ان کے آقا بن کر رہے ہیں' جن کے ارادے مضبوط اور عزم پختہ رہے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیکن فرق اور بہت فرق ہے اُس خودی میں جو خدا بن جائے۔ اور اس خودی میں جو خدا کی تابع فرمان بن کر کام کرے۔ کامیاب زندگی کے لیے خودی کا قابو یافتہ ہونا تو بہر حال ضروری ہے، مگر جو خودی اپنے خالق سے آزاد اور دنیا کے مالک سے بے نیاز ہو، جو کسی بالاتر اخلاقی قانون کی پابند نہ ہو، جس کو کسی حساب لینے والے کی باز پرس کا اندیشہ نہ ہو، وہ اگر اپنے جسم ونفس کی طاقتوں پر قابو پاکر ایک پرزور خودی بن جائے تو وہ دنیا میں فرعون اور نمرود، ہٹلر اور مسولینی جیسے بڑے بڑے مفسد ہی پیدا کرسکتی ہے۔ ایسا ضبطِ نفس نہ قابلِ تعریف ہے اور نہ وہ اسلام کو مطلوب ہے۔ اسلام جس ضبط کا قائل ہے وہ یہ ہے کہ پہلے انسان کی خودی اپنے خدا کے آگے سر تسلیم خم کردے، اس کی رضا کی طلب اور اس کے قانون کی اطاعت کو اپنا شعار بنائے، اس کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھ لے، پھر اس مسلم ومومن خودی کو اپنے جسم اور اس کی طاقتوں پر حاکمانہ اقتدار، اور اپنے نفس اور اس کی خواہشوں پر قاہرانہ تسلط حاصل ہو، تاکہ وہ دنیا میں ایک مصلح قوت بن سکے۔

یہ ہے اسلامی نقطۂ نظر سے ضبطِ نفس کی اصل حقیقت۔ آیئے! اب ہم دیکھیں کہ روزہ کس طرح انسان میں یہ طاقت پیدا کرتا ہے۔

اگر آپ نفس وجسم کے مطالبات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں تین مطالبے اصل وبنیاد کا حکم رکھتے ہیں اور وہی سب سے زیادہ طاقت ور مطالبے ہیں۔ ایک غذا کا مطالبہ جس پر بقائے حیات کا انحصار ہے۔ دوسرا صنفی مطالبہ جو بقائے نوع کا ذریعہ ہے۔ تیسرا آرام کا مطالبہ جو قوتِ کارکردگی کی بحالی کے لیے ضروری ہے۔ یہ تینوں مطالبے اگر اپنی حد کے اندر ہیں تو عین منشائے فطرت ہیں۔ لیکن نفس وجسم کے پاس یہی تین پھندے ایسے ہیں کہ ذرا سی ڈھیل پاتے ہی وہ ان کے جال میں پھانس کر آدمی کی خودی کو الٹا اپنا غلام بنالیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مطالبہ بڑھ کر مطالبات کی ایک فہرست بن جاتا ہے اور ہر ایک زور لگاتا ہے کہ انسان اپنا مقصدِ زندگی، اپنے اصول اور اپنے ضمیر کے فتوے بھول کر بس اسی کے تقاضے پورے کرنے میں لگا رہے۔ ایک کمزور خودی جب ان تقاضوں سے مغلوب ہوجاتی ہے تو غذا کا مطالبہ اسے بندۂ شکم بنادیتا ہے۔ صنفی جذبہ اس کو حیوانیت کے اسفل السافلین میں پہنچا دیتا ہے، اور جسم کی آرام طلبی اس کے اندر ارادے کی کوئی طاقت باقی نہیں رہنے دیتی۔ پھر وہ اپنے نفس وجسم کی حاکم نہیں بلکہ ان کی محکوم بن کر رہتی ہے اور اس کا کام بس یہ رہ جاتا ہے کہ اس کے احکام کو بھلے اور برے، جائز اور ناجائز تمام طریقوں سے بجالایا کرے۔

روزہ نفس کی انھی تین خواہشوں کو اپنے ضابطے کی گرفت میں لیتا ہے اور خودی کو ان پر قابو پانے کی مشق کراتا ہے۔ وہ اس خودی کو جو خدا پر ایمان لاچکی ہے، یہ خبر دیتا ہے کہ تیرے خدا نے آج دن بھر کے لیے تجھ پر دانہ پانی حرام کردیا ہے، اس مدت کے اندر تیرے مالک نے آج تیری صنفی خواہشات پر بھی پابندی عائد کردی ہے، صبح صادق سے غروب آفتاب تک تیرے لیے حلال طریقے سے بھی ان خواہشات کو پورا کرنا حرام ہے۔ وہ اسے یہ اطلاع بھی دیتا ہے کہ تیرے رب کی خوشی اسی میں ہے کہ دن بھر کی بھوک پیاس کے بعد جب تو افطار کرے تو نڈھال ہوکر لیٹ نہ جا بلکہ اٹھ کر عام دنوں سے زیادہ اس کی عبادت کر۔ وہ اس کو یہ حکم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بھی پہنچاتا ہے کہ نماز کی لمبی رکعتوں سے فارغ ہو کر جب تو آرام کر لے تو صبح تک مدہوش ہو کر نہ پڑ جا بلکہ معمول کے خلاف سحری کے لیے اٹھ اور صبح سے پہلے اپنے جسم کو غذا دے۔ یہ سارے احکام پہنچا دینے کے بعد وہ ان کی تعمیل کا معاملہ خود اسی پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی پولیس' کوئی سی آئی ڈی، کوئی خارجی دباؤ ڈالنے والی طاقت نہیں لگائی جاتی۔ وہ چھپ کر کھائے پیے یا صنفی خواہشات پوری کر لے تو خدا کے سوا کوئی اسے دیکھنے والا نہیں ہے۔ وہ تراویح سے بچنے کے لیے کوئی شرعی حیلہ کر دے تو کوئی دنیوی طاقت اس کی گرفت نہیں کر سکتی۔ سب کچھ اس کے اپنے اُوپر منحصر ہے۔ اگر مومن کی خودی واقعی خدا کی مطیع ہو چکی ہے اور اگر اس کے ارادے میں اتنا زور ہے کہ نفس پر قابو پا سکے تو وہ خود ہی غذا کی مانگ کو صنفی خواہش کو اور آرام کی طلب کو اس ضابطے میں کس دے گا جو آج خلافِ معمول اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔

یہ صرف ایک دن کی مشق نہیں ہے۔ ایسی مشق کے لیے ایک دن کافی بھی نہیں ہو سکتا۔ مسلسل ۳۰ دن خودی سے یہی مشق کرائی جاتی ہے۔ سال بھر میں پورے ۷۲۰ گھنٹے کے لیے یہ پروگرام بنا دیا گیا ہے کہ رات کے آخری حصے میں اٹھ کر سحری کھاؤ' صبح پو پھٹتے ہی کھانا پینا بند کر دو' دن بھر ہر قسم کی غذا سے پرہیز کرو' غروبِ آفتاب کے بعد ٹھیک وقت پر افطار کرو' پھر رات کا ایک حصہ تراویح کی غیر معمولی نماز میں کھڑے رہ کر گزارو' اور چند گھنٹے آرام لینے کے بعد پھر دوسرے دن کے لیے یہی پروگرام شروع کر دو۔ اس طرح مہینے بھر تک پے در پے نفس کے ان تین سب سے بڑے اور سب سے زیادہ طاقت ور مطالبوں کو ضابطے میں کستے رہنے سے خودی کے اندر یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق اپنے نفس و جسم پر حکومت کر سکے۔ اور یہ عمر بھر میں صرف ایک ہی مرتبہ کا پروگرام نہیں ہے بلکہ سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد سے مرتے دم تک ہر سال میں ایک مہینہ اسی مشق کے لیے وقف کیا گیا ہے تاکہ نفس پر خودی کی گرفت بار بار تازہ اور سخت ہوتی رہے۔

یہ ساری مشق محض اس غرض کے لیے نہیں ہے کہ مومن کی خودی صرف اپنی بھوک' پیاس' شہوت اور آرام طلبی پر قابو پا لے۔ اور اس کی غرض یہ بھی نہیں ہے کہ اس کو نفس و جسم پر قابو صرف ایک رمضان ہی کے مہینے میں حاصل رہے۔ دراصل اس کا مدّعا یہ ہے کہ نفس کے ان تین سب سے زیادہ زوردار حربوں کا مقابلہ کر کے وہ اس کے سارے ہی جذبات اور ساری خواہشات پر قابو یافتہ ہو جائے اور اس میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ محض رمضان ہی میں نہیں بلکہ رمضان کے بعد بھی باقی گیارہ مہینوں میں وہ ہر اس خدمت کے لیے اپنے جسم اور اس کی طاقتوں سے کام لے سکے جو خدا نے اس پر فرض کی ہو' ہر اس بھلائی کے لیے کوشش کر سکے جس میں خدا کی رضا ہو' ہر اس برائی سے رک سکے جو خدا کو ناپسند ہو اور اپنی خواہشات و جذبات کو ان حدود کا پابند بنا کر رکھ سکے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ اس کی باگیں نفس کے قبضے میں نہ ہوں کہ جدھر جدھر وہ چاہے اسے کھینچے کھینچے پھرے بلکہ عنانِ اقتدار اس کے اپنے ہاتھ میں رہے اور نفس کی جن خواہشوں کو' جس وقت' جس حد تک اور جس طرح پورا کرنے کی خدا نے اجازت دی ہے، انھیں اسی ضابطے کے مطابق پورا کرے۔ اس کا ارادہ اتنا کمزور نہ ہو کہ فرض کو فرض جانتا بھی ہو' ادا بھی کرنا چاہتا ہو' مگر جسم پر اس کا حکم ہی نہ چلتا ہو۔ نہیں، جسم کی مملکت میں وہ اس زبردست حاکم کی طرح رہے جو اپنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ماتحت عملے سے ہر وقت اپنے حسبِ منشا کام لے سکتا ہو۔ یہی طاقت پیدا کرنا روزے کا اصل مقصد ہے۔ جس شخص نے روزے سے یہ طاقت حاصل نہ کی اس نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو بھوک پیاس اور رت جگے کی تکلیف دی۔

قرآن اور حدیث دونوں میں اس بات کو صاف صاف واضح کر دیا [گیا] ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا کہ روزے تم پر اس لیے فرض کیے گئے ہیں کہ تمھارے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا اس کا پانی اور کھانا چھڑوا دینے کی خدا کو کوئی حاجت نہیں۔ نیز حضورؐ نے فرمایا بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جو روزے سے بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں پاتے۔

(نشری تقریریں، فروری ۱۹۷۸ء، ص ۷۹-۸۵)

❁ ❁ ❁

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

روزے اور رمضان کی فضیلت

روزہ جسم کی زکوٰۃ ہے

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز کی زکوٰۃ ہے اور آدمی کے جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے۔[1] (ابن ماجہ)

حقیقت میں تو تمام عبادتیں ایک لحاظ سے زکوٰۃ ہی کی تعریف میں آتی ہیں لیکن بطور اصطلاح صرف مال کی زکوٰۃ کو زکوٰۃ سے تعبیر کیا گیا ہے...... زکوٰۃ اصل میں یہ ہے کہ اللہ کا دیا ہوا جو کچھ آپ کے پاس ہے اس پر اللہ کا حق تسلیم کریں اور اس میں سے اس کی راہ میں خرچ کریں۔ چنانچہ روزہ آدمی کے جسم کی زکوٰۃ ہے اور اس زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ آپ روزہ اس احساس کے ساتھ رکھیں کہ میرے رب نے مجھ پر جو بے شمار احسانات کیے ہیں اور مجھے جسم جیسا عظیم الشان خادم عطا فرمایا ہے یہ روزہ میں اس کے شکرانے کے طور پر رکھ رہا ہوں۔ اگر کسی شخص نے محض اپنی صحت درست کرنے کے لیے روزہ رکھ لیا وہ جسم کی زکوٰۃ نہیں ہے۔ وہ جسم کی زکوٰۃ اس وقت شمار ہوگا جب کہ وہ اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے جسم میں اس کا حق مان کر رکھا جائے...... اسی طرح آپ کے اوقات کی زکوٰۃ ہے جو وقت بھی آپ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے صرف کریں گے وہ لامحالہ آپ کے وقت کی زکوٰۃ ہوگی اسی طرح آپ کی قابلیتوں کی زکوٰۃ ہے، جو کچھ قابلیتیں اللہ نے آپ کو عطا کی ہیں اگر آپ ان کو خدا کا دین پھیلانے میں، لوگوں کو اس کے دین کا قائل کرنے میں اور کفر والحاد کا مقابلہ کرنے میں صرف کرتے ہیں تو یہ چیز آپ کی دماغی اور علمی قابلیتوں کی زکوٰۃ ہوگی...... چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی آپ کو دی ہے اس پر اس کا حق ہے اور جب آپ یہ حق ادا کرتے ہیں تو گویا اس چیز کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۲-۲۴۳)

روزے کی غیر معمولی فضیلت

دوسری تمام نیکیاں آدمی کسی نہ کسی ظاہری فعل سے انجام دیتا ہے۔ مثلاً نماز ایک ظاہری فعل ہے۔ نماز پڑھنے والا نماز میں اٹھتا اور بیٹھتا ہے، رکوع اور سجدہ کرتا ہے، اس طرح یہ ایک نظر آنے والی عبادت ہے۔ اسی طرح حج اور زکوٰۃ کا معاملہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس روزہ کسی ظاہری فعل سے ادا نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ایسا مخفی فعل ہے جو فقط آدمی اور اس کے خدا کے درمیان ہوتا

۱- تخریج کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۷۳، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے...... اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ روزہ دراصل اللہ کے حکم کی تعمیل کی ایک مخفی شکل ہے۔ مثلاً نہ کھانا اور نہ پینا اور اسی طرح جن دوسری چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے باز رہنا۔ اس مخفی فعل کو یا تو آدمی خود جان سکتا ہے یا اس کا رب، کسی تیسرے کو معلوم نہیں ہوسکتا ہے کہ مخفی فعل اس نے کیا ہے یا نہیں۔ مثلاً اگر ایک آدمی چھپ کر کھا پی لے تو کسی کو اس کا علم نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ وہ روزہ نہ رکھتے ہوئے بھی کہہ سکتا ہے کہ میں روزے سے ہوں اور کوئی شخص یقین کے ساتھ یہ نہیں جان سکتا کہ آیا وہ روزے سے ہے یا نہیں۔ اگر وہ روزے سے ہے تو اس بات کو صرف وہ جانتا ہے اور اگر روزے سے نہیں تو اس کو بھی اس کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ اسی وجہ سے روزے کا معاملہ صرف خدا اور اس کے بندے کے درمیان ہوتا ہے اور اسی بنا پر اس میں ریا کا امکان نہیں ہوتا۔ ایک آدمی دنیا کو دکھانے کے لیے بے شک یہ کہتا پھرے کہ میں روزے سے ہوں لیکن حقیقتِ صوم کے اندر اس ریاکاری کی کوئی گنجایش نہیں کیونکہ وہ خدا کو دھوکا نہیں دے سکتا۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزے کی اس غیر معمولی فضیلت وقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ روزہ دار اپنی شہوتِ نفس اور کھانے پینے کو صرف اللہ ہی کی خاطر چھوڑتا ہے، اس لیے وہ بھی اسے آخرت میں بے حد وحساب اجر سے نوازے گا۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۵-۳۶)

روزے اور قرآن کی شفاعت

جب روزہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ اس بندے نے روزہ رکھا ہے تو اس پیشی کے ساتھ ساتھ روزے کی یہ شفاعت بھی موجود ہوتی ہے کہ یہ بندہ آپ کی خاطر دن بھر بھوکا پیاسا رہا۔ یہ چھپ کر کھا پی سکتا تھا اور دوسری خواہشات بھی پوری کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، اس بندے نے چونکہ آپ کی خاطر دن بھر بھوک پیاس برداشت کی ہے اور اپنی دوسری خواہشات پر بھی پابندیاں عائد کیے رکھی ہیں اس لیے اس کے قصور معاف فرما دیجیے۔

اسی طرح ایک شخص رات کو جو قرآن مجید پڑھتا ہے جب وہ قرآن اللہ کے حضور پیش کیا جاتا ہے کہ آج اس بندے نے اتنا قرآن مجید پڑھا ہے تو قرآن کا وہ پیش کیا جانا ہی خود اپنے اندر ایک شفاعت رکھتا ہے اور وہ شفاعت یہ ہے کہ اس بندے نے دن بھر کے روزے سے تھکا ماندا ہونے کے باوجود آپ کی رضاجوئی کی خاطر رات کو (نماز میں) کھڑے ہو کر قرآن پڑھا اس لیے اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں۔[2]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۶)

روزہ دار کے لیے دو فرحتیں

روزہ رکھنے والے کے لیے دو فرحتیں ہیں۔ ایک فرحت افطار کے وقت کی اور دوسری اپنے رب سے ملاقات کے وقت

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، دوم، ص ۲۹-۳۲۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۴۲-۴۳، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی......مراد یہ ہے کہ جو فرحت ایک روزے دار کو افطار کے وقت ملتی ہے وہ افطار پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس سے زیادہ فرحت اسے اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اپنے رب سے ملے گا اور وہاں اس کو معلوم ہوگا کہ جو عمل وہ دنیا میں کر کے آیا ہے اس کی یہاں کتنی بڑی جزا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے کس قدر قرب سے نوازا ہے اور اس کی کتنی خوشنودی اسے حاصل ہوئی ہے۔

روزہ دار کے منہ کی بساند اللہ تعالیٰ کو مُشک کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے، کوئی شخص اپنے منہ کو چاہے کتنا ہی صاف رکھنے والا اور دانتوں کی صفائی کرنے والا ہو لیکن کئی کئی گھنٹوں تک کھانے پینے سے رُکے رہنے کی وجہ سے اس کے منہ میں ایک خاص قسم کی بساند پیدا ہو جاتی ہے........... یہ بساند اللہ تعالیٰ کو مُشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسند ہے۔

روزہ ڈھال ہے

روزہ کارزارِ حیات میں انسان کو برائیوں سے بچانے والی ڈھال ہے۔ جس طرح دشمن کا وار ڈھال پر روکا جاتا ہے اسی طرح برائی کا کوئی موقع پیدا ہونے پر اگر ایک شخص یہ خیال کر کے کہ وہ روزے سے ہے اس برائی سے بچ جاتا ہے تو اس کا روزہ اس کے لیے برائی کے مقابلے میں ڈھال کے بمنزلہ ہے۔

اس ڈھال کی مدد کرنے اور اس کو مضبوط بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود بدکلامی نہ کرے، خود کسی کو برا نہ کہے اور خود کسی سے نہ لڑے۔ یہ ڈھال کی پہلی مدد ہے۔ اس کی دوسری مدد یہ ہے کہ کوئی دوسرا شخص لڑنے کو آئے تو اس سے کہے کہ بابا میں تو روزے سے ہوں۔ اگر تم گالی دو گے تو میں نہیں دوں گا۔ اس کے بعد یہ ڈھال اس قدر مضبوط ہو جاتی ہے کہ آدمی کو ہر برائی سے بچا سکتی ہے۔

اگر ایک آدمی نے لوگوں سے خود جھگڑا کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنی اس ڈھال میں خود شگاف پیدا کر لیا جو اس کو برائی سے بچانے والی تھی۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس سے لڑنے کو آیا اور یہ بھی آستینیں چڑھا کر کھڑا ہو گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے وہ ڈھال خود توڑ تاڑ کر پھینک دی۔ اب ایک وار وہ کرے گا اور دوسرا یہ کرے گا۔ لیکن اگر ایک آدمی اپنے روزے کی اِس ڈھال سے کام لے تو یہ ڈھال یقیناً اسے برائیوں سے بچائے گی۔[۱]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۷)

سرما کا روزہ، غنیمتِ باردہ

حضرت عامر بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاڑے کے زمانے کا روزہ غنیمت باردہ ہے۔ (احمد، ترمذی)

غنیمت باردہ اس مال کو کہتے ہیں جو مفت میں ہاتھ آجائے اور اس کے لیے کوئی محنت و مشقت نہ کرنی پڑے نہ تو اس پر کچھ خرچ اٹھے اور نہ اس کے لیے جان جوکھوں میں ڈالنی پڑے۔

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۴۰، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جاڑے کے زمانے میں روزے کی نوعیت بھی مفت ہاتھ آئے ہوئے مال کی سی ہے کیوں کہ اس میں کوئی زیادہ تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی۔

یہاں اس روزے سے مراد رمضان کا روزہ بھی ہے اور نفلی روزہ بھی رمضان کے روزے بھی آدمی کو مفت ثواب دلوا دیتے ہیں اور نفلی روزوں کا بھی یہی معاملہ ہے، کیونکہ اس میں گرما کی سی سختی اور تکلیف سے سابقہ پیش نہیں آتا۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۳۴-۲۳۵)

گناہ سے بچنے کا ذریعہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے روزے کے اصل مقصد کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ سمجھایا ہے کہ مقصد سے غافل ہو کر بھوکا پیاسا رہنا کچھ مفید نہیں ہے، چنانچہ فرمایا: مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ جس کسی نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا ہی نہ چھوڑا تو اس کا کھانا اور پانی چھڑا دینے کی اللہ کو کوئی حاجت نہیں۔

(خطبات، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۵-۱۶۶)

دوسری حدیث میں آیا ہے:

اَلصِّيَامُ جُنَّةٌ وَ اِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ اَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّهٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهٗ فَلْيَقُلْ اِنِّيْ امْرُءٌ صَائِمٌ روزے ڈھال کی طرح ہیں (کہ جس طرح ڈھال دشمن کے وار سے بچنے کے لیے ہے اسی طرح روزہ بھی شیطان کے وار سے بچنے کے لیے ہے) لہٰذا جب کوئی شخص روزے سے ہو تو اسے چاہیے کہ (اس ڈھال کو استعمال کرے اور) دنگے فساد سے پرہیز کرے۔ اگر کوئی شخص اس کو گالی دے، یا اس سے لڑے تو اس کو کہہ دینا چاہیے کہ بھائی میں روزے سے ہوں (مجھ سے یہ توقع نہ رکھو کہ تمھارے اس مشغلے میں حصہ لوں گا)۔

(خطبات، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۷)

[ایک اور] حدیث میں ہے کہ سرکارؐ نے فرمایا:

كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الظَّمَأُ وَكَمْ مِّنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ قِيَامِهٖ اِلَّا السَّهَرُ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اور بہت سے راتوں کو کھڑے رہنے والے ایسے ہیں کہ اس قیام سے رت جگے کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

ان دونوں حدیثوں کا مطلب بالکل صاف ہے۔ ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ محض بھوکا اور پیاسا رہنا عبادت

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۶۲-۲۶۳، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں ہے بلکہ اصل عبادت کا ذریعہ ہے اور اصل عبادت ہے خوفِ خدا کی وجہ سے خدا کے قانون کی خلاف ورزی نہ کرنا' اور محبت الٰہی کی بنا پر ہر اس کام کے لیے شوق سے لپکنا جس میں محبوب کی خوشنودی ہو' اور نفسانیت سے بچنا' جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اس عبادت سے جو شخص غافل رہا اس نے خواہ مخواہ اپنے پیٹ کو بھوک پیاس کی تکلیف دی۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی حاجت کب تھی کہ بارہ چودہ گھنٹے کے لیے اس سے کھانا پینا چھڑا دیتا؟

(خطبات، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۶)

نیکی کی حرص پیدا کرنا

دوسری احادیث میں حضورؐ نے بتایا ہے کہ روزے کی حالت میں آدمی کو زیادہ سے زیادہ نیک کام کرنے چاہییں اور ہر بھلائی کا شوقین بن جانا چاہیے۔ خصوصاً اس حالت میں اس کے اندر اپنے دوسرے بھائیوں کی ہمدردی کا جذبہ تو پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو جانا چاہیے' کیونکہ وہ خود بھوک پیاس کی تکلیف میں مبتلا ہو کر زیادہ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ دوسرے بندگانِ خدا پر غریبی اور مصیبت میں کیا گزرتی ہوگی۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ خود سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں عام دنوں سے زیادہ رحیم اور شفیق ہو جاتے تھے۔ کوئی سائل اس زمانے میں حضورؐ کے دروازے سے خالی نہ جاتا تھا۔ اور کوئی قیدی اس زمانے میں قید نہ رہتا تھا۔

(خطبات، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۷)

رمضان کی آمد پر پکارنے والے کی پکار

پکارنے والا پکارتا ہے کہ اے بھلائی کے طالب! آگے بڑھ، اور اے برائی کے طالب! رُک جا۔

پکارنے والے سے مراد یہ نہیں کہ کوئی شخص کھڑا ہو کر یہ صدا لگاتا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی کرنے والوں کو رمضان کی آمد ہی سے اس بات کی اطلاع مل جاتی ہے کہ نیکیاں کرنے اور برائیوں سے بچنے کا زمانہ آ گیا ہے۔ جس وقت اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ رمضان کا چاند دیکھ لیا گیا ہے تو یہ اعلان اپنے اندر اس بات کو متضمن رکھتا ہے کہ اے بھلائی کے طالب! آگے بڑھ، یہ وقت ہے بھلائیاں لُوٹ لے جانے کا۔ وہ زمانہ شروع ہو گیا ہے، جس میں تو بھلائیوں سے اپنی جھولی بھر سکتا ہے...... اور اے برائی کے طالب! رُک جا، یہ وقت ہے تیرے رُک جانے کا، کیونکہ وہ زمانہ شروع ہو گیا ہے، جس میں تیری ایک معمولی سی برائی بھی بہت بڑی قرار پائے گی اور اس کے برعکس تیری ایک معمولی سی بھلائی بھی بے انتہا نشوونما پائے گی، اس لیے اب تجھے برائیوں سے رُک ہی جانا چاہیے۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۴۰-۴۱)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۷۳، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رمضان، نیکیوں کا موسم بہار

............جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو آسمان (یا جنت یا رحمت) کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں [یعنی] رمضان کی آمد کے بعد جتنی نیکیاں کر سکتے ہو کرتے چلے جاؤ' جنت کے سب دروازے تمھارے لیے کھلے ہیں۔ اگر صدقہ وخیرات کے دروازے سے جنت میں پہنچ سکتے ہو تو صدقہ وخیرات کے دروازے سے پہنچو۔ اگر روزے کے دروازے سے پہنچ سکتے ہو تو روزے کے دروازے سے پہنچو۔ اگر برائیوں سے اجتناب کے ذریعے سے پہنچ سکتے ہو تو اس ذریعے سے پہنچو۔ الغرض جنت میں پہنچنے کے لیے تمام دروازے پوری طرح تمھارے لیے کھلے ہیں اور اب یہ تمھارا کام ہے کہ خود کو جنت کے قابل بنالو............

............رمضان کے زمانے میں ان برائیوں کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں جن میں ایک آدمی دوسرے زمانے میں عام طور پر مبتلا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک نیکو کار مسلمان رمضان کی ایمان پرور فضا کی بدولت برائی کے بہت سے امکانات سے بچ جاتا ہے اور اس طرح جہنم کے دروازے اس کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔............

............رمضان المبارک وہ زمانہ ہے جس میں نیکیاں فروغ پاتی ہیں اور شیاطین کی کارفرمائی رُک جاتی ہے۔ چونکہ تمام مسلمان بیک وقت روزہ رکھتے ہیں اور ایک ایک آدمی الگ الگ روزہ نہیں رکھتا، اس لیے بیک وقت روزہ رکھنے سے پوری قوم کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کا ایک ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے جو دوسرے دنوں میں نہیں ہوتا۔ اس لیے رمضان وہ مہینہ ہے جس میں آدمی کے اندر رجوع الی اللہ کی ایک مسلسل کیفیت جاری وساری رہتی ہے کیونکہ جو آدمی بارہ چودہ گھنٹے روزے سے ہوتا ہے اسے گویا ہر وقت یہ یاد ہوتا ہے کہ میں روزے سے ہوں اور میں نے اپنے رب کی خوشنودی کے لیے روزہ رکھا ہوا ہے۔ جب اسے پیاس لگے گی تو وہ پانی نہیں پیے گا کیوں کہ اسے یاد ہوگا کہ وہ روزے سے ہے۔ جب اسے بھوک لگے گی اور کھانے کی خواہش ہوگی تو اسے یاد ہوگا کہ وہ روزے سے ہے اس لیے کھانے سے مجتنب رہے گا۔ اس طرح رمضان کے پورے مہینے میں آدمی کا رجوع مسلسل اللہ تعالیٰ کی طرف رہتا ہے......وہ افطار کرتا ہے تو گویا خود محسوس کرتا ہے کہ یہاں تک تو میرے رب نے مجھے باندھ رکھا تھا' اب اس نے مجھے اجازت دے دی ہے تو روزہ افطار کر رہا ہوں۔ اس کے بعد کھانا کھایا تو پھر تراویح کے لیے چلا گیا' جس سے پھر رجوع الی اللہ کی نوبت آئی۔ اس طرح مسلسل چوبیس گھنٹے اللہ کی طرف اس کا رجوع رہا......اور پھر یہ رجوع ایک آدمی کا نہیں ہوتا بلکہ پوری قوم کا ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رمضان نیکی کا موسم ہے۔

جس طرح بارش کا ایک موسم ہوتا ہے اور اس میں ہر چیز نشوونما پاتی ہے اسی طرح یہ نیکیوں کا موسم ہے اور اس میں نیکیوں کی ترقی کے بے شمار مواقع پیدا ہو جاتے ہیں۔ آدمی جس قدر روحانی ترقی کرنا چاہے کر سکتا ہے کیوں کہ اس میں ہر آدمی کی نیکی دوسرے کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ہر آدمی دوسرے کے روزے میں مددگار رہتا ہے۔ عام دنوں میں روزہ رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں کتنی شدت پائی جاتی ہے کیوں کہ کوئی آدمی بھی روزے میں دوسرے کا مددگار نہیں ہوتا۔ لیکن رمضان میں یہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیفیت نہیں ہوتی کیوں کہ پورا معاشرہ ایک حالت میں ہوتا ہے اس طرح ایک آدمی کو لاکھوں آدمیوں کے روزے سے مدد پہنچتی ہے اور ان کے تقویٰ اور نیکوکاری سے تقویت ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ رمضان میں انسان کی روحانی ترقی اور سیرت وکردار کی اصلاح وتعمیر کے لیے بے شمار مواقع پیدا ہو جاتے ہیں۔.......... آپ دیکھتے ہیں کہ اب بھی بگڑے ہوئے ماحول میں اگر کوئی شخص رمضان کے زمانے میں گالم گلوچ کر رہا ہو تو لوگ کہتے ہیں: میاں! رمضان میں یہ حرکت کر رہے ہو؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے کو اب تک اس بات کا احساس ہے کہ رمضان کا احترام کیا معنی رکھتا ہے اور اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صدرِ اوّل میں کیا کچھ کیفیت ہوگی۔

.... یہ امر بہر حال ملحوظ رہنا چاہیے کہ بات ایک مسلم معاشرے کے صالح ماحول کے بارے میں بیان کی گئی ہے۔ ورنہ اسی زمانے میں اگر کوئی شخص شرک اور دوسرے گناہوں کا مرتکب ہو تو اس کے لیے دوزخ کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں اور جنت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں..........

جنت کے دروازوں سے مراد وہ بڑی نمایاں نیکیاں ہیں جن کے ذریعے سے آدمی جنت میں جا سکتا ہے مثلاً ایک آدمی فیاضی٬ سخاوت اور انفاق فی سبیل اللہ میں بڑھا ہوا ہے۔ وہ نیکی کے دوسرے کام بھی کر رہا ہے۔ روزے بھی رکھتا ہے اور نمازیں بھی پڑھتا ہے۔ لیکن اس کی نمایاں نیکی جس کی وجہ سے وہ ممتاز ہے انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ چنانچہ یہ انفاق فی سبیل اللہ دراصل جنت کا ایک دروازہ ہے جس کے ذریعے سے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ پھر مثلاً ایک اور شخص ایسا ہے کہ اس کے اعمال میں نمایاں نیکی جہاد فی سبیل اللہ ہے تو وہ مجاہدین فی سبیل اللہ کے دروازے سے جنت میں داخل ہوگا۔

اس طرح مختلف آدمیوں کے جو نمایاں اوصاف ہیں ان کے لحاظ سے ان کی حیثیت مشخّص ہوتی ہے اور انھی کے لحاظ سے جنت کے وہ دروازے ہیں جن سے وہ اس میں داخل ہوں گے..........

..........[حدیث میں] جو فرمایا کہ ان میں سے ایک دروازہ ریان (یعنی سیراب کرنے والا) ہے اور اس سے جنت میں صرف روزہ دار ہی داخل ہوں گے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ویسے تو روزہ سارے مسلمان رکھیں گے لیکن جن لوگوں نے کثرت سے روزے رکھے ان کا پورا پورا حق ادا کیا اور یہی بات پیش نظر رکھی کہ وہ روزے رکھ کر اپنے اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ دروازہ ان کے لیے مخصوص ہوگا۔

(کتاب الصوم٬ نومبر ۲۰۰۰ء٬ ص ۲۶-۳۰)

گذشتہ تمام گناہوں کی بخشش کا زمانہ

..........حدیث میں گناہوں سے معافی کی جو خوش خبری سنائی گئی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والے اور آخرت کی باز پرس سے بے خوف ہیں ان کو اس بات کا لائسنس دیا جا رہا ہے کہ میاں رمضان کے روزے رکھ لو٬ تراویح پڑھ لو اور لیلۃ القدر میں کھڑے ہو کر عبادت کر لو تو پچھلا حساب صاف اور پھر گیارہ مہینے تمھیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جو کچھ کرنا ہے کرتے رہو، رشوتیں کھاؤ' لوگوں کے حق مارو' جو ظلم وستم چاہو کرو' رمضان میں آ کے پھر عبادت کے لیے کھڑے ہو جانا' روزے رکھ لینا اور نمازیں پڑھ لینا اور پھر پہلے کا کیا ہوا سب معاف ہو جائے گا۔

اس طرح کی احادیث کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان کے مخاطب کون لوگ ہیں ......ان کے مخاطب وہ صلحا و ابرار ہیں جو اپنی زندگیاں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے مطابق بسر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان سے اگر کوئی لغزش یا گناہ سرزد ہو جاتا تھا تو اس کی نوعیت ایسی ہرگز نہیں ہوتی تھی کہ جیسے ایک آدمی پوری ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ گناہ کا ارتکاب کرے اور پھر اس پر ڈٹا رہے' بلکہ وہاں صورت اس سے یکسر مختلف تھی۔ ان راست باز لوگوں سے اگر کوئی قصور سرزد ہو بھی جاتا تھا تو وہ بشری کمزوری کی وجہ سے ہوتا تھا اور وہ ہر وقت اس پر توبہ کے لیے مستعد رہتے تھے۔ بشری کمزوری سے اگر کسی سے کوئی قصور سرزد ہو جائے اور وہ اس کے بعد نیکی اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کو اپنا شعار بنائے رکھے تو وہ بجائے خود ایک توبہ ہے..........

اسی بنا پر فرمایا گیا کہ اگر ایک شخص نے ایمان اور احتساب کے ساتھ روزے رکھے تو اس کے پچھلے قصور معاف ہو گئے۔[1] رمضان میں راتوں کو کھڑے ہو کر عبادت کی تو وہ بھی پچھلے قصوروں کی معافی کا ذریعہ بن گئی۔ اسی طرح اگر وہ لیلۃ القدر میں عبادت کے لیے کھڑا ہوا تو اس کا یہ عمل بھی اس کے پچھلے قصوروں کی معافی کا سبب بن گیا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۱-۳۳)

جہنم کی آگ سے آزادی کا مہینہ

..........رمضان کے زمانے میں اللہ کے بہت سے بندے ایسے ہیں جو آگ سے آزادی حاصل کرتے ہیں۔

..........مراد یہ ہے کہ بہت سے بندے ایسے ہیں جو اس زمانے میں اپنے نیک اعمال کی بدولت جہنم کی آگ سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہر انسان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنا شمار ان بندوں میں کرانے کا سامان کہاں تک کر رہا ہے۔ ....اور [جس پکار کا ذکر ابھی گزرا ہے یہ معاملہ] ہر رات کو ہوتا ہے...... رمضان المبارک کی جو برکتیں اور خصوصیات اس کی پہلی رات کو ظہور میں آتی ہیں ان سب کا ظہور رمضان کی ہر رات میں بدستور جاری رہتا ہے۔[2]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۴۱)

۱- ایمان کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے متعلق ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہیے وہ عقیدہ ذہن میں پوری طرح تازہ رہے اور احتساب کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ ہی کی رضا کا طالب ہو اور ہر وقت اپنے خیالات اور اپنے اعمال پر نظر رکھے کہ کہیں وہ اللہ کی رضا کے خلاف تو نہیں چل رہا ہے۔ ان دونوں چیزوں کے ساتھ جو شخص رمضان کے پورے روزے رکھ لے گا وہ اپنے پچھلے گناہ بخشوا لے جائے گا، اس لیے کہ اگر وہ کبھی سرکش و نافرمان بندہ تھا بھی تو اب اس نے اپنے مالک کی طرف پوری طرح رجوع کر لیا اور التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ تھا۔ (خطبات، ص ۱۹۶) تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۸-۲۷۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۷-۳۸۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رحمت، مغفرت اور نجات کا مہینہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے .... فرمایا: لوگو! تمھارے اوپر ایک مہینہ ایسا آ رہا ہے جو عظیم ہے یعنی بزرگی والا اور بڑی برکت والا ہے[1]۔

ماہ رمضان کے بزرگ یا بابرکت ہونے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اس کے دنوں، گھنٹوں یا منٹوں میں فی نفسہٖ کوئی ایسی برکت شامل ہے جو لوگوں کو خود بخود حاصل ہو جاتی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ تمھارے لیے ایسے مواقع پیدا کر دیتا ہے جن کی بدولت تم اس کی بے حد وحساب برکات سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ اس مہینے میں ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی جتنی زیادہ عبادت کرے گا اور نیکیوں کے جتنے زیادہ کام کرے گا وہ سب اس کے لیے زیادہ سے زیادہ روحانی ترقی کا وسیلہ بنیں گے۔ اس لیے اس مہینے کے بزرگ اور بابرکت ہونے کا مطلب درحقیقت یہ ہے کہ اس کے اندر تمھارے لیے برکتیں سمیٹنے کے بے شمار مواقع فراہم کر دیے گئے ہیں۔

یہ وہ مہینہ ہے جس کی ایک رات ایسی ہے کہ ہزار مہینوں سے زیادہ افضل ہے۔

اس سے مراد لیلۃ القدر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل فرمایا۔ اس کے ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ کبھی ہزار مہینے میں بھی نوعِ انسانی کی فلاح کا وہ کام نہ ہوا ہوگا جتنا اس کی ایک رات میں ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رمضان کے دنوں کے روزے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں کے قیام کو تطوع (یعنی نفل) قرار دیا ہے۔

تطوع سے مراد وہ کام ہے جو آدمی اپنے دل کی خوشی سے (voluntarily) انجام دے، بغیر اس کے کہ وہ اس پر فرض کیا گیا ہو۔

رمضان میں دن کے روزے کو فرض اور رات کے قیام کو نفل قرار دے کر فرض اور نفل عبادات دونوں کے فائدوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ ادائے فرض کے فائدے کچھ اور ہیں اور از خود اپنی رضا و رغبت سے، بغیر اس کے کہ کوئی چیز لازم قرار دی گئی ہو، اللہ کی عبادت کرنے کے فائدے کچھ اور ہیں۔ اگر ایک آدمی اپنی ڈیوٹی بجالاتا ہے تو وہ اس پر ایک اور قسم کے انعام کا مستحق ہوتا ہے اور اگر وہ اپنی ڈیوٹی سے بڑھ کر اپنے دل کی رضا سے کوئی خدمت بجالاتا ہے تو اس پر وہ کسی اور قسم کے انعام کا مستحق ہوتا ہے۔ ایک چیز وہ ہے جس پر وہ مزدوری کا مستحق ہے اور دوسری چیز وہ ہے جس پر اسے بونس (bonus) کا مستحق قرار دیا جائے گا...... معلوم ہوا کہ اس ماہ میں دو قسم کے مواقع پیدا کر دیے گئے ہیں۔ ایک تو ڈیوٹی عاید کر دی گئی ہے جس کے اجر کے آپ الگ مستحق ہوں گے اور ایک چیز آپ کے تطوع پر چھوڑ دی گئی ہے کہ آپ اپنی رضا و رغبت سے راتوں کو عبادت کے لیے کھڑے ہوں تو اس پر آپ کو مزید انعامات ملیں گے...... یہ گویا اس چیز کی تشریح ہے کہ اس بزرگ مہینے میں کیا کیا برکتیں رکھ دی گئی ہیں۔

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۷۰۴، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے بعد فرمایا: جس شخص نے اس مہینے میں کوئی نیکی کر کے اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کی اس کو ایسا اجر ملے گا جیسا کہ دوسرے دنوں میں فرض ادا کرنے پر ملتا ہے، اور جس نے اس مہینے میں فرض ادا کیا وہ ایسا ہے جیسے دوسرے دنوں میں اس نے ستر فرض ادا کیے۔

چوں کہ یہاں فَرِيضَة کے مقابلے میں خَصْلَةٌ مِّنَ الْخَيْرِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اس لیے ان سے خود بہ خود یہ معنی نکلتے ہیں کہ ان سے مراد نفل نیکی ہے۔ یعنی جو آدمی اس مہینے میں نفل کے طور پر کوئی نیکی کرتا ہے اسے اس پر ایسا اجر ملے گا جیسا دوسرے زمانے میں فرض ادا کرنے پر ملتا ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۵۱-۵۳)

رمضان اور دوسرے مہینوں میں یہ فرق کیوں؟

رمضان کے زمانے میں عام دنوں کی بہ نسبت اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عام دنوں میں تو آدمی بڑی حد تک یا ایک حد تک انفرادی حیثیت سے عبادات و فرائض کی بجا آوری کرتا ہے لیکن رمضان کا زمانہ وہ ہے جسے بحیثیت مجموعی پوری قوم کے لیے نیکی کا موسم قرار دیا گیا ہے۔ ساری قوم بیک وقت روزہ رکھتی اور افطار کرتی ہے۔ سب ایک ہی وقت میں تراویح پڑھتے اور دوسری عبادات انجام دیتے ہیں۔ اس طرح پوری قوم کے اندر نیکی کا ایک عام ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس زمانے میں نیکی خوب پھلتی پھولتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بارش کے زمانے میں فصل عام زمانے کی بہ نسبت خوب بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ چنانچہ رمضان کے دنوں میں آدمی جو نیکی بھی کرتا ہے وہ اکیلے اسی کی نیکی نہیں ہوتی، بلکہ بے شمار نیکیاں مل کر اس کو بڑھا رہی ہوتی ہے۔ پھر چوں کہ رمضان نیکیوں کا موسم ہے، اس لیے اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا فیضان بھی عام ہوتا ہے۔ ایک آدمی جو نفل نماز بھی پڑھے، کسی کے ساتھ بھلائی کا جو کام بھی کرے، جو خیرات بھی کرے، اسے ان پر اتنا اجر ملے گا جتنا عام دنوں میں فرض ادا کرنے پر ملتا ہے۔ اسی طرح رمضان کے زمانے میں اگر کوئی شخص فرض ادا کرتا ہے، خواہ وہ زکوٰۃ ہو یا نماز یا روزہ، تو اسے اس کا اتنا اجر ملے گا جتنا اس کو عام دنوں میں ستر گنا زکوٰۃ نکالنے، ستر نمازیں پڑھنے یا ستر روزے رکھنے کا ملتا ہے۔

......صبر کے معنی عربی لغت میں باندھنے اور روکنے کے ہیں۔ اس مقام پر صبر سے مراد ہے اپنے آپ کو اتنا باندھنا اور ایسا ضبط نفس کرنا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرے اور اس کی اطاعت کے دائرے سے باہر نہ نکلے۔

یہ جو ارشاد فرمایا کہ صبر ہی کا ثواب جنت ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ ایک آدمی اگر جنت حاصل کرتا ہے تو اسی وجہ سے حاصل کرتا ہے کہ وہ اپنے نفس پر اتنا قابو پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ اس کی خواہشات نفس بے لگام نہیں ہونے پاتیں اور وہ ان کو رضائے الٰہی کا پابند بنا دیتا ہے۔

اس صبر کی جتنی مشق رمضان میں ہوتی ہے اتنی اور کسی زمانے میں نہیں ہوتی۔ رمضان میں آدمی مسلسل چوبیس گھنٹے صبر کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مشق کرتا ہے۔ سحری کا وقت اس کے اٹھنے کا نہیں ہوتا لیکن وہ اٹھتا ہے۔ وہ وقت کھانے کا نہیں ہوتا لیکن وہ اپنے نفس سے کہتا ہے کہ تیرے رب نے یہی وقت تیرے کھانے کے لیے مقرر کیا ہے، اس وقت کھانا ہے تو کھالے ورنہ دن بھر تجھے بھوکا رہنا پڑے گا۔ گویا اس طرح اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے آپ کے نفس کی لگام آپ کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور آپ اس پر سوار ہوتے ہیں (بجائے اس کے کہ یہ آپ پر سوار ہو) جس وقت اللہ کا حکم ہوا بس اسی وقت کھانا پینا بند ہو گیا۔ پھر آپ کا ہاتھ نہ کھانے کی طرف بڑھتا ہے نہ پینے کی طرف۔ دن بھر آپ پر خواہ کچھ ہی کیوں نہ گزر جائے لیکن آپ اپنے نفس کو بے قابو نہیں ہونے دیتے۔ پھر جس وقت اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے، آپ فوراً افطار کرتے ہیں............اس کے معنی یہ ہیں کہ روزہ دار محض اللہ کے حکم کی وجہ سے رکا ہوا تھا ورنہ اس کو ایسی بھوک اور پیاس لگی تھی کہ وہ کھانے پینے میں ایک لمحے کی دیر کرنے والا نہیں تھا۔

یہ ہے وہ طریقہ جس سے آپ کو اپنے نفس پر قابو پانے اور صبر کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے اور یہی وہ صبر ہے جس کا نتیجہ جنت ہے کیوں کہ اسی صبر کی بدولت تو آپ اس پر قادر ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام وہدایات کی خلاف ورزی سے بچیں اور ہر حال میں اس کی اطاعت وفرماں برداری کو اپنا شعار بنائے رکھیں۔

پھر فرمایا کہ یہ مہینہ مواساۃ کا مہینہ ہے۔

مُوَاسَاۃ کے معنی ہیں باہم ہمدردی کرنا اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آنا............رمضان کے شَھْرُ المواساۃ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں لوگوں کو ایک دوسرے کی مدد اور ہمدردی کرنے کی تربیت دی جاتی ہے کیوں کہ ایک بھوکے آدمی کو جب خود بھوک کا احساس ہوتا ہے تب ہی اسے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ دوسرے پر بھوک میں کیا گزرتی ہے اور وہ کس قسم کی ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے۔

اور یہ وہ مہینہ ہے، جس میں مومن کا رزق بڑھایا جاتا ہے۔

......کوئی شخص ناپ تول کر یا حساب لگا کر تو یہ نہیں بتا سکتا کہ رمضان میں اس کی آمدنی کتنی بڑھی یا اس کی تنخواہ میں کیا اضافہ ہوا لیکن لاکھوں، کروڑوں مسلمانوں کا یہ تجربہ ہے کہ رمضان میں جیسا کچھ وہ کھا پی لیتے ہیں، عام حالات میں وہ ان کو میسر نہیں آتا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لازماً کوئی ایسی برکت ہے جو اس مہینے میں اللہ تعالیٰ مومن کے رزق میں ڈال دیتا ہے۔

پھر فرمایا کہ جو شخص کسی کا روزہ کھلوائے تو وہ اس کے گناہوں کی مغفرت کا اور اس کی گردن کو دوزخ کی سزا سے بچانے کا ذریعہ ہے اور اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اس روزے دار کو روزہ رکھنے کا ملے گا بغیر اس کے کہ اس روزے دار کے اجر میں کوئی کمی ہو۔

............یعنی اللہ تعالیٰ کا فضل اتنا محدود نہیں ہے کہ وہ روزے دار کے اجر میں سے کاٹ کر افطار کرانے والے کو کچھ دے دے کہ یہ تیرے افطار کرانے کا اجر ہے۔ نہیں بلکہ جتنا اجر روزہ رکھنے والے کو ملتا ہے اتنا ہی اجر اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے اس شخص کو دیتا ہے جو روزہ افطار کراتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یادرہے کہ یہ اجر اُن افطاریوں کے لیے نہیں ہے جو بطور ریاکاری کے اپنی شان وشوکت کے مظاہرے کے لیے کرائی جاتی ہیں اور جن سے مقصود لوگوں کو یہ دکھانا ہوتا ہے کہ حضرت کتنے دولت مند ہیں اور راہِ خدا میں کس قدر خرچ کرنے والے ہیں...... یہاں جس اجر کا ذکر کیا جارہا ہے وہ تو ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ کی خاطر لوگوں کو افطار کرائیں اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان لوگوں کو افطار کروائیں جو بہتر افطار کرنے کے قابل نہیں ہیں، بہ نسبت اس کے کہ کھاتے پیتے لوگوں کو افطار کرایا جائے۔

اوپر کی سطور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جن ارشادات کا ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد حضرت سلمان فارسیؓ بتاتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم میں سے ہر ایک کو اتنی توفیق نہیں ہے کہ روزے دار کو روزہ کھلوائے...... اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اجر تو ہر اس شخص کا ہے جو کسی روزے دار کو دودھ یا لسی پلادے یا ایک کھجور کھلادے یا ایک گھونٹ پانی پلادے...... یعنی یہ اجر بڑی بھاری افطاریوں کا نہیں ہے بلکہ یہ تو محض روزہ کھلوادینے کا اجر ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ کیسے ہی سادہ طریقے سے کھلوایا گیا ہو۔

پھر فرمایا: اور جو شخص کسی روزے دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلادے اللہ تعالیٰ اسے میرے حوض سے پانی پلائے گا۔ پھر اسے اس وقت تک پیاس محسوس نہ ہوگی جب تک کہ وہ جنت میں داخل نہ ہو جائے۔

احادیث میں آتا ہے کہ میدانِ حشر میں پانی کا ایک حوض ہوگا جسے حوض کوثر کہا جاتا ہے۔ اس حوض کے محافظ اور نگران خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ اس سے پانی وہی پیے گا جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پلائیں گے۔ کسی دوسرے شخص کو اس سے پانی پینے کا موقع نہیں ملے گا۔ پھر اس حوض کے سوا میدان حشر میں کوئی دوسرا حوض بھی نہ ہوگا جہاں سے کوئی شخص پانی پی سکے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس حوض پر صرف انہی لوگوں کو آنے دیں گے جو اس قابل ہوں گے کہ آگے جا کر جنت میں داخل ہو سکیں۔ چنانچہ جو شخص ایک روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتا ہے اسے میدانِ حشر میں حوضِ کوثر سے پانی ملے گا تا آں کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔

میدانِ حشر کے متعلق یہ بات بھی احادیث سے معلوم ہوتی ہے کہ وہاں کوئی سایہ اللہ کے سائے کے سوا نہیں ہوگا اور وہ سایہ صرف نیک آدمیوں کو میسر آئے گا۔ بدآدمیوں کے لیے وہ سایہ نہیں ہوگا...... تصور کیجیے کہ اس میدانِ حشر میں جہاں اللہ کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، اس شخص کو برابر پانی ملتا رہے گا جو یہاں کسی روزے دار کو پیٹ بھر کے کھانا کھلاتا ہے۔

پھر فرمایا: اور یہ وہ مہینہ ہے جس کے آغاز میں رحمت ہے، وسط میں مغفرت ہے اور آخر میں دوزخ سے رہائی ہے۔[1]

---

[1] س: مولانا! حدیث میں رمضان المبارک کے متعلق آتا ہے کہ اس کا پہلا عشرہ رحمت کا ہے، دوسرا مغفرت کا اور تیسرا عتق من النار یعنی آگ سے نجات کا۔ عتق من النار، مغفرت کا نتیجہ ہے اور یہ چیز مغفرت میں آجاتی ہے، پھر مغفرت کے بعد عتق من النار کی کیا ضرورت تھی؟

ج: رحمت، مغفرت اور عتق من النار یہ کوئی تین مختلف چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سلسلے کے مختلف پہلو ہیں۔ ایک بات بیان کرنی ہو تو اسے کئی پہلوؤں سے بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو کھلایا پلایا گیا۔ اب یہاں کھلایا کہہ دینا کافی تھا۔ اس کے ساتھ پلانا کہنا زائد معلوم ہوتا ہے۔ حدیث میں جن تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے وہ بھی دراصل سمجھانے کا ایک انداز ہے اور تین چیزیں ایک ہی بات کے تین پہلو ہیں۔ (۵-اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۸۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یعنی ادھر اس مبارک مہینے کی آمد پر آپ روزہ رکھنا شروع کرتے ہیں اُدھر اللہ کی رحمت آپ پر سایہ فگن ہو جاتی ہے۔ پھر رمضان کے وسط تک پہنچتے پہنچتے اللہ تعالیٰ آپ کے قصوروں سے درگزر فرما لیتا ہے اور آپ کی مغفرت ہو جاتی ہے اس طرح جب آپ رمضان کے آخر تک پہنچتے ہیں تو ادھر آپ آخری روزہ رکھتے ہیں ادھر آپ کو دوزخ کے خطرے سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔

اس آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب آخری روزے کی وجہ سے آپ کو دوزخ سے آزادی حاصل ہوگئی تو آپ آزاد ہیں کہ جو جی چاہے کرتے پھریں، اب آپ پر کوئی گرفت نہیں ہوگی...... ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ بعض لوگ رمضان کے ختم ہوتے ہی وہ سب پابندیاں توڑ ڈالتے ہیں جو اس مبارک مہینے میں انھوں نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہوتی ہیں...... بس رمضان ختم ہوا اور وہ عین عید کے دن (یعنی شوال کی پہلی ہی تاریخ کو) سینما دیکھنے چلے گئے اور پھر اس سے آگے بڑھ کر ناچ گانے کا شوق بھی کر لیا ...... پھر کہیں بیٹھ کر کچھ تھوڑا بہت جوا وغیرہ بھی کھیل لیا۔ یہ سب کچھ اگر ایک شخص نے کر ڈالا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ادھر وہ دوزخ کے خطرے سے آزاد ہوا اور ادھر اس نے پھر اس میں کودنے کی تیاریاں شروع کر دیں.......... ظاہر بات ہے کہ کوئی بھلا آدمی جس کے دل میں ایمان کی کچھ روشنی اور خوف خدا کی کوئی رمق موجود ہو یہ کھیل نہیں کھیل سکتا۔

اور جس نے رمضان کے مہینے میں اپنے غلام (یا نوکر) سے ہلکی خدمت لی، اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ سے آزاد کر دے گا۔

...... رمضان کے زمانے میں آدمی کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ جیسے وہ خود روزے سے ہے ویسے ہی اس کا نوکر بھی روزے سے ہے۔ نوکر اور خادم سے اس طرح کس کر خدمت لینا کہ جیسے وہ تو روزے سے نہیں اور آپ ہیں کہ روزہ رکھ کر نڈھال ہوئے جاتے ہیں، یہ کسی بھلے آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ جو شخص رمضان کے زمانے میں اپنے نوکر کے کام میں تخفیف کرتا ہے اور اس سے نرمی برتتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ کی آگ سے بچائے گا۔

موجودہ زمانے میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ اپنے ماتحتوں سے...... نوکروں یا غلاموں سے...... رمضان کے زمانے میں معمول سے زیادہ کس کر کام لیتے ہیں۔ گویا وہ اپنے عمل سے یہ بات کہتے ہیں کہ اچھا تم نے روزہ رکھنے کی گستاخی کی ہے۔ اب تمھاری سزا یہ ہے کہ تمھاری ڈیوٹی عام دنوں سے دُگنی ہوگئی ہے تاکہ تمھیں ذرا معلوم تو ہو کہ اس زمانے میں اور ہمارے زیر سایہ تم روزے رکھنے کی جسارت کرتے ہو۔ لیکن خوب سمجھ لیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت یہ ہے کہ اگر تمھارا کوئی غلام بھی ہے (یہاں مملوک کا لفظ ہے، خادم کا لفظ نہیں ہے) تو تمھارا یہ کام ہے کہ رمضان کے زمانے میں اس سے سخت قسم کا کام نہ لو بلکہ اس کے ساتھ نرمی برتو اور اسے ہر ممکن سہولت دو۔ اس بات کا صلہ، اللہ تعالیٰ کے ہاں تمھارے لیے یہ ہوگا کہ وہ تمھیں دوزخ کی آگ سے بچائے گا۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۵۴-۶۰)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۴۷-۵۲۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رمضان میں حضورؐ کی شفقت اور فیاضی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت، رحم دلی، نرمی، عطا، بخشش اور فیاضی کا جو حال عام دنوں میں تھا وہ تو تھا ہی، کہ یہ چیزیں آپؐ کے اخلاق کریمانہ کا حصہ تھیں، لیکن رمضان المبارک میں خاص طور پر ان میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں چوں کہ آپؐ معمول سے کہیں زیادہ گہرائی سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے اور اللہ کے ساتھ آپؐ کی محبت میں شدت آ جاتی تھی اس لیے آپ کی نیکیاں بھی عام دنوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ بڑھ جاتی تھیں۔ جیسا کہ خود حضورؐ کا ارشاد ہے کہ عام دنوں میں فرض ادا کرنے کا جو ثواب ملتا ہے وہ رمضان میں نفل ادا کرنے پر ملتا ہے۔ اس لیے آپ رمضان کے زمانے میں بہت کثرت سے نیکیاں کرتے تھے۔ یہاں حضورؐ کے عمل میں سے دو چیزیں مثال کے طور پر بیان کی گئی ہیں۔ اسیروں کو رہا کرنا اور مانگنے والوں کو دینا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کے بارے میں کہ آپ رمضان میں ہر قیدی کو رہا کر دیتے تھے[1]۔ محدثین کے درمیان بحثیں پیدا ہوئی ہیں۔ مثلاً ایک سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی جرم کی پاداش میں قید ہے تو اس کو محض رمضان کے مہینے کی وجہ سے رہا کر دینا یا سزا نہ دینا کس طرح انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہو سکتا ہے؟

اس بنا پر اس قول کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔ بعض محدثین کے نزدیک اس سے مراد جنگی قیدی ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے ذمے کا قرض ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے ماخوذ ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف سے ان کا قرض ادا کر کے ان کو آزاد کر دیتے تھے۔ اس طرح کی بعض دوسری توجیہات بھی اس قول کی کی گئی ہیں............ اگر غور کیا جائے تو اس کی ایک اور شکل بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً آج کل کے زمانے میں ایک طریقہ پیرول (parole) پر رہا کرنے کا ہے، یعنی قیدی کو قول لے کر رہا کر دینا۔ قیدی کو اس اُمید پر رہا کر دیا جاتا ہے کہ وہ رہائی کی مدت ختم ہونے کے بعد خود واپس آ جائے گا............ وہ معاشرہ ایسا تھا کہ اس میں اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ جس قیدی کو رہا کیا جا رہا ہے وہ یہ خیال کر کے کہ اب مجھے کون پکڑتا ہے کسی ایسی جگہ فرار ہو جائے گا جہاں سے اس کو پکڑنا ممکن نہ رہے گا۔ وہ تو ایسے لوگ تھے کہ اگر ان سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا تھا تو خود آ کر اس کا اعتراف کرتے تھے تاکہ ان کو سزا دے کر پاک کر دیا جائے............ اس لیے ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ عمل کی شکل یہ رہی ہو کہ حضورؐ ایسے لوگوں کو، جن کی سزا معاف نہ ہو سکتی تھی، رمضان کے زمانے میں مشروط طور پر رہا کر دیتے ہوں تاکہ وہ رمضان کا مبارک زمانہ اپنے گھروں پر گزاریں[2]۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۶۱-۶۲)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، اپریل ۲۰۰۰ء، ص ۵۳۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۵۳-۵۴، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شیاطین کے جکڑے جانے کا مفہوم

رمضان کی آمد پر شیاطین کا باندھا جانا دراصل اس بات کا نتیجہ ہوتا ہے کہ مومنِ صالح رمضان کا آغاز ہوتے ہی اپنی خواہشاتِ نفس پر وہ پابندیاں قبول کرتا ہے جو عام زمانے میں اس پر نہیں ہوتیں۔ مثلاً عام زمانے میں تو پانی اس کے لیے حلال ہے لیکن رمضان کے زمانے میں بارہ سے چودہ گھنٹے تک وہ اس پر حرام ہو جاتا ہے۔ عام دنوں میں اس کے لیے کھانا کھانا اور خواہشِ نفس کو پورا کرنا، بشرطیکہ جائز طریقے سے ہو، حلال ہے لیکن رمضان کے زمانے میں یہ چیزیں کئی کئی گھنٹے کے لیے اس پر حرام ہو جاتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک مومن پر رمضان کے مہینے میں اُس کے نفس، اُس کی خواہشات اور آزادی عمل پر ایسی پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں جو دوسرے دنوں میں نہیں ہوتیں۔ جب مومن ان پابندیوں کو قبول کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو ان میں جکڑ لیتا ہے تو اس کا شیطان بھی جکڑا جاتا ہے۔ اگر مومن بھی اپنے آپ کو خواہشِ نفس کا غلام بنائے رکھے اور شریعت کی پابندیاں قبول نہ کرے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا شیطان جکڑا نہیں گیا بلکہ بہ دستور کھلا پھر رہا ہے اور اپنا کام کیے جا رہا ہے۔

پس خوب سمجھ لیجیے، جس شخص نے اپنے نفس پر شریعت کی پابندیاں عائد کر لیں تو جس لمحے اس نے ایسا کیا اُسی لمحے اس کا شیطان بھی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ اِسی طرح اِدھر اس نے اپنے اوپر شریعت کی پابندیاں عائد کیں اور اُدھر جنت کے سارے دروازے اس کے لیے کھل گئے اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے گئے۔ یہ ہے مفہوم شیطان کے جکڑے جانے کا، دوزخ کے دروازے بند ہونے کا اور جنت کے دروازے کھلنے کا۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۹-۴۰)

رمضان کی آخری رات کو امت کی مغفرت

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رمضان کی آخری رات کو میری امت کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا یہی وہ لیلۃ القدر ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: نہیں، بلکہ مزدور کو اس کی مزدوری اس وقت دی جاتی ہے جب وہ اپنا کام مکمل کر لیتا ہے۔

حضورؐ کا یہ ارشاد سن کر کہ رمضان کی آخری رات میری امت کی مغفرت ہو جاتی ہے، صحابہ کرامؓ کو یہ خیال ہوا کہ شاید وہی رات لیلۃ القدر ہو اور اسی کی فضیلت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہو۔ لیکن آپؐ نے فرمایا کہ ایسا لیلۃ القدر ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مزدور کو اجرت کام مکمل ہونے پر دی جاتی ہے۔ میری امت کی اجرت یہ ہے کہ اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔

امت کی مغفرت ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ اُن لوگوں کی بھی مغفرت ہو جاتی ہے جو روزے نہیں رکھتے اور نہ دوسرے احکام کی پیروی کرتے ہیں بلکہ یہ مغفرت اُمت کے اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو روزے رکھتے ہیں اور احکامِ خداوندی کی پیروی کرتے ہیں......... اس زمانے میں یہ بات قابلِ تصور ہی نہ تھی کہ کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہو کر روزے

ا۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۵-۳۶، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہ رکھے اس وقت پوری کی پوری امت روزہ رکھتی تھی۔ رمضان کا سارا زمانہ خدا کی عبادت میں گزارتی تھی۔ ہر طرح کی برائیوں سے بچتی تھی اور عام دنوں سے بڑھ کر نیکیاں کرتی تھی۔ اس لیے یہاں اس امت کی مغفرت کا ذکر کیا گیا ہے.......... ورنہ اس سے مراد وہ لوگ کیسے ہو سکتے ہیں، جن کی بے راہ روی اور سرکشی میں رمضان کی آمد پر کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ روزہ رکھنا تو ایک طرف رہا، الٹا بر سر عام بے تکلفی سے کھاتے پیتے ہیں۔ رمضان کی آخری رات کو ایسے لوگوں کی مغفرت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ اس رات تو شاید ان کے خلاف مقدمہ فوج داری (prosecution case) مکمل ہو جاتا ہوگا۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۶۳)

عید کی مبارک باد کے حقیقی مستحق لوگ

عید کی مبارک باد کے حقیقی مستحق وہ لوگ ہیں جنھوں نے رمضان المبارک میں روزے رکھے۔ قرآن مجید کی ہدایت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی فکر کی، اس کو پڑھا، سمجھا، اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی اور تقویٰ کی اس تربیت کا فائدہ اٹھایا جو رمضان المبارک ایک مومن کو دیتا ہے۔

قرآن مجید میں رمضان کے روزوں کی دو ہی مصلحتیں بیان ہوئی ہیں:

ایک یہ کہ اُن سے مسلمانوں میں تقویٰ پیدا ہو: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (البقرۃ ۲:۱۸۳) تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

دوسری یہ کہ مسلمان اس نعمت کا شکر ادا کریں جو اللہ تعالیٰ نے رمضان میں قرآن مجید نازل کر کے ان کو عطا کی ہے: لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ (البقرۃ ۲:۱۸۵) اور جس ہدایت سے اللہ نے تمھیں سرفراز کیا ہے، اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔

دنیا میں اللہ جل شانہ کی سب سے بڑی نعمت نوعِ انسانی پر اگر کوئی ہے تو وہ قرآن مجید کو نازل کرنا ہے.......... اس کا شکر ادا کرنے کی یہ صورت نہیں ہے کہ آپ بس زبان سے شکر ادا کریں اور کہیں کہ اللہ تیرا شکر، کہ تو نے قرآن ہمیں دیا، بلکہ اس کے شکر کی صحیح صورت یہ ہے کہ آپ قرآن کو سرچشمۂ ہدایت سمجھیں، دل سے اس کو رہنمائی کا اصل مرجع مانیں اور عملاً اس کی رہنمائی کا فائدہ اٹھائیں...... اگر کسی نے اس رمضان المبارک کے زمانے میں قرآن کو اس نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے اور کوشش کی ہے کہ اس کی تعلیم و ہدایت کو زیادہ سے زیادہ اپنی سیرت و کردار میں جذب کر لے تو اس نے واقعی اس نعمت پر اللہ کا صحیح شکر ادا کیا ہے۔ وہ حقیقت میں اس پر مبارک باد کا مستحق ہے کہ رمضان المبارک کا ایک حق جو اس پر تھا، اسے اُس نے ٹھیک ٹھیک ادا کر دیا۔

رمضان المبارک کے روزوں کا دوسرا مقصد جس کے لیے وہ آپ پر فرض کیے گئے ہیں، یہ ہے کہ آپ کے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ آپ اگر روزے کی حقیقت پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ کارگر ذریعہ اور کوئی

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۵۶-۵۷، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں ہوسکتا۔ تقویٰ کیا چیز ہے؟ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچے اور اس کی فرماں برداری اختیار کرے۔ روزہ مسلسل ایک مہینے تک آپ کو اسی چیز کی مشق کرواتا ہے۔ جو چیزیں آپ کی زندگی میں عام طور پر حلال ہیں وہ بھی اللہ کے حکم سے روزے میں حرام ہو جاتی ہیں۔ اور اس وقت تک حرام رہتی ہیں جب تک اللہ ہی کے حکم سے وہ حلال نہ ہو جائیں۔ پانی جیسی چیز جو ہر حال میں حلال وطیب ہے، روزے میں جب اللہ حکم دیتا ہے کہ یہ اب تمھارے لیے حرام ہے تو آپ اس کا ایک قطرہ تک حلق سے نہیں اتار سکتے خواہ پیاس سے آپ کا حلق چٹخنے ہی کیوں نہ لگے۔ البتہ جب اللہ پینے کی اجازت دے دیتا ہے اس وقت آپ اس کی طرف اس طرح لپکتے ہیں گویا کسی نے آپ کو باندھ رکھا تھا اور آپ ابھی کھولے گئے ہیں۔ ایک مہینے تک روزانہ یہ باندھنے اور کھولنے کا عمل اسی لیے کیا جاتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی پوری پوری بندگی واطاعت کے لیے تیار ہو جائیں۔ جس جس چیز سے وہ آپ کو روکتا ہے اس سے رکنے کی، اور جس جس چیز کا وہ آپ کو حکم دیتا ہے اس کو بجالانے کی آپ کو عادت ہو جائے۔ آپ اپنے نفس پر اتنا قابو پالیں کہ وہ اپنے بے جا مطالبات اللہ کے قانون کے خلاف آپ سے نہ منوا سکے۔ یہ غرض ہے جس کے لیے روزے آپ پر فرض کیے گئے ہیں۔

اگر کسی شخص نے رمضان کے زمانے میں روزے کی اس کیفیت کو اپنے اندر جذب کیا ہے تو وہ حقیقت میں مبارک باد کا مستحق ہے اور اس سے زیادہ مبارک باد کا مستحق وہ شخص ہے جو مہینے بھر کی اس تربیت کے بعد عید کی پہلی ساعت ہی میں اسے اپنے اندر سے اُگل کر پھینک نہ دے بلکہ باقی گیارہ مہینے اس کے اثرات سے فائدہ اٹھاتا رہے۔

آپ غور کیجیے! اگر ایک شخص اچھی سے اچھی غذا کھائے جو انسان کے لیے نہایت قوت بخش ہو، مگر کھانے سے فارغ ہوتے ہی حلق میں انگلی ڈال کر اس کو فوراً اُگل دے تو اس غذا کا کوئی فائدہ اُسے حاصل نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس نے ہضم ہونے اور خون بنانے کا اسے کوئی موقع ہی نہ دیا۔ اس کے برعکس اگر ایک شخص غذا کھا کر اُسے ہضم کرے اور اس سے خون بن کر اُس کے جسم میں دوڑے، تو یہ کھانے کا اصل فائدہ ہے جو اس نے حاصل کیا۔ کم درجے کی مقوی غذا کھا کر اُسے جزوِ بدن بنانا اس سے بہتر ہے کہ بہترین غذا کھانے کے بعد استفراغ کر دیا جائے۔ ایسا ہی معاملہ رمضان کے روزوں کا بھی ہے۔ ان کا حقیقی فائدہ آپ اسی طرح اٹھا سکتے ہیں کہ ایک مہینے تک جو اخلاقی تربیت ان روزوں نے آپ کو دی ہے، عید کے بعد آپ اس کو نکال کر اپنے اندر سے پھینک نہ دیں بلکہ گیارہ مہینے اس کے اثرات کو اپنی زندگی میں کام کرنے کا موقع دیں۔ یہ فائدہ اگر کسی شخص نے اس رمضان سے حاصل کر لیا تو وہ واقعی پوری پوری مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت پالی۔

(تفہیمات، چہارم، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۶۶-۱۷۰)

❀ ❀ ❀

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب دوم

روزے کے احکام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

رؤیتِ ہلال

چاند دیکھنے کی اہمیت

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَاتَصُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوُا الْهِلَالَ وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰی تَرَوْهُ، فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوْا لَهٗ......... وَ فِیْ رِوَايَةٍ، قَالَ: اَلشَّهْرُ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ لَيْلَةً فَلَا تَصُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْهُ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِيْنَ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک رمضان کا ہلال نہ دیکھ لو، روزہ رکھنا شروع نہ کرو اور جب تک شوال کا ہلال نہ دیکھ لو، افطار نہ کرو (یعنی روزہ رکھنا ختم نہ کرو) پھر اگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے چاند تم کو نظر نہ آئے، تو اس کا اندازہ کرلو۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے، پس روزہ رکھنا شروع نہ کرو جب تک کہ رمضان کا ہلال نہ دیکھ لو، پھر اگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ تم کو نظر نہ آئے تو (شعبان کے) تیس دن پورے کرو۔

حدیث میں پہلی بات یہ فرمائی گئی (ہے) کہ جب تک رمضان کا ہلال دیکھ نہ لو روزے رکھنے شروع نہ کرو۔ لَاتَصُوْمُوْا کا یہ مطلب نہیں کہ روزہ نہ رکھو بلکہ مراد یہ ہے کہ روزہ رکھنا شروع نہ کرو، یعنی رمضان کا ہلال دیکھے بغیر رمضان کا آغاز قرار نہ دو۔ پھر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم میں ہر شخص چاند دیکھے بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ حَتّٰی تَرَوْ یعنی تم چاند دیکھ لو۔ دوسرے الفاظ میں اگر کسی بستی یا علاقے کے لوگوں نے عام طور پر چاند دیکھ لیا ہو تو پھر یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص انفرادی طور پر چاند دیکھے بلکہ عام لوگوں کا اس کو دیکھ لینا ہر آدمی کے لیے حجت ہے۔

رؤیت ہلال کی یہ تاکید اس لیے فرمائی گئی ہے کہ رمضان کے آغاز کی علامت رؤیت ہلال ہے، کوئی حساب نہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ چونکہ جنتری کے حساب سے آج شعبان ختم ہو رہا ہے اور آج رمضان کا ہلال ہونا چاہیے اس لیے اعلان کر دیا جائے کہ کل سے رمضان شروع ہو رہا ہے۔ نہیں بلکہ رمضان کے آغاز کے لیے رؤیتِ ہلال ضروری ہے۔

یہ جو فرمایا کہ جب تک (شوال کا) ہلال دیکھ نہ لو، افطار نہ کرو، اس سے مراد روزہ افطار کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب رمضان ختم ہو گیا اور شوال کا چاند نظر آ گیا تو اب روزے ختم ہوئے اور کل عید الفطر ہے۔ یعنی رمضان کا آغاز بھی ہلال دیکھ کر ہوتا ہے اور اس کا اختتام بھی ہلال دیکھ کر ہوتا ہے۔ فیصلہ رؤیتِ ہلال سے ہے، کسی حساب سے نہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آپؐ نے فرمایا کہ مطلع صاف نہ ہونے کی بنا پر اگر چاند تم سے مخفی رہ جائے تو پھر اندازہ کرلو۔'اندازہ کرلو' کا مفہوم دوسری روایت سے واضح ہو گیا ہے اور وہ اس طرح کہ فرمایا گیا: مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے پس روزہ رکھنا شروع نہ کرو جب تک ہلال نہ دیکھ لو، پھر اگر وہ تم سے چھپا رہ جائے تو ۳۰ دن پورے کرو۔[1]

مطلب یہ ہوا کہ اگر ۲۹ شعبان کو چاند نظر نہ آئے تو پھر شعبان کا مہینہ ۳۰ دن کا قرار دیا جائے گا اور رمضان کا اعلان کسی حساب کی بنا پر نہیں کیا جائے گا۔ (جیسا کہ بعض لوگوں نے 'اندازہ کرلو' کے الفاظ سے یہ مطلب نکالنے کی کوشش کی ہے۔) اس صورت میں رمضان کا آغاز شعبان کے ۳۰ دن پورے کرنے کے بعد ہوگا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۶۷-۶۸)

عبادات کے لیے قمری حساب کی مصلحت

اس جگہ ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام میں عبادات کے لیے شمسی مہینوں کو نہیں بلکہ قمری مہینوں کو اختیار کیا گیا ہے.......... اللہ تعالیٰ نے اپنے عائد کردہ فرائض کے لیے شمسی حساب کے بجائے قمری حساب جن اہم مصالح کی بنا پر اختیار کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے بندے زمانے کی تمام گردشوں میں ہر قسم کے حالات اور کیفیات میں اس کے احکام کی اطاعت کے خوگر ہوں۔ مثلاً رمضان کبھی گرمی اور کبھی برسات میں اور کبھی سردیوں میں آتا ہے، اور اہل ایمان ان سب بدلتے ہوئے حالات میں روزے رکھ کر فرماں برداری کا ثبوت بھی دیتے ہیں اور بہترین اخلاقی تربیت بھی پاتے ہیں..........

علاوہ بریں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ ایک عالم گیر دین جو سب انسانوں کے لیے ہے، آخر کس شمسی مہینے کو روزے اور حج کے لیے مقرر کرے؟ جو مہینہ بھی مقرر کیا جائے گا وہ زمین کے تمام باشندوں کے لیے یکساں سہولت کا موسم نہیں ہو سکتا۔ کہیں وہ گرمی کا زمانہ ہوگا اور کہیں سردی کا، کہیں وہ بارشوں کا موسم ہوگا اور کہیں خشکی کا، کہیں فصل کاٹنے کا موسم ہوگا اور کہیں بونے کا۔ اس لیے یہ لازم ہے کہ ان عبادات کے زمانے کا تعین کرنے کے لیے شمسی حساب کے بجائے قمری حساب کو اختیار کیا جاتا تاکہ ہر خطۂ زمین پر بسنے والے لوگ ہر موسم میں ان عبادات کی بجا آوری سے ان کے اخلاقی اور روحانی فوائد حاصل کر سکیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۶۹-۷۰)

شمسی حساب کی قباحت

شمسی حساب کو عبادات کی بنیاد قرار دینے کی یہ قباحت بھی بالکل واضح ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہر مسلمان کے لیے یا تو فلکیات اور نجوم کا علم حاصل کرنا فرض ہو جاتا، یا جنتری اس کے دین کا جز بن جاتی، جسے پاس رکھے بغیر وہ فرائضِ دینی ادا نہ کر سکتا۔ اس لیے اس کے بجائے آسمان کے اوپر ہر ماہ جنتری کا جو بہت بڑا ورق الٹتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۵۸-۶۲۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تاریخیں جاننے کا ذریعہ بنایا تا کہ اگر کوئی آدمی صحرا میں زندگی گزار رہا ہو یا کسی پہاڑ کی چوٹی پر اس کی کٹیا بنی ہوئی ہو تو وہ بھی اسے دیکھ کر یہ معلوم کر لے کہ اب رمضان کا چاند ہو گیا ہے اور روزے شروع ہو گئے ہیں، یا شوال کا چاند نکل آیا ہے اور کل عید الفطر ہے۔

رؤیتِ ہلال کے سلسلے میں مطلع غبار آلود یا ابر آلود ہونے کی صورت میں جو دقت پیش آسکتی ہے اس کے متعلق یہ ہدایت کر دی گئی کہ ۲۹ کو چاند نظر نہ آنے کی صورت میں مہینے کے ۳۰ دن پورے کیے جائیں۔ اس طرح اس تذبذب کو ختم کر دیا گیا ہو جو ۲۹ تاریخ کو چاند نظر نہ آسکنے کی وجہ سے دلوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۷۰-۷۱)

سائنس کے ہیضے کے شکار لوگ

بعض لوگوں کو اس زمانے میں سائنس کا ہیضہ ہو گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب یہ سائنس کا زمانہ ہے اس کے اندر تو بڑی آسانی کے ساتھ اس بات کی تحقیق کی جا سکتی ہے کہ چاند طلوع ہوا یا نہیں۔ مطلع پر چاند اگر موجود ہو اور فضا صاف نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہ آ رہا ہو تو ایسے آلات موجود ہیں جن کی مدد سے اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ خود علم فلکیات اور علم نجوم (astronomy) کے ذریعے سے بھی اس بات کا تعین کیا جا سکتا ہے کہ آج چاند ہو گا یا نہیں.......... لیکن یہ لوگ دراصل اس بات کو نہیں سمجھتے کہ ایک عالم گیر دین کبھی مصنوعی ذرائع پر انحصار نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ انھی ذرائع پر انحصار کرے گا جو زیادہ سے زیادہ فطری ہوں اور جن پر اعتماد کر کے جدید ترین سائنسی ترقیوں سے بہرہ ور لوگ بھی اس دین پر عمل پیرا ہو سکیں، اور وہ لوگ بھی ایک سچے مسلمان کی سی زندگی بسر کر سکیں جو ان ترقیوں کے ثمرات سے محروم یا ناآشنا ہوں۔

رؤیتِ ہلال کے لیے سائنسی ذرائع کو اختیار کرنے کا مشورہ دینے والے حضرات کی طرف سے ایک یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اس طریقے سے سب مسلمانوں کی عید (کم از کم پاکستان میں) ایک ہی دن ہو سکے گی کیونکہ عید اسلامی اتحاد کا ایک اہم نشان ہے اور رؤیتِ ہلال میں اختلاف واقع ہو جانے سے مسلمانوں کے اس اتحاد کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی عید ایک ہی دن ہونی چاہیے۔ لیکن درحقیقت یہ فکر و نظر کی غلطی ہے۔ ایسی باتیں دین سے ناواقفیت کی بنا پر کی جاتی ہیں اور یہ باتیں زیادہ تر وہ لوگ کرتے ہیں جو رمضان کے روزے تو نہیں رکھتے مگر عید کے معاملے میں اسلامی اتحاد کی انھیں بڑی فکر ہے۔

ساری دنیا میں ایک دن عید!

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی عید ایک دن ہونی چاہیے وہ تو بالکل ہی لغو بات کہتے ہیں، کیونکہ تمام دنیا میں رؤیتِ ہلال کا لازماً اور ہمیشہ ایک ہی دن ہونا ممکن نہیں ہے۔ رہا کسی ملک یا کسی ملک کے ایک بڑے علاقے میں سب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کی ایک عید ہونے کا مسئلہ تو شریعت نے اس کو بھی لازم نہیں کیا ہے۔ یہ اگر ہو سکے اور کسی ملک میں شرعی قواعد کے مطابق رویت کی شہادت اور اس کے اعلان کا انتظام کر دیا جائے تو اس کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے، مگر شریعت کا یہ مطالبہ ہرگز نہیں ہے کہ ضرور ایسا ہی ہونا چاہیے، اور نہ شریعت کی نگاہ میں یہ کوئی برائی ہے کہ مختلف علاقوں کی عید مختلف دنوں میں ہو۔ خدا کا دین تمام انسانوں کے لیے ہے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ آج لوگ ریڈیو کی موجودگی کی بنا پر یہ باتیں کر رہے ہیں کہ سب کی عید ایک دن ہونی چاہیے، مگر آج سے ساٹھ ستر برس پہلے تک پورے برصغیر ہند تو درکنار، اس کے کسی ایک صوبے میں بھی یہ ممکن نہ تھا کہ ۲۹ رمضان کو عید کا چاند دیکھ لیے جانے کی اطلاع سب مسلمانوں تک پہنچ جاتی۔ اگر شریعت نے عید کی وحدت کو لازم کر دیا ہوتا تو پچھلی صدیوں میں مسلمان اس حکم پر آخر کیسے عمل کر سکتے تھے؟ پھر آج بھی اس کو لازم کر کے عید کی یہ وحدت قائم کرنا عملاً ممکن نہیں ہے۔ مسلمان صرف بڑے شہروں اور قصبوں ہی میں نہیں رہتے، دور دراز دیہات میں بھی رہتے ہیں اور بہت سے مسلمان جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی مقیم ہیں۔ وحدت عید کو ایک لازمی شرعی حکم بنانے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان ہونے کے لیے ملک میں صرف ایک ریڈیو سٹیشن کا ہونا ہی ضروری نہ ہو، بلکہ ہر شخص کے پاس، یا ہر گھر کے لوگوں کے پاس، یا مسلمانوں کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بستی میں ایک ریڈیو سیٹ یا ایک ٹرانزسٹر بھی ضرور ہو، ورنہ وہ اپنے شرعی فرائض ادا نہ کر سکیں گے۔ کیا یہ آلات بھی اب دین کا ایک لازمی جز قرار پائیں گے، خدا کی شریعت نے تو ایسے قواعد مقرر کیے ہیں، جن سے ہر مسلمان کے لیے ہر حالت میں دینی فرائض ادا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس نے نماز کے اوقات گھڑیوں کے حساب سے مقرر نہیں کیے کہ گھڑی ہر مسلمان کے لیے اس کے دین کا ایک جز بن جائے، بلکہ اُس نے سورج کے طلوع و غروب اور زوال جیسے عالمگیر مناظر کو اوقاتِ نماز کی علامت قرار دیا، جنھیں ہر شخص ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح اُس نے روزے شروع اور ختم کرنے کے لیے بھی رمضان اور شوال کے چاند کی رویت کو علامت قرار دیا ہے جو عالمگیر مشاہدے کی چیز ہے اور ہر مسلمان ہر جگہ چاند دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ اب رمضان شروع ہوا اور اب ختم ہو گیا۔ اگر وہ اس کی بنیاد جنتری کے حساب کو قرار دیتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہر مسلمان کے لیے یا تو فلکیات اور نجوم کا علم حاصل کرنا فرض ہو جاتا، یا جنتری اس کے دین کا ایک جز بن جاتی، جسے پاس رکھے بغیر وہ فرائض دینی ادا نہ کر سکتا۔ اور اگر وہ یہ حکم دیتا کہ ایک جگہ کی رویت سے ساری دنیا میں یا روئے زمین کی ایک ایک اقلیم میں روزے شروع اور ختم کرنا فرض ہے تو خبر رسانی کے موجودہ ذرائع کی ایجاد سے پہلے تو مسلمان اس دین پر عمل کر ہی نہیں سکتے تھے، رہا ان کی ایجاد کے بعد کا دور تو اس میں بھی مسلمانوں پر یہ مصیبت نازل ہو جاتی کہ چاہے انھیں روٹی اور کپڑا میسر ہو یا نہ ہو، مگر وہ مسلمان رہنا چاہیں تو ان کے پاس ایک ٹرانزسٹر ضرور ہو۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۷۳-۷۵)

عیدوں کے مہینے ناقص نہیں ہوتے

حضرت [ابو بکرۃؓ] بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عید کے دو مہینے کبھی ناقص نہیں ہوتے،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رمضان اور ذو الحجّۃ (متفق علیہ)[1]

بعض لوگوں نے حضورؐ کے اس ارشاد کا یہ مطلب لیا ہے کہ دونوں مہینے کبھی بیک وقت ۲۹ دن کے نہیں ہوتے۔ لیکن یہ ایک غیر علمی توجیہ ہے۔ رمضان اور ذو الحجۃ کے مہینے ایک سال میں ۲۹ دن کے ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ حدیث کا مطلب دراصل یہ ہے کہ یہ مہینے خواہ ۲۹ دن کے ہوں خواہ ۳۰ دن کے۔ ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر رمضان ۳۰ کے بجائے ۲۹ دن کا ہو تو اس کے روزوں کے اجر و ثواب میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی (یعنی ۲۹ روزوں کا ثواب ۳۰ روزوں سے کم ہوگا) اس طرح ذو الحجۃ کے عشرۂ اول کی جو فضیلت اور اجر و ثواب ہے اس میں کوئی کمی اس وجہ سے نہیں ہوگی کہ یہ مہینہ ۳۰ کے بجائے ۲۹ دن کا ہوا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۷۵-۷۶)

شعبان کا چاند دیکھنے کا اہتمام

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی: رمضان کے لیے شعبان کا ہلال دیکھنے کا اہتمام کرو۔[2] (ترمذی)

اگر شعبان کا ہلال دیکھنے کا اہتمام نہ کیا جائے تو یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ شعبان کی کون سی تاریخ ہے۔ چنانچہ رمضان کے آغاز کا فیصلہ کرنے میں بھی مشکل پیش آ سکتی ہے کیونکہ اگر رمضان کی آمد پر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آیا تو اس بات کا تعین کرنا ناممکن ہو جائے گا کہ آج شعبان کی ۲۹ تاریخ ہے یا ۳۰۔ اگر شعبان کا ہلال دیکھنے کا اہتمام کیا گیا ہو تو ۲۹ تاریخ کو رمضان کا ہلال نظر نہ آنے کی صورت میں شعبان کے ۳۰ دن پورے کیے جائیں گے۔ اور اگر یہ معلوم ہو کہ آج شعبان کی ۳۰ تاریخ ہے تو چاند خواہ نظر آئے یا نہ آئے اگلے روز سے رمضان کا آغاز قرار دیا جائے گا۔ اس لیے رمضان کے آغاز کا صحیح فیصلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شعبان کا ہلال دیکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۸۱)

رؤیتِ ہلال میں شہادت کا نصاب

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بدّو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے۔ آپؐ نے اس سے پوچھا: کیا تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپؐ نے پھر پوچھا: کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس پر آپؐ نے حضرت بلالؓ کو آواز دے کر کہا کہ اے

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۷۵، اشاعت سوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۷۴، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بلالؓ، لوگوں میں اعلان کر دو کہ کل سے روزہ رکھیں۔[1]

یہ ایک بڑی اہم حدیث ہے جس میں بہت سے مسائل معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ ....رؤیتِ ہلال کے سلسلے میں شہادت کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب مطلع صاف نہ ہو اور عام لوگ چاند نہ دیکھ سکے ہوں۔ اگر مطلع صاف ہو تو ہزاروں لاکھوں آدمی چاند کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اس لیے کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے برعکس اگر مطلع صاف ہو لیکن ہزاروں آدمی کوشش کے باوجود اس کو نہ دیکھ سکے ہوں تو اس صورت میں اگر کوئی ایک آدمی یا چند آدمی آ کر شہادت دیں کہ انھوں نے چاند دیکھ لیا ہے تو ان کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی، خواہ وہ کیسے ہی متقی اور پرہیز گار ہوں۔ آخر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ آسمان پر جو چیز نمایاں ہوا سے لاکھوں آدمی تو نہ دیکھ سکیں اور بس دو چار یا دس پانچ آدمی دیکھ لیں۔ البتہ اگر مطلع صاف نہ ہو اور بادل فضا پر چھائے ہوئے ہوں، اس صورت میں دو چار آدمی اگر یہ بیان کریں کہ ہم نے چاند دیکھ لیا ہے تو ان کی یہ شہادت قابل غور ہو سکتی ہے کیوں کہ اس بات کا امکان ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بدلی کہیں سے ہٹی ہو اور کسی کو چاند نظر آ گیا ہو۔ اس صورت میں صرف یہی دیکھنا ہو گا کہ یہ لوگ سچے ہیں یا نہیں۔ اور خود نماز روزے کے پابند ہیں یا نہیں۔

۲۔ ....رؤیتِ ہلال کے معاملے میں پہلے مرحلے پر شہادت درکار ہوتی ہے اور دوسرے مرحلے پر صرف خبر کافی ہو جاتی ہے۔ یعنی سب سے پہلے اس امر کی شہادت قائم ہونی چاہیے کہ چاند ایسے چند آدمیوں نے دیکھا ہے جو بھروسے کے قابل تھے۔ کسی معتبر مجلس یا کسی مفتی یا قاضی نے یہ شہادتیں لی ہوں۔ ان شہادتوں کی بنا پر جب وہ مطمئن ہو کر رؤیت ہلال کا اعلان کر دے تو اس کے بعد یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہر آدمی یا تو خود چاند دیکھے یا اس کے سامنے شہادتیں پیش ہوں، بلکہ مجلس مجاز یا مفتی یا قاضی کے اعلان کی بنا پر اگر سائرن بجیں یا نقارے بجیں یا شہر میں عام چرچا ہو کہ چاند دیکھا گیا تو عام لوگوں کے لیے خبر کافی ہے۔

۳۔ ....ایک آدمی کی شہادت رمضان کے چاند کے لیے ہے۔ عید کے چاند کے لیے نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کی شہادت کو رمضان کے چاند کے بارے میں قبول فرمایا ہے۔ البتہ عید کے چاند کے بارے میں فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کم از کم دو آدمیوں کی شہادت ضروری ہے۔ س معاملے میں صرف ایک آدمی کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ رمضان کے چاند کے لیے لوگوں میں وہ بے تابی نہیں ہوتی جو عید کے چاند کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس کے معاملے میں احتیاط کا پہلو غالب رہنا چاہیے۔

۴۔ ......شہادت دینے والے کا مومن ہونا ضروری ہے، جیسا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رؤیتِ ہلال کی شہادت دینے والے اعرابی کا مومن ہونا تحقیق فرمایا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ دینی معاملات میں کسی غیر مومن کی شہادت قابلِ

[1] تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۶۶۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قبول نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ ایک غیر مومن کو اس بات کی کیا فکر ہو سکتی ہے کہ اس کی غلط گواہی سے آپ کے کسی دینی فریضے میں کوئی خرابی واقع ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس ایک مومن کے لیے یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ آیا کل رمضان شروع ہو رہا ہے یا نہیں۔ یا کل عید ہے یا نہیں، کیوں کہ اگر کل عید ہے تو روزہ رکھنا حرام ہے اور اگر عید نہیں ہے تو روزہ چھوڑنا حرام ہے۔ اور پھر اس صورت میں جب کہ معاملہ پوری جماعت مسلمین کے ایک دینی فریضے کا ہو وہ کیسے اتنی بڑی غیر ذمہ داری کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ غلط معلومات بہم پہنچائے۔

۵- ...... جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس اعرابی نے اپنے مومن ہونے کا اقرار کیا تو پھر حضورؐ نے اس کے بارے میں کوئی مزید تحقیقات نہ کی کہ آیا وہ شخص فاسق وفاجر تو نہیں ہے۔ جب اس بات کا اطمینان فرمالیا کہ وہ شخص مسلمان ہے تو پھر اس کی شہادت قبول فرمالی۔ اس سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ جب تک آدمی کا فاسق ہونا معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک اس کی شہادت رد نہیں کی جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں کسی مسلمان کی شہادت اس بنا پر رد نہیں کی جائے گی کہ اس کا فاسق ہونا معلوم نہیں ہوا۔ ایک مسلمان کے بارے میں ابتدائی مفروضہ یہی ہوگا کہ وہ فاسق نہیں ہے۔ اس کے غیر فاسق ہونے کی تحقیقات نہیں کرائی جائے گی۔ ہاں اگر کسی کا فاسق ہونا معلوم ہو تو پھر اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۸۵-۸۷)

اس امر میں تو عام طور پر اتفاق ہے کہ ہلال رمضان کے لیے ایک آدمی کی شہادت بھی قابل قبول ہے۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ صرف ایک آدمی کی شہادت کن حالات میں قبول کی جائے گی۔ بعض فقہا کے نزدیک رمضان کے چاند کے معاملے میں ایک ہی آدمی کی شہادت ہر حالت میں معتبر ہے۔ امام ابوحنیفہؒ بھی ایک آدمی کی شہادت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس صورت میں جب کہ مطلع صاف نہ ہو۔ اگر مطلع صاف ہو تو پھر ان کے نزدیک ایک آدمی کی شہادت کافی نہیں بلکہ اس صورت میں بہت سے لوگوں کا رویتِ ہلال کی گواہی دینا ضروری ہے۔ اور امام مالکؒ اور بعض دوسرے فقہا کا یہ مسلک ہے کہ رمضان کے چاند کے لیے کم از کم دو قابل اعتبار آدمیوں کی شہادت ضروری ہے۔ لیکن پیش نظر حدیث ان کے مسلک کے خلاف جاتی ہے۔ البتہ بعض دوسری احادیث سے ان کے مسلک کو تقویت پہنچتی ہے، اگرچہ ان سے بھی یہ قطعی حکم نہیں نکلتا کہ ایک آدمی کی شہادت معتبر نہیں ہے۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۸۸)

تاریخ کا تعین چاند دیکھنے سے

حضرت ابن عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا [ہے] کہ اللہ تعالیٰ نے مہینے کے امتداد کو ہلال کی رویت تک رکھا ہے۔ پس اگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے چاند تمھیں نظر نہ آئے تو پھر (مہینے کے دنوں کی) تعداد (۳۰ تک)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۷۲، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پوری کرو[1]............

اگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے رؤیتِ ہلال کے بارے میں فیصلہ نہ ہو سکا ہو اور پھر اگلے روز یا اس سے اگلے روز چاند دیکھنے کے بعد لوگوں میں یہ بحث چھڑ جائے کہ آج چاند دوسری شب کا ہے یا تیسری شب کا تو ظاہر بات ہے اس سے دلوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا ہوں گے۔اس لیے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کا تدارک کرنے کے لیے اس بات کی وضاحت فرمادی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہینے کی مدت کا مدار رؤیت ہلال پر رکھا ہے اور دوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مہینے کی امتداد کو رؤیتِ ہلال تک رکھا ہے۔یعنی ایک مہینہ دوسرے مہینے کا چاند دیکھ کر ختم ہوتا ہے اور اگر ۲۹ تاریخ کو چاند نظر نہ آئے تو پھر مہینے کے دنوں کی تعداد ۳۰ تک پوری کی جائے۔محض چاند کی جسامت وغیرہ کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا کہ یہ کون سی تاریخ کا چاند ہے سراسر خود کو شک میں مبتلا کرنے والی بات ہے،بس رؤیت پر اپنے فیصلے کا مدار رکھو،خواہ مخواہ کے قیاسات پر فیصلہ نہ کرو اور بلاوجہ اپنے لیے مشکلات پیدا کرنے سے احتراز کرو۔

(کتاب الصوم،نومبر ۲۰۰۰ء،ص ۹۱-۹۲)

چاند کا گھٹنا بڑھنا اور اس میں پوشیدہ حکمت

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَ ھِلَّۃِ قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ۔ (البقرۃ ۲:۱۸۹)لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔کہو!یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کی تعیین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔

چاند کا گھٹنا بڑھنا ایک ایسا منظر ہے،جس نے ہر زمانے میں انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے اور اس کے متعلق طرح طرح کے اوہام وتخیلات اور رسوم دنیا کی قوموں میں رائج رہے ہیں اور اب تک رائج ہیں۔اہل عرب میں بھی اس قسم کے اوہام موجود تھے۔چاند سے اچھے یا بُرے شگون لینا،بعض تاریخوں کو سُعد اور بعض کو نحس سمجھنا کسی تاریخ کو سفر کے لیے اور کسی کو ابتدائے کار کے لیے اور کسی کو شادی بیاہ کے لیے منحوس یا مسعود خیال کرنا اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلوع وغروب اور اس کی کمی وبیشی اور اس کی حرکت اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر پڑتا ہے،یہ سب باتیں دوسری جاہل قوموں کی طرح اہل عرب میں بھی پائی جاتی تھیں اور اس سلسلے میں مختلف توہم پرستانہ رسمیں اُن میں رائج تھیں۔انھی چیزوں کی حقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کی گئی۔جواب میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ گھٹتا بڑھتا چاند تمھارے لیے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک قدرتی جنتری ہے،جو آسمان پر نمودار ہو کر دنیا بھر کے لوگوں کو بیک وقت ان کی تاریخوں کا حساب بتاتی رہتی ہے۔حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ عرب کی مذہبی،تمدنی اور معاشی زندگی میں اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر تھی۔سال کے چار مہینے حج اور عمرے سے وابستہ تھے۔ان مہینوں میں لڑائیاں بند رہتیں،راستے محفوظ ہوتے اور امن کی وجہ سے کاروبار فروغ پاتے تھے۔

(تفہیم القرآن،اوّل،ص ۱۴۸-۱۴۹،البقرۃ،حاشیہ ۱۹۸)

۱۔ تخریج:تفہیم الاحادیث،چہارم،ص ۸۴-۸۵،اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

سحری کا اہتمام

سحری میں برکت ہے

عَنْ اَنَسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السَّحُوْرِ بَرَكَةً (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)[1] حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سحری کرو کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے۔

اہل کتاب کے روزوں میں سحری کرنا نہیں تھا۔ ان کا روزہ سورج غروب ہونے کے بعد شروع ہوتا تھا اور وہ رات ہی کو کھا پی کر فارغ ہو جاتے تھے۔ پھر وہ روزہ دوسرے دن کے سورج کے غروب ہونے تک چلتا تھا۔ لیکن ان کے اندر جو لوگ زیادہ زہد و تقویٰ برتنے والے تھے وہ دوسرے دن کا روزہ کھولتے ہی اگلا روزہ شروع کر دیتے تھے اور کوئی اللہ کا بندہ ایسا بھی ہوتا تھا جو مثلاً مٹر کے ایک دانے سے روزہ کھول لیتا اور دوسرا روزہ شروع کر لیتا، پھر ان میں بعض ایسے با کمال تھے جو دوسرے دن کا روزہ بھی نہیں کھولتے تھے اور اگلا روزہ شروع کر لیتے تھے۔ اسی طرح تین تین چار چار دن کا روزہ رکھتے تھے۔ گویا جو جتنا بڑا راہب ہوتا تھا یا جس کو اپنے ذوق تقویٰ کا کوئی خاص بڑا کمال دکھانا ہوتا تھا وہ اتنا ہی لمبا چوڑا روزہ رکھتا تھا۔

اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سحری کرو کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے۔

سحری کھانے میں برکت یہ ہے کہ اس سے آپ کو اللہ کے حکم کی بجا آوری میں سہولت ہوتی ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ فجر کے وقت سے روزہ شروع کرو اور غروب آفتاب کے وقت ختم کرو۔ اب جس وقت سے روزہ شروع ہوتا ہے اس سے پہلے اگر آپ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اجازت سے فائدہ اٹھا کر کھا پی لیتے ہیں تو وہ کھایا پیا دن بھر آپ کے کام آئے گا۔ لیکن اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو اس سے لازماً آپ کو کمزوری لاحق ہوگی۔ اب چوں کہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ یہ روزے مہینے بھر رکھے جائیں، اور ہو سکتا ہے کہ اس طرح کسی آدمی کی طاقت اور ہمت یہ مدت پوری کرنے سے پہلے ہی جواب دے جائے اس لیے نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کھانے کی تاکید فرمائی کہ جس وقت کھانے پینے کی تمھیں اجازت ہے اس وقت تم کھاؤ تا کہ جس وقت تمھیں کھانے پینے کی اجازت نہ ہوگی اس میں تمھیں اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کی طاقت حاصل رہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۹۶-۹۷)

۱- تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۸۶-۸۹، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بہترین سحری، کھجور

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کے لیے بہترین سحری کھجور ہے۔(ابوداؤد)

کھجور میں انسان کی تمام غذائی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ اگر انسان کو کوئی غذا نہ مل سکے لیکن کھجور حاصل ہو تو یہ اس کے لیے کافی غذا ہے۔ موجودہ تحقیق کے مطابق انسان کو اپنی توانائی برقرار رکھنے کے لیے غذا کی جتنی کلوریاں درکار ہوتی ہیں وہ کھجور میں موجود ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں بھی جب فوج کو کسی صحرائی علاقے میں لمبے عرصے کے لیے قیام کرنا پڑتا ہے اور وہاں غذا مہیا کرنے کے عام مواقع موجود نہیں ہوتے تو کھجوروں کا کافی سٹاک فوج کے لیے فراہم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اگر کئی کئی ماہ تک کوئی اور غذا میسر نہ آئے تو محض کھجور پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔

کھجور کی اسی افادیت اور غذائیت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بہترین سحری قرار دیا ہے۔ سحری کے طور پر اس کے استعمال کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دن کے وقت آدمی کو اپنی طاقت اور توانائی برقرار رکھنے اور کام کاج کے قابل رکھنے میں بہت زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۸-۱۱۹)

سحری کے وقت میں گنجایش

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص اذان کی آواز سنے اور اس وقت برتن ابھی اس کے ہاتھ میں ہو تو وہ اس برتن کو اپنے ہاتھ سے نہ رکھے جب تک کہ اپنی حاجت اس سے پوری نہ کر لے۔[2] (ابوداؤد)

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سحری کے وقت نقارے اور سائرن نہیں بجتے تھے بلکہ لوگوں کو اذان کے ذریعے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سحری کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ گرمی کا زمانہ ہے اور لوگ باہر کھلی جگہ میں سو رہے ہیں تو اس حالت میں ہر شخص خود یہ دیکھ سکتا تھا کہ روزہ شروع ہونے کا وقت ہو گیا ہے یا نہیں............اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بارش اور جاڑے کا زمانہ ہے اور لوگ گھروں کے اندر سحری کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں عملاً یہ ممکن نہ تھا کہ سب لوگ باہر نکل نکل کر دیکھیں کہ سحری کا وقت ختم ہو گیا ہے یا نہیں۔ اس لیے فرمایا کہ جب سحری کے وقت اذان کی آواز تمھارے کان میں پڑے اور صورت یہ ہو کہ ایک آدمی پانی پی رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں برتن ہے تو ضروری نہیں کہ اللہ اکبر کی آواز سنتے ہی وہ اسے رکھ دے بلکہ اسے اجازت ہے کہ وہ اس میں سے اپنی ضرورت پوری کر لے۔

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۱۶-۱۱۷، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۸۴۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن مجید اور احادیث میں سحری کے خاتمے کے وقت کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے، اور عام مشاہدہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ سیکنڈوں کے حساب سے نہیں ہے کہ ایک سیکنڈ ادھر تو سحری کا وقت ہو اور ایک سیکنڈ اُدھر جاتے ہی سحری کا وقت ختم ہو جائے۔ ختم سحر اور طلوع فجر دراصل ایک بڑا مظہر فطرت ہے جسے آدمی مشرق کی طرف دیکھتا ہے۔ مشرق سے سپیدی ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آغاز میں ایک ہلکی سی دھاری نمودار ہوتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اب گویا فجر کا آغاز ہو رہا ہے اور رات ختم ہو رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ طلوع فجر (dawn) کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو سیکنڈوں کے حساب سے ہو بلکہ وداعِ شب اور طلوع فجر میں چند منٹ کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ جب آدمی اذان کی آواز سنتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس سے ایک سیکنڈ پہلے تک تو سحری کا وقت تھا لیکن موذن کی زبان سے اللہ کا لفظ نکلتے ہی یہ وقت ختم ہو گیا۔ اس طرح کی موشگافیاں کرنا درست نہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اگر اتفاق سے کبھی ایسا ہو کہ آپ سوتے رہ گئے اور آنکھ کھلنے پر آپ نے ابھی چند لقمے ہی لیے تھے کہ سائرن بج گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ فوراً ہاتھ روک لیں یا برتن اپنے منہ سے ہٹا لیں بلکہ جلدی جلدی تھوڑا بہت جو کچھ بھی آپ کھا پی سکتے ہیں آپ کو کھا لینا چاہیے۔

اس حدیث میں یہی بات فرمائی گئی ہے کہ جب تم اذان کی آواز سنو یا سحری کے خاتمے کا کوئی دوسرا اعلان ہو رہا ہو اور اس وقت تمھارے ہاتھ میں کوئی برتن ہو تو اسے رکھ مت دو بلکہ اس سے اپنی حاجت پوری کر لو۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر اطمینان سے بیٹھا کھاتا پیتا رہے بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ جلدی سے اپنی ضرورت پوری کر لینی چاہیے۔

(کتاب الصوم، جولائی ۱۹۸۰ء، ص ۱۰۴-۱۰۶)

آج کل لوگ سحری اور افطار دونوں کے معاملے میں شدتِ احتیاط کی بنا پر کچھ بے جا تشدد برتنے لگے ہیں مگر شریعت نے ان دونوں اوقات کی کوئی ایسی حد بندی نہیں کی ہے جس سے چند سیکنڈ یا چند منٹ ادھر ادھر ہو جانے سے آدمی کا روزہ خراب ہو جاتا ہو۔ سحر میں سیاہی شب سے سپیدۂ سحر کا نمودار ہونا اچھی خاصی گنجائش اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک شخص کے لیے یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر طلوع فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی ہو تو وہ جلدی سے اُٹھ کر کھا پی لے۔

سحر اور افطار کی صحیح علامت یہ ہے کہ جب رات کے آخری حصے میں افق کے مشرقی کنارے پر سفیدۂ صبح کی باریک سی دھاری نمودار ہو کر اوپر بڑھنے لگے تو سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور جب دن کے آخری حصے میں مشرق کی جانب سے رات کی سیاہی بلند ہوتی نظر آئے تو افطار کا وقت آ جاتا ہے۔

(تفہیم القرآن، اول، البقرہ، ص ۱۴۶، حاشیہ ۱۹۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

روزے کی نیت کا وقت

حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے فجر سے پہلے روزہ رکھنے کا فیصلہ نہ کر لیا اس کا کوئی روزہ نہیں۔[1] (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، دارمی)

اس ارشاد سے مقصود یہ ہے کہ جب آپ کسی عبادت کا آغاز کرنے لگیں تو اس وقت یہ نیت کریں کہ میں یہ عبادت اللہ کے لیے کر رہا ہوں۔ یہ بات اس لیے ارشاد فرمائی کہ آدمی کھاتا پیتا تو فاقے میں بھی نہیں لیکن جو چیز فاقے اور روزے میں فرق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ روزہ رکھتے وقت آپ اس بات کی نیت کرتے ہیں کہ میں اس وقت سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے طور پر کھانا پینا ترک کر رہا ہوں۔ اگر آپ نے یہ نیت نہ کی تو بظاہر روزے اور فاقے میں کوئی فرق نہ رہا۔

روزے کا آغاز چوں کہ فجر سے ہوتا ہے اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فجر کے وقت سے پہلے یہ عزم کر لو کہ تم اللہ کے لیے روزہ رکھ رہے ہو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم نے روزے اور فاقے میں کوئی امتیاز قائم نہیں کیا۔

تاہم اس بات کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اگر ایک آدمی فجر سے پہلے روزے کی نیت کرنا بھول گیا تو اس کا روزہ ہی ساقط ہو گیا اور اسے بعد میں اس کی قضا ادا کرنا ہو گی۔ ایسا نہیں ہے، بلکہ اگر آپ روزہ رکھتے وقت یہ نیت کرنا بھول گئے ہوں تو جس وقت آپ کو یاد آئے اسی وقت روزے کی نیت کر لیں، ورنہ یہ بات اپنی جگہ پر تو واضح ہے کہ آپ کی نیت روزے کی موجود ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب آپ سحری کے لیے اٹھے تھے تو یہ سمجھتے ہوئے ہی تو اٹھے تھے کہ آپ کو روزہ رکھنا ہے۔ اس لیے اگر روزہ رکھتے وقت آپ یہ الفاظ زبان سے ادا نہیں کر سکے کہ میں آج اللہ کے لیے روزہ رکھ رہا ہوں یا دل میں اس کا خیال عین آغازِ صوم کے وقت نہیں آیا تو اس سے روزہ باطل نہیں ہو جاتا............ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شریعت میں چونکہ اصل اہمیت نیت کو حاصل ہے اور اعمال کی قدر و قیمت بھی نیت ہی کی بنا پر متعین ہوتی ہے۔ اس لیے شریعت کی نظر میں ایک فعل کو دوسرے فعل سے ممتاز کرنے والی چیز آدمی کی نیت ہے۔ اس وجہ سے ارشاد فرمایا کہ فجر سے پہلے آدمی کو چاہیے کہ وہ بالارادہ اس بات کی نیت کر لے کہ میں آج روزہ رکھ رہا ہوں۔ ورنہ اس کے بغیر محض ظاہری فعل کی حد تک روزے اور فاقے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۳-۱۰۴)

خورد و نوش کے حدود

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۔ (البقرۃ ۲:۱۸۷) نیز راتوں کو کھاؤ پیو یہاں تک کہ تم کو سیاہیِ شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نظر آ جائے۔

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۸۱۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس بارے میں بھی لوگ ابتداً غلط فہمی میں تھے۔ کسی کا خیال تھا کہ عشا کی نماز پڑھنے کے بعد سے کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے اور کوئی یہ سمجھتا تھا کہ رات کو جب تک آدمی جاگ رہا ہو، کھا پی سکتا ہے۔ جہاں سو گیا، پھر دوبارہ اُٹھ کر وہ کچھ نہیں کھا سکتا۔ یہ احکام لوگوں نے خود اپنے ذہن میں سمجھ رکھے تھے اور اس کی وجہ سے بسا اوقات بڑی تکلیفیں اٹھاتے تھے۔ اس آیت میں انھی غلط فہمیوں کو رفع کیا گیا ہے۔ اس میں روزے کی حد طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک مقرر کر دی گئی اور غروب آفتاب سے طلوع فجر تک رات بھر کھانے پینے اور مباشرت کرنے کے لیے آزادی دے دی گئی۔ اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کا وقت مقرر فرما دیا تا کہ طلوع فجر سے عین پہلے آدمی اچھی طرح کھا پی لے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۴۵، البقرہ، حاشیہ ۱۹۲)

عبادات کے لیے معیار اوقات

اسلام نے اپنی عبادات کے لیے اوقات کا وہ معیار مقرر کیا ہے جس سے دنیا میں ہر وقت، ہر مرتبۂ تمدن کے لوگ ہر جگہ اوقات کی تعیین کر سکیں۔ وہ گھڑیوں کے لحاظ سے وقت مقرر کرنے کے بجائے اُن آثار کے لحاظ سے وقت مقرر کرتا ہے جو آفاق میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر نادان لوگ اس طریق توقیت پر عموماً یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قطبین کے قریب، جہاں رات اور دن کئی کئی مہینوں کے ہوتے ہیں، اوقات کی یہ تعیین کیسے چل سکے گی۔ حالاں کہ یہ اعتراض دراصل علم جغرافیہ کی سرسری واقفیت کا نتیجہ ہے۔ حقیقت میں نہ وہاں چھ مہینوں کی رات اُس معنوں میں ہوتی ہے اور نہ چھ مہینوں کا دن، جس معنی میں ہم خط استوا کے آس پاس رہنے والے لوگ دن اور رات کا لفظ بولتے ہیں۔ خواہ رات کا دَور ہو یا دن کا بہر حال صبح و شام کے آثار وہاں پوری باقاعدگی کے ساتھ اُفق پر نمایاں ہوتے ہیں اور انھی کے لحاظ سے وہاں کے لوگ ہماری طرح اپنے سونے، جاگنے اور کام کرنے اور تفریح کرنے کے اوقات مقرر کرتے ہیں۔ جب گھڑیوں کا رواج عام نہ تھا، تب بھی فن لینڈ، ناروے اور گرین لینڈ وغیرہ ملکوں کے لوگ اپنے اوقات معلوم کرتے ہی تھے اور اس کا ذریعہ یہی اُفق کے آثار تھے۔ لہٰذا جس طرح دوسرے تمام معاملات میں یہ آثار ان کے لیے تعیینِ اوقات کا کام دیتے ہیں اس طرح نماز اور سحر و افطار کے معاملے میں بھی دے سکتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۴۵، البقرہ، حاشیہ ۱۹۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

افطار کی اہمیت

افطار کا صحیح وقت

ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ (البقرہ ۲: ۱۸۷) تب...........رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔

رات تک روزہ پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ جہاں رات کی سرحد شروع ہوتی ہے، وہیں تمھارے روزے کی سرحد ختم ہو جائے۔اور ظاہر ہے کہ رات کی سرحد غروب آفتاب سے شروع ہوتی ہے۔لہٰذا غروب آفتاب ہی کے ساتھ افطار کر لینا چاہیے۔ سحر اور افطار کی صحیح علامت یہ ہے کہ جب رات کے آخری حصے میں اُفق کے مشرقی کنارے پر سفیدۂ صبح کی باریک سی دھاری نمودار ہو کر اوپر بڑھنے لگے، تو سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور جب دن کے آخری حصے میں مشرق کی جانب سے رات کی سیاہی بلند ہوتی ہوئی نظر آئے، تو افطار کا وقت آ جاتا ہے۔آج کل لوگ سحری اور افطار دونوں کے معاملے شدتِ احتیاط کی بنا پر کچھ بے جا تشدد برتنے لگے ہیں۔مگر شریعت نے ان دونوں اوقات کی کوئی ایسی حد بندی نہیں کی ہے کہ جس سے چند سیکنڈ یا چند منٹ اِدھر اُدھر ہو جانے سے آدمی کا روزہ خراب ہو جاتا ہو۔سحر میں سیاہی شب سے سپیدۂ سحر کا نمودار ہونا اچھی خاصی گنجائش اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک شخص کے لیے یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر عین طلوع فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی ہو تو وہ جلدی سے اُٹھ کر کچھ کھا پی لے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور اذان کی آواز آ جائے تو فوراً چھوڑ نہ دے بلکہ اپنی حاجت بھر کھا پی لے۔اسی طرح افطار کے وقت میں بھی غروبِ آفتاب کے بعد خواہ مخواہ دن کی روشنی ختم ہونے کا انتظار کرتے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سورج ڈوبتے ہی بلال کو آواز دیتے تھے کہ لاؤ ہمارا شربت۔بلال عرض کرتے کہ یا رسول اللہ! ابھی تو دن چمک رہا ہے۔آپ فرماتے کہ جب رات کی سیاہی مشرق سے اٹھنے لگے تو روزے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص۱۴۶، البقرہ، حاشیہ ۱۹۴)

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب رات اس طرف سے آنی شروع ہو اور دن اس طرف سے پلٹنا شروع ہو اور سورج ڈوب جائے تو روزے دار کے روزہ کھولنے کا وقت ہو گیا۔[1] (متفق علیہ)

یعنی مشرق کی طرف سے اگر رات کی تاریکی بلند ہونی شروع ہو جائے اور معلوم ہو کہ تاریکی ابھرتی چلی آ رہی ہے اور دوسری طرف مغرب کی جانب یہ کیفیت ہو کہ سورج غروب ہو چکا ہے اور دن پلٹ رہا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ روزہ

۱۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۹۲-۹۴، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کھولنے کا وقت ہو گیا ہے اور آپ کو فوراً روزہ کھول لینا چاہیے۔ اگر روزہ کھولنے کا وقت ہو گیا ہو اور اس کے بعد آپ سوچ رہے ہوں کہ روزہ کھولیں یا نہ کھولیں تو یہ بات غلط اور شریعت کی روح کے منافی ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۰-۱۰۱)

یہود کے ہاں روزہ کھولنے کا دستور

یہود کا یہ دستور تھا کہ روزہ اس وقت کھولتے تھے جب آسمان پر ستارے چھٹک آتے تھے اور اس میں بھی جو آدمی جتنی زیادہ دیر کرتا تھا وہ اتنا ہی زیادہ متقی اور زاہد و پرہیز گار مانا جاتا تھا۔ یہ گویا ان کے نزدیک اس بات کی علامت تھی کہ یہ شخص کھانے کے لیے مطلق بے تاب نہیں تھا اور دیکھو کیسا ضبطِ نفس ہے کہ روزہ کھولنے کا وقت ہو گیا ہے لیکن پھر بھی نہیں کھول رہا ہے۔ اسلام میں اس طرح کے نمائشی تقویٰ کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تصور یہ ہے کہ جو وقت اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے اس وقت تک تو آپ اس طرح رُکے رہیں کہ جیسے کسی نے آپ کو باندھ رکھا تھا لیکن جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت مل جائے آپ اسی وقت اس چیز کی طرف دوڑیں جس سے اب تک رُکے ہوئے تھے، اور اس سے فائدہ اٹھانے میں جلدی کریں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کیوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بندہ اس کے حکم کی وجہ سے رُکا ہوا تھا۔ اگر اس کا حکم رکنے کا نہ ہوتا تو یہ نہ رُکتا۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پابند کر رکھا تھا اس لیے اس نے اپنی خواہشات اور اپنی بھوک پیاس ہر چیز پر پابندی لگا رکھی تھی لیکن جوں ہی اس پر سے پابندی ہٹالی گئی وہ پوری آزادی سے کھانے پینے لگا اور اپنی دوسری مصروفیات پوری کرنے لگا۔ چوں کہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ خیر پر رہیں گے جب تک کہ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے[1]............ اس سے یہ تنبیہ بھی مقصود تھی کہ اگر لوگوں نے افطار میں دیر لگانی شروع کر دی تو ان کو وہ بیماری لگنی شروع ہو جائے گی جس میں اہل کتاب مبتلا ہوئے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص [illegible])

اسلام برائی کو مقامِ آغاز سے روکتا ہے

قرآن مجید اور احادیث کا گہرا مطالعہ کرنے سے آپ کو معلوم ہو گا کہ اس معاملے میں اسلام کا مزاج یہ ہے کہ [illegible] خطرناک چیز کافی فاصلے پر ہو تو مومن کو چاہیے کہ اس کی جانب محض اس خیال سے نہ بڑھتا چلا جائے کہ اس کے قریب [illegible] رُک ہی جاؤں گا............ اس کے برعکس اسلام تو خطرے کی سڑک جہاں سے شروع ہوتی ہے وہیں سے آپ کو [illegible] قدم بھی اس کی طرف بڑھانے کو پسند نہیں کرتا۔ اب چوں کہ اسلام رہبانیت کو سخت ناپسند کرتا ہے اور روزے کے معاملے میں یہ بیماری اس مقام سے لگتی ہے کہ روزہ کھولنے کا وقت ہو گیا ہو لیکن آپ محض اس لیے تاخیر کریں کہ اس تاخیر کے ذریعے سے [illegible] دیر آپ اپنے جسم کو تکلیف دیں گے خدا اتنا ہی زیادہ آپ سے خوش ہو گا۔ اس لیے اس معاملے میں تنبیہ کر دی گئی کہ اگر تم نے یہ

ا۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۹۰۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیا تو یہ چیز تمھیں خیر سے محروم کر دے گی اور اللہ کی خوشنودی کے بجائے الٹی اس کی ناراضی کی موجب ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کی حقیقی خوشنودی تو اس بات میں ہے کہ آپ اس کے احکام کی پیروی کریں، اس کی عائد کردہ پابندیوں کو قبول کریں اور اس کی دی ہوئی اجازتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ جو چیز اس نے آپ کے لیے حلال کی ہے اس سے آپ پوری طرح متمتع ہوں اور جس چیز کو اس نے حرام ٹھہرایا ہے اس سے آپ رُک جائیں اور اپنی طرف سے اس کے احکام میں کوئی کمی بیشی نہ کریں۔ یہی فرماں برداری وہ چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ آپ پر خوش ہوتا ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگ بھلائی پر رہیں گے جب تک افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے افطار کا جو وقت مقرر کر دیا ہے اسی پر افطار کرنا اس کو محبوب ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۹۹-۱۰۰)

افطار میں جلدی کرنا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دین نمایاں اور غالب رہے گا جب تک کہ لوگ افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے کیوں کہ یہود اور نصاریٰ افطار کرنے میں تاخیر کرتے ہیں۔[۱] (ابوداؤد، ابن ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بظاہر ایک چھوٹی سی بات کے کتنے بڑے نتائج بیان فرمائے ہیں۔ روزہ کھولنے میں تاخیر کرنا اور سحری نہ کھانا اور صوم وصال رکھنا، یہ سب افعال یہود و نصاریٰ نے اپنا رکھے تھے .... یہی چیز تھی جس نے رفتہ رفتہ ان کے اندر رہبانیت پیدا کی اور انھیں زندگی سے فرار کر کے گوشوں میں پناہ لینے کی طرف راغب کیا لیکن دینِ خداوندی کا منشا اس سے بالکل مختلف ہے۔ اللہ کے دین کا منشا یہ ہے کہ یہ دنیا انسانوں ہی کے لیے پیدا کی گئی ہے اور اس کی لذتیں اور آسایشیں اور دوسرے سروسامان انسانوں ہی کے لیے ہیں۔ البتہ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ان ساری چیزوں کو اللہ کے مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرے اور ان حدود سے سرِمُو انحراف اور تجاوز نہ کرے .... پس ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ شریعت نے اس کو جو سہولت اور گنجایش دی ہے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھائے۔ البتہ اس سہولت کی جو حد مقرر کر دی گئی ہے اس پر جا کر رک جائے۔ سحری کا وقت ختم ہونے کے بعد تو یہ پابندی ہے کہ جب تک سورج غروب نہ ہو جائے تم کچھ کھانے پینے کا حق نہیں رکھتے لیکن سورج ڈوبتے ہی تمھیں حق پہنچتا ہے کہ کھاؤ پیو۔ اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ روزہ افطار کرنے میں یہود و نصاریٰ کا تاخیر کرنا دراصل رہبانیت کا ایک شاخسانہ تھا اور اپنے رب سے بدگمانی اس کی جڑ تھی۔ ان کا تصور یہ تھا کہ ان کا رب اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ اپنے جسم کو اذیتوں میں مبتلا کیا جائے۔ لیکن یہاں تصور یہ ہے کہ آپ کے رب کو آپ کی اطاعت و فرماں برداری مطلوب ہے اور اس کو وہ پسند کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اگر ایک وقت میں پانی جیسی حلال چیز آپ کے لیے حرام کر دیتا ہے تو آپ کا کام یہ ہے کہ اس کے استعمال سے رک جائیں۔ لیکن جس وقت وہ اسے آپ کے لیے حلال کر دیتا ہے تو آپ فوراً اس سے فائدہ اٹھائیں۔

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۱۰-۱۱۲، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک تم یہود اور نصاریٰ کے اس طریقے کے خلاف افطار میں جلدی کرتے رہو گے تمھارا دین غالب اور نمایاں رہے گا، لیکن جس وقت تم نے اس میں تاخیر کرنی شروع کر دی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اب تم نے دین کی اصل اسپرٹ کو ضائع کر دیا اور اب چلے تم سیدھے رہبانیت کی طرف۔ اس طرح جب تم نے اپنا طریقہ چھوڑ کر یہود و نصاریٰ کے طرز عمل کو اختیار کر لیا تو اس کے بعد تمھارا دین غالب کیسے رہ سکتا ہے۔ ایک مسلمان کا کام تو یہ ہے کہ جس چیز میں یہود و نصاریٰ کے اخلاق و عادات اور تہذیب و تمدن کی تقلید کا شائبہ بھی موجود ہو اس سے کھٹک جائے اور اس سے بچے کیوں کہ ان کی تقلید اختیار کرنا خود اپنے دین کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس کے بعد تمھارا دین اپنی اصل شان کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پہلے ایک چیز کی تقلید کرو گے اور پھر دوسری کی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ حالت یہ ہو جائے گی کہ تمھارے اندر ایک سچے مسلمان کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ اسی لیے حکم دیا گیا کہ جس مقام سے بگاڑ کا آغاز ہوتا ہے وہیں پر رک جاؤ، کیوں کہ اگر اس مقام پر نہ رکے تو پھر آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاؤ گے......... اور اسی بنا پر اتنی بڑی بات فرمائی کہ تمھارا دین غالب اور نمایاں رہے گا اگر تم یہود اور نصاریٰ کی روش کے برعکس افطار کرنے میں جلدی کرتے رہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۲-۱۱۴)

حضرت ابو عطیہؒ بیان کرتے ہیں کہ میں اور مسروق حضرت عائشہؓ کے ہاں گئے اور ہم نے عرض کیا: اے ام المومنین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے دو صاحب ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک تو افطار کرنے اور نماز پڑھنے میں جلدی کرتے ہیں اور دوسرے افطار اور نماز دونوں میں تاخیر کرتے ہیں۔ اُم المومنین نے دریافت فرمایا کون صاحب ہیں جو افطار اور نماز میں جلدی کرتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا، عبد اللہ بن مسعودؓ۔ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کرتے تھے ....دوسرے صاحب حضرت ابو موسیٰ اشعری ہیں۔[1]

جلدی کرنے کا مفہوم

یہاں پہلے تاخیر و تعجیل (جلدی کرنے) کا مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے تعجیل کرنے سے مراد ان کا یہ عمل تھا کہ ادھر روزہ افطار کرنے کا وقت ہوا اور اُدھر آپ نے روزہ افطار کیا اور نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے، لیکن حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا طریقہ یہ تھا کہ افطار کا وقت ہو جانے کے بعد قدرے تامل کرتے تھے کیوں کہ افطار کے وقت کا ٹھیک تعین ہونے اور اس کا اطمینان حاصل کرنے کے لیے کچھ توقف کرنے کی گنجایش ہوتی ہے۔ جب آفتاب غروب ہوتا ہے تو اس وقت اگر ذرا سی کرن بھی نظر آ رہی ہو تو آپ اس میں شبہ کرتے ہیں کہ کیا واقعی سورج غروب ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس بات کا یقین حاصل کرنے کے لیے چند لمحے کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔

پہلے صاحب یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ تو غروب آفتاب کے فوراً بعد روزہ کھولتے تھے اور نماز میں بھی جلدی کرتے

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۱۳-۱۱۶، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تھے۔ لیکن حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روزہ کھولنے میں بھی قدرے تاخیر کرتے تھے اور نماز سے پہلے بھی کچھ دیر ٹھہرتے تھے (اور کچھ نہ کچھ کھا پی لیتے تھے) اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کے روزہ کھولنے کا انتظار کرتے تھے تاکہ وہ بھی اطمینان سے روزہ افطار کر کے نماز میں شریک ہو جائیں۔

اس تعجیل اور تاخیر کے معاملے میں ایک یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں عام لوگوں کے لیے کچھ سہولت اور کچھ دقت کے پہلو ہیں۔ مثلاً افطار کے بعد مسجد میں نماز جلدی ہونے کی صورت میں دیر سے آنے والوں کو دقت ہوتی ہے، لیکن جو لوگ افطار کے وقت موجود ہوتے ہیں انھیں انتظار کی زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔ تاہم اس معاملے میں حضرت عائشہؓ کے ارشاد کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ تھا کہ آپ افطار میں بھی جلدی کرتے تھے اور نماز میں بھی...... حضرت عائشہؓ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انھوں نے ان دونوں صاحبوں میں سے ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط قرار دیا ہے بلکہ صرف یہ بتایا ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل کیا تھا اور اس میں مسنون طریقہ کیا ہے...... اس لیے یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے طریقے کے ساتھ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے عمل کی گنجایش بھی شریعت میں موجود ہے کیوں کہ وہ جس تاخیر سے کام لیتے تھے وہ یہود والی تاخیر نہیں تھی۔ روزہ افطار کرنے سے پہلے غروب آفتاب کا اطمینان کرنے کے لیے کچھ توقف کرنے کی گنجایش بالکل قابلِ فہم ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ اس کا محرک جان بوجھ کر تاخیر کرنے یا راہبانہ احتیاط پسندی کا جذبہ نہ ہو۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۴-۱۱۶)

افطار کے لیے افضل چیزیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ یہ تھا کہ آپؐ پہلے روزہ افطار کرتے تھے اور پھر نماز پڑھتے تھے۔ افطار میں آپؐ کا دستور یہ تھا کہ آپؐ تازہ کھجور سے افطار کرتے (تازہ کھجور سے یہ مراد نہیں کہ ابھی درخت سے اتری ہو بلکہ وہ کھجور مراد ہے جو خشک نہ ہو یعنی تر کھجور، جیسے ہم یہاں کھجور استعمال کرتے ہیں) اگر کھجور نہ ملتی تو پھر آپؐ چھوہاروں سے روزہ کھولتے تھے اور اگر کبھی اتفاق سے وہ بھی نہ ہوتے تو پانی کے ایک دو گھونٹ پی کر روزہ افطار فرماتے۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۸)

روزہ افطار کرانے والے کا اجر

شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ نیکی کرنے والے کے لیے تو اس کی نیکی کا اجر ہے ہی لیکن جو اس کو نیکی کے ذرائع فراہم کر کے دے، اس کے لیے بھی اجر ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص کسی کو نیکی کرنے کے لیے کہے تو اس کے لیے بھی اجر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهٖ (نیکی کی طرف رہنمائی کرنے والا اس نیکی کرنے والے کے مانند ہے۔)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۰۴-۱۰۶، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ نیکی کرنے والے کے اجر میں سے کوئی حصہ لے کر اس شخص کو دے دیا جائے گا جس نے نیکی کے ذرائع اور وسائل بہم پہنچائے تھے بلکہ نیکی کرنے والے کو اس کا پورا اجر ملے گا اور اس نیکی کے لیے سفارش کرنے والے اور اس میں مددگار بننے والے کو بھی اپنا اپنا اجر ملے گا۔[1]

کسی روزہ دار کا روزہ کھلوا دینا بظاہر معمولی سی بات ہے لیکن اس کا جو اجر ارشاد فرمایا گیا وہ کہیں بڑا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محض نیکی کی طرف رغبت دلانا بھی اللہ تعالیٰ کی نظر میں بڑا محبوب فعل ہے کیوں کہ اس سے نیکیوں کے پھیلنے میں مدد ملتی ہے اور انسانی خیر و فلاح کا وہ کام انجام پاتا ہے جو دین کا مقصود ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۸-۱۰۹)

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا كَانَ لَهُ مَغْفِرَةٌ لِذُنُوبِهِ وَعِتْقُ رَقَبَتِهِ مِنَ النَّارِ وَ كَانَ لَهُ مِثْلُ اَجْرِهِ مِنْ غَيْرِ اَنْ يُنْتَقَصَ مِنْ اَجْرِهِ شَيْءٌ جس نے رمضان میں کسی روزہ دار کو افطار کرایا تو یہ اس کے گناہوں کی بخشش کا اور اس کی گردن کو آگ سے چھڑانے کا ذریعہ ہوگا۔ اور اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس روزہ دار کو روزہ رکھنے کا ثواب ملے گا بغیر اس کے کہ روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی ہو۔

(خطبات، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۸)

افطار کے وقت کی دعائیں

اگر ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ کوئی فریضہ انجام دیتا ہے تو اس کا یہ فعل بذات خود اپنی ایک قدر و قیمت رکھتا ہے اور اس پر وہ اجر کا مستحق ہے لیکن اس فریضے کی انجام دہی کے دوران میں اس کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ غفلت کے ساتھ اسے انجام دے اور دوسری یہ کہ وہ اس کے دوران میں مسلسل اپنے رب کی طرف راغب رہے اور اس کا ذکر کرتا رہے، ان دونوں حالتوں میں اجر اور مقبولیت کے لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ ایک شخص کا کسی فریضے کی انجام دہی کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی طرف اہتمام کے ساتھ متوجہ رہنا اس کے اجر کو کہیں زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ آپ نماز کے لیے وضو کر رہے ہیں اور آپ نے وہ سارے اعضا ٹھیک ٹھیک دھوئے ہیں جو وضو میں دھونے چاہییں۔ اس طرح بے شک آپ نماز میں کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے۔ لیکن اگر اس وضو کے دوران میں آپ مختلف اعضا دھونے کے ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر بھی کرتے رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے یہ وضو اللہ سے غفلت کی حالت میں نہیں کیا اس لیے آپ کے اس وضو کی قدر و قیمت ہی کچھ اور ہو گئی۔

یہی مثال روزے کی ہے۔ اگر آپ سحری کا وقت ختم ہونے سے لے کر افطار کے وقت تک کچھ کھائیں پئیں نہیں تو آپ کا

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۰۷-۱۰۸، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

روزہ مکمل ہو جائے گا۔لیکن اس روزے کے دوران میں اگر آپ خدا کو یاد بھی کرتے رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اس روزے کے اجر اور قدر و قیمت کو بہت زیادہ بڑھا لیا۔دوسرے الفاظ میں روزے کے دوران میں غفلت کے ساتھ وقت گزارنے اور اس کے برعکس اللہ کو یاد کرتے ہوئے وقت گزارنے میں اجر و مقبولیت کے لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہے......پھر دیکھیے کہ جب روزہ ختم ہو جاتا ہے تو آپ کو حق پہنچتا ہے کہ آپ فوراً ایک کھجور یا افطاری کی کوئی چیز اٹھائیں اور کھا لیں۔لیکن افطار کرتے وقت بھی اگر آپ اللہ تعالیٰ کو یاد کر رہے ہیں اور اس سے پہلے کہ آپ اپنے منہ میں کوئی چیز رکھیں آپ کہتے ہیں کہ خدایا تیرے ہی لیے میں نے روزہ رکھا اور تیرے ہی دیے ہوئے رزق پر اسے افطار کر رہا ہوں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے غفلت کی حالت میں بھوکے پیاسے نہیں رہے اور نہ روزہ افطار کرتے وقت ہی اس کی یاد سے غافل ہو گئے۔بلکہ ہر لحظہ آپ نے اس کی یاد کو تازہ رکھا۔اس طرح گویا آپ نے اپنے اس روزے کے اجر کو کئی گنا بڑھا لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طریقہ بھی یہی تھا اور اسی کی آپ ؐ نے لوگوں کو تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ کی ایک عبادت کرتے ہوئے دوسری عبادتیں بھی ساتھ ساتھ شامل ہو جائیں تو خود اس عبادت کی قدر و قیمت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۰-۱۱۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قاعدہ تھا کہ جب آپ ؐ روزہ افطار کرتے تو فرماتے :

ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ۔[۱] (ابوداود) تشنگی دور ہوگئی اور رگیں تر ہوگئیں اور اجر ثابت ہوگیا، اگر اللہ چاہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۹)

حضرت معاذ بن زہرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب روزہ افطار کرتے تھے، تو فرماتے تھے :

اَللّٰهُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ [۲] (رواہ ابوداؤد مرسلاً) اے اللہ! تیرے ہی لیے میں نے روزہ رکھا، اور تیرے ہی رزق پر میں نے افطار کیا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۰)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۰۸-۱۰۹، اشاعت دوم۔
۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۰۹-۱۱۰، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

روزے میں جائز اور ناجائز امور

اس [فصل] میں یہ بتایا گیا ہے کہ روزے کو پاک اور درست رکھنے کے لیے کیا کیا احتیاطیں ضروری ہیں اور اسے کن کن چیزوں سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ مزید برآں کون سی چیزیں ایسی ہیں، جن کا کرنا روزے کی حالت میں جائز ہے اور ان سے روزے میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی۔

(کتاب الصوم، جولائی ۱۹۸۰ء، ص ۱۱۶)

روزے کا قانون

روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب طلوع سحر کی پہلی علامات ظاہر ہوتے ہی آدمی پر یکا یک کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب تک پورے دن حرام رہتا ہے۔ اس دوران میں پانی کا ایک قطرہ اور خوراک کا ایک ریزہ تک قصداً حلق سے اتارنے کی اجازت نہیں ہوتی اور زوجین کے لیے ایک دوسرے سے قضائے شہوت کرنا بھی حرام ہوتا ہے۔ پھر شام کو ایک خاص وقت آتے ہی اچانک حرمت کا بند ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ سب چیزیں جو ایک لمحہ پہلے تک حرام تھیں یکا یک حلال ہو جاتی ہیں اور رات بھر حلال رہتی ہیں، یہاں تک کہ دوسرے روز کی مقررہ ساعت آتے ہی پھر حرمت کا قفل لگ جاتا ہے۔ ماہِ رمضان کی پہلی تاریخ سے یہ عمل شروع ہوتا ہے اور ایک مہینے تک مسلسل اس کی تکرار جاری رہتی ہے۔ گویا پورے تین دن آدمی ایک شدید ڈسپلن کے ماتحت رکھا جاتا ہے۔ مقررہ وقت تک سحری کرے، مقرر وقت پر افطار کرے، جب تک اجازت ہے اپنی خواہشات نفس پوری کرتا رہے اور جب اجازت سلب کر لی جائے تو ہر اُس چیز سے رک جائے جس سے منع کیا گیا ہے۔

(اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر، اکتوبر ۲۰۰۴ء، ص ۶۷-۶۸)

روزے میں جھوٹ بولنا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی آدمی نے روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس بات کی کوئی حاجت نہیں کہ اس کا کھانا پینا چھڑوا دے کیوں کہ اس نے روزے کے اصل مقصد کو فوت کر دیا۔[1]

البتہ یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ جھوٹ نواقضِ صوم (یعنی روزہ توڑنے والی چیزوں) میں سے نہیں ہے۔ ایک چیز تو وہ ہے جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور دوسری چیز وہ ہے جس سے روزے کے حسن وخوبی (quality) میں خرابی واقع ہوتی ہے، مثلاً

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۱۹-۱۲۰، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ اخلاقی برائیاں ہیں جن کے ارتکاب میں روزے کی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ لیکن ان سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۳)

[روزے میں] محض بھوکا اور پیاسا رہنا عبادت نہیں ہے بلکہ اصل عبادت کا ذریعہ ہے اور اصل عبادت ہے خوف خدا کی وجہ سے خدا کے قانون کی خلاف ورزی نہ کرنا، اور محبت الٰہی کی بنا پر ہر اس کام کے لیے شوق سے لپکنا جس میں محبوب کی خوشنودی ہو، اور نفسانیت سے بچنا، جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اس عبادت سے جو شخص غافل رہا، اس نے خواہ مخواہ اپنے پیٹ کو بھوک و پیاس کی تکلیف دی اللہ تعالیٰ کو اس کی حاجت کب تھی کہ بارہ چودہ گھنٹے کے لیے اس سے کھانا پینا چھڑا دیتا۔

(خطبات، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۶)

بھول کر کھانا پینا

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو روزہ دار بھولے سے کھالے یا پی لے تو اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرے کیوں کہ دراصل اللہ تعالیٰ نے اس کو کھلا پلا دیا۔[۱]

اگر آدمی بھولے سے پیٹ بھر کر کھالے یا گلاس بھر پانی یا کوئی اور چیز پی لے تب بھی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ لیکن جس وقت اسے یاد آجائے اسی وقت اپنا ہاتھ روک لے کیوں کہ اگر اس کے بعد ایک بھورایا ایک قطرہ بھی اس کے حلق سے گزر گیا تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا۔ معلوم ہوا کہ بھولے سے اگر آدمی کوئی کام ایسا کر جائے جو روزہ توڑنے والا ہو تو اس سے روزے میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی اور ایسی غلطی کی صورت میں اسے اپنا روزہ ختم نہیں کرنا چاہیے۔

اس سے یہ اصول بھی نکلا کہ بھولے کی غلطی معاف ہے اور شریعت اس اصول کو تسلیم کرتی ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۷-۱۲۸)

پچھنے لگوانا

قدیم زمانے میں یہ طریقہ تھا اور آج کل بھی ایسا کیا جاتا ہے کہ بعض طبی ضروریات کی بنا پر جسم کے کسی حصے پر کسی تیز دھار آلے یا نشتر سے ہلکے ہلکے شگاف دیے جاتے ہیں جن سے خون رسنے لگتا ہے اور پھر سینگی سے اس کو چوسا جاتا ہے، اسے پچھنے لگانا کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا احرام اور روزے کی حالت میں ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟ [حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے ہیں اس حالت میں کہ آپؐ احرام کی حالت میں تھے اور اس حالت میں کہ آپؐ روزے سے تھے۔[۲] (بخاری و مسلم)]

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۲۹-۱۳۵، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۲۴-۱۲۶، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس حدیث سے پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ احرام کی حالت میں پچھنے لگوائے جاسکتے ہیں۔البتہ شرط یہ ہے کہ پچھنے لگاتے وقت کوئی بال نہ کٹے، اگر بال کٹے گا تو احرام میں خرابی واقع ہو جائے گی۔دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ روزے کی حالت میں بھی پچھنے لگوائے جاسکتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ پچھنے لگانے کی اجازت کے بارے میں احادیث میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔اس اختلاف کی بنا پر امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ پچھنے لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔لیکن امام احمدؒ اس بات کے قائل ہیں کہ پچھنے لگانے سے، پچھنے لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے ان کا استدلال ایک دوسری حدیث کی بنیاد پر ہے، البتہ پیش نظر حدیث میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے یہ الفاظ بالکل واضح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود روزے کی حالت میں پچھنے لگوائے۔اس سے ظاہر ہے کہ اگر پچھنے لگوانے سے روزہ ٹوٹتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہ کرتے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص۱۲۶-۱۲۷)

حضرت شداد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقیع کے مقام پر تشریف لے گئے تو وہاں دیکھا کہ ایک شخص پچھنے لگوا رہا ہے۔آپؐ اس وقت میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور اس دن رمضان کی اٹھارہویں تاریخ تھی۔آپؐ نے فرمایا کہ پچھنے لگانے والے اور پچھنے لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔(ابو داؤد، ابن ماجہ، دارمی)

امام احمد بن حنبلؒ نے اسی حدیث کو قبول کیا ہے اور اسی کی بنیاد پر وہ اس بات کے قائل ہیں کہ روزے کی حالت میں پچھنے لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔بعض لوگوں کے نزدیک امام احمد بن حنبلؒ نے اس حدیث کو اس بنا پر قبول کیا ہے کہ پچھنے لگوانے میں اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ جس شخص کے پچھنے لگائے جائیں اس کو خون نکلنے سے اتنی کمزوری لاحق ہو جائے کہ وہ آخر کار روزہ کھولنے پر مجبور ہو جائے۔اس طرح جو شخص سینگی سے خون چوستا ہے اس کے لیے بھی اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ خون چوستے چوستے کہیں کوئی قطرہ اس کے حلق میں نہ چلا جائے اور وہ روزہ توڑ بیٹھے۔

لیکن اس حدیث کے بارے میں دوسری روایات سے جو تفصیلات معلوم ہوئی ہیں ان کے مطابق جس واقعہ کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے وہ فتح مکہ کے زمانے کی بات ہے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پچھنے لگواتے ہوئے دیکھا تھا وہ حجۃ الوداع کے موقع کی بات ہے، جو یقیناً بعد کے زمانے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔اسی لیے فقہا کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ چوں کہ اس معاملے میں حضرت عبداللہؓ بن عباس کا مشاہدہ ترتیب زمانی کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک بعد کے عمل کو ظاہر کرتا ہے اس لیے اس معاملے میں آخری حکم یہ ہے کہ پچھنے لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، اور امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص۱۴۰-۱۴۱)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص۱۴۵-۱۴۸۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جناب ثابت بنانیؒ (جو تابعی ہیں) بیان کرتے ہیں کہ حضرت انسؓ بن مالک سے پوچھا گیا کہ کیا آپ لوگ (یعنی صحابہ کرامؓ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں روزہ دار کے لیے پچھنے لگوانے کو مکروہ سمجھتے تھے؟ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ نہیں، البتہ اس وجہ سے پرہیز کرتے تھے کہ اس سے ضعف لاحق ہو جاتا ہے۔[۱] (بخاری)

معلوم ہوا کہ چونکہ پچھنے لگوانے سے کمزوری لاحق ہو جاتی ہے اور اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ اس سے کوئی ایسی ناقابل برداشت تکلیف ہو جائے جس سے روزہ توڑنا پڑ جائے تو اس بنا پر صحابہ کرامؓ پچھنے لگوانے سے پرہیز کرتے تھے، لیکن وہ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ بجائے خود پچھنے لگوانے سے روزے میں کوئی خرابی واقع ہو جاتی ہے......

امام بخاری تعلیقاً (یعنی سند کے حوالے کے بغیر) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ روزے کی حالت میں پچھنے لگوایا کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا اور رات کو پچھنے لگوانے لگے''۔[۲] (بخاری)

......اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر روزے میں پچھنے لگوانا مکروہ ہوتا یا اس سے روزے میں کوئی خرابی واقع ہوتی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایسا نہ کرتے۔ بعد میں انھوں نے دن کو پچھنے لگوانے کا طریقہ چھوڑ کر رات کو پچھنے لگوانے کا طریقہ اس لیے اختیار کیا کہ عمر میں اضافے سے وہ دن کے وقت پچھنے لگوانے سے کمزوری محسوس کرنے لگے تھے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۶-۱۴۸)

بیویوں کے پاس جانا

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْـَٔانَ بَٰشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَٰشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَٰكِفُونَ فِي الْمَسَٰجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ ءَايَٰتِهِۦ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ○ (البقرۃ ۲:۱۸۷) تمھارے لیے روزوں کے زمانے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے۔ اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم چپکے چپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے، مگر اُس نے تمھارا قصور معاف کر دیا اور تم سے درگزر فرمایا۔ اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو لطف اللہ نے تمھارے لیے جائز کر دیا ہے، اسے حاصل کرو۔ نیز راتوں کو کھاؤ پیو یہاں تک کہ تم کو سیاہی شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آ جائے۔ تب یہ سب کام چھوڑ کر رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔ اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو، تو بیویوں

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۵۵، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۵۶، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لیے بہ صراحت بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ وہ غلط رویے سے بچیں گے۔

فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ (البقرہ ۲:۱۸۷) اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو لطف اللہ نے تمھارے لیے جائز کر دیا ہے، اُسے حاصل کرو۔

ابتدا میں اگر چہ اس قسم کا کوئی صاف حکم موجود نہ تھا کہ رمضان کی راتوں میں کوئی شخص اپنی بیوی سے مباشرت نہ کرے، لیکن لوگ اپنی جگہ یہی سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ پھر اس کے ناجائز یا مکروہ ہونے کا خیال دل میں لیے ہوئے بسا اوقات اپنی بیویوں کے پاس چلے جاتے۔ یہ گویا اپنے ضمیر کے ساتھ خیانت کا ارتکاب تھا اور اس سے اندیشہ تھا کہ ایک مجرمانہ اور گناہ گارانہ ذہنیت اُن کے اندر پرورش پاتی رہے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے اس خیانت پر تنبیہ فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ فعل تمھارے لیے جائز ہے۔ لہٰذا اب اسے برا فعل سمجھتے ہوئے نہ کرو، بلکہ اللہ کی اجازت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے قلب وضمیر کی پوری طہارت کے ساتھ کرو۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۴۵، البقرہ، حاشیہ ۱۹۱)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا ایک روزے دار کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ اختلاط (یعنی میل جول) کی اجازت ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس کی اجازت دے دی۔ پھر ایک دوسرا شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بھی یہی بات دریافت کی تو آپؐ نے اسے اس چیز سے منع کر دیا...... جس شخص کو آپؐ نے اجازت دی وہ سن رسیدہ آدمی تھا اور جس کو منع کیا وہ جوان آدمی تھا۔[1] (ابوداؤد)

ظاہر بات ہے کہ سن رسیدہ آدمی پر جذبات کا اتنا غلبہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے۔ لیکن جوان آدمی بسا اوقات ضبط نہیں کر سکتا، اس لیے اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ وہ روزہ توڑ بیٹھے اور ایک مشکل میں مبتلا ہو جائے۔ چنانچہ اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ احتیاط برتے اور اختلاط سے پرہیز کرے۔

اس حدیث میں واضح طور پر یہ بات بتائی گئی ہے کہ اگرچہ یہ کام جائز ہے اور یہ آخری حد ہے جس تک آدمی روزے کی حالت میں جا سکتا ہے۔ لیکن جو آدمی ضبط نہ کر سکتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اس سے پرہیز کرے البتہ جو شخص اپنے اوپر پورا قابو رکھتا ہو وہ اس رخصت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۳-۱۳۵)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۳۵-۱۳۶، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بیوی سے میل جول کے حدود

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے کی حالت میں بیوی سے اختلاط (میل جول) کرلیا کرتے تھے اور حضورؐ تم سب سے بڑھ کر اپنی خواہشات پر قابو رکھنے والے تھے۔[۱] (متفق علیہ)

مراد یہ ہے کہ روزے میں جنسی عمل کے سوا باقی ہر طرح کا میل جول اور اختلاط جائز ہے۔ یہ تو ہے اصل قانون، البتہ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے اس بات کی وضاحت فرما دی کہ اس اجازت سے کس قسم کے آدمی کے لیے فائدہ اٹھانا درست ہے...... [اور] فرمایا کہ حضورؐ تم سب سے بڑھ کر اپنی خواہشات پر قابو رکھنے والے تھے۔ مراد یہ ہے کہ اگر تم میں سے کسی شخص کو اپنی ذات پر پورا قابو ہو تو وہ اس اجازت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن جس شخص کو اتنا قابو نہ ہو اُس کو اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۴)

[اس طرح کی] احادیث کی تشریح وتوضیح سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے تاکہ ان کے مطالعے کے دوران میں کسی طرح کی خلش یا شبہات پیدا نہ ہوں۔

یہ بات کہ کن چیزوں سے روزے میں خرابی پیدا ہوتی ہے اور کن چیزوں سے نہیں ہوتی اور کیا کیا کام ایسے ہیں جن کے کرنے کی اجازت ہے اور کیا کام ایسے ہیں جن کے کرنے کی اجازت نہیں ہے اس کے بیان میں بعض بڑے نازک مسائل بھی آتے ہیں۔ خصوصاً وہ مسائل جو آدمی کی خلوت کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ آدمی کی زندگی کا ایک ایسا لازمی حصہ ہیں جس سے کوئی انسان بھی بری نہیں ہے اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ روزے کی حالت میں انسان اپنی اس زندگی میں کہاں تک جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اگر وضاحت کے ساتھ اس کا جواب نہ دیا جاتا تو آدمی ہر وقت ایک خلجان اور پریشانی میں مبتلا رہتا۔ علاوہ بریں اس غرض کے لیے بھی یہ ناگزیر تھا کہ اس سلسلے کی ضروری معلومات اور رہنمائی وہ ہستیاں فراہم کریں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت کی زندگی سے واقفیت حاصل تھی، یعنی ازواجِ مطہرات۔ طالبانِ رُشد وہدایت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ حضور کی اندرونِ خانہ کی زندگی کے متعلق ضروری معلومات اور رہنمائی ازواجِ مطہرات سے حاصل کریں اور ازواجِ مطہراتؓ کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ ضروری معلومات اور ہدایات ان کو بہم پہنچائیں کیوں کہ وہ اس ہستی کی بیویاں تھیں جس کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے پیدا کیا تھا اور جس کی زندگی کو انسانیت کے لیے کامل نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک اہم سبب تھا جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہراتؓ کو اُمت کی مائیں (امہات المومنین) قرار دیا تاکہ ان کی اس نازک حیثیت کے مطابق ان کا ضروری ادب واحترام ملحوظ وبرقرار رہے اور اُمت کو یہ بتا دیا گیا کہ اگر ان کے متعلق تم دل میں بھی کوئی برا خیال لاؤ گے تو تمھارا ایمان ختم ہو جائے گا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۰-۱۲۱)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۲۱-۱۲۲، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حالتِ جنابت میں روزہ شروع کرنا

رمضان کے زمانے میں بعض اوقات یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کو رات کے وقت جنابت لاحق ہو تو کیا اس کے لیے یہ لازم ہے کہ سحری بند ہونے اور روزہ شروع ہونے سے پہلے پہلے نہا لے یا اس بات کی اجازت ہے کہ وہ سحری کا وقت ختم ہونے اور روزہ شروع ہونے کے بعد نہا لے؟ اس سوال کا جواب اس حدیث سے ملتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فجر کا وقت آ گیا اور روزہ شروع ہونے کے بعد آپ نے غسل فرمایا۔ پھر اس کی وضاحت بھی فرما دی کہ یہ غسل وہ نہیں تھا جو خواب میں لاحق ہونے والی جنابت سے لازم آتا ہے۔[۱] معلوم ہوا کہ اس طرح کی حالت میں روزہ شروع کیا جا سکتا ہے اور اس سے روزے میں کوئی خرابی یا قباحت واقع نہیں ہوتی۔

اب ذرا غور کیجیے کہ اگر یہ بات حضرت عائشہؓ بیان نہ فرماتیں تو مسلمانوں کو کیسے معلوم ہوتی اور اگر معلوم نہ ہوتی تو انھیں اپنی پرائیویٹ زندگی میں کیسی دقتیں اور الجھنیں پیش آتیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپؐ کے گھر والوں کی ایک بہت بڑی قربانی تھی کہ انھوں نے زندگی کے اس پہلو تک کو لوگوں سے چھپا کر نہیں رکھا بلکہ اس کے متعلق ضروری معلومات دیں تاکہ لوگوں کو زندگی کے اس پہلو کے متعلق رہنمائی مل سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بڑا عظیم الشان ایثار تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کے گھر والوں نے کیا۔

آج کچھ بے وقوف ایسے بھی ہیں جو اس چیز کے متعلق اعتراض کرتے ہیں کہ حدیث میں یہ کیسی باتیں آ گئی ہیں جو ازواج مطہرات نے بیان فرمائی ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر مومنین کی مائیں امت کو یہ باتیں نہ بتاتیں تو امت کو ان چیزوں کی متعلق ہدایات کہاں سے ملتیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۵-۱۲۶)

قے آنا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو قے خود بخود آ جائے اس حالت میں کہ وہ روزے سے ہو تو اس پر کوئی قضا نہیں اور جو شخص عمداً قے کرے، اسے چاہیے کہ قضا ادا کرے۔[۲] (ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ، دارمی)

اگر کسی شخص کو خود بخود قے آ جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے عمداً روزہ نہیں توڑا ہے اس لیے اس کا حکم وہی ہے جو بھولے سے کھا لینے والے کا ہے۔ بھولے سے اگر کوئی شخص پیٹ بھر کر بھی کھا لے تب بھی اس پر کوئی قضا نہیں۔ قضا صرف اس

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۳۷-۱۳۸، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۱۱۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صورت میں ہوگی جب کہ اس نے عمداً ایسا کیا ہو۔ اسی طرح کوئی شخص اگر قصداً قے کرے تو اس صورت میں اس پر قضا لازم آئے گی، لیکن اگر اس کے پیٹ میں کوئی ایسی تکلیف ہو جس کی وجہ سے اُسے خود بخود قے آجائے تو چاہے قے پوری طرح سے منہ بھر کر آئے یا کئی مرتبہ آئے، اس سے اس کا روزہ نہیں ٹوٹے گا اور نہ قضا لازم آئے گی۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۵-۱۳۶)

آنکھ میں سرمہ اور کان میں دوائی ڈالنا

حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کی کہ میری آنکھوں میں تکلیف ہے، کیا میں روزے کی حالت میں سرمہ لگالوں؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں لگالو۔[1] (ترمذی)

یہ روایت ضعیف ہے تاہم اگر اس کو صحیح مانا جائے تو اس سے صرف اتنی گنجایش نکلتی ہے کہ سرمہ لگایا جاسکتا ہے کیونکہ وہ ایک ذرا سی چیز ہوتی ہے لیکن اس سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ آنکھ میں باقاعدہ دوائی ٹپکانی بھی جائز ہے کیونکہ آنکھ اور حلق کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اگر آپ کوئی رنگین دوا آنکھ میں ڈالیں تو تھوڑی دیر کے بعد اس کا رنگ آپ کے حلق میں آجائے گا اور تھوکنے سے تھوک بھی اسی رنگ کا نکلے گا۔

آنکھ کے برعکس کان میں دوا ڈالنا جائز ہے کیونکہ کان اور حلق کے درمیان ایسا پردہ ہوتا ہے جس سے دوا نہیں گزر سکتی۔ اگر کان کو دوا سے بھر بھی دیا جائے تب بھی کان کے پردے سے دوا کی ذرا سی نمی بھی حلق میں نہیں پہنچے گی، جب کہ آنکھ میں دوا ڈالنے سے فوراً حلق میں پہنچ جاتی ہے۔ چوں کہ بعض لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے اس لیے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کان چونکہ گہرا ہوتا ہے اور اس پر بظاہر جوف کا اطلاق ہوسکتا ہے اسی لیے اس میں دوائی ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، لیکن آنکھ میں دوا ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، حالاں کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

اصل میں یہ مسئلہ فقہ کا نہیں ہے بلکہ طب کا ہے۔ اگر ایک آدمی علم الاعضا (فزیالوجی) سے واقف ہو تو وہ اسے بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۸)

نہانا اور سر پر پانی ڈالنا

اگر آپ پانی کے ٹب (یا کسی نہر وغیرہ) میں اس طرح بیٹھے رہیں کہ آپ کا سارا جسم اس میں بھیگتا رہے اور آپ سر پر بھی بار بار پانی ڈالتے رہیں تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ چاہے یہ عمل کتنی دیر تک ہوتا رہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ پانی میں بیٹھے رہنے یا

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۴۲-۱۴۳، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہانے سے گرمی کی تکلیف اور پیاس کی شدت میں کمی واقع ہوگی لیکن یہ روزہ توڑنے والی چیز نہیں ہے۔ البتہ اگر آپ حلق سے پانی کا ایک قطرہ بھی گزار دیں گے تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔

عَنْ بَعْضِ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ لَقَدْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْعَرْجِ يَصُبُّ عَلٰى رَأْسِهِ الْمَآءَ وَهُوَ صَائِمٌ مِنَ الْعَطْشِ اَوْ مِنَ الْحَرِّ[1] (رواہ مالک وابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرج[2] کے مقام پر دیکھا کہ آپؐ پیاس کی وجہ سے یا گرمی کی شدت کی وجہ سے سر پر پانی ڈال رہے ہیں اور اس وقت آپؐ روزے سے تھے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۹)

بھڑ کے کاٹنے سے روزے کا حکم

بھڑ کے کاٹنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اس کی حیثیت ایک ایسے حادثے کی ہوتی ہے جس سے روزہ متاثر نہیں ہوتا...... جس طرح اس کے باوجود روزہ قائم رہتا ہے کہ آپ بھولے سے کچھ کھا پی لیتے ہیں اسی طرح بھڑ کے کاٹنے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔

(۵-اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۳۲-۳۳)

بیماری یا تکلیف میں روزہ توڑنا

..........اگر معالج کہہ دے کہ روزہ جاری رکھنے کی صورت میں جان کا خطرہ ہے، یا انسان خود یہ بات محسوس کرلے تو روزہ توڑا جاسکتا ہے.......... ایسے روزے کا کفارہ نہیں قضا ہوتی ہے۔ انسان جب تندرست ہوجائے تو روزے پورے کرے۔

(۵-اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۱۰۸)

س: بعض کام بڑی مشقت اور محنت کے ہوتے ہیں، کیا رمضان المبارک میں ایسے کام کرنے والوں کو اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ روزے نہ رکھیں؟

ج: ہم نے آگ برساتی ہوئی دھوپ میں ہل چلاتے کسان کو روزہ رکھتے دیکھا ہے، جن دنوں ریل کے انجن میں پتھر کا کوئلہ استعمال کیا جاتا تھا، ان دنوں شدید گرمی اور لو کے عالم میں کوئلہ جھونکنے والا فائر مین اور ڈرائیور بھی روزے سے ہوتا تھا۔ جب یہ اللہ کے بندے روزہ رکھ سکتے ہیں تو دوسرے کیوں نہیں رکھ سکتے؟ فی الحقیقت ایسے معاملات میں اصل چیز انسان کی اپنی لگن اور اس کا عزم ہوتا ہے۔ رکاوٹوں اور مشکلات کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔

(۵-اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۲)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۴۴، ص ۱۴۵، اشاعت دوم۔

۲- مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک صاحب کا سوال تھا:

مولانا! روزے کی حالت میں آدمی کسی شدید تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو کیا اس کے لیے روزہ توڑنا جائز ہے؟

مولانا نے فرمایا: اگر تکلیف ناقابل برداشت ہو جائے یا ڈاکٹر اسے بتا دے کہ جان جانے کا خطرہ ہے تو روزہ توڑنا جائز ہے۔ ان صاحب نے کہا: بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر ایسی حالت میں انسان روزہ نہ توڑے اور جان دے دے تو اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔

مولانا نے فرمایا: ایسا نہیں ہوتا بلکہ شریعت کی رو سے انسان گناہ گار قرار پاتا ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ ہمیں انسانی جان کے معاملے میں وہی معیار سامنے رکھنا چاہیے اور مومن کی زندگی کو وہی اہمیت دینی چاہیے جو خود اسلام دیتا ہے۔ شریعت کا حکم ہے کہ جان پر آ بنے یا تکلیف برداشت سے باہر ہو جائے تو روزہ توڑنے میں کوئی حرج نہیں۔

(۵- اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۲۱۰)

تھوک نگلنا اور مصطگی وغیرہ چبانا

جناب عطاءؒ (جو مشہور تابعی اور بہت بڑے فقیہ ہیں) مسئلہ بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص (روزے کی حالت میں) کُلی کرے اور منہ سے پانی بالکل نکال دے تو اس کے لیے اپنا تھوک نگلنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور وہ بھی [جو کچھ اس کے منہ میں بچ رہا ہو (یعنی اس پانی کا اثر)]۔ اور وہ (شخص) روزے کی حالت میں مصطگی نہ چبائے کیونکہ اگر اس کا اثر اس کے تھوک میں رہا اور اس نے تھوک نگلا تو میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس شخص کا روزہ ٹوٹ جائے گا لیکن اس چیز سے روکا جاتا ہے۔[۱] (بخاری)

......اگر آدمی روزے میں کلی کرے اور منہ سے پانی نکال دینے کے بعد بھی اس کا اثر باقی رہے تو تھوک نگلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا...... ظاہر بات ہے کہ جب آدمی کلی کرتا ہے تو پانی سے اس کے منہ میں کچھ تری پیدا ہوتی ہے اور پانی پوری طرح نکال دینے کے باوجود اس کا کچھ نہ کچھ اثر تھوک کے ساتھ اندر جاتا ہے لیکن یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہو ......البتہ اگر کوئی شخص قصداً کچھ پانی منہ میں بچا کر رکھے اور اسے تھوک کے ساتھ نگل لے تو ظاہر بات ہے کہ اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا۔

پھر یہاں مصطگی نہ چبانے کے بارے میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے اسی سے منجن یا ٹوتھ پیسٹ وغیرہ کا حکم بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ جس طرح ایک آدمی منہ سے پانی لے کر نکال دیتا ہے اسی طرح وہ منجن لگاتا ہے یا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتا ہے اور اس کے بعد پوری کوشش کے ساتھ منہ کو خوب صاف کر لیتا ہے تو اس پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا روزہ ٹوٹ گیا لیکن آدمی کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

پانی تو ایک ایسی چیز ہے کہ یہ تھوک کے ساتھ مل کر پوری طرح سے نکل جاتا ہے۔ لیکن دوسری چیزیں چوں کہ کچھ نہ کچھ گاڑھی

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۵۷-۱۵۹، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوتی ہیں اس لیے اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ پوری کوشش کے باوجود منہ میں لگی رہ جائیں اور روزے میں خرابی کی باعث بنیں.......... البتہ مسواک کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیوں کہ مسواک کے متعلق تو یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے میں مسواک فرمایا کرتے تھے.......... پھر اگرچہ مسواک بھی کچھ نہ کچھ چبائی جاتی ہے اور اس کا رس نکلتا ہے لیکن اس رس میں ایسا گاڑھا پن نہیں ہوتا ہے جس کے منہ میں چمٹ کر رہ جانے کا خطرہ ہو، اس لیے مسواک کے بارے میں کسی طرح کا تذبذب لاحق نہیں ہوتا.......... البتہ دوسری چیزوں کو اس پر قیاس کرنا درست نہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۸-۱۵۰)

انجکشن لگوانا

ایک صاحب پوچھنے لگے: روزے میں انجکشن لگوانا کیسا ہے؟

مولانا نے جواب دیا: میری رائے میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ صاحب کہنے لگے: بعض علما تو روزے کی حالت میں انجکشن کی اجازت دیتے ہیں!

مولانا نے فرمایا: ہاں، مگر میں اسے صحیح نہیں سمجھتا کیونکہ انجکشن کے ذریعے تو انسانی جسم میں بہت سی ایسی چیزیں داخل کی جاسکتی ہیں جو اس کے لیے غذا کی حیثیت رکھتی ہیں مثلاً گلوکوز، پانی یا دیگر قوت بخش اجزا۔ اگر یہ جائز رکھا جائے تو پھر انجکشن کے ذریعے روزے دار کو باقاعدہ غذا پہنچائی جاسکتی ہے اس طرح روزے کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔

انھوں نے کہا: مولانا! وہ کہتے ہیں کہ ایسے انجکشن جن میں غذائی اجزا شامل ہوں، ان کی اجازت نہیں، باقی لگوائے جاسکتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا: ہاں! مگر ان کے درمیان لکیر کہاں سے کھینچیں گے اور کس طرح ایسی فہرستیں بنائیں گے کہ فلاں فلاں اور فلاں قسم کے انجکشن جائز ہیں اور فلاں فلاں ناجائز ہیں، جب کہ نت نئے انجکشن منظر عام پر آتے رہیں گے۔ اس لیے میری رائے میں صحیح طریقہ یہی ہے کہ جو لوگ انجکشن لگوانا چاہیں وہ روزہ رکھنے تک درمیانی وقفے میں بآسانی لگوا سکتے ہیں۔ اور اگر ایسی ہی مجبوری ہو کہ انجکشن روزے کے اوقات میں لگوانا ضروری ہو تو ان کے لیے گنجایش ہے کہ وہ انجکشن لگوا لیں اور روزہ بعد میں قضا کرلیں۔

ایک اور صاحب نے کہا: مولانا! روزے میں بلڈ ٹیسٹ کے لیے خون دینے میں تو کوئی حرج نہیں؟

مولانا نے فرمایا: نہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔

(۵-اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۳-۱۳۴)

❁ ❁ ❁

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل پنجم

روزہ اور سفر

مسافر کے لیے روزے کے احکام

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت حمزہ بن عمرو سلمیؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں سفر کی حالت میں روزہ رکھ لوں؟..........اور حضرت حمزہؓ کثرت سے روزے رکھا کرتے تھے..........رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارا جی چاہے تو روزہ رکھ لو، اور نہ جی چاہے تو نہ رکھو۔[1] (متفق علیہ)

حضرت عائشہؓ نے یہ روایت بیان کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت بھی فرمادی ہے کہ سائل کیسا آدمی تھا کیوں کہ وہ بہت بڑے درجے کی فقیہہ تھیں اس لیے قانونی باریکیاں ان کی نگاہ میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے واضح فرمادیا کہ حضرت حمزہؓ جنھوں نے سوال کیا تھا، کثرت سے روزے رکھنے کے عادی تھے۔ یہاں ان کا یہ سوال نفلی روزے کے بارے میں نہیں تھا بلکہ فرض روزے کے بارے میں تھا کہ اگر رمضان میں مجھے سفر پیش آ جائے تو کیا حالتِ سفر میں مجھے روزہ رکھنا چاہیے یا نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمھیں اس بات کا اختیار ہے کہ چاہے سفر میں روزہ رکھو، چاہے نہ رکھو۔

حضرت عائشہؓ نے اس وضاحت سے کہ حضرت حمزہ بن عمروؓ کثرت سے روزہ رکھنے کے عادی تھے دراصل یہ بات بتائی ہے کہ اگر ایک آدمی سال کے دوران میں بکثرت روزے رکھنے کا عادی ہو تو اُسے عام آدمیوں کی بہ نسبت روزے کی سختی کو برداشت کرنے کی زیادہ عادت اور مشق ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسا آدمی حالتِ سفر میں بھی روزہ رکھے تو وہ دورانِ سفر میں روزے سے پیش آنے والی سختی کو اس آدمی کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے برداشت کر لیتا ہے جو صرف رمضان ہی میں روزے رکھنے کا عادی ہو۔

حضرت عائشہؓ کی اس وضاحت کی روشنی میں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اس اختیار میں ایسی مساوات نہیں ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا یا چھوڑنا دونوں بالکل مساوی درجے کے کام ہوں، بلکہ اس میں یہ دیکھنا ہوگا کہ کس آدمی میں تحمل کی زیادہ طاقت ہے اور کس آدمی میں کم ہے۔ اگر کسی آدمی میں تحمل کی طاقت زیادہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ سفر میں روزہ رکھے لیکن اگر کسی آدمی میں یہ طاقت کم ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے۔

اسی طرح یہ بات سفر کے حالات پر بھی موقوف ہے کہ کیسے حالات میں آدمی کے لیے روزہ رکھنا افضل ہے اور کیسے

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۶۰-۱۶۳، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حالات میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ فقہا کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے ــــــ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ سفر کی حالت میں روزہ رکھنے کو افضل قرار دیتے ہیں اور نہ رکھنے کو اس سے کم درجے کا فعل قرار دیتے ہیں۔ بعض دوسرے فقہا روزہ نہ رکھنے کو افضل قرار دیتے ہیں اور بعض نے وہی تصریح کی ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے کہ یہ چیز آدمی اور اس کے حالات اور سفر کی نوعیت پر منحصر ہے کہ اس کے لیے روزہ رکھنے یا چھوڑنے میں سے کون سی صورت افضل ہے۔ اگر ایک آدمی کی قوتِ برداشت زیادہ ہو اور وہ ایسے حالات میں سفر کر رہا ہو جن میں بہت زیادہ مشقت بھی پیش آنے کا خدشہ نہ ہو تو اس صورت میں اس کے لیے روزہ رکھنا افضل ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ایک آدمی کی قوتِ برداشت کم ہو اور اسے سفر میں بھی ایسے حالات پیش آنے کا خطرہ ہو جن میں روزے کی سختی برداشت کرنا مشکل ہو جائے تو اس صورت میں اس کے لیے روزہ نہ رکھنا ہی صحیح ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۵۱-۱۵۳)

[قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:]

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ ۲:۱۸۴) لیکن اگر تم سمجھو، تو تمھارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔

یہاں تک وہ ابتدائی حکم ہے، جو رمضان کے روزوں کے متعلق سن ۲ ہجری میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوا تھا۔ اس کے بعد کی آیات اس کے ایک سال بعد نازل ہوئیں اور مناسبتِ مضمون کی وجہ سے اسی سلسلۂ بیان میں شامل کر دی گئیں۔

وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ (البقرہ ۲:۱۸۵) اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔

سفر کی حالت میں روزہ رکھنا یا نہ رکھنا آدمی کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو صحابہؓ سفر میں جایا کرتے تھے، اُن میں سے کوئی روزہ رکھتا تھا اور کوئی نہ رکھتا تھا اور دونوں گروہوں میں سے کوئی دوسرے پر اعتراض نہ کرتا تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کبھی سفر میں روزہ رکھا ہے اور کبھی نہیں رکھا ہے۔ ایک سفر کے موقع پر ایک شخص بدحال ہو کر گر گیا اور اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر دریافت فرمایا: کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا گیا: روزے سے ہے۔ فرمایا: یہ نیکی نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۴۲، البقرہ، حاشیہ ۱۸۶)

جن فقہا کے نزدیک سفر میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے ان کا استدلال اس حدیث سے ہے۔ لیکن اس حدیث سے اس بات کی وضاحت نہیں ہوتی کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں ہر حالت میں سفر میں روزہ رکھنے کو نیکی کے خلاف قرار دیا ہے یا آپؐ کا ارشاد خاص حالات کے ساتھ مخصوص ہے .... یہاں خاص حالت خود سامنے موجود نظر آتی ہے کہ ایک آدمی روزے کی تکلیف سے نڈھال ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سخت گرمی کا زمانہ تھا اور سفر بھی دن کے وقت کیا گیا تھا اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیے اس حالت میں اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ گر گیا۔ چنانچہ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس پر سایہ کرنے لگے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ سفر میں اس حال کا روزہ رکھا جائے..........یعنی اگر کوئی شخص سفر میں روزہ رکھے تو وہ حالات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے اور یہ دیکھے کہ آیا میری طاقت ایسی ہے کہ میں سفر کی تکلیف برداشت کر سکوں گا، اور یہ بھی کہ سفر میں کوئی ایسی غیر معمولی سختی پیش آنے کا خدشہ تو نہیں جو برداشت سے باہر ہو جائے۔ چنانچہ جن حالات میں کوئی شخص اپنے اندر ایسی قوتِ برداشت بھی محسوس نہ کرتا ہو اور سفر بھی زیادہ سخت نظر آ رہا ہو تو اس کا روزہ رکھنا اور پھر تکلیف اٹھانا کوئی نیکی نہیں ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۵۵-۱۵۶)

جہاد کے موقع پر روزہ توڑنے کا حکم

جنگ کے موقع پر تو آپؐ حکماً روزے سے روک دیا کرتے تھے تاکہ دشمن سے لڑنے میں کمزوری لاحق نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو مرتبہ رمضان میں جنگ پر گئے۔ پہلی مرتبہ جنگ بدر میں اور آخری مرتبہ فتح مکہ کے موقع پر۔ اور دونوں مرتبہ ہم نے روزے چھوڑ دیے۔ ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ نے فرمادیا تھا کہ اِنَّهٗ يَوْمُ قِتَالٍ فَاَفْطِرُوْا۔ دوسری روایات میں یہ الفاظ ہیں کہ اِنَّكُمْ قَدْ دَنَوْتُمْ مِنْ عَدُوِّكُمْ فَاَفْطِرُوْا اَقْوٰى لَكُمْ۔ دشمن سے مقابلہ درپیش ہے، روزے چھوڑ دو تا کہ تمھیں لڑنے کی قوت حاصل ہو۔

عام سفر کے معاملے میں یہ بات کہ کتنی مسافت کے سفر پر روزہ چھوڑا جا سکتا ہے، حضورؐ کے کسی ارشاد سے واضح نہیں ہوتی اور صحابہ کرام کا عمل اس باب میں مختلف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ جس مسافت پر عرفِ عام میں سفر کا اطلاق ہوتا ہے اور جس میں مسافرانہ حالت انسان پر طاری ہوتی ہے، وہ افطار کے لیے کافی ہے۔

یہ امر متفق علیہ ہے کہ جس روز آدمی سفر کی ابتدا کر رہا ہو، اُس دن کا روزہ افطار کر لینے کا اُسے اختیار ہے۔ چاہے تو گھر سے کھانا کھا کر چلے اور چاہے تو گھر سے نکلتے ہی کھا لے۔ دونوں عمل صحابہؓ سے ثابت ہیں۔ یہ امر کہ اگر کسی شہر پر دشمن کا حملہ ہو، تو کیا لوگ مقیم ہونے کے باوجود جہاد کی خاطر روزہ چھوڑ سکتے ہیں، علما کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ بعض علما اس کی اجازت نہیں دیتے۔ مگر علامہ ابن تیمیہؒ نے نہایت قوی دلائل کے ساتھ فتویٰ دیا تھا کہ ایسا کرنا بالکل جائز ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۴۲-۱۴۳، البقرۃ، حاشیہ ۱۸۶)

عظیم الشان نعمتِ الٰہی کا شکریہ

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (البقرۃ ۲:۱۸۵) اور جس ہدایت سے اللہ نے تمھیں سرفراز کیا ہے،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اُس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار واعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔

اللہ نے صرف رمضان ہی کے دنوں کو روزوں کے لیے مخصوص نہیں کر دیا ہے، بلکہ جو لوگ رمضان میں کسی عذر شرعی کی بنا پر روزے نہ رکھ سکیں، اُن کے لیے دوسرے دنوں میں اُس کی قضا کر لینے کا راستہ بھی کھول دیا ہے تا کہ قرآن کی جو نعمت اس نے تم کو دی ہے، اس کا شکر ادا کرنے کے قیمتی موقع سے تم محروم نہ رہ جاؤ۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ رمضان کے روزوں کو صرف عبادت اور صرف تقویٰ کی تربیت ہی نہیں قرار دیا گیا، بلکہ انھیں مزید برآں اُس عظیم الشان نعمت ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ بھی ٹھہرایا گیا ہے، جو قرآن کی شکل میں اُس نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دانش مند انسان کے لیے کسی نعمت کی شکر گزاری اور کسی احسان کے اعتراف کی بہترین صورت اگر ہو سکتی ہے وہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار کرے، جس کے لیے عطا کرنے والے نے وہ نعمت عطا کی ہو۔ قرآن ہم کو اس لیے عطا فرمایا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی رضا کا راستہ جان کر خود اس پر چلیں اور دنیا کو اس پر چلائیں۔ اس مقصد کے لیے ہم کو تیار کرنے کا بہترین ذریعہ روزہ ہے۔ لہٰذا نزول قرآن کے مہینے میں ہماری روزہ داری صرف عبادت ہی نہیں ہے اور صرف اخلاقی تربیت بھی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ خود اِس نعمتِ قرآن کی بھی صحیح اور موزوں شکر گزاری ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۴۲-۱۴۳، البقرہ، حاشیہ ۱۸۷)

سفر میں روزہ، ایک دوسرے پر اعتراض

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ لِسِتِّ عَشَرَۃَ مَضَتْ مِنْ شَھْرِ رَمَضَانَ فَمِنَّا مَنْ صَامَ وَ مِنَّا مَنْ اَفْطَرَ فَلَمْ یَعِبِ الصَّائِمُ عَلَی الْمُفْطِرِ وَلَا الْمُفْطِرُ عَلَی الصَّائِمِ[1] (رواہ مسلم) حضرت ابو سعید خدریؓ بیان فرماتے ہیں کہ ہم رمضان کی سولہ تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ کے لیے سفر پر نکلے تو ہم میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو روزے سے تھے اور کچھ ایسے تھے، جو روزے سے نہیں تھے، لیکن نہ تو روزہ داروں نے روزہ نہ رکھنے والوں کو ملامت کی اور نہ روزہ نہ رکھنے والوں نے روزہ داروں پر اعتراض کیا۔

اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص سفر کی حالت میں روزہ نہیں رکھتا یا روزہ رکھتا ہے تو اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی ایسے شخص کو ملامت کرے جس نے اس کے برعکس عمل کیا ہے، کیوں کہ جب شریعت میں دونوں کاموں کا اختیار دیا گیا ہے تو کسی کو کسی پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔

اس معاملے میں شریعت کی اس باریکی کو سمجھ لینا چاہیے جس کی بنا پر حضرت ابو سعید خدریؓ نے یہ واقعہ بیان فرمایا ہے

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۶۴-۱۶۶، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

.........شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شریعت کی رو سے دو متبادل کام کرنے کا اختیار رکھتا ہو اور وہ دونوں برابر کے کام ہوں تو اس صورت میں وہ جو کام بھی کرے اس پر کسی شخص کو اس کے اوپر اعتراض کرنے یا اسے ملامت کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ کیوں کہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس طرح درحقیقت وہ شریعت کے مزاج میں بے اعتدالی کو داخل کرنے بلکہ شریعت سازی کا اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔ شریعت نے تو لوگوں کو برابر کا اختیار دیا تھا لیکن وہ ایک چیز کو دوسری پر ترجیح دے کر دوسروں کو ملامت کرنے پر اتر آتا ہے۔ اس طرح لوگوں پر بے جا سختی کر کے جو رعایت اللہ تعالیٰ نے انھیں دی تھی اسے چھیننے کی کوشش کرتا ہے......... یہ بات اگرچہ دیکھنے میں بڑی چھوٹی سی معلوم ہوتی ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کی بنا پر ملامت کر رہا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔ لوگوں کے اندر اعتدال پیدا کرنے اور ان میں شریعت کے احکام کی پابندی اور اطاعت پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اگر کوئی شخص خدا کی دی ہوئی رعایت سے جائز طور پر فائدہ اٹھا رہا ہے تو کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۵۴-۱۵۵)

مشکل سفر میں روزہ

حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور کوئی ہم میں سے روزے سے تھا اور کوئی روزے سے نہیں تھا۔ ایک سخت گرمی کے دن ہم نے ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالا تو روزہ دار تو وہاں جا کر لیٹ گئے اور جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا تھا وہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے خیمے ایستادہ کیے اور سواری کے اونٹوں کو پانی پلایا......... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج روزہ نہ رکھنے والے اجر لوٹ لے گئے۔[1] (متفق علیہ)

اس حدیث کی رو سے پلڑا اس قول کے حق میں جھک رہا ہے جس کے مطابق حالتِ سفر میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ یہاں بیان کیا گیا ہے کہ مذکورہ سفر میں چوں کہ سخت گرمی کا زمانہ تھا اس لیے جن لوگوں نے روزہ رکھا ہوا تھا وہ روزے کی شدت برداشت نہ کر سکے اور جاتے ہی پڑ گئے۔ ان کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ اٹھ کر خیمے لگاتے اور سواریوں کو پانی پلاتے...... چنانچہ جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا تھا انھوں نے دوسروں کے آرام کا سامان کیا...... اگر وہ بھی روزے سے ہوتے تو وہ بھی سب کے سب پڑ جاتے اور نہ کوئی خیمہ لگاتا اور نہ جانوروں کو پانی پلاتا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج وہ لوگ اجر لوٹ لے گئے جنھوں نے روزہ نہیں رکھا تھا، انھوں نے لوگوں کے لیے آرام و آسایش کا سامان کیا۔

اب غور کیجیے کہ دورانِ سفر میں روزے کے جواز یا رخصت کے متعلق جو احادیث اب تک گزری ہیں ان میں دونوں طرف کے دلائل میں ایسا وزن ہے کہ کوئی شخص نہ تو پورے زور کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ حالتِ سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے اور نہ پورے زور کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ نہ رکھنا افضل ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ بات دراصل آدمی کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ

۱۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۷۰-۱۷۲، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اپنے حالات کا خود اندازہ کر کے یہ رائے قائم کرے کہ آیا وہ روزہ رکھے یا نہ رکھے...... کام دونوں یکساں حیثیت کے ہیں...... یہ خیال دل میں ہرگز نہ رہنا چاہیے کہ اگر سفر میں روزہ نہ رکھا تو اجر کم ہو جائے گا اور بعد میں قضا کرنے کی صورت میں اتنا ثواب نہیں ملے گا جو رمضان کے دنوں میں ملتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے خود ہی سفر کی حالت میں روزہ نہ رکھنے کا اختیار دیا ہے اور اس بات کی اجازت دے دی ہے کہ بعد میں ان روزوں کی قضا کر لی جائے تو اس امر میں شبہ کی کوئی گنجایش نہیں رہنی چاہیے کہ بعد میں قضا کا روزہ رکھنے کی صورت میں اس کا وہ اجر نہیں ہوگا جو رمضان کے زمانے میں رکھنے کا ہو سکتا ہے...... رمضان کے اندر جو روزہ بلاوجہ چھوڑ دیا گیا ہو اس کا معاملہ تو یکسر مختلف ہے کیوں کہ اس کی ایک قضا تو کیا آدمی ساری عمر بھی قضا ادا کرتا رہے تو اس روزے کا بدل نہیں ہو سکتی، لیکن یہاں معاملہ بالکل دوسرا ہے اور اس صورت میں روزہ قضا کر کے رکھنے سے ثواب میں کسی کمی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ آدمی حالات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر کے یہ فیصلہ کر لے کہ آیا وہ سفر میں روزہ رکھے یا نہ رکھے۔ دونوں صورتوں میں جس جانب وہ زیادہ جھکاؤ محسوس کرتا ہوا سے اختیار کر لے، اجر کے لحاظ سے دونوں صورتیں یکساں ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۵۶-۱۵۸)

مسافر کا قبل از وقت روزہ کھولنا

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ فتح مکہ والے سفر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے مکے کی طرف نکلے تو راستے بھر آپؐ روزہ رکھتے گئے یہاں تک کہ آپؐ عُسفان کے مقام (مدینے اور مکے کے درمیان ایک ساحلی مقام) پر پہنچے۔ وہاں آپؐ نے پانی منگوایا اور اسے ہاتھ میں لے کر اوپر اٹھایا تا کہ لوگ بھی اسے دیکھ لیں۔ پھر آپؐ نے روزہ افطار کیا۔ پھر مکے پہنچنے تک آپؐ نے روزے نہیں رکھے اور یہ واقعہ رمضان کے زمانے کا ہے...... اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے (یعنی ان کا یہ فتویٰ تھا) کہ چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے زمانے میں حالتِ سفر میں روزے رکھے بھی ہیں اور چھوڑے بھی ہیں اس لیے (تمھارے لیے بھی حکم یہ ہے کہ) جو چاہے سفر میں روزہ رکھے جو چاہے نہ رکھے۔ (یہاں تک حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں آئی ہے)۔ اور امام مسلم کی روایت میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کے یہ الفاظ زائد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مقام عسفان پر) پانی عصر کے بعد پیا تھا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۵۹)

مسلم کی ایک اور روایت میں (جو حضرت جابرؓ سے مروی ہے) یہ اضافہ بھی ہے کہ اس کے بعد حضورؐ سے جا کر عرض کیا گیا کہ بعض لوگ ابھی تک روزے سے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: وہ نافرمان لوگ ہیں وہ نافرمان لوگ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ کی مہم پر روانہ ہوئے تو یہ رمضان کا زمانہ تھا اور گرمی کا موسم تھا آپؐ ایک لمبا سفر کرتے ہوئے جا رہے تھے اور بہت بڑی مہم درپیش تھی اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر لوگ کمزور ہو گئے تو جنگ نہیں کر سکیں گے، اس لیے ان مصالح کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانیہ روزہ کھولا تا کہ لوگ آپؐ کے اس فعل کی تقلید کرتے ہوئے روزہ کھول

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیں۔ آپؐ نے لوگوں کو یہ کہلا کر نہیں بھیجا کہ روزہ کھول لیا جائے بلکہ خود ایک فعل سب کے سامنے کیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اب روزہ نہیں رکھنا ہے اور اب اس رمضان میں معافی ہے لیکن اس کے بعد بھی جب کچھ لوگوں نے روزہ نہ کھولا اور آپؐ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ نافرمان ہیں، وہ نافرمان ہیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ جب اللہ کے رسول نے اللہ کی عطا کردہ ایک رعایت سے فائدہ اٹھایا ہے تو یہ لوگ کون ہیں جو اس رعایت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ ہم تو عزیمت کے مقام پر ہیں، اور [illegible] رخصت سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ وہ نافرمان لوگ ہیں۔

(کتاب [illegible]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس روایت میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ [illegible] کھولا تھا لیکن صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت میں یہ وضاحت موجود ہے کہ وہ عصر کا وقت [illegible] بن عباسؓ کے بیان کا حاصل بھی یہی ہے کہ وہ دن کا وقت تھا، خواہ صبح کا ہو یا شام سے پہلے کا، کیوں کہ [illegible] نے سحری سے پہلے پانی پیا تھا تو اسے بیان کرنے کا کوئی مطلب نہیں ہو سکتا تھا، اور اگر مغرب کے بعد پیا تھا تو [illegible] کرنے کی کوئی حاجت نہیں تھی...... بہر حال حضرت جابرؓ کی روایت میں اس بات کی صراحت آ گئی ہے کہ وہ عصر کا وقت تھا۔

اس حدیث میں حضرت ابن عباسؓ نے اس بات کی اچھی طرح وضاحت فرما دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر پانی پیا تھا تاکہ لشکر کے سارے لوگ یہ دیکھ لیں کہ آپؐ روزہ کھول رہے ہیں۔

اس حدیث سے ایک مزید بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر کسی شخص پر روزے کی حالت میں کوئی ایسی سختی آ جائے جسے وہ برداشت نہ کر سکتا ہو تو وہ وقت سے پہلے روزہ کھول سکتا ہے.......... ایک شکل تو یہ ہے کہ آدمی نے کسی مجبوری کی بنا پر روزہ ہی نہ رکھا ہو اور دوسری شکل یہ ہے کہ اس نے روزہ تو رکھ لیا لیکن بعد میں کوئی ایسی سختی پیش آ گئی کہ وہ اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو اس کے لیے اجازت ہے کہ وہ روزہ کھول لے۔ اس طرح روزہ کھولنا روزہ توڑنے کی تعریف میں نہیں آتا کہ اس پر کفارہ لازم آئے۔ اس کی صرف قضا لازم آتی ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۵۹-۱۶۰)

سفر میں روزہ رکھنا گناہ ہے!

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سفر کی حالت میں رمضان کا روزہ رکھنے والا شخص ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ شخص، جو گھر پر رہتے ہوئے روزہ نہ رکھے۔[۱] (ابن ماجہ)

جس طرح یہ غلط ہے کہ کوئی شخص گھر پر مقیم ہوتے ہوئے کسی عذر کے بغیر رمضان کا روزہ ترک کر دے اسی طرح یہ بھی صحیح

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۸۱-۱۸۲، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں کہ آدمی حالت سفر میں اپنے آپ کو مشکل میں ڈال کر روزہ رکھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دونوں فعلوں کا درجہ بھی ایک سا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آدمی گھر پر ہو تو روزہ نہ رکھنا بُرا، اور سفر میں ہو تو روزہ رکھنا بُرا۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ سفر کی حالت میں آدمی کو سختی پیش آئے یا کبھی سختی پیش آنے کا خطرہ ہو ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی سفر کی حالت میں روزہ رکھا ہے اور صحابہ کرامؓ نے بھی روزہ رکھا ہے۔ مزید برآں ایسی حالت بھی گزری ہے کہ ایک سفر میں صحابہ کرامؓ میں سے بعض روزے سے تھے اور بعض نہیں تھے...... اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اگر آدمی گھر پر مقیم رہتے ہوئے رمضان کا کوئی روزہ بغیر کسی عذر کے چھوڑ دیتا ہے تو بعد میں عمر بھر کی قضا بھی اس کی تلافی نہیں کرسکتی .... لیکن ظاہر بات ہے کہ حالت سفر میں روزہ رکھنے کو، خواہ اس میں سختی ہی کیوں نہ پیش آئے کسی طرح بھی اس درجے کا بُرا فعل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۷-۱۶۸)

اصل پوزیشن

حضرت حمزہ بن عمرو اسلمیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہؐ! میں اپنے اندر اتنی قوت پاتا ہوں کہ سفر کی حالت میں بھی روزہ رکھوں۔ اگر میں ایسا کروں گا تو کیا میں گناہ گار ہوں گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ یہ تو اللہ بزرگ و برتر کی طرف سے ایک رعایت ہے اگر کوئی شخص اس رعایت سے فائدہ اٹھائے تو یہ اچھی بات ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص روزہ رکھنا پسند کرے تو اس کے لیے کوئی گناہ بھی نہیں۔[۱] (مسلم)

یہ اصل پوزیشن ہے کہ اگر ایک آدمی اپنے اندر اتنی قوت پاتا ہو اور اس کے حالات بھی ساز گار ہوں تو اس کے لیے روزہ رکھنا بالکل درست ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن اگر وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس کے اندر سفر کی حالت میں روزہ رکھنے کی طاقت نہیں ہے یا اس کو سختی پیش آنے کا خطرہ ہے تو اس حالت میں روزہ چھوڑ کر اللہ کی دی ہوئی رخصت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے کیوں کہ جب اللہ کسی معاملے میں رعایت دے تو آدمی کے لیے مستحسن یہ ہے کہ وہ اس رعایت سے فائدہ اٹھائے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۹)

تین افراد کے لیے روزہ چھوڑنے کی اجازت

حضرت انسؓ بن مالک کعبی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مسافر سے آدھی نماز ساقط کر دی ہے اور اسے روزہ چھوڑنے کی بھی اجازت دے دی ہے۔ اسی طرح دودھ پلانے والی اور حاملہ عورت کو بھی روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔[۲] (ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۸۳، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۷۵-۱۷۷، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آدھی نماز ساقط کرنے سے مراد چار رکعتوں والی نماز میں دو رکعتوں کی معافی ہے.......... تین اور دو رکعتوں والی نماز میں کوئی قصر اور معافی نہیں ہے۔ نماز میں رخصت کے علاوہ مسافر سے روزہ رکھنے کی پابندی بھی اٹھالی گئی ہے، البتہ ان دونوں رخصتوں میں فرق یہ ہے کہ مسافر پر روزے کی قضا تو لازم آتی ہے لیکن قصر نمازوں کی کوئی قضا نہیں ہے۔

مسافر اور دودھ پلانے والی اور حاملہ عورت کو روزہ چھوڑنے کی اجازت دینے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ روزہ نہ رکھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ ایک مسافر اگر دوران سفر میں پوری نماز پڑھے تو یہ اس کے لیے درست نہیں جبکہ اگر وہ روزہ رکھنے کی استطاعت رکھتا ہو تو اسے روزہ رکھنے کی (نہ صرف) اجازت ہے بلکہ یہ افضل ہے۔

اگر کوئی شخص سفر کی حالت میں روزے چھوڑتا ہے تو اُسے ان کی قضا ادا کرنی ہوگی۔ اس طرح اگر دودھ پلانی والی عورت دودھ پلانے کے زمانے میں اور حاملہ عورت دوران حمل میں غیر معمولی تکلیف محسوس کرے تو انھیں اس بات کی اجازت ہے کہ وہ روزہ چھوڑ دیں۔ یہ دور گزر جانے پر بعد میں انھیں ان روزوں کی قضا ادا کرنا ہوگی۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۱-۱۶۲)

اگر کوئی شخص سفر کی حالت میں ہو اور اس کے پاس سواری نہ ہو یا سواری ہو تو خستہ حال ہو اور اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر اس نے سفر میں روزہ رکھ لیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ مغرب کے بعد تک کسی ایسے مقام تک نہ پہنچ سکے گا جہاں وہ اطمینان سے کھا پی سکے تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ روزہ نہ رکھے.......... دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے پاس اچھی سواری موجود ہو اور اسے اس بات کا یقین ہو کہ وہ رات تک کسی ایسے مقام تک پہنچ جائے گا جہاں وہ اطمینان سے کھا پی سکے گا تو اسے چاہیے کہ جہاں بھی رمضان اس پر آجائے وہ وہاں سے روزے رکھنا شروع کر دے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ششم

روزے کی قضا اور فدیہ

قضا روزے کب رکھے جائیں؟

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ میں قضا کے روزے شعبان کے مہینے میں رکھتی تھی کیوں کہ باقی دس مہینوں کے اندر مجھے ایسی مصروفیات رہتی تھی جن کی وجہ سے قضا کے روزے ٹلتے رہتے تھے یہاں تک کہ شعبان آ جاتا۔ انھوں نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ آیا وہ یہ روزے شعبان کی پندرہ تاریخ سے پہلے رکھتی تھیں یا اس کے بعد لیکن حدیث کے انداز سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قضا کے روزے پندرہ تاریخ کے بعد رکھنے کا ذکر فرما رہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قضا کے روزے حقیقت میں فرض ہیں اور نفل کی حیثیت نہیں رکھتے اس لیے وہ اس زمانے میں بھی رکھے جاسکتے ہیں۔ [۲]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۱)

شوہر کی اجازت کے بغیر روزے کی قضا

عورت کے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ اس کا شوہر گھر پر موجود ہو لیکن وہ اس کی اجازت کے بغیر روزے رکھے۔ اس سے نفلی روزے بھی مراد ہو سکتے ہیں اور قضا کے روزے بھی۔ چوں کہ قضا کے روزوں میں اس بات کی گنجایش ہوتی ہے کہ وہ گیارہ مہینوں کے اندر کسی وقت بھی رکھے جاسکتے ہیں اس لیے عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنے شوہر سے اس بات کی اجازت لے لے۔ اس کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر روزے رکھنے شروع کر دے، خواہ نفلی ہوں یا قضا کے۔ کیونکہ بعض حالات میں یہ چیز شوہر کے لیے باعث تکلیف ہو سکتی ہے۔ ایسی کسی چیز سے میاں بیوی کے درمیان چپقلش واقع ہونا یا کم از کم شوہر کے دل میں بیوی کے لیے ناراضی کا جذبہ پیدا ہونا شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے۔ شریعت اس بات کو بڑی اہمیت دیتی ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات زیادہ سے زیادہ خوشگوار ہوں کیوں کہ ان تعلقات میں ناخوشگواری کے نتائج بہت بُرے اور دوررس ہوتے ہیں۔ اس لیے شریعت اس بات کو ملحوظ رکھتی ہے کہ کسی معاملے میں زوجین کے درمیان کسی قسم کی بدمزگی پیدا نہ ہونے پائے......... بعض حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ شوہر کو بیوی کا روزہ رکھنا (خواہ وہ نفلی ہو یا قضا کا) اتنا ناگوار محسوس ہوتا ہے کہ وہ روزے ہی کے متعلق نامناسب الفاظ اپنی زبان سے نکال بیٹھتا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف میاں بیوی کے تعلقات میں بدمزگی پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ آدمی بھی گناہ گار ہوتا ہے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ روزہ رکھنے سے پہلے بیوی اپنے شوہر سے اس بات کی

۱- قضا سے متعلق کچھ بحث اس کتاب میں نماز کی قضا کے ضمن میں بھی موجود ہے۔ دیکھیے: حصہ نماز، باب پنجم، فصل چہارم۔ (مرتب)
۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۸۴-۱۸۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اجازت لے لے.........البتہ رمضان کے روزوں کا معاملہ مختلف ہے۔ رمضان کے زمانے میں شوہر کی اجازت اور رضا مندی حاصل کرنا ضروری نہیں ہے کیوں کہ رمضان کے روزے چھوڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۲-۱۷۳)

حائضہ کے لیے روزوں کی قضا

ایک تابعی خاتون معاذہ عَدَوِیہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ سے عرض کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ ایک حائضہ عورت ایام ماہواری میں جو روزے چھوڑتی ہے ان کی قضا تو وہ ادا کرتی ہے لیکن جو نمازیں چھوڑتی ہے ان کی قضا ادا نہیں کرتی[2]؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم پر یہ حالت گزرتی تھی تو ہمیں یہ حکم تو دیا جاتا تھا کہ ہم روزوں کی قضا کریں۔ لیکن یہ حکم نہیں دیا جاتا تھا کہ ہم نمازوں کی قضا بھی کریں۔[3] (مسلم)

یہاں دیکھیے سوال کرنے والی خاتون اس بات کی علت دریافت کرتی ہیں کہ حائضہ عورت ایام ماہواری کے روزوں کی قضا کیوں ادا کرتی ہے جب کہ نمازوں کی قضا ادا نہیں کرتی، لیکن حضرت عائشہؓ اس کے جواب میں فرماتی ہیں کہ حکم یہی ہے (اگرچہ اس حکم کے اندر مصلحت موجود ہے اور غور کرنے سے وہ سمجھ میں بھی آسکتی ہے[4] لیکن حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ قانون اور حکم یہ ہے۔ قطع نظر اس سے کہ علت تمھاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے تمھارا کام اس قانون کی پابندی کرنا ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۴)

متوفی کے روزوں کی قضا

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ مَّاتَ وَ عَلَيْهِ صَوْمٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهٗ (متفق علیہ) حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اس حالت میں فوت ہو جائے کہ اس کے ذمے کچھ روزے ہوں تو اس کا ولی اس کے بدلے میں روزے رکھے۔

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۸۶-۱۸۸، اشاعت دوم۔

۲- حیض کی حالت میں روزہ و نماز دونوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ نماز کی کوئی قضا نہیں البتہ روزے بعد میں ادا کرنے چاہییں۔ (مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اوّل، ۱۹۷۰ء، ص ۱۲۶)

۳- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۸۸-۱۹۱، اشاعت دوم۔

۴- فرض کیجیے کہ ایک عورت کو ایام ماہواری میں آٹھ دس روز تک نماز چھوڑنی پڑتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ذمے قضا کی چالیس یا پچاس نمازیں ہو گئیں جو اسے بعد میں ادا کرنی پڑیں گی۔ ظاہر بات ہے کہ اس طرح اسے سخت مشکل پیش آئے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں رعایت فرمائی اور نماز کی قضا لازم نہیں کی۔ اس کے برعکس روزوں کا معاملہ یہ ہے کہ سال کے ایک مہینے میں فرض ہوتے ہیں اور قضا ہونے کی صورت میں سال کے باقی مہینوں میں کسی وقت بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ اس لیے یہاں وہ رعایت نہیں دی گئی جو نماز کے بارے میں دی گئی ہے۔ (تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۹۰-۱۹۱، اشاعت دوم)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ ایک پیچیدہ فقہی بحث ہے کہ اگر کوئی شخص اس حالت میں فوت ہو جائے کہ اس کے ذمہ کچھ روزے رہ گئے ہوں تو آیا اس کے ولی پر اس کی قضا لازم ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں چونکہ متعدد احادیث آئی ہیں اور ان میں اختلاف ہے اس لیے اس کے بارے میں فقہا کے مسلک مختلف ہو گئے ہیں۔ امام احمدؒ بن حنبل یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمے رمضان کے روزے رہ جائیں تو اس کے ولی کو اس کی طرف سے روزے رکھنے ہوں گے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس بات کے قائل نہیں ہیں۔ یہ ائمہ اس حدیث [یعنی مَنْ مَّاتَ وَ عَلَیْهِ صَوْمٌ صَامَ عَنْهُ وَلِیُّهٗ (متفق علیہ) جو شخص اس حالت میں فوت ہو جائے کہ اس کے ذمے کچھ روزے ہوں تو اس کا ولی اس کے بدلے میں روزے رکھے] کو رد تو نہیں کرتے البتہ وہ اس کی تاویل کرتے ہیں۔

اول تو ان کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ یہاں رمضان کے روزے ہی مراد ہوں۔ بلکہ نذر کے روزے بھی مراد ہو سکتے ہیں یعنی اگر کسی شخص نے نذر مانی تھی کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو میں اتنے روزے رکھوں گا لیکن یہ نذر پوری کرنے سے قبل وہ فوت ہو گیا تو اس کا ولی اس کی طرف سے یہ روزے رکھ سکتا ہے۔ دوسرے یہ ضروری نہیں ہے کہ صیغۂ امر کے معنی لازماً وجوب کے ہوں، اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہاں اس سے مراد یہ ہو کہ اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھ سکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس سلسلے کی بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث ان احادیث سے پہلے کی ہے۔ اس لیے ان فقہا کے نزدیک اب یہ حکم منسوخ سمجھا جائے گا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۵-۱۷۶)

متوفی کے قضا روزوں کا فدیہ

عَنْ نَافِعٍ، عَنِ بْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ مَنْ مَّاتَ وَ عَلَیْهِ صِیَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ فَلْیُطْعَمْ عَنْهُ مَکَانَ کُلِّ یَوْمٍ مِسْکِیْنٌ (رواہ الترمذی، و قال والصحیح انهٗ موقوفٌ علی بن عمر)

جناب نافعؒ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اس حالت میں فوت ہو جائے کہ اس کے ذمے رمضان کے روزے ہوں تو اس کی طرف سے ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین آدمی کو کھانا کھلایا جائے (یعنی اس کا فدیہ دیا جائے)۔

امام ترمذی کے نزدیک یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں بلکہ عبداللہ بن عمرؓ کا اپنا فتویٰ ہے یعنی یہ بات ثابت نہیں ہے کہ یہ بات حضورؐ نے فرمائی ہے بلکہ مضبوط سندوں سے جو روایات آئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اپنی رائے ہے۔ ان کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے ذمے رمضان کے روزے رہ گئے ہوں اور وہ فوت ہو جائے تو اس کی طرف سے فدیہ کے طور پر مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔ یہ وہی فدیہ ہے جو اس کی زندگی میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص بیماری وغیرہ کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے۔ وہ فدیہ ادا کرے یعنی ہر روزے کے بدلے میں کسی مسکین کو کھانا کھلائے۔ اب فرض کیجیے کہ وہ بیماری کے زمانے میں کھانا نہیں کھلا سکا اور فوت ہو گیا تو اس کے بعد اس کے ولی کو چاہیے کہ وہ اس کے فدیے کے طور پر ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔

اگر اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مانا جائے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ حضورؐ کے ارشاد کے خلاف ہے حالانکہ یہ ایک یقینی امر ہے کہ اگر اُن کے علم میں یہ بات ہوتی کہ اس سلسلے میں حضورؐ کا ارشاد یہ ہے کہ ولی کو روزہ رکھنا چاہیے تو وہ ہرگز اس کے خلاف فتویٰ نہ دیتے۔ اس لیے فقہا اس بات سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اگر پہلے وہ حکم تھا بھی کہ ولی کو روزہ رکھنا چاہیے تو بعد کے حکم سے منسوخ ہو گیا یا پھر اس کی یہ تاویل کرنی ہوگی کہ اس میں امر کا صیغہ وجوب کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے صرف اس بات کی اجازت نکلتی ہے کہ ولی روزہ رکھ سکتا ہے۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۷-۱۷۸)

تندرست آدمی کا روزے کے بجائے فدیہ دینا

س: ایک صاحبِ علم نے ماہِ رمضان میں ایک فتنہ کھڑا کیا تھا کہ رمضان کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آیات بیک وقت نازل ہوئی تھیں۔ اس لیے اللہ نے شروع میں جو رعایت دی ہے کہ "جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں، اور پھر نہ رکھیں تو وہ فدیہ ادا کریں" یہ ایک اٹل رعایت ہے اور اب بھی اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کی حمایت میں آیت ۱۸۳ کے آخری حصے کو پیش کیا گیا کہ اگر روزہ رکھو تو بہتر ہے اور نہ رکھو تو فدیہ ادا کر دو۔ ان کا کہنا تھا کہ آیت ۱۸۴ پہلی آیات کے ساتھ ہی نازل ہوئی تھی، وہ پہلی آیات کی رعایت کو کیسے چھین سکتی ہے۔

آپ کی تفسیر کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ آیات ۱۸۲-۱۸۳ تو جنگ بدر سے پہلے ۲ھ میں نازل ہوئیں اور آیت ۱۸۴ ایک سال بعد نازل ہوئی۔ اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو پھر اُن کے اس خیال کی تردید ہو سکتی ہے کہ آج بھی ایک تندرست ہٹا کٹا انسان فدیہ دے کر روزے کی فرضیت سے بچ سکتا ہے۔ آپ براہ مہربانی کچھ تکلیف گوارا کر کے ان کتب کا حوالہ دے دیں جن سے آپ کو ثبوت ملا ہو کہ آیات ۱۸۲ اور ۱۸۳ تو ۲ھ میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئیں اور آیت ۱۸۴ ایک سال بعد نازل ہوئی..........

ج: اس سوال میں جس فتنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا منشا تو خود اس کے موضوع و مضمون ہی سے ظاہر ہے۔ اس کے مصنف کا صاف مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں روزے رکھنے کی 'مصیبت' سے خود بھی بچیں اور اپنے ہم مشرب 'صاحب لوگوں' کو بھی بچائیں۔ عام فساق غنیمت ہیں کہ کھلی کھلی نافرمانی کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور جو نافرمانی کرنا چاہتے ہیں اسے بے محابا کر

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۵۳-۱۵۴۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گزرتے ہیں۔ ان میں کم از کم یہ مکاری موجود نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی کرنے کے لیے خود خدا ہی کی کتاب کو حجت بنائیں، لیکن یہ نرالی قسم کے فساق وہ ہیں کہ اپنے فسق و فجور کے لیے قرآن کو آڑ بناتے ہیں اور قرآن سے یہ خدمت لینے ہی کے لیے انھوں نے اس کا رشتہ حدیث سے توڑا ہے تاکہ اس کی آیات کو جیسے چاہیں معنی پہنائیں، ان لوگوں کو آج کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے، جس جس طرح چاہتے ہیں خلق خدا کو خدا کی کتاب کا نام لے لے کر خدا کے دین سے پھیرتے ہیں۔ پہلے انھوں نے 'دو قرآن' تصنیف کیے تھے۔ پھر 'دو اسلام' وضع کیے۔ آگے چل کر یہ 'دو خدا' بھی بنا ڈالیں تو کون ان کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔

روزوں کے بارے میں قرآن سے جو غلط استدلال انھوں نے کیا ہے۔ اس کی غلطی واضح کرنے کے لیے سب سے پہلے ہم خود قرآن کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ زیر بحث آیات کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

اے لوگو، جو ایمان لائے ہو! لکھ دیے گئے تم پر روزے جس طرح لکھے گئے تھے تم سے پہلے لوگوں پر تاکہ تم پرہیزگاری کرو۔ روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا، پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو، یا سفر پر ہو، تو پورا ہونا چاہیے شمار دوسرے دنوں سے۔ اور جو لوگ اس کی (یعنی روزے کی) طاقت رکھتے ہوں، ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔ پھر جو کوئی رضا کارانہ بجالائے نیکی تو وہ بہتر ہے اسی کے لیے، اور یہ کہ تم روزہ رکھو، یہ بہتر ہے تمھارے لیے اگر علم رکھتے ہو۔ ماہِ رمضان وہ ہے جس میں نازل کیا گیا قرآن، رہنما بنا کر انسانوں کے لیے، اور روشن آیات لیے ہوئے ہدایت اور تفریق حق و باطل کی۔ پس جو پائے تم میں سے اس مہینے کو تو چاہیے کہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہیے شمار دوسرے دنوں سے۔

ملاحظہ فرمائیے سورۂ بقرہ رکوع ۲۳ [۲:۱۸۳-۱۸۵] اور اصل سے مقابلہ کرکے خوب اطمینان کرلیجیے کہ اصل اور ترجمے میں معنی کے لحاظ سے کوئی فرق تو نہیں ہے۔

اس عبارت کو جو شخص خالی الذہن ہو کر پڑھے گا۔ اس کے دل میں لازماً پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر یہ پوری عبارت ایک ہی سلسلۂ تقریر کی ہے جو بیک وقت ارشاد ہوئی تھی، تو اس میں پہلے ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا گیا کہ ماہِ رمضان میں تم کو یہ نعمت دی گئی تھی، اس لیے تم میں سے جو اس کو پائے اسے چاہیے کہ اس مہینے کے روزے رکھے؟ آخر یہ کیا انداز بیان ہے کہ پہلے کہا: 'روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا'۔ پھر تین چار فقروں میں روزوں کے متعلق بعض احکام بیان کیے، پھر بتایا گیا کہ وہ گنے چنے دن رمضان کے ہیں اور رمضان کو اس کام کے لیے اس وجہ سے منتخب کیا گیا ہے اور اس پورے مہینے کے روزے رکھنے چاہییں۔ ایک مربوط سلسلۂ تقریر میں شاید ایک اناڑی بھی اپنی بات یوں ادا نہ کرتا بلکہ یوں کہتا کہ اگلی قوموں کی طرح تم پر بھی روزے فرض کیے گئے ہیں اور چونکہ رمضان کے مہینے میں تم کو قرآن کی نعمت دی گئی ہے اس لیے یہ فرض روزے تم اس مہینے میں رکھو۔ اس کے بعد اس کو جو کچھ احکام بیان کرنے ہوتے وہ بیان کر دیتا۔

دوسرا سوال ایک خالی الذہن ناظر کے دل میں یہ پیدا ہوگا کہ اس سلسلۂ عبارت میں جب پہلے یہ فقرہ آچکا تھا کہ "جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہیے شمار دوسرے دنوں سے" تو اسی فقرے کو بعد میں پھر دُہرانے کی کیا حاجت تھی؟ اور اگر فی الواقع اس کا دُہرانا ضروری تھا تو پھر یہ فقرہ بھی کیوں نہ دہرایا گیا کہ "جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک مسکین کا کھانا''؟ حقیقت میں ضرورت تو دونوں میں سے ایک کو بھی دہرانے کی نہ تھی، لیکن ایک کو دُہرانا اور دوسرے کو نہ دُہرانا تو ایک معما سا محسوس ہوتا ہے۔

تیسرا سوال جو اس کے دل میں کھٹکے گا وہ یہ ہے کہ ''ماہ رمضان وہ ہے'' سے پہلے کی عبارت اور اس کے بعد کی عبارت کا مضمون ایک دوسرے سے صریحاً متناقض نظر آتا ہے۔ پہلا مضمون صاف طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ جو شخص طاقت رکھنے کے باوجود روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دے دے، لیکن اگر وہ روزہ ہی رکھے تو یہ اسی کے حق میں اچھا ہے۔ اس کے بالکل برعکس دوسرا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جو شخص ماہ رمضان کو پائے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے اور اس لازمی حکم کو یہ بات مزید تقویت پہنچا رہی ہے کہ اس حکم کے بعد اس رعایت کا تو اعادہ کر دیا گیا ہے جو پہلے مضمون میں مریض اور مسافر کو دی گئی تھی، مگر اس رعایت کو ساقط کر دیا گیا ہے جو اوپر روزے کی طاقت رکھنے والے کو دی گئی تھی۔ ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے قانون ساز سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک ہی معاملے میں وہ بیک وقت دو مختلف احکام دے گا۔ پھر بھلا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان کیسے ہو سکتا ہے؟

پہلے دو سوالات صرف سوالات ہی ہیں، لیکن یہ آخری سوال تو ایک سخت اعتراض ہے جو اس عبارت پر وارد ہوتا ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص حدیث سے مدد لیے بغیر اسے کیسے رفع کر سکتا ہے۔ جو لوگ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کو سمجھنے کے مدعی ہیں، اور حدیث کو احکامِ دین کا ماخذ اور قرآن کی مستند شرح ماننے سے انکار کرتے ہیں، ان سے پوچھیے کہ ان کے پاس ان سوالات اور اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟

اب دیکھیے کہ حدیث کس طرح ہمیں قرآن مجید کے اس مقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جن لوگوں کے سامنے قرآن کے یہ احکام نازل ہوئے تھے، ان کا بیان یہ ہے کہ اس عبارت کا ایک حصہ جو ''اے لوگو'' سے شروع ہو کر ''اگر تم علم رکھتے ہو'' پر ختم ہوتا ہے، ابتداءً نازل ہوا تھا، اور دوسرا حصہ اس کے ایک سال بعد نازل ہوا۔ پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی تھی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دے دے مگر دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کر دیا گیا۔ البتہ مسافر اور مریض کے لیے سابق رعایت بحال رکھی گئی۔

اس بیان میں نہ صرف یہ کہ سارے اِشکالات رفع ہو گئے، بلکہ یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ دوسرے سال آخری اور قطعی حکم دیتے ہوئے یہ تمہید کیوں اٹھائی گئی کہ یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں تمھیں قرآن جیسی نعمت دی گئی ہے۔ اب بات سمجھ میں آ گئی کہ پہلے اللہ کی اس نعمت کا احساس دلایا گیا، پھر حکم دیا گیا کہ اس نعمت کے شکریے میں تم کو اس مہینے کے روزے ضرور رکھنے چاہییں۔

محدثین و مفسرین نے یہ تشریح متعدد صحابہ اور تابعین سے نقل کی ہے مثلاً امام احمد بن حنبلؒ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ایک طویل تشریحی بیان نقل کرتے ہیں جس میں وہ فرماتے ہیں کہ نماز اور روزہ، دونوں کی موجودہ صورت بتدریج قائم کی گئی ہے۔ نماز میں پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کیا جاتا تھا۔ پھر مکے کی طرف رخ پھیرا گیا۔ پہلے لوگ ایک دوسرے کو نماز کے وقت اطلاع دیتے تھے۔ پھر اذان کا طریقہ مقرر کیا گیا۔ پہلے طریقہ یہ تھا کہ اگر ایک شخص بیچ کے کسی مرحلے پر آ کر جماعت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں شریک ہوتا تھا تو اپنی نماز کا چھوٹا ہوا حصہ ادا کرنے کے بعد امام کی پیروی شروع کرتا تھا۔ پھر یہ طریقہ مقرر کیا گیا کہ جماعت میں جس مرحلے پر بھی آ کر شریک ہو امام کی پیروی میں نماز پڑھنی شروع کر دو۔ پھر امام کے سلام پھیر دینے کے بعد اٹھ کر اپنی نماز پوری کرو۔ اسی طرح روزے کے احکام بھی بتدریج آئے ہیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپؐ ہر مہینے تین دن کے روزے رکھتے تھے، اور ایک روزہ محرم کی دسویں کو رکھا کرتے تھے۔ پھر اللہ نے رمضان کے روزے فرض کیے، مگر یہ رعایت رکھی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اس کے بعد حکم آیا کہ رمضان کے روزے ضرور رکھے جائیں۔ اور تندرست مقیم آدمی کے لیے فدیے کی رعایت منسوخ کر دی۔ پہلے لوگ افطار کے بعد اس وقت تک کھانا پینا، مباشرت کرنا جائز سمجھتے تھے۔ جب تک سو نہ جائیں۔ سونے کے بعد وہ سمجھتے تھے کہ دوسرے دن کا روزہ شروع ہو گیا۔ اگرچہ اس باب میں کوئی صریح حکم نہ تھا۔ مگر لوگ ایسا ہی سمجھے ہوئے تھے۔ بعد میں حکم آیا کہ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ...... ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (ابن کثیر، ج ۱، ص ۲۱۴)

اس مضمون کی تائید میں بخاری، مسلم، ابوداؤد اور دوسرے محدثین نے متعدد روایات نقل کی ہیں۔ جو حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ مشہور مفسر ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) نے پوری سند کے ساتھ جن صحابہ اور تابعین سے اس کی تائید میں روایات نقل کی ہیں ان کے نام یہ ہیں: معاذ بن جبلؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، سلمہ بن اکوعؓ، علقمہؒ، عکرمہؒ، حسن بصریؒ، شعبیؒ، عطاءؒ، زہریؒ۔ ان میں سے ایک روایت میں وہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی یہ تصریح نقل کرتے ہیں کہ پہلے چونکہ اہلِ عرب روزوں کے عادی نہ تھے اور روزہ ان پر سخت گراں گزرتا تھا۔ اس لیے ان کو یہ رعایت دی گئی تھی کہ رمضان میں جس دن روزہ نہ رکھیں اس دن کسی مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ بعد میں تاکیدی حکم آ گیا کہ پورے مہینے کے روزے رکھو الا یہ کہ تم مریض ہو یا سفر پر ہو۔ ایک اور روایت میں وہ ابن عباسؓ کی یہ تصریح نقل کرتے ہیں کہ پہلے سال کے روزوں میں اللہ تعالیٰ نے فدیے کی رخصت رکھی تھی، مگر دوسرے سال جو حکم آیا اس میں مریض و مسافر کی رعایت تو بحال تھی، لیکن مقیم کے لیے فدیے کی رعایت کا ذکر نہ تھا، اس لیے یہ رعایت منسوخ ہو گئی۔

اس تشریح سے ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ جو لوگ حدیث سے بے نیاز ہو کر، بلکہ احادیث کو حقارت اور تضحیک کے ساتھ پھینک کر قرآن سے من مانے احکام نکال رہے ہیں، وہ کس طرح خود گمراہ ہو رہے ہیں اور عام مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۴۵-۵۲)

دوسرے کے بدلے میں روزہ رکھنا

امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ ان تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جب یہ مسئلہ پوچھا جاتا تھا کہ کیا کوئی شخص دوسرے کے بدلے میں روزے رکھ سکتا ہے یا کوئی شخص دوسرے کی جگہ نماز پڑھ سکتا ہے؟ تو آپ یہ فرمایا کرتے تھے کہ نہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے اور نہ کسی کی طرف سے نماز پڑھ سکتا ہے۔ (موطا امام مالکؒ)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ فتویٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کے خلاف نہیں پڑتا کیوں کہ اگر مفروضے کے طور پر یہ مان لیا جائے کہ حضورؐ کا وہ حکم، کہ آدمی کے ولی کو اس کے بدلے میں روزہ رکھنا چاہیے، انھیں نہیں پہنچا تھا تو وہ صحابہ کرام کا زمانہ تھا، بہت سے صحابیؓ ایسے ہو سکتے تھے جو ان سے کہتے کہ جب حضورؐ کا حکم یہ ہے تو آپ یہ فتویٰ کیسے دے رہے ہیں؟ لیکن چوں کہ ان سے کسی نے یہ بات نہیں کہی اس لیے اس سے یہ معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ میں یہ بات عام طور پر معلوم تھی کہ کسی شخص کے روزوں کی قضا کسی دوسرے شخص کے ذمے لازم نہیں آتی، خواہ وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۹-۱۸۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ہفتم

روزے کا کفارہ

رمضان کے ایک روزے کا بدل

حضرت ابو ہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر کسی شخص نے رمضان کا ایک روزہ بھی چھوڑا، بغیر کسی رخصت (معقول عذر) کے اور بغیر کسی مرض کے، تو اگر وہ ساری عمر کے روزے بھی رکھے تب بھی وہ اس کی قضا نہیں ہو سکتے۔

شریعت میں بعض چیزیں تو قانونی حیثیت رکھتی ہیں اور بعض اخلاقی۔ قانونی حیثیت تو یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے جان بوجھ کر کوئی روزہ چھوڑا ہو تو اس پر قضا لازم آئے گی اور قانون کا تقاضا اتنا ہے کہ وہ قضا روزہ رکھے۔ لیکن اس کے روزہ قضا کرنے کی اخلاقی حیثیت اس حدیث کے مطابق یہ ہے کہ ایک روزہ نہیں بلکہ عمر بھر کے روزے بھی اس ایک روزے کا بدل نہیں ہو سکتے جو اس نے رمضان کے زمانے میں جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہو۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۲)

عبادات کی اصل روح

اعمال کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو ان کی ظاہری حیثیت ہے، یعنی وہ ظاہری شکل جس کے مطابق وہ انجام دیے جاتے ہیں اور دوسری ان کی باطنی حیثیت ہے، یعنی ان کی اصل حقیقت اور روح جو اُس سے مطلوب ہوتی ہے۔ اگر آپ شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کوئی عمل انجام دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ذمے جو فرض تھا وہ آپ نے ادا کر دیا۔ اس کے بعد دوسری چیز ہے اس عمل کی حقیقت، تو اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے جسم کے اندر روح ہوتی ہے۔ روح اگر آدمی کے جسم سے نکل جائے تو دیکھنے کو تو اس کا پورا جسم جوں کا توں موجود ہوتا ہے (اور بظاہر کوئی چیز اس میں سے کم نہیں ہوتی) لیکن فرق یہ واقع ہو جاتا ہے کہ پہلے وہ زندہ تھا اور اب زندہ نہیں ہے۔ جب تک وہ زندہ تھا تو آپ اُسے دفن کرنے کا خیال تک نہیں کر سکتے تھے لیکن اب وہ مُردہ ہے تو آپ اسے اپنے پاس رکھنے کے متعلق نہیں سوچ سکتے۔ یہی تعلق ہے اعمال کی اصل حقیقت اور ان کی ظاہری شکل کے درمیان۔

پس اگر ایک آدمی عمل کی وہ شکل پوری نہیں کرتا جو شریعت نے بتائی ہے تو شریعت کی نگاہ میں اس کا وہ عمل بے کار ہے، اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اگر وہ اس عمل کے اندر اس کی حقیقی روح پیدا نہیں کرتا تو اس صورت میں اس کا وہ عمل خدا کے ہاں بے وزن اور بے حقیقت ہے۔ مثلاً اگر ایک آدمی نے روزہ رکھا اور اس نے دن بھر کچھ کھایا پیا نہیں تو اُس نے روزے کی ظاہری شکل کو تو پورا کر دیا لیکن اگر وہ دن بھر خدا کو بھولا رہا اور روزے کی حالت میں ہر طرح کے ناجائز افعال کرتا رہا تو اگرچہ اس کے متعلق یہ تو نہیں کہا جائے گا کہ اس نے روزہ ہی نہیں رکھا، یا اس کا روزہ ٹوٹ گیا کیوں کہ اس نے جھوٹ بولا تھا یا کسی پر بہتان لگایا تھا یا کسی کا حق مارا تھا۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس نے روزے کے اصلی مقصد کو فوت کر دیا۔ اس کا روزہ ویسے ہی بے جان ہے جیسے کوئی مردہ اور بے جان وجود......... اس طرح درحقیقت اس شخص نے اپنے روزے سے سوائے بھوک پیاس کے اور کچھ حاصل نہیں کیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص رمضان کی راتوں میں قیام کرتا ہے اور خدا کی عبادت میں وقت گزارتا ہے تو اس کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے قیام نہیں کیا، یا عبادت نہیں کی لیکن اگر اس نے اپنے اس قیام میں صحیح معنوں میں رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا نہیں کی اور اپنی عبادت کی بنا اخلاص پر نہیں رکھی تو اس کا یہ عبادت کرنا اور راتوں کو کھڑا ہونا محض ایک مشینی عمل ہے جس میں کوئی جان اور روح نہیں ہے۔ اس سے اسے سوائے رت جگے کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

پس شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ آپ کے اعمال ظاہری شکل کے اعتبار سے بھی قانون کے مطابق ہوں اور ان کے اندر حقیقی روح بھی موجود ہو......... اعمال کی یہ حقیقی روح ہے اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کی محبت، اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ، اس کے حضور جواب دہی کا احساس، اس کا خوف اور اس کے احکام وقوانین کی ہمہ وقت پیروی اور ان کی بجا آوری کا خیال۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے اعمال کے اندر حقیقی روح پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہ ہوں تو ظاہری عمل کی حد تک تو قانون کی پابندی ہو جائے گی اور بظاہر آدمی اس کی خلاف ورزی سے بھی بچ جائے گا لیکن اعمال کی حقیقی روح سے محروم رہے گا۔ نتیجتاً اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس کے اعمال کی کچھ قدر و قیمت نہ ہوگی۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۳-۱۴۵)

روزے کا کفارہ

اگر ایک آدمی اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے اور قصداً روزہ توڑ دے تو اس کا پہلا کفارہ غلام آزاد کرنا ہے۔ اگر وہ یہ کفارہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو اس صورت میں دوسرا کفارہ یہ ہے کہ وہ دو مہینے کے مسلسل روزے رکھے، اس طرح کہ بیچ میں چھوڑے نہیں۔ اگر وہ اس پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے سے مراد دونوں وقت کا پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہے اور اس طرح کا کھانا کھلانا جیسا کہ آدمی خود کھاتا ہے۔

یہاں تک تو مسئلے کی عمومی نوعیت تھی۔ اس کے بعد ایک خاص شکل سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان چیزوں میں سے کسی پر قادر نہ ہو تو اس کے لیے کیا حکم ہے......... [اس حوالے سے حدیث میں آتا ہے کہ] جب سائل نے کہا میں تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تینوں صورتوں میں کفارہ ادا کرنے پر قادر نہیں ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال زکوٰۃ میں سے جو آپؐ کے پاس آیا تھا اس شخص کی مدد فرمائی۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ بیت المال سے اس طرح کے لوگوں کی مدد کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی کسی غلطی کا مرتکب ہو جائے جس سے اس نوعیت کا شدید کفارہ لازم آجاتا ہے اور وہ یہ کفارہ ادا کرنے پر قادر بھی نہ ہو تو اس کے لیے دو ہی راستے ہیں یا تو وہ اس وقت تک انتظار کرے جب تک کہ اس کو ان تینوں چیزوں میں سے کسی ایک کی قدرت حاصل ہو جائے۔ (اور ہوسکتا ہے کہ اسی انتظار میں اس کی عمر گزر جائے) یا یہ کہ بیت المال سے اس کی مدد کی جائے، یا کچھ دوسرے نیک لوگ اس کی مدد کریں۔ معلوم ہوا کہ مالِ زکوٰۃ اس چیز پر بھی صرف کیا جاسکتا ہے جس طرح کسی ایسے مقروض کا قرضہ بیت المال سے ادا کیا جاسکتا ہے جو خود قرضہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو، اسی طرح اگر کسی شخص پر اس طرح کے کفارے لازم آگئے ہوں تو ان کفاروں کے ادا کرنے سے مالِ زکوٰۃ سے اس کی مدد کی جاسکتی ہے اگر بیت المال موجود نہ ہو تو جو لوگ زکوٰۃ نکالتے ہیں وہ مالِ زکوٰۃ سے اس کی مدد کریں تاکہ ان کا ایک مسلمان بھائی جس پیچیدگی میں پھنس گیا ہے اس سے نکل جائے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۰-۱۳۱)

فقہا کا اختلاف

فقہا کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ کفارہ (جس کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی ہے) آیا اس صورت میں واجب آتا ہے جب کہ مباشرت روزہ توڑنے کی وجہ بنی ہو یا اس صورت میں بھی واجب آتا ہے جب کہ آدمی قصداً کھا پی لے۔ فقہا کا ایک گروہ یہ رائے رکھتا ہے کہ کفارہ صرف اس صورت میں لازم آتا ہے جب کہ مباشرت روزہ توڑنے کا سبب بنی ہو۔ دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اگر آدمی نے کسی طرح بھی قصداً روزہ توڑ دیا ہے تو اس سے بھی کفارہ لازم آتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالک کے نزدیک تمام شکلوں میں جب کہ روزہ توڑا جائے کفارے کی یہی شکل ہے۔

اس حدیث میں ایک بہت ہی خاص بات بھی آئی ہے (اور وہ یہ) کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سائل نے یہ کہا کہ مدینے میں مجھ سے بڑھ کر کوئی مفلس نہیں ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ اچھا یہ کھجوریں لے جاؤ اور اپنے ہی اہل و عیال پر صدقہ کر دے۔ اس سلسلے میں بعض فقہا کا قول یہ ہے کہ یہ معاملہ صرف اس شخص کے لیے خاص تھا، دوسرے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے (واللہ اعلم بالصواب) کہ جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سہولت اور فراخی رکھی ہے اس میں کسی اور کو تنگی کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اگر کوئی آدمی ایسی حالت میں ہے کہ اسے خود کھانے کو نصیب نہیں ہے اور آپ اس کے ہاتھ میں مال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے غریبوں پر صدقہ کر دے تو سوال یہ ہے کہ آخر خود اسے یہ مال لینے کا حق کیوں نہیں پہنچتا۔ یہ صدقہ تو وہ شخص دے جس کے پاس کم از کم کھانے کو تو موجود ہو۔ لیکن جو اس فکر میں ہے کہ رات کو میرے بچے کھائیں گے کیا اور آپ اس کے ہاتھ سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاتے ہیں تو یہ بات یقیناً محل نظر ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں شریعت کا منشا یہ نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے ایک مسئلہ شرعی معلوم ہوتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فعل جذباتی نہیں تھا اور آپؐ کے ہر فعل سے دراصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کے حدود کیا ہیں اور اس کی حقیقی روح کیا ہے؟ چنانچہ اگر کسی شخص سے کوئی ایسا قصور ہو جائے جس سے کفارہ لازم آتا ہو اور وہ شخص فی الواقع خود صدقے کا مستحق ہو تو بیت المال سے اس کی مدد کرنا جائز ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ایک مرتبہ اس مال کا مالک بنا دیا جائے اور پھر اسے کہا جائے کہ تجھے صدقہ کرنے کا پورا حق ہے لیکن اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ تو خود ہی صدقے کا مستحق ہے تو خود بھی اسے استعمال کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل یہ بتا رہا ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۱-۱۳۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ہشتم

نفلی روزے

[نفلی روزوں کے لیے عربی میں صیام التطوع کا لفظ استعمال ہوتا ہے] تطوع کے معنی ہیں اپنی رضا و رغبت سے کوئی کام کرنا، یہ فرض کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ فرض تو وہ چیز ہے جس کی پابندی کرنا ضروری ہوتا ہے، لیکن تطوع وہ چیز ہے جو آدمی خود اپنی مرضی سے کرے، بغیر اس کے کہ وہ اس پر فرض اور لازم کی گئی ہو۔ چنانچہ صیام التطوع سے مراد نفلی روزے ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۱)

نفلی روزے کی فضیلت

حضرت اُمّ عمارہ بنت کعبؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لائے تو انھوں نے آپؐ کے سامنے کھانا پیش کیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم بھی کھاؤ تو انھوں نے عرض کیا کہ میں روزے سے ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر روزہ دار آدمی کے پاس کھانا کھایا جائے (اور وہ اس میں شریک نہ ہو، تو فرشتے اس کے لیے اس وقت تک دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں جب تک کہ لوگ کھانا کھانے سے فارغ نہ ہو جائیں۔[1] (احمد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

یہ ایک بہت بڑی بات ہے کہ آدمی نفلی روزہ رکھتے ہوئے ہو اور وہ یہ حق رکھتے ہوئے بھی کہ وہ روزہ کھول کر کھا پی سکتا ہے، اپنا روزہ پورا کرے۔ دوسرے لوگ اس کے سامنے کھا پی رہے ہوں لیکن وہ روزے سے رہے۔ اس کے اندر صبر اور ضبطِ نفس کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اور اس کے دل میں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا جو جذبہ کارفرما ہے اس کی وجہ سے ملائکہ برابر اس کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۵۷-۲۵۸)

حضرت بُریدہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت بلالؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت دن کا کھانا کھا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: بلال! آؤ کھانے میں شریک ہو جاؤ۔ انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں روزے سے ہوں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: ہم اپنا رزق کھا رہے ہیں اور بلال کا بہترین رزق جنت میں ہے۔ اے بلال! تمھیں معلوم ہے کہ جب تک لوگ روزہ دار کے پاس کھانا کھاتے رہتے ہیں اس کی ہڈیاں تسبیح میں لگی ہوتی ہیں اور ملائکہ اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں۔[2] (بیہقی)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۸۸-۲۸۹، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۹۰، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ چیز کہ ایک آدمی کو کھانے کے لیے بلایا جائے اور کھانا سامنے موجود ہونے کے باوجود وہ اپنا نفلی روزہ پورا کرے، اتنا بڑا اجر رکھتی ہے کہ اس شخص کے لیے کھانا جنت میں محفوظ کر دیا جاتا ہے اور جتنی دیر تک لوگ اس کے پاس بیٹھے کھاتے رہیں اتنی دیر تک اس کی ہڈیاں تسبیح میں لگی ہوتی ہیں اور ملائکہ اس کے لیے استغفار کر رہے ہوتے ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۵۹-۲۶۰)

نفلی اعمال کی اصل روح[1]

نفلی اعمال کی اصل روح تو یہ ہے کہ انھیں چھپا کر کیا جائے نہ یہ کہ اعلان کر کے کیا جائے۔ اس لیے ان کا ظاہر کرنا بھی ناپسندیدہ ہے اور ان کے متعلق دریافت کرنا بھی غلط ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص سے یہ پوچھیں کہ آپ تہجد میں کتنی رکعتیں پڑھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تو وہ آپ کے سامنے یہ اقرار کرے کہ میں تہجد پڑھتا ہوں اور اس کی رکعتیں اور دوسری تفصیلات بھی بتائے۔ تہجد تو ہے ہی ایک ایسی نماز کہ آپ اسے لوگوں سے چھپا کر پڑھیں تاکہ آپ کے اور آپ کے رب کے درمیان وہ ایک راز رہے اور دوسرا کوئی شخص اسے جان نہ سکے۔ جس طرح فرائض کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ علانیہ ادا کیے جاتے ہیں اس طرح نوافل کی روح یہ ہے کہ انھیں زیادہ سے زیادہ چھپا کر انجام دیا جائے ....

.... اگر کوئی شخص مسلسل روزہ رکھتا چلا جائے اور کوئی وقفہ نہ کرے تو یہ گویا اس کی عادت ہی بن گئی۔ اس کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جس نے دن میں صرف ایک وقت کھانا کھانے کی عادت ڈال لی ہو۔ ظاہر بات ہے کہ اس طرح نفلی روزے رکھنے کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔ اب تو اسے بھوک ہی اس وقت لگے گی جو اس نے اپنے کھانے کے لیے مقرر کر لیا ہے۔ باقی اوقات میں تو وہ گویا روزے سے ہے ہی نہیں۔ اس لیے آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص ہمیشہ روزہ رکھتا ہے تو گویا نہ اس نے روزہ رکھا اور نہ کبھی افطار کیا۔

[آپؐ نے مزید فرمایا] کیا کوئی شخص یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ دو دن روزہ رکھے اور ایک دن چھوڑے؟ مراد یہ ہے کہ آدمی کا مسلسل یہ طریقہ اختیار کرنا ایک بہت بڑی مشقت ہے جس سے عہدہ برآں ہونے پر شاید ہی کوئی قادر ہو سکتا ہو۔

حضرت عمرؓ کے یہ دریافت کرنے پر کہ وہ شخص کیسا ہے جو ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن چھوڑے۔ آپؐ نے فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اسی طرح کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کرو یا نہ کرو۔ بس یہی فرمانے پر اکتفا کیا کہ اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے طریقے پر عمل کرے گا۔

جب حضرت عمرؓ نے یہ سوال کیا کہ وہ شخص کیسا ہے جو ایک دن روزہ رکھے اور دو دن چھوڑ دے، تو آپؐ نے اس طریقے کو پسندیدہ تو قرار دیا لیکن فرمایا کہ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ میں اس پر ہمیشہ عمل کر سکوں۔ مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اتنی طاقت رکھتا

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۱۶-۲۱۹، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوتو وہ ایسا کرسکتا ہے لیکن اگر اتنی طاقت نہ رکھتا ہوتو ایسا نہ کرے............

......جب حضرت عمرؓ کے سوالات ختم ہو گئے تو اب خود حضورؐ نے نفلی روزوں کے متعلق ہدایات ارشادفرمائیں۔فرمایا کہ ہر مہینے کے تین روزے رکھنا اور پھر رمضان کے پورے مہینے کے روزے رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص ہمیشہ ہی روزے رکھے۔

مراد یہ ہے کہ نفلی عبادات کے سلسلے میں لوگوں کو اتنی لمبی چوڑی مشقتیں اٹھانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ انھیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں وہ فرائض بھی انجام دینے ہیں جو خلافت الٰہیہ کے سلسلے میں ان پر عائد ہوتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ انھیں اپنے بال بچوں کا بھی پیٹ پالنا ہے اور دنیا کے دوسرے کام بھی انجام دینے ہیں۔اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے فرائض اور نوافل کے درمیان توازن اور اعتدال قائم رکھیں اور نوافل کے لیے اپنے آپ کو ایسی مشقت میں نہ ڈالیں کہ اس کا اثر فرائض پر پڑے۔

ہر مہینے کے تین نفلی روزوں اور رمضان کے پورے مہینے کے روزوں کی فضیلت بیان کرنے کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ مزید برآں اگر آدمی عرفہ کے دن کا روزہ بھی رکھے تو اس کی فضیلت یہ ہے کہ اس سے ایک سال قبل اور ایک سال بعد کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور اگر عاشورہ کے دن کا روزہ رکھے تو وہ ایک سال قبل کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا.......... معلوم ہوا کہ عرفہ کا روزہ عاشورہ کے روزے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

یہاں کفارے کے متعلق کسی کو غلط فہمی نہ ہو کہ جب عرفہ کے دن کا روزہ آدمی کے ایک سال پہلے کے اور ایک سال بعد کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا تو اب کھلی چھوٹ ہے کہ وہ عرفہ کا روزہ رکھے اور ایک سال تک جو جی چاہے کرتا رہے.......... پچھلے سال کا حساب بھی صاف اور اگلے سال کے لیے بھی چھٹی مل گئی......ایسی احادیث کے مخاطب دراصل وہ لوگ نہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرنے کے بہانے تلاش کررہے ہوں بلکہ ان کے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کو رات دن یہ فکر رہتی تھی کہ ہم کون سا کام ایسا کریں جس سے ہمیں اپنے رب کی خوشنودی اور تقرب نصیب ہو جائے چنانچہ اس طرح کی باتیں دراصل ان لوگوں کو شوق دلانے کے لیے فرمائی گئی ہیں تا کہ وہ اللہ کے ہاں زیادہ سے زیادہ تقرب حاصل کرنے کی کوشش کریں..........
یہ روزے ان گناہوں کا کفارہ نہیں بنتے جو آدمی جان بوجھ کر بےخوفی اور ڈھٹائی کے ساتھ کرے، بلکہ یہ کفارہ ہیں ان خطاؤں اور اعمال کا جو آدمی سے بشری کمزوریوں کی بنا پر سرزد ہو جاتے ہیں درآنحالیکہ اس کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پوری پوری فرماں برداری کرے.......... پھر یہ کفارہ ہیں آدمی کی ایسی لغزشوں کا جن سے توبہ کرنے کا اسے موقع نہیں ملا، اور پھر وہ انھیں بھول گیا یا کسی وجہ سے اس سے غفلت ہو گئی۔اب چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بنیادی طور پر ایک فرماں بردار بندہ ہے اس لیے اس کے نیک اعمال اس کی خطاؤں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔یہ سراسر اپنے بندوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے کیوں کہ وہ مغفرت کرنا چاہتا ہے غلطیوں اور خطاؤں پر پکڑنا نہیں چاہتا۔وہ رحیم ہے اس لیے چاہتا ہے کہ کوئی کام بندے سے ایسا ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اسے بخش دے۔چنانچہ ایک بندۂ مومن کی نفل عبادات (خواہ وہ نفلی نمازیں ہوں یا نفلی روزے یا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نفلی صدقات) سب کی سب اس کی لغزشوں اور خطاؤں کا کفارہ اور گناہوں کی معافی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۹۷-۲۰۱)

نفلی عبادات میں اعتدال

حضرت عمرو بن العاصؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: اے عبداللہ! کیا میں نے یہ ٹھیک سنا ہے کہ تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور رات رات بھر کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: ہاں یارسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: اچھا اب ایسا مت کیا کرو، روزہ رکھو بھی اور نہ بھی رکھو، اور راتوں کو کھڑے ہو کر عبادت بھی کیا کرو اور سویا بھی کرو کیونکہ تمھارے جسم کا بھی تم پر ایک حق ہے اور تمھاری آنکھوں کا بھی تم پر ایک حق ہے اور تمھاری بیوی کا بھی تم پر ایک حق ہے اور تمھارے ہاں ملاقات کے لیے آنے والے کا بھی تم پر ایک حق ہے۔ جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے گویا کوئی روزہ نہیں رکھا۔ ہر مہینے میں تین دن کے روزے رکھنا گویا صومِ دھر (ہمیشہ روزہ رکھنے کے مترادف) ہے۔ ہر مہینے تین روزے رکھو اور قرآن مہینے میں ایک مرتبہ پورا پڑھ لیا کرو.......... میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اچھا پھر تم افضل ترین روزہ رکھو اور وہ حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے، یعنی ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن افطار کرنا (یعنی روزہ نہ رکھنا) اور ہر سات راتوں میں ایک مرتبہ قرآن ختم کر لیا کرو اور اس پر اضافہ ہرگز نہ کرو۔[1] (متفق علیہ)

آنکھوں کے حق سے مراد یہ ہے کہ کبھی تم انھیں جاگتے ہوئے کھلا رکھو اور کبھی انھیں سونے کے لیے بند رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ تم دن بھر بھی جاگتے رہو اور پھر رات کو بھی آرام نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی جو عظیم الشان نعمت تمھیں عطا کی ہے تم اس کے ساتھ زیادتی اور ناقدری کا معاملہ کرنا چاہتے ہو۔

ملاقات کے لیے آنے والے کے حق سے مراد یہ ہے کہ اگر تم رات رات بھر کھڑے ہو کر عبادت کرتے رہے اور پھر دن کو تم نے روزہ بھی رکھا تو ظاہر ہے کہ تمھارے اندر طبیعت کی وہ تازگی اور شگفتگی باقی نہیں رہ سکتی جس سے کسی ملنے والے کا استقبال کیا جائے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ مثلاً گرمی کا زمانہ ہے اور آپ روزے سے ہیں۔ اس حالت میں جو شخص بھی آپ سے ملنے کے لیے آتا ہے آپ اس سے اس شگفتگی اور دل کی کشادگی سے پیش نہیں آسکتے جس سے دوسری حالت میں پیش آسکتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ آنے والے کو تو یہ معلوم ہونا ضروری نہیں کہ آپ روزے سے ہیں۔ اگر آپ نے بے دلی کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور روکھے پن سے اس سے گفتگو کی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا برا مانے اور یہ محسوس کرے کہ یہ عجیب انسان ہے جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ چل کر ملنے کے لیے آنے والے سے کس اخلاق سے پیش آنا چاہیے۔

۱۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۳۸-۲۴۵، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نفلی روزہ رکھنے والوں کو خاص طور پر اس کا عملی تجربہ ہوا ہوگا کہ خصوصاً گرمی کے زمانے میں جب آدمی ایک لمبے روزے سے ہو اور کوئی شخص افطار کے قریب ملنے کے لیے آجائے تو بعض اوقات آدمی اس سے بڑے روکھے پن سے ملتا ہے۔ اب چونکہ نفلی روزے میں آدمی خود تو یہ ظاہر نہیں کرتا کہ وہ روزے سے ہے اور آنے والے کو اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ شخص روزے سے ہے اس لیے اس سے بعض اوقات بڑی شکایت پیدا ہوتی ہے اور تعلقات میں کشیدگی تک واقع ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے .... یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ نگاہ ہے کہ آپؐ نے یہ ساری چیزیں گنا کر بتا دیں کہ اگر ہمیشہ روزہ رکھو گے اور راتوں کو کھڑے ہو کر نمازیں پڑھتے رہو گے اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو گے تو اس طرح اپنے جسم، اپنی آنکھوں، اپنی بیوی اور اپنے ملنے والوں سب کے ساتھ زیادتی کرو گے اور ان میں سے کسی کا حق ٹھیک طرح سے ادا نہیں کر سکو گے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر آدمی پر ہر وقت خشکی طاری رہے تو نہ عام لوگوں کے ساتھ ہی اس کے تعلقات خوشگوار رہ سکتے ہیں اور نہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی وہ صحیح سلوک کر سکتا ہے۔ ہر شخص بجا طور پر دوسرے سے اچھے برتاؤ کی توقع رکھتا ہے لیکن جب وہ توقع پوری نہیں ہوتی تو فطری طور پر اس کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۱۴-۲۱۷)

نفلی روزے کے متعلق آپؐ کی ہدایت

حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر مہینے تین دن کے روزے رکھا کروں اور ان کی ابتدا پیر سے یا جمعرات سے کیا کروں۔[1] (ابوداؤد، نسائی)

نفلی روزوں میں کوئی لگا بندھا طریقہ نہیں ہے۔ اگر حضورؐ نے ہر شخص کو چند مخصوص دنوں ہی میں روزہ رکھنے کے لیے کہا ہوتا تو یہی قانون بن جاتا اور پھر جو شخص بھی نفلی روزہ رکھتا انھی دنوں میں رکھتا۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقے بتائے تاکہ جب وہ جمع کیے جائیں تو معلوم ہو کہ اس معاملے میں کوئی ایک ہی مقرر طریقہ نہیں ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۷-۲۲۸)

مختلف روایات میں تطبیق

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہینے ہفتہ، اتوار اور پیر کا روزہ رکھتے تھے اور دوسرے مہینے منگل بدھ اور جمعرات کا روزہ رکھتے تھے۔[2] (ترمذی)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی جو روایت اس سے پہلے گزری ہے وہ اس سے بالکل مختلف کیوں ہے؟

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۳۸-۲۴۵، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۵۳-۲۵۴، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

......اصل بات یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک مدت دراز یعنی ۴۷،۴۸ سال تک بقید حیات رہیں۔ چوں کہ لوگوں کو حضورؐ کے معمولات، آپؐ کی ہدایات واحکام اور آپؐ کی زندگی کے حالات کی مستقل جستجو اور کھوج رہتی تھی اس لیے وہ سیکڑوں، ہزاروں میلوں سے سفر کر کے مدینے آتے تھے اور خاص طور پر حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، کیوں کہ ان کے متعلق لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زیادہ تفصیل سے جانتی اور بیان فرماتی ہیں۔ چنانچہ اس طویل مدت کے دوران میں مختلف اوقات میں بے شمار لوگوں نے آ کر ان سے حضورؐ کے حالات دریافت کیے ہیں۔ اب چوں کہ ہر حدیث میں ہر بات کا پس منظر تو بیان نہیں کیا جاتا بلکہ صرف اتنی بات مذکور ہوتی ہے جو اس حدیث کے باب کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو۔ اس لیے اس چیز کا تعین کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ اصل مفصل گفتگو کیا ہوئی تھی جس کا ایک حصہ راوی نے روایت کیا ہے۔ اس بنا پر مختلف روایات کے اختلافات کو مختلف احوال وشئون کے لحاظ سے مختلف نوعیت کے جوابات اور بیانات پر محمول کیا جائے گا اور اسے تضاد قرار نہیں دیا جائے گا............ حضرت عائشہؓ نے کسی شخص کے پوچھنے پر یہ بتایا کہ حضورؐ پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتے تھے تو وہ شخص وہی بات پلے باندھ کر لے گیا اور اس نے اُسی کو جا کر روایت کیا۔ اسی طرح کسی دوسرے شخص سے کسی اور موقع پر حضرت عائشہؓ نے یہ ذکر کیا کہ حضور کسی مہینے فلاں دنوں کے روزے رکھتے تھے اور کسی مہینے فلاں دنوں کے، اور اگر ایک مہینے میں ایک دفعہ تین دن کے روزے رکھ لیتے تھے تو پھر دوسرے مہینے میں دوسرے تین دنوں کے روزے رکھ لیتے تھے تاکہ ہر دو مہینوں میں ہفتے کا کوئی دن ایسا نہ ہو جس میں آپؐ نے روزہ نہ رکھا ہو، تو اس شخص نے اُسی چیز کو روایت کیا...... چنانچہ دراصل اس طرح کی مختلف روایات مختلف مواقع سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے متعلق یہ سوال اٹھانا کوئی معقول بات نہیں کہ نفلی روزوں کے بارے میں حضرت عائشہؓ کے علم میں حضورؐ کے جو مختلف معمولات آئے تھے۔ انھوں نے وہ ہر گفتگو میں ہر ایک کے سامنے سب کے سب کیوں نہ بیان فرما دیے...... ایسا ہی معاملہ دوسرے صحابہؓ کا ہے۔ ان سے بھی مختلف روایات مروی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بعد میں آنے والے لوگ ان سے بکثرت مسائل پوچھتے رہے، کسی سے دس سال تک پوچھتے رہے، کسی سے تیس سال تک اور کسی سے چالیس سال تک۔ اس طرح ان ہزاروں لوگوں نے مختلف صحابہؓ سے مختلف مواقع پر جو بات سنی اسے انھوں نے اسی طرح سے روایت کیا۔ یہ چیز کسی تضاد کا نہیں بلکہ اس امر کا ثبوت ہے کہ سننے والوں نے جو بات معلوم کی تھی انھوں نے اسی کو آگے پہنچایا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۵-۲۲۷)

شعبان کے روزے

حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کے نفلی روزوں کا یہ طریقہ بیان فرمایا ہے کہ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ آپ مسلسل روزے رکھتے چلے جاتے تھے اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ مسلسل روزے رکھنا چھوڑ دیتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں حضورؐ نے نوافل کے بارے میں کوئی ایک مقرر طریقہ اختیار نہیں کیا ہوا تھا۔[1] (متفق علیہ)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۹۷-۱۹۹، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حضرت عائشہ نے دوسری بات یہ بیان فرمائی ہے کہ رمضان کے سوا آپؐ نے کبھی کسی پورے مہینے کے روزے نہیں رکھے۔ البتہ شعبان ایسا مہینہ تھا جس میں آپؐ باقی مہینوں سے زیادہ روزے رکھا کرتے تھے اور بسا اوقات شعبان میں اتنے روزے رکھتے تھے کہ گویا آپؐ نے پورے مہینے ہی کے روزے رکھ لیے۔ اس چیز کا خاص طور پر ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے دوسرے لوگوں کو یہ ہدایت فرما دی تھی کہ نصف شعبان کے بعد نفلی روزے نہ رکھے جائیں کیوں کہ اس سے انسان کو ایسی کمزوری لاحق ہو سکتی ہے جو رمضان کے روزوں پر اثر انداز ہونے والی ہو۔ البتہ وہ لوگ ان سے مستثنیٰ ہیں جن کے ذمے مثلاً قضا یا نذر کے روزے رہ گئے ہوں یا کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو ان خاص دنوں میں ہی نفلی روزے رکھنے کے عادی ہوں۔ چنانچہ اس طرح کی مستثنیٰ صورتوں کو چھوڑ کر حضورؐ کی عام ہدایت یہی تھی............معلوم ہوا کہ حضورؐ کی یہ ہدایت صرف دوسرے لوگوں کے لیے تھی اور آپؐ کا اپنا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ شعبان میں زیادہ سے زیادہ روزے رکھا کرتے تھے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۲-۱۸۳)

شعبان کے آخری دو دنوں کا مسئلہ

حضرت عمران بن حصینؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا (یا یہ ہے کہ حضورؐ نے کسی دوسرے شخص سے دریافت فرمایا اور میں سن رہا تھا)[1]: اے فلاں! کیا تم نے شعبان کے آخری دو دن کے روزے نہیں رکھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: (کہ اگر تم نے ان دو دنوں کے روزے نہیں رکھے تو) جب تم موجودہ (رمضان کے روزوں سے فارغ ہو جاؤ تو کچھ دوسرے دنوں کے روزے (ان کے بدلے میں) رکھ لینا[2] (متفق علیہ)

............جو راوی حضرت عمران بن حصینؓ سے یہ حدیث روایت کر رہے ہیں وہ غالباً فقیہ نہیں تھے، اس لیے انھوں نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ یہ سوال حضورؐ نے اُن سے کیوں کیا تھا اور انھیں وہ روزے رکھنے کی تاکید کیوں فرمائی تھی؟ اس وجہ سے یہ غلط فہمی لاحق ہوتی ہے کہ کیا شعبان کے آخری دو دنوں کا روزہ رکھنا ضروری ہے اور اگر ایک آدمی یہ روزے نہ رکھ سکا ہو تو کیا بعد کے دنوں میں ان کی قضا لازم آ جاتی ہے؟............

دوسری روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غالباً صورت یہ پیش آئی تھی کہ وہ صاحب جن سے حضورؐ نے یہ سوال کیا تھا، ان کے ذمے یا تو قضا یا نذر کے روزے تھے یا وہ ان دنوں میں نفلی روزوں کا التزام کیا کرتے تھے......

چوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرھویں شعبان کے بعد روزے نہ رکھنے کی ہدایت فرما دی تھی اس لیے انھوں نے ان دنوں میں روزے رکھنے بند کر دیے............اس پر حضور نے انھیں مسئلہ بتانے کے لیے یہ سوال دریافت فرمایا کہ کیا تم نے ان دنوں کے روزے رکھ لیے؟ جب انھوں نے کہا کہ نہیں رکھے تو آپؐ نے فرمایا کہ اب ان کے بدلے میں دوسرے دنوں کے روزے رکھ لینا

۱- بعد کے راویوں کو یہ شک ہو گیا ہے کہ حضورؐ کا سوال کس سے تھا؟ (مؤلف)

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۰۰-۲۰۱، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تا کہ جو التزام تم کیا کرتے ہو وہ پورا ہو جائے (یا تمھارے ذمے نذر یا قضا کے جو روزے ہیں وہ ادا ہو جائیں)

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۵-۱۸۶)

محرم کے روزے

(حدیث میں آیا ہے) کہ رمضان کے سوا دوسرے دنوں میں سب سے زیادہ بہتر دن جن میں روزہ رکھا جائے محرم کا مہینہ ہے۔[1] (مسلم)

یہاں عاشورہ یعنی دسویں محرم کے روزے کے بارے میں یہ بات سمجھ لیجیے کہ اس کی فضیلت اس وجہ سے نہیں ہے کہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا دن ہے بلکہ عاشورہ کی اہمیت بہت پہلے سے ہے...... بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو فرعون کے مظالم سے نجات اس روز نصیب ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شکرانے کے طور پر پابندی کے ساتھ اس دن کا روزہ رکھا کرتے تھے چونکہ یہ حضرت موسیٰؑ کی سنت تھی اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عاشورہ کے دن کے روزے کو افضل قرار دیا اور اس کے رکھنے کی ہدایت فرمائی۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۹)

حضورؐ کا عمل یہ تھا کہ جس طرح آپؐ رمضان کے پورے مہینے کے روزے رکھنے کا التزام فرماتے تھے اسی طرح آپؐ عاشورہ کے دن کا روزہ رکھنے کا التزام بھی فرماتے تھے۔ اس سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حضورؐ کے نزدیک عاشورہ کے دن کی فضیلت باقی دنوں کی نسبت زیادہ ہے۔[2]

واضح رہے کہ عاشورہ کے روزے کی فضیلت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اپنا ارشاد نہیں ہے کہ عاشورہ کے دن کا روزہ سب سے افضل ہے بلکہ یہ ایک نتیجہ ہے جو حضرت عبداللہؓ بن عباس نے حضورؐ کے اس التزام کو دیکھ کر خود اخذ کیا۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ ایک اور حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرفہ کے دن کی فضیلت عاشورہ کے دن سے بھی زیادہ ہے اس سے یہ تاثر پیدا ہو سکتا ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں اختلاف یا تناقض پایا جاتا ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۹۰)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ جب (ایک دفعہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشورہ کے دن کا روزہ رکھا اور اس کے رکھنے کا حکم دیا تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ تو ایک ایسا دن ہے کہ جس کی تعظیم یہود و نصاریٰ بھی کرتے ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو محرم کی نویں تاریخ کا روزہ بھی رکھوں گا۔[3] (مسلم)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۰۳-۲۰۴، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۰۶-۲۰۷، اشاعت دوم۔

۳- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۰۸-۲۱۳، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات لوگوں نے حضورؐ کی حیات طیبہ کے آخری سال میں عرض کی تھی۔ اس سے پہلے جب آپؐ عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے تو اس وقت کسی نے آپؐ کی توجہ اس طرف مبذول نہیں کرائی۔ لیکن جب آپؐ نے آخری سال یہ روزہ رکھا تو صحابہؓ نے آپؐ سے یہ بات عرض کی۔ اس سے غالباً اُن کا منشا یہ نہیں تھا کہ آپؐ یہ عمل نہ فرمائیں۔ بلکہ اپنے نزدیک وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ یہود و نصاریٰ کے ہاں بھی اس دن کی فضیلت ہے اور آپؐ نے بھی اسے افضل قرار دیا ہے، ہوسکتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اس سے ہمارے تقلید کرنے کا پہلو نکال لیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نویں محرم کا روزہ بھی ضرور رکھوں گا۔ تاکہ میرا عمل یہود و نصاریٰ کے عمل سے مختلف ہو جائے اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص عاشورہ کا روزہ رکھنے کا ارادہ کرے اسے چاہیے کہ وہ اس سے ایک دن پہلے یا بعد کا روزہ بھی اس کے ساتھ ملائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کام کے کرنے کی خواہش یا ارادہ کا اظہار کرنا بھی اس کے سنت ہونے کی دلیل ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۹۱-۱۹۲)

روزۂ عاشورہ

حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں یوم عاشورہ کے روزے کا حکم دیا کرتے تھے۔ اور ہمیں اس پر ابھارتے تھے اور ہم سے دریافت کرتے تھے کہ کس کس نے روزہ رکھا ہے۔ پھر جب رمضان کے روزے فرض کر دیے گئے تو اس کے بعد نہ تو آپؐ نے ہمیں عاشورہ کے دن کا روزہ رکھنے کا حکم دیا، نہ اس سے منع فرمایا اور نہ پوچھا کہ کس کس نے روزہ رکھا ہے۔[۱] (مسلم)

یَحُثُّنَا (یعنی ہمیں ابھارتے تھے) کے الفاظ واضح کر دیتے ہیں کہ آپؐ نے عاشورہ کے روزے کو فرض یا واجب قرار نہیں دیا تھا بلکہ بس وہ ایک نیکی کا کام ہے جس پر حضور لوگوں کو ابھارتے تھے۔

یتعاھدنا عندہ کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ ہم سے پوچھا کرتے تھے کہ بھئی آج کس کس نے روزہ رکھا ہے۔ یہ بھی گویا ابھارنے اور ترغیب دلانے کا ایک طریقہ تھا جس سے لوگوں کو اس کی اہمیت سے آگاہ کرنا مقصود ہوتا تھا۔

پھر حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں جب رمضان کے روزے فرض کر دیے گئے تو اس کے بعد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو ہمیں عاشورہ کے دن کا روزہ رکھنے کا حکم دیا اور نہ اس سے منع کیا اور نہ پھر کبھی کسی سے پوچھا کہ آج کس نے روزہ رکھا ہے۔ اس طرح حضورؐ نے رمضان کی فرضیت کے بعد اس کی وہ پہلی اہمیت ختم کر دی۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۳۸-۲۳۹)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم ص ۲۶۹-۲۷۰، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عاشورہ ایک دینی یادگار

شریعت میں بعض دنوں کو یادگار کی حیثیت دی گئی ہے اور یادگار بنانے کے لیے ان دنوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کا کوئی غیر معمولی نشان ظاہر ہوا ہو، جیسے عاشورہ کا دن ہے کہ اس روز اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو مصر سے نکالا اور ان کی آنکھوں کے سامنے فرعون کو غرق کیا۔ چنانچہ یہ دن شریعت موسوی میں یادگار قرار پایا۔ اس یادگار کی یہ شکل مقرر نہیں کی گئی کہ اس میں مصر سے نکلنے کی کہانیاں اور قصے بیان کیے جائیں اور اس کو میلے ٹھیلے کا دن بنایا جائے بلکہ اس دن کا روزہ رکھنا طے کیا گیا.......... اسی طرح دیکھیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس روز اللہ کی راہ میں اپنے بیٹے کو قربان کرنے کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں دنبہ دے کر قربانی کرائی، اسی عظیم الشان تاریخی دن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا گیا اور تمام دنیا کے اہل ایمان کے لیے یہ طریقہ مقرر کر دیا گیا کہ وہ اس روز قربانی کر کے اس دن کی یاد تازہ کریں۔ اسی طرح جس مہینے میں قرآن نازل ہوا تھا اس پورے مہینے کو نزول قرآن کی یادگار بنا دیا اور اسی غرض کے لیے رمضان کے روزے مقرر کیے گئے.......... معلوم ہوا کہ شریعت یادگاروں کی اہمیت کو عملاً تسلیم کرتی ہے لیکن اس کے لیے وہ معیار اور آداب بھی خود مقرر کرتی ہے۔ اور اس کے یہ معیار اور آداب اس کی حقیقی روح کی نمائندگی کرتے ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۳۷)

حضورؐ کے چار معمول

حضرت حفصہؓ فرماتی ہیں کہ چار کام ایسے ہیں جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ترک نہیں فرماتے تھے:

۱۔ عاشورہ کا روزہ

۲۔ ذوالحجہ کے پہلے عشرے کے روزے

۳۔ ہر مہینے کے تین روزے اور

۴۔ فجر کے فرضوں سے پہلے دو رکعت سنت۔[۱] (نسائی)

اگرچہ حدیث کے متن میں عشرہ (دس) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن اس سے ذی الحجہ کے ابتدائی نو دن مراد ہیں کیونکہ دسواں دن تو عید الاضحیٰ کا ہے۔

نفلی روزوں کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف معمولات اور ان کی اہمیت کا تفصیلی ذکر گذشتہ احادیث میں آ چکا ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۰)

۱۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۱۷۲، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عرفہ کے دن روزہ

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات میں عرفہ کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمادیا تھا۔[1] (ابوداؤد)

حج ایک بڑی مشقت کا کام ہے اس لیے حضورؐ نے حالتِ حج میں روزہ رکھنے سے منع فرمادیا تھا۔ اصل میں آدمی کو ایک عبادت کا حق، .... جسے وہ انجام دے رہا ہو، پوری طرح ادا کرنا چاہیے۔ اگر وہ حج کر رہا ہے تو وہ حج ہی کا حق پوری طرح ادا کرے۔ حج کے اندر کٹوتی کر کے کچھ نفلی روزے کا بھی حق ادا کرنے کی کوشش کرنا، جس سے آدمی نہ پوری طرح حج کا حق ادا کر سکے اور نہ نفلی روزے کا، درست نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ حج تو خود ایک بہت بڑی نیکی اور بڑا اہم فریضہ ہے۔ اس کے ساتھ ایک نفلی عبادت بڑھا کر اپنے لیے ایسی مشقت پیدا کر لینا جس کی وجہ سے ایک شخص اس فریضے کے مناسک میں سے کوئی چیز چھوڑنے پر مجبور ہو جائے، کوئی معقول بات نہیں۔ یہاں تو دراصل نیکیوں میں بھی ایک توازن مطلوب ہے اور اسے ملحوظ رکھ کر ہی آدمی کو نیکی انجام دینی چاہیے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۳۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حج (یعنی حجۃ الوداع) کے موقع پر عرفات کے میدان میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے سے ہیں یا نہیں کیونکہ جب آپؐ مدینہ طیبہ میں تھے تو عرفہ کے دن (یعنی نویں ذی الحجہ) کا روزہ لازماً رکھا کرتے تھے۔ [صحابہ کرامؓ نے حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے] حضور صلی اللہ علیہ وسلم [کی خدمت میں دودھ کا ایک پیالہ بھیجا آپؐ] نے اونٹ کے اوپر ہی دودھ نوش فرمالیا تو سب کو معلوم ہوگیا کہ آج آپؐ روزے سے نہیں ہے۔[2] ....
اسی سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ عرفہ کا روزہ باقی سب مقامات پر تو رکھا جائے گا لیکن جو لوگ حج انجام دے رہے ہوں ان کے لیے اس کا نہ رکھنا ہی درست ہے، کیونکہ عرفات کے میدان میں جو دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے اور بعض اوقات سخت گرمی کے عالم میں کھلے میدان میں رہنا پڑتا ہے اس کے ساتھ اگر آدمی نے روزہ بھی رکھ لیا ہو تو اس سے سخت مشکل پیش آ سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ہوسکتا ہے کہ روزہ توڑنا پڑ جائے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کا روزہ نہیں رکھا اور پھر اپنے عمل سے بھی سب پر یہ بات واضح فرمادی کہ آپؐ روزے سے نہیں ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۹۳-۱۹۴)

ذوالحجۃ کا پہلا عشرہ

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی الحجہ کے ابتدائی دس دنوں

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم ص ۲۵۸، اشاعت دوم۔
۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم ص ۲۱۳-۲۱۴، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے (پورے) روزے رکھے ہوں۔ (مسلم)

حضرت عائشہؓ نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذی الحجہ کے پہلے دنوں کے روزے رکھنے کا التزام فرمایا کرتے تھے اور آپؐ نے اس کی ہدایت بھی فرمائی ہے۔ اس سے کوئی شخص یہ قیاس کرسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی یا ہمیشہ پہلے پورے ۹ دن کے روزے ضرور رکھتے ہوں گے۔

حضرت عائشہؓ کے اس قول کے بارے میں بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے علم میں یہ بات نہ آئی ہو کہ آپؐ مسلسل نو دن کے روزے رکھتے رہے ہیں [اس لیے انھوں نے فرمایا کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی الحجہ کے ابتدائی دس دنوں کے پورے روزے رکھے ہوں؟ جب کہ] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہوسکتا ہے کہ حضورؐ کا اپنا عمل چاہے یہ نہ ہو کہ آپؐ ان پورے دنوں کے روزے رکھنے کا التزام فرماتے ہوں لیکن جب آپؐ نے ان دنوں میں روزہ رکھنے کی بہت زیادہ فضیلت بیان فرمائی ہے تو کسی کے لیے اس بات میں مضائقہ نہیں ہے کہ وہ مسلسل ان دنوں کے روزے رکھے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۹۴-۱۹۵)

پیر کے روزے کی فضیلت

حضرت ابوقتادہ انصاریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوموار کے روزے کے متعلق سوال کیا گیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اسی دن کے اندر میں پیدا ہوا اور اسی روز مجھ پر قرآن نازل ہوا۔[1] (مسلم)

[یہاں] آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس دن کا روزہ رکھو یا نہ رکھو بلکہ صرف یہ فرمایا کہ اس دن کی فضیلت یہ ہے کہ یہ میرا یوم پیدائش بھی ہے اور نزول قرآن کے آغاز کا دن بھی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اس دن کا روزہ رکھے تو اس کے لیے اچھا ہے کیوں کہ اس میں یہ فضیلت پائی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایسا نہ کرے تو اس پر کوئی گرفت بھی نہیں ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۲)

ہر ماہ تین نفلی روزے

حضرت معاذہ عدویہؒ بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے تین دن کے روزے رکھتے تھے؟ انھوں نے فرمایا کہ ہاں۔ میں نے پھر عرض کیا: حضورؐ مہینے میں کون سے تین دنوں میں روزے رکھتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا: حضورؐ اس بات کی پروا نہیں کرتے تھے کہ مہینے میں کون سے تین دنوں میں روزہ رکھیں۔[2] (مسلم)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۲۲، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۲۳-۲۲۴، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مراد یہ ہے کہ حضورؐ نے نفلی روزوں کے لیے کوئی خاص تاریخیں اور دن مقرر نہیں کر رکھے تھے۔ آپؐ جس چیز کا التزام فرماتے تھے وہ یہ تھی کہ کوئی مہینہ ایسا نہ آجائے جس میں آپؐ نے تین دن کے نفلی روزے نہ رکھے ہوں۔

[ایک حدیث] میں فرمایا گیا ہے کہ اگر آدمی ہر مہینے میں تین دن کے روزے رکھے اور پھر رمضان کے پورے روزے رکھنے کے بعد شوال کے چھ دن کے مزید روزے رکھ لے تو یہ بھی ایسا ہے کہ جیسے اس نے ہمیشہ روزہ رکھا[1] .... ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہ سمجھنا چاہیے۔ درحقیقت اپنی اپنی جگہ دونوں کی یہی حیثیت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اگر کوئی شخص پہلی چیز پر عمل کرے گا تو اسے بھی ہمیشہ روزے رکھنے کا اجر ملے گا اور اگر دوسری چیز پر عمل کرے گا تو اس کا بھی یہی اجر ہوگا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۳-۲۰۴)

پیر اور جمعرات کے روزے

حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیر اور جمعرات کے دن نفلی روزہ رکھا کرتے تھے۔[2] (ترمذی، نسائی) ....

.... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دور گزر جانے کے بعد جب لوگوں نے مختلف صحابہؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کے بارے میں پوچھا تو جس صحابی کے علم میں جو چیز تھی اس نے وہ بیان کر دی۔ اس لیے جن احادیث میں کہیں اختلاف نظر آئے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ان میں کوئی تضاد پایا جاتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نفلی روزوں کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایک ہی لگا بندھا معمول نہیں تھا۔ کبھی آپؐ کسی طرح عمل کرتے تھے اور کبھی کسی طرح۔ کیونکہ نوافل کے معاملے میں آزادی ہے۔ فرض میں یہ ہوتا ہے کہ جو چیز مقرر کر دی گئی وہی مقرر ہے لیکن نوافل میں یہ پابندی نہیں ہوتی۔ نوافل کے معاملے میں مختلف زمانوں میں مختلف اوقات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مختلف رہا۔ چنانچہ جن لوگوں کے علم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو معمول تھا۔ انھوں نے وہی بیان کر دیا۔

یہاں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نفلی روزہ پیر اور جمعرات کے دن رکھا کرتے تھے۔ پیر کے دن کے متعلق پہلے ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ میں پیر کے روز پیدا ہوا ہوں اور پیر کے روز مجھ پر سب سے پہلے وحی نازل ہوئی۔ اسی لیے پیر کے دن کی یہ فضیلت ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۰-۲۲۱)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پیر اور جمعرات کے روز اعمال کی پیشی ہوتی

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۲۴، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۴۸، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرا عمل اس حالت میں پیش ہو کہ میں روزے سے ہوں[1] (ترمذی)......

رہا یہ سوال کہ پیر اور جمعرات کے روز اعمال کی کیسی پیشی ہوتی ہے تو اس کا علم صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ کوئی دوسرا شخص وضاحت کے ساتھ اس کو نہیں جان سکتا۔ کیونکہ اعمال کی پیشی کا ذکر مختلف صورتوں میں آیا ہے۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کس کس نوعیت کی پیشیاں ہوتی ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۱-۲۲۲)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیر اور جمعرات کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! آپؐ پیر اور جمعرات کا روزہ اکثر رکھتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: پیر اور جمعرات کے دن وہ ہیں کہ جن میں اللہ تعالیٰ ہر مسلم کی مغفرت فرماتا ہے۔[2] (احمد، ابن ماجہ)

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۳)

مغفرت کے...... دو معنی ہیں۔ ایک معنی ہیں کلی مغفرت کے اور دوسرے معنی ہیں جزوی مغفرت کے۔ کلی مغفرت یہ ہے کہ سارے قصور معاف کر دیے جائیں اور جزوی مغفرت یہ ہے کہ اس کی ایک ایک نیکی ایک ایک گناہ کا بدلہ ہوتی چلی جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ برائیوں پر پکڑ ہی لیا جائے .... آخرت میں حساب لگایا جائے گا کہ اس آدمی نے کتنی نیکیاں کی ہیں اور کتنی بدیاں اس سے سرزد ہوئی ہیں۔ اس کی نیکیوں کے حساب سے اس کی بدیاں چھانٹ دی جائیں گی اگر اس کے بعد بھی بدیاں باقی رہ جائیں گی تو اس صورت میں اسے سزا ملنے کا سوال پیدا ہوگا، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و احسان سے اس کو سزا دیے بغیر بخش دے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۶)

ہفتے اور اتوار کا روزہ

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نفلی روزوں میں اکثر ہفتے اور اتوار کا روزہ رکھا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ مشرکین کے عید کے دن ہیں (یعنی ان کے نزدیک مقدس دن ہیں) اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان کے خلاف عمل کروں۔[3] (احمد)

یہاں مشرکین سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ ہفتے کا دن یہودیوں کے ہاں اور اتوار کا دن عیسائیوں کے ہاں مذہبی تقدس کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہودیوں کے نزدیک ہفتے کا اور عیسائیوں (practising christians) کے نزدیک اتوار کا روزہ

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۴۹-۲۵۰، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۴۷، اشاعت دوم۔

۳- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۶۸-۲۶۹، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رکھنا نیکی ہے۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ میں ان دونوں دنوں کا روزہ رکھ کر دونوں کے خلاف کرتا ہوں۔ کیونکہ یہودی صرف ہفتے کے دن کا روزہ رکھتے ہیں اور اتوار کا نہیں رکھتے اور عیسائی صرف اتوار کا روزہ رکھتے ہیں ہفتے کا نہیں رکھتے۔ اس طرح اہل کتاب کے ہاں ان دونوں دنوں کی جس وجہ سے اہمیت تھی حضورؐ نے اس کو برقرار بھی رکھا۔ لیکن دونوں کے طریقوں کو اپنایا بھی نہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۳۸)

ایام بیض کے روزے

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام بیض (یعنی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ) کے روزے کبھی نہیں چھوڑتے تھے خواہ آپؐ گھر پر مقیم ہوں یا آپؐ سفر میں ہوں۔[۱] (نسائی)

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۱)

حضرت ابوذر غفاریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوذر! اگر مہینے میں تین دن کے روزے رکھنا چاہو تو تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ کے روزے رکھا کرو۔[۲]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد لوگوں کو یہ بات سکھائی ہے کہ اگر مہینے میں تین روزے رکھنے ہوں تو تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخوں کو رکھے جائیں۔ اگرچہ ایسا کرنا لازم نہیں ہے لیکن آپؐ نے اس طریقے کو پسند فرمایا ہے اور خود آپؐ کا عمل بھی یہ تھا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۲)

www.kitabosunnat.com

مہینے کے پہلے تین دنوں کے روزے

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے کے آغاز میں تین روزے رکھا کرتے تھے اور کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ جمعہ کا روزہ نہ رکھیں۔[۳] (ترمذی، نسائی، ابوداؤد)

اس حدیث میں دو باتیں وضاحت طلب ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی گذشتہ حدیث میں یہ آیا ہے اور دوسری حدیث سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ ہر مہینے کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ کو روزہ رکھا کرتے تھے اور اسی چیز کی آپؐ نے ہدایت بھی فرمائی ہے لیکن اس حدیث میں یہ بات آئی ہے کہ آپ مہینے کے آغاز میں روزہ رکھا کرتے تھے۔

۱۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۷۲، اشاعت دوم۔

۲۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۵۰-۲۵۱، اشاعت دوم۔

۳۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۵۱-۲۵۲، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

احادیث میں تطبیق

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ نفلی روزہ کسی اعلان کے ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ نہ آدمی خود اعلان کرتا ہے اور نہ کوئی لازمی موقع ایسا پیدا ہوتا ہے جس سے دوسروں کو یہ پتہ چل جائے کہ فلاں شخص روزے سے ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات خود بیوی تک کو یہ معلوم ہونا ضروری نہیں ہوتا کیوں کہ اگر شوہر نے کہیں باہر دن گزارا ہے اور گھر آ کر کھانا نہیں کھایا تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہوتا کہ لازماً اس نے کہیں باہر سے کھانا کھالیا ہے۔ چنانچہ لازمی طور پر کسی شخص کے روزے کا پتہ نہیں چل سکتا.......... اب جن لوگوں کو بعض آثار سے یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ آج حضورؐ روزے سے ہیں تو وہ اپنی جگہ یہ رائے قائم کرتے تھے کہ نفلی روزوں کے بارے میں حضورؐ کا معمول یہ ہے۔ اس طرح ہر ایک کا اپنا اپنا قیاس اور اندازہ ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے جو بات جس طرح کسی کے علم میں آئی اس نے اسی طرح بیان کردی۔ چنانچہ اگر کسی کے علم میں یہ بات آئی کہ آپؐ تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں کا روزہ رکھتے ہیں تو اس نے اسی بات کو بیان کیا۔ اگر کسی کے علم میں یہ آیا کہ آپؐ مہینے کے آغاز میں روزہ رکھتے ہیں تو اس نے اسی کو بیان کر دیا۔ لیکن یہ عین ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مہینے میں پندرہ دن کے روزے رکھ لیتے ہوں۔ کبھی مہینے کے آغاز میں، کبھی درمیان میں اور کبھی جمعہ کو بھی۔ اس طرح یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ حضورؐ مہینے میں صرف تین ہی دن کے روزے رکھتے تھے اور وہ فلاں فلاں تاریخ کے ہوتے تھے۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ بیان ان احادیث کے خلاف نہیں پڑتا جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں کا روزہ رکھتے تھے اور نہ یہ بیان ان احادیث کے خلاف پڑتا ہے جن میں بیان کیا گیا ہے کہ حضور پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتے تھے۔

جمعہ کے دن روزہ

دوسری بات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ فرمائی ہے کہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا روزہ نہ رکھتے ہوں۔ لیکن اس سے پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمعہ کے دن کو روزے کے لیے مخصوص کر لینے سے منع فرمادیا تھا۔ غور کرنے پر یہ اشکال بآسانی رفع ہوسکتا ہے۔ چوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا روزہ رکھنا اعلان کے ساتھ نہیں ہوتا تھا اور عام پتہ بھی نہیں چل سکتا تھا کہ آپؐ نے کس کس دن کا روزہ رکھا ہے۔ اس لیے جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو یہ چیز بکثرت دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ آپؐ نے جمعہ کا روزہ رکھا ہے تو انھوں نے اپنے قیاس سے یہ رائے قائم کی کہ آپؐ جمعہ کو اکثر و بیشتر روزہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی قطعی رائے نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے روزے رکھتے چلے آ رہے ہوں اور جمعہ کا روزہ بھی ان میں آ گیا ہو اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علم میں صرف جمعہ کا روزہ آیا ہو۔ اس لیے انھوں نے یہ سمجھا کہ حضورؐ بکثرت جمعہ کا روزہ رکھنے کا اہتمام فرماتے ہیں۔ اس امکانی صورت کی موجودگی میں ان کا یہ بیان ان احادیث کے خلاف نہیں پڑتا جن میں التزام کے ساتھ جمعہ کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۳-۲۲۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللہ کی راہ میں روزہ

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ٍ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ مَنْ صَامَ یَوْماً فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بَعَّدَ اللّٰہُ وَجْھَہٗ عَنِ النَّارِ سَبْعِیْنَ خَرِیْفًا[1] (متفق علیہ)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ کی راہ میں ایک دن کا روزہ رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ستر سال کے فاصلے تک جہنم کی آگ سے دور کر دیتا ہے۔

اللہ کی راہ میں روزہ رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اگر ایک آدمی جہاد کے لیے نکلتا ہے اور وہ اس جہاد کے لیے سفر کرتے ہوئے، یا کسی کیمپ میں قیام کی حالت میں روزہ رکھتا ہے تو اس کا یہ روزہ رکھنا خدا کی راہ میں روزہ رکھنا ہے۔ یا مثلاً ایک شخص حج یا عمرے کے لیے سفر کر رہا ہے اور اس سفر کے دوران میں روزے بھی رکھتا ہے، تو اس کا یہ روزہ رکھنا خدا کی راہ میں روزہ رکھنا ہے اور اس کے لیے ایک عظیم اجر اور فائدے کا موجب ہے۔

فی سبیل اللہ کا مطلب لِوَجْہِ اللّٰہِ بھی ہوسکتا ہے یعنی خالصتاً اللہ کی رضا کی خاطر روزہ رکھنا۔ ان دونوں صورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو جہنم کی آگ سے ستر سال کے فاصلے تک دور کرے گا۔ یہاں اس بات کا تعین نہیں کیا گیا کہ یہ ستر سال کی مسافت کس رفتار سے ہے۔ آیا وہ اونٹ کی رفتار سے ہے یا انسان کے پیدل چلنے کی رفتار سے۔ کسی پرندے کے اڑنے کی رفتار سے ہے یا کسی جیٹ ہوائی جہاز یا روشنی کی رفتار سے.......... اصل مدعا درحقیقت یہ ہے کہ اس عمل سے انسان جہنم کی آگ سے بہت دور ہو جاتا ہے، اتنی دور کہ گویا ستر سال کی مسافت درمیان میں حائل ہو جاتی ہے اور یہ صرف اتنے عمل کی بنیاد پر فرمایا گیا کہ اس نے اللہ کی راہ میں روزہ رکھا۔

جو شخص اللہ کی راہ میں نکلا یعنی جہاد کے لیے جا رہا ہے اس کے متعلق یہ فرض کیا جائے گا کہ وہ ایسا آدمی نہیں ہے جو جان بوجھ کر گناہ کرنے والا ہو۔ اس سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے بجا طور پر وہ بہت بڑے اجر کا مستحق قرار پائے گا۔ قرآن وحدیث میں نیکوکار لوگوں کے لیے نفلی عبادات پر جن انعامات اور بھاری اجر وثواب کی بشارت دی گئی ہے وہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو جان بوجھ کر گناہ کرنے والے ہوں۔ بلکہ ایسے لوگوں کے لیے ہے، جن کی عام زندگیاں نیکوکاری اور صلاح و تقویٰ کا نمونہ ہوں۔ یہاں فی سبیل اللہ کی قید خود بتا رہی ہے کہ یہ اجر اس شخص کے لیے ہے جو نہ صرف یہ کہ فرائض ادا کرنے والا اور حرام سے بچنے والا ہے بلکہ وہ اپنی جان خدا کے رستے میں لڑانے کے لیے نکلا ہے۔ اس کے ساتھ اگر وہ نفلی روزہ بھی رکھتا ہے تو وہ یقیناً اس بات کا مستحق ہے کہ جہنم کی آگ سے زیادہ سے زیادہ دور ہو جائے۔

اسی طرح اس اجر کا مستحق وہ شخص بھی ہوسکتا ہے جو محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے حج یا عمرے کا سفر اختیار کرتا ہے اور اس

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۳۵-۲۳۷، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوران میں روزہ بھی رکھتا ہے۔ جو لوگ حرام کھاتے ہوئے حج کے لیے نکلتے ہیں اور آکر بھی حرام کھاتے ہیں۔ یہ اجر اُن کے لیے نہیں ہوسکتا کیوں کہ انھوں نے نہ فی سبیل اللہ یہ سفر اختیار کیا اور نہ انھوں نے خود کو اللہ تعالیٰ کے انعامات کا مستحق ٹھہرایا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۱۲-۲۱۴)

نفلی روزے کی قضا

[ایک] حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر میں کھانا نہ ہونے کی وجہ سے روزہ رکھ لیا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ آپؐ نے یہ خیال کر کے کہ شاید گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوگا، روزہ رکھ لیا۔ بعد میں گھر میں کسی کے ہاں سے ہدیہ کے طور پر حَیس (ایک قسم کا حلوہ) آیا تو آپؐ نے اپنا روزہ کھول لیا اور تناول فرمایا۔[1]

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۹-۲۵۰)

[دوسری] حدیث میں یہ ہے کہ روزے کی حالت میں آپؐ کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا لیکن آپؐ نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا میں روزے سے ہوں[2]......... دونوں حدیثوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حالت تو وہ تھی کہ حضورؐ نے گھر میں کھانا نہ ہونے کی وجہ سے روزے کی نیت کر لی لیکن جب دیکھا کہ گھر میں کھانا آ گیا ہے تو روزہ کھول لیا۔ روزے کی نیت اس لیے کی کہ جب گھر میں کچھ کھانے کو نہیں ہے تو بجائے اس کے کہ ویسے ہی فاقہ کیا جائے، روزہ رکھ لینا چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا اجر ملے......... دوسری حالت میں یہ ہوا کہ اس روز پہلے سے نفلی روزہ رکھنے کا ارادہ تھا اس لیے کھانا سامنے آنے کے باوجود روزہ افطار نہیں کیا۔ ان دونوں حالتوں میں واضح فرق ہے۔ وہاں چونکہ روزہ اس وجہ سے رکھ لیا تھا کہ کھانا نہیں ہے اس لیے جب کھانا آ گیا تو کھا لیا۔ لیکن یہاں چونکہ پہلے سے روزہ رکھنے کا ارادہ تھا اس لیے کھانا آ بھی گیا لیکن نفلی روزہ ہونے کے باوجود افطار نہیں کیا۔

فقہا کے درمیان نفلی روزے کی قضا کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کا قول مختلف احادیث کے پیش نظر یہ ہے کہ اگر ایک شخص نفلی روزہ توڑ دے اور کھانا کھا لے تو اس کی کوئی قضا نہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کی قضا ہے اور امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ اگر آدمی بلا عذر روزہ توڑ دے تو اس کی قضا ہے لیکن اگر کسی معقول وجہ سے روزہ کھول دے تو اس کی قضا نہیں ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۵۱-۲۵۲)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۷۸، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: کتاب الاحادیث، چہارم، ص ۲۷۹-۲۸۰، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نفلی روزہ قبل از وقت افطار کرنا

حضرت ام ہانیؓ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے روز (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے تو) حضرت فاطمہؓ، حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپؐ کے بائیں جانب بیٹھ گئیں اور میں (یعنی ام ہانیؓ) آپؐ کے دائیں ہاتھ بیٹھی تھی۔ اتنے میں گھر کی ملازم لڑکی ایک برتن میں کچھ پینے کے لیے لائی اور اسے حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے اس میں سے نوش فرمالیا اور پھر آپؐ نے وہی برتن ام ہانیؓ کو دے دیا۔ انھوں نے اس میں سے پی لیا اور پھر عرض کیا: یارسول اللہؐ! میں نے روزہ کھول لیا ہے درآنحالیکہ میں روزے سے تھی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: کیا تم اپنے کسی پچھلے روزے کی قضا کررہی تھیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ نہیں، تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: اگر یہ نفلی روزہ تھا تو اس کے (افطار کرلینے) میں تمھارے لیے کچھ مضائقہ نہیں.......... ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ حضرت ام ہانیؓ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ میں تو روزے سے تھی۔ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: نفلی روزہ رکھنے والا اپنے نفس کا امیر (بادشاہ) ہوتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو روزہ رکھ لے (یعنی اس کی تکمیل کرے) اور اگر چاہے تو افطار کر لے۔[1] (ابو داؤد، ترمذی، دارمی، مسند احمد)

ایک مومن مرد یا عورت کے لیے اس سے بڑھ کر عزت اور برکت کی بات کیا ہوسکتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی برتن میں پانی پی کر اسے دے دیا ہو۔ چنانچہ حضرت ام ہانیؓ نے اسی شوق سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چھوڑا ہوا پانی پی لیا۔ لیکن اس کے بعد یہ فکر ہوئی کہ آیا اس طرح روزہ افطار کرنا چاہیے تھا یا نہیں؟ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں تو روزے سے تھی۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نفلی روزہ تھا تو کوئی مضائقہ نہیں۔

معلوم ہوا کہ نفلی روزے میں وہ پابندی نہیں ہے جو فرض روزے میں ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص فرض روزہ جان بوجھ کر توڑ دے تو اس کے کفارے کے طور پر اسے ساٹھ روزے رکھنے ہوں گے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ لیکن اگر نفلی روزہ کھول لے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

'کوئی مضائقہ نہیں ہے' کے الفاظ کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ نفلی روزہ کھول لینے پر کوئی کفارہ واجب نہیں آتا اور نہ اس کی کوئی سزا یا اس پر کوئی گرفت ہے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی قضا تو کرنا ہوگی روزہ کھول لینے کا کوئی گناہ نہیں۔ اس سلسلے میں فقہا کے درمیان جو اختلاف ہوا ہے وہ ان احادیث کے معنی کو دیکھ کر ہوا ہے اور اس اختلاف کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہے۔ ہر ایک نے کسی نہ کسی چیز سے دلیل لی ہے اور کوئی فتویٰ بے دلیل نہیں دیا ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۵۳-۲۵۵)

..........[ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہ کی موجودگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۸۳-۲۸۶، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عرض کیا] یا رسول اللہ ہم دونوں روزے سے تھیں لیکن ہمارے سامنے ایسا کھانا پیش کیا گیا جو ہمیں بہت مرغوب تھا اس لیے ہم نے اس میں سے کھالیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس کی قضا کرنے کے لیے اس کے بدلے میں کسی دوسرے دن کا روزہ رکھ لو۔[1] (ترمذی، ابوداؤد)

فقہا کے درمیان یہ اختلاف عموماً ایسی احادیث اور آیات کے معانی متعین کرنے میں ہوئے ہیں اور یہ اختلاف بالکل فطری ہیں۔ بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں کسی شخص کے پاس بھی ایسی کوئی قطعی دلیل نہیں ہوتی جس کی بنا پر وہ دوسرے کے قول کو غلط قرار دے سکے۔ البتہ ہر ایک کی دلیل اپنی ہوتی ہے جو اس کے اپنے نزدیک تو زیادہ مرجح ہوتی ہے لیکن دوسروں کے نزدیک اس کا وہ وزن نہیں ہوتا۔ اس لیے ایسے مواقع پر یہ کہنا درست نہیں ہوتا کہ فلاں کا قول یکسر غلط ہے۔ اسی طرح کسی شخص کے لیے اس دعوے کے ساتھ اسے رد کرنا بھی صحیح نہیں ہوتا کہ وہ حدیث یا قرآن کے بالکل خلاف ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۵۶-۲۵۷)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۸۶-۲۸۸، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل نہم

ممنوع روزے

صومِ وصال

اہلِ کتاب میں روزہ رکھنے کے جو مختلف طریقے رائج تھے ان میں سے ایک صوم وصال کا طریقہ تھا۔ اس کی بھی مختلف شکلیں تھیں۔ ایک شکل یہ تھی کہ ایک شخص فرض روزوں کے ماسوا نفلی روزے اس طریقے سے رکھے کہ بغیر وقفے کے مسلسل مہینے مہینے، دودو مہینے کے روزے رکھتا چلا جائے۔ اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسا کرتے تھے اور کچھ لوگ تو ایسے بھی ہوتے تھے جو ابداً صوم وصال رکھتے تھے.......... یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کردہ روزوں کے علاوہ باقی دنوں میں بھی وہ روزہ دار ہی رہتے تھے۔ صوم وصال کی دوسری شکل یہ تھی کہ ایک شخص ایک سحری کھا کر دوسری سحری تک مسلسل روزہ رکھے اور درمیان میں افطار نہ کرے بلکہ بعض اوقات دو دو تین تین دن کا روزہ مسلسل رکھے۔ اہل کتاب میں صوم وصال کی یہ دونوں شکلیں رائج تھیں.......... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل اسلام کو روزے کے اس طریقے یعنی وصال فی الصوم سے منع فرمایا کیونکہ یہ اہل کتاب کا طریقہ تھا[1]......

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خود صوم وصال رکھنا[2] آپ کی اُن خصوصیات میں سے ہے جن کی تقلید دوسرے مسلمانوں کے لیے جائز نہیں، کیونکہ حضورؐ نے خود اس بات کی وضاحت فرمادی (ہے) کہ تم میں سے کوئی میرے جیسا نہیں ہے۔

صوم الدّہر

عَنْ مُسْلِمٍ الْقُرَشِيِّ قَالَ سَأَلْتُ اَوْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صِيَامِ الدَّهْرِ، فَقَالَ: اِنَّ لِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا. صُمْ رَمَضَانَ وَالَّذِيْ يَلِيْهِ. وَ كُلَّ اَرْبِعَاءَ وَ خَمِيْسٍ فَاِذًا اَنْتَ قَدْ صُمْتَ الدَّهْرَ كُلَّهٗ[3] (ابوداؤد، ترمذی)

حضرت مسلم قرشیؓ سے روایت ہے کہ میں نے یا کسی اور شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صوم دھر کے متعلق سوال کیا [کہ اس کا کیا حکم ہے؟] اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا: تمھارے بال بچوں کا بھی تم پر حق ہے۔ رمضان کے روزے رکھو اور پھر بدھ اور جمعرات کو بھی روزہ رکھ لیا کرو۔ اس طرح گویا تم ہمیشہ روزہ رکھنے والے شمار ہو گے۔

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۹۴-۹۸، اشاعت دوم۔
۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۹۴-۹۸، اشاعت دوم۔
۳- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۵۶، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قدیم زمانے میں چونکہ رہبانیت کا بہت زور تھا اس لیے اہل مذاہب میں راہب، سنیاسی اور جوگی وغیرہ قسم کے لوگ صَوْمِ دَھر کو بڑی فضیلت اور اہمیت دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ نیک آدمی وہ ہے جو صَائِمُ الدَّھر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضور سے صَوْمِ دَھر کے متعلق بکثرت پوچھا گیا ہے اور آپؐ نے لوگوں کو بکثرت اس کے متعلق احکام بتائے ہیں۔

آپ نے ایک پوچھنے والے سے فرمایا کہ تمھارے بال بچوں کا بھی تم پر حق ہے، یعنی جو شخص صَوْمِ دَھر رکھتا ہے وہ بال بچوں کے حقوق ادا نہیں کر سکتا۔

صَائِمُ الدَّھر بن کر بیٹھ رہنا ان لوگوں کا کام ہے جنھیں دنیا اور اس کے معاملات سے کوئی سروکار نہ ہو، اور ایسا وہی لوگ کر سکتے ہیں جو گوشوں میں جا کر بیٹھ رہیں۔ لیکن جن لوگوں کو دنیا میں خدا کی خلافت کا حق ادا کرنا ہے وہ یہاں شادی بیاہ بھی کریں گے، بال بچوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے، کاروبار اور تجارتیں اور ملازمتیں بھی کریں گے، عدالت کی کرسیوں پر بھی بیٹھیں گے اور حکومت کا کاروبار بھی چلائیں گے۔ غرض دنیا میں خلافتِ خداوندی کے جو کام ہیں وہ سب انھیں انجام دینے ہوں گے۔ ایسے لوگ صائم الدھر کیسے بن سکتے ہیں۔ پھر صائم الدھر بننے والے شخص کے بارے میں انسان جس بڑی سے بڑی نیکی اور اجر کی توقع کرتا ہے اس کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ ساری نیکی اور سارا اجر ایک بندۂ مومن کو اس صورت میں بھی حاصل ہو جائے گا جب کہ وہ اپنے باقی فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ رمضان کے فرض روزوں کے بعد شوال کے چھ روزے اور ہر مہینے بدھ اور جمعرات کے روزے بھی رکھ لے۔

اس حدیث میں سائل کو بدھ اور جمعرات کا روزہ بتایا گیا ہے اس سے پہلے کسی کو پیر اور جمعرات کا روزہ بتایا گیا اور کسی کو بعض دوسرے دنوں کا۔ اس طرح مختلف لوگوں کو مختلف دنوں کے روزے بتائے گئے۔ گویا مختلف اشخاص کے لیے مختلف نسخے ہیں۔ وہ حکیم کہ جس کے پاس ہر مریض کے لیے ایک ہی لگا بندھا نسخہ ہوتا ہے کوئی دانا حکیم نہیں ہوتا۔ دانا حکیم تو وہ ہوتا ہے جو مریض کے مزاج، اس کے حالات، اس کے ماحول کی طبعی خصوصیات، ملکی آب و ہوا کے خصائص وغیرہ غرض ہر چیز کو سامنے رکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے اور دوا اور خوراک مقرر کرتا ہے...... بالکل اسی طرح مختلف پوچھنے والوں میں سے ہر ایک کے حسبِ حال حضورؐ نے نفلی روزوں کے متعلق مختلف طریقے ارشاد فرمائے اور ان میں سے ہر طریقہ اپنی اپنی جگہ پر یکساں اجر و ثواب کا موجب ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۸-۲۳۰)

جمعہ کے دن کی تخصیص

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جمعہ کی رات کو قیام (نفل عبادات اور تہجد وغیرہ) کے لیے مخصوص نہ کر لو [اور جمعہ کے دن کو روزہ کے لیے مخصوص نہ کرو] بجز اس صورت کے کہ جمعہ کسی ایسی تاریخ کو پڑ جائے جب تم میں سے کوئی شخص روزہ رکھا کرتا ہے۔[1] (مسلم)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۳۲، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شریعت میں اس معاملے میں بہت زیادہ نزاکت پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو پابندیاں انسان پر عائد کی ہیں ان میں کوئی شخص اپنی طرف سے اضافہ کرے۔ اس سے پہلے دوسری قوموں کا جو حشر ہوا وہ اسی وجہ سے ہوا کہ لوگوں نے قیاس کر کر کے یا اپنے نفس کے ذاتی میلانات کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود و فرائض پر اپنی طرف سے مزید حدود و فرائض کا اضافہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی شریعت کے ساتھ ایک نئی شریعت اور بن گئی اور اس شریعت نے لوگوں کو باندھنا اور جکڑنا شروع کیا۔ قرآن مجید نے سورۂ اعراف میں اس چیز کو اِصْــر اور اَغْلاَل سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی لوگوں نے اپنے ہاتھ سے طوق اور سلاسل بنائے اور اپنے گلے میں پہن کر انھیں اوپر کسنا شروع کر دیا۔ آگے چل کر وہ شریعت اتنی بوجھل بن گئی کہ آخر کار لوگ اس کے بندھنوں سے نکل بھاگے اور انھوں نے خدا کی پوری شریعت ہی کو اتار کر پھینک دیا۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ جب پابندیاں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں تو انسان آخر کار تنگ آ جاتا ہے۔ ظلم یہ ہے کہ بعض مذہبی پیشواؤں کی طرف سے بڑھائی ہوئی پابندیاں عام لوگوں کے سامنے اسی حیثیت سے پیش ہوتی ہیں کہ یہ خدا کی شریعت کا حصہ ہے۔ چنانچہ جب لوگ ان سے تنگ آ کر انھیں توڑتے ہیں تو وہ یہ تمیز کیے بغیر کہ انسانوں کی طرف سے بڑھائی ہوئی پابندیاں کون سی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ حدود کون سے ہیں، وہ سب کچھ توڑ تاڑ کر پھینک دیتے ہیں اور بالکل آزاد ہو جاتے ہیں .... اسی بدبختی میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہوئے اور اسی خطرے میں دوسرے انبیا علیہم السلام کی اُمتیں مبتلا ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی میں یہ اصول مقرر کر دیا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے جو چیز فرض کی گئی ہے بس وہی فرض ہے اور کسی کو اس میں اضافہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو کچھ واجب کیا گیا ہے بس وہی واجب ہے، کوئی شخص اس پر اپنی طرف سے کسی قسم کا اضافہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ حرام وہی ہے جو خدا کی شریعت میں حرام کیا گیا ہے، کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی طرف سے کچھ مزید چیزوں کو حرام کر دے۔ اسی طرح مکروہ وہ چیز ہے جس کے متعلق اللہ اور اس کی رسول نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی طرف سے کچھ مزید مکروہات مقرر کر دے۔ اگر کوئی شخص کسی چیز کے حرام یا حلال ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے لازماً یہ بتانا پڑے گا کہ قرآن کی کس آیت اور کس حدیث کی رُو سے وہ یہ بات کہہ رہا ہے۔ اگر وہ حدیث اور قرآن کا حوالہ نہیں دیتا اور کہتا ہے کہ فلاں بزرگ نے اسے حلال یا حرام کہا تھا یا فلاں کتاب میں ایسا لکھا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اسے مانیں، جب تک کہ وہ دلیل لے کر نہ آئے اور یہ نہ بتائے کہ قرآن کی کس آیت یا کس حدیث سے یہ حلت یا حرمت نکل رہی ہے .... یہ ہے اس معاملے میں شریعت کا مزاج۔ اور یہ اس عظیم الشان حکمت کی وجہ سے ہے کہ خدا کے بندوں کو کسی ایسی پابندی میں نہیں جکڑنا چاہیے جو خدا نے ان پر عائد نہیں کی ہے۔ اگر لوگوں کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنی طرف سے بھی اس میں اضافہ کر سکتے ہیں تو اس کی معنی یہ ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ہی شارع نہیں کچھ دوسرے حضرات بھی شارع ہیں۔ لوگ محض خدا ہی کے بندے نہیں بلکہ کچھ دوسرے حضرات بھی ایسے ہیں جن کے وہ بندے ہیں اور انھیں بھی یہ حق ہے کہ وہ خدا کے بندوں پر اپنی طرف سے پابندیاں عائد کریں۔

یہاں یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں احکام و مسائل کا استنباط کرنے کی گنجایش بھی نہیں ہے جیسا کہ فقہا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا طریقہ ہے، بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کی دلیل قرآن وحدیث سے پیش نہ کی جاسکتی ہو دین میں اضافے کے مترادف ہے اور اس لیے وہ ایک ایسی گمراہی ہے جس سے ایک بندۂ خدا کو خود بھی بچنا چاہیے اور دوسرے بندگانِ خدا کو بھی اس میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری اٹھانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اب دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے متعلق یہ کیوں فرمایا کہ جمعہ کی راتوں کی عبادت اور دن کے روزوں کے لیے مخصوص نہ کرلو الا یہ کہ جمعہ کسی ایسی تاریخ کو آپڑے جس میں تم پہلے ہی روزہ رکھا کرتے ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کا دن اس غرض کے لیے مقرر کیا ہے کہ لوگ اس میں ایک خاص نماز اجتماعی طور پر ادا کریں۔ دوسری نمازوں کے متعلق تو اس بات کی اجازت ہے کہ اگر آپ کسی ایسی جگہ پر ہوں جہاں قریب کوئی مسجد نہیں ہے اور وہاں اذان کی آواز نہیں پہنچتی، یا آپ کسی جنگل میں ہیں تو آپ اپنی جگہ پر نماز ادا کرسکتے ہیں اور اگر دو چار آدمی آپ کے ساتھ ہیں تو آپ وہیں جماعت کرسکتے ہیں اور یہ لازم نہیں ہے کہ آپ مسجد ہی میں جائیں، لیکن جمعہ کی نماز ایسی ہے کہ یہ مسجد میں جماعت کے ساتھ ہی ادا ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دن اس لیے مقرر کیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان مسجد میں جمع ہو کر ایک خاص نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں اور امام کا خطبہ سنیں تاکہ ہفتے میں کم از کم ایک دن اللہ تعالیٰ کے احکام باقاعدگی کے ساتھ انھیں یاد دلائے جائیں۔
اب اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ چونکہ جمعہ کا دن فضیلت رکھتا ہے اس لیے کیوں نہ وہ اس دن روزہ بھی رکھے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ شریعت نے جمعے کو جو فضیلت ایک خاص وجہ سے دی تھی اور اس دن کے لیے جو عبادت لازم قرار دی تھی اس نے اس میں ایک اور چیز کا اضافہ کرلیا۔ پھر صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ رات کے لیے بھی ایک عبادت کو لازم ٹھہرالیا۔ اب اگر اس کی گنجایش دے دی جاتی تو پہلے ایک آدمی یہ کام کرتا، پھر دو چار اور کرتے یہاں تک کہ گروہِ کثیر اس کام کو کرنا شروع کردیتا۔ رفتہ رفتہ ایک دو صدی گزرنے کے بعد لوگوں کے لیے یہ لازم ہوجاتا کہ نہ صرف یہ کہ جمعہ کے دن جمعہ کی نماز ادا کریں بلکہ روزہ بھی رکھیں۔ اس طرح یہ فرق کرنا مشکل ہوجاتا کہ کیا چیز اللہ نے فرض کی تھی اور کیا چیز لوگوں نے اپنی طرف سے اپنے اوپر عائد کرلی۔ گویا ایک ایسی چیز شریعت کا جز قرار پاجاتی جو درحقیقت اس کا جز نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے واضح طور پر فرمادیا کہ جمعہ کے دن کو ان نفلی عبادات کے لیے مخصوص نہ کرلو۔ اگرچہ بجائے خود نہ روزہ رکھنا کوئی برائی ہے اور نہ راتوں کو کھڑے ہو کر عبادت کرنا کوئی معیوب چیز ہے، بلکہ دونوں چیزیں عین پسندیدہ ہیں لیکن چونکہ جمعہ کے ساتھ مخصوص کر کے ان کا التزام کرنے سے شریعت میں اضافے کا خطرہ تھا اس لیے حضورؐ نے وضاحت کے ساتھ اس سے منع فرمادیا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۸-۲۱۲)

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن کا روزہ نہ رکھے الا یہ کہ اس سے ایک دن پہلے کا یا ایک دن بعد کا بھی روزہ رکھے۔[1] (متفق علیہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن کو روزے کے لیے مخصوص کرلینا صحیح نہیں ہے۔ حضورؐ کے اس ارشاد سے یہ بات

۱۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۴۰، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام کا مزاج کیا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان خود اپنا شارع نہ بنے۔ شارع صرف اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہے۔ کسی کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ اللہ اور اس کے رسول کی مقرر کردہ شریعت میں اپنی طرف سے قیاسات کر کے اضافہ کرنا شروع کر دے۔ اس کا نتیجہ وہی کچھ ہوگا، جو یہود و نصاریٰ کے ہاں ہوا کہ انھوں نے خدا کے دین میں تحریف کر کے اس کی شکل ہی بدل ڈالی۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ایک خاص نماز کے لیے جمعہ کے دن کو ایک خاص فضیلت عطا کی ہے۔ اب اگر ایک آدمی یہ خیال کر کے کہ یہ دن فضیلت والا ہے، اس کو روزے کے لیے مخصوص کر لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے خدا کی شریعت میں اپنے طور پر ایک اضافہ کر لیا۔ ایک فضیلت تو اس دن کو ایک خاص غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے دی تھی اور ایک فضیلت اب اسے اس شخص نے اپنے طور پر دے دی۔ اگر یہ طریقہ رائج ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح رمضان کے روزوں کا التزام کیا جاتا ہے اسی طرح رفتہ رفتہ جمعہ کے روزے کا التزام بھی شروع ہو جائے گا اور یہ چیز نئی شریعت بنانے کے مترادف ہوگی۔ اسی لیے حضورؐ نے جمعہ کے نفلی روزے کا التزام کرنے سے منع فرمایا۔ ہاں! اس کی اجازت اس صورت میں دے دی جبکہ اس سے ایک دن پہلے یا بعد کا روزہ بھی رکھا جائے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۶-۲۰۷)

ہفتے کے دن روزہ

حضرت عبداللہ بن بُسر اپنی بہن صمّاءؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہفتے کے دن روزہ نہ رکھو الا یہ کہ ہفتہ اس دن آ جائے جس میں روزہ رکھنا تم پر فرض ہو۔ اگر کسی شخص نے غلطی سے ہفتے کے دن کا روزہ رکھ لیا اور روزہ توڑنے کے لیے اسے انگور کا چھلکا یا کسی درخت کی چھال ہی مل جائے تو وہ اسی کو چبا کر روزہ توڑ دے۔[۱] (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

'جس دن میں روزہ رکھنا فرض ہو' کے الفاظ سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ ہفتہ اگر رمضان کے اندر آ جائے، جیسا کہ آتا ہے، تو کوئی حرج نہیں ہے اور اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اگر تمھیں رمضان کے روزوں کی قضا ادا کرنی ہے یا کفارے کے روزے رکھنے ہیں اور بیچ میں ہفتہ آ رہا ہے تو اس کا روزہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن خاص طور پر سَبْت یعنی ہفتے کے دن کا قصد کر کے روزہ رکھنا درست نہیں۔

یہ اس لیے کہ ہفتہ یہودیوں کے نزدیک مقدس دن ہے اور ان کے ہاں اس کا روزہ رکھنے کا التزام کیا جاتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ہفتے کے دن کو روزہ رکھنے کے لیے مخصوص کر لینا یا اس دن اکثر روزہ رکھنا، یا کبھی کبھار بھی اس کا انتخاب کر کے روزہ رکھنا ممنوع ہے، اور اگر کسی شخص نے یہ روزہ رکھ ہی لیا ہو تو اسے چاہیے کہ توڑ دے۔ معلوم ہوا کہ اس معاملے میں شدت ہے اور اس چیز کی اجازت نہیں ہے کہ اگر کسی نے غلطی سے روزہ رکھ لیا ہو تو وہ اسے پورا کرے۔ یہ شدت اس لیے اختیار کی گئی کہ اہل اسلام اور

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۵۹-۲۶۰، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہود و نصاریٰ کے درمیان مشابہت پیدا نہ ہو۔ کیونکہ مسلمانوں کو ایک امت کی حیثیت سے اپنا امتیاز قائم کرنا چاہیے اور اسے سختی سے قائم رکھنا بھی چاہیے۔ مسلمان ان امتیازی سرحدوں کو جتنا زیادہ دھندلا کرتے چلے جائیں گے اتنا ہی وہ یہود و نصاریٰ میں گم ہوتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ ان کے درمیان یہ تمیز کرنا بھی مشکل ہو جائے گا کہ کون کیا ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۳۲-۲۳۳)

عید کے دن روزہ

حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا تھا۔ (اور انہی سے دوسری) روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن کوئی روزہ نہیں ہے۔[1] (بخاری و مسلم)

اگرچہ روزہ بھی اسی طرح کی ایک عبادت ہے جس طرح کہ نماز ایک عبادت ہے لیکن اسلام کا مزاج یہ ہے کہ نامناسب اوقات و مواقع پر عبادت انجام دینا نیکی شمار ہونے کے بجائے گناہ بن جاتا ہے۔ عید الفطر وہ دن ہے کہ جس میں تیس دن کے روزوں کے بعد اللہ تعالیٰ آپ سے یہ چاہتا ہے کہ آپ ایک زائد عبادت کے ذریعے سے اس کا شکر بھی ادا کریں اور اس کے شکرانے کے طور پر آزادی کے ساتھ کھائیں پئیں بھی۔ اب جس دن اللہ تعالیٰ اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ آپ آزادی کے ساتھ کھائیں پئیں اور دنیوی آسائشوں اور لذتوں سے شاد کام ہوں، اس روز بھی اگر آپ بزعم خود زہد و پارسائی اختیار کر کے روزہ رکھ لیتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ یہ چیز سراسر اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف ہوگی۔ جس وقت اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ آپ آرام و آسائش حاصل کریں اس وقت آپ کا فرض ہے کہ آپ آرام و آسائش حاصل کریں اور جس وقت وہ چاہتا ہے کہ آپ مشقت اٹھائیں تو اس وقت آپ کا یہ کام ہے کہ مشقت اٹھائیں۔ اگر آپ مشقت کے وقت بھی مشقت اٹھائیں اور آرام و آسائش کے وقت بھی مشقت اٹھائیں تو اس طرح گویا آپ اپنے رب سے یہ کہتے ہیں کہ نہیں جناب، ہمیں آپ کی کسی رعایت اور عنایت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو اس سے بے نیاز ہیں............ اس چیز کا سد باب کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین کے دن روزہ رکھنے سے سختی سے منع فرمایا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۵-۲۰۶)

ایامِ تشریق کا روزہ

حضرت نُبَیْشَہ ہذلیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایام تشریق کھانے پینے اور اللہ کا ذکر کرنے کے دن ہیں۔[2] (مسلم)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۲۵-۲۲۷، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۲۸ تا ۲۲۹، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایام تشریق سے مراد بقرعید کے بعد کے تین دن ہیں، یعنی ذی الحجہ کی گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں تاریخ.........اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ان دنوں میں روزہ رکھنا درست نہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۶)

نصفِ شعبان کے بعد روزہ

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزہ نہ رکھے اِلّا یہ کہ کوئی شخص معمولاً اس دن روزہ رکھا کرتا ہو ایسا آدمی اس دن کا روزہ رکھ سکتا ہے۔[1] (متفق علیہ)

ایک اور حدیث.........میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت بیان ہوئی ہے کہ نصف شعبان کے بعد کوئی روزہ نہ رکھا جائے۔

اس کی دو مصلحتیں ہیں.........ایک یہ ہے کہ رمضان سے پہلے متصل زمانے میں روزے رکھنے سے آدمی کو ایسی کمزوری لاحق ہو سکتی ہے کہ اس کے لیے رمضان کے روزے پورے کرنا مشکل ہو جائے.........دوسری مصلحت یہ ہے کہ شریعت اسلامی کا مزاج فرض میں نہ کسی کمی کو برداشت کرتا ہے نہ اضافے کو۔ چونکہ رمضان کے روزے فرض ہیں اس لیے اس کے بالکل متصل پہلے روزہ رکھنے سے اس بات کا احتمال ہو سکتا ہے کہ فرض عبادت میں اضافہ ہو جائے، ایک شخص اپنی جگہ یہ خیال کر کے کہ مجھے رمضان کے تیس دنوں کا ثواب تو ملے گا ہی، کیوں نہ ایک آدھ دن کے ثواب کا مزید اضافہ ہو جائے اور وہ رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزے رکھنا شروع کر دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے فرض عبادت میں ایک اضافہ اپنی طرف سے تجویز کر لیا۔ یہی فعل وہ بدعت ہے جس کو گمراہی قرار دیا گیا اور اس کا انجام نارِ جہنم بتایا گیا۔ آخر اہل کتاب نے اور پھر خود مسلمانوں نے خدا کی شریعت میں جو اضافے کیے ہیں وہ اسی طرح تو ہوئے ہیں کہ مختلف چیزوں کو نیکیاں قرار دے دے کر فرائض کے ساتھ ملا لیا گیا۔ پھر ان کی اتنی فضیلتیں اپنے ذہن سے تصنیف کی گئیں، اور ان کی اس قدر اشاعت اور تاکید کی گئی کہ وہ فرائض سے بھی بڑھ کر اہم قرار پائیں۔ اس طرح وہ آخر کار خدا کی شریعت کا جزو بن گئیں۔ اور جزو بھی ایسا کہ جو اصل سے زیادہ اہم ہو گیا۔ اس لیے اسلامی شریعت کا مزاج یہ ہے کہ جس چیز کی جو حد مقرر کر دی گئی ہے اس میں نہ کسی کو کمی کرنے کا اختیار ہے نہ اضافہ کرنے کا۔ اگر ظہر کے چار فرض مقرر کیے گئے ہیں تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان کو کم کر کے تین قرار دے دے یا اضافہ کر کے پانچ رکعت ٹھہرا لے۔ بندے کا کام اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی طرف سے فرض میں اضافہ کرتا ہے تو حقیقت میں وہ عبادت نہ ہوئی بلکہ اپنی جگہ ایک قانون سازی ہوئی۔ اب جو حقیقی قانون ساز ہے اس کا مطالبہ تو یہ ہے کہ اس کے بتائے ہوئے قانون کی بے کم و کاست تعمیل کی جائے۔ اس میں کمی بیشی کرنا ایک صریح نافرمانی ہے۔ بلکہ بعض حالات میں کفر ہے۔

۱۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۶۸-۶۹، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نماز میں یہ چیز مسنون ہے کہ امام جب فرض نماز پڑھا کر فارغ ہو جائے تو فوراً پلٹ جائے تاکہ مزید قبلہ رخ بیٹھے رہنا بھی نماز کا ایک حصہ نہ بن جائے۔ یہ ہدایت بھی کی گئی کہ نماز با جماعت سے فارغ ہو کر سنتیں منتشر ہو کر الگ الگ پڑھی جائیں اور جماعت کی ہیئت کو برقرار نہ رہنے دیا جائے تاکہ سنتیں بھی نماز با جماعت کا حصہ نہ بن جائیں۔ اسی طرح جب روزوں کے لیے رمضان کا مہینہ مقرر کر دیا گیا تو اب کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس کے ساتھ ملا کر کچھ اور دنوں کا روزہ بھی رکھے۔ کیونکہ یہ چیز فرض میں اضافے کا موجب بن سکتی ہے...... [البتہ] جو شخص معمولاً اس دن کا روزہ رکھتا ہو اس کو ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مہینے کی آخری تاریخوں کو نفلی روزہ رکھنے کا اہتمام کرتا ہو، یا ہفتے کا کوئی ایک دن اس نے نفلی روزے کے لیے خاص کر رکھا ہو اور وہ دن اتفاق سے رمضان سے پہلے آ پڑے تو اس کے لیے اس دن کا روزہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، وہ اپنے معمول کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۷۶-۷۹)

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی مسلسل دو مہینے کے روزے رکھنے کا اہتمام کرتے نہیں دیکھا مگر شعبان اور رمضان کے۔[1] (ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

اس حدیث سے آپ کا اپنا عمل یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اکثر (ہمیشہ نہیں بلکہ اکثر) شعبان اور رمضان کے مسلسل روزے رکھا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔ دوسروں کو اس کی اجازت نہیں تھی۔ حضورؐ کے بعض معمولات ایسے تھے جو آپؐ ہی کے لیے خاص تھے اور دوسروں کے لیے اس کا اتباع درست نہیں، یا کم از کم ان پر وہ لازم نہیں ہیں...... انھی میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ حضورؐ شعبان کے روزے رکھا کرتے تھے جب کہ عام مسلمانوں کے لیے نصف شعبان کے بعد ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۸۱-۸۲)

مشکوک دن کا روزہ

حضرت عمار بن یاسرؓ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے اس دن کا روزہ رکھا جس کے بارے میں شک ہو تو اس نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔[2] (ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)

یہ حضرت عمار بن یاسرؓ کے اپنے الفاظ ہیں۔ گویا وہ اپنے الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت نقل فرما رہے ہیں کہ شک کے دن کا روزہ نہ رکھا جائے۔ شک کے دن سے مراد وہ دن ہے جس میں یہ بات مشکوک ہو کہ آیا آج رمضان شروع

۱- *تخریج:* تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۷۴-۷۶، اشاعت دوم۔

۲- *تخریج:* تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۷۶-۷۷، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوگیا ہے یا نہیں۔ مثلاً اگر آج شعبان کی ۲۹ تاریخ ہے اور مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا تو یہ بات مشکوک ہوگئی کہ آیا واقعی چاند ہوا ہے یا نہیں............اب اگر کوئی شخص یہ خیال کر کے، کہ ممکن ہے چاند ہوگیا ہو، اگلے دن کا روزہ رکھ لے تو یہ غلط ہے کیونکہ اسی کو شک کا دن کہا گیا ہے اور اس میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت کی بنیاد شک پر نہیں بلکہ یقین پر ہونی چاہیے۔ شک کے ساتھ عبادت کرنا غلط ہے (چنانچہ) اگر یقین ہے کہ آج رمضان شروع ہوگیا ہے تو روزہ رکھیے، اگر یقین نہیں تو پھر شک کے ساتھ روزہ رکھنا صحیح نہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۸۳-۸۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب سوم

متعلّقاتِ روزہ ورمضان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

تراویح

احکامِ تراویح کا خلاصہ

تراویح کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

□ **حضورؐ کا طرزِ عمل:** نبی صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے زمانوں کی بہ نسبت رمضان کے زمانے میں قیام لیل کے لیے زیادہ ترغیب دیا کرتے تھے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز آپ کو بہت محبوب تھی۔

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ رمضان المبارک میں تین رات نماز تراویح جماعت کے ساتھ پڑھائی اور پھر یہ فرما کر اسے چھوڑ دیا کہ مجھے اندیشہ ہے کہیں یہ تم پر فرض نہ ہو جائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تراویح میں جماعت مسنون ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تراویح فرض کے درجے میں نہیں ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا کہ حضورؐ چاہتے تھے کہ لوگ ایک پسندیدہ سنت کے طور پر تراویح پڑھتے رہیں مگر بالکل فرض کی طرح لازم نہ سمجھ لیں۔

تمام روایات کو جمع کرنے سے جو چیز حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے خود جماعت کے ساتھ رمضان میں جو نماز پڑھائی وہ اول وقت تھی نہ کہ آخر وقت میں۔ اور وہ آٹھ رکعتیں تھیں نہ کہ بیس (اگر چہ ایک روایت بیس کی بھی ہے مگر وہ آٹھ والی روایت کی بہ نسبت ضعیف ہے) اور یہ کہ لوگ حضورؐ کے پیچھے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے بعد واپس جا کر اپنے طور پر مزید کچھ رکعتیں بھی پڑھتے تھے۔ وہ مزید رکعتیں کتنی ہوتی تھیں؟ اس کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں ملتی۔ لیکن بعد میں جو حضرت عمرؓ نے ۲۰ رکعتیں پڑھنے کا طریقہ رائج کیا اور تمام صحابہؓ نے اس سے اتفاق کیا اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ زائد رکعتیں ۱۲ ہوتی تھیں۔

□ **باقاعدہ جماعت کا آغاز:** حضورؐ کے زمانے سے لے کر حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانے تک باقاعدہ ایک جماعت میں سب لوگوں کے تراویح پڑھنے کا طریقہ رائج نہ تھا، بلکہ لوگ یا تو اپنے اپنے گھروں میں پڑھتے تھے یا مسجد میں متفرق طور پر چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ اسی تفرق کو دور کر کے سب لوگوں کو ایک جماعت کی شکل میں نماز پڑھنے کا حکم دے دیا۔ اس کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس یہ حجت موجود تھی کہ حضورؐ نے خود تین بار جماعت کے ساتھ تراویح پڑھائی تھی۔ اس لیے اس فعل کو بدعت نہیں کہا جا سکتا اور چونکہ حضورؐ نے اس سلسلے کو یہ فرما کر بند کیا تھا کہ کہیں یہ فرض نہ ہو جائے اور حضورؐ کے گزر جانے کے بعد اس امر کا اندیشہ باقی نہ رہا تھا کہ کسی کے فعل سے یہ چیز فرض قرار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پا سکے گی، اس لیے حضرت عمرؓ نے ایک سنت اور مندوب چیز کی حیثیت سے اس کو جاری کر دیا۔ یہ حضرت عمرؓ کے تفقہ کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے کہ انھوں نے شارع کے منشا کو سمجھا اور امت میں ایک صحیح طریقے کو رائج فرما دیا۔ صحابہ کرامؓ میں سے کسی کا اس پر اعتراض نہ کرنا، بلکہ بسر و چشم اسے قبول کر لینا یہ ثابت کرتا ہے کہ شارع کے اس منشا کو بھی ٹھیک ٹھیک پورا کیا گیا کہ 'اسے فرض کے درجے میں نہ کر دیا جائے' چنانچہ کم از کم ایک بار تو ان کا خود تراویح میں شریک نہ ہونا ثابت ہے جب کہ وہ عبد الرحمٰن بن عبد کے ساتھ نکلے اور مسجد میں لوگوں کو تراویح پڑھتے دیکھ کر اظہار تحسین فرمایا۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب باقاعدہ جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو باتفاقِ صحابہ بیس رکعتیں پڑھی جاتی تھیں اور اسی کی پیروی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں بھی ہوئی۔ تینوں خلفا کا اس پر اتفاق اور پھر صحابہ کا اس میں اختلاف نہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لوگ تراویح کی بیس ہی رکعتوں کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ تینوں بیس ہی رکعت کے قائل ہیں، اور ایک قول امام مالکؒ کا بھی اسی کے حق میں ہے۔ داؤد ظاہریؒ نے بھی اسی کو سنتِ ثابتہ تسلیم کیا ہے۔

□ **۳۶ رکعت پڑھنے کی توجیہ:** حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور حضرت ابان بن عثمانؒ نے ۲۰ کے بجائے ۳۶ رکعتیں پڑھنے کا جو طریقہ شروع کیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان کی تحقیق خلفائے راشدین کی تحقیق کے خلاف تھی، بلکہ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ مکے سے باہر کے لوگ ثواب میں اہل مکہ کے برابر ہو جائیں۔ اہل مکہ کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ تراویح کی ہر چار رکعتوں کے بعد کعبے کا طواف کرتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے ہر طواف کے بدلے چار رکعتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ یہ طریقہ چونکہ اہلِ مدینہ میں رائج تھا اور امام مالکؒ اہل مدینہ کے عمل کو سند سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے بعد میں ۲۰ کے بجائے ۳۶ کے حق میں فتویٰ دیا۔

□ **ہر محلے میں اس کا اہتمام:** علما جس بنا پر یہ کہتے ہیں کہ جس بستی یا محلے میں سرے سے نمازِ تراویح با جماعت ادا ہی نہ کی جائے اس کے سب لوگ گناہ گار ہیں، وہ یہ ہے کہ تراویح ایک سنت الاسلام ہے جو عہد خلافت راشدہ سے تمام امت میں جاری ہے۔ ایسے ایک اسلامی طریقے کو چھوڑ دینا اور بستی کے سارے ہی مسلمانوں کا مل کر چھوڑ دینا، دین سے ایک عام بے پروائی کی علامت ہے جس کو گوارا کر لیا جائے تو رفتہ رفتہ وہاں سے تمام اسلامی طریقوں کے مٹ جانے کا اندیشہ ہے......

□ **تراویح کا افضل وقت:** اس امر میں اختلاف ہے کہ تراویح کے لیے افضل وقت کون سا ہے، عشا کا وقت یا تہجد کا؟ دلائل دونوں کے حق میں ہیں، مگر زیادہ تر رجحان آخر وقت ہی کی طرف ہے۔ البتہ اول وقت کی ترجیح کے لیے یہ بات بہت وزنی ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی اول وقت ہی کی تراویح پڑھ سکتے ہیں۔ آخر وقت اختیار کرنے کی صورت میں امت کے سوادِ اعظم کا اس ثواب سے محروم رہ جانا ایک بڑا نقصان ہے اور اگر چند صلحا آخر وقت کی فضیلت سے مستفید ہونے کی خاطر اول وقت کی جماعت میں شریک نہ ہوں تو اس سے یہ اندیشہ ہے کہ عوام الناس یا تو ان صلحا سے بدگمان ہوں، یا اُن کی عدمِ شرکت کی وجہ سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خود ہی تراویح چھوڑ بیٹھیں یا پھر ان صلحا کو اپنی تہجد خوانی کا ڈھنڈورا پیٹنے پر مجبور ہونا پڑے۔

هذا ما عندي والعلم عندالله و هو اعلم بالصواب

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۱۲-۲۱۶)

تعدادِ رکعات تراویح

تراویح کی رکعات کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن پر مدت دراز کے جھگڑوں اور مناظروں نے فریقین کو بے انتہا ذکی الحس بنا دیا ہے۔ اسی وجہ سے آٹھ رکعت یا بیس رکعت کا لفظ کسی کی زبان سے نکلتے ہی کوئی ایک گروہ اس پر آستینیں چڑھا لیتا ہے اور چیلنج بازی شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر اتنے جھگڑوں کی کوئی حاجت ہو۔ اگر کسی کے نزدیک آٹھ رکعت ہی ثابت ہوں تو وہ آٹھ پڑھے اور خواہ مخواہ بیس رکعت کو بدعت قرار دینے پر اپنا زور صرف نہ کرے۔ اور اگر کسی کے نزدیک ۲۰ رکعت ہی ثابت ہوں تو وہ بیس پڑھے اور آٹھ رکعت پڑھنے والوں کی مخالفت میں وقت ضائع نہ کرتا رہے۔ دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو اس سے بدرجہا زیادہ اہم مسائل درپیش ہیں جو ہماری توجہ اور محنت اور اوقات اور اموال کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اُن کو چھوڑ کر ان مسائل پر جھگڑے اور بحثیں کرنے میں سارا زور لگا دینا خدا کے دین کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔

محترم سائل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آٹھ رکعت سے زائد پڑھنا خلافِ سنت ہے۔ اور اس دعوے کی بنا انھوں نے اس بات پر رکھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح میں آٹھ ہی رکعت پڑھی ہیں۔ حالانکہ اگر اس بنیاد پر آٹھ رکعت سے زائد پڑھنے کو خلافِ سنت کہنا درست ہو تو پھر تمام عمر میں تراویح صرف تین مرتبہ ہی جماعت کے ساتھ پڑھنی چاہیے اور اس سے زائد پڑھنے کو بھی خلاف سنت قرار دے دیا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ حضورؐ سے باجماعت تراویح صرف اسی حد تک ثابت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس معاملے میں حضرت عمرؓ کا یہ اجتہاد کہ ہر رمضان میں بالالتزام تمام مساجد میں ہر روز باجماعت تراویح کا اہتمام کیا جائے، آپ نے قبول فرما لیا اور اسے خلافِ سنت قرار نہیں دیا تو آخر تراویح کے لیے ۲۰ رکعت مقرر کرنے کے بارے میں ان کا اجتہاد کس دلیل سے خلافِ سنت ہو گیا؟

سائل فاضل کی یہ کوشش کہ حضرت عمرؓ سے ۲۰ رکعت کے ثبوت ہی میں سرے سے شک پیدا کر دیا جائے، درحقیقت مکابرہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بات قریب قریب یقینی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ نے تراویح کے لیے ۲۰ رکعت مقرر کی تھیں، صحابہ نے اسے قبول کیا اور ان کے بعد بھی خلفا اور صحابہ کا عمل اس پر رہا۔ ترمذی کا بیان ہے:

وَ اَكْثَرُ اَهْلِ الْعِلْمِ عَلٰى مَارُوِيَ عَنْ عُمَرَ وَ عَلِيٍّ وَ غَيْرِهِمَا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً

اکثر اہل علم اُسی مسلک پر ہیں جو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ اور اُن کے علاوہ دوسرے صحابہ سے مروی ہے، یعنی ۲۰ رکعت۔

محمد بن نصر المروزی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہی عمل نقل کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے اسے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حضرت اُبیؓ بن کعب اور متعدد دوسرے صحابہ کا اثر بتایا ہے۔ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ جمہور علما ۲۰ رکعت ہی کے قائل ہیں اور صحابہ سے اس بارے میں کوئی اختلاف منقول نہیں ہوا ہے۔

المغنی میں ابنِ قُدامہؒ لکھتے ہیں:

امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک تراویح کے معاملے میں ۲۰ رکعت ہی کا مسلک مرجح ہے اور اسی کے قائل سُفیان ثوری اور ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ ہیں۔ مگر امام مالک ۳۶ کے قائل ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ قدیم سے اس پر عمل چلا آ رہا ہے.......... اس کے مقابلے میں ہمارا استدلال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب متفرق طور پر تراویح پڑھنے والے تمام لوگوں کو اُبی بن کعب کی امامت میں جمع کیا تو حضرت اُبی ۲۰ رکعتیں پڑھاتے تھے...... اور حضرت علیؓ سے بھی یہی ثابت ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو رمضان میں ۲۰ رکعت تراویح پڑھانے پر مامور کیا تھا۔ یہ عمل قریب قریب اجماع کا ہم معنی ہے.......... اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ بعد میں تمام اہل مدینہ ۳۶ رکعت تراویح پڑھنے لگے تھے تب بھی جو کچھ حضرت عمرؓ نے کیا تھا اور جس پر صحابہ ان کے زمانے پر متفق ہو گئے تھے اس کی پیروی کرنا زیادہ بہتر ہے۔ (المغنی لابن قدامہ، اول، ص ۷۹۸-۷۹۹)

اس کے مقابلے میں محترم سائل کا تمام تر اعتماد صرف اس روایت پر ہے جو امام مالک نے مؤطا میں سائب بن یزید سے نقل کی ہے اور جس میں وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے وتر سمیت ۱۱ رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں تین باتیں قابل غور ہیں۔ اوّل یہ کہ اسی مؤطا میں امام مالک یزید بن رومان کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے وتر سمیت ۲۳ رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ مگر محترم سائل نے اس روایت کو نظر انداز کر دیا۔ دوم یہ کہ وہی سائب بن یزید جن سے امام مالک ۱۱ رکعت کی روایت نقل کرتے ہیں، ان سے ایک دوسری روایت بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ ۲۳ رکعت کے حق میں نقل کی ہے، اور اس سے گمان ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اگر پہلے ۱۱ رکعتیں مقرر کی بھی تھیں تو بعد میں ان کو ۲۳ رکعت سے بدل دیا ہوگا۔ سوم یہ کہ امام مالک خود ان دونوں روایتوں پر عمل نہیں کرتے بلکہ ۳۶ رکعتوں کے حق میں اس بنا پر فیصلہ دیتے ہیں کہ مدینے میں ایک صدی سے زیادہ مدت سے تین رکعت وتر اور چھتیس رکعت تراویح پڑھنے کا طریقہ رائج تھا۔ سیوطی المصابیحؒ میں جو کچھ چاہیں کہیں مگر فقہائے مالکیہ اپنے امام کا یہی قول صحیح مانتے ہیں۔

ان امور پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعتیں ہی پڑھی ہیں، لیکن صحابہ اور تابعین نے بالعموم حضورؐ کے اس فعل کا مطلب یہ نہیں لیا ہے کہ آٹھ رکعت پڑھنا ہی سنت ہے اور اس سے زائد پڑھنا خلافِ سنت یا بدعت ہے۔ آخر یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین اور ائمہ مجتہدین سنت اور بدعت کے درمیان تمیز کرنے کی اہلیت سے اس درجہ محروم تھے یا جان بوجھ کر وہ سنت کو چھوڑ کر ایک بدعت کو اختیار کر سکتے تھے؟

بہرحال اگر کوئی شخص حضورؐ کے اس فعل کو اس معنی میں لیتا ہو کہ آپ کا منشا ۸ رکعت ہی کو سنت کی حیثیت سے جاری کرنے کا تھا تو وہ شوق سے اس پر عمل کرے، اور جو اس معاملے میں اس کے ہم خیال ہوں وہ اس کی پیروی کریں۔ لیکن ۲۰ رکعت کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دلائل اتنے کمزور نہیں ہیں کہ اسے خلاف سنت قرار دینا اتنا آسان ہو جتنا سمجھ لیا گیا ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، جون ۱۹۶۷ء، ص ۴۶۴-۴۶۸)

دس تراویح

س: کیا دس تراویح اور ایک وتر بھی مشروع ہیں، سعودی عرب میں ماہ رمضان میں اکثر اسی پر عمل ہوتا ہے؟

ج: جو لوگ دس تراویح اور ایک وتر پڑھتے ہیں وہ حدیث میں مذکورہ گیارہ رکعتوں کی تاویل کرتے ہیں۔ یہ کہ دس تراویح اور ایک وتر ہے۔ جو لوگ آٹھ رکعت تراویح پڑھتے ہیں، ان کی تاویل یہ ہے کہ گیارہ رکعت میں تین وتر اور آٹھ تراویح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر عرب ممالک میں آٹھ یا دس تراویح پڑھی جاتی ہیں، کچھ لوگ بیس یا چھتیس بھی پڑھتے ہیں۔ بیس اور چھتیس بھی صحابہ کرامؓ سے ثابت ہیں۔

(استفسارات، اوّل، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

اعتکاف

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات بخشی۔ پھر آپؐ کے بعد آپؐ کی ازواجِ مطہرات اعتکاف کیا کرتی تھیں۔[1] (متفق علیہ)

لغوی اور اصطلاحی معنی

اعتکاف کہتے ہیں اپنے آپ کو روکے رکھنے، کسی چیز پر قائم رہنے اور اس سے وابستہ رہنے کو۔ شریعت کی اصطلاح میں اعتکاف اس چیز کا نام ہے کہ آدمی ایک خاص صورت میں مسجد میں ٹھہرا رہے گویا مسجد میں قیام کرنے اور وہاں اپنے آپ کو روکے رکھنے کا نام اعتکاف ہے۔

حضورؐ کا معمول

نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں مسجد میں قیام فرماتے تھے اور آپ کا یہ معمول عمر بھر رہا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد آپ کا وہ معمول ہے جو مدینہ طیبہ میں رہا کیوں کہ رمضان کے روزوں کا حکم مدینہ طیبہ میں آیا تھا۔ دوسرے یہ کہ مکے میں اس وقت تک سرے سے کوئی مسجد ہی نہ تھی اور مسجدِ حرام (خانہ کعبہ) میں اعتکاف کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اسی لیے اس سے مراد یہی ہے کہ قیام مدینہ طیبہ میں آخر وقت تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول رہا کہ آپؐ رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔

(کتاب الصوم، جولائی ۱۹۸۰ء، ص ۲۶۷-۲۶۸)

آخری سال کا اعتکاف

[ایک] حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبریلؑ کو قرآن مجید سناتے تھے،[2] [دوسری] حدیث میں ہے کہ جبریلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید سناتے تھے[3]۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل دونوں طرح ہوتا تھا یعنی ایک مرتبہ جبریل

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۳۲-۳۳۳، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۳۴-۳۳۵، اشاعت دوم۔

۳- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۳۵-۳۳۶، اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

علیہ السلام قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سناتے تھے اور ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید جبریل علیہ السلام کو سناتے تھے۔ البتہ جس سال حضورؐ کا انتقال ہوا اس سال آپؐ کو دو مرتبہ قرآن مجید سنایا گیا۔ یعنی دو مرتبہ قرآن مجید آپؐ نے سنایا اور دو مرتبہ جبریل علیہ السلام نے سنایا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۸۴-۲۸۵)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتکاف کرنے کا عام معمول دس دن کا تھا لیکن حیات مبارکہ کے آخری سال بیس دن اعتکاف فرمایا۔[1]

ازواج مطہرات کا اعتکاف

ازواج مطہرات کا اعتکاف مسجد نبوی میں نہیں بلکہ اپنے حجروں ہی میں ہوتا تھا۔ تمام ازواج مطہرات کے حجرے مسجد نبوی کے ساتھ ساتھ تھے اور ہر ایک کا دروازہ مسجد کے اندر کھلتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات میں سے جن کے ہاں بھی قیام رکھتے تھے وہاں سے آپؐ مسجد کے اندر تشریف لاتے تھے۔ چونکہ یہ حجرے مسجد سے متصل تھے اس لیے ازواج مطہرات کو مسجد کے اندر آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی عورتوں کا اعتکاف مسجد میں نہیں ہوتا، بلکہ گھروں ہی میں ہوتا ہے۔ اس لیے ازواج مطہرات بھی رمضان کے آخری عشرے میں اپنے اپنے حجروں میں اعتکاف کرتی رہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۸۲)

اعتکاف کا فقہی حکم

......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال اپنے زمانہ قیام مدینہ میں اعتکاف نہیں کیا جس سے اس بات کی دلیل ملتی ہے کہ اعتکاف کرنا فرض اور واجب نہیں ہے۔ اگر فرض اور واجب ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک سال بھی اعتکاف نہ چھوڑتے۔ اگرچہ اعتکاف ایک بہت بڑی نیکی ہے اور ایک ایسی سنت ہے جس پر عمل کیا جانا چاہیے (اور آپؐ برابر سالہا سال اسی پر عمل پیرا رہے) لیکن ایک سال آپؐ نے اعتکاف نہیں فرمایا تاکہ فرض و واجب یا سنت میں فرق واضح ہو جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کی بنا پر فقہا کے درمیان اعتکاف کی نوعیت میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض اس کو واجب قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اعتکاف کیا ہے۔ اگر ایک سال نہیں کیا تو دوسرے سال آپؐ نے دس دن مزید اعتکاف میں بیٹھ کر اس کی قضا ادا کی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ سنت ہے اور سنت مؤکدہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مُستَحَب ہے اور ایسا مستحب کہ اس پر عمل کیا جانا چاہیے۔ اس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو مختلف عمل ہیں۔ فقہا نے یہ آرا ان کو دیکھ کر اختیار کی ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ وزن رکھتی ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۸۸-۲۸۹)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۳۵-۳۳۶، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معتکف میں کب داخل ہونا چاہیے

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کا ارادہ فرماتے تھے تو فجر کی نماز پڑھ کر اپنے مُعْتَکَف (اعتکاف کی جگہ) میں داخل ہوجاتے تھے۔[1] (ابوداؤد، ابن ماجہ)

مُـعْـتَـکَف سے مراد وہ جگہ ہے جو آدمی مسجد میں اپنے اعتکاف کے لیے بنالے۔ مسجد میں ایک پردہ سا لٹکا کر اپنے لیے خلوت پیدا کرلی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ فجر کی نماز پڑھ کر اپنے مُعْتَکَف میں داخل ہوجاتے تھے۔

امام اوزاعیؒ اور امام ثوریؒ وغیرہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ اعتکاف کی ابتدا فجر کے وقت سے ہوتی ہے۔ بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف کی ابتدا مغرب کے وقت سے ہوتی ہے یعنی اگر ۲۱ تاریخ سے اعتکاف میں بیٹھنا چاہے تو وہ ۲۰ تاریخ کو مغرب کی نماز کے بعد اعتکاف میں بیٹھ جائے گا۔ ائمہ اربعہ اسی بات کے قائل ہیں اور وہ اپنی دلیل دوسری احادیث سے لاتے ہیں۔ لیکن جو فقہا اسی بات کے قائل ہیں کہ اعتکاف کا وقت ۲۰ تاریخ کی فجر سے شروع ہوتا ہے وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۹۰-۲۹۱)

حضورؐ کے معتکف کی کیفیت

عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا اعْتَكَفَ طُرِحَ لَهٗ فِرَاشُهٗ اَوْيُوضَعُ لَهٗ سَرِيْرُهٗ وَرَاءَ اُسْطُوَانَةِ التَّوْبَةِ۔[2] (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه) حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کا ارادہ فرماتے تھے تو (مسجدِ نبوی میں) توبہ والے ستون کے ساتھ یا تو آپؐ کے لیے بستر بچھا دیا جاتا یا آپؐ کی چارپائی بچھا دی جاتی تھی۔

توبہ والا ستون جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے اب تک مسجد نبوی میں موجود ہے اس پر اُسْـطُوَانَۃُ التَّوْبَۃِ کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک صحابی حضرت ابولُبابہ رضی اللہ عنہ سے ایک غلطی سرزد ہوگئی۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بنی قریظہ کے پاس بطور سفیر کے بھیجا تو انھوں نے گردن پر ہاتھ پھیر کر اشارۃً انھیں یہ بتادیا کہ اب تمھیں قتل کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ یہ چیز گویا ایک فوجی اور جنگی راز دشمنوں پر ظاہر کرنے کے ہم معنی تھی۔ اس پر سخت گرفت کی گئی۔ چنانچہ جب حضرت ابولبابہؓ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ لیا اور کہا کہ جب تک میری معافی نہیں ہوگی اس وقت تک نہ تو میں اپنے آپ کو کھولوں گا اور نہ کچھ کھاؤں پیوں گا۔ وہ اس حالت میں بندھے رہے یہاں تک کہ بے ہوش ہوکر گر پڑے۔

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۴۴-۳۴۶، اشاعت دوم۔

۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۴۹-۳۵۰، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی معافی آئی تو ان کو کھولا گیا.......... اس ستون کو آج تک مسجد نبوی میں محفوظ رکھا گیا ہے اور اسی کے قریب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۹۴-۲۹۵)

معتکِف کے لیے احکام

معتکف کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ جنازے کے ساتھ نہ جائے۔ وہ بیوی کے قریب نہ جائے۔ حضرت عائشہؓ ہی کی حدیث میں ہے کہ وہ حضورؐ کے بال ٹھیک کر دیتی تھیں درآنحالیکہ آپؐ اعتکاف میں ہوتے تھے۔[1] اس سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو ہاتھ لگانے کی اجازت دی مگر خود ان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ البتہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی دوسرے کا گھر اس طرح مسجد کے ساتھ نہیں ہوتا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ اس لیے اس معاملے میں حکم وہی رہے گا جو معروف ہے۔

روزے کے بغیر اعتکاف نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی روزے سے نہ ہو مگر مسجد میں اعتکاف میں بیٹھا ہوا ہو۔

[ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ] اعتکاف نہیں ہے مگر مسجد جامع میں۔ فقہا کے درمیان اس کے مفہوم میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ بعض فقہا نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اعتکاف اس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جمعہ قائم کیا جا رہا ہو، یعنی اس میں جمعہ کی نماز ہوتی ہو۔ اس سے اختلاف کرتے ہوئے فقہا کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ہر مسجد میں اعتکاف ہو سکتا ہے۔ تاہم مسجدِ جامع کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ وہ مسجد ہے جس میں جماعت ہوتی ہو۔ یعنی کوئی شخص ایسی ویران مسجد تلاش کر کے وہاں جا کر اعتکاف میں نہ بیٹھ جائے جہاں نمازیوں کی آمد و رفت نہ ہو کیوں کہ اس صورت میں وہ اکیلا ہی نماز پڑھتا رہے گا اور جماعت کی نماز سے محروم رہے گا۔ اعتکاف کی نیکی تو اس نے کی لیکن جماعت کی نماز چھوٹ گئی۔ اس لیے اگر مسجد جامع سے ایسی مسجد مراد لی جائے تو پھر اختلاف کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی کیونکہ ویران مسجد میں اعتکاف کرنے کا کوئی بھی قائل نہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۹۲-۲۹۳)

مباشرت سے پرہیز

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ[1] (البقرہ ۲:۱۸۷) اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔

معتکف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی رمضان کے آخری دس دن مسجد میں رہے اور یہ دن اللہ کے ذکر کے لیے مختص کر

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۲۴۷-۲۴۳، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دے۔اس اعتکاف کی حالت میں آدمی اپنی انسانی حاجات کے لیے مسجد سے باہر جا سکتا ہے، مگر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو شہوانی لذتوں سے روکے رکھے۔

(تفہیم القرآن، اوّل،ص ۱۴۷، البقرہ، حاشیہ ۱۹۵)

مریض کی عیادت کا طریقہ

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کی حالت میں مریض کی عیادت کر لیتے تھے۔بس آپؐ سیدھے مریض کے پاس جاتے تھے اور اس کی خیریت پوچھ کر واپس آجاتے تھے۔[1] (ابو داؤد)

..........ایک حدیث [میں آتا] ہے کہ اعتکاف میں عیادت بھی نہیں کی جا سکتی اور وہ بھی حضرت عائشہؓ ہی کی روایت ہے۔[2] یہاں حضرت عائشہؓ کا بیان یہ ہے کہ حضورؐ عیادت کے لیے جایا کرتے تھے۔اس سے معلوم ہوا کہ عیادت کی دو حالتیں ہیں۔ایک حالت یہ ہے کہ کسی آدمی کو کوئی معمولی بیماری ہے اور اس میں کوئی خطرے اور پریشانی کی بات نہیں تو اعتکاف کی حالت میں آپؐ اس کی عیادت کے لیے نہیں جایا کرتے تھے لیکن اگر معلوم ہوتا کہ آدمی بہت سخت بیمار ہے اور اس کی حالت قابل تشویش ہے تو اس حالت میں آپؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تھے لیکن اس طرح کہ راستے میں کسی دوسرے کام کے لیے ٹھہرتے اور رُکتے نہیں تھے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۹۱)

اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت

حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معتکف کے بارے میں فرمایا: اعتکاف کرنے والا چونکہ اعتکاف کے زمانے میں گناہوں سے رکا رہتا ہے اس لیے اس کے حق میں وہ تمام نیکیاں لکھی جاتی ہیں جو اس شخص کے حق میں لکھی جاتی ہیں جو تمام نیکیوں پر عمل پیرا ہو۔(ابن ماجہ)

اعتکاف کرنے والا اعتکاف کی وجہ سے رُکا ہوا تو گناہوں سے ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کا معاملہ اس کے ساتھ یہ ہے اس کے حق میں وہ تمام نیکیاں بھی لکھی جاتی ہیں جو اس دوران میں وہ مسجد سے باہر ہونے کی صورت میں کرتا ....یعنی یہ بات تو نہیں لکھی جاتی کہ اگر وہ مسجد سے باہر رہتا تو یہ بدی کرتا، لیکن یہ لکھا جاتا ہے کہ اگر وہ باہر رہتا تو یہ نیکی کرتا..........یہ خلق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا انتہائی فیاضانہ اور مربیانہ معاملہ ہے کہ گناہ تو اس وقت تک نہیں لکھا جاتا جب تک کہ آدمی سے اس کا صدور نہ ہو جائے اور پھر جتنا گناہ صادر ہوتا ہے صرف اسی قدر لکھا جاتا ہے لیکن نیکی کا معاملہ جدا ہے..........

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۴۶-۳۴۷، اشاعت دوم۔
۲- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۴۷-۳۴۹، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صرف یہی نہیں کہ بندۂ مومن کے حق میں وہ نیکی لکھی جاتی ہے جو اس سے صادر ہوتی ہے بلکہ وہ نیکی بھی لکھ دی جاتی ہے جس کے متعلق یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کا موقع ملنے کی صورت میں وہ اسے انجام دیتا۔ اسی طرح اگر اس کے دل میں نیکی کا ارادہ تو آیا ہو اور وہ اسے کسی وجہ سے پورا نہ کر سکا ہو تب بھی وہ نیکی اس کے حق میں لکھ دی جاتی ہے (جب کہ محض گناہ کا ارادہ کرنے پر اس وقت تک کوئی مواخذہ نہیں ہوتا جب تک کہ اس پر عمل نہ کیا جائے) یہ خاص معاملہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے ساتھ کرتا ہے، کیوں کہ وہ فیاض ہے جتنا چاہے اپنی طرف سے دے سکتا ہے۔ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ نیکی کے بغیر اجر کا مستحق ٹھہرایا جانا عجیب بات ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر بادشاہ اپنی خوشی سے دیتا ہے تو اس پر کسی کے اعتراض کرنے کی کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص۲۹۵-۲۹۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

لیلۃ القدر

ہزار مہینوں سے بہتر رات

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۝ وَمَاۤ اَدۡرٰٮكَ مَا لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِؕ ۝ لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۙ خَيۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍؕ ۝ تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ وَ الرُّوۡحُ فِيۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ‌ۚ مِّنۡ كُلِّ اَمۡرٍ ۝ سَلٰمٌ ۛ هِىَ حَتّٰى مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ۝ (القدر ۹۷: ۱-۵) ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ فرشتے اور رُوح اُس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اُترتے ہیں۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا نزول انسانیت کے لیے عظیم الشان خیر کی حیثیت رکھتا ہے اور انسان کے لیے اس سے بڑی کوئی خیر نہیں ہوسکتی۔ اس لیے فرمایا گیا کہ وہ رات جس میں یہ قرآن مجید نازل ہوا ہے ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ دوسرے لفظوں میں پوری انسانی تاریخ میں کبھی ہزار مہینوں میں بھی انسانیت کی بھلائی کے لیے وہ کام نہیں ہوا جو اس ایک رات میں ہوا ہے۔ ہزار مہینوں کے لفظ کو گنتے ہوئے ہزار نہ سمجھنا چاہیے بلکہ اس سے بہت بڑی کثرت مراد ہے۔ چنانچہ اس رات میں، جو اپنی بھلائی کے لحاظ سے ہزار مہینوں سے بھی افضل ہے جس آدمی نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اور اس سے لو لگائی اُس نے بہت بڑی بھلائی حاصل کرلی۔ کیوں کہ اس رات میں بندے کا اللہ کی طرف رجوع کرنا یہی معنی تو رکھتا ہے کہ اسے اس رات کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اپنا کلام نازل فرمایا۔ اس لیے جس آدمی نے اس رات میں عبادت کا اہتمام کیا گویا اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اپنے عمل سے ثابت کیا کہ اس کے دل میں قرآن مجید کی صحیح قدر و قیمت کا احساس موجود ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۴۳-۴۴)

نزول قرآن کی رات

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۝ (القدر ۹۷: ۱) ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔

یہاں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے، اور سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے: شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِىۡٓ اُنۡزِلَ فِيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ ۔ (البقرۃ ۲: ۱۸۵) [رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس سے معلوم ہوا کہ وہ رات جس میں پہلی مرتبہ خدا کا فرشتہ غارِ حرا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے کر آیا تھا وہ ماہِ رمضان کی ایک رات تھی۔ اس رات کو یہاں شب قدر کہا گیا ہے اور سورۂ دخان میں اسی کو مبارک رات فرمایا گیا ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ۔ (الدخان ۴۴:۳) ہم نے اسے ایک برکت والی رات میں نازل کیا ہے۔

اس رات میں قرآن نازل کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس رات پورا قرآن حاملِ وحی فرشتوں کے حوالے کر دیا گیا اور پھر واقعات اور حالات کے مطابق وقتاً فوقتاً ۲۳ سال کے دوران میں جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی آیات اور سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کرتے رہے۔ یہ مطلب ابن عباسؓ نے بیان کیا ہے۔ (ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم، ابن مردویہ، بیہقی)

دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتدا اس رات ہوئی، یہ امام شعبی کا قول ہے، اگرچہ اُن سے بھی دوسرا قول وہی منقول ہے جو ابن عباسؓ کا اوپر گزرا ہے۔ (ابن جریر) بہر حال دونوں صورتوں میں بات ایک ہی رہتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے نزول کا سلسلہ اسی رات کو شروع ہوا اور یہی رات تھی جس میں سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات نازل کی گئیں۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کی آیات اور سورتیں اللہ تعالیٰ اُسی وقت تصنیف نہیں فرماتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت اسلامی کو کسی واقعہ یا معاملہ میں ہدایت کی ضرورت پیش آتی تھی، بلکہ کائنات کی تخلیق سے پہلے ازل میں اللہ تعالیٰ کے ہاں زمین پر نوع انسانی کی پیدایش، اس میں انبیا کی بعثت، انبیا پر نازل کی جانے والی کتابوں، اور تمام انبیا کے بعد آخر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمانے اور آپؐ پر قرآن نازل کرنے کا پورا منصوبہ موجود تھا۔ شب قدر میں صرف یہ کام ہوا کہ اس منصوبے کے آخری حصے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اس وقت اگر پورا قرآن حاملین وحی کے حوالے کر دیا گیا ہو تو کوئی قابل تعجب امر نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۴۰۴-۴۰۵، القدر، حاشیہ ۱)

وجہ تسمیہ

لیلۃ القدر اس خاص رات کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی صفت ہے چونکہ قرآن مجید اس خاص رات میں نازل کیا گیا تھا اس لیے اس کو قدر کی رات کہا گیا۔

قدر کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک معنی یہ ہیں کہ وہ رات بہت ہی احترام کے قابل اور بڑی عظمت والی ہے کیونکہ اس میں قرآن مجید نازل کیا گیا۔ اس کے علاوہ قدر کا لفظ قضا و قدر کے معنوں میں بھی ہو سکتا ہے کیونکہ قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۙ ملائکہ اور جبریلؑ اسی رات میں اپنے رب کے حکم سے ہر طرح کے احکام و فرامین لے کر نازل ہوتے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چنانچہ اس کے معنی تقدیر بنانے کی رات کے بھی ہو سکتے ہیں۔ بعض مفسرین نے قدر کو ضیق اور تنگی کے معنوں میں لیا ہے اور وہ لیلۃ القدر کا مفہوم یہ قرار دیتے ہیں کہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے تنگی کی ہے کہ اس کی صحیح تاریخ لوگوں کو بتائی جائے، لیکن یہ ایک دور کا مفہوم ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۶۱-۲۶۲)

قدر کے معنی بعض مفسرین نے تقدیر کے لیے ہیں، یعنی یہ وہ رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ تقدیر کے فیصلے نافذ کرنے کے لیے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کی تائید میں سورۂ دخان کی یہ آیت کرتی ہے: فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ''اس رات میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے'' (آیت ۵)۔ بخلاف اس کے امام زُہری کہتے ہیں کہ قدر کے معنی عظمت و شرف کے ہیں، یعنی وہ بڑی عظمت والی رات ہے۔ اس معنی کی تائید اسی سورہ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۴۰۵، القدر، حاشیہ ۱)

تعیّن میں اختلاف

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہؓ کو خواب میں دکھایا گیا کہ لیلۃ القدر رمضان کی آخری سات تاریخوں میں ہے۔ جب یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی گئی تو آپؐ نے فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگوں کے خواب رمضان کے آخری سات دنوں کے بارے میں متفق ہو گئے ہیں۔ پس اب جو شخص لیلۃ القدر کی تلاش کرے تو وہ رمضان کی آخری سات تاریخوں میں تلاش کرے۔[1] (متفق علیہ)

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو متعدد احادیث ایک دوسرے سے مختلف آئی ہیں ان کے اختلاف کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کوئی حدیث زمانی اعتبار سے پہلے کی ہو اور کوئی بعد کی۔ کیوں کہ راویوں نے احادیث کی روایت کرتے وقت ان کا زمانہ بیان نہیں کیا ہے۔ اس حدیث میں بھی ایسا کوئی تعین نہیں کیا گیا ہے کہ (یہ) کس زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت عائشہ کی روایت میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری دس تاریخوں میں تلاش کرو، یہاں بہت سے صحابہؓ کے ایک خواب کا ذکر کیا گیا ہے جس کے مطابق وہ رمضان کی آخری سات تاریخوں میں سے کوئی رات ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ کئی صحابہؓ کو ایک ہی خواب نظر آیا ہے یہ فرمایا کہ اب لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری سات تاریخوں میں تلاش کرو۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت پہلے کی ہے اور حضرت عبداللہؓ بن عمر کی بعد کی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب) ایسی احادیث کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ باہم متضاد ہیں۔ بلکہ درحقیقت ان میں اختلاف ترتیب زمانی کی تقدیم و تاخیر کی وجہ سے ہوا ہے اور اس نوع کا اختلاف ان کو متضاد یا غلط قرار دیے جانے کی دلیل نہیں بن سکتا۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۶۳-۲۶۴)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۱۳-۳۱۴، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

[شب قدر کے تعین میں] اتنا اختلاف ہوا ہے کہ قریب قریب ۴۰ مختلف اقوال اس کے بارے ملتے ہیں لیکن علمائے امت کی بڑی اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ رمضان کی آخری دس تاریخوں میں سے کوئی ایک طاق رات شب قدر ہے، اور ان میں بھی زیادہ تر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ وہ ستائیسویں رات ہے...........

حضرت ابوذرؓ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ، حضرت حذیفہؓ اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بہت لوگوں کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے۔ (ابن ابی شیبہ)......

حضرت ابوبکرہؓ کی روایت ہے کہ ۹ دن باقی ہوں یا سات دن یا پانچ دن یا تین دن یا آخری رات۔ مراد یہ تھی کہ ان تاریخوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو۔ (ترمذی، نسائی)............

اس معاملے میں جو روایات حضرت معاویہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ وغیرہ بزرگوں سے مروی ہیں ان کی بنا پر علمائے سلف کی بڑی تعداد ستائیسویں رمضان ہی کو شب قدر سمجھتی ہے۔ غالباً کسی رات کا تعین اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ شب قدر کی فضیلت سے فیض اٹھانے کے شوق میں لوگ زیادہ سے زیادہ راتیں عبادت میں گزاریں۔ اور کسی ایک رات پر اکتفا نہ کریں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت مکہ معظمہ میں رات ہوتی ہے اس وقت دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں دن ہوتا ہے۔ اس لیے ان علاقوں کے لوگ تو کبھی شب قدر کو پا ہی نہیں سکتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں اکثر رات کا لفظ دن اور رات کے مجموعے کے لیے بولا جاتا ہے اس لیے رمضان کی ان تاریخوں سے جو تاریخ بھی دنیا کے کسی حصے میں ہو اس کے دن سے پہلے والی رات وہاں کے لیے شب قدر ہو سکتی ہے۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۴۰۵-۴۰۶، القدر، حاشیہ ۱)

لیلۃ القدر، ۲۷ویں شب!

حضرت اُبی بن کعبؓ نے بغیر استثنا کیے ہوئے حلفاً یہ کہا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں تاریخ ہے [پوچھا گیا کہ] آپ یہ بات کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: [میں یہ بات] ایک علامت یا نشانی کی بنا پر کہہ رہا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتائی تھی اور وہ نشانی یہ ہے کہ اس روز جو سورج نکلے گا تو اس میں شعاع نہیں ہوگی۔[1] (مسلم)

'شعاع نہیں ہوگی' سے مراد یہ ہے کہ شعاع میں تیزی نہیں ہوگی۔ ایسا اس بنا پر بھی ہو سکتا ہے کہ بادل ہونے کی وجہ سے سورج کی شعاعیں بہت ہلکی اور دھیمی ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس روز ویسے ہی شعاعوں میں تیزی اور چمک کم ہو.........

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس علامت سے قطعی طور پر لیلۃ القدر کا تعین کیا جا سکتا ہے؟

حضرت ابی بن کعبؓ نے اول تو اپنے اجتہاد سے یہ رائے قائم کی کہ چوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ علامت بتائی ہے اور فلاں تاریخ کو (جو ستائیسویں تھی) میں نے یہ علامت دیکھی ہے اس لیے ضرور یہ ستائیسویں تاریخ ہی لیلۃ القدر کی تاریخ ہوگی،

۱۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۲۱-۳۲۲، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حالاں کہ کسی اور تاریخ کو بھی سورج نکلنے کی یہ کیفیت ہو سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ خود لا شعاع لھا کے الفاظ بھی اس بات کا قطعی طور پر تعین نہیں کرتے کہ سورج کے طلوع ہونے کی کس کیفیت کا نام لا شعاع لھا ہے۔ اس بنا پر بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمیشہ کے لیے ستائیسویں تاریخ کا تعین کر دیا جائے۔ یا کسی اور تاریخ کو کھڑے ہو کر ایک آدمی یہ دیکھے کہ آج سورج کی شعاع کیسی پڑ رہی ہے اور وہ اپنی جگہ یہ خیال کر کے کہ لا شعاع لھا کی کیفیت ہے یہ طے کر دے کہ آج کی تاریخ وہ خاص تاریخ ہے...... یہاں بھی دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت کس طرح پوری ہو رہی ہے کہ لوگوں کو یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ لیلۃ القدر کون سی رات ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۷۰-۲۷۱)

لیلۃ القدر کی تلاش

حضرت عُبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی سے (یا اپنے خانۂ مبارک) سے نکلے تا کہ ہمیں لیلۃ القدر کی خبر دیں۔ اتنے میں دو مسلمان آپس میں جھگڑنے لگے۔ اس پر آپؐ نے ہم سے فرمایا کہ میں تو تمھیں لیلۃ القدر کی خبر دینے نکلا تھا مگر فلاں اور فلاں آپس میں جھگڑ پڑے اور اس دوران میں وہ اٹھالی گئی (یعنی اس رات کا علم مجھ سے رفع کر لیا گیا) شاید تمھاری بھلائی اسی میں تھی۔ لہٰذا اب تم اسے ۲۱ویں یا ۲۳ویں یا ۲۵ویں رات کو تلاش کرو۔[۱] (بخاری)

اب تک جتنی احادیث گزری ہیں ان سب پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کوئی خاص حکمت اور مصلحت ہے کہ اس نے لیلۃ القدر حتمی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بتائی اور آپؐ کو اس بات پر مامور نہیں کیا کہ آپؐ لوگوں کو یہ بتائیں کہ فلاں رات لیلۃ القدر ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ سے زیادہ جو بات بتانے کی اجازت دی گئی وہ یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے میں ہے اور تم طاق راتوں میں اسے تلاش کرو۔ اس حدیث میں طاق راتوں میں سے بھی تین راتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی ۲۱، ۲۳ اور ۲۵۔ بعض روایات میں اکیس سے انتیس تک کی طاق راتیں ہیں اور بعض روایات میں آخری سات دنوں کی راتیں ہیں۔

احادیث کی روایت کرتے وقت چوں کہ یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ کون سی حدیث کس تاریخ کی ہے اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سی حدیث ابتدائی دور کی ہے اور کون سی بعد کے دور کی۔ علمائے امت میں جو بات معروف ہے وہ یہی ہے کہ لیلۃ القدر آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۷-۲۲۸)

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب لیلۃ القدر ہوتی ہے تو جبریل علیہ السلام ملائکہ کے ایک جھرمٹ میں اترتے ہیں اور ہر اس بندے کے لیے دعا کرتے ہیں جو اس وقت کھڑا ہوا یا بیٹھا ہوا اللہ عزوجل کا ذکر کر رہا ہو (یعنی جاگ رہا ہو اور عبادت کر رہا ہو)۔ پھر جب عید الفطر کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنے ملائکہ کے

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۲۹-۳۳۱، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سامنے فخر کرتا ہے اور انھیں مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اے میرے فرشتو! اس اجیر (مزدور) کی جزا کیا ہے، جس نے اپنے ذمے کا کام پورا کر دیا۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! اس کی جزا یہ ہے کہ اس کی مزدوری اسے پوری پوری دے دی جائے۔ اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ اے میرے ملائکہ! میرے ان بندوں اور بندیوں نے اپنا وہ فرض ادا کر دیا جو میں نے ان پر عائد کیا تھا۔ پھر اب یہ گھروں سے (عید کی نماز ادا کرنے اور) مجھ سے گڑگڑا کر مانگنے کے لیے نکلے ہیں۔ اور قسم ہے میری عزت اور میرے جلال کی، اور میرے کرم کی اور میری بلند مرتبگی کی، اور میری بلند مقامی کی کہ میں ان کی دعائیں ضرور قبول کروں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: جاؤ میں نے تمھیں معاف کر دیا اور تمھاری برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دیا............ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ پھر وہ اس حالت میں پلٹتے ہیں کہ انھیں معاف کر دیا جاتا ہے۔[1] (بیہقی)

اللہ تعالیٰ سال کے سال اپنے مومن بندوں کے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے کیوں کہ انھوں نے رمضان میں روزے رکھے اور لیلۃ القدر کی تلاش میں راتوں کو عبادت کرتے رہے۔ پھر عید کے روز نماز کے لیے نکلے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں۔ اس کے نتیجے میں وہ اس کے ہاں سے مغفرت اور مہربانیاں حاصل کر کے پلٹے ہیں۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۷۹-۲۸۰)

عدمِ تعیّن کی حکمت

لیلۃ القدر کے متعلق یہ وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ وہ کون سی رات ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتایا ہے وہ بس یہ ہے کہ وہ رات رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں آتی ہے۔ یعنی وہ رات اکیسویں ہوسکتی ہے بائیسویں نہیں، تیئسویں ہوسکتی ہے چوبیسویں نہیں۔ وعلی ھذا القیاس وہ آخری عشرے کی طاق رات ہے۔ یہ فرمانے کے بعد اس بات کو بغیر تعیّن کے چھوڑ دیا گیا کہ وہ کون سی رات ہے۔ عام طور پر لوگ ستائیسویں رمضان کے بارے میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ لیلۃ القدر ہے۔ لیکن بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ رمضان کی ستائیسویں شب ہی لیلۃ القدر ہے۔ البتہ جو بات تعیّن کے ساتھ کہی جاسکتی ہے وہ فقط یہ ہے کہ وہ آخری عشرے کی کوئی طاق رات ہے۔

لیلۃ القدر کا قطعی طور پر تعیّن نہ کرنے میں یہ حکمت کارفرما نظر آتی ہے کہ آدمی ہر طاق رات میں اس امید پر اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہو کر عبادت کرے کہ شاید یہی لیلۃ القدر ہو.......... لیلۃ القدر اگر اس نے پالی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ جس چیز کا طالب تھا وہ اسے مل گئی، اس کے بعد اس نے جو چند مزید راتیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاریں تو اس کی نیکی میں مزید اضافے کا موجب بنے گی۔

اس مقام پر ایک اور بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ چوں کہ ساری دنیا میں رمضان کی ایک ہی تاریخیں نہیں ہوتیں اور ان میں رد و بدل ہوتا رہتا ہے اس لیے یہ بات یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ کس آدمی کو واقعی وہ اصل رات میسر آ گئی۔ اس

۱۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۳۱، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیے ایک طالب صادق کو ہر رمضان میں اسے تلاش کرنا چاہیے۔ رمضان کا جو آخری عشرہ اعتکاف کے لیے مقرر کیا گیا ہے اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اعتکاف کا ثواب آدمی کو الگ ملے اور چوں کہ اعتکاف کی حالت میں اس کی تمام طاق راتیں عبادت میں گزریں گی اس لیے اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ اسے ان میں کبھی نہ کبھی وہ رات بھی لازماً مل جائے گی۔

بعض لوگ اپنی جگہ لیلۃ القدر کی تلاش کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ رات کو باہر نکل کر یہ دیکھا جائے کہ فضا میں کوئی ایسی علامت پائی جاتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ قدر کی رات ہے۔ فضا میں کوئی ایسا نور برس رہا ہے جس سے اس کا لیلۃ القدر ہونا ثابت ہو جائے۔ لیکن دراصل یہ طرزِ فکر مطابقِ حقیقت نہیں ہے۔ بے شک یہ نور برستا ہے، لیکن یہ نور تو پورے رمضان میں اور رمضان کی ہر رات میں برستا ہے۔ البتہ اس کے لیے وہ آنکھیں چاہییں جو اس کو دیکھ سکیں۔ یہ نور درحقیقت آپ کی عبادات کے اندر برستا ہے۔ یہ نور خدا کی رضا طلبی کے اندر، آپ کے انہماک میں، بھلائیوں کے لیے آپ کے ذوق و شوق میں اور عبادات کے لیے آپ کے خلوص و اہتمام میں اور فی الجملہ آپ کے ایک ایک فعل میں برستا ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۴۷-۴۹)

پورے رمضان میں لیلۃ القدر کی تلاش

رمضان کے مختلف حصوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتکاف بیٹھنے کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ لیلۃ القدر کو تلاش کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے آپؐ نے رمضان کے پہلے دس دن اعتکاف کیا۔ پھر بیچ کے دنوں میں کیا۔ پھر آپ کو اشارہ کیا گیا کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری دس دنوں میں ہے چنانچہ آپؐ نے ان صحابہؓ سے جو آپؐ کے ساتھ اعتکاف میں بیٹھے تھے یہ فرمایا کہ اب تم بھی آخری دس دنوں میں اعتکاف کرو۔[۱]

حدیث کے متن میں اِنِّیۡ اُنۡسِیۡتُهَا کے الفاظ آئے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ رات مجھے بھلا دی گئی۔ یہ نہیں فرمایا کہ میں بھول گیا۔ اس جگہ ایک نازک نکتہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز بطور ہدایت نازل ہو یا کسی چیز کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولؐ کو دیا گیا ہو اور وہ اسے بھول جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نعوذ باللہ رسالت محفوظ نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ایسا ہونا بعید از عقل و امکان ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلا دیا جائے تو اسے اختیار ہے کہ وہ اپنے نبیؐ کے ذہن سے جس بات کو چاہے محو کر دے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ ہر کام کے کرنے کا اختیار رکھتا ہے کہ اسی طرح وہ اپنے کیے ہوئے کسی کام کو محو کر دینے اور منسوخ کر دینے کا اختیار بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وہ علم اپنے نبیؐ سے چھپایا بھی نہیں لیکن اس کو ظاہر کرنے کے بعد اس کے ذہن سے اس کو محو بھی کر دیا تاکہ جس چیز کی خبر اللہ تعالیٰ لوگوں کو نہیں دینا چاہتا تھا وہ لوگوں تک نہ پہنچے۔ اسی لیے حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اِنِّیۡ اُنۡسِیۡتُهَا وہ رات مجھے بھلا دی گئی۔

اب یہ سوال کہ راوی حدیث حضرت ابوسعید خدریؓ کے اخذ کردہ اس نتیجے کی حقیقت کیا ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کی

۱۔ تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۱۷-۳۲۰، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اکیسویں رات ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ چوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا تھا کہ مجھے خواب میں جو چیز دکھائی گئی ہے وہ یہ تھی کہ وہ کوئی بارش والی رات ہے اور صبح کو میں نے کیچڑ میں سجدہ کیا ہے۔ اس لیے جب لوگوں نے دیکھا کہ اکیس تاریخ کو بارش ہوئی ہے اور صبح کی نماز کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر پانی اور مٹی کا نشان تھا لوگوں نے خیال کیا کہ حضور کی بتائی ہوئی بات کے مطابق یہی رات لیلۃ القدر ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ نہیں فرمایا کہ یہی اکیسویں رات لیلۃ القدر ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ نے خود یہ قیاس کیا کہ یہی رات لیلۃ القدر ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ حضور کو کوئی اور رات دکھائی گئی ہو کیوں کہ عبداللہ بن اُنیسؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ تیئسویں رات تھی۔ چنانچہ اس طرح بھی ۲۱ تاریخ کا قطعی تعین نہیں ہوا............اس طرح دراصل حکمت الٰہی کا یہ مقصود کہ لوگوں کو ٹھیک ٹھیک اس رات کی تاریخ کا علم نہ ہو روایات کے اختلاف نے پورا کر دیا۔ نہ روایات متفق ہوسکیں اور نہ خود رسول اللہ ہی نے یہ وضاحت فرمائی کہ یہی وہ رات ہے جو میں نے خواب میں دیکھی تھی۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۶۷-۲۶۸)

کیا لیلۃ القدر ہر رمضان میں ہوتی ہے؟

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لیلۃ القدر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ رمضان میں ہوتی ہے۔[۱]

جس رات میں قرآن نازل کیا گیا تھا اور جس کو قرآن مجید میں لیلۃ القدر کہا گیا ہے چونکہ وہ رمضان کی ایک رات تھی اس لیے لازماً ہر رمضان میں ایک رات لیلۃ القدر ہے۔ لیکن کون سی رات ہے اس کا تعین نہیں ہوسکا بجز اس کے کہ وہ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی رات ہے۔

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۷۴-۲۷۵)

لیلۃ القدر کی دعا

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کا کیا خیال ہے، اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ کون سی رات لیلۃ القدر ہے، تو مجھے اس میں کیا کہنا چاہیے؟ آپؐ نے فرمایا: یوں کہو: اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ اے میرے خدا، تو بڑا معاف کرنے والا ہے، تو معاف کرنے کو پسند کرتا ہے، لہٰذا مجھے معاف فرمادے۔

(احمد، ابن ماجہ، ترمذی)

(کتاب الصوم، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۷۳)

۱- تخریج: تفہیم الاحادیث، چہارم، ص ۳۲۶، اشاعت دوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

صدقۂ فطر

صدقہ کا مفہوم

صدقہ اردو زبان میں تو بہت بُرے معنوں میں بولا جاتا ہے، مگر اسلام کی اصطلاح میں یہ اس عطیے کو کہتے ہیں جو سچے دل اور خالص نیت کے ساتھ محض اللہ کی خوشنودی کے لیے دیا جائے، جس میں کوئی ریا کاری نہ ہو، کسی پر احسان نہ جتایا جائے، دینے والا صرف اس لیے دے کہ وہ اپنے رب کے لیے عبودیت کا سچا جذبہ رکھتا ہے۔ یہ لفظ صدق سے ماخوذ ہے اس لیے صداقت عین اس کی حقیقت میں شامل ہے۔ کوئی عطیہ اور کوئی صرف مال اس وقت تک صدقہ نہیں ہو سکتا جب تک اس کی تہہ میں انفاق فی سبیل اللہ کا خالص اور بے کھوٹ جذبہ موجود نہ ہو۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۳۱۵، سورۃ الحدید، حاشیہ ۳۱)

صدقۂ فطر کا صحیح مصرف

صدقۂ فطر کا تعلق خاص طور پر عید سے ہے۔ اس کا مقصد عید کے موقع پر معاشرے کے نادار لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ [مثلاً] آپ کسی کو سلائی مشین دینا چاہیں تو اس کے لیے صدقات اور اعانت کی دوسری صورتیں موجود ہیں۔ لیکن اگر آپ یہ کام صدقۂ فطر سے لینا چاہتے ہیں تو اندازہ کر لیں کہ کتنے لوگوں کے حصے کا فطرانہ جمع کر کے کے ایک مشین خرید سکیں گے۔ اس طرح فطرانے کی بڑی رقم ایک جگہ صرف ہونے سے بہت سے مستحق افراد کی حق تلفی ہو سکتی ہے۔ صدقہ فطر تو اس لیے ہے کہ غریب لوگ بھی عید منا سکیں اور عید کی خوشیوں میں شریک ہو سکیں۔

(۵-اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۳۴-۳۵)

صدقۂ فطر کی مقدار

فطرے کی مقدار میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں جو اوزان اور پیمانے اُس وقت رائج تھے ان کو موجودہ زمانے کے اوزان اور پیمانوں کے مطابق بنانے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ مختلف اہل علم نے اپنی تحقیق سے جو کچھ اوزان بیان کیے ہیں، عام لوگ ان میں سے جس کے مطابق بھی فطرہ دیں گے سبکدوش ہو جائیں گے۔ اس معاملے میں زیادہ تشدد کی ضرورت نہیں ہے۔ فطرہ ہر اس شخص کو دینا چاہیے جو عید کے روز اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد فطرہ نکالنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ اور بیوی مستطیع ہو تو وہ بیوی ہی پر واجب ہوگا کیوں کہ اس کے شوہر کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں ہے لیکن میرے خیال میں اسے اولاد کا فطرہ نکالنا چاہیے۔

(رسائل و مسائل، چہارم، اپریل ۱۹۸۱ء، ص ۳۵۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حصہ چہارم

حج

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب اوّل

خانۂ کعبہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

کعبے کی اہمیت

تاریخی اہمیت

اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۝ فِيۡهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ ۚ وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا ؕ وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ (آل عمران ۳:۹۶-۹۷) بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکے میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیمؑ کا مقام عبادت ہے، اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔[1]

مذہبی اہمیت

اس گھر میں ایسی صریح علامات پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جناب میں مقبول ہوا ہے۔ اور اسے اللہ نے اپنے گھر کی حیثیت سے پسند فرما لیا ہے۔ لق و دق بیابان میں بنایا گیا اور پھر اللہ نے اس کے جوار میں رہنے والوں کی رزق رسانی کا بہتر سے بہتر انتظام کر دیا۔ ڈھائی ہزار برس تک جاہلیت کے سبب سے سارا ملک عرب انتہائی بدامنی کی حالت میں مبتلا رہا، مگر اس فساد بھری سرزمین میں کعبہ اور اطراف کعبہ ہی کا ایک خطہ ایسا تھا جس میں امن قائم رہا۔ بلکہ اسی کعبے کی یہ برکت تھی کہ سال بھر میں چار مہینے کے لیے پورے ملک کو اس کی بدولت امن میسر آ جاتا تھا۔ پھر ابھی نصف صدی پہلے ہی سب دیکھ چکے تھے کہ ابرہہ نے جب کعبے کی تخریب کے لیے مکہ پر حملہ کیا تو اس کی فوج کس طرح قہر الٰہی کی شکار ہوئی۔ اس واقعہ سے اس وقت

۱- یہودیوں کا اعتراض تھا کہ تم نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبے کو قبلہ کیوں بنایا، حالانکہ پچھلے انبیاؑ کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ اس کا جواب سورہ بقرہ میں دیا جا چکا ہے۔ لیکن یہودی اس کے بعد بھی اپنے اعتراض پر مصر رہے۔ لہٰذا یہاں پر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ بیت المقدس کے متعلق خود بائیبل ہی کی شہادت موجود ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساڑھے چار سو برس بعد حضرت سلیمانؑ نے اس کو تعمیر کیا۔ (۱۔ سلاطین، باب ۶۔ آیت ۱) اور حضرت سلیمانؑ ہی کے زمانے میں وہ قبلہ اہل توحید قرار دیا گیا (کتاب مذکور، باب ۸، آیت ۲۹۔۳۰)۔ برعکس اس کے یہ تمام عرب کی متواتر اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے کہ کعبے کو حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا، اور وہ حضرت موسیٰؑ سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے ہیں۔ لہٰذا کعبے کی اولیت ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔ (تفہیم القرآن، اوّل، ص ۲۷۴، آل عمران، حاشیہ ۷۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عرب کا بچہ بچہ واقف تھا اور اس کے چشم دید شاہد ان آیات کے نزول کے وقت موجود تھے۔

جاہلیت کے تاریک دور میں بھی اس گھر کا یہ احترام تھا کہ خون کے پیاسے دشمن ایک دوسرے کو وہاں دیکھتے تھے اور ایک کو دوسرے پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۲۷۴-۲۷۵، آل عمران حاشیہ ۸۰-۸۱)

معاشی و معاشرتی اہمیت

یہ عمارت محض ایک عبادت گاہ ہی نہ تھی، جیسے مسجدیں ہوا کرتی ہیں، بلکہ اول روز ہی سے اس کو دین اسلام کی عالم گیر تحریک کا مرکز تبلیغ واشاعت قرار دیا گیا تھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ایک خدا کو ماننے والے ہر جگہ سے کھنچ کھنچ کر یہاں جمع ہوا کریں، مل کر خدا کی عبادت کریں، اور اسلام کا پیغام لے کر پھر اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں۔ یہی اجتماع تھا جس کا نام 'حج' رکھا گیا۔ اس کی پوری تفصیل کہ یہ مرکز کس طرح تعمیر ہوا، کن جذبات اور کن دعاؤں کے ساتھ دونوں باپ بیٹوں نے اس عمارت کی دیواریں اٹھائیں، اور کیسے حج کی ابتدا ہوئی، قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۚ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (آل عمران ۳:۹۶-۹۷) یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی تھا جو مکے میں تعمیر ہوا۔ برکت والا گھر اور سارے جہانوں کے لیے (مرکز) ہدایت۔ اس میں (اللہ کی) کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ مقام ابراہیمؑ ہے۔ اور جو کوئی اس میں داخل ہو جاتا ہے، اس کو امن مل جاتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ (العنکبوت ۲۹:۶۷) کیا لوگوں نے دیکھا نہیں ہے کہ ہم نے کیسا پُر امن حرم بنایا ہے۔ حالانکہ اس کے گرد و پیش لوگ اچک لیے جاتے ہیں۔

یعنی جب کہ عرب میں دو ہزار برس تک ہر طرف لوٹ مار، قتل و غارت گری اور جنگ و جدال کا بازار گرم رہا، اس حرم میں ہمیشہ امن ہی رہا، حتیٰ کہ وحشی بدو تک اس کے حدود میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھ پاتے تو اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرتے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرکز و مرجع اور امن کی جگہ بنایا اور (حکم دیا کہ) ابراہیمؑ کے مقام عبادت کو جائے نماز بنا لو۔

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۔ اور ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو ہدایت کی کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اور جب ابراہیمؑ نے دعا کی کہ پروردگار! اس جگہ کو ایک پر امن شہر بنا دے اور یہاں کے باشندوں کو پھلوں کا رزق بہم پہنچا، جو بھی ان میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والا ہو۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (البقرۃ ۲:۱۲۵-۱۲۹) اور جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو دعا کرتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار! ہماری اس کوشش کو قبول فرما، تو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ پروردگار! اور تو ہم دونوں کو اپنا مسلم (اطاعت گزار) بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو، اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہم پر عنایت کی نظر رکھ کہ تو بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔ پروردگار! اور تو ان لوگوں میں انھی کی قوم میں سے ایک ایسا رسول بھیج جو انھیں تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق درست کرے۔ یقیناً تو بڑی قوت والا اور بڑا حکیم ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ○ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ○ (ابراہیم ۱۴:۳۵-۳۷) اور جب کہ ابراہیمؑ نے دعا کی: پروردگار! اس شہر کو پر امن شہر بنا دے اور مجھ کو اور میرے بچوں کو بت پرستی سے بچا۔ پروردگار! ان بتوں نے بہتیرے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ سو جو کوئی میرے طریقے کی پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میرے طریقے سے پھر جائے تو یقیناً تو غفور اور رحیم ہے۔ پروردگار! میں نے اپنی نسل کے ایک حصے کو تیرے اس عزت والے گھر کے پاس اس بے آب و گیاہ وادی میں لا بسایا ہے تاکہ اے پروردگار! یہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دلوں میں ایسا شوق ڈال کہ وہ ان کی طرف کھنچ کر آئیں اور ان کو پھلوں سے رزق پہنچا۔ امید ہے کہ یہ شکر گزار بنیں گے۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ○ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ○ (الحج ۲۲:۲۶-۲۸) اور جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر کی جگہ مقرر کی اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی کو میرے ساتھ شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھنا اور (حکم دیا کہ) لوگوں میں حج کی عام منادی کر دو کہ تمھارے پاس آئیں خواہ پیدل آئیں یا ہر دور دراز

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مقام سے دبلی اونٹنیوں پر آئیں۔ تاکہ یہاں آکر دیکھیں کہ ان کے لیے کیسے کیسے (دینی و دنیوی) منافع ہیں اور ان چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر جو اللہ نے ان کو دیے ہوں، اللہ کا نام لیں (یعنی قربانی کریں) اور اس میں سے خود بھی کھائیں اور تنگ دست و محتاج لوگوں کو بھی کھلائیں۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۶۵-۲۶۸، بتصرف ترتیب)

۞ ۞ ۞

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

مرکزیّت

عالم اسلام کا دل

عالم اسلام کے اندر خانہ کعبہ کی مثال وہی ہے جو انسان کے جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ انسان کے جسم میں دل کا مقام یہ ہے کہ وہ رگ رگ سے خون کھینچ کر اپنی طرف لاتا ہے اور پھر اس کو پمپ کر کے ایک صالح شکل میں انسان کے جسم کی رگ رگ میں واپس پہنچاتا ہے۔ جسدِ ملت کے لیے ایسا ہی عمل خانہ کعبہ کرتا ہے۔ یہ ہر سال دنیا کے ہر گوشے سے مسلمانوں کو کھینچ کر لاتا ہے اور پھر ان کو گناہوں کی آلائشوں اور سیرت و کردار کی خامیوں سے پاک کر کے ان کے اندر ایک نئی صالح زندگی کی افزائش کر کے دنیا کے گوشے گوشے میں واپس بھیج دیتا ہے۔ اس دل کی یہ دھڑکن جب تک جاری ہے، دنیا کی کوئی طاقت اسلام کو نہیں مٹا سکتی۔ یہ ایک ایسی تحریک ہے جو ہر سال مسلمانوں کو کھینچ بلا کر ایک جگہ جمع کرتی ہے۔ ان کو ایک وقت تک ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر رکھتی ہے۔ ان سے مختلف عبادات انجام دلاتی ہے اور ان عبادات کے دوران میں تمام اسلامی جذبات کو تازہ کر کے ایک متحرک اور فعال اسلامی روح ان کے اندر پھونک کر انھیں واپس بھیجتی ہے۔ جس طرح انسان کے جسم میں دل جب تک دھڑکتا رہتا ہے اس کا جسم زندہ رہتا ہے، اسی طرح یہ حج حقیقت میں دنیائے اسلام کے دل کی دھڑکن ہے جو خون کو کھینچ کر لا رہی ہے اور پھر اس کو صالح اور پاکیزہ بنا کر واپس پہنچا رہی ہے۔ یہ عمل جب تک جاری رہے گا ان شاء اللہ قیامت تک اسلام قائم رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت خواہ وہ اپنا کتنا ہی زور صرف کر لے اس کو دنیا سے نہیں مٹا سکتی!

(خطبات حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۴۷-۴۸)

وحدتِ ملت کا پُر کیف نظارہ

ذرا آنکھیں بند کر کے اپنے دل میں اس نقشے کا تصور تو کیجیے کہ ادھر مشرق سے، اُدھر جنوب سے، اِدھر مغرب سے، اُدھر شمال سے اَن گنت قوموں اور بے شمار ملکوں کے لوگ ہزاروں راستوں سے ایک ہی مرکز کی طرف چلے آرہے ہیں۔ شکلیں اور صورتیں مختلف ہیں، رنگ مختلف ہیں، زبانیں مختلف ہیں، مگر مرکز کے قریب ایک خاص حد پر پہنچتے ہی سب اپنے اپنے قومی لباس اُتار دیتے ہیں، اور سارے کے سارے ایک ہی طرز کا سادہ یونی فارم پہن لیتے ہیں۔ احرام کا یہ یونی فارم پہننے کے بعد علانیہ یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ سلطانِ عالم اور بادشاہ زمین و آسمان کی یہ فوج، جو دنیا کی ہزاروں قوموں سے بھرتی ہو کر آرہی ہے، ایک ہی بادشاہ کی فوج ہے، ایک ہی اطاعت و بندگی کا نشان ان سب پر لگا ہوا ہے، ایک ہی وفاداری کے رشتے میں یہ سب بندھے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوئے ہیں، اور ایک ہی دار السلطنت کی طرف اپنے بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش ہونے کے لیے جا رہے ہیں۔ یونی فارم پہنے ہوئے سپاہی جب میقات سے آگے چلتے ہیں تو ان سب کی زبانوں سے وہی ایک نعرہ بلند ہوتا ہے: لَبَّیْکَ، اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ

بولنے کی زبانیں سب کی مختلف ہیں، مگر نعرہ سب کا ایک ہی ہے۔ پھر جوں جوں مرکز قریب آتا جاتا ہے، دائرہ سمٹ کر چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے۔ مختلف ملکوں کے قافلے ملتے چلے جاتے ہیں، اور سب کے سب مل کر نمازیں ایک ہی طرز پر پڑھتے ہیں۔ سب کا ایک یونی فارم، سب کا ایک امام، سب کی ایک ہی حرکت، سب کی ایک ہی زبان، سب ایک اللہ اکبر کے ہی اشارے پر اُٹھتے اور بیٹھتے اور رکوع اور سجدہ کرتے ہیں اور سب اسی ایک قرآنِ عربی کو پڑھتے اور سنتے ہیں۔ یوں زبانوں اور قومیتوں اور وطنوں اور نسلوں کا اختلاف ٹوٹتا ہے اور یوں خدا پرستوں کی ایک عالم گیر جماعت بنتی ہے۔ پھر جب یہ قافلے یک زبان ہو کر لبیک لبیک کے نعرے بلند کرتے ہوئے چلتے ہیں، جب ہر بلندی اور ہر پستی پر یہی نعرے لگتے ہیں، جب قافلوں کے ایک دوسرے سے ملنے کے وقت دونوں طرف سے یہی صدائیں اٹھتی ہیں۔ جب نمازوں کے وقت اور صبح کے تڑکے میں یہی آوازیں گونجتی ہیں تو ایک عجیب فضا پیدا ہو جاتی ہے جس کے نشے میں آدمی سرشار ہو کر اپنی خودی کو بھول جاتا ہے اور اس لبیک کی کیفیت میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر کعبے پہنچ کر تمام دنیا سے آئے ہوئے آدمیوں کا ایک لباس میں ایک مرکز کے گرد گھومنا، پھر سب کا ایک ساتھ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا، پھر سب کا منیٰ میں کیمپ لگانا، پھر سب کا عرفات کی طرف کوچ کرنا اور وہاں ایک امام سے خطبہ سننا، پھر سب کا مزدلفہ میں رات کو چھاؤنی ڈالنا، پھر سب کا ایک ساتھ منیٰ کی طرف پلٹنا، پھر سب کا متفق ہو کر جمرۂ عقبہ پر کنکریوں کی چاند ماری کرنا، پھر سب کا قربانیاں کرنا، پھر سب کا ایک ساتھ کعبے کی طرف پلٹ کر طواف کرنا، پھر سب کا ایک ہی مرکز کے گرداگرد نماز پڑھنا، یہ اپنے اندر وہ کیفیت رکھتا ہے جس کی نظیر دنیا میں ناپید ہے۔

ایک مقصد، ایک مرکز پر اجتماع

دنیا بھر کی قوموں سے نکلے ہوئے لوگوں کا ایک مرکز پر اجتماع، اور وہ بھی ایسی یک دلی و یک جہتی کے ساتھ، ایسی ہم خیالی و ہم آہنگی کے ساتھ، ایسے پاک جذبات، پاک مقاصد اور پاک اعمال کے ساتھ، حقیقت میں اتنی بڑی نعمت ہے جو آدم کی اولاد کو اسلام کے سوا کسی نے نہیں دی۔ دنیا کی قومیں ہمیشہ ایک دوسرے سے ملتی رہی ہیں، مگر کس طرح؟ میدانِ جنگ میں گلے کاٹنے کے لیے، یا صلح کانفرنسوں میں، ملکوں کی تقسیم اور قوموں کے بٹوارے کے لیے، یا مجلس اقوام متحدہ میں، تاکہ ہر قوم دوسری قوم کے خلاف دھوکے، فریب، سازش اور بے ایمانیوں کے جال پھیلائے اور دوسروں کے نقصان سے اپنا فائدہ کرنے کی کوشش کرے۔ تمام قوموں کے عام لوگوں کا صاف دلی کے ساتھ ملنا، نیک اخلاق اور پاک خیالات کے ساتھ ملنا، محبت اور خلوص کے ساتھ ملنا، قلبی و روحانی اتحاد کے ساتھ ملنا، خیالات، اعمال، اور مقاصد کی یک جہتی کے ساتھ ملنا، اور صرف ایک ہی دفعہ مل کر نہ رہ جانا، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہر سال ایک مرکز پر اسی طرح اکٹھے ہوتے رہنا، کیا یہ نعمت اسلام کے سوا بنی نوع انسان کو اور بھی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہیں ملتی ہے؟ دنیا میں امن قائم کرنے ،قوموں کی دشمنیوں کو مٹانے اور لڑائی جھگڑوں کے بجائے محبت، دوستی اور برادری کی فضا پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر نسخہ کس نے تجویز کیا ہے؟

دنیا میں واحد مرکزِ امن

اسلام صرف اتنا ہی نہیں کرتا۔ اس سے بڑھ کر یہاں اور بہت کچھ ہے۔

اس نے لازم کیا ہے کہ سال کے چار مہینے جو حج اور عمرے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، ان میں کوشش کی جائے کہ کعبے کی طرف آنے والے تمام راستوں میں امن قائم رہے۔ یہ دنیا میں امن قائم رکھنے کی سب سے بڑی دوامی تحریک ہے۔ اور اگر دنیا کی سیاست کی باگیں اسلام کے ہاتھ میں ہوں تو مسلمانوں کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ دنیا میں ایسی بدامنی برپا نہ ہونے پائے جس سے حج اور عمرے کا نظام معطل ہو جائے۔

اس نے دنیا کو ایک ایسا حرم دیا ہے جو قیامت تک کے لیے امن کا شہر ہے۔ جس میں آدمی تو کیا جانور تک کا شکار نہیں کیا جا سکتا، جس میں گھاس تک کاٹنے کی اجازت نہیں، جس کی زمین کا کانٹا تک نہیں توڑا جا سکتا، جس میں حکم ہے کہ کسی کی کوئی چیز گری پڑی ہو تو اسے ہاتھ تک نہ لگاؤ۔

اس نے دنیا کو ایک ایسا شہر دیا ہے جس میں ہتھیار لانے کی ممانعت ہے، جس میں غلے کو اور دوسری عام ضرورت کی چیزوں کو روک کر مہنگا کرنا 'الحاد' کی حد تک پہنچ جاتا ہے، جس میں ظلم کرنے والے کو اللہ نے دھمکی دی ہے کہ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ. ہم اُسے دردناک سزا دیں گے۔

حقیقی مساوات کا مرکز

اُس نے دنیا کو ایک ایسا مرکز دیا ہے جس کی تعریف یہ ہے: سَوَآءَنِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ۔ (الحج ۲۲:۲۵) یعنی وہاں اُن تمام انسانوں کے حقوق بالکل برابر ہیں جو خدا کی بادشاہی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی تسلیم کر کے اسلام کی برادری میں داخل ہو جائیں، خواہ کوئی شخص امریکہ کا رہنے والا ہو یا افریقہ کا، چین کا ہو یا ہندستان کا، اگر وہ مسلمان ہو جائے تو مکے کی زمین پر اس کے وہی حقوق ہیں جو خود مکہ والوں کے ہیں۔ پورے حرم کے علاقے کی حیثیت گویا مسجد کی سی حیثیت ہے کہ جو شخص مسجد میں جا کر کسی جگہ اپنا ڈیرہ جما دے وہ جگہ اسی کی ہے، کوئی اس کو وہاں سے اٹھا نہیں سکتا، نہ اس سے کرایہ مانگ سکتا ہے۔ مگر وہ اس جگہ خواہ تمام عمر بیٹھا رہا ہو اسے یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہ جگہ میری مِلک ہے، نہ وہ اس کو بیچ سکتا ہے، نہ اس کا کرایہ وصول کر سکتا ہے، حتیٰ کہ جب وہ شخص اُس جگہ سے اُٹھ جائے تو دوسرے کو بھی وہاں ڈیرہ جمانے کا ویسا ہی حق ہے جیسا اُس کو تھا۔ بالکل یہی حال پورے مکے کے حرم کا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مَكَّةُ مُنَاخٌ لِّمَنْ سَبَقَ۔ یعنی جو شخص اس شہر میں کسی جگہ آ کر پہلے اُتر جائے وہ جگہ اُسی کی ہے۔

وہاں کے مکانوں کا کرایہ لینا جائز نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں کے لوگوں کو حکم دے دیا تھا کہ اپنے مکانات کے گرد صحنوں پر دروازے نہ لگاؤ تا کہ جو چاہے تمھارے صحن میں آ کر ٹھہر سکے۔ بعض فقہا نے تو یہاں تک کہا ہے کہ شہر مکہ کے مکانات پر نہ کسی کی ملکیت ہے اور نہ وہ وراثت میں منتقل ہو سکتے ہیں۔

کیا اسلام کے سوا یہ نعمتیں انسان کو کہیں اور بھی مل سکتی ہیں؟

بھائیو! یہ ہے وہ حج جس کے متعلق فرمایا گیا تھا کہ اسے کر کے دیکھو، اس میں تمھارے لیے کتنے منافع ہیں۔ میری زبان میں اتنی قدرت نہیں کہ اس کے سارے منافع گنا سکوں، تاہم اس کے فائدوں کا یہ ذرا سا خاکہ جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے اسی سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۹۴-۲۹۸)

معاشی و تمدنی مرکز

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ۭ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (المائدہ ۵:۹۷) اللہ نے مکانِ محترم، کعبہ کو لوگوں کے لیے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اس کام میں معاون بنا دیا) تا کہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے۔ اور اُسے ہر چیز کا علم ہے۔

عرب میں کعبے کی حیثیت محض ایک مقدس عبادت گاہ ہی کی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج اور عمرے کے لیے سارا ملک اُس کی طرف کھنچ کر آتا تھا اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہوتا، مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے، شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی نصیب ہوتی، اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں کی بدولت عربوں کو سال کا پورا ایک تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا تھا۔ بس یہی زمانہ ایسا تھا جس میں ان کے قافلے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بہ سہولت آتے جاتے تھے۔ قربانی کے جانوروں اور قلادوں کی موجودگی سے بھی اس نقل و حرکت میں بڑی مدد ملتی تھی، کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردن میں پٹے پڑے ہوتے انھیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں اور کسی غارت گر قبیلے کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۵۰۵-۵۰۶، حاشیہ ۱۱۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مرکزیت کی نشانیاں

آج سے چار ہزار برس پہلے [خانہ کعبہ کی] یہ جگہ ایک سنسان وادی تھی۔ دنیا سے الگ تھلگ، اس ریگستان میں، ان پہاڑوں کے درمیان، اس وادی میں اللہ کا ایک بندہ آتا ہے اور اس کی چار دیواری کھینچ کر اعلان کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، اور دنیا بھر کو پکار دیتا ہے کہ آؤ اس کا حج کرو۔ اب دیکھیے آخر کیا بات ہے کہ چار ہزار برس سے دنیا بھر کے انسان اس پکار پر لبیک لبیک کہتے ہوئے اس گھر کی طرف کھچے چلے آرہے ہیں اور آج تک تاریخ میں ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا ہے کہ اس کا حج اور اس کے گرد طواف نہ ہوا ہو۔ کوئی دوسرا انسان ذرا ہمت کر کے کوئی جگہ بنا کر دیکھے اور اس کو قبلۂ عالم بنانے کے لیے اپنی سی پوری کوشش کر کے دیکھ لے۔ اسے خود معلوم ہو جائے گا کہ کتنے انسان اس کی طرف کھچ کر آتے ہیں۔ یہ صریح علامت ہے اس بات کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ انھوں نے فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی اور اس کے حکم سے یہ گھر بنایا تھا، ان کے بنائے ہوئے اس گھر کو واقعی اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت عطا فرمایا تھا اور یہ بھی اللہ ہی کا علم تھا جس کے تحت انھوں نے دنیا کو حج کی دعوت عام دی تھی۔ اسی وجہ سے اس گھر کو اور اس دعوت عام کو یہ کشش نصیب ہوئی کہ صدہا برس سے دنیا بھر کے انسان اس طرف کھچے چلے آرہے ہیں۔ قرآن مجید اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ وہ اللہ ہی تھا جس نے اس گھر کی تعمیر کے لیے اس جگہ کو منتخب فرمایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اس کا حج کرنے کے لیے دنیا بھر کو پکار دیں۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْقَاۗىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰي كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ○ (الحج ۲۲:۲۶-۲۷) اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر کی جگہ تجویز کی تھی اس ہدایت کے ساتھ کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو، اور لوگوں کو حج کے لیے اذن عام دے دو کہ وہ تمھارے پاس آئیں ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار۔

.... یہ اسی فرمان خداوندی کی برکت ہے کہ آج لاکھوں آدمی **لبیک اللّٰھم لبیک** کی صدائیں بلند کرتے ہوئے فوج در فوج یہاں آرہے ہیں اور پروانوں کی طرح اس خانہ کعبہ کے گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ ان آیات بینات میں سے اولین اور نمایاں ترین نشانی ہے جو اس گھر میں آپ دیکھ رہے ہیں۔

امن وامان

اب ذرا ایک اور نشانی ملاحظہ فرمایئے۔ اس گھر کی تعمیر جب ہوئی تھی اسی وقت اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما دیا تھا کہ ہم اسے لوگوں کا مرکز و مرجع ہی نہیں بلکہ امن کا گھر بھی بنا دیں گے۔ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ (البقرۃ ۲:۱۲۵) اس اعلان پر چار ہزار برس گزر چکے ہیں اور اس وقت سے آج تک یہ امن ہی کا گھر بنا ہوا ہے۔ نہ صرف یہ خود امن کا گھر ہے بلکہ جس شہر میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

واقع ہے وہ بھی امن کا شہر ہے اور اس کے گرد و پیش کئی کئی میل تک کا پورا رقبہ ایک ایسا حرم ہے جس کے اندر کسی نوعیت کی بدامنی نہیں ہو سکتی۔ آج روئے زمین پر اس حرم پاک کے سوا کوئی دوسرا گز بھر کا خطہ بھی ایسا نہیں پایا جاتا جسے اس معنیٰ میں حرم ہونے کا شرف حاصل ہو، اور آج ہی نہیں کبھی دنیا میں کوئی دوسرا ایسا حرم نہیں پایا گیا ہے جس کا وہ احترام کیا گیا ہو جو اس حرم کا ہوا ہے۔ اس کی حرمت کا اندازہ آپ اس بات سے کیجیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک ڈھائی ہزار برس کا زمانہ عرب کی سرزمین میں ایسا گزرا ہے جس میں یہ ملک نظم و آئین سے محروم تھا۔ یہاں کوئی حکومت نہ تھی، کوئی قانون نہ تھا۔ ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ قتل و خون اور غارت گری کا زور تھا۔ کسی کے لیے جان، مال اور عزت و آبرو کی امان نہ تھی۔ لیکن اس پورے ملک میں صرف یہ حرم پاک ہی ایک ایسا خطہ تھا جہاں ان ۲۵ صدیوں کے دوران میں کامل امن قائم رہا۔ عرب کے وہ لوگ جو شوقیہ خوں ریزی اور لوٹ مار کرتے تھے، جن کے قبائل میں سو سو برس تک مسلسل لڑائیاں ٹھنی رہتی تھیں اور پشت در پشت انتقام کا چکر چلتا رہتا تھا، ان کا بھی یہ حال تھا کہ اس حرم کے حدود میں پہنچتے ہی ان کے ہاتھ رک جاتے تھے، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو بھی یہاں پالیتا تھا تو اس سے انتقام نہ لے سکتا تھا۔ یہ اس کے سوا اور کس چیز کا نتیجہ مانا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس خطہ پاک کو حرم اور امن کا گھر بنا دیا تھا۔ یہ اللہ جل شانہ کے فرمان ہی کی برکت تھی کہ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا ؕ جو اس میں داخل ہوا وہ امن میں آ گیا (آل عمران ۳:۹۷) اللہ کی قدرت کے سوا دنیا میں کوئی طاقت اس انتہائی بدنظمی اور طوائف الملوکی کے زمانے میں ڈھائی ہزار برس تک یہاں امن قائم نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسی نشانی کی طرف اللہ تعالیٰ قریش کو توجہ دلاتا ہے کہ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ (عنکبوت ۲۹:۶۷) کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پرامن حرم بنا رکھا ہے حالاں کہ ان کے گرد و پیش لوگ اچکے جا رہے ہیں۔

جزیرۂ عرب کی لسانی وحدت

اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ایک اور نشانی ہے جو اس زمین میں پائی جاتی ہے۔ آپ ذرا وسیع نگاہ سے عرب کی تاریخ اور عرب کے ملک پر ایک نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عربی قوم کا ایک قوم کی حیثیت سے باقی رہنا اور عربی زبان کا اس قوم کی زبان کی حیثیت سے زندہ رہ جانا بھی اسی بیت اللہ کی برکت کا نتیجہ ہے۔ دنیا میں آج کوئی ملک ایسا نہیں پایا جاتا، نہ کبھی پایا گیا ہے جس کا رقبہ تو اتنا وسیع ہو جتنا عرب کا ہے اور پھر اس پورے ملک میں ایک ہی زبان بولی جاتی ہو۔ اور دنیا میں کوئی ایسا ملک بھی نہ آج موجود ہے نہ کبھی موجود رہا ہے، جس میں چار ہزار برس سے ایک ہی زبان بولی جا رہی ہو۔ اتنی لمبی مدت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ اور اتنے وسیع و عریض ملکوں میں ایک نہیں، بیسیوں بلکہ سیکڑوں زبانیں بن جاتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ جس ملک میں ہزاروں برس تک بدامنی اور بدنظمی رہی ہو، اور جو ملک صدیوں قبائلی لڑائیوں کی آماج گاہ بنا رہا ہو، اس کے اندر تو یہ وحدت باقی رہ جانا بالکل ہی ایک عجوبہ ہے۔ لیکن یہ معجزہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اس سرزمین میں کر کے دکھا دیا، اور اس کا ذریعہ بھی خانہ کعبہ اور یہی حج تھا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ خانہ کعبہ اور یہ حج اس کا ذریعہ کیسے بنا؟ اس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو مرکز و مرجع (مَثَابَةً لِّلنَّاسِ) بنایا اور حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں کو اس کا حج کرنے کی دعوت عام دے دیں، تو اس کے ساتھ یہ فیصلہ فرما دیا کہ سال میں چار مہینے ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم حج کے لیے اور رجب عمرے کے لیے حرام قرار دیے جائیں، حکم دے دیا گیا کہ ان چار مہینوں میں لڑائی بند رہے، حج اور عمرے کے لیے آنے جانے والوں کو کوئی نہ چھیڑے، اور ان جانوروں پر بھی کوئی ہاتھ نہ ڈالے جو قربانی کے لیے بیت اللہ کی طرف لائے جا رہے ہوں۔ یہ حکم صرف ایک بندہ خدا کی زبان سے ادا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی حکومت نہ تھی۔ اس کے پاس کوئی فوج، پولیس یا عدالت نہ تھی کہ اس کے زور سے وہ اس قانون کو جاری کرتا۔ مگر اس کی پشت پر اللہ رب العالمین کی طاقت تھی جس کے زور سے یہ حکم نافذ ہوا اور عرب کے باشندے نسلاً بعد نسلٍ اس کی پیروی کرتے چلے گئے۔

اس حکم کی برکت یہ تھی کہ عرب کی سرزمین کو ہر سال چار مہینے امن وامان کے میسر آجاتے تھے جن سے فائدہ اٹھا کر ملک کے ہر گوشے سے قافلے بیت اللہ کی طرف آتے تھے۔ قبائل کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے، آزادانہ تجارت ہوتی تھی، میلے لگتے تھے، شاعری اور خطابت کے مقابلے ہوتے تھے۔ اور عرب کے دوسرے حصوں میں بھی قافلوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ اس طرح عربوں میں ایک قوم ہونے کا احساس زندہ رہا۔ ان کی زبان محفوظ رہی اور وہ تمام عربوں کی ایک ہی زبان بنی رہی۔ ان کی ثقافت اور ان کی روایات باقی رہیں اور یہ قوم کٹ کٹ کر مر جانے سے بچ گئی۔ یہ سب کچھ اسی گھر کا صدقہ اور اسی گھر والے خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ اسی کی بدولت ایک قوم مرنے سے بچی، ایک زبان مٹنے سے بچی اور ایک ملک کے اندر ایک ہی زبان اور ایک ہی تہذیب برقرار رہی۔ یہ گھر نہ ہوتا تو ہزاروں برس کی بدامنی و بدنظمی اور طوائف الملوکی سے عرب قوم اور عربی ثقافت کبھی کی مٹ چکی ہوتی۔

بے آب و گیاہ صحرا میں عظیم شہر کی آبادی

ایک اور نشانی ملاحظہ ہو: جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اپنی ایک بیوی اور بچے کو لا کر چھوڑا تھا اس وقت یہاں کوئی شہر تو درکنار برائے نام کوئی چھوٹا گاؤں تک نہ تھا۔ اس حالت میں ان کی زبان پاک سے یہ دعا نکلتی ہے کہ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ (ابراہیم ۱۴: ۳۷) اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی نسل کا ایک حصہ لا کر بے آب و گیاہ وادی میں بسا دیا ہے۔ تیرے حرمت والے گھر کے پاس، اے پروردگار! اس لیے کہ وہ نماز قائم کریں۔ پس لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کردے اور ان کو پھلوں سے رزق دے تاکہ یہ شکر گزار ہوں۔

اب دیکھیے کہ اس دعا کا ایک ایک لفظ کس طرح پورا کیا گیا۔ اس بیت اللہ کے گرد یہ شہر مکہ آباد ہوا۔ حج نے اس کو تمام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عرب کا مرکز بنا دیا۔ تجارتی قافلے عرب کے ہر حصے سے یہاں آنے لگے اور یہاں سے گزرنے لگے۔ اسلام سے صدیوں پہلے یہ شہر ایک تجارتی منڈی بن چکا تھا اور دنیا بھر کا مال کھچ کھچ کر یہاں آتا تھا۔ آج بھی آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو مکے کے بازاروں میں آپ کو نہ مل جاتی ہو۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں بیان فرماتا ہے کہ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا۔ (القصص ۲۸: ۵۷) کیا ہم نے اہل مکہ کے لیے ایک پر امن حرم نہیں بنا دیا ہے جس کی طرف ہر طرح کے پھل کھچے چلے آتے ہیں۔ ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟

..........عرب اور عربی قوم اور عربی زبان پر یہ ساری عنایات جس مقصد کے لیے فرمائی گئی تھیں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایک دعا کو پورا کرنا تھا جسے قرآن مجید ان الفاظ میں نقل کرتا ہے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (البقرۃ ۲: ۱۲۷-۱۲۹) اور جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو وہ یہ دعا کر رہے تھے "اے اللہ ہمارے رب، ہماری اس سعی کو قبول فرما لے، یقیناً تو سب ہی کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! اور ہم دونوں کو اپنا مسلم (فرماں بردار) بنالے اور ہماری نسل سے ایک ایسی امت پیدا کر جو تیری مسلم ہو اور ہم کو اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہمارے قصور معاف کر، بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔ اے ہمارے رب! اور ان لوگوں کے اندر خود انھی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، یقیناً تو ہی زبردست حکیم ہے۔

یہ تھا وہ اصل مقصد جس کے لیے عرب قوم اور عربی زبان کو زندہ رکھنے کا وہ اہتمام فرمایا گیا تھا جس کی تفصیل ابھی آپ نے سنی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی یہ دعا، اور اس کے نتیجے میں آخر کار اسی شہر مکہ سے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث ہونا اور پھر یہیں سے ایک عظیم الشان امت مسلمہ کا اٹھنا جو دنیا میں قیامت تک کے لیے توحید کی علم بردار بنی، یہ اللہ جل شانہ کی نشانیوں میں سے سب سے بڑی نشانی ہے جس کا مشاہدہ آپ اس حرم پاک میں کر رہے ہیں۔

یہی شہر مکہ ہے جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت الی اللہ کا آغاز فرمایا تھا اور یہی صفا کی پہاڑی ہے جس پر کھڑے ہو کر حضور نے سب سے پہلے قریش کے خاندانوں کو نام بہ نام پکار کر اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لانے کی تلقین فرمائی تھی۔ اس شہر کے سرداروں نے حضورؐ کی اس دعوت کو دبا دینے کے لیے اپنا سارا زور صرف کر دیا۔ یہ حرم کی زمین، یہ ابوقبیس کا پہاڑ، اور یہ مکہ کی گھاٹیاں، سب اس ظلم وستم کے گواہ ہیں جو ۱۳ سال تک حضورؐ اور آپؐ کے اصحاب پر توڑا گیا۔ مگر آخر کار ان سب لوگوں نے نیچا دیکھا جنھوں نے دعوت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ دیکھ لیجیے، آج یہاں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابوجہل اور ابولہب کا نام لینے والا کوئی نہیں ہے اور اس کے میناروں سے پانچوں وقت اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی آواز بلند ہو رہی ہے۔

یہی خانہ کعبہ ہے جس کی دیوار کے نیچے ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور حال یہ تھا کہ مکے میں ہر طرف مسلمانوں پر بے تحاشا ظلم ہو رہا تھا۔ اس حالت میں خبابؓ بن الارت نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ، اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، کیا آپؐ ہمارے لیے دعا نہ فرمائیں گے؟ اس پر حضورؐ نے فرمایا: یہ کام تو پورا ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب ایک مسافر صنعا سے حضرموت تک بے خوف وخطر سفر کرے گا۔ مگر تم لوگ بے صبری کر رہے ہو۔ اللہ کے رسولؐ کی یہ بات حرف بہ حرف پوری ہوئی اور چند سال کے اندر ہی وہ وقت آ گیا جب اسلام کی حکومت نے پورے جزیرۃ العرب میں مکمل امن قائم کر دیا۔

یہی خانہ کعبہ ہے جس کے کلید بردار عثمانؓ بن طلحہ سے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنجی مانگی تاکہ بیت اللہ میں داخل ہو کر عبادت کریں۔ اس نے نہ صرف یہ کہ انکار کیا بلکہ حضورؐ کے ساتھ سخت بدکلامی کی۔ آپؐ خاموشی کے ساتھ اس کی ساری سخت سست باتیں سنتے رہے اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ فرمایا: اے عثمان! تم دیکھو گے کہ ایک روز یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہو گی اور مجھے اختیار ہو گا کہ جسے چاہوں اسے دوں۔ عثمان نے کہا: اگر ایسا ہوا تو وہ دن قریش کے لیے ہلاکت اور ذلت کا دن ہو گا۔ حضورؐ نے فرمایا: نہیں، وہ دن قریش کے لیے عزت اور سرفرازی کا دن ہو گا۔

یہ قول بھی پتھر کی لکیر ثابت ہوا۔ اس بات کو دس سال سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ مکہ معظمہ فتح ہوا۔ اسی عثمانؓ بن طلحہ کو حضور نے حکم دیا کہ کلید خانہ کعبہ پیش کرے۔ اس نے بے چون وچرا حاضر کر دی۔ حضرت عباسؓ نے بہ اصرار درخواست کی کہ اب کلید برداریِ کعبہ کی خدمت بنی ہاشم کے سپرد کر دی جائے۔ لیکن حضورؐ نے وہ کنجی اسی عثمانؓ بن طلحہ کو عطا کی اور فرمایا: خُذُوْهَا خَالِدَةً تَالِدَةً لَا یَنْزِعُهَا مِنْكُمْ اِلَّا ظَالِمٌ لے لو اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تم سے اس کو کوئی نہ چھینے گا مگر ظالم۔

یہ ارشاد بھی پورا ہو کر رہا۔ آج تک اس گھر کا کلید بردار وہی خاندان چلا آ رہا ہے جسے فتح مکہ کے روز حضورؐ نے اس کی کنجی سپرد فرمائی تھی۔

یہی شہر مکہ ہے جس کے لوگوں سے حضورؐ نے اپنی دعوت کے ابتدائی زمانے میں فرمایا تھا کہ میں ایک ایسا کلمہ تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں جسے اگر تم مان لو گے تو عرب اور عجم سب اس کی بدولت تمھارے تابع فرمان ہو جائیں گے: كَلِمَةٌ وَّاحِدَةٌ تُعْطُوْنِیْهَا تَمْلِكُوْنَ بِهَا الْعَرَبَ وَتَدِیْنُ لَكُمْ بِهَا الْعَجَمُ۔ قریش کے لوگوں نے اس وقت اس کو جھوٹ سمجھا تھا۔ وہ اس کے برعکس اپنی جگہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس کلمے کو ہم نے قبول کر لیا تو تمام عرب ہم پر ٹوٹ پڑے گا اور ہماری ریاست تو کیا، ہمارا وجود بھی یہاں باقی نہ رہ سکے گا۔ وہ کہتے تھے کہ: اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ (القصص ۲۸:۵۷) اگر ہم تمھارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو ہم اپنی جگہ سے اچک لیے جائیں گے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیکن اللہ کے رسول کی زبان مبارک سے جو کچھ نکلا تھا وہ لفظ بہ لفظ پورا ہو کر رہا۔قریش کے جن لوگوں نے حضور کی بات اپنے کانوں سے سنی تھی انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ چند سال کے اندر عرب اور عجم سب خلافت اسلامیہ کے تابع فرمان ہو گئے اور قریش ہی کے خلفا اس عظیم الشان سلطنت کے فرماں روا ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک یہ گھر صرف عرب کا مرکز تھا اور عرب ہی اس کے حج کے لیے آتے تھے۔مگر جب اللہ تعالیٰ نے آنحضور کی زبان مبارک سے یہ اعلان کرایا کہ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (البقرۃ ۲:۱۴۴) جہاں بھی تم ہو، نماز میں تم اپنا رخ اسی کی طرف پھیرو۔اور جب مالک زمین و آسمان نے اپنے آخری نبی کے ذریعے سے یہ فرمان صادر کیا کہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا (آل عمران ۳:۹۷) اللہ کا حق ہے لوگوں پر اس گھر کا حج، جو شخص بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔تو یہ گھر تمام دنیا کے لیے مرکز و قبلہ بن گیا۔آج دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں اس گھر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے والے موجود نہ ہوں، اور کوئی خطہ زمین ایسا نہیں ہے جہاں سے اللہ وحدہ لاشریک کے ماننے والے اس کا حج کرنے کے لیے نہ آ رہے ہوں۔جس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان احکام کا اعلان ہوا تھا اس وقت اسلام کا نفوذ و اثر صرف مدینہ طیبہ اور اس کے گرد و پیش ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود تھا۔کوئی شخص بھی اس وقت یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ احکام تمام روئے زمین پر اور اتنے بڑے پیمانے پر نافذ ہوں گے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب دس لاکھ آدمی دنیا کے ہر حصے سے کھچ کر یہاں جمع ہوں گے۔ خداوند عالم کی طاقت کے سوا اور کون سی طاقت ایسی ہو سکتی تھی جو اس خانہ کعبہ کو یہ مقبولیت، یہ مرکزیت اور یہ کشش عطا کر دیتی۔

(خطبات حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۷-۱۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

بعض مخصوص احکام

مشرکین کا داخلہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ (التوبہ ۹:۲۸) اے ایمان لانے والو! مشرکین ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔ اور اگر تمھیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمھیں اپنے فضل سے غنی کر دے، اللہ علیم و حکیم ہے۔

آئندہ کے لیے ان کا حج اور ان کی زیارت ہی بند نہیں بلکہ مسجد حرام کے حدود میں ان کا داخلہ بھی بند ہے تاکہ شرک و جاہلیت کے اعادے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ 'ناپاک' ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ بذاتِ خود ناپاک ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعتقادات، ان کے اخلاق، ان کے اعمال اور ان کے جاہلانہ طریقِ زندگی ناپاک ہیں اور اسی نجاست کی بنا پر حدودِ حرم میں ان کا داخلہ بند کیا گیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ حج اور عمرہ اور مراسمِ جاہلیت ادا کرنے کے لیے حدودِ حرم میں نہیں جاسکتے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اس حکم کا منشا یہ ہے کہ وہ مسجد حرام میں جا ہی نہیں سکتے۔ اور امام مالکؒ یہ رائے رکھتے ہیں کہ صرف مسجدِ حرام ہی نہیں بلکہ کسی مسجد میں بھی ان کا داخل ہونا درست نہیں۔ لیکن یہ آخری رائے درست نہیں ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مسجدِ نبوی میں ان لوگوں کو آنے کی اجازت دی تھی۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص۱۸۶-۱۸۷، التوبہ، حاشیہ ۲۵)

پاک رکھنے کا مطلب

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـــًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْقَاۗىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○ (الحج ۲۲:۲۶) یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

سورۂ بقرہ آیت ۱۲۵ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

الْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ۔ اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو تاکید کی تھی کہ میرے گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

پاک رکھنے سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اُسے پاک رکھا جائے۔ خدا کے گھر کی اصلی پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو۔ جس نے خانۂ خدا میں خدا کے سوا کسی دوسرے کو مالک، معبود، حاجت روا اور فریاد رس کی حیثیت سے پکارا، اس نے حقیقت میں اُسے گندا کر دیا۔ یہ آیت ایک نہایت لطیف طریقے سے مشرکینِ قریش کے جرم کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ ظالم لوگ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے وارث ہونے پر فخر تو کرتے ہیں، مگر وراثت کا حق ادا کرنے کے بجائے الٹا اس حق کو پامال کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو وعدہ ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا، اس سے جس طرح بنی اسرائیل مستثنیٰ ہو گئے ہیں، اسی طرح یہ مشرک بنی اسماعیل بھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۱۱، البقرۃ، حاشیہ ۱۲۶)

ان احکام کی خلاف ورزی پر سزا

مَنْ یُّرِدْ فِیْہِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْہُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ (الحج ۲۲:۲۵) اس (مسجد حرام) میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا اسے ہم دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے۔

اس سے ہر وہ فعل مراد ہے جو راستی سے ہٹا ہوا ہو اور ظلم کی تعریف میں آتا ہو، نہ کہ کوئی خاص فعل۔ اس طرح کے افعال اگرچہ ہر حال میں گناہ ہیں، مگر حرم میں ان کا ارتکاب زیادہ شدید گناہ ہے۔ مفسرین نے بلاضرورت قسم کھانے تک کو الحاد فی الحرم میں شمار کیا ہے اور اس آیت کا مصداق ٹھیرایا ہے۔ ان عام گناہوں کے علاوہ حرم کی حرمت کے متعلق جو خاص احکام ہیں ان کی خلاف ورزی بدرجۂ اولیٰ اس تعریف میں آتی ہے۔ مثلاً حرم کے باہر جس شخص نے کسی کو قتل کیا ہو، یا کوئی اور ایسا جرم کیا ہو جس پر حد لازم آتی ہو، اور پھر وہ حرم میں پناہ لے لے، تو جب تک وہ وہاں رہے اس پر ہاتھ نہ ڈالا جائے گا۔ حرم کی یہ حیثیت حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آتی ہے، اور فتح مکہ کے روز صرف ایک ساعت کے لیے اٹھائی گئی، پھر ہمیشہ کے لیے قائم ہو گئی۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا (آلِ عمران ۳:۹۷) جو اس میں داخل ہو گیا وہ امن میں آ گیا۔

حضرت عمرؓ، عبداللہؓ بن عمر اور عبداللہؓ بن عباسؓ کے یہ اقوال معتبر روایات میں آئے ہیں کہ اگر ہم اپنے باپ کے قاتل کو بھی وہاں پائیں تو اسے ہاتھ نہ لگائیں۔ اسی لیے جمہور تابعین اور حنفیہ اور حنابلہ اور اہل حدیث اس کے قائل ہیں کہ حرم کے باہر کیے ہوئے جرم کا قصاص حرم میں نہیں لیا جا سکتا۔

وہاں جنگ اور خوں ریزی حرام ہے۔ فتح مکہ کے دوسرے روز جو خطبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا اس میں آپؐ نے اعلان فرما دیا تھا: لوگو! اللہ نے مکے کو ابتدائے آفرینش سے حرام کیا ہے اور یہ قیامت تک کے لیے اللہ کی حرمت سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حرام ہے۔ کسی شخص کے لیے، جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو، حلال نہیں ہے کہ یہاں کوئی خون بہائے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: اگر میری اس جنگ کو دلیل بنا کر کوئی شخص اپنے لیے یہاں خوں ریزی کو جائز ٹھہرائے تو اس سے کہو کہ اللہ نے اپنے رسول کے لیے اس کو جائز کیا تھا نہ کہ تمھارے لیے۔ اور میرے لیے بھی یہ صرف ایک دن کی ایک ساعت کے لیے حلال کیا گیا، پھر آج اُس کی حرمت اُسی طرح قائم ہو گئی جیسی کل تھی۔

وہاں کے قدرتی درختوں کو نہیں کاٹا جا سکتا، نہ خودرو گھاس اُکھاڑی جا سکتی ہے، نہ پرندوں اور دوسرے جانوروں کا شکار کیا جا سکتا ہے اور نہ شکار کی غرض سے وہاں کے جانور کو بھگایا جا سکتا ہے تاکہ حرم کے باہر اس کا شکار کیا جائے۔ اس سے صرف سانپ بچھو اور دوسرے موذی جانور مستثنیٰ ہیں۔ اور خودرُو گھاس سے اِذْخِر اور خشک گھاس مستثنیٰ کی گئی ہے۔ ان امور کے متعلق صحیح احادیث میں صاف صاف احکام وارد ہوئے ہیں۔

وہاں کی گری پڑی چیز اٹھانا ممنوع ہے، جیسا کہ ابوداؤد میں آیا ہے اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنْ لُقَطَۃِ الْحَاجِّ، یعنی آپؐ نے حاجیوں کی گری پڑی چیز اُٹھانے سے منع فرما دیا تھا۔

وہاں جو شخص بھی حج یا عمرے کی نیت سے آئے وہ احرام کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ دوسری کسی غرض سے داخل ہونے والے کے لیے بھی احرام باندھ کر جانا ضروری ہے یا نہیں۔ ابن عباسؓ کا مذہب یہ ہے کہ کسی حال میں بلا احرام داخل نہیں ہو سکتے۔ امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کا بھی ایک ایک قول اسی کا مؤید ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ صرف وہ لوگ احرام کی قید سے مستثنیٰ ہیں جن کو بار بار اپنے کام کے لیے وہاں جانا آنا پڑتا ہو۔ باقی سب کو احرام بند جانا چاہیے۔ یہ امام احمدؒ اور شافعیؒ کا دوسرا قول ہے۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ جو شخص میقاتوں کے حدود میں رہتا ہو وہ مکے میں بلا احرام داخل ہو سکتا ہے، مگر جو حدود میقات سے باہر کا رہنے والا ہو وہ بلا احرام نہیں جا سکتا۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۱۷-۲۱۸، الحج، حاشیہ ۴۴)

غلاف کعبہ کی شرعی حیثیت

قرآن مجید سے ثابت ہے کہ خانۂ کعبہ وہ عمارت ہے جو اَب سے چار ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مل کر تعمیر کی تھی اور یہ بات بھی قرآن مجید میں بصراحت ارشاد ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنا گھر قرار دیا اور ہمیشہ کے لیے قبلۂ اہلِ توحید بنا دیا۔ یہ امور تو ہر شک وشبہے سے بالاتر ہیں، اس لیے ان پر کسی بحث وگفتگو کی حاجت نہیں۔ البتہ یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ اس پر غلاف چڑھانے کی شرعی حیثیت کیا ہے اور اس میں کیا حکمت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ کوئی بدعت ہے جو بعد کے کسی زمانے میں شروع ہوئی ہے۔ یہ خیالات بھی بعض لوگوں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں کہ اس عمارت پر غلاف چڑھانا بے جا اسراف ہے، کیوں نہ اتنا روپیہ غریب انسانوں کی تن پوشی پر صرف کیا جائے؟ یہ شبہات بھی بعض حلقوں کی طرف سے ظاہر کیے گئے ہیں کہ اس غلاف کے احترام اور اس کی روانگی کے اہتمام اور اس کی مشایعت[1] اور زیارت میں شرک کا شائبہ ہے۔ یہ غلط فہمیاں چونکہ واقفیت کی کمی کے باعث لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لیے ہم سب سے پہلے ان کو رفع کریں گے۔

کسی فعل کے متعلق جب معتبر و مستند ذرائع سے ثابت ہو جائے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا ہے، یا وہ آپؐ کے سامنے ہوا ہے اور آپؐ نے اس سے منع نہیں فرمایا ہے تو اس کے بارے میں یہ گمان کرنے کوئی گنجایش نہیں رہتی کہ وہ بدعت ہے۔ کعبے کے متعلق یہ بات احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ فتح مکہ سے پہلے، جب کہ یہ گھر کفار کی تولیت میں تھا، اس پر غلاف چڑھا ہوا تھا۔ اور فتح کے بعد جب وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تولیت میں آیا تو نہ صرف یہ کہ آپؐ نے اسے باقی رکھا بلکہ غلاف چڑھانے کے طریقے پر خود عمل کیا، اور غلاف چڑھانے کے اس فعل کا ذکر تعظیم و تکریم کے ساتھ فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ کَانُوْا یَصُوْمُوْنَ عَاشُوْرَاءَ قَبْلَ اَنْ یُفْرَضَ رَمَضَانُ وَکَانَ یَوْمًا تُسْتَرُ فِیْهِ الْکَعْبَةُ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے مسلمان یوم عاشوراء (۱۰ محرم) کا روزہ رکھا کرتے تھے اور یہ وہ دن تھا جب خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ (بخاری، کتاب الحج)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہجرت سے پہلے کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اِنِّیْ لَمُسْتَتِرٌ بِاَسْتَارِ الْکَعْبَةِ اِذْجَاءَ ثَلٰثَةُ نَفَرٍ، ثَقَفِیٌّ وَّ خَتَنَاهُ قُرَشِیَّانِ، کَثِیْرٌ شَحْمُ بُطُوْنِهِمْ قَلِیْلٌ فِقْهُ قُلُوْبِهِمْ، فَتَحَدَّثُوْا بَیْنَهُمْ حَدِیْثًا، فَقَالَ اَحَدُهُمْ تَرٰی اَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ یَسْمَعُ مَا قُلْنَا؟ قَالَ الْاٰخَرُ اَرَاهُ یَسْمَعُ اِذَا رَفَعْنَا وَ لَا یَسْمَعُ اِذَاخَفَضْنَا. قَالَ الْاٰخَرُ: اِنْ کَانَ یَسْمَعُ شَیْئًا مِنْهُ اَنَّهٗ یَسْمَعُهٗ کُلَّهٗ. (مسند احمد، مرویات ابن مسعودؓ) میں خانہ کعبہ کے پردوں میں چھپا ہوا تھا کہ تین آدمی آئے۔ ایک قبیلہ ثقیف کا تھا اور دو اس کے قریشی داماد تھے۔ تینوں بڑے موٹے تازے تھے مگر عقل و فہم سے عاری۔ انھوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں پھر ایک نے کہا: تمھارا کیا خیال ہے یہ باتیں جو ہم نے کی ہیں کیا اللہ تعالیٰ نے ان کو سن لیا ہے؟ دوسرے نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ جب ہم زور سے بات کرتے ہیں تو اللہ اس کو سن لیتا ہے اور جب آہستہ بولتے ہیں تو وہ اسے نہیں سنتا تیسرے نے کہا: اگر وہ کچھ سنتا ہے تو پھر ساری باتیں سنتا ہے۔

یہ دونوں روایات ظاہر کرتی ہیں کہ فتح مکہ سے پہلے اہل عرب خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد حضرت انسؓ بن مالک کی حسب ذیل روایت ثابت کرتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح کر لیا تو آپؐ نے زمانہ جاہلیت کے اس طریقے کو برقرار رکھا حالانکہ جاہلیت کی جتنی یادگاریں اسلام کے خلاف تھیں ان کو آپؐ نے بلا تاخیر مٹا دیا تھا۔

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ مَکَّةَ وَ عَلٰی رَاْسِهِ الْمِغْفَرُ فَلَمَّا نَزَعَهٗ جَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ اِبْنُ خَطَلٍ

۱۔ مہمان کو رخصت کرنے کے لیے اس کے ساتھ چند قدم چلنے کو مشایعت کہتے ہیں۔ (مرتب)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مُتَعَلِّقٌ بِاَسْتَارِ الْكَعْبَةِ فَقَالَ اُقْتُلْهُ۔ (بخاری کتاب المغازی - ابو داؤد، کتاب الجہاد، نسائی، کتاب الحج)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے اور آپ سر پر خود پہنے ہوئے تھے۔ جب آپؐ نے خود اتارا تو ایک شخص نے آ کر عرض کیا کہ ابن خطل کعبے کے پردوں سے لپٹا کھڑا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: اسے قتل کر دو۔

اس روایت کی تائید حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی یہ روایت کرتی ہے جو اُن کے صاحب زادے حضرت مصعب بن سعدؓ نے نقل کی ہے:

لَمَّا كَانَ يَوْمُ فَتْحِ مَكَّةَ اَمَّنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ اِلَّا اَرْبَعَةَ نَفَرٍ وَّا مْرَأَتَيْنِ وَ قَالَ: اُقْتُلُوْهُمْ وَ اِنْ وَجَدْتُمُوْهُمْ مُتَعَلِّقِيْنَ بِاَسْتَارِ الْكَعْبَةِ۔ (نسائی، کتاب تحریم الدم) جب فتح مکہ کا دن آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کو امان دی مگر چار مردوں اور دو عورتوں کے متعلق فرمایا کہ ان کو قتل کر دو خواہ وہ کعبے کے پردوں ہی سے چمٹے ہوئے ہوں۔

ان روایتوں کے باوجود یہ شبہہ باقی رہ جاتا ہے کہ شاید عین فتح کے موقع پر حضورؐ نے غلاف نہ اتروایا ہو اور بعد میں اس کو اُتروا دیا ہو۔ لیکن ایک دوسری روایت اسی شبہے کو رفع کر دیتی ہے۔ اس میں عروہ بن زبیرؓ فتح مکہ کا قصہ بیان کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں کہ اس روز حضرت سعد بن عبادہؓ نے ابوسفیان کو مخاطب کر کے کہا: اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَلْحَمَةِ اَلْيَوْمَ تُسْتَحَلُّ الْكَعْبَةُ (آج قتل و خون کا دن ہے، آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا)۔ اس بات کی شکایت ابوسفیان نے جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: كَذَبَ سَعْدٌ وَلٰكِنَّ هٰذَا يَوْمٌ يُعَظِّمُ اللّٰهُ فِيْهِ الْكَعْبَةَ، وَ يَوْمَ تُكْسٰى فِيْهِ الْكَعْبَةُ۔ (بخاری کتاب المغازی، غزوۃ الفتح) سعد نے غلط کہا۔ بلکہ آج تو وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ کعبے کی عظمت قائم فرمائے گا اور وہ دن ہے جب کعبے پر غلاف چڑھایا جائے گا۔

آخری فقرے کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ اس ارشاد سے حضورؐ کا مطلب یہ تھا کہ اب ہم کعبے پر غلاف چڑھائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ حضورؐ کا یہ ارشاد اس حقیقت پر بھی دلالت کرتا ہے کہ کعبے پر غلاف چڑھانا اس کی تعظیم کے مقتضیات میں سے ہے۔ اسی بنا پر علمائے امت اس کے جواز پر متفق ہیں۔

علامہ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: کعبے کے لیے وہ تعظیم ہے جو دوسری مساجد کے لیے نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ کعبہ کو حریر و دیبا سے ڈھانکنا جائز ہے مگر مساجد پر اس طرح کے پردے ڈالنے کے جواز میں اختلاف ہے.......... کعبے کو دیبا کے غلاف سے ڈھانکنے کے جواز پر اجماع ہے۔ (فتح الباری کتاب الحج، باب کسوۃ الکعبہ)

اور یہی بات علامہ بدرالدین عینی بھی ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں غلاف کعبہ کے مشروع ہونے کی دلیل پائی جاتی ہے۔ (عمدۃ القاری، کتاب الحج، باب کسوۃ الکعبہ)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شبہات

□ **اسراف بے جا کا شبہہ:** رہا یہ شبہہ کہ اس میں بے جا اسراف ہے، کیوں نہ یہی کپڑا غریبوں کی تن پوشی پر صرف کیا جائے، تو اس کا جواب ہمیں اس واقعے میں مل جاتا ہے جو بخاری، ابن ماجہ اور طبرانی نے نقل کیا ہے.......... ایک دفعہ حضرت عمرؓ [خانہ کعبہ میں] بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں کعبے کے خزانے میں رتی بھر سونا اور چاندی بھی نہ رہنے دوں گا۔ سب کچھ فقرائے مسلمین میں تقسیم کردوں گا۔ [خانہ کعبہ کے کلید بردار شیبہ] نے کہا: آپ کے دونوں پیش روؤں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ) نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر کہا کہ وہ تو یقیناً راست رو لوگ تھے، میں انھی کے نقش قدم پر چلوں گا۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور روایت عبدالرزاق نے حضرت حسن بصریؒ سے نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ کعبے کے خزانے کو راہِ خدا میں خرچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ حضرت اُبی بن کعبؓ کے سامنے انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا تو انھوں نے کہا: آپ کو یہ کام کرنے کا حق نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: یہ کیوں؟ انھوں نے جواب دیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن تمام ہدیوں اور نذر کے اموال کو جوں کا توں رہنے دیا تھا، جو زمانۂ جاہلیت سے کعبے کے خزانے میں چلے آرہے تھے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر سونے چاندی کے وہ ظروف تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رہنے دیے جو خانہ کعبہ کے لیے زمانۂ جاہلیت میں ہدیتاً دیے گئے تھے تو غلاف کعبہ پر جو مال خرچ ہوتا ہے وہ اسراف کی تعریف میں کیسے آسکتا ہے۔ حضورؐ کے اس فعل ہی کی وجہ سے علمائے اسلام میں کبھی خانۂ کعبہ کو ریشمی غلاف پہنانے کے جواز پر اختلاف نہیں ہوا۔ صحابہ و تابعین کے زمانے سے ریشمی غلاف پہنانے کا یہ عمل چلا آرہا ہے اور اس مسئلے میں کسی کی اختلافی رائے منقول نہیں ہوئی۔

□ **شرک کا شبہہ:** اس کے بعد یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ کعبے پر غلاف چڑھانا تو درست، مگر کیا وہ غلاف جو کعبے کے لیے تیار کیا گیا ہو اس کا بھی مستحق ہے کہ اس کا احترام کیا جائے، اس کی زیارت اور مشایعت کی جائے اور اسے بڑے اہتمام کے ساتھ روانہ کیا جائے؟ کیا ان افعال میں شرک نہیں پایا جاتا؟ یہ غلاف آخر ایک کپڑا ہی تو ہے۔ محض اس بنا پر کہ یہ کعبے پر چڑھانے کے لیے تیار کیا گیا ہے، اس کی تعظیم و تکریم کیسے جائز ہوگئی۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ خانہ کعبہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پتھروں کی بنی ہوئی ایک عمارت ہے۔ معاذ اللہ وہ نہ خود خدا ہے، نہ خداوند عالم اس میں رہتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے تمام دنیا کے اہلِ توحید کا قبلہ بنادیا جس کی طرف رُخ کرکے ہر مومن قیام و قعود اور رکوع و سجود کرتا ہے۔ دوسرے مقامات پر تو کعبہ سامنے نہیں ہوتا لیکن مسجد حرام میں تو سب کی آنکھوں کے سامنے وہ موجود ہوتا ہے اور مسجد کے اندر ہر طرف سے لوگ اسی کی طرف رُخ کرکے ارکانِ نماز ادا کرتے ہیں جن میں رکوع بھی شامل ہے اور سجدہ بھی۔ پھر حج اور عمرے میں اس عمارت کے گرد طواف کیا جاتا ہے۔ اور ہر طواف کی ابتدا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حجر اسود کو چوم کر کی جاتی ہے، جو ظاہر ہے کہ ایک پتھر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیا ان میں سے کسی فعل کو بھی شرک کہا جا سکتا ہے؟

ایسا ہی معاملہ اُن اشیا کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خاطر خانہ کعبہ میں پیش کرنے کے لیے لے جائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو شعائر اللہ (خدا پرستی کی نشانیاں) قرار دیا ہے اور ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ۔ (المائدۃ ۵:۲) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! اللہ کے شعائر کو حلال نہ کرلو، اور نہ ماہ حرام کو اور نہ ہدی کو اور نہ ان ہاروں کو جو ہدی کے گلے میں لٹکائے جاتے ہیں اور نہ بیت الحرام کے قصد سے سفر کرنے والوں کو۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ۔ (الحج ۲۲:۳۶) اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے۔

وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ۔ (الحج ۲۲:۳۲) اور جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ کی نشانی ہے۔

دیکھیے! ماہِ حرام کیا ہے؟ مہینوں میں سے ایک مہینہ ہی تو ہے مگر کعبے کی نسبت نے اسے شعائر اللہ میں داخل کر دیا۔ ہدی کے اونٹ آخر جانوروں کے سوا اور کیا ہیں؟ مگر چونکہ وہ کعبے کی طرف نذر کے طور پر لے جائے جاتے ہیں اس لیے وہ بھی شعائر اللہ میں شمار ہو گئے۔

اہل عرب قدیم زمانے میں ان اونٹوں کے گلے میں جوتوں کے ہار لٹکا دیتے تھے تاکہ دور سے ہی دیکھ کر ہر شخص معلوم کر لے کہ یہ ہدی کے اونٹ ہیں۔ یہ ہار بھی شعائر اللہ بن گئے، کیونکہ انھیں اللہ کے گھر سے نسبت نصیب ہو گئی۔ اب ان شعائر کی تعظیم و تکریم ان اشیا کی تعظیم و تکریم نہیں بلکہ اس نسبت کی تعظیم و تکریم ہے جو انھیں اللہ کے گھر سے حاصل ہو چکی ہے۔ ان کی تعظیم کو اللہ تعالیٰ اس بات کی علامت قرار دے رہا ہے کہ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے دل میں تقویٰ ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھنے میں آخر کیا مشکل ہے کہ جو کپڑا کعبے پر غلاف چڑھانے کے لیے تیار کیا جاتا ہے اس کا احترام بھی ایک کپڑے کا احترام نہیں بلکہ اس نسبت کا احترام ہے جو اسے کعبے کے ساتھ حاصل ہو گئی ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے جو شخص بھی آتا ہے، اسے اللہ کے گھر کی محبت کھینچ کر لاتی ہے نہ کہ ایک کپڑے کو دیکھنے کی خواہش۔ اسے بیت اللہ کی طرف بھیجنے کے لیے جو مشایعت کی جاتی ہے وہ اس شوق کا ایک مظہر ہے جو مسلمان خود بیت اللہ کی زیارت کے لیے اپنے دلوں میں پاتے ہیں۔ اس حد تک جو کچھ کیا جائے وہ تو شرک کی تعریف میں نہیں آتا۔ البتہ اس سے تجاوز کر کے اگر کوئی شخص غلاف کو چومے اور اس کا طواف کرنے اور اس سے چمٹ کر دعائیں مانگنے اور اس کی طرف رُخ کر کے رکوع و سجود کرنے لگے تو یہ بلاشبہ شرک ہو گا۔ کیونکہ یہ سب امور صرف بیت اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں، غلاف کے کپڑے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا گھر قرار نہیں دیا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

غلافِ کعبہ کی تاریخ

اب ہم مختصراً یہ بیان کریں گے کہ کعبہ پر غلاف چڑھانے کی ابتدا کب ہوئی اور اُس وقت سے آج تک اس کی تاریخ کیا رہی ہے۔ اس تاریخ کے مآخذ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) فتح الباری شرح صحیح بخاری، علامہ ابن حجر۔ (۲) سیرۃ ابنِ ہشام۔ (۳) اخبار مکہ، محمد بن عبداللہ الازرقی۔ (۴) شفاء الغرام، تقی الدین الفاسی۔ (۵) الاعلام، قطب الدین الحنفی۔ (۶) تاریخ الکعبہ، عبداللہ باسلامہ۔ (۷) مراۃ الحرمین، ابراہیم رفعت پاشا۔

□ **فتح مکہ سے پہلے:** غلاف کے بارے میں زمانۂ قدیم کی تاریخ کا کوئی مرتب اور معتبر ریکارڈ موجود نہیں ہے، لیکن اُس زمانے کی جو روایات علمائے اسلام تک پہنچی ہیں ان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبے پر غلاف چڑھایا تھا۔ اس کے بعد صدیوں تک تاریخ خاموش ہے۔ پھر یہ ذکر ملتا ہے کہ عدنان نے یہ خدمت انجام دی۔ اس کے بعد پھر کئی صدی تک کی تاریخ غائب ہے۔ تیسرا شخص جس کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس نے سرخ رنگ کے دھاری دار یمنی کپڑے (الوصائل) کا مکمل غلاف کعبے پر چڑھایا وہ یمن کا ایک بادشاہ اسعد تھا جس کا زمانہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سو برس پہلے گزرا ہے۔

غلاف کی مسلسل تاریخ ہم کو اُس وقت سے ملتی ہے۔ جب خانۂ کعبہ کا انتظام قبیلۂ قریش کے ہاتھوں میں آیا۔ اس قبیلے کی روایات زمانۂ اسلام تک محفوظ رہی ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے اس نے انتظام سنبھالا اس کے مختلف خاندان ہر سال باری باری سے کعبے پر غلاف چڑھایا کرتے تھے، پھر بنی مخزوم کے ایک سردار ابو ربیعہ نے یہ طے کیا کہ ایک سال غلاف وہ چڑھایا کرے گا اور ایک سال کا غلاف قریش کا کوئی خاندان اپنی طرف سے چڑھائے۔

اس کے علاوہ زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ عرب کے مختلف قبیلے اور قبائلی سردار جب زیارت کے لیے آتے تھے تو کعبہ پر لٹکانے کے لیے طرح طرح کے پردے لاتے تھے۔ جتنے لٹکائے جاسکتے تھے اُتنے لٹکا دیے جاتے اور باقی کعبے کے خزانے میں رکھ دیے جاتے تھے۔ جب کوئی پردہ بوسیدہ ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا پردہ لٹکا دیا جاتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کا واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دادی کے ایک صاحبزادے (غالباً حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب) گم ہو گئے تھے۔ انھوں نے نذر مانی کہ اگر بچہ مل گیا تو وہ کعبہ پر ریشمی غلاف چڑھائیں گی۔ جب وہ مل گئے تو انھوں نے اپنی نذر پوری کی اور سفید رنگ کا ریشمی غلاف کعبے پر چڑھایا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کعبے پر ریشم کا غلاف چڑھایا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پانچ سال پہلے جب قریش نے کعبے کی از سرِ نو تعمیر کی تو پورے قبیلے نے بڑے اہتمام سے کعبے پر غلاف چڑھایا۔ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ قبیلۂ بنی سُلَیم کے ایک صاحب اپنی ماں کے ساتھ زیارتِ کعبہ کے

www.KitaboSunnat.com

لیے گئے ہوئے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اُس زمانے میں انھوں نے کعبے پر مختلف قسم کی اور مختلف رنگوں کی چادریں لٹکی ہوئی دیکھی تھیں۔

فتح مکہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعلان کہ فلاں فلاں اشخاص اگر کعبے کے پردوں سے بھی لپٹے ہوئے ہوں تو انھیں قتل کر دیا جائے، اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اس وقت کعبے پر پردے لٹکے ہوئے تھے۔

□ **فتح مکہ کے بعد:** جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، فتح کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا تھا کہ آج وہ دن ہے جب اللہ کعبہ کی عظمت قائم فرمائے گا اور اب ہم اس پر غلاف چڑھائیں گے۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک عورت غلافِ کعبہ کو خوشبو دینے کے لیے بخور جلا رہی تھی، اتفاقاً کپڑا آگ پکڑ گیا اور پورا غلاف جل گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے زمانۂ جاہلیت کا لبادہ کعبے پر سے خود اتار دیا اور پھر زمانۂ اسلام میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے اللہ کے گھر پر غلاف چڑھایا۔ یہ روایت علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں حضرت سعید بن المُسَیَّب سے نقل کی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے زمانے میں کعبے پر یمنی کپڑے کا غلاف چڑھاتے تھے پھر جب مصر فتح ہو گیا تو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ قُباطی (مصری کپڑے) کا غلاف بنوانے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے اپنے عہدِ خلافت میں غلاف چڑھایا ہے یا نہیں۔ اس بارے میں روایات خاموش ہیں۔ ممکن ہے کہ فتنوں نے آنجناب کو اس خدمت کا موقع نہ دیا ہو۔

قدیم زمانہ سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ جب حج کے بعد سب حاجی رخصت ہو جاتے تھے تو ۱۰ محرم کو کعبے پر غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ اسی طریقے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی عمل ہوتا رہا۔ امیر معاویہؓ نے اپنے عہد میں یوم عاشوراء پر غلاف چڑھانے کے علاوہ ایک اور غلاف عید الفطر کے موقع پر بھی چڑھانا شروع کر دیا۔ یہ بات بھی روایات سے معلوم ہوتی ہے کہ زمانۂ اسلام میں سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے اپنے عہد میں ریشمی غلاف بنوایا تھا۔ پھر یزید اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنے اپنے زمانے میں اس کی تقلید کی اور عبدالملک بن مروان کے عہد سے یہی مستقل طریقہ بن گیا جو آج تک جاری ہے۔ اس عمل کی ابتدا جس وقت ہوئی تھی اس وقت بکثرت صحابہ و تابعین اور جلیل القدر فقہا موجود تھے۔ کسی نے ریشمی غلاف پر اعتراض نہیں کیا۔ اسی وجہ سے بعد کے علما بھی اس کے جواز پر متفق رہے۔

زمانۂ اسلام سے پہلے مختلف لوگ کعبے پر چڑھانے کے لیے چادریں لایا کرتے تھے۔ اسلامی دور میں غلاف چڑھانا حکومت کی ذمہ داری قرار پا گیا۔ عبدالرزاق کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: کیا ہم کعبے پر غلاف چڑھائیں؟ انھوں نے فرمایا: اب تمھیں اس کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ حکام نے تمھاری طرف سے اس خدمت کو سنبھال لیا ہے۔ ایک روایت میں حضرت عائشہؓ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ کِسْوَةُ الْبَيْتِ عَلَى الْأُمَرَاءِ بیت اللہ کا غلاف حکام کے ذمہ ہے۔

عباسی خلافت کے زوال تک غلاف کی تیاری مرکزی حکومت کے انتظام میں ہوتی رہی۔ پھر جب کوئی مرکزی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حکومت باقی نہ رہی تو مختلف علاقوں کے سلاطین اپنی طرف سے غلاف بنوا کر بھیجتے رہے اور بسا اوقات بیک وقت کئی کئی غلاف بھی چڑھائے گئے۔ اس سلسلے میں ایک مرتبہ ہندوستان سے بھی (۴۶۶ھ میں) غلاف بنوا کر بھیجا گیا تھا اور چونکہ اس زمانے میں اسلامی حکومت ان علاقوں تک محدود تھی جو اب پاکستان میں شامل ہیں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غلاف پاکستان سے بن کر گیا تھا۔

۷۵۰ھ میں مصر کے فرماں روا الملک الصالح اسماعیل بن ناصر نے غلافِ کعبہ تیار کرانا اپنے ذمہ لے لیا اور اس غرض کے لیے تین گاؤں وقف کر دیے اس وقت سے موجودہ زمانے تک مصر ہی سے غلاف بن کر آتا رہا ہے۔ مصر پر ترکی سلاطین کا قبضہ ہو جانے کے بعد سلطان سلیمان اعظم نے ملک الصالح کے اس وقف میں سات گاؤں کا اور اضافہ کر دیا اور اس عظیم وقف کی آمدنی سے ہر سال کعبے کا غلاف اور ہر پانچویں سال حجرہ نبوی کے پردے اور منبر نبوی کا غلاف مصر سے بن کر آنے لگا۔ اس کے علاوہ خانۂ کعبہ کے اندر کے پردے بھی وقتاً فوقتاً اسی وقف سے بنا کر بھیجے جاتے تھے۔ اس زمانے میں اس وقف کی آمدنی ۳۶۶۷۳۶ درہم تھی جسے موجودہ زمانے کے مصری سکے کے لحاظ سے ۵۰ ہزار اور ایک لاکھ درہم مصری پاؤنڈ کے درمیان سمجھنا چاہیے مگر جب پچھلی صدی کے آغاز میں مصر کے وائسرائے محمد علی پاشا نے ترکی سلطنت سے بغاوت کر کے خود مختاری اختیار کر لی تو اس نے یہ وقف منسوخ کر دیا ورصرف غلافِ کعبہ حکومتِ مصر کے خرچ پر بنوا کر بھیجنا شروع کر دیا۔ کعبے کے اندرونی پردے اور حجرۂ نبوی کے پردے آج تک مصر سے نہیں بھیجے گئے۔ آج جو پردے وہاں پڑے ہوئے ہیں وہ سب سلطان عبدالعزیز (۱۸۳۰-۱۸۷۶ء) کے زمانے کے ہیں اور بہت بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ کعبے کا جو غلاف اب مصر سے بن کر آتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار مصری پونڈ کا ہوتا ہے۔

پہلے غلاف مختلف رنگوں کے ہوا کرتے تھے۔ مامون الرشید نے سفید رنگ کا غلاف چڑھایا تھا۔ محمود غزنوی کے غلاف کا رنگ زرد تھا۔ مصر کے فاطمی خلفا سفید رنگ کے غلاف بھیجتے تھے۔ خلیفۂ ناصر عباسی (۵۷۸-۶۲۲ھ) نے ابتدا میں سبز غلاف بنوایا تھا۔ پھر سیاہ ریشم کا بنوا کر بھیجا۔ اس کے بعد سے سیاہ غلاف ہی بنوایا جاتا رہا اور آج تک یہی طریقہ جاری ہے۔

غلافِ کعبہ کے چاروں طرف زری کے کام کی پٹی بنانے اور اس پر کعبہ کے متعلق قرآن مجید کی آیات لکھوانے کا سلسلہ سب سے پہلے ۷۶۱ھ میں مصر کے سلطان حسن نے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ پٹی لگانے کا طریقہ آج تک چل رہا ہے۔ اس پٹی پر حسبِ ذیل آیات لکھی جاتی ہیں:

ایک طرف: اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ۚ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ ؎۱ (آلِ عمران ۳:۹۶-۹۷)

۱- ترجمہ: بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی، وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت ←

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسری طرف: جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ۭ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ [1] (المائدة ۵:۹۷)

تیسری طرف: وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ [2] (البقرة ۲:۱۲۷-۱۲۸)

چوتھی جانب اس فرمانروا کا نام لکھا جاتا ہے جس نے غلاف بنوایا ہو۔

موجودہ صدی کے آغاز تک غلافِ کعبہ دنیا کے سیاسی حالات سے غیر متاثر رہا۔ لڑائیاں ہوتی تھیں، سلطنتوں کے تعلقات بنتے اور بگڑتے تھے مگر کعبہ کے لیے غلاف جہاں سے آیا کرتا تھا، وہیں سے آتا رہا، لیکن اس صدی کے آغاز میں دنیا کے سیاسی حالات اس پر بھی اثر انداز ہونے لگے۔ جنگِ عظیم اوّل میں جب ترکی سلطنت جرمنی کے ساتھ شریک جنگ ہوگئی تو اسے اندیشہ ہوا کہ انگریز مصر سے غلاف کے آنے میں مانع ہوں گے۔ اس لیے اس نے استنبول سے ایک نہایت شاندار غلاف بنوا کر حجاز ریلوے کے ذریعے سے مدینے بھیج دیا مگر چونکہ مصر سے عین وقت پر غلاف پہنچ گیا تھا اس لیے وہ ترکی غلاف مدینہ طیبہ میں محفوظ کر دیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں شریف حسین اور حکومتِ مصر کے تعلقات خراب ہوگئے اور مصری حکومت نے عین حج کے موقع پر جدہ پہنچے ہوئے غلاف کو واپس منگوا لیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت وہ مصری غلاف کام آ گیا، جو جنگ کے زمانے میں ترکی حکومت نے مدینہ طیبہ بھیج رکھا تھا۔ پھر ۱۹۲۵ء میں سلطان ابن سعود اور شریف حسین کی لڑائی کے زمانے میں مصر سے غلاف نہ آیا اور ابن سعود نے عراق کا بنا ہوا ایک غلاف چڑھا دیا جو شریف حسین نے احتیاطاً بنوا کر رکھ چھوڑا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں ٹھیک یکم ذی الحجہ کو حکومت مصر نے غلاف بھیجنے سے انکار کر دیا اور ابن سعود کو فوراً مکہ میں ایک غلاف بنوانا پڑا۔ پھر ۱۹۲۸ء میں بھی مصری غلاف نہ آیا اور امرتسر سے مولانا داؤد غزنوی اور مولانا اسماعیل غزنوی کے اہتمام میں غلاف بنوا کر بھیجا گیا۔

ان تجربات کی بنا پر اُسی زمانہ میں مکہ معظمہ کے اندر ایک دارالکسوہ قائم کر دیا گیا تھا تاکہ مصر سے آئے دن غلاف نہ آنے

← دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ ابراہیمؑ کا مقامِ عبادت ہے، اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہوگیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

۱- ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے مکانِ محترم، کعبہ کو لوگوں کے لیے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہِ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اس کام میں معاون بنا دیا) تاکہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔

۲- اور یاد کرو، ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے، تو دعا کرتے جاتے تھے: اے ہمارے رب! ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے، تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب! ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیعِ فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا، اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی مصیبت کا مستقل علاج کر دیا جائے۔ اس کارخانے میں مولانا اسماعیل غزنوی مرحوم کی مدد سے ہندوستان کے بہت سے کاریگر فراہم کیے گئے تھے۔ کچھ مدت تک وہیں غلاف تیار کیا جاتا رہا۔ پھر سعودی حکومت اور مصر کے تعلقات درست ہو گئے اور وہاں سے غلاف کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب پچھلے سال وہی قضیہ پھر پیش آیا اور سیاسی تعلقات کی خرابی نے مصری غلاف کی آمد کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک مدت دراز کے بعد اس سال پاکستان کی سرزمین پر غلاف کا کپڑا تیار ہو رہا ہے۔ پورے غلاف کے لیے ایک ہزار گز کپڑا درکار ہوتا ہے۔ پاکستان سے صرف یہ کپڑا ہی بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ زری کے کام کی پٹی مکہ معظمہ کے دارالکسوہ میں تیار کی جائے گی۔[1]

(تفہیمات، چہارم، اگست ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۱-۱۵۵)

اراضیِ مکہ کی خرید و فروخت اور کرایہ

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ؕ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (الحج ۲۲:۲۵) جن لوگوں نے کفر کیا اور جو (آج) اللہ کے راستے سے روک رہے ہیں اور اُس مسجد حرام کی زیارت میں مانع ہیں جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے بنایا ہے، جس میں مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر ہیں (اُن کی روش یقیناً سزا کی مستحق ہے)۔ اس (مسجدِ حرام) میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا اسے ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

[مسجدِ حرام] کسی شخص یا خاندان یا قبیلے کی جائداد نہیں ہے، بلکہ وقفِ عام اور جس کی زیارت سے روکنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

یہاں فقہی نقطۂ نظر سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں جن کے بارے میں فقہائے اسلام کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے ہیں:

اوّل یہ کہ 'مسجد حرام' سے مراد کیا ہے؟ آیا صرف مسجد یا پورا حرم مکہ؟

دوم یہ کہ اس میں عاکف (رہنے والے) اور باد (باہر سے آنے والے) کے حقوق برابر ہونے کا کیا مطلب ہے؟

ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسجد ہے نہ کہ پورا حرم، جیسا کہ قرآن کے ظاہر الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔ اور اس میں حقوق کے مساوی ہونے سے مراد عبادت کے حق میں مساوات ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ یَا بَنِیْ عَبْدِ مَنَافٍ مَنْ وَّلِیَ مِنْكُمْ مِنْ اُمُوْرِ النَّاسِ شَيْئًا فَلَا يَمْنَعَنَّ اَحَدًا طَافَ بِهٰذَا الْبَيْتِ اَوْ صَلّٰی اَيَّةَ سَاعَةٍ شَآءَ مِنْ لَيْلٍ اَوْ نَهَارٍ۔ اے اولادِ عبد مناف! تم میں سے جو کوئی لوگوں کے معاملات پر کسی اقتدار کا مالک ہو، اسے

---

[1] یہ تحریر ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، مارچ ۱۹۶۳ء میں اس وقت شائع کی گئی تھی جب مسلمانانِ پاکستان کو عرصۂ دراز کے بعد غلاف تیار کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی تھی۔ (مرتبین)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چاہیے کہ کسی شخص کو رات اور دن کے کسی وقت میں بھی خانہ کعبہ کا طواف کرنے یا نماز پڑھنے سے منع نہ کرے۔ اس رائے کے حامی کہتے ہیں کہ مسجدِ حرام سے پورا حرم مراد لینا اور پھر وہاں جملہ حیثیات سے مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر قرار دینا غلط ہے۔ کیونکہ مکے کے مکانات اور زمینوں پر لوگوں کے حقوقِ ملکیت و وراثت اور حقوق بیع و اجارہ اسلام سے پہلے قائم تھے اور اسلام کے بعد بھی قائم رہے، حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں صفوان بن اُمیہ کا مکان مکے میں جیل کی تعمیر کے لیے چار ہزار درہم میں خریدا گیا۔ لہٰذا یہ مساوات صرف عبادت ہی کے معاملے میں ہے نہ کہ کسی اور چیز میں۔ یہ امام شافعیؒ اور ان کے ہم خیال اصحاب کا قول ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مسجد حرام سے مراد پورا حرم مکہ ہے۔ اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ خود اس آیت میں جس چیز پر مشرکین مکہ کو ملامت کی گئی ہے وہ مسلمانوں کے حج میں مانع ہونا ہے، اور ان کے اس فعل کو یہ کہہ کر رد کیا گیا ہے کہ وہاں سب کے حقوق برابر ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ حج صرف مسجد ہی میں نہیں ہوتا بلکہ صفا اور مروہ سے لے کر منیٰ، مزدلفہ، عرفات، سب مناسکِ حج کے مقامات ہیں۔ پھر قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر مسجد حرام بول کر پورا حرم مراد لیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا: وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ "مسجد حرام سے روکنا اور اس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک ماہِ حرام میں جنگ کرنے سے بڑا گناہ ہے (البقرہ ۲: ۲۱۷)۔ ظاہر ہے کہ یہاں مسجد سے نماز پڑھنے والوں کو نکالنا نہیں بلکہ مکے سے مسلمان باشندوں کو نکالنا مراد ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ذَٰلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ "یہ رعایت اُس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں (البقرہ ۲: ۱۹۶)۔ یہاں بھی مسجد حرام سے مراد پورا حرمِ مکہ ہے نہ کہ محض مسجد۔ لہٰذا 'مسجد حرام' میں مساوات کو صرف مسجد میں مساوات تک محدود نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ یہ حرمِ مکہ میں مساوات ہے۔

پھر یہ گروہ کہتا ہے کہ یہ مساوات صرف عبادت اور تعظیم و حرمت ہی میں نہیں ہیں، بلکہ حرم مکہ میں تمام حقوق کے اعتبار سے ہے۔ یہ سرزمین خدا کی طرف سے وقفِ عام ہے لہٰذا اس پر اور اس کی عمارات پر کسی کے حقوقِ ملکیت نہیں ہیں۔ ہر شخص ہر جگہ ٹھیر سکتا ہے، کوئی کسی کو نہیں روک سکتا اور نہ کسی بیٹھے ہوئے کو اٹھا سکتا ہے۔ اس کے ثبوت میں یہ لوگ بکثرت احادیث اور آثار پیش کرتے ہیں۔ مثلاً:

عبداللہؓ بن عمر کی روایت کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَكَّةُ مُنَاخٌ لَا تُبَاعُ رِبَاعُهَا وَلَا تُؤَاجَرُ بُيُوتُهَا، مکہ مسافروں کے اترنے کی جگہ ہے، نہ اس کی زمینیں بیچی جائیں اور نہ اس کے مکان کرائے پر چڑھائے جائیں۔

ابراہیم نخعی کی مرسل روایت کہ حضورؐ نے فرمایا: مَكَّةُ حَرَّمَهَا اللَّهُ لَا يَحِلُّ بَيْعُ رِبَاعِهَا وَ لَا إِجَارَةُ بُيُوتِهَا، مکہ کو اللہ نے حرم قرار دیا ہے، اس کی زمین کو بیچنا اور اس کے مکانوں کا کرایہ وصول کرنا حلال نہیں ہے۔ (واضح رہے کہ ابراہیم نخعی کی مُرسلات حدیث مرفوع کے حکم میں ہیں، کیونکہ اُن کا یہ قاعدہ مشہور و معروف ہے کہ جب وہ مرسل روایت کرتے ہیں تو دراصل عبداللہؓ بن مسعود کے واسطے سے روایت کرتے ہیں)۔ مجاہد نے بھی تقریباً انھی الفاظ میں ایک روایت نقل کی ہے۔

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

علقمہ بن نضلہ کی روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں مکہ کی زمینیں سوائب (افتادہ زمینیں یا شاملات) سمجھی جاتی تھیں، جس کو ضرورت ہوتی وہ رہتا تھا اور جب ضرورت نہ رہتی دوسرے کو ٹھیرا دیتا تھا۔

عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کہ حضرت عمرؓ نے حکم دے دیا تھا کہ حج کے زمانے میں مکے کا کوئی شخص اپنا دروازہ بند نہ کرے۔ بلکہ مجاہد کی روایت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہل مکہ کو اپنے مکانات کے صحن کھلے چھوڑ دینے کا حکم دے رکھا تھا اور وہ ان پر دروازے لگانے سے منع کرتے تھے تاکہ آنے والا جہاں چاہے ٹھیرے۔ یہی روایت عطا کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ صرف سہیل بن عمرو کو فاروقِ اعظم نے صحن پر دروازے لگانے کی اجازت دی تھی کیونکہ ان کو تجارتی کاروبار کے سلسلے میں اپنے اونٹ وہاں بند کرنے ہوتے تھے۔

عبداللہ بن عمرؓ کا قول کہ جو شخص مکہ کے مکانات کا کرایہ وصول کرتا ہے وہ اپنا پیٹ آگ سے بھرتا ہے۔

عبداللہ بن عباسؓ کا قول کہ اللہ نے پورے حرم مکہ کو مسجد بنا دیا ہے جہاں سب کے حقوق برابر ہیں۔ مکہ والوں کو باہر والوں سے کرایہ وصول کرنے کا حق نہیں ہے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کا فرمان امیر مکہ کے نام کہ مکہ کے مکانات پر کرایہ نہ لیا جائے کیونکہ یہ حرام ہے۔

ان روایات کی بنا پر بکثرت تابعین اس طرف گئے ہیں، اور فقہا میں سے امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، امام احمد بن حنبلؒ، اور اسحاق بن راہُوَیہ کی بھی یہی رائے ہے کہ اراضیِ مکہ کی بیع، اور کم از کم موسمِ حج میں مکے کے مکانوں کا کرایہ جائز نہیں۔ البتہ بیش تر فقہا نے مکے کے مکانات پر لوگوں کی ملکیت تسلیم کی ہے اور ان کی بحیثیت عمارت، نہ کہ بحیثیت زمین بیع کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

یہی مسلک کتاب اللہ و سنت رسول اللہ اور سنت خلفائے راشدین سے قریب تر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کے مسلمانوں پر حج اس لیے فرض نہیں کیا ہے کہ یہ اہل مکہ کے لیے آمدنی کا ذریعہ بنے اور جو مسلمان احساس فرض سے مجبور ہو کر وہاں جائیں انھیں وہاں کے مالکانِ زمین اور مالکانِ مکانات خوب کرائے وصول کر کر کے لوٹیں۔ وہ ایک وقفِ عام ہے تمام اہلِ ایمان کے لیے۔ اس کی زمین کسی کی مِلک نہیں ہے۔ ہر زائر کو حق ہے کہ جہاں جگہ پائے ٹھیر جائے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۱۵-۲۱۷، الحج، حاشیہ ۴۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب دوم

حج

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

فرضیّت

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۔

(آل عمران ۳:۹۷) اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو کوئی اس گھر تک آنے کی قدرت رکھتا ہو وہ حج کے لیے آئے۔ پھر جو کوئی کفر کرے (یعنی قدرت کے باوجود نہ آئے) تو اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

فرضیتِ حج کی تاریخ

فتح مکہ کے بعد دورِ اسلامی کا پہلا حج ۸ ھ میں قدیم طریقے پر ہوا۔ پھر ۹ ھ میں دوسرا حج مسلمانوں نے اپنے طریقے پر کیا اور مشرکین نے اپنے طریقے پر۔ اس کے بعد تیسرا حج ۱۰ ھ میں خالص اسلامی طریقے پر ہوا اور یہی وہ مشہور حج ہے جسے حجۃ الوداع کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے دو سال حج کے لیے تشریف نہ لے گئے۔ تیسرے سال جب بالکل شرک کا استیصال ہو گیا تب آپؐ نے حج ادا فرمایا۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۱۷۴، التوبہ، حاشیہ نمبر ۱)

مکہ معظمہ رمضان ۸ ھ میں فتح ہوا۔ دوسرے ہی مہینے حُنین اور طائف کے معرکے پیش آئے جن سے ذی القعدہ ۸ ھ کے وسط میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے اور عمرہ کر کے حج کیے بغیر اپنے اصحاب کے ساتھ مدینے واپس تشریف لے گئے۔ اُس وقت یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حج کے قدیم طریقے کو جو صدیوں سے زمانۂ جاہلیت میں رواج پا چکا تھا، اور جس کے مطابق حج کرنے کے لیے ہزاروں لاکھوں مشرکین مکے میں جمع ہو چکے تھے یا عن قریب جمع ہونے والے تھے، یک لخت بدل ڈالا جاتا۔ اگر اس وقت ایسا کیا جاتا تو حُنین کے معرکے سے کئی گنا زیادہ شدید معرکہ مسجد الحرام کے حدود میں پیش آ جاتا۔ اس لیے اُس سال جاہلیت کے طریقوں سے کوئی تعرض نہ کیا گیا اور حج جس طرح پہلے ہوتا تھا اُسی طرح ہونے دیا گیا[1]۔

دوسرے سال ۹ ھ میں آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کو حج کے موقع پر بھیجا اور اعلان کر دیا کہ لَا یَحُجَّنَّ بَعْدَ عَامِنَا ھٰذَا مُشْرِكٌ وَ لَا یَطُوْفَنَّ بِالْبَیْتِ عُرْیَانٌ۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرنے پائے اور نہ کوئی شخص برہنہ طواف کرے۔

۱۔ یہ صرف تاریخی واقعات سے میرا استنباط ہی نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم ترین سیرت نگار ابن ہشام نے اس کی تصریح بھی کی ہے۔ وہ ۸ ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وَ حَجَّ النَّاسُ تِلْكَ السَّنَةَ عَلٰى مَا كَانَتِ الْعَرَبُ تَحُجُّ عَلَيْهِ. اس سال لوگوں نے اُسی طریقے پر حج کیا جس پر اہل عرب کیا کرتے تھے۔ (سیرت النبیؐ، ابن ہشام، ج ۴، ص ۱۴۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ اعلان قرآن مجید کے اس حکم کی بنیاد پر تھا کہ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ (التوبہ ۹:۲۸) مشرکین تو نجس ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔

تیسرے سال ۱۰ھ میں اس حکم کی تعمیل کی گئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تشریف لے جا کر حج کے خالص اسلامی طریقے کو ہمیشہ کے لیے قائم فرما دیا۔

......یہ سوال کہ حج کس سال فرض ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ محققین کے نزدیک وہ ۹ھ کے آخر، یا ۱۰ھ کے آغاز میں فرض ہوا ہے، اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ صحیحین میں بنی عبدالقیس کے وفد کی حاضری کا جو قصہ آیا ہے اُس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارکانِ اسلام بیان کرتے ہوئے صرف چار ارکان کا ذکر فرمایا ہے، حج کا ذکر نہیں فرمایا۔ یہ وفد بالاتفاق ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے بعد حاضر ہوا تھا۔ (زاد المعاد، اوّل، ص ۳۴-۳۹) لیکن چوں کہ اُس سال جاہلیت کے رواجِ نسي کی وجہ سے حج ذی القعدہ میں پڑتا تھا، اور مشرکین کے ساتھ حج کرنا بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان نہ تھا اس لیے آپؐ خود حج کے لیے تشریف نہ لے گئے اور حضرت ابوبکرؓ و علیؓ کو بھیجا تاکہ جاہلیت کے طریقوں کی تنسیخ کا اعلان فرما دیں۔ حج کے اسلامی احکام کی تشریح و توضیح اور عملی تعلیم ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر ہی ہوئی ہے۔

(رسائل و مسائل، سوم، مئی ۱۹۶۵ء، ص ۸۰-۸۲)

زندگی میں ایک ہی حج فرض ہے

قرآن میں مجملاً یہ حکم دیا گیا تھا کہ حج تم پر فرض کیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے حکم سنتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: کیا ہر سال فرض کیا گیا ہے؟

آپؐ نے کچھ جواب نہ دیا۔ انھوں نے پھر پوچھا۔ آپؐ پھر خاموش ہو گئے۔ تیسری مرتبہ پوچھنے پر آپؐ نے فرمایا: تم پر افسوس ہے۔ اگر میری زبان سے ہاں نکل جائے تو حج ہر سال فرض قرار پا جائے پھر تم ہی لوگ اس کی پیروی نہ کر سکو گے اور نافرمانی کرنے لگو گے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۵۰۷، المائدہ، حاشیہ ۱۱۶)

جاہلی رسومات کا خاتمہ

اس طرح حج کا از سرِ نو آغاز کرنے کے ساتھ ہی جاہلیت کی وہ ساری رسمیں بھی یک قلم مٹا دی گئیں جو پچھلے دو ہزار برس میں رواج پا گئی تھیں۔

- **بت پرستی:** کعبے کے سارے بت توڑے گئے، خدا کے سوا دوسروں کی جو پرستش وہاں ہو رہی تھی وہ قطعاً روک دی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گئی، سب رسمیں مٹا دی گئیں، میلے ٹھیلے اور تماشے بند کر دیے گئے اور حکم دیا گیا کہ اب جو طریقۂ عبادت کا بتایا جا رہا ہے اسی طریقے سے یہاں اللہ کی عبادت کرو۔

وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ۔ (البقرۃ ۲:۱۹۸) اللہ کو یاد کرو اس طرح جیسی تمھیں اللہ نے ہدایت کی ہے ورنہ اس سے پہلے تو تم گمراہ لوگ تھے۔

□ **بے ہودہ افعال:** تمام بے ہودہ افعال کی سخت ممانعت کر دی گئی:

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ (البقرۃ ۲:۱۹۷) حج میں نہ شہوانی افعال کیے جائیں، نہ فسق و فجور ہو، نہ لڑائی جھگڑے ہوں۔

□ **شاعری کے دنگل:** شاعری کے دنگل، باپ دادا کے کارناموں پر فخر، بڑائی اور ہجو گوئی کے مقابلے سب بند کر دیے گئے:

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ؕ (البقرۃ ۲:۲۰۰) پھر جب اپنے مناسک حج ادا کر چکو تو جس طرح تم اپنے باپ دادا کا ذکر کیا کرتے تھے اب اللہ کو یاد کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

□ **نمایشی فیاضی:** فیاضی کے مقابلے، جو محض دکھاوے اور نام وری کے لیے ہوتے تھے ان سب کا خاتمہ کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہی حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کا طریقہ پھر زندہ کیا گیا کہ محض اللہ کے نام پر جانور ذبح کیے جائیں تا کہ خوش حال لوگوں کی قربانی سے غریب حاجیوں کو بھی کھانے کا موقع مل جائے۔

وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ (الاعراف ۷:۳۱) کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو کہ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ (الحج ۲۲:۳۶) ان جانوروں کو خالص اللہ کے لیے اسی کے نام پر قربان کرو، پھر جب اُن کی پیٹھیں زمین پر ٹھیر جائیں (یعنی جب جان پوری طرح نکل چکے اور حرکت باقی نہ رہے) تو خود بھی ان میں سے کھاؤ اور قانع کو بھی کھلاؤ اور حاجت مند سائل کو بھی۔

□ **قربانی کا غلط تصور:** قربانی کے خون کو کعبے کی دیواروں سے لتھیڑنا اور گوشت لا کر ڈالنا موقوف کیا گیا اور ارشاد ہوا: لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ (الحج ۲۲:۳۷) اللہ کو ان جانوروں کے گوشت اور خون نہیں پہنچتے بلکہ تمھاری پرہیز گاری و خدا ترسی پہنچتی ہے۔

□ **برہنہ طواف:** برہنہ ہو کر طواف کرنے کی قطعی ممانعت کر دی گئی اور فرمایا گیا:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ۔ (الاعراف ۷:۳۲) اے نبیؐ! ان سے کہو کہ کس نے اللہ کی اُس زینت کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حرام کیا جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی تھی (یعنی لباس)؟

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ (الاعراف ۷:۲۸) اے نبیؐ! کہو کہ اللہ تو ہرگز بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف ۷:۳۱) اے آدم زادو! ہر عبادت کے وقت اپنی زینت (یعنی لباس) پہنے رہا کرو۔

□ **حج کے مہینوں میں الٹ پھیر:** حج کے مہینوں کا اُلٹ پھیر کرنے اور حرام مہینوں کو لڑائی کے لیے حلال کر لینے سے سختی کے ساتھ روک دیا گیا:

اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ (التوبہ ۹:۳۷) نسی تو کفر میں اور زیادتی ہے (یعنی کفر کے ساتھ ڈھٹائی کا اضافہ ہے) کافر لوگ اس طریقے سے اور زیادہ گمراہی میں پڑے ہیں۔ ایک سال ایک مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور دوسرے سال اس کے بدلے میں کوئی دوسرا مہینہ حرام کر دیتے ہیں تاکہ جتنے مہینے اللہ نے حرام ٹھیرائے ہیں ان کی تعداد پوری کر دی جائے، مگر اس بہانے سے دراصل اُس چیز کو حلال کر لیا جائے جسے اللہ نے حرام کیا تھا۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۷۶-۲۷۷)

عرب میں نسی دو طرح کی تھی۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ جنگ و جدل اور غارت گری اور خون کے انتقام لینے کی خاطر کسی حرام مہینے کو حلال قرار دے لیتے تھے اور اس کے بدلے میں کسی حلال مہینے کو حرام کر کے حرام مہینوں کی تعداد پوری کر دیتے تھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لیے اُس میں کبیسہ کا ایک مہینہ بڑھا دیتے تھے، تاکہ حج ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا رہے اور وہ اُن زحمتوں سے بچ جائیں جو قمری حساب کے مطابق مختلف موسموں میں حج کے گردش کرتے رہنے سے پیش آتی ہیں۔ اس طرح ۳۳ سال تک حج اپنے اصلی وقت کے خلاف دوسری تاریخوں میں ہوتا رہتا تھا اور صرف چونتیسویں سال ایک مرتبہ اصل ذی الحجہ کی ۹-۱۰ تاریخ کو ادا ہوتا تھا۔ یہی وہ بات ہے جو حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبے میں فرمائی تھی کہ اِنَّ الزَّمَانَ قَدِاسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ یعنی اس سال حج کا وقت گردش کرتا ہوا ٹھیک اپنی اس تاریخ پر آ گیا ہے جو قدرتی حساب سے اس کی اصل تاریخ ہے۔

[مذکورہ بالا] آیت میں نسی کو حرام اور ممنوع قرار دے کر جہلائے عرب کی ان دونوں اغراض کو باطل کر دیا گیا ہے۔ پہلی غرض تو ظاہر ہے کہ صریح طور پر ایک گناہ تھی، اُس کے تو معنی ہی یہ تھے کہ خدا کے حرام کیے ہوئے کو حلال بھی کر لیا جائے اور پھر حیلہ بازی کر کے پابندی قانون کی ظاہری شکل بھی بنا کر رکھ دی جائے۔ رہی دوسری غرض تو سرسری نگاہ میں وہ معصوم اور مبنی بر مصلحت نظر آتی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ بھی خدا کے قانون سے بدترین بغاوت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے عائد کردہ فرائض کے لیے شمسی حساب کے بجائے قمری حساب جن اہم مصالح کی بنا پر اختیار کیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے بندے زمانے کی گردشوں میں، ہر قسم کے حالات اور کیفیات میں اُس کے احکام کی اطاعت کے خوگر ہوں۔ مثلاً رمضان ہے، تو وہ کبھی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گرمی میں کبھی برسات میں اور کبھی سردیوں میں آتا ہے، اور اہل ایمان ان سب بدلتے ہوئے حالات میں روزے رکھ کر فرماں برداری کا ثبوت بھی دیتے ہیں اور بہترین اخلاقی تربیت بھی پاتے ہیں۔ اسی طرح حج بھی قمری حساب سے مختلف موسموں میں آتا ہے اور ان سب طرح کے اچھے اور برے حالات میں خدا کی رضا کے لیے سفر کر کے بندے اپنے خدا کی آزمائش میں پورے بھی اترتے ہیں اور بندگی میں پختگی بھی حاصل کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی گروہ اپنے سفر اور اپنی تجارت اور اپنے میلوں ٹھیلوں کی سہولت کی خاطر حج کو خوش گوار موسم میں ہمیشہ کے لیے قائم کر دے، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے مسلمان کوئی کانفرنس کر کے طے کر لیں کہ آئندہ سے رمضان کا مہینہ دسمبر یا جنوری کے مطابق کر دیا جائے گا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ بندوں نے اپنے خدا سے بغاوت کی اور خود مختار بن بیٹھے۔ اسی چیز کا نام کفر ہے۔ علاوہ بریں ایک عالم گیر دین جو سب انسانوں کے لیے ہے، آخر کس شمسی مہینے کو روزے اور حج کے لیے مقرر کرے؟ جو مہینہ بھی مقرر کیا جائے گا وہ زمین کے تمام باشندوں کے لیے یکساں سہولت کا موسم نہیں ہو سکتا کہیں وہ گرمی کا زمانہ ہو گا اور کہیں سردی کا۔ کہیں وہ بارش کا موسم ہو گا اور کہیں خشکی کا۔ کہیں فصلیں کاٹنے کا زمانہ ہو گا اور کہیں بونے کا۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۱۹۳-۱۹۴، التوبہ، حاشیہ ۳۷)

☐ **گھروں میں پچھواڑے سے داخلہ:** وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (البقرہ ۲:۱۸۹) یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہوتے ہو۔ نیکی تو اصل میں یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ شاید کہ تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔

من جملہ ان توہم پرستانہ رسموں کے، جو عرب میں رائج تھیں، ایک یہ بھی تھی کہ جب حج کے لیے احرام باندھ لیتے تو اپنے گھروں میں دروازے سے داخل نہ ہوتے تھے، بلکہ پیچھے سے دیوار کود کر یا دیوار میں کھڑکی سی بنا کر داخل ہوتے تھے۔ نیز سفر سے واپس آ کر بھی گھروں میں پیچھے سے داخل ہوا کرتے تھے۔ اس آیت میں نہ صرف اس رسم کی تردید کی گئی ہے، بلکہ تمام اوہام پر یہ کہہ کر ضرب لگائی گئی ہے کہ نیکی دراصل اللہ سے ڈرنے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچنے کا نام ہے۔ اُن بے معنی رسموں کو نیکی سے کوئی واسطہ نہیں، جو محض باپ دادا کی اندھی تقلید میں برتی جا رہی ہیں اور جن کا انسان کی سعادت و شقاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۱۴۹، البقرہ حاشیہ ۱۹۹)

نئی اصلاحات

☐ **زادِ راہ کی ہدایت:** زادِ راہ لیے بغیر حج کے لیے نکلنے کو ممنوع ٹھیرایا گیا اور ارشاد ہوا:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۠ (البقرہ ۲:۱۹۷) زادِ راہ ضرور لو کیونکہ (دنیا میں زادِ راہ نہ لینا زادِ آخرت نہیں)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بہترین زادِ آخرت تو تقویٰ ہے۔

□ **روزی کمانے کی اجازت:** سفر حج میں کمائی نہ کرنے کو جو نیکی کا کام سمجھا جاتا تھا، اور روزی کمانے کو ناجائز خیال کیا جاتا تھا اس کی تردید کی گئی:

لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ‌ؕ۔ (البقرہ ۲:۱۹۸) کوئی مضائقہ نہیں اگر تم کاروبار کے ذریعے سے اپنے رب کا فضل تلاش کرتے جاؤ۔

گونگے حج اور بھوکے پیاسے حج سے بھی روکا گیا، اور اس طرح جاہلیت کی دوسری تمام رسموں کو مٹا کر حج تقویٰ، خدا پرستی، پاکیزگی اور سادگی ودرویشی کا مکمل نمونہ بنا دیا گیا۔

□ **شریفانہ اطوار:** حاجیوں کو حکم دیا گیا کہ جب اپنے گھروں سے چلو تو اپنے آپ کو تمام دنیوی آلایشوں سے پاک کرلو، شہوات کو چھوڑ دو، بیوی کے ساتھ بھی اس زمانے میں تعلق زن وشو نہ رکھو۔ گالی گلوچ اور تمام بے ہودہ اعمال سے پرہیز کرو۔

□ **میقات کا تعین:** کعبے کی طرف آنے والے جتنے راستے ہیں، ان سب پر بیسیوں میل دور سے ایک ایک حد مقرر کر دی گئی کہ اس حد سے آگے بڑھنے سے پہلے سب لوگ اپنے اپنے لباس بدل کر احرام کا فقیرانہ لباس پہن لیں، تاکہ سب امیر وغریب یکساں ہو جائیں الگ الگ قوموں کے امتیازات مٹ جائیں، اور سب کے سب اللہ کے دربار میں ایک ہو کر، فقیر بن کر عاجزانہ شان کے ساتھ حاضر ہوں۔

□ **پرامن ماحول کی ہدایت:** احرام باندھنے کے بعد انسان کو خون بہانا تو درکنار، جانور تک کا شکار کرنا حرام کر دیا گیا تاکہ امن پسندی پیدا ہو، بہیمیت دور ہو جائے اور طبیعتوں پر روحانیت کا غلبہ ہو۔ حج کے چار مہینے اس لیے حرام کیے گئے کہ اس مدت میں کوئی لڑائی نہ ہو، کعبے کو جانے والے تمام راستوں پر امن رہے۔ اور زائرینِ حرم کو کوئی نہ چھیڑے۔ اس شان کے ساتھ جب حاجی حرم میں پہنچیں تو ان کے لیے کوئی میلا ٹھیلا، کھیل تماشا، ناچ رنگ وغیرہ نہیں ہے۔ قدم قدم پر خدا کا ذکر ہے، نمازیں ہیں، عبادتیں ہیں، قربانیاں ہیں، کعبے کا طواف ہے، اور کوئی پکار ہے تو بس یہ ہے: لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ. حاضر ہوں، میرے اللہ میں حاضر ہوں، حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، یقیناً تعریف سب تیرے ہی لیے ہے، نعمت سب تیری ہے۔ ساری بادشاہی تیری ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔

ایسے ہی پاک صاف، بے لوث اور مخلصانہ حج کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ. جس نے اللہ کے لیے حج کیا اور اس میں شہوات اور فسق وفجور سے پرہیز کیا وہ اس طرح پلٹا جیسے آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۷۷-۲۷۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

حکمت اور رُوح

مناسکِ حج اور ان کی اصل رُوح

ہر عبادت کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ظاہر سے مراد وہ عملی شکل ہے جو کسی عبادت کو ادا کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہے اور باطن سے مراد وہ معنی ہیں جو اس عملی شکل میں مضمر ہوتے ہیں اور جن کے اظہار کی خاطر عمل کی وہ شکل مقرر کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر نماز کا ظاہر یہ ہے کہ ہر آدمی قبلہ رخ کھڑا ہو، رکوع کرے، سجدہ کرے، بیٹھے اور وہ اذکار زبان سے ادا کرے جو اس عبادت کے لیے مقرر ہیں۔ان ظاہری افعال سے نماز کی جو شکل قائم کی جاتی ہے اس سے مقصود دراصل اس معنی کا اظہار ہے کہ بندہ اپنے رب کے حضور بندگی کا اعتراف کرنے کے لیے حاضر ہوا ہے، اس کے مقابلے میں اپنی انانیت سے دست بردار ہو رہا ہے۔ اس کی بڑائی اور اپنی عاجزی تسلیم کر رہا ہے اور اس کے آگے اپنے وہ معروضات پیش کر رہا ہے جو اس کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں۔ اب دیکھیے جو شخص نماز کی ظاہری شکل کو ٹھیک ٹھیک احکام و ہدایات کے مطابق قائم کر دے وہ بلاشبہ ادائے نماز کی قانونی شرائط پوری کر دیتا ہے۔ اس کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے نماز نہیں پڑھی، یا اس کے ذمے فرض باقی رہ گیا۔لیکن آپ غور کریں گے تو خود محسوس کریں گے کہ نماز کا پورا پورا فائدہ وہی شخص اٹھا سکتا ہے جو نماز کے اعمال میں سے ہر عمل کرتے وقت اس کی روح کو بھی نگاہ میں رکھے، اور نماز کے اذکار میں سے ہر ذکر کو زبان سے ادا کرتے ہوئے اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ رہے۔

ایسا ہی معاملہ حج کا ہے۔اس کو ادا کرنے کا جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے اس پر آپ خواہ سمجھ کر عمل کریں یا بے سمجھے بوجھے، بہرحال جب آپ شارع کے مقرر کردہ مناسک ادا کریں گے تو حج ادا ہو جائے گا، اور فرض سے یقیناً آپ سبک دوش ہو جائیں گے۔لیکن حج کی اس ظاہری شکل کے ہر ہر جز میں جو معنی پوشیدہ ہیں ان کو بھی اگر آپ اچھی طرح سمجھ لیں اور حج کے اعمال انجام دیتے وقت ہر عمل کی غرض و غایت کی طرف بھی متوجہ ہوں تو اس سے مقصدِ حج کی تکمیل ہو جائے گی اور آپ حج کے فوائد سے پوری طرح متمتع ہوں گے۔اسی غرض کے لیے میں آپ کے سامنے حج کے اعمال میں سے ایک ایک عمل کے معنی سیدھے، سادے اور مختصر طریقے سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

(خطباتِ حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۱۹-۲۰)

آٹھویں ذی الحجہ کی صبح کو تمام حاجی مکہ معظمہ سے حج کے لیے نکلتے ہیں اور جن لوگوں نے تمتع کرتے ہوئے عمرے کے بعد احرام کھول لیا تھا وہ بھی نئے سرے سے احرام باندھ لیتے ہیں۔اب اصل حج شروع ہوتا ہے۔یہ لاکھوں احرام بند حاجی بیک وقت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مکے سے چل کر لبیک لبیک کہتے ہوئے ۸ ذی الحجہ کو منیٰ جا اترتے ہیں۔ پھر یہی مجمع عظیم ۹ ذی الحج کی صبح کو بیک وقت لبیک لبیک کہتا ہوا چلتا ہے اور حدودِ حرم سے باہر جا کر عرفات کے میدان میں پڑاؤ ڈال دیتا ہے۔ پھر اسی روز شام کو یہ پورا مجمع اٹھتا ہے اور لبیک لبیک پکارتا ہوا مزدلفہ جا اترتا ہے۔ پھر ۱۰ ذی الحجہ کو طلوع آفتاب سے پہلے پہلے حاجیوں کا یہ سیلاب لبیک کہتا ہوا اٹھتا ہے اور منیٰ واپس پہنچ جاتا ہے۔ پھر یہ سب لوگ لبیک کہتے ہوئے جمرۂ عقبہ کی طرف چلتے ہیں اور اس پر سات کنکریاں مارتے ہیں۔ پھر یہ لوگ منیٰ ہی میں قربانی کرتے ہیں۔ پھر سب سر کے بال منڈواتے یا ترشواتے ہیں۔ پھر جوق در جوق مکہ معظمہ پہنچ کر طواف اور سعی کرتے ہیں۔ پھر منیٰ واپس ہو کر دو دن یا تین دن قیام کرتے ہیں اور ان ایام میں ہر روز تینوں جمروں پر رمی کرتے ہیں۔ یہی اعمال ہیں جن کا نام حج ہے۔

جو لوگ عبادت کے معنی اور حج کی حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ آخر یہ کیسی دوڑ دھوپ ہے جس کے لیے دنیا بھر سے کھینچ کر لاکھوں آدمیوں کو بلایا جاتا ہے؟ اور یہ کیا عبادت ہوئی کہ مکے سے اٹھے اور منیٰ پہنچ گئے، وہاں سے اٹھے اور عرفات جا ٹھہرے، پھر چلے اور مزدلفہ میں رات گزار دی، پھر منیٰ پہنچے اور وہاں ایک پتھر کو کنکریاں مار دیں؟ لیکن آپ ذرا سمجھنے کی کوشش کریں تو آپ پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ اس ساری دوڑ دھوپ میں جو زحمت آدمی کو پیش آتی ہے، جو تکلیفیں اس کو اٹھانا پڑتی ہیں، جس مشقت اور بے آرامی سے اس کو سابقہ درپیش ہوتا ہے، جس طرح وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بے ٹھکانے ہوتا چلا جاتا ہے، اللہ کی راہ میں یہی سب کچھ برداشت کرنا تو اصل عبادت ہے۔ عمرے میں طواف وسعی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ وہ فرداً فرداً کیا جاتا ہے۔ ایک فرد کے لیے ایک دن عرفات جا ٹھہرنا، ایک رات مزدلفہ میں گزار دینا اور دو چار روز منیٰ میں ٹھہر جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسی لیے عمرہ کرنے والے کو ان کاموں میں سے کوئی کام بھی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا لیکن حج میں لاکھوں آدمیوں کو بیک وقت یہ دوڑ دھوپ کرنا ہوتی ہے جس میں کوئی بڑے سے بڑا صاحبِ ثروت آدمی بھی زحمتیں اٹھائے اور آسایشوں سے محروم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حج کی اجتماعی عبادت میں طواف وسعی سے زائد یہ مناسک رکھے گئے ہیں۔ اس سے مقصود ہر بندۂ مومن میں یہ کیفیت پیدا کرنا ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے لیے ہر آسایش سے دست کش ہونے اور اس کی راہ میں ہر زحمت اٹھانے کے لیے تیار ہو جائے۔ یہی اللہ پر ایمان لانے کا تقاضا ہے۔ یہی بندگی کے معنی ہیں۔ اور یہی اس عبادت کی روح ہے۔ اس عبادت کے دوران میں جو شخص ان ساری تکلیفوں کو پورے اطمینان اور قلب و روح کی پوری مسرت کے ساتھ قبول کرتا ہے اور اپنے ساتھ کے حاجیوں کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کرتا بلکہ سخت کش مکش کے مواقع پر بھی صبر وضبط سے کام لیتا ہے اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتا ہے وہ حج کا ثواب لوٹ لیتا ہے۔ اور اس کے برعکس جو شخص اپنی ہر بے آرامی پر چیں بہ جبیں ہوتا ہے، ہر زحمت پر کبیدہ خاطر ہوتا ہے اور ساتھ کے حاجیوں سے اپنے آرام کی خاطر مزاحمت کرتا اور لڑتا جھگڑتا ہے وہ حج کے ثواب کو ضائع کر دیتا ہے۔ اس بے چارے کے حصے میں خالص مشقت ہی رہ جاتی ہے۔ اجر ہوا میں اڑ جاتا ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھیے کہ حج کے ان اعمال کو ادا کرتے وقت آپ خواہ کچھ بھی نہ پڑھیں اور وقت پر نماز ادا کرنے کے سوا کوئی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسرا عمل نہ کریں، تب بھی حج پورا ہو جائے گا اور بجائے خود حج کا جو ثواب ہے وہ آپ کو مل جائے گا۔ مگر بدقسمت ہے وہ شخص جسے اللہ سے تقرب حاصل کرنے کا یہ نادر موقع نصیب ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مکہ معظمہ سے نکلنے کے بعد یوم النحر کی پہلی رمی تک بہترین ذکر یہ ہے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ تلبیہ کرے[1] اور اس شعور کے ساتھ کرے کہ میرا مولیٰ اب منیٰ بلا رہا ہے تو میں حاضر ہوں، اب عرفات بلا رہا ہے تو اس کے لیے بھی حاضر ہوں، اب مزدلفہ بلا رہا ہے تو اس کے لیے بھی حاضر ہوں اور اب رمی کے لیے منیٰ طلب کر رہا ہے تو اس کے لیے بھی حاضر۔ ہر مرتبہ لبیک کہتے ہوئے آپ محسوس کریں کہ رب العالمین کی طرف سے آپ کی طلبی ہو رہی ہے اور آپ اس کے جواب میں کہہ رہے ہیں کہ میں حاضر ہوں۔ اس احساس کے ساتھ جب آپ بار بار لبیک کہیں گے تو ان شاء اللہ آپ کے دل میں ذوق و شوق کی وہ کیفیت پیدا ہوگی اور روح اس کے اندر وہ لذت پائے گی جس کے مقابلے میں ہر لذت ہیچ ہو جائے گی۔

تلبیہ کے علاوہ بیچ بیچ میں کثرت سے اللہ کی حمد اور تکبیر و تحلیل کرتے جائیے، کثرت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجیں۔ کثرت سے اپنے حق میں، اپنے والدین کے حق میں، اور سب مومنین و مومنات کے حق میں دعائے مغفرت کیجیے۔ اور خاص طور پر وقوفِ عرفہ کے آخری وقت میں اور قیام مزدلفہ کی رات میں تو اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کے ذکر اور دعا و استغفار میں صرف کر دیجیے۔ پھر ایام تشریق میں منیٰ کے قیام کا زمانہ فضول مشاغل میں نہ ضائع کیجیے، بلکہ اسے خیر اور صلاح کی تبلیغ میں، دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ روابط پیدا کرنے میں، اور اعلائے کلمۃ الحق کی فکر و سعی میں صرف کیجیے تاکہ حج کے روحانی و اخلاقی فوائد کا کوئی پہلو بھی چھوٹنے نہ پائے۔

(خطباتِ حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۳۲-۳۶)

مناسکِ حج اور دُعائیں

یہ بات بھی جان لیجیے کہ ان مناسک کو ادا کرتے ہوئے بھی اللہ کا ذکر اور اس سے دعا کا سلسلہ برابر جاری رہنا چاہیے۔

آپ زم زم کا پانی پییں تو اللہ سے دعا کریں کہ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ رِزْقاً وَّاسِعاً، وَعِلْماً نَافِعًا وَ شِفَاءً مِنْ کُلِّ دَاءٍ خدایا، میں تجھ سے فراخ روزی، نفع بخش علم، اور ہر بیماری سے شفا مانگتا ہوں۔

صفا پر چڑھیں تو کعبے کی طرف رخ کر کے کہیں:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اللّٰہُ اَکْبَرُ، اللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ عَلٰی مَا ھَدَانَا وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی مَا اَوْلَانَا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ یُحْیِی وَ یُمِیْتُ بِیَدِہِ الْخَیْرُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ، اَنْجَزَ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ. لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ لَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ، مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ. اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اسی کے لیے ساری تعریف ہے۔ ہم اللہ کی بڑائی کرتے

۱۔ تلبیہ کے معنی ہیں لبّیک لبّیک کہنا۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں اس شکر میں کہ اس نے ہمیں ہدایت بخشی اور اس کی تعریف کرتے ہیں ان احسانات پر جو اس نے ہم پر کیے ہیں۔ اللہ وحدہ لاشریک کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی بادشاہی ہے اور اس کے لیے حمد ہے، وہی جلاتا اور مارتا ہے۔ اس کے اختیار میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ کوئی معبود اکیلے اللہ کے سوا نہیں ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی اور سارے جتھوں کو اسی اکیلے نے شکست دے دی۔ کوئی معبود اللہ کے سوا نہیں، ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔ اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے، خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

یہی کچھ آپ مروہ پر بھی کہیں، اور صفا و مروہ کے درمیان چلتے ہوئے یہ دعا کرتے جائیں:

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَ تَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَ عَزُّ الْاَ کْرَمُ۔ اے رب! بخش دے اور رحم کر، ہمارے ان سارے قصوروں سے درگزر فرما جو تیرے علم میں ہیں، تو سب پر غالب اور بڑا کریم ہے۔

(خطباتِ حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۳۱-۳۲)

احرام

سفر کا ایک حصہ ختم کر چکنے کے بعد ایک خاص حد ایسی آتی ہے جس سے کوئی مسلمان جو مکہ جانا چاہتا ہو، احرام باندھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ احرام کیا ہے؟ ایک فقیرانہ لباس، جس میں ایک تہبند، ایک چادر اور جوتی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک جو کچھ تم تھے سو تھے مگر اب جو تمھیں خدا کے دربار میں جانا ہے تو فقیر بن کر چلو۔ ظاہر میں بھی فقیر بنو اور دل کے فقیر بھی بننے کی کوشش کرو۔ رنگین کپڑے اور آرایش کے لباس اُتارو۔ سادہ اور درویشانہ طرز کا لباس پہن لو۔ موزے نہ پہنو۔ سر کھلا رکھو۔ خوشبو نہ لگاؤ۔ بال نہ بناؤ۔ ہر قسم کی زینت سے پرہیز کرو۔ عورت اور مرد کا تعلق بند کر دو، بلکہ ایسی حرکات و سکنات اور ایسی باتوں سے بھی پرہیز کرو جو اس تعلق کا شوق یا اس کی یاد دلانے والی ہوں۔ شکار نہ کرو، بلکہ شکاری کو شکار کا نشان دینے یا اس کا پتا بتانے سے بھی اجتناب کرو۔ ظاہر میں جب یہ رنگ اختیار کرو گے تو باطن پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ اندر سے تمھارا دل بھی فقیر بنے گا، کبر و غرور نکلے گا، مسکینی اور امن پسندی پیدا ہوگی، دنیا اور اس کی لذتوں میں پھنسنے سے جو کچھ آلایشیں تمھاری روح کو لگ گئی تھیں وہ صاف ہوں گی اور خدا پرستی کی کیفیت تمھارے اوپر بھی طاری ہوگی اور اندر بھی۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۸۴-۲۸۵)

اعمالِ حج میں سب سے پہلا عمل احرام ہے۔ باہر سے آنے والا کوئی حاجی میقات سے اُس وقت تک نہیں گزر سکتا جب تک وہ اپنا لباس اتار کر احرام نہ باندھ لے اور اسی طرح مکہ معظمہ سے حج کی نیت کرنے والے کو بھی سب سے پہلے لباس تبدیل کر کے احرام باندھنا ہوتا ہے۔ یہ ایک انتہائی فقیرانہ لباس ہے جس میں آدمی بس ایک تہبند باندھ لیتا ہے، ایک چادر کندھوں پر ڈال لیتا ہے، اور سر ننگا رکھتا ہے۔ یہ اس عمل کی ظاہری صورت ہے، مگر غور سے دیکھیے کہ اس ذرا سے فعل میں کتنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ حج شروع کرنے سے پہلے ہمارے وہ سارے لبادے اتروا دینا چاہتا ہے جو ہم نے اپنے اوپر ڈال رکھے ہیں، جن کے اندر ہم میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو اپنی اصل حقیقت سے کچھ نہ کچھ زائد بنا رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم بندے ہو اور بندے سے بڑھ کر کچھ نہیں ہو۔ لہٰذا میرے دربار میں حاضر ہونا چاہتے ہو تو صرف بندے بن کر آؤ۔ تم کہیں کے بادشاہ یا صدرِ مملکت ہو تو ہوا کرو۔ کوئی جنرل ہو، وزیر ہو، رئیس ہو، یا جو کچھ بھی ہو، ہوتے رہو۔ میرے حضور میں تمھیں یہ ساری حیثیتیں ختم کر کے صرف ایک بندے کی حیثیت سے آنا ہوگا۔ اس طرح احرام کا یہ لباس ہر انسان کو بندگی کے مقام پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے، اُس کی ہر شانِ امتیاز مٹا دیتا ہے، اور ایک بڑے سے بڑے شخص کو بھی ایک ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی سطح پر لے آتا ہے۔ آپ حالتِ احرام میں حاجیوں کے کسی مجمعے پر نگاہ ڈال کر دیکھیں تو آپ کو کسی طرح یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ ان میں کون اونچا اور کون نیچا ہے، کون امیر اور کون غریب ہے، کون حاکم اور کون محکوم ہے۔ اللہ کے دربار میں سب ایک ہی طرح کے فقیر نظر آئیں گے۔

اونچ نیچ برابر کرنے کے ساتھ یہ احرام مسلمانوں کے درمیان تمام قومی، نسلی اور وطنی امتیازات بھی ختم کر دیتا ہے۔ اسلام کے ماننے والے دنیا کے ہر حصے سے چل کر آتے ہیں۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب، ہر طرف سے ملک ملک کے لوگ طرح طرح کے لباس پہنے ہوئے اپنے گھروں سے چلتے ہیں۔ مگر جوں ہی کہ وہ مرکزِ اسلام سے ایک خاص فاصلے پر پہنچتے ہیں، ان کو یکایک میقات کی سرحد پر روک کر ان کے تمام قومی لباس اُتروا دیے جاتے ہیں اور سب کو ایک ہی طرح کا لباس پہنا دیا جاتا ہے تاکہ خداوند عالم کے دربار میں جب وہ حاضر ہوں تو انسان اور مسلمان کے سوا اور کچھ نہ ہوں۔ مسلمانوں کے اندر ملتِ واحدہ ہونے کا احساس پیدا کرنے کی اس سے زیادہ کارگر تدبیر شاید ہی کوئی دوسری ہو سکے۔ آپ کے سامنے لاکھوں حاجیوں کا ایک سیلِ رواں ہوتا ہے جس میں سیکڑوں قومیتوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ گزر رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہ احرام کی برکت ہے کہ ہر دیکھنے والی نگاہ ان کو ایک ملت اور ایک ہی قوم کی حیثیت سے دیکھتی ہے اور ان کے سارے دنیوی امتیازات دب کر رہ جاتے ہیں۔

پھر یہ احرام آدمی کو حیوانیت سے دور اور ملائکہ کے مقام سے قریب کر دیتا ہے۔ اس حالت میں وہ کوئی جُوں تک نہیں مار سکتا، کوئی بال تک نہیں اکھاڑ سکتا۔ کسی جانور کا شکار خود کرنا تو درکنار دوسرے کو کسی قسم کی مدد بھی شکار میں نہیں دے سکتا۔ اپنے جسم کی زینت و آرایش بھی اس کے لیے جائز نہیں رہتی۔ اس کی اپنی بیوی بھی اس کے لیے حرام ہو جاتی ہے جو عام حالات میں اس کے لیے حلال ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس کی طرف کسی شہوانی میلان تک کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے فحش گوئی، بدکلامی، لڑائی جھگڑا، سب کچھ ممنوع ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے خادم کو بھی ڈانٹنے کا مجاز نہیں رہتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ احرام باندھتے ہی وہ اللہ کا فقیر بن گیا اور اس نے تمام خواہشاتِ نفس کو تیاگ دیا۔ اب دنیا کی ہر چیز کو اس کی طرف سے امن و سلامتی کا پیغام ہے۔ اب کسی کو اس سے ضرر کا اندیشہ نہیں۔ اب وہ کسی کے لیے بھی جبار و قہار اور ظالم نہیں رہا۔ اب وہ دنیا کی لذتوں سے کنارہ کش ہونے اور کبریائی کا ہر شائبہ اپنے نفس سے نکال دینے کے بعد بس ایک بندۂ عاجز ہے جو اپنے خدا کے حضور اپنی نیاز مندی پیش

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرنے کے لیے جارہا ہے۔

حضرات! یہ ہے احرام کی اصل روح۔ آپ جب غسل یا وضو کر کے احرام باندھتے ہیں اور ان قواعد کی پابندی کرتے ہیں جو حالتِ احرام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، تو اس سے عمل کی صرف ظاہری شکل قائم ہوتی ہے۔ یہ شکل بناتے ہوئے آپ کا ذہن اس تصور سے خالی ہو کہ یہ شکل آپ نے کیوں بنائی ہے تو یہ گویا ایک جسم ہوگا جس میں جان نہ ہو۔ جان اس میں اسی وقت پڑے گی جب آپ پورے شعور اور ارادے کے ساتھ اپنے اندر وہ باطنی کیفیات بھی پیدا کر لیں جو درحقیقت احرام سے مقصود ہیں۔ قانون کی نگاہ میں تو ہر شخص مُحرِم ہے جس نے احرام کی پابندیوں میں سے کسی کو نہ توڑا ہو۔ مگر خدا کی نگاہ میں اصل محرم وہی ہے جو احرام باندھتے ہی فی الواقع ایک فقیر اور ایک بندۂ عاجز بن کر رہ گیا ہو، جس نے اپنے دماغ سے کبریائی کی ہوا نکال دی ہو، جس نے قومی و نسلی تعصبات کو بھی اپنے ذہن سے نکال باہر کیا ہو، جو خلقِ خدا کے لیے سراپا رحم اور خیر مجسم بن گیا ہو اور جس نے حیاتِ دنیا کی زینتوں سے منہ موڑ کر کم از کم یہ چند دن تو صرف اپنے رب سے لو لگانے کے لیے خالی کر لیے ہوں۔

(خطباتِ حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۲۰-۲۳)

تلبیہ

احرام باندھنے کے ساتھ جو کلمات حاجی کی زبان سے نکلتے ہیں، جن کو وہ ہر نماز کے بعد، اور ہر بلندی پر چڑھتے وقت، ہر پستی کی طرف اُترتے وقت، اور ہر قافلے سے ملتے وقت اور ہر روز صبح نیند سے بیدار ہو کر بلند آواز سے پکارتا ہے، وہ یہ ہیں: لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ۔ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَا شَرِیْکَ لَکَ۔ حاضر ہوں، میرے اللہ حاضر ہوں، حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، یقیناً تعریف سب تیرے ہی لیے ہے۔ نعمت سب تیری ہے، اور ساری بادشاہی تیری ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

یہ دراصل حج کی اس ندائے عام کا جواب ہے جو ساڑھے چار ہزار برس...... پہلے حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے حکم سے کی تھی۔ پینتالیس صدیاں گزر چکی ہیں۔ جب پہلے پہل اللہ کے اُس منادی نے پکارا تھا کہ اللہ کے بندو! اللہ کے گھر کی طرف آؤ، زمین کے ہر گوشے سے آؤ، خواہ پیدل آؤ خواہ سواریوں پر آؤ۔ جواب میں آج تک حرمِ پاک کا ہر مسافر بلند آواز سے کہہ رہا ہے: میں حاضر ہوں، میرے اللہ میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں صرف تیری طلبی پر حاضر ہوں، تعریف تیرے لیے ہے، نعمت تیری ہے، ملک تیرا ہے، کسی چیز میں تیرا کوئی شریک نہیں۔

اس طرح لبیک کی ہر صدا کے ساتھ حاجی کا تعلق سچی اور خالص خدا پرستی کی اُس تحریک سے جُڑ جاتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے وقت سے چلی آرہی ہے۔ ساڑھے چار ہزار برس کا فاصلہ بیچ میں سے ہٹ جاتا ہے۔ یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اُدھر اللہ کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ پکار رہے ہیں اور اِدھر سے یہ جواب دے رہا ہے۔ جواب دیتا جاتا ہے اور بڑھتا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جاتا ہے۔ جوں جوں آگے بڑھتا ہے شوق کی کیفیت اور زیادہ تیز ہوتی جاتی ہے۔ ہر چڑھاؤ اور ہر اُتار پر اس کے کانوں میں اللہ کے منادی کی آواز گونجتی ہے اور یہ اُس پر لبیک کہتا ہوا آگے چلتا ہے۔ ہر قافلہ اُسے وہیں کا پیامی معلوم ہوتا ہے اور ایک عاشق کی طرح یہ اس کا پیغام سن کر پکارتا ہے: میں حاضر، میں حاضر۔

ہر نئی صبح اس کے لیے گویا پیغام دوست لاتی ہے اور نور کے تڑکے میں آنکھ کھولتے ہی یہ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کی صدا لگانے لگتا ہے۔ غرض یہ بار بار کی صدا احرام کے اس فقیرانہ لباس، سفر کی اس حالت اور منزل بہ منزل کعبے کے قریب تر ہوتے جانے کی اس کیفیت کے ساتھ مل کر کچھ ایسا سماں باندھ دیتی ہے کہ حاجی عشقِ الٰہی میں از خود رفتہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل کی یہ حالت ہوتی ہے کہ بس ایک یادِ دوست کے سوا: آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۸۵-۲۸۶)

احرام باندھنے کے بعد آپ تلبیہ شروع کر دیتے ہیں......

[اس کے] الفاظ پر غور کیجیے۔ ان کے اندر خود یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ غلام کو اس کے آقا نے طلب کیا ہے اور غلام اس کے جواب میں لبیک لبیک کہتا ہوا اور اپنے مالک کی تعریف کے گُن گاتا ہوا دوڑا چلا جا رہا ہے بیت اللہ کی طرف طلبی ہوئی، اس نے عرض کیا: میں حاضر، عرفات بلایا گیا اس نے کہا: میں حاضر، مزدلفہ طلب کیا گیا، اس نے کہا: میں حاضر، منٰی طلب کیا گیا، اس نے کہا: میں حاضر، اس ساری دوڑ دھوپ کے دوران میں یہ الفاظ آپ زبان سے کہتے رہیں تو قانون کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ مگر اس تلبیہ کی اصل روح یہ ہے کہ ان الفاظ کو زبان سے ادا کرتے ہوئے اپنے دل کی گہرائیوں میں فی الواقع آپ یہ محسوس کریں کہ آپ اللہ کے بندے اور غلام ہیں، اس کی طرف سے آپ کی طلبی ہوئی ہے۔ اور جہاں جہاں حاضر ہونے کی طلبی ہوتی جا رہی ہے وہاں آپ لبیک لبیک کہتے ہوئے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اس لبیک میں ایک نشہ ہے جو لازماً ہر بندۂ حق پر طاری ہو جائے گا جسے یہ احساس ہو کہ خداوندِ عالم کی طرف سے اُس جیسی ناچیز ہستی کی طلبی ہو رہی ہے۔

یہ نصیب! اللہ اکبر!! لوٹنے کی جائے ہے۔

حرم کی حاضری

باہر سے آنے والے ہر حاجی کی فطری خواہش یہ ہوتی ہے، اور یہی اس کو کرنا بھی چاہیے کہ مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد جلدی سے جلدی حرم میں حاضر ہو۔ پھر جب وہ حرم میں داخل ہوتا ہے اور بیت اللہ پر اس کی نظر پڑتی ہے تو اس کے دل پر ایک ہیبت طاری ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے جلال کا کرشمہ ہے، اور اس کا دل بے اختیار خانہ کعبہ کی طرف کھچتا ہے جو اللہ جل شانہ کی محبت کا فطری تقاضا ہے۔ اس موقع پر اسے دل اور زبان سے اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اللّٰہُ اَکْبَرُ کہنا چاہیے اور پورے شعور کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہیے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اَللّٰھُمَّ زِدْھٰذَا الْبَیْتَ تَعْظِیْماً وَ تَشْرِیْفًا وَ تَکْرِیْماً وَ مَھَابَۃً وَبِرًّا۔ خدایا، اس گھر کو زیادہ سے زیادہ عظمت وشرف اور بزرگی اور دبدبہ عطا فرما اور اسے زیادہ سے زیادہ نیکیوں کا مرکز بنا دے۔

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ، وَ مِنْکَ السَّلَامُ، فَحَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ خدایا تو خود ہر عیب ونقص سے پاک ہے، اور عیوب وآفات سے سلامتی جس کو بھی نصیب ہوتی ہے تیری ہی طرف سے نصیب ہوتی ہے، لہٰذا اے پروردگار! ہمیں جسم وروح کی سلامتی کے ساتھ جینے کی توفیق عطا فرما۔

ضروری نہیں ہے کہ یہ دعائیں آپ عربی زبان ہی میں مانگیں۔ اصل چیز ان الفاظ کو زبان سے ادا کرنا نہیں ہے بلکہ اس مضمون کی دعا اللہ سے مانگنا ہے جو ان فقروں میں بیان کیا گیا ہے۔ آپ کو عربی الفاظ یاد کرنے اور پڑھنے میں دقت ہو تو آپ اسی مضمون کی دعا اپنی زبان میں بھی مانگ سکتے ہیں۔

(خطباتِ حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۲۳-۲۵)

طوافِ زیارت

اس شان سے حاجی مکہ پہنچتا ہے اور جاتے ہی سیدھا اُس آستانے کا رخ کرتا ہے جس کی طرف بلایا گیا تھا۔ آستانِ دوست کو چومتا ہے، پھر اپنے عقیدے، اپنے ایمان، اپنے دین و مذہب کے اُس مرکز کے گرد چکر لگاتا ہے اور ہر چکر آستانہ بوسی سے شروع اور آستانہ بوسی پر ختم کرتا جاتا ہے[1]۔ اس کے بعد مقامِ ابراہیمؑ پر دو رکعتیں سلامی کی پڑھتا ہے، پھر وہاں سے نکل کر کوہِ صفا پر چڑھتا ہے اور وہاں سے جب کعبے پر نظر پڑتی ہے تو پکار اُٹھتا ہے:

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ لَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْکَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ کوئی معبود نہیں اللہ کے سوا، کسی دوسرے کی ہم بندگی نہیں کرتے، ہماری اطاعت صرف اللہ کے لیے خاص ہے خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۸۶-۲۸۷)

حرم میں پہنچنے کے بعد ہر حاجی کو طواف کرنا ہوتا ہے۔ اگر احرام باندھتے وقت اس نے تمتع[2] یا قران کی نیت کی ہو تو وہ عمرے کا طواف کرتا ہے۔ اور اگر اِفراد (یعنی صرف حج) کی نیت کی ہو تو طوافِ قدوم کرتا ہے پھر یوم النحر کو اسے طوافِ اِفاضہ اور

۱- حجرِ اسود کے بوسے پر نادان لوگ اکثر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی تو ایک طرح کی بت پرستی ہے۔ حالانکہ یہ دراصل آستانہ بوسی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خانہ کعبہ کا طواف حجرِ اسود کے سامنے سے شروع کیا جاتا ہے اور سات طواف کرنے کے دوران میں ہر طواف کے خاتمے پر حجرِ اسود کو بوسہ دیا جاتا ہے، یا اس کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ اس میں ذرہ برابر بھی کوئی شائبہ اس کالے پتھر کی پرستش کا نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کا یہ قول مشہور ہے کہ انھوں نے حجرِ اسود کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ میں جانتا ہوں تو محض ایک پتھر ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے نہ چوما ہوتا تو میں ہرگز تجھے نہ چومتا۔ (مؤلف)

۲- تمتع یہ ہے کہ آدمی عمرہ کر کے احرام کھول لے اور پھر حج کا وقت آنے پر نئے سرے سے احرام باندھے۔ اور قران یہ ہے کہ آدمی ایک ہی احرام میں عمرہ اور حج دونوں کرے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مکہ چھوڑتے وقت طواف وداع بھی کرنا ہوتا ہے اور ان ضروری طوافوں کے علاوہ بھی یہ ایک ایسی نفلی عبادت ہے جس کا موقع باہر سے آنے والوں کو صرف زمانۂ قیامِ مکہ ہی میں نصیب ہوسکتا ہے، اس لیے اس موقع سے جتنا بھی فائدہ اٹھایا جاسکے اٹھانا چاہیے۔

یہ طواف کیا ہے؟ یہ انسان کے اس فطری جذبے کا اظہار ہے کہ جس ہستی کو وہ اپنا منعم ومحسن سمجھتا ہے اور اپنا معبود مانتا ہے اس پر اپنے آپ کو فدا کرے، اس کے گرد گھومے اور صدقے اور قربان ہو۔ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود اس سے بالاتر ہے کہ ہم اسے پا سکیں اور اس کے گرد گھوم سکیں۔ اس نے ہمارے اس جذبے کی تسکین کے لیے اس خانۂ کعبہ کو اپنا گھر قرار دیا ہے اور ہمیں ہدایت کی ہے کہ مجھ پر فدا ہونے کی جو خواہش تمہارے دل میں ہے اسے میرے اس گھر کا طواف کرکے پورا کرلو۔ پس جب آپ اس گھر کا طواف کریں تو عشق کے جذبے سے سرشار ہوکر اس طرح طواف کیجیے جیسے ایک عاشق اپنے محبوب حقیقی کے صدقے ہورہا ہے۔

ہر طواف کی ابتدا حجرِ اسود کے بوسے یا استلام سے ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت ایک پتھر کا بوسہ نہیں ہے بلکہ محبوب کے سنگِ آستاں کا بوسہ ہے۔

اسی طرح طواف اور مقام ابراہیم کی دو رکعتوں سے فارغ ہونے کے بعد ملتزم سے چمٹ کر جو دعائیں مانگی جاتی ہیں وہ بھی یہی سمجھتے ہوئے مانگنی چاہییں کہ یہ ہمارے مالک کے گھر کی چوکھٹ ہے۔ مالک خود تو اس سے بالاتر ہے کہ ہم اس کا دامن تھام سکیں۔ ہماری نارسائی پر ترس کھا کر اس نے یہ گھر ہمارے لیے بنادیا ہے تاکہ اس کے دامن سے لپٹ کر اپنی آرزوئیں پیش کرنے کی جو تمنا ہمارے دل میں ہے اُسے ہم اُس کے گھر کی چوکھٹ سے لپٹ کر پورا کرلیں۔

طواف کے دوران میں پڑھنے کے لیے جو لمبی چوڑی دعائیں بعض لوگوں نے لکھی ہیں، ان کا یاد کرنا اور پڑھنا کچھ ضروری نہیں ہے۔ اور یہ طریقہ تو بالکل ہی فضول ہے کہ ایک معلم آگے آگے دعا پڑھتا جارہا ہے اور حاجیوں کی ایک ٹولی کی ٹولی اس کی غلط سلط نقل اتارتی جارہی ہے۔ طواف کے لیے ان دعاؤں کو شریعت نے ہرگز لازم نہیں کیا ہے، اور نہ اس بے معنی طریقے سے ان کو ادا کرنے کا کوئی فائدہ ہے۔ بس یہ کافی ہے کہ آپ طواف شروع کرتے وقت حجر اسود کے سامنے کھڑے ہوکر نماز کی طرح ہاتھ اٹھائیں اور بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ لِلّٰہِ الْحَمْدُ کہ کر طواف شروع کردیں، پھر دورانِ طواف میں اللہ کا ذکر کرتے چلے جائیں اور اس سے دعا مانگتے جائیں۔ ذکر کے لیے سُبْحَانَ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور اَللّٰہُ اَکْبَرُ کے الفاظ کافی ہیں۔ کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ دعا جو کچھ بھی آپ کے دل سے نکلے اور جس زبان میں بھی آپ مانگ سکیں، مانگتے رہیں۔

حجر اسود کا بوسہ دینے کے لیے جو ہجوم اور دھکا پیل لوگ کرتے ہیں یہ ایک ناروا فعل ہے، بلکہ اس میں ایک دوسرے کی جو سخت مزاحمت کی جاتی ہے وہ توجہ کے ضائع کرنے والی حرکت ہے خصوصاً عورتوں کا اس دھکا پیل میں گھسنا تو بالکل ہی ناجائز ہے۔ شریعت نے آپ پر لازم نہیں کیا ہے کہ آپ ضرور حجر اسود کو بوسہ ہی دیں۔ یہ کام اگر مزاحمت کے بغیر نہ ہوسکتا ہو تو ہر چکر کے خاتمے پر حجر اسود کے سامنے پہنچ کر اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرنا اور اپنے ہاتھ ہی کو چوم لینا شرعاً بالکل کافی ہے۔

جس طواف کے بعد سعی کرنی ہو اس میں اضطباع اور رمل بھی کیا جاتا ہے۔ اضطباع یہ ہے کہ احرام کی چادر کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سیدھے ہاتھ کے نیچے سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال لیا جائے اور دایاں شانہ کھلا رکھا جائے اور رمل یہ ہے کہ پہلے تین طواف شانے ہلا ہلا کر چھوٹے چھوٹے قدم ڈالتے ہوئے ذرا تیزی کے ساتھ کیے جائیں۔ یہ دراصل اس واقعے کی یادگار ہے جو صلح حدیبیہ کی قرارداد کے مطابق جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے مکہ معظمہ تشریف لائے تھے تو کفار مکہ نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ مدینے کی آب و ہوا نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ پہلے تین طوافوں میں اضطباع اور رمل کریں تاکہ کفار کے سامنے اہلِ اسلام کی طاقت کا مظاہرہ ہو۔ اسی یادگار کو آج تک باقی رکھا گیا ہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ بندے کا اکڑ کر چلنا ویسے تو اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے، مگر جب اس کے دشمنوں کے سامنے اسلام کی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے یہ چال اختیار کی جائے تو پھر یہی چال اللہ کو محبوب ہو جاتی ہے۔

مقامِ ابراہیمؑ میں نفل

طواف سے فارغ ہونے کے بعد آپؑ مقامِ ابراہیمؑ پر پہنچتے ہیں اور وہاں دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ اس مقام پر جو پتھر رکھا ہے یہ وہی پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانۂ کعبہ کی دیواریں اٹھائی تھیں، پھر اسی پر کھڑے ہو کر انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ویران و سنسان مقام پر تمام خلق کو حج کے لیے پکارا تھا۔ پہلے یہ پتھر خانۂ کعبہ کی دیوار سے متصل رکھا ہوا تھا۔ بعد میں اسے موجودہ مقام پر رکھ دیا گیا۔ اس مقام کے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اسے نماز کی جگہ بنا لو۔ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى [البقرۃ ۲:۱۲۵] طواف کعبہ کے بعد یہ دو رکعتیں اسی فرمانِ خداوندی کی تعمیل میں پڑھی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی آپ کے علم میں رہنی چاہیے کہ تمام دنیا کے لیے قبلہ مسجدِ حرام ہے اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے والوں کے لیے خانہ کعبہ ہے، اور مسجدِ حرام کی نماز باجماعت کے لیے امام کا قبلہ وہ مقام ہے جہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا کو حج کے لیے پکارا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود بھی اسی مقام پر کھڑے ہو کر کعبے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اور آج بھی حرم کی نمازِ باجماعت کا امام اسی جگہ کھڑا ہوتا ہے۔

(خطباتِ حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۲۵-۲۸)

سعی صفا و مروہ

پھر وہ [یعنی حاجی] صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتا ہے، گویا اپنی حالت سے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ یوں ہی اپنے مالک کی خدمت میں اور یوں ہی اس کی خوشنودی کی طلب میں ہمیشہ سعی کرتا رہے گا۔ اس سعی کے دوران میں بھی اس کی زبان سے نکلتا ہے: اَللّٰھُمَّ اسْتَعْمِلْنِیْ بِسُنَّةِ نَبِیِّکَ وَ تَوَفَّنِیْ عَلٰی مِلَّتِهٖ وَ اَعِذْنِیْ مِنْ مُضِلَّاتِ الْفِتَنِ۔ خدایا! مجھ سے کام لے اُسی طریقے پر جو تیرے نبی کا طریقہ ہے، اور مجھے موت دے اسی راستے پر جو تیرے نبی کا راستہ ہے، اور زندگی میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مجھے بچا ان فتنوں سے جو راہِ راست سے بھٹکانے والے ہیں۔

اور کبھی کہتا ہے: رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ، اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَکْرَمُ۔ پروردگار! معاف کر اور رحم کر، میرے جن قصوروں کو تو جانتا ہے اُن سے درگزر کر، تیری طاقت سب سے بڑھ کر ہے اور تیرا کرم بھی سب سے بڑھ کر۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۸۷)

مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کرنے اور ملتزم پر دعا کرنے کے بعد آپ زم زم پر آتے ہیں اور اس کا پانی پیتے ہیں۔ پھر عمرے کی تکمیل کے لیے صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کرتے ہیں یہ سب کام آپ غفلت و بے خبری کے ساتھ نہ کریں بلکہ اپنے دل میں سوچیں کہ یہ زم زم کیا ہے جہاں آپ کھڑے ہیں، یہ پانی کیسا ہے جسے آپ پی رہے ہیں، یہ صفا کیسی پہاڑی ہے جس سے آپ سعی کی ابتدا کرتے ہیں، اور یہ سات چکر کیسے ہیں جو آپ صفا اور مروہ کے درمیان لگاتے ہیں۔

ان میں سے ہر مقام اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے اور اس تاریخ کے اندر ایک درسِ عبرت ہے۔ آج بیت اللہ اور زم زم اور مقامِ ابراہیم علیہ السلام جس جگہ واقع ہیں، یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی حضرت ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچے حضرت اسماعیل کو صرف ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلا کھجوروں کا دے کر بالکل یکہ وتنہا چھوڑ گئے تھے۔ یہاں کوئی پانی نہ تھا، کوئی غذا کا سامان نہ تھا۔ دور دور کوئی بستی نہ تھی۔ اور بظاہر یہ دونوں ماں اور بچہ اس سنسان وادی میں قطعی بے سہارا تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب انھیں چھوڑ کر واپس جانے لگے تو حضرت ہاجرہؓ ان کے پیچھے چلیں۔ بار بار پوچھتی تھیں کہ آپ ہمیں کہاں چھوڑے جا رہے ہیں، مگر وہ خاموش چلے جا رہے تھے۔ آخر حضرت ہاجرہؓ نے پوچھا: کیا یہ کام آپ اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں؟ انھوں نے فرمایا ہاں۔ اس پر حضرت ہاجرہؓ نے کہا، اگر یہ بات ہے تو اللہ یقیناً ہمیں ضائع نہ ہونے دے گا۔ پھر وہ پورے اطمینان کے ساتھ اللہ کے بھروسے پر اپنے بچے کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اس وادی سے نکلنے لگے تو پلٹ کر انھوں نے وادی کی طرف رخ کیا اور اللہ سے دعا مانگی:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ ○ (ابراہیم ۱۴: ۳۷) اے پروردگار! میں نے اپنی نسل کا ایک حصہ ایک بے آب و گیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے قریب لا بسایا ہے۔ اے پروردگار! یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ یہاں نماز قائم کریں۔ پس تو ایسا کر، کہ لوگوں کے دل ان کی طرف کھچیں۔ اور ان کو پھلوں سے رزق دے تاکہ یہ شکر گزار ہوں۔

دیکھیے کیا شانِ تسلیم و رضا اور کیا شانِ توکل علی اللہ تھی اس شوہر اور باپ کی جس نے اللہ رب العالمین کا اشارہ پاتے ہی اپنی بیوی اور بچے کو ٹھنڈے دل سے اس بے آب و گیاہ وادی میں لا کر چھوڑ دیا اور کس درجے کا یقین و اعتماد اپنے خدا پر تھا اس خاتون کو جو یہ معلوم ہونے کے بعد بالکل مطمئن ہو گئی کہ اسے اور اس کے ننھے بچے کو اللہ کے حکم سے یہاں یکہ وتنہا چھوڑا جا رہا ہے۔

جب پانی اور کھجوروں کا ذخیرہ ختم ہو گیا اور دونوں ماں اور بچہ بھوک پیاس سے تڑپنے لگے تو حضرت ہاجرہؓ اسی زم زم کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مقام پر بچے کو لٹا کر صفا کی پہاڑی پر پہنچیں تا کہ چاروں طرف نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ کہیں کوئی مدد کرنے والا ہے؟ پھر صفا سے اتر کر مروہ کی طرف دوڑیں اور اس پر چڑھ کر پھر انھوں نے چاروں طرف دیکھا کہ شاید کوئی مدد کرنے والا نظر آ جائے۔ اس طرح ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان وہ مسلسل سات دفعہ دوڑیں۔ آخری مرتبہ جب وہ مروہ پر تھیں تو انھوں نے ایک آواز سنی۔ یقین نہ آیا کہ یہ واقعی کسی کی آواز ہے۔ پھر کان لگا کر سنا اور وہی آواز آئی۔ زم زم کی طرف دیکھا جہاں بچے کو لٹا کر گئی تھیں تو ایک شخص نظر آیا جو دراصل اللہ کا فرشتہ تھا۔ اس نے زمین پر پاؤں مارا اور یکا یک ایک چشمہ نکل آیا۔ پھر اس نے حضرت ہاجرہؓ سے کہا، اطمینان رکھو، اللہ ضائع کرنے والا نہیں ہے، یہاں اللہ کا گھر بننے والا ہے جسے تمھارا یہ لڑکا اور اس کا باپ تعمیر کرے گا۔

اسی واقعے کی یادگار یہ سعی بین الصفا والمروہ ہے جو آج عمرے اور حج میں کی جاتی ہے۔ حضرت ہاجرہؓ نے صفا سے سعی کی ابتدا کی تھی، اس لیے ہماری سعی بھی اسی سے شروع ہوتی ہے۔ انھوں نے سات چکر لگائے تھے، اس لیے ہم بھی سات چکر لگاتے ہیں۔ انھوں نے سعی کے بعد آ کر پانی پیا تھا، کیونکہ اس سے پہلے یہاں پانی موجود نہ تھا۔ ہم سعی سے پہلے اللہ تعالیٰ کے معجزے سے پیدا ہونے والا یہ پانی پیتے ہیں، کیونکہ اب وہ موجود ہے۔ یہ سارے کام جو حضرت ہاجرہؓ کے اس فعل کی نقل کے طور پر کیے جاتے ہیں، ان کی اصل روح یہ ہے کہ ہم اپنے اندر وہی تسلیم و رضا، وہی توکل علی اللہ اور وہی یقین و اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کریں جس کا حیرت انگیز مظاہرہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ہاجرہؓ نے کیا تھا۔ ہمیں جب یہ معلوم ہو جائے کہ کسی کام کا حکم اللہ جل شانہ کی طرف سے ہے تو پھر کوئی خطرہ اور کوئی اندیشہ ہمیں اس کی تعمیل سے باز نہ رکھ سکے۔ ہم پورے یقین کے ساتھ اس بھروسے پر چھلانگ لگا دیں کہ خدا جس نے اس ظاہری خطرے میں کود جانے کا ہمیں حکم دیا ہے وہ ہمیں ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ ہماری بھلائی اسی کام میں ہے جس کا اس نے حکم دیا ہے۔ یہ درس جس نے بھی یہاں سے حاصل کر لیا وہ آبِ زم زم پینے اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑنے کے سارے روحانی فوائد لوٹ لے گیا۔

(خطباتِ حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۲۸-۳۱)

وقوفِ منیٰ، عرفات اور مزدلفہ

اس کے بعد وہ گویا اللہ کا سپاہی بن جاتا ہے اور اب پانچ چھ روز اس کو کیمپ کی سی زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ ایک دن منیٰ میں پڑاؤ ہے، دوسرے دن عرفات میں کیمپ ہے اور خطبے میں کمانڈر کی ہدایات سنی جا رہی ہیں، رات مزدلفہ میں جا کر چھاؤنی ڈالی جاتی ہے۔

رمیِ جمار

دن نکلتا ہے تو منیٰ کی طرف کوچ ہوتا ہے اور وہاں اُس ستون پر کنکریوں سے چاند ماری کی جاتی ہے جہاں تک اصحاب فیل کی فوجیں کعبے کو ڈھانے کے لیے پہنچ گئی تھیں۔ ہر کنکری مارنے کے ساتھ اللہ کا سپاہی کہتا جاتا ہے: اَللّٰہُ اَکْبَرُ رَغْمًا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لِلشَّيْطَانِ وَحِزْبِهٖ اور اَللّٰهُمَّ تَصْدِيقًا بِكِتَابِكَ وَ اِتِّبَاعًا لِسُنَّةِ نَبِيِّكَ۔

کنکریوں کی اس چاند ماری کا مطلب یہ ہے کہ خدایا جو تیرے دین کو مٹانے اور تیرا بول نیچا کرنے اٹھے گا، میں اُس کے مقابلے میں تیرا بول بالا کرنے کے لیے یوں لڑوں گا۔

تحلیل

پھر اسی جگہ قربانی کی جاتی ہے تاکہ راہِ خدا میں خون بہانے کی نیت اور عزم کا اظہار عمل سے ہو جائے۔ قربانی کے بعد احرام کھل جاتا ہے جو کچھ حرام کیا گیا تھا وہ اب پھر حلال ہو جاتا ہے اور معمول کی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ نہا دھو کر اور معمول کا لباس پہن کر حاجی پھر کعبے کا رخ کرتا ہے جیسے سپاہی اپنی ڈیوٹی ادا کر کے ہیڈ کوارٹر کی طرف سرخ رو واپس آ رہا ہے۔ طواف اور سعی کے بعد حاجی پھر منیٰ میں جا کر رات کو قیام کرتا ہے اور دوسرے دن پتھر کے ان تین ستونوں پر باری باری کنکریوں سے پھر چاند ماری کرتا ہے جن کو جمرات کہتے ہیں اور جو دراصل اُس ہاتھی والی فوج کی پسپائی اور تباہی کی یادگار ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے سال عین حج کے موقع پر اللہ کے گھر کو ڈھانے آئی تھی اور جسے اللہ کے حکم سے آسمانی چڑیوں نے کنکریاں مار مار کر تباہ کر دیا تھا۔[1] تیسرے دن پھر ان ستونوں پر سنگ باری کرنے کے بعد حاجی مکہ پلٹتا ہے اور سات دفعہ اپنے دین کے مرکز کا طواف کرتا ہے۔ یہ طواف وداع ہے اور اس سے فارغ ہونے کے معنی حج سے فارغ ہو جانے کے ہیں۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۸۸-۲۸۹)

۞ ۞ ۞

۱- عام طور پر مشہور یہ ہے کہ کنکریاں مارنے کا یہ فعل اس واقعے کی یادگار میں کیا جاتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پیش آیا تھا۔ یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی دیتے وقت شیطان نے آ کر آپ کو بہکایا تھا اور آپ نے اسے کنکریاں ماری تھیں، یا جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فدیے میں مینڈھا آپ کو قربانی کے لیے دیا گیا تو وہ نکل کر بھاگا تھا اور اس کو آپ نے کنکریاں ماری تھیں۔ لیکن کسی صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نہیں ہے کہ رمی جمار کی علت یہ ہے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

اہمیت اور فوائد

اللہ تعالیٰ نے ہم پر کوئی عبادت ایسی فرض نہیں فرمائی ہے جس میں بے شمار روحانی، اخلاقی، اجتماعی، تمدنی اور مادی فوائد نہ ہوں۔ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات کے لیے تو کسی کی عبادت کی کوئی حاجت نہیں ہے۔اس نے جو عبادت بھی بندوں پر فرض کی ہے وہ خود بندوں ہی کی بھلائی کے لیے ہے۔اللہ کی ذات ہر احتیاج سے بالاتر اور ہر نفع اور فائدے کی ضرورت سے بلند تر ہے۔لیکن جتنی عبادتیں بھی اس نے فرض کی ہیں ان کا ایک تو مقصدِ اصلی ہے جس کے لیے وہ فرض کی گئی ہیں اور اس کے علاوہ وہ بے شمار ضمنی فائدے ہیں جو ان عبادات کے انجام دینے سے آپ سے آپ حاصل ہوتے ہیں۔اب اگر کوئی شخص نادانی سے ان ضمنی فائدوں ہی کو اصل مقصد قرار دے بیٹھے اور اس غایت اصلی کو فوت کر دے جس کے لیے وہ عبادات مقرر کی گئی ہیں تو حقیقت میں وہ اپنی عبادات کو ضائع کرتا ہے۔اس کی عبادت سرے سے عبادت ہی نہیں رہتی۔

روزے کے بے شمار اخلاقی، روحانی اور جسمانی فوائد ہیں لیکن اگر کوئی شخص روزہ اس لیے رکھے کہ اس کی صحت اچھی ہو جائے گی تو حقیقت میں وہ کوئی عبادت نہیں کرتا۔وہ تو بس ایک فاقہ کرتا ہے جو صحت درست کرنے کے لیے ڈاکٹر کی تجویز سے یا خود اپنی رائے سے اس نے کرنا شروع کر دیا ہے۔اس طرح اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے اور اس میں اس کے پیش نظر یہ بات ہوتی ہے کہ اس کی عادات میں باقاعدگی پیدا ہو جائے گی، اس کے اوقات میں نظم وضبط پیدا ہو جائے گا یا اسی طرح کا کوئی اور فائدہ اس کی نگاہ میں ہے،تو حقیقت میں وہ کوئی عبادت نہیں کرتا،جس فائدے کو اس نے نگاہ میں رکھا ہے وہ چاہے اس کو حاصل ہو بھی جائے لیکن عبادات کا کوئی اجر اُس کو نہیں پہنچتا۔ایسا ہی معاملہ حج کا بھی ہے۔اس کے جو اخلاقی، روحانی، اجتماعی، تمدنی اور مادی فوائد ہیں، اگر کوئی شخص ان میں سے کسی فائدے ہی کو اپنا مقصود قرار دیتا ہے تو حقیقت میں وہ کوئی حج کرتا ہی نہیں ہے۔اس کی یہ عبادت سرے سے عبادت ہی نہیں ہے۔تمام عبادتوں کا مقصود اصلی تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی بندگی پیش کرنا ہے۔اس کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔اگر بندے کو اللہ کی رضا حاصل ہو جائے تو اس کی عبادت کا اصل مقصد پورا ہو گیا۔لیکن اگر وہ عبادات میں اپنی ساری دوڑ دھوپ کے باوجود اللہ کی رضا پانے سے محروم رہ گیا تو حقیقت میں اس کی ساری محنت ہی اکارت گئی۔اس نے عبادت کے حقیقی مقصد اور اصلی فائدے کو ضائع کر دیا۔اس لیے یاد رکھیے کہ عبادات سے ضمنی فوائد کا حاصل ہونا یا نہ ہونا بجائے خود مقصود نہیں ہے۔سب سے پہلا کام یہ ہے کہ......... ہر شخص حج اپنی نیت کو خالص اور پاک کر کے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کو مقصود سمجھتے ہوئے انجام دے۔اگر کسی شخص نے نیت کے اخلاص اور ارادے کی درستی کے ساتھ حج کیا اور کوئی بڑا اجر نہیں، صرف اپنی مغفرت ہی حاصل کر لے گیا تو حقیقت میں وہ کامیاب ہے۔اس کے آگے یہ سراسر اللہ کا فضل واحسان ہے کہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ کسی آدمی کو اس پر مزید اجر اور بلند مراتب سے بھی نواز دے۔ بہر حال ایک آدمی کو حج کے ذریعے سے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کر لینا ہی بہت بڑی کامیابی ہے............

آج کل حج کے بارے میں بعض نئے نئے فلسفے پیش کیے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کے خیال میں حج اس لیے فرض کیا گیا ہے کہ اس سے دراصل مسلمانوں کی ایک بین الاقوامی سالانہ کانفرنس کرانا مقصود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی ایک سالانہ کانفرنس کے جو کچھ فوائد بھی کوئی شخص اپنے ذہن میں سوچ سکتا ہے، اس سے ہزار گنے زیادہ فوائد حج سے عملاً حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی کوئی کانفرنس دراصل حج کا حقیقی مقصود نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ حج کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو عرب کی سیاحت کرنے کا، اس کے تاریخی مقامات دیکھنے کا اور اس کے تہذیبی اور تمدنی زندگی کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے حج کو ضائع کرتا ہے۔ اگر اس کے دل میں حج کے مقصد کی حیثیت سے ایسی کوئی غرض اور نیت شامل ہو جائے تو فی الحقیقت اس کی یہ عبادت سرے سے عبادت ہی نہیں رہے گی......اپنے ذہن میں اس خیال کو بٹھائیے کہ ہمارا اصل مقصود اللہ کے رضا حاصل کرنا اور اس کے حضور اپنے جذبۂ عبودیت کو پیش کرنا ہے۔

(خطبات حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۳۷-۳۹)

فریضۂ حج کی اہمیت

قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔

(آل عمران ۳:۹۷) اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی قدرت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جس نے کفر کیا تو اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

اس آیت میں قدرت رکھنے کے باوجود قصداً حج نہ کرنے کو کفر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس کی شرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دو حدیثوں سے ہوتی ہے:

مَنْ مَلَكَ زَادًا وَّرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ اَنْ يَّمُوْتَ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا۔ جو شخص زادِراہ اور سواری رکھتا ہو جس سے بیت اللہ تک پہنچ سکتا ہو اور پھر حج نہ کرے تو اس کا اس حالت پر مرنا اور یہودی یا نصرانی ہو کر مرنا یکساں ہے۔

مَنْ لَّمْ يَمْنَعْهُ مِنَ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ اَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ اَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ فَمَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ اِنْ شَآءَ يَهُوْدِيًّا وَ اِنْ شَآءَ نَصْرَانِيًّا۔ جس کو نہ کسی صریح حاجت نے حج سے روکا ہو، نہ کسی ظالم سلطان نے، نہ کسی روکنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

والے مرض نے اور پھر اس نے حج نہ کیا ہو اور اسی حالت میں اُسے موت آ جائے تو اُسے اختیار ہے خواہ یہودی بن کر مرے یا نصرانی بن کر۔

اور اسی کی تفسیر حضرت عمرؓ نے کی جب کہا کہ جو لوگ قدرت رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتے، میرا جی چاہتا ہے کہ ان پر جزیہ لگا دوں۔ وہ مسلمان نہیں ہیں، وہ مسلمان نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان اور رسولؐ وخلیفۂ رسولؐ کی اس تشریح سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ فرض ایسا فرض نہیں ہے کہ جی چاہے تو ادا کیجیے اور نہ چاہے تو ٹال دیجیے بلکہ یہ ایسا فرض ہے کہ ہر اس مسلمان کو جو کعبے تک جانے آنے کا خرچ رکھتا ہو اور ہاتھ پاؤں سے معذور نہ ہو، عمر میں ایک مرتبہ اسے لازماً ادا کرنا چاہیے۔ خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں ہو اور خواہ اس کے اوپر بال بچوں کی اور اپنے کاروبار یا ملازمت وغیرہ کی کیسی ہی ذمہ داریاں ہوں۔ جو لوگ قدرت رکھنے کے باوجود حج کو ٹالتے رہتے ہیں اور ہزاروں مصروفیتوں کے بہانے کر کر کے سال پر سال یوں ہی گزارتے چلے جاتے ہیں ان کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ رہے وہ لوگ جن کو عمر بھر کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ حج بھی کوئی فرض ان کے ذمے ہے، دنیا بھر کے سفر کرتے پھرتے ہیں۔ کعبۂ یورپ کو آتے جاتے حجاز کے ساحل سے بھی گزر جاتے ہیں جہاں سے مکہ صرف چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے، اور پھر بھی حج کا ارادہ تک اُن کے دل میں نہیں گزرتا، وہ قطعاً مسلمان نہیں ہیں۔ جھوٹ کہتے ہیں اگر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، اور قرآن سے جاہل ہے جو انھیں مسلمان سمجھتا ہے۔ ان کے دل میں اگر مسلمانوں کا درد اٹھتا ہے تو اُٹھا کرے، اللہ کی اطاعت اور اس کے حکم پر ایمان کا جذبہ تو بہر حال ان کے دل میں نہیں ہے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۷۹-۲۸۱)

بندگی کی مختلف شکلوں کا مجموعہ

......اللہ کے حضور بندگی پیش کرنے کی دنیا میں جتنی شکلیں بھی ممکن ہیں وہ ساری کی ساری اللہ تعالیٰ نے حج میں جمع کر دی ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ ایک آدمی جس وقت حج کا ارادہ کرتا ہے اگر وہ خالصتاً اللہ کی رضا چاہنے کا ارادہ کر رہا ہے تو اس کا یہ عزمِ سفر بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ کوئی دنیوی مقصد لے کر گھر سے نہیں نکل رہا ہے۔ اس کے پیش نظر کوئی تجارتی غرض نہیں ہے اور نہ اسے سیر و سیاحت ہی کا شوق چرایا ہے۔ اس نے ہزاروں میل کا سفر کرنے کا ارادہ صرف اس لیے کیا ہے کہ اللہ کی عبادت کرے اور اس کی رضا جوئی کے لیے تگ و دو کرے۔

□ **ہجرت:** ......ایک آدمی جب حج کے لیے نکلتا ہے تو اپنے بال بچوں کو چھوڑتا ہے۔ اپنا گھر بار، اپنا کاروبار، اپنے اعزہ واقربا اور اپنے دوست احباب، غرض بے شمار علائق وروابط کو توڑ کر نکلتا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اللہ کی عبادت انجام دے اور اس کی خوشنودی تلاش کرے۔ اس طرح ہجرت کا اجر اس کو آپ سے آپ مل جاتا ہے، ہجرت کے جو اخلاقی اور روحانی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فوائد اور منافع ہیں وہ سارے کے سارے اس کو حاصل ہو جاتے ہیں، کیونکہ اس کی حیثیت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو شخص اللہ کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑ دیتا ہے۔

□ **جانی قربانی:**......ایک شخص جب مکہ معظمہ پہنچتا ہے تو اس جگہ وہ بے شمار مختلف عبادات انجام دیتا ہے۔ پانچوں اوقات کی نمازیں تو بہر حال وہ آپ سے آپ پڑھتا ہی ہے، لیکن اس کے علاوہ وہ بیت اللہ کا طواف بھی کرتا ہے جس سے اس کو اللہ تعالیٰ پر قربان ہونے اور اپنے آپ کو صدقہ کرنے کا اجر نصیب ہوتا ہے۔

□ **آستانہ بوسی:** وہ حجر اسود کو بھی چومتا ہے اور اس طرح اسے اللہ تعالیٰ کی آستانہ بوسی کا شرف حاصل ہوتا ہے وہ مُلتزَم سے بھی چمٹتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ کی چوکھٹ سے چمٹ رہا ہے اور اس سے دعائیں مانگ رہا ہے۔

□ **جہاد:** اس کے علاوہ وہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتا ہے۔ اس سے اس کو اللہ کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے کا اجر ملتا ہے۔ اس طریقے سے اس کو اللہ سے دعا کرنے، اس کے گھر کے گرد طواف کرنے اور اس کی راہ میں سعی وجہد کرنے کا اجر حاصل ہوتا ہے۔ پھر ان عبادات کے علاوہ حج کے دوران میں وہ منیٰ سے عرفات اور عرفات سے مزدلفہ آتا ہے۔ مزدلفہ سے پھر منیٰ جاتا ہے۔ یہ ساری دوڑ دھوپ جہاد سے مشابہت رکھتی ہے جس طرح ایک آدمی جہاد کے لیے گھر سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکلتا ہے، راستے کی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ میدانِ جنگ کی سختیاں جھیلتا ہے، قریب قریب اسی طرح صعوبتیں اور محنتیں اور مشقتیں آدمی کو اس تمام دوران میں انگیز کرنی ہوتی ہیں۔ اس طریقے سے وہ گویا جہاد فی سبیل اللہ کے اجر کا مستحق بنتا ہے پھر وہ یوم النحر کو (قربانی کے روز) قربانی کرتا ہے۔ اس طرح اس کو قربانی کا اجر بھی حاصل ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ حج جامع عبادات ہے۔ دنیا میں آج تک جتنی ممکن قسم کی عبادتیں انسانوں نے کسی معبود کو پیش کی ہیں وہ ساری کی ساری یہاں ایک بندۂ مومن صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کرتے ہوئے انجام دیتا ہے۔ اسی بنا پر حج کو سب سے بڑی عبادت بھی قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگر یہ عبادت انجام دے کر کوئی شخص اپنے گناہوں کی مغفرت ہی حاصل کر لے تو درحقیقت یہ اس کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

(خطباتِ حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۳۹-۴۱)

......قرآنِ مجید میں جہاں یہ ذکر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حج کی عام منادی کرنے کا حکم دیا تھا، وہاں اس حکم کی پہلی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (الحج ۲۲:۲۸) تاکہ لوگ یہاں آ کر دیکھیں کہ اس حج میں اُن کے لیے کیسے کیسے فائدے ہیں۔

یعنی یہ سفر کر کے اور اس جگہ جمع ہو کر وہ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں کہ یہ انھی کے نفع کے لیے ہے اور اس میں جو فائدے پوشیدہ ہیں ان کا اندازہ کچھ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آدمی یہ کام کر کے خود دیکھ لے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے متعلق روایت ہے کہ جب تک انھوں نے حج نہ کیا تھا، انھیں اس معاملے میں تردّد تھا کہ اسلامی عبادات میں سب سے افضل کون سی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عبادت ہے، مگر جب انھوں نے خود حج کر کے اُن بے حد حساب فائدوں کو دیکھا جو اس عبادت میں پوشیدہ ہیں، تو بے تامل پکار اُٹھے کہ یقیناً حج سب سے افضل ہے.........

سفرِ حج کی نوعیت

دنیا کے لوگ عموماً دو ہی قسموں کے سفروں سے واقف ہیں۔ ایک سفر وہ جو روٹی کمانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ دوسرا وہ جو سیر و تفریح کے لیے کیا جاتا ہے۔ ان دونوں قسم کے سفروں میں اپنی غرض اور اپنی خواہش آدمی کو باہر نکلنے پر آمادہ کرتی ہے۔ گھر چھوڑتا ہے تو اپنی غرض کے لیے، بال بچوں اور عزیزوں سے جدا ہوتا ہے تو اپنی خاطر، مال خرچ کرتا ہے یا وقت صرف کرتا ہے تو اپنے مطلب کے لیے۔ لہٰذا اس میں قربانی کا کوئی سوال نہیں ہے۔ مگر یہ سفر جس کا نام حج ہے، اس کا معاملہ اور سب سفروں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ سفر اپنی کسی غرض کے لیے یا اپنے نفس کی خواہش کے لیے نہیں ہے، بلکہ صرف اللہ کے لیے ہے اور اس فرض کو ادا کرنے کے لیے ہے جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ اس سفر پر کوئی شخص اس وقت تک آمادہ ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کے دل میں اللہ کی محبت نہ ہو، اس کا خوف نہ ہو، اور اس کے فرض کو فرض سمجھنے کا خیال نہ ہو۔ پس جو شخص اپنے گھر بار سے ایک لمبی مدت کے لیے علیٰحدگی، اپنے عزیزوں سے جدائی، اپنے کاروبار کا نقصان، اپنے مال کا خرچ، اور سفر کی تکلیفیں گوارا کر کے حج کو نکلتا ہے، اُس کا نکلنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے اندر خوفِ خدا اور محبتِ خدا بھی ہے اور فرض کا احساس بھی، اور اُس میں یہ طاقت بھی موجود ہے کہ اگر کسی وقت خدا کی راہ میں نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ نکل سکتا ہے، تکلیفیں اٹھا سکتا ہے، اپنے مال اور اپنی راحت کو خدا کی خوشنودی پر قربان کر سکتا ہے۔

نیکی اور تقویٰ کی رغبت

پھر جب وہ ایسے پاک ارادے سے سفر کے لیے تیار ہوتا ہے تو اس کی طبیعت کا حال کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ جس دل میں خدا کی محبت کا شوق بھڑک اٹھا ہو اور جس کو اُدھر کی لو لگ گئی ہو اُس میں پھر نیک ہی نیک خیال آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ گناہوں سے توبہ کرتا ہے اور لوگوں سے اپنا کہا سنا بخشواتا ہے۔ کسی کا حق اُس پر آتا ہو تو اُسے ادا کرنے کی فکر کرتا ہے تا کہ خدا کے دربار میں بندوں کے حقوق کا بوجھ لادے ہوئے نہ جائے۔ برائی سے اس کے دل کو نفرت ہونے لگتی ہے اور قدرتی طور پر بھلائی کی طرف رغبت بڑھ جاتی ہے۔ پھر سفر کے لیے نکلنے کے ساتھ ہی جتنا جتنا وہ خدا کے گھر کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے اتنا ہی اس کے اندر نیکی کا جذبہ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اُس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی کو اس سے اذیت نہ پہنچے اور جس کی جتنی خدمت یا مدد ہو سکے کرے۔ بدکلامی و بے ہودگی، بے حیائی، بددیانتی اور جھگڑا فساد کرنے سے خود اس کی اپنی طبیعت اندر سے رکتی ہے کیونکہ وہ خدا کے راستے میں جا رہا ہے۔ حرمِ الٰہی کا مسافر ہو اور پھر برے کام کرتا ہوا جائے، ایسی شرم کی بات کسی سے کیسے ہو؟ اُس کا یہ سفر پورے کا پورا عبادت ہے، اس عبادت کی حالت میں ظلم و فسق کا کیا کام؟ پس دوسرے تمام سفروں کے برعکس یہ ایسا سفر ہے جو ہر دم آدمی کے نفس کو پاک کرتا رہتا ہے، اور یوں سمجھو کہ یہ ایک بہت بڑا اصلاحی کورس ہے جس سے لازماً ہر اُس مسلمان کو گزرنا ہوتا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے جو حج کے لیے جائے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۸۲-۲۸۴)

پرہیزگاری اور تقویٰ کی افزایش

جب ایک ایک حاجی حج کی نیت کرتا ہے اور اس نیت کے ساتھ ہی اس پر خوفِ خدا اور پرہیزگاری اور توبہ واستغفار اور نیک اخلاقی کے اثرات چھانے شروع ہوتے ہیں، اور وہ اپنے عزیزوں، دوستوں، معاملہ داروں اور ہر قسم کے متعلقین سے اس طرح رخصت ہوتا اور اپنے معاملات صاف کرنا شروع کرتا ہے کہ گویا اب یہ وہ پہلا سا شخص نہیں ہے، بلکہ خدا کی طرف لو لگ جانے کی وجہ سے اس کا دل پاک صاف ہو رہا ہے، تو اندازہ کیجیے کہ ایک ایک حاجی کی اس حالت کا کتنے کتنے لوگوں پر اثر پڑتا ہو گا۔ اور اگر ہر سال دنیا کے مختلف حصوں میں ایک لاکھ آدمی بھی اوسطاً اس طرح حج کے لیے تیار ہوتے ہوں تو ان کی تاثیر کتنے لاکھ آدمیوں کے اخلاق تک پہنچتی ہوگی۔ پھر حاجیوں کے قافلے جہاں جہاں سے گزرتے ہوں گے، وہاں اُن کو دیکھ کر، ان سے مل کر، اُن کی لبیک لبیک کی آوازیں سن کر کتنوں کے دل گرماجاتے ہوں گے، کتنوں کی توجہ اللہ کی طرف اور اللہ کے گھر کی طرف پھر جاتی ہوگی، اور کتنوں کی سوئی ہوئی روح میں حج کے شوق سے حرکت پیدا ہو جاتی ہوگی۔ پھر جب یہ لوگ اپنے مرکز سے پھر کر اپنی اپنی بستیوں کی طرف دنیا کے مختلف حصوں میں حج کی کیفیتوں کا خمار لیے ہوئے پلٹتے ہوں گے اور لوگ ان سے ملاقات کرتے ہوں گے تو ان کی زبانِ حال اور زبانِ قال سے اللہ کے گھر کا ذکر سن کر کتنے بے شمار حلقوں میں دینی جذبات تازہ ہو جاتے ہوں گے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۹۳)

بے عیب حج

مغفرت کی حد تک حج کا فائدہ حاصل کرنے کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ آپ بے عیب حج کریں۔ بے عیب حج سے مراد یہ ہے کہ آدمی حج کے دوران میں ہر قسم کی برائیوں سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ غیبت سے پرہیز کرے، گالی دینے سے اور باہم جھگڑا کرنے سے بچے۔ حج میں انسان کو جو سب سے بڑی مشقت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسے مناسک حج کی ادائیگی میں قدم قدم پر رکاوٹوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ایک ہی وقت میں لاکھوں آدمیوں کو یہ مناسک ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اب چوں کہ اس موقع پر لوگوں کا غیر معمولی ہجوم ہوتا ہے اور ہر کوئی ایک تگ ودو میں لگا ہوتا ہے، اس لیے اس عالم میں ہر وقت اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے دانستہ یا نادانستہ کوئی تکلیف پہنچ جائے، یا کسی کو اپنا کوئی کام انجام دینے میں زحمت پیش آئے۔ ایسے تمام مواقع پر ہر شخص کو نہایت ضبط وتحمل سے کام لینا چاہیے اور کسی صورت میں بھی تنگ دلی اور تنگ مزاجی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس عالم میں اس بات کی سخت ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی اپنے نفس پر ضبط

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرے۔ باہم گالم گلوچ اور دنگے فساد سے پوری طرح بچے اور اس امر کی کوشش کرے کہ اس کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اور اگر کسی کی ذات سے اس کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو وہ اس کو صبر کرنے کے ساتھ برداشت کرے۔ یہ کم سے کم وہ چیز ہے جو آدمی کے حج کو بے عیب بناتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ۔ (البقرہ ۲:۱۹۷) یعنی جو شخص حج کے مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدعملی اور کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو۔

حج کے دوران میں آدمی کا سب سے بڑا امتحان اسی معاملے میں ہوتا ہے۔ اور جو آدمی حج میں لڑائی جھگڑا کرتا ہے، دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بنتا ہے اور دوسروں سے پہنچنے والی تکالیف پر صبر نہیں کرتا وہ اپنے حج کے اجر کو بہت بڑی حد تک ضائع کر دیتا ہے۔

اس کے آگے اگر کوئی شخص خوبیوں والا حج کرنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ اللہ کا ذکر کرنے میں صرف کرے۔ بیٹھا ہوا فضول گپیں نہ ہانکے، بے کار قصہ گوئی نہ کرے۔ کسی کی برائی کرنا تو بڑی چیز ہے، محض دنیاوی معاملات پر ہر وقت باتیں کرتے رہنا بھی حج کے اجر و ثواب کو کم کر دیتا ہے۔ اونچے درجے کا خوبیوں والا حج اگر آپ کو مطلوب ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے اوقات کا زیادہ سے زیادہ حصہ اللہ کا ذکر کرنے میں، نمازیں پڑھنے میں، قرآن مجید کی تلاوت کرنے میں، نیکی اور بھلائی کی باتیں کرنے میں، لوگوں کو اللہ کا دین سمجھانے میں اور ان کو منکرات اور فواحش سے روکنے میں صرف کریں۔ اگر آپ ان کاموں میں اپنے اوقات صرف کرتے ہوئے حج کریں گے تو ان شاء اللہ وہ حج، خوبیوں والا حج ہو گا اور اس پر آپ بہت بڑے اجر کے مستحق ہو سکیں گے۔

(خطباتِ حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۴۱-۴۳)

حج کے اثرات

[اس] ساری تفصیل سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ حج کے ارادے اور اس کی تیاری سے لے کر اپنے گھر واپس آنے تک، دو تین مہینے کی مدت میں، کتنے زبردست اثرات آدمی کے دل اور دماغ پر پڑتے ہیں۔ اس میں وقت کی قربانی ہے، مال کی قربانی ہے، آرام و آسایش کی قربانی ہے، بہت سے دنیوی تعلقات کی قربانی ہے، بہت سی نفسانی خواہشوں اور لذتوں کی قربانی ہے، اور یہ سب کچھ اللہ کی خاطر ہے، کوئی ذاتی غرض اس میں شامل نہیں۔ پھر اس سفر میں پرہیزگاری و تقویٰ کے ساتھ مسلسل خدا کی یاد اور خدا کی طرف شوق و عشق کی جو کیفیت آدمی پر گزرتی ہے وہ اپنا ایک مستقل نقش دل پر چھوڑ جاتی ہے جس کا اثر برسوں قائم رہتا ہے۔ پھر حرم کی سرزمین میں پہنچ کر قدم قدم پر انسان اُن لوگوں کے آثار دیکھتا ہے جنھوں نے اللہ کی بندگی و اطاعت میں اپنا سب کچھ قربان کیا۔ دنیا بھر سے لڑے، مصیبتیں اُٹھائیں، جلاوطن ہوئے، ظلم پر ظلم سہے، مگر بالآخر اللہ کا کلمہ بلند کر کے چھوڑا اور ہر اس باطل قوت کا سرنیچا کر کے ہی دم لیا جو انسان سے اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرانا چاہتی تھی۔ ان آیاتِ بینات اور ان آثار متبرکہ کو دیکھ کر ایک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خدا پرست آدمی عزم و ہمت اور جہاد فی سبیل اللہ کا جو سبق لے سکتا ہے، شاید کسی دوسری چیز سے نہیں لے سکتا۔ پھر طواف کعبہ سے اس مرکزِ دین کے ساتھ جو وابستگی ہوتی ہے اور مناسکِ حج میں دوڑ دھوپ، کوچ اور قیام سے مجاہدانہ زندگی کی جو مشق کرائی جاتی ہے اسے اگر آپ نماز اور روزے اور زکوٰۃ کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو کہ یہ ساری چیزیں کسی بہت بڑے کام کی ٹریننگ ہیں جو اسلام مسلمانوں سے لینا چاہتا ہے۔ اسی لیے ہر اُس مسلمان پر جو کعبے تک جانے آنے کی قدرت رکھتا ہو، حج لازم ہو گیا ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو ہر زمانے میں زیادہ سے زیادہ مسلمان ایسے موجود رہیں جو اس پوری ٹریننگ سے گزر چکے ہوں۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۸۹-۲۹۰)

حج کے لیے اذنِ عام اور اس کے تمدنی فوائد

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰي كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ (الحج ۲۲: ۲۷-۲۸) اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دو[1] کہ وہ تمھارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں[2] پر سوار آئیں، تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں۔

□ **مَنَافِعَ کا مفہوم**: اس سے مراد صرف دینی فائدے ہی نہیں ہیں بلکہ دنیوی فائدے بھی ہیں۔ یہ اسی خانہ کعبہ اور اس کے حج کی برکت تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک ڈھائی ہزار برس کی مدت میں عربوں کو ایک مرکزِ وحدت حاصل رہا جس نے ان کی عربیت کو قبائلیت میں بالکل گم ہو جانے سے بچائے رکھا۔ اس کے مرکز سے وابستہ ہونے اور حج کے لیے ہر سال ملک کے تمام حصوں سے آتے رہنے کی بدولت ان کی زبان ایک رہی، ان کی تہذیب ایک رہی، ان کے اندر عرب ہونے کا احساس باقی رہا، اور ان کو خیالات، معلومات اور تمدنی طریقوں کی اشاعت کے مواقع ملتے رہے۔ پھر یہ بھی اسی حج کی برکت تھی کہ اس عام بدامنی میں کم از کم چار مہینے ایسے امن کے میسر آجاتے تھے جن میں ملک کے ہر حصے کا آدمی سفر کر سکتا تھا اور تجارتی قافلے بھی بخیریت گزر سکتے تھے۔ اس لیے عرب کی معاشی زندگی کے لیے بھی حج ایک رحمت تھا۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۱۸-۲۱۹، الحج، حاشیہ ۴۵-۴۶، ۴۸)

عرب میں کعبے کی حیثیت محض ایک مقدس عبادت گاہ ہی کی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج اور عمرے کے لیے سارا ملک اس کی طرف کھنچ کر آتا تھا اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہوتا، مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم

۱- بعض مفسرین نے .... 'حج کے لیے اذنِ عام دے دو' کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مانا ہے۔ لیکن اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ خطاب بھی حضرت ابراہیمؑ ہی کی طرف ہے اور اسی کا ایک حصہ ہے جو ان کو خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت دیا گیا تھا۔ علاوہ بریں مقصودِ کلام بھی یہاں یہی بتانا ہے کہ اول روز ہی سے یہ گھر خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر کیا گیا تھا اور تمام خدا پرستوں کو یہاں حج کے لیے آنے کا اذنِ عام تھا۔ (مؤلف)

۲- اصل میں لفظ ضامر استعمال ہوا ہے جو خاص طور پر دبلے اونٹوں کے لیے بولتے ہیں۔ اس سے ان مسافروں کی تصویر کھینچنا مقصود ہے جو دور دراز مقامات سے چلے آ رہے ہوں اور راستے میں ان کے اونٹ چارہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے دبلے ہو گئے ہوں۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرتے، شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی نصیب ہوتی، اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں کی بدولت عربوں کو سال کا پورا ایک تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا تھا۔ بس یہی زمانہ ایسا تھا جس میں ان کے قافلے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بسہولت آتے جاتے تھے۔ قربانی کے جانوروں اور قلادوں کی موجودگی سے بھی اس نقل و حرکت میں بڑی مدد ملتی تھی، کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردن میں پٹے پڑے ہوتے انھیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں اور کسی غارت گر قبیلے کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۵۰۵-۵۰۶، المائدہ، حاشیہ ۱۱۳)

حج ایک اجتماعی عبادت

لیکن حج کے فائدوں کا پورا اندازہ کرنے سے آپ قاصر رہیں گے جب تک یہ بات آپ کے پیش نظر نہ ہو کہ ایک ایک مسلمان اکیلا اکیلا حج نہیں کرتا ہے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے حج کا ایک ہی زمانہ رکھا گیا ہے اور ہزاروں لاکھوں مسلمان مل کر ایک وقت میں حج ادا کرتے ہیں پہلے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس سے تو آپ کے سامنے صرف اتنی بات آئی ہے کہ فرداً فرداً ایک ایک حاجی پر اس عبادت کا کیا اثر ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے حج کا ایک ہی وقت مقرر کر کے فائدوں کو کس طرح لاکھوں درجے بڑھا دیا گیا ہے۔ اسلام کا کمال یہی ہے کہ بیک کرشمہ دو کار نہیں بلکہ ہزار کار نکال لے جاتا ہے۔ نماز علیٰحدہ پڑھنے ہی میں کچھ کم فائدے نہ تھے مگر اس کے ساتھ جماعت کی شرط لگا کر، اور امامت کا قاعدہ مقرر کر کے اور جمعہ و عیدین کی بڑی جماعتیں بنا کر اس کے فائدوں کو بے حد حساب بڑھا دیا گیا ہے۔ روزہ فرداً فرداً رکھنا بھی اصلاح اور تربیت کا بہت بڑا ذریعہ تھا مگر سب مسلمانوں کے لیے رمضان کا ایک ہی مہینہ مقرر کر کے اس کے فائدے اتنے بڑھا دیے گئے کہ شمار میں نہیں آ سکتے۔ زکوٰۃ الگ الگ دینے میں بھی بہت خوبیاں تھیں، مگر اس کے لیے بیت المال کا نظام مقرر کر کے اس کی منفعت اتنی زیادہ کر دی گئی کہ آپ اس کا اندازہ اس وقت تک کر ہی نہیں سکتے جب تک اسلامی حکومت قائم نہ ہو، اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں کہ تمام مسلمانوں کی زکوٰۃ ایک جگہ جمع کر کے ایک انتظام کے ساتھ مستحقین میں تقسیم کرنے سے کتنی خیر و برکت ہوتی ہے۔ یہی معاملہ حج کا بھی ہے۔ اکیلا اکیلا آدمی حج کرے، تب بھی اس کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب ہو سکتا ہے، مگر تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک ہی وقت میں مل کر حج کرنے کا قاعدہ مقرر کر کے تو اس کے فائدوں کی کوئی حد باقی ہی نہیں رکھی گئی۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۹۰-۲۹۱)

بین الاقوامی اجتماع

......دنیا میں کہیں اس بات کی نظیر بھی موجود نہیں ہے کہ اس نوعیت کا بین الاقوامی اجتماع کسی قوم اور ملت میں پایا جاتا ہو۔ ہزار ہا برس کے بعد انسان نے اس زمانے میں لیگ آف نیشنز اور یونائیٹڈ نیشنز کا تصور سوچا ہے اور اس کی بنیاد پر بعض بین الاقوامی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ادارے قائم کیے ہیں۔لیکن خواہ آنجہانی لیگ آف نیشنز ہو یا موجودہ زمانے کی یونائیٹڈ نیشنز، ان میں ہونے والے بین الاقوامی اجتماعات میں اور حج کے بین الاقوامی اجتماع میں ایک بہت بڑا بنیادی فرق ہے۔ یونائیٹڈ نیشنز میں جو عالم گیر اجتماع ہوتا ہے وہ قوموں کے نمائندوں، ان کے سیاسی لیڈروں اور حکمرانوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے مقابلے میں مفاد اور اغراض کی کشمکش کرتے ہیں۔اس کا نام بین الاقوامی اجتماع نہیں ہوسکتا۔حقیقی معنوں میں بین الاقوامی اجتماع تو یہ ہے جو ہر سال حج پر یہاں ہوتا ہے کہ اس کے اندر دنیا کی تمام قوموں کے عام آدمی کھنچ کر آتے ہیں۔ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہتے ہیں اور سب اجتماعی طور پر مختلف عبادات سرانجام دیتے ہیں۔ یہاں قوموں کے نمائندے، حکمران، سیاست دان اور پارلیمنٹوں کے ارکان نہیں آتے بلکہ عام انسان آتے ہیں اور دنیا کی ہر قوم کے عام انسانوں سے ملتے ہیں۔ بین الاقوامی اجتماع کا ایسا عظیم نقشہ اور کہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

(خطباتِ حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۴۶)

عالمِ اسلام میں حرکت و بیداری

ایسے مسلمان جن پر حج فرض ہے، یعنی جو کعبے تک آنے جانے کی قدرت رکھتے ہیں، ایک دو تو ہوتے نہیں ہیں۔ ہر بستی میں ان کی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے۔ ہر شہر میں ہزاروں اور ہر ملک میں لاکھوں ہی ہوتے ہیں اور ہر سال اُن میں سے بہت لوگ حج کا ارادہ کر کے نکلتے ہیں۔اب ذرا تصور کیجیے کہ دنیا کے کونے کونے میں جہاں جہاں بھی مسلمان بستے ہیں، حج کا موسم آنے کے ساتھ ہی کس طرح اسلام کی زندگی جاگ اٹھتی ہے، کیسی کچھ حرکت پیدا ہوتی ہے اور کتنی دیر تک رہتی ہے۔تقریباً رمضان کے مہینے سے لے کر ذی القعدہ تک دنیا کے مختلف حصوں سے مختلف لوگ حج کی تیاریاں کر کے نکلتے ہیں اور اُدھر ذی الحج کے آخر سے صفر، ربیع الاول بلکہ ربیع الثانی تک واپسیوں کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔اس چھ سات مہینے کی مدت تک گویا مسلسل تمام روئے زمین کی مسلمان آبادیوں میں ایک طرح کی دینی حرکت جاری رہتی ہے۔ جو لوگ حج کو جاتے ہیں اور حج سے واپس آتے ہیں وہ تو دینی کیفیت میں سرشار ہوتے ہی ہیں، مگر جو نہیں جاتے ان کو بھی حاجیوں کے رخصت کرنے اور ایک ایک بستی سے ان کے گزرنے اور پھر واپسی پر ان کا استقبال کرنے اور اُن سے حج کے حالات سننے کی وجہ سے تھوڑا یا بہت اس کیفیت کا کچھ نہ کچھ حصہ مل ہی جاتا ہے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۹۲)

پس اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ جس طرح رمضان کا مہینہ تمام اسلامی دنیا میں تقویٰ کا موسم ہے، اسی طرح حج کا زمانہ تمام روئے زمین میں اسلام کی زندگی اور بیداری کا زمانہ ہے۔اس طریقے سے شریعت بنانے والے حکیم و دانا نے ایسا بے نظیر انتظام کر دیا ہے کہ ان شاءاللہ قیامت تک اسلام کی عالم گیر تحریک مٹ نہیں سکتی۔ دنیا کے حالات خواہ کتنے ہی بگڑ جائیں اور زمانہ کتنا ہی خراب ہو جائے، مگر یہ کعبے کا مرکز اسلامی دنیا کے جسم میں کچھ اس طرح رکھ دیا گیا ہے جیسے آدمی کے جسم میں دل ہوتا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ جب تک دل حرکت کرتا رہے، آدمی مر نہیں سکتا، چاہے بیماریوں کی وجہ سے وہ ہلنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ بالکل اسی طرح دنیا کا یہ دل بھی ہر سال اُس کی دور دراز رگوں تک سے خون کھینچتا رہتا ہے اور پھر اس کو رگ رگ تک پھیلا دیتا ہے۔ جب تک اس دل کی یہ حرکت جاری ہے اور جب تک خون کے کھنچنے اور پھیلنے کا یہ سلسلہ چل رہا ہے، اس وقت تک یہ بالکل محال ہے کہ اس جسم کی زندگی ختم ہو جائے، خواہ بیماریوں سے یہ کتنا ہی زار و نزار ہو۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۹۳-۲۹۴)

عالم گیر برادری کا قیام

اجتماعی طور پر حج سے جو بہت بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر عالم گیر برادری اور عالم گیر مساوات پیدا ہوتی ہے۔ اسی خانہ کعبہ کے دروازے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر اسی جگہ کھڑے ہو کر یہ اعلان فرمایا تھا:

اے قریش کے لوگو! اللہ نے تمھاری جاہلیت کی نخوت دور کر دی ہے۔ اب نسبوں اور خاندانی اعزازات کے لیے کوئی مقام باقی نہیں رہا۔ اب یہاں حسب و نسب کے لیے کوئی فخر نہیں ہے۔ کسی عربی کو عجمی اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے، سوائے تقویٰ کے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

یہ اعلان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جگہ سے فرمایا تھا اور اسی مقام پر سب سے بڑھ کر اس بات کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ تمام انسان یکساں ہیں۔ کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے، نہ یہاں کوئی امیر ہے نہ غریب، نہ کوئی حاکم ہے نہ محکوم، سب برابر ہیں۔ یہاں آتے ہی، بلکہ اس خانہ کعبہ سے میلوں دور میقات پر پہنچتے ہی ایک آدمی کو اپنے پہنے ہوئے کپڑے اتار کر احرام کا لباس پہن لینا پڑتا ہے۔ خواہ کوئی افریقہ سے آ رہا ہو یا امریکہ سے، ایشیا کے کسی دور دراز گوشے سے آ رہا ہو یا یورپ کے کسی دور افتادہ مقام سے، جہاں سے بھی وہ آ رہا ہو، ہر شخص کو اپنا قومی لباس اتار کر صرف ایک احرام پہن لینا ہوتا ہے۔ اس طرح لباسوں کے اختلاف سے جو قومی امتیازات پیدا ہوتے ہیں وہ یک لخت ختم ہو جاتے ہیں۔ تمام مسلمان ایک ہی لباس میں حج کرتے ہیں۔ اس طرح یہاں ایک ایسی وحدت جنم لیتی ہے جو کسی دوسری تدبیر سے پیدا نہیں کی جا سکتی۔ یہ وحدت نہ تقریروں سے پیدا ہو سکتی ہے اور نہ کانفرنسیں منعقد کرنے سے۔ یہ صرف اسی عمل سے پیدا ہو سکتی ہے جو دنیا کے ہر حصے سے آئے ہوئے لاکھوں مسلمان بیک وقت انجام دیتے ہیں کہ میقاتوں پر پہنچتے ہی وہ یک لخت اپنے قومی لباس کو چھوڑ کر ایک ہی لباس زیب تن کر لیتے ہیں۔

عالم گیر مساوات

پھر یہ عمل محض عالم گیر اخوت ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ عالم گیر مساوات بھی پیدا کرتا ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا رئیس ہو یا کہیں کا بادشاہ، کوئی فیلڈ مارشل ہو یا صدر مملکت، کوئی آقا ہو یا غلام، ہر ایک کو وہی لباس پہننا پڑتا ہے جو اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ ہر شخص وہی ایک چادر باندھے گا اور ویسی ہی دوسری چادر اوپر سے اوڑھ لے گا۔ یہاں آ کر کسی کی کوئی امتیازی شان باقی نہیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رہتی۔ امیر اور غریب، حاکم اور محکوم، خادم اور مخدوم، ادنیٰ اور اعلیٰ سب برابر ہو جاتے ہیں۔ اللہ کے دربار میں پہنچ کر کسی کی کوئی حیثیت بندۂ خدا ہونے کے سوا باقی نہیں رہتی۔ اس طرح سے جو مساوات یہاں قائم ہوتی ہے اس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ دنیا کے کسی دین میں اور کسی اجتماعی مسلک میں کہیں کوئی ایسی تدبیر موجود نہیں ہے جو تمام انسانوں کو بیک وقت ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیتی ہو۔ یہ بھی حج کی ایک بے نظیر خصوصیت ہے جس کے متعلق اگر ایک آدمی غور کرے تو اس کو محسوس ہوگا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے سوا اور کسی چیز کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ کوئی انسان ایسا نسخہ تجویز نہیں کر سکتا تھا جس سے تمام انسانوں کو ایک ہی سطح پر لانا اور ان کے درمیان ایسی کامل مساوات قائم کرنا ممکن ہو سکے۔

(خطباتِ حرم، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۴۳-۴۵)

ہماری قدر ناشناسی

مگر یہ سب کچھ سننے کے بعد ذرا میرے جلے دل کی کچھ باتیں بھی سن لو! تم نسلی مسلمانوں کا حال اُس بچے کا سا ہے جو ہیرے کی کان میں پیدا ہوا ہے۔ ایسا بچہ جب ہر طرف ہیرے ہی ہیرے دیکھتا ہے اور پتھروں کی طرح ہیروں سے کھیلتا ہے تو ہیرے اس کی نگاہ میں ایسے ہی بے قدر ہو جاتے ہیں جیسے پتھر۔ یہی حالت تمھاری بھی ہے کہ دنیا جن نعمتوں سے محروم ہے، جن سے محروم ہو کر سخت مصیبتیں اور تکلیفیں اُٹھا رہی ہے اور جن کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہے، وہ نعمتیں تم کو مفت میں بغیر کسی تلاش وجستجو کے صرف اس وجہ سے مل گئیں کہ خوش قسمتی سے تم مسلمان گھروں میں پیدا ہوئے ہو۔ وہ کلمۂ توحید جو انسان کی زندگی کے تمام پیچیدہ مسئلوں کو سلجھا کر ایک صاف سیدھا راستہ بنا دیتا ہے، بچپن سے تمھارے کانوں میں پڑا۔ نماز اور روزے کے وہ کیمیا سے زیادہ قیمتی نسخے جو آدمی کو جانور سے انسان بناتے ہیں، اور انسان کو خدا ترس اور ایک دوسرے کا بھائی، ہمدرد اور دوست بنانے کے لیے جن سے بہتر نسخے آج تک دریافت نہیں ہو سکے ہیں، تم کو آنکھ کھولتے ہی خود بخود باپ دادا کی میراث میں مل گئے۔ زکوٰۃ کی وہ بے نظیر ترکیب جس سے محض دلوں ہی کی ناپاکی دور نہیں ہوتی، بلکہ دنیا کے مالیات کا نظام بھی درست ہو جاتا ہے، جس سے محروم ہو کر تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ دنیا کے لوگ ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگے ہیں، تمھیں وہ اس طرح مل گئی جیسے کسی حکیم حاذق کے بچے کو بغیر محنت کے وہ نسخے مل جاتے ہیں جنھیں دوسرے لوگ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح حج کا وہ عظیم الشان طریقہ بھی جس کا آج دنیا بھر میں کہیں جواب نہیں جس سے زیادہ طاقت ور ذریعہ کسی تحریک کو چار دانگِ عالم میں پھیلانے اور ابدالآباد تک زندہ رکھنے کے لیے آج تک دریافت نہیں ہو سکا ہے، جس کے سوا آج دنیا میں کوئی عالم گیر طاقت ایسی موجود نہیں ہے کہ آدم کی ساری اولاد کو زمین کے گوشے گوشے سے کھینچ کر خدائے واحد کے نام پر ایک مرکز پر جمع کر دے، اور بے شمار نسلوں اور قوموں کو ایک خدا پرست، نیک نیت، خیر خواہ برادری میں پیوست کر کے رکھ دے، ہاں ایسا بے نظیر طریقہ بھی تمھیں بغیر کسی جستجو کے بنا بنایا اور صدہا برس سے چلتا ہوا مل گیا۔ مگر تم نے ان نعمتوں کی کوئی قدر نہ کی، کیونکہ آنکھ کھولتے ہی یہ تم کو اپنے گھر میں ہاتھ آ گئیں۔ اب تم اُن سے بالکل اُسی طرح کھیل رہے ہو جس طرح ہیرے کی کان میں پیدا ہونے والا نادان بچہ ہیروں سے کھیلتا ہے اور انھیں کنکر پتھر سمجھنے لگتا ہے۔ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے جس بری طرح تم اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زبردست دولت اور طاقت کو ضائع کر رہے ہو اس کا نظارہ دیکھ کر دل جل اُٹھتا ہے۔ کوئی کہاں سے اتنی قوتِ برداشت لائے کہ پتھر پھوڑوں کے ہاتھوں جواہرات کو برباد ہوتے دیکھ کر ضبط کر سکے؟

تم نے شاعر کا یہ شعر سنا ہی ہوگا کہ:

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود چوں بیاید ہنوز خر باشد

یعنی گدھا خواہ عیسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر ہی کا کیوں نہ ہو مکے کی زیارت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ اگر وہ وہاں ہو آئے تب بھی جیسا گدھا تھا ویسا ہی رہے گا۔

نماز روزہ ہو یا حج، یہ سب چیزیں سمجھ بوجھ رکھنے والے انسانوں کی تربیت کے لیے ہیں، جانوروں کو سدھانے کے لیے نہیں ہیں۔ جو لوگ نہ ان کے معنی و مطلب کو سمجھیں، نہ ان کے مدعا سے کچھ غرض رکھیں، نہ اُس فائدے کو حاصل کرنے کا ارادہ ہی کریں جو ان عبادتوں میں بھرا ہوا ہے بلکہ جن کے دماغ میں ان عبادتوں کے مقصد و مطلب کا سرے سے کوئی تصور ہی نہ ہو، وہ اگر ان افعال کی نقل اس طرح اُتار دیا کریں کہ جیسا اگلوں کو کرتے دیکھا ویسا ہی خود بھی کر دیا، تو اس سے آخر کس نتیجے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ بدقسمتی سے عموماً آج کل کے مسلمان اسی طریقے سے ان افعال کو ادا کر رہے ہیں۔ ہر عبادت کی ظاہری شکل جیسی مقرر کر دی گئی ہے ویسی ہی بنا کر رکھ دیتے ہیں، مگر وہ شکل روح سے بالکل خالی ہوتی ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ ہر سال ہزارہا زائرین مرکزِ اسلام کی طرف جاتے ہیں اور حج سے مشرف ہو کر پلٹتے ہیں، مگر نہ جاتے وقت ہی ان پر وہ اصلی کیفیت طاری ہوتی ہے جو ایک مسافر حرم میں ہونی چاہیے، نہ وہاں سے واپس آ کر ہی اُن میں کوئی اثر حج کا پایا جاتا ہے، اور نہ اس سفر کے دوران میں وہ ان آبادیوں کے مسلمانوں اور غیر مسلموں پر اپنے اخلاق کا کوئی اچھا نقش بٹھاتے ہیں جن پر سے اُن کا گزر ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اُن میں زیادہ تر وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اپنی گندگی، بے تمیزی اور اخلاقی پستی کی نمائش کر کے اسلام کی عزت کو بٹہ لگاتے ہیں۔ ان کی زندگی کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ دین کی بزرگی کا سکہ غیروں پر جمے، خود اپنوں کی نگاہوں میں بھی وہ بے وقعت ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج خود ہماری قوم کے بہت سے نوجوان ہم سے پوچھتے ہیں کہ ذرا اس حج کا فائدہ تو ہمیں سمجھاؤ۔ حالانکہ یہ حج وہ چیز تھی کہ اگر اسے اس کی اصلی شان کے ساتھ ادا کیا جاتا تو کافر تک اس کے فائدوں کو علانیہ دیکھ کر ایمان لے آتے۔ کسی تحریک کے ہزاروں لاکھوں ممبر ہر سال دنیا کے ہر حصے سے کھنچ کر ایک جگہ جمع ہوں اور پھر اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں، ملک ملک اور شہر شہر سے گزرتے ہوئے اپنی پاکیزہ زندگی، پاکیزہ خیالات اور پاکیزہ اخلاق کا اظہار کرتے جائیں، جہاں جہاں ٹھہریں اور جہاں سے گزریں وہاں اپنی تحریک کے اصولوں کا نہ صرف زبان سے پرچار کریں بلکہ اپنی عملی زندگی سے ان کا پورا پورا مظاہرہ بھی کر دیں، اور یہ سلسلہ دس بیس برس نہیں بلکہ صدیوں تک سال بسال چلتا رہے، بھلا غور کیجیے کہ یہ بھی کوئی ایسی چیز تھی کہ اس کے فائدے پوچھنے کی کسی کو ضرورت پیش آتی؟ خدا کی قسم، اگر یہ کام صحیح طریقے پر ہوتا تو اندھے اس کے فائدے دیکھتے اور بہرے اس کے فائدے سن لیتے۔ ہر سال کا حج کروڑوں مسلمانوں کو نیک بناتا۔ ہزاروں غیر مسلموں کو اسلام کے دائرے میں کھینچ لاتا، اور لاکھوں غیر مسلموں کے دلوں پر اسلام کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بزرگی کا سکہ بٹھا دیتا۔ مگر برا ہو جہالت کا، جاہلوں کے ہاتھ پڑ کر کتنی بیش قیمت چیز کس بری طرح ضائع ہو رہی ہے۔

حج کے پورے فوائد سے محرومی کی وجہ

حج کے پورے فائدے حاصل ہونے کے لیے ضروری تھا کہ مرکزِ اسلام میں کوئی ایسا ہاتھ ہوتا جو اس عالم گیر طاقت سے کام لیتا، کوئی ایسا دل ہوتا جو ہر سال تمام دنیا کے جسم میں خونِ صالح دوڑاتا رہتا، کوئی ایسا دماغ ہوتا جو ان ہزاروں لاکھوں خداداد قاصدوں کے واسطے سے دنیا بھر میں اسلام کے پیغام کو پھیلانے کی کوشش کرتا، اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا ہی ہوتا کہ وہاں خالص اسلامی زندگی کا ایک مکمل نمونہ موجود ہوتا اور ہر سال دنیا کے مسلمان وہاں سے صحیح دین داری کا تازہ سبق لے کر پلٹتے۔ مگر وائے افسوس کہ وہاں کچھ بھی نہیں۔

مدت ہائے دراز سے عرب میں جہالت پرورش پا رہی ہے۔ عباسیوں کے دور سے لے کر عثمانیوں کے دور تک ہر زمانے کے بادشاہ اپنی سیاسی اغراض کی خاطر عرب کو ترقی دینے کے بجائے صدیوں سے پیہم گرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے اہل عرب کو علم، اخلاق، تمدن ہر چیز کے اعتبار سے پستی کی انتہا تک پہنچا کر چھوڑا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ سرزمین جہاں سے کبھی اسلام کا نور تمام عالم میں پھیلا تھا، آج اُسی جاہلیت کے قریب پہنچ گئی ہے جس میں وہ اسلام سے پہلے مبتلا تھی۔ اب نہ وہاں اسلام کا علم ہے، نہ اسلامی اخلاق ہیں، نہ اسلامی زندگی ہے۔

لوگ دُور دُور سے بڑی گہری عقیدتیں لیے ہوئے حرمِ پاک کا سفر کرتے ہیں، مگر اس علاقے میں پہنچ کر جب ہر طرف ان کو جہالت، گندگی، طمع، بے حیائی، دنیا پرستی، بداخلاقی، بدانتظامی اور عام باشندوں کی ہر طرح گری ہوئی حالت نظر آتی ہے تو ان کی توقعات کا سارا طلسم پاش پاش ہو کر رہ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے لوگ حج کر کے اپنا ایمان بڑھانے کے بجائے اور اُلٹا کچھ کھو آتے ہیں۔ وہی پرانی مہنت گری جو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے بعد جاہلیت کے زمانے میں کعبے پر مسلط ہوئی تھی اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر ختم کیا تھا، اب پھر تازہ ہو گئی ہے۔

حرم کعبہ کے منتظم پھر اسی طرح مہنت بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ خدا کا گھر ان کے لیے جائداد اور حج ان کے لیے تجارت بن گیا ہے۔ حج کرنے والوں کو وہ اپنا اسامی سمجھتے ہیں۔ مختلف ملکوں میں بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے ایجنٹ مقرر ہیں تاکہ اسامیوں کو گھیر گھیر کر بھیجیں۔ ہر سال اجمیر کے خادموں کی طرح ایک لشکر دلالوں اور سفری ایجنٹوں کا مکے سے نکلتا ہے تاکہ دنیا بھر کے ملکوں سے اسامیوں کو گھیر لائے۔

قرآن کی آیتیں اور حدیث کے احکام لوگوں کو سنا سنا کر حج پر آمادہ کیا جاتا ہے، نہ اس لیے کہ انھیں خدا کا عائد کیا ہوا فرض یاد دلایا جائے، بلکہ صرف اس لیے کہ ان احکام کو سن کر یہ لوگ حج کو نکلیں تو آمدنی کا دروازہ کھلے۔ گویا اللہ اور اس کے رسولؐ نے یہ سارا کاروبار انھی مہنتوں اور ان کے دلالوں کی پرورش کے لیے پھیلایا تھا۔

پھر جب اس فرض کو ادا کرنے کے لیے آدمی گھر سے نکلتا ہے تو سفر شروع کرنے سے لے کر واپسی تک ہر جگہ اس کو مذہبی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مزدوروں اور دینی تاجروں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ معلم، مطوف، وکیل مطوف، کلید بردار کعبہ اور خود حکومت حجاز، سب اس تجارت میں حصہ دار ہیں۔ حج کے سارے مناسک معاوضہ لے کر ادا کرائے جاتے ہیں۔ ایک مسلمان کے لیے خانۂ کعبہ کا دروازہ تک فیس کے بغیر نہیں کھل سکتا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

یہ بنارس اور ہردوار کے پنڈتوں کی سی حالت اُس دین کے نام نہاد خدمت گزاروں اور مرکزی عبادت گاہ کے مجاوروں نے اختیار کر رکھی ہے جس نے مہنت گری کے کاروبار کی جڑ کاٹ دی تھی۔ بھلا جہاں عبادت کرانے کا کام مزدوری اور تجارت بن گیا ہو، جہاں عبادت گاہوں کو ذریعہ آمدنی بنالیا گیا ہو، جہاں احکامِ الٰہی کو اس غرض کے لیے استعمال کیا جاتا ہو کہ خدا کا حکم سن کر لوگ فرض بجالانے کے لیے مجبور ہوں اور اس طاقت کے بل پر اُن کی جیبوں سے روپیہ گھسیٹا جائے، جہاں آدمی کو عبادت کا ہر رُکن ادا کرنے کے لیے معاوضہ دینا پڑتا ہو اور دینی سعادت ایک طرح سے خرید و فروخت کی جنس بن گئی ہو، ایسی جگہ عبادت کی روح باقی کہاں رہ سکتی ہے؟ کس طرح آپ اُمید کر سکتے ہیں کہ حج کرنے والوں اور حج کرانے والوں کو اس عبادت کے حقیقی و روحانی فائدے حاصل ہوں گے جب کہ یہ سارا کام سوداگری اور دوسری طرف خریداری کی ذہنیت سے ہو رہا ہو[1]۔

اس ذکر سے میرا مقصد کسی کو الزام دینا نہیں ہے، بلکہ صرف آپ لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ حج جیسی عظیم الشان طاقت کو آج کن چیزوں نے قریب قریب بالکل بے اثر بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ غلط فہمی کسی کے دل میں نہ رہنی چاہیے کہ اسلام میں اور اس کے جاری کیے ہوئے طریقوں میں کوئی کوتاہی ہے۔ نہیں کوتاہی دراصل اُن لوگوں میں ہے جو اسلام کی صحیح پیروی نہیں کرتے۔ یہ تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے کہ جو طریقے تم کو انسانیت کا مکمل نمونہ بنانے والے تھے اور جن پر ٹھیک ٹھیک عمل کر کے تم تمام دنیا کے مصلح اور امام بن سکتے تھے، اُن سے آج کوئی اچھا پھل ظاہر نہیں ہو رہا ہے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ لوگوں کو خود ان طریقوں کے مفید ہونے میں شک ہونے لگا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک طبیب حاذق چند بہترین تیر بہدف نسخے مرتب کر کے چھوڑ گیا ہو اور بعد میں اس کے وہ نسخے اناڑی اور جاہل جانشینوں کے ہاتھ پڑ کر بے کار بھی ہو رہے ہوں اور بدنام بھی۔ نسخہ بجائے خود چاہے کتنا ہی صحیح ہو، مگر بہر حال اس سے کام لینے کے لیے فن کی واقفیت اور سمجھ بوجھ ضروری ہے۔ اور جاہل لوگ جو خود نسخے کو جانچنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں اس غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ نسخہ خود ہی غلط ہے۔

(خطبات، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۹۸-۳۰۴)

❁ ❁ ❁

۱- واضح رہے کہ یہ خطبہ ۱۹۳۸ء کا ہے۔ اس کے بعد سے اب تک حالات کی بہت کچھ اصلاح ہو چکی ہے اور سعودی عرب کی حکومت مزید اصلاح کے لیے کوشاں ہے۔ عرب میں تعلیم بھی پھیلائی جا رہی ہے۔ ریاض، مکہ، جدہ وغیرہ شہروں میں شریعت کی تعلیم کے لیے اعلیٰ درجے کے ادارات قائم کیے گئے ہیں۔ مدینہ طیبہ میں ایک جامعہ اسلامیہ نے بڑے پیمانے پر کام شروع کر دیا ہے۔ مکہ معظمہ میں رابطۂ اسلامیہ کے نام سے عالمِ اسلامی کی ایک بین الاقوامی تنظیم قائم کی گئی ہے جو پوری کوشش کر رہی ہے کہ حج کے اجتماع سے فائدہ اٹھا کر تمام مسلمان قوموں میں دینی روح پیدا کی جائے۔ ان پہلوؤں سے حالات بڑی حد تک قابلِ اطمینان ہیں۔ اب دو امور کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ حرمین شریفین کی سرزمین کو مغربی تہذیب کے سیلاب سے بچایا جائے۔ دوسرے یہ کہ معلمین کے طریق کار کی اصلاح کی جائے۔ خدا کرے کہ سعودی حکومت اس سلسلے میں صحیح تدابیر عمل میں لائے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

احکام

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٚ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ؗ وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰٮكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰٓٮِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِىْۤ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِىْ يَوْمَيْنِ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (البقرۃ ۲:۱۹۶-۲۰۳)

اللہ کی خوشنودی کے لیے جب حج اور عمرے کی نیت کرو، تو اسے پورا کرو، اور اگر کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے، اللہ کی جناب میں پیش کرو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر منڈوالے، تو اسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے، پھر اگر تمھیں امن نصیب ہو جائے (اور تم حج سے پہلے مکے پہنچ جاؤ)، تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھائے، وہ حسب مقدور قربانی دے، اور اگر قربانی میسر نہ ہو، تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر، اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت ان لوگوں کے لیے ہے، جن کے گھر بار مسجد حرام کے قریب نہ ہوں۔ اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے، اسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدعملی، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہو۔اور جو نیک کام تم کرو گے، وہ اللہ کے علم میں ہوگا۔سفر حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ، اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیز گاری ہے۔پس اے ہوش مندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔پھر جب عرفات سے چلو، تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھیر کر اللہ کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو، جس کی ہدایت اس نے تمھیں دی ہے، ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو، یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو، تو جس طرح پہلے اپنے آباواجداد کا ذکر کرتے تھے، اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔(مگر اللہ کو یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے) ان میں سے کوئی تو ایسا ہے، جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دے دے۔ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔اور کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔یہ گنتی کے چند روز ہیں، جو تمھیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہییں۔پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں، اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھیر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں۔بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں.........اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمھاری پیشی ہونے والی ہے۔

سفر حج کے لیے زادِ راہ

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ (البقرہ ۲:۱۹۷) سفر حج کے لیے زادراہ ساتھ لے جاؤ، اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیز گاری ہے۔

جاہلیت کے زمانے میں حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے کر نکلنے کو ایک دنیادارانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور ایک مذہبی آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خدا کے گھر کی طرف دنیا کا سامان لیے بغیر جائے گا۔اس آیت میں ان کے اس غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور انھیں بتایا گیا ہے کہ زادِ راہ نہ لینا کوئی خوبی نہیں ہے۔اصل خوبی خدا کا خوف اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے اجتناب اور زندگی کا پاکیزہ ہونا ہے۔جو مسافر اپنے اخلاق درست نہیں رکھتا اور خدا سے بے خوف ہو کر برے اعمال کرتا ہے، وہ اگر زادِ راہ ساتھ نہ لے کر محض ظاہر میں فقیری کی نمایش کرتا ہے، تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔خدا اور خلق دونوں کی نگاہ میں وہ ذلیل ہوگا اور اپنے اس مذہبی کام کی بھی توہین کرے گا، جس کے لیے وہ سفر کر رہا ہے۔لیکن اگر اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور اس کے اخلاق درست ہوں، تو خدا کے ہاں بھی اس کی عزت ہوگی اور خلق بھی اس کا احترام کرے گی، چاہے اس کا توشہ دان کھانے سے بھرا ہوا ہو۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۵۵-۱۵۷، البقرہ، حاشیہ ۲۱۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شہوانی فعل، بدعملی اور لڑائی جھگڑے

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرہ ۲:۱۹۷) جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے، اسے خبر دار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدعملی، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو۔

احرام کی حالت میں میاں اور بیوی کے درمیان نہ صرف تعلق زن وشو ممنوع ہے، بلکہ ان کے درمیان کوئی ایسی گفتگو بھی نہ ہونی چاہیے، جو رغبت شہوانی پر مبنی ہو۔ تمام معصیت کے افعال اگرچہ بجائے خود ناجائز ہیں، لیکن احرام کی حالت میں ان کا گناہ بہت سخت ہے، حتیٰ کہ خادم کو ڈانٹنا تک جائز نہیں۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۵۵-۱۵۷، البقرہ، حاشیہ ۲۱۴-۲۱۶)

سفرِ حج کے دوران میں کسبِ معاش

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ (البقرہ ۲:۱۹۸) اگر حج کے ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصور تھا کہ سفر حج کے دوران میں کسب معاش کے لیے کام کرنے کو وہ برا سمجھتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک کسب معاش ایک دنیا دارانہ فعل تھا اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔ قرآن اس خیال کی تردید کرتا ہے اور انھیں بتاتا ہے کہ ایک خدا پرست آدمی جب خدا کے قانون کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی معاش کے لیے جدوجہد کرتا ہے، تو دراصل اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے اور کوئی گناہ نہیں اگر وہ اپنے رب کی رضا کے لیے سفر کرتے ہوئے اس کا فضل بھی تلاش کرتا جائے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۵۶، البقرہ، حاشیہ ۲۱۸)

احرام کی حالت میں حرام چیزیں

'احرام' اس فقیرانہ لباس کو کہتے ہیں جو زیارت کعبہ کے لیے پہنا جاتا ہے۔ کعبے کے گرد کئی کئی منزل کے فاصلے پر ایک حد مقرر کردی گئی ہے جس سے آگے بڑھنے کی کسی زائر کو اجازت نہیں جب تک کہ وہ اپنا معمولی لباس اتار کر احرام کا لباس نہ پہن لے۔ اس لباس میں صرف ایک تہہ بند ہوتا ہے اور ایک چادر جو اوپر سے اوڑھی جاتی ہے۔ اسے احرام اس لیے کہتے ہیں کہ اسے باندھنے کے بعد آدمی پر بہت سی وہ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو معمولی حالات میں حلال ہیں۔ مثلاً حجامت، خوشبو کا استعمال، ہر قسم کی زینت و آرائش اور قضائے شہوت وغیرہ۔ انھی پابندیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی جان دار کو ہلاک نہ کیا جائے، نہ شکار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیا جائے اور نہ کسی کو شکار کا پتا دیا جائے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۴۳۷-۴۳۸، المائدۃ، حاشیہ ۳)

حالتِ مرض میں سر منڈانے کا فدیہ

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ (البقرۃ ۲:۱۹۶)
مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر منڈوا لے، تو اسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت میں تین دن کے روزے رکھنے یا چھے مسکینوں کو کھانا کھلانے یا کم از کم ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۵۴، البقرہ، حاشیہ ۲۱۱)

حالتِ احرام میں شکار

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (المائدہ ۵:۹۴) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ تمھیں اس شکار کے ذریعے سے سخت آزمائش میں ڈالے گا۔ جو بالکل تمھارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہوگا، یہ دیکھنے کے لیے کہ تم میں سے کون اس سے غائبانہ ڈرتا ہے۔ پھر جس نے اس تنبیہ کے بعد اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا اس کے لیے دردناک سزا ہے۔

شکار خواہ آدمی خود کرے، یا کسی دوسرے کو شکار میں کسی طور پر مدد دے، دونوں باتیں حالت احرام میں منع ہیں۔ نیز اگر مُحرِم کی خاطر شکار مارا گیا ہو تب بھی اس کا کھانا محرم کے لیے جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی شخص نے اپنے لیے خود شکار کیا ہو اور پھر وہ اس میں سے محرم کو بھی تحفتاً کچھ دے دے تو اس کے کھانے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اس حکم عام سے موذی جانور مستثنیٰ ہیں: سانپ، بچھو، باؤلا کتا اور ایسے دوسرے جانور جو انسان کو نقصان پہنچانے والے ہیں، حالت احرام میں مارے جا سکتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۵۰۴، المائدہ، حاشیہ ۱۱۰)

شکار کا کفارہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ۭ عَفَا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللّٰہُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنۡ عَادَ فَیَنۡتَقِمُ اللّٰہُ مِنۡہُ ؕ وَ اللّٰہُ عَزِیۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ○ (المائدۃ ۹۵:۵) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! احرام کی حالت میں شکار نہ مارو، اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اسی کے ہم پلہ ایک جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے، اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا، یا نہیں تو اس گناہ کے کفارے میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا، یا اس کے بقدر روزے رکھنے ہوں گے، تاکہ وہ اپنے کیے کا مزہ چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا اسے اللہ نے معاف کر دیا، لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا تو اس سے اللہ بدلہ لے گا، اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

ان امور کا فیصلہ بھی دو عادل آدمی ہی کریں گے کہ کس جانور کے مارنے پر آدمی کتنے مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کتنے روزے رکھے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۵۰۴، المائدہ، حاشیہ ۱۱۱)

طوافِ افاضہ

وَلۡیَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَیۡتِ الۡعَتِیۡقِ۔ (الحج ۲۹:۲۲) اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔

کعبے کے لیے 'بیت عتیق' کا لفظ بہت معنی خیز ہے۔ 'عتیق' عربی زبان میں تین معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک قدیم، دوسرے آزاد، جس پر کسی کی ملکیت نہ ہو، تیسرے، مکرم اور معزز۔ یہ تینوں ہی معنی اس پاک گھر پر صادق آتے ہیں۔

طواف سے مراد طوافِ افاضہ، یعنی طواف زیارت ہے جو یوم النحر کو قربانی کرنے اور احرام کھول دینے کے بعد کیا جاتا ہے۔ یہ ارکان حج میں سے ہے۔ اور چونکہ قضائے تفث کے حکم سے متصل اس کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ طواف قربانی کرنے اور احرام کھول کر نہادھو لینے کے بعد کیا جانا چاہیے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۲۱، الحج، حاشیہ ۵۳)

سعی بین الصفا والمروہ

اِنَّ الصَّفَا وَ الۡمَرۡوَۃَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰہِ ۚ فَمَنۡ حَجَّ الۡبَیۡتَ اَوِ اعۡتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِ اَنۡ یَّطَّوَّفَ بِہِمَا ؕ (البقرہ ۱۵۸:۲) یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے[۱] اس کے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کر لے۔

صفا اور مروہ مسجد حرام کے قریب دو پہاڑیاں ہیں، جن کے درمیان دوڑنا من جملہ ان مناسک کے تھا، جو اللہ تعالیٰ نے حج

۱- ذوالحجہ کی مقرر تاریخوں میں کعبے کی جو زیارت کی جاتی ہے، اس کا نام حج ہے اور ان تاریخوں کے ماسوا دوسرے کسی زمانے میں جو زیارت کی جائے، وہ عمرہ ہے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے لیے حضرت ابراہیمؑ کو سکھائے تھے۔ بعد میں جب مکے اور آس پاس کے تمام علاقوں میں مشرکانہ جاہلیت پھیل گئی تو صفا پر اساف اور مروہ پر نائلہ کے استھان بنالیے گئے اور ان کے گرد طواف ہونے لگا۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اسلام کی روشنی اہل عرب تک پہنچی، تو مسلمانوں کے دلوں میں یہ سوال کھٹکنے لگا کہ آیا صفا اور مروہ کی سعی حج کے اصلی مناسک میں سے ہے یا محض زمانۂ شرک کی ایجاد ہے، اور یہ کہ اس سعی سے کہیں ہم ایک مشرکانہ فعل کے مرتکب تو نہیں ہو جائیں گے۔ نیز حضرت عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مدینہ کے دلوں میں پہلے ہی سے سعی بین الصفا والمروہ کے بارے میں کراہت موجود تھی، کیونکہ وہ مناۃ کے معتقد تھے اور اساف و نائلہ کو نہیں مانتے تھے۔ انھی وجوہ سے ضروری ہوا کہ مسجد حرام کو قبلہ مقرر کرنے کے موقع پر ان غلط فہمیوں کو دور کر دیا جائے جو صفا اور مروہ کے بارے میں پائی جاتی تھیں اور لوگوں کو بتا دیا جائے کہ ان دونوں مقامات کے درمیان سعی کرنا حج کے اصلی مناسک میں سے ہے اور یہ کہ ان مقامات کا تقدس خدا کی جانب سے ہے نہ کہ اہل جاہلیت کی من گھڑت۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۱۲۷-۱۲۸، البقرہ، حاشیہ ۱۵۸)

سب کو عرفات سے پلٹنے کا حکم

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (البقرہ ۲:۱۹۹) پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو، یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

حضرت ابراہیم و اسماعیلؑ کے زمانے سے عرب کا معروف طریقۂ حج یہ تھا کہ ۹ ذی الحجہ کو منیٰ سے عرفات جاتے تھے اور رات کو وہاں سے پلٹ کر مزدلفہ میں ٹھیرتے تھے۔ مگر بعد کے زمانے میں جب رفتہ رفتہ قریش کی برہمنیت قائم ہوگئی، تو انھوں نے کہا: ہم اہل حرم ہیں، ہمارے مرتبے سے یہ بات فروتر ہے کہ عام اہلِ عرب کے ساتھ عرفات تک جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لیے یہ شانِ امتیاز قائم کی کہ مزدلفہ تک جا کر ہی پلٹ آتے اور عام لوگوں کو عرفات تک جانے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ پھر یہی امتیاز بنی خزاعہ اور بنی کنانہ اور ان دوسرے قبیلوں کو بھی حاصل ہو گیا، جن کے ساتھ قریش کے شادی بیاہ کے رشتے تھے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو قبیلے قریش کے حلیف تھے، ان کی شان بھی عام عربوں سے اونچی ہو گئی اور انھوں نے بھی عرفات جانا چھوڑ دیا۔ اسی فخر و غرور کا بت اس آیت میں توڑا گیا ہے۔ آیت کا خطاب خاص قریش اور ان کے رشتے دار اور حلیف قبائل کی طرف ہے اور خطاب عام ان سب کی طرف ہے، جو آئندہ کبھی اس قسم کے امتیازات اپنے لیے مخصوص کرنا چاہیں۔ ان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اور سب لوگ جہاں تک جاتے ہیں، انھیں کے ساتھ جاؤ، انھیں کے ساتھ ٹھیرو، انھیں کے ساتھ پلٹو، اور اب تک جاہلیت کے فخر و غرور کی بنا پر سنت ابراہیمی کی جو خلاف ورزی تم کرتے رہے ہو، اس پر اللہ سے معافی مانگو۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۵۷، حاشیہ ۲۲۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایامِ تشریق میں منیٰ سے مکہ واپسی

فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ ۚ وَ مَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰی ؕ (البقرۃ ۲:۲۰۳) پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں، جو کچھ دیر زیادہ ٹھیر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں۔

ایامِ تشریق میں منیٰ سے مکے کی طرف واپسی خواہ ۱۲ ذی الحجہ کو ہو یا تیرھویں تاریخ کو، دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں۔ اصل اہمیت اس کی نہیں کہ تم ٹھیرے کتنے دن، بلکہ اس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھیرے ان میں خدا کے ساتھ تمھارے تعلق کا کیا حال رہا۔ خدا کا ذکر کرتے رہے یا میلوں ٹھیلوں میں لگے رہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۵۳-۱۵۸، البقرہ، حاشیہ ۲۲۲)

وادیِ مُحسّر سے گزرنا

صحیح مسلم اور ابوداؤد کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کا جو قصہ امام جعفر صادقؒ نے اپنے والد ماجد امام محمد باقر سے اور انھوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے اس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلے تو محسّر کی وادی میں آپؐ نے رفتار تیز کر دی.........

مؤطا میں امام مالکؒ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مزدلفہ پورے کا پورا ٹھہرنے کا مقام ہے۔ مگر محسّر کی وادی میں نہ ٹھیرا جائے۔

(تفہیم القرآن، ششم، ص ۴۶۷-۴۶۸، الفیل، تاریخی پس منظر)

سفرِ حج میں اللہ کا ذکر

وَاذۡکُرُوۡہُ کَمَا ہَدٰىکُمۡ ۚ (البقرہ ۲:۱۹۸) اس کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو، جس کی ہدایت اس نے تمھیں دی ہے۔

جاہلیت کے زمانے میں خدا کی عبادت کے ساتھ جن دوسرے مشرکانہ اور جاہلانہ افعال کی آمیزش ہوتی تھی ان سب کو چھوڑ دو اور اب جو ہدایت اللہ نے تمھیں بخشی ہے، اس کے مطابق خالصتاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۵۶، البقرہ، حاشیہ ۲۱۹)

منیٰ میں ذکر اللہ

فَاِذَا قَضَیۡتُمۡ مَّنَاسِکَکُمۡ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَذِکۡرِکُمۡ اٰبَآءَکُمۡ اَوۡ اَشَدَّ ذِکۡرًا ؕ (البقرہ ۲:۲۰۰) پھر جب اپنے حج کے ارکان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادا کر چکو، تو جس طرح پہلے اپنے آبا واجداد کا ذکر کرتے تھے، اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

اہل عرب حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں جلسے کرتے تھے، جن میں ہر قبیلے کے لوگ اپنے باپ دادا کے کارنامے فخر کے ساتھ بیان کرتے اور اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتے تھے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ ان جاہلانہ باتوں کو چھوڑو، پہلے جو وقت فضولیات میں صرف کرتے تھے اب اسے اللہ کی یاد اور اس کے ذکر میں صرف کرو۔ اس ذکر سے مراد زمانہ قیامِ منیٰ کا ذکر ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۵۷-۱۵۸، حاشیہ ۲۲۱)

حجامت وغیرہ کا حکم

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ (الحج ۲۲:۲۹) پھر اپنا میل کچیل دور کریں۔

یعنی یوم النحر (۱۰ ذی الحجہ) کو قربانی سے فارغ ہو کر احرام کھول دیں، حجامت کرائیں، نہائیں، دھوئیں اور وہ پابندیاں ختم کر دیں جو احرام کی حالت میں عائد ہو گئی تھیں۔ لغت میں تفث کے اصل معنی اس غبار اور میل کچیل کے ہیں جو سفر میں آدمی پر چڑھ جاتا ہے۔ مگر حج کے سلسلے میں جب میل کچیل دور کرنے کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کا مطلب وہی لیا جائے گا جو اوپر بیان ہوا ہے۔ کیونکہ حاجی جب تک مناسک حج اور قربانی سے فارغ نہ ہو جائے، وہ نہ بال ترشوا سکتا ہے، نہ ناخن کٹوا سکتا ہے، اور نہ جسم کی دوسری صفائی کر سکتا ہے۔ (اس سلسلے میں یہ بات جان لینی چاہیے کہ قربانی سے فراغت کے بعد دوسری تمام پابندیاں تو ختم ہو جاتی ہیں۔ مگر بیوی کے پاس جانا اس وقت تک جائز نہیں ہوتا جب تک آدمی طواف افاضہ نہ کر لے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۲۱، الحج، حاشیہ ۵۱)

سر منڈوانا افضل ہے

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ (الفتح ۲۲:۲۷) فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا۔ ان شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے، اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے اور تمھیں کوئی خوف نہ ہوگا۔

[اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے] یہ الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عمرے اور حج میں سر منڈوانا لازم نہیں ہے۔ بلکہ بال ترشوانا بھی جائز ہے۔ البتہ سر منڈوانا افضل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے پہلے بیان فرمایا ہے اور بال ترشوانے کا ذکر بعد میں کیا ہے۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۶۱-۶۲، الفتح، حاشیہ ۵۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حجِ تمتع

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ ۔ (البقرہ ۲:۱۹۶) تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھائے ۔

عرب جاہلیت میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں ادا کرنا گناہِ عظیم ہے۔ ان کی خود ساختہ شریعت میں عمرے کے لیے الگ اور حج کے لیے الگ سفر کرنا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قید کو اڑا دیا اور باہر سے آنے والوں کے ساتھ یہ رعایت فرمائی کہ وہ ایک سفر میں عمرہ اور حج دونوں کرلیں، البتہ جو لوگ مکے کے آس پاس میقاتوں کی حدود کے اندر رہتے ہوں، انھیں اس رعایت سے مستثنیٰ کردیا۔ کیونکہ ان کے لیے عمرے کا سفر الگ اور حج کا سفر الگ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھانے سے مراد یہ ہے کہ آدمی عمرہ کر کے اِحرام کھول لے اور ان پابندیوں سے آزاد ہوجائے، جو احرام کی حالت میں لگائی گئی ہیں۔ پھر جب حج کے دن آئیں، تو ازسرِ نو احرام باندھ لے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۵۵، البقرہ، حاشیہ ۲۱۳)

احصار کی صورت میں قربانی

اگر راستے میں کوئی ایسا سبب پیش آجائے، جس کی وجہ سے آگے جانا غیر ممکن ہو اور مجبوراً رک جانا پڑے، تو اونٹ، گائے، بکری میں سے جو جانور بھی میسر ہو، اللہ کے لیے قربان کردو۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ قربانی کے اپنی جگہ پہنچ جانے سے کیا مراد ہے۔ فقہائے حنفیہ کے نزدیک اس سے مراد حرم ہے، یعنی اگر آدمی راستے میں رک جانے پر مجبور ہو، تو اپنی قربانی کا جانور یا اس کی قیمت بھیج دے تاکہ اس کی طرف سے حدودِ حرم میں قربانی کی جائے۔ اور امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک جہاں آدمی گھر گیا ہو، وہیں قربانی کردینا مراد ہے۔ سر مونڈنے سے مراد حجامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک قربانی نہ کرلو حجامت نہ کراؤ۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۵۳-۱۵۴، البقرہ، حاشیہ ۲۰۹-۲۱۰)

فَإِذَا أَمِنتُمْ (البقرہ ۲:۱۹۶) پھر اگر تمھیں امن نصیب ہوجائے۔

یعنی وہ سبب دور ہوجائے، جس کی وجہ سے مجبوراً تمھیں راستے میں رک جانا پڑا تھا۔ چوں کہ اس زمانے میں حج کا راستہ بند ہوجانے اور حاجیوں کے رک جانے کی وجہ زیادہ تر دشمنِ اسلام قبیلوں کی مزاحمت ہی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اوپر کی آیت میں 'گھر جانے' اور اس کے بالمقابل یہاں 'امن نصیب ہوجانے' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن جس طرح 'گھر جانے' کے مفہوم میں دشمن کی مزاحمت کے علاوہ دوسرے تمام موانع شامل ہیں، اسی طرح 'امن نصیب ہوجانے' کا مفہوم بھی ہر مانع و مزاحم چیز کے دور ہوجانے پر حاوی ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۱۵۴، البقرہ، حاشیہ نمبر ۲۱۱-۲۱۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حجۃ الوداع اور اعلان براءت

(ذی القعدہ) ۹ھ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کو حج کے لیے روانہ کر چکے تھے تو ان کے پیچھے سورہ التوبہ کی ابتدا سے رکوع پانچ تک آیات نازل ہوئیں تو صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اسے ابوبکرؓ کو بھیج دیجیے تا کہ وہ حج میں اس کو سنا دیں۔ لیکن آپؐ نے فرمایا کہ اس اہم معاملے کا اعلان میری طرف سے میرے ہی گھر کے کسی آدمی کو کرنا چاہیے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اس خدمت پر مامور کیا اور ساتھ ہی ہدایت فرمادی کہ حاجیوں کے مجمع عام میں اسے سنانے کے بعد حسب ذیل چار باتوں کا اعلان بھی کر دیں (۱) جنت میں کوئی ایسا شخص داخل نہ ہوگا جو دین اسلام کو قبول کرنے سے انکار کرے۔ (۲) اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے۔ (۳) بیت اللہ کے گرد برہنہ طواف کرنا ممنوع ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ رسول اللہ کا معاہدہ باقی ہے، یعنی جو نقضِ عہد کے مرتکب نہیں ہوئے ان کے ساتھ مدتِ معاہدہ تک وفا کی جائے گی۔

فتح مکہ کے بعد دورِ اسلامی کا پہلا حج ۸ھ میں قدیم طریقے پر ہوا۔ پھر ۹ھ میں یہ دوسرا حج مسلمانوں نے اپنے طریقے پر کیا اور مشرکین نے اپنے طریقے پر۔ اس کے بعد تیسرا حج ۱۰ھ میں خالص اسلامی طریقے پر ہوا یہی وہ مشہور حج ہے جسے حجۃ الوداع کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے دو سال حج کے لیے تشریف نہ لے گئے۔ تیسرے سال جب بالکل شرک کا استیصال ہو گیا تب آپؐ نے حج ادا فرمایا۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۱۷۴، التوبہ، حاشیہ ۱)

حجِ اکبر

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ حجۃ الوداع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے حاضرین سے پوچھا: یہ کون سا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: یوم النحر ہے۔ فرمایا: هذا يوم الحج الاكبر۔ یہ حج اکبر کا دن ہے۔ [یعنی ۱۰ ذی الحجہ جسے یوم النحر کہتے ہیں]۔ حج اکبر کا لفظ حج اصغر کے مقابلے میں ہے۔ اہل عرب عمرے کو چھوٹا حج کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ حج جو ذی الحجہ کی مقررہ تاریخوں میں کیا جاتا ہے، حج اکبر کہلاتا ہے۔

(تفہیم القرآن، دوم، ص ۱۷۵، التوبہ، حاشیہ ۴)

حجِ بدل

فقہائے حنفیہ کہتے ہیں کہ عبادات کی تین قسمیں ہیں۔ ایک خالص بدنی جیسے نماز، دوسری خالص مالی، جیسے زکوٰۃ اور تیسری مالی و بدنی مرکب، جیسے حج۔ ان میں سے پہلی قسم میں نیابت نہیں چل سکتی، مثلاً ایک شخص کی طرف سے دوسرا شخص نیابتاً نماز نہیں پڑھ سکتا۔ دوسری قسم میں نیابت ہو سکتی ہے، مثلاً بیوی کے زیورات کی زکوٰۃ شوہر دے سکتا ہے۔ تیسری قسم میں نیابت صرف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس حالت میں ہو سکتی ہے جبکہ اصل شخص، جس کی طرف سے کوئی فعل کیا جا رہا ہے، اپنا فریضہ خود ادا کرنے سے عارضی طور پر نہیں بلکہ مستقل طور پر عاجز ہو، مثلاً حج بدل ایسے شخص کی طرف سے ہو سکتا ہے جو خود حج کے لیے جانے پر قادر نہ ہو اور نہ یہ امید ہو کہ وہ کبھی اس کے قابل ہو سکے گا۔ مالکیہ اور شافعیہ بھی اس کے قائل ہیں۔ البتہ امام مالکؒ حج بدل کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اگر باپ نے وصیت کی ہو کہ اس کا بیٹا اس کے بعد اُس کی طرف سے حج کرے تو وہ حج بدل کر سکتا ہے ورنہ نہیں۔ مگر احادیث اس معاملے میں بالکل صاف ہیں کہ باپ کا ایما یا وصیت ہو یا نہ ہو، بیٹا اس کی طرف سے حج بدل کر سکتا ہے۔

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ قبیلہ خثعم کی ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے باپ کو فریضۂ حج کا حکم ایسی حالت میں پہنچا ہے کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے، اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ نہیں سکتا۔ آپؐ نے فرمایا: فَحُجِّی عَنْهُ تو اُس کی طرف سے تُو حج کر لے۔ (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، نسائی) قریب قریب اسی مضمون کی روایت حضرت علیؓ نے بھی بیان کی ہے (احمد، ترمذی)۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ قبیلہ خثعم ہی کے ایک مرد کا ذکر کرتے ہیں کہ اس نے بھی اپنے بوڑھے باپ کے متعلق یہی سوال کیا تھا۔ حضورؐ نے پوچھا: کیا تو اس کا سب سے بڑا لڑکا ہے؟ اس نے عرض کیا: جی ہاں! فرمایا: اَرَأَیْتَ لَوْ کَانَ عَلٰی اَبِیْکَ دَیْنٌ فَقَضَیْتَهُ عَنْهُ اَکَانَ یَجْزِیْ ذٰلِکَ عَنْهُ. 'تیرا کیا خیال ہے، اگر تیرے باپ پر قرض ہو اور تو اس کو ادا کر دے تو وہ اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا؟' اس نے عرض کیا: جی ہاں! فرمایا: فَاحْجُجْ عَنْهُ. بس اسی طرح تو اس کی طرف سے حج بھی کر لے۔ (احمد، نسائی)

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت نے آ کر عرض کیا کہ میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی مگر وہ اس سے پہلے ہی مر گئی، اب کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: تیری ماں پر اگر قرض ہوتا تو کیا تو اس کو ادا نہ کر سکتی تھی؟ اسی طرح تم لوگ اللہ کا حق بھی ادا کرو، اور اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے ساتھ کیے ہوئے عہد پورے کیے جائیں۔ (بخاری، نسائی) بخاری اور مسند احمد میں ایک دوسری روایت یہ ہے کہ ایک مرد نے آ کر اپنی بہن کے بارے میں وہی سوال کیا جو اوپر مذکور ہوا ہے اور حضورؐ نے اس کو بھی وہی جواب دیا۔

(تفہیم القرآن، پنجم، ص ۲۱۸، النجم، حاشیہ ۳۸)

ناجائز دولت سے حج کرنا

س: مولانا محترم! کیا ایک عورت جس کی دولت حلال طریقوں سے اکٹھی نہ ہوئی ہو، حج پر جا سکتی ہے؟

ج: بہتر تو یہ ہے کہ وہ حج کے لیے جائز اور حلال طور پر کچھ پس انداز کر لے، لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو آپ اس کو حج سے روکنے والے نہ ثابت ہوں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کچھ توقف کے بعد فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص کے بارے میں عرض کیا گیا کہ وہ رات کو چوری کرتا ہے اور دن کو نماز پڑھتا ہے ___ حضورؐ نے فرمایا: اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، یا تو چوری اس سے نماز چھڑا دے گی۔ یا نماز اس سے چوری چھڑا دے گی۔

(۵-اے ذیلدار پارک، اوّل، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۲۵)

عورت کا محرم کے بغیر سفرِ حج

عورت کے بلا محرم حج کرنے کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اس معاملے میں چار مسلک پائے جاتے ہیں جنھیں مختصراً یہاں بیان کیے دیتا ہوں۔

۱۔ عورت کو کسی حال میں شوہر یا محرم کے بغیر حج نہ کرنا چاہیے۔ یہ مسلک ابراہیم نخعی، طاؤس، شعبی اور حسن بصری رحمھم اللہ سے منقول ہے اور حنبلی مذہب کا یہی فتویٰ ہے۔

۲۔ اگر حج کا سفر تین شبانہ روز سے کم کا ہو تو عورت بلا محرم جا سکتی ہے، لیکن اگر تین دن یا اس سے زائد کا سفر ہو تو شوہر یا محرم کے بغیر نہیں جا سکتی۔ امام ابو حنیفہؒ اور سفیانؒ ثوری کا یہی مذہب ہے۔

۳۔ جو عورت شوہر یا محرم نہ رکھتی ہو وہ ایسے لوگوں کے ساتھ جا سکتی ہے جن کی اخلاقی حالت قابلِ اطمینان ہو۔ یہ ابن سیرین، عطا، زُہری، قتادہ اور اوزاعی رحمھم اللہ کا مسلک ہے اور امام مالکؒ اور امام شافعی رحمھم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام شافعیؒ نے 'قابلِ اطمینان رفیقوں' کی مزید تشریح اس طرح کی ہے کہ اگر چند عورتیں بھروسے کے قابل ہوں اور وہ اپنے محرموں کے ساتھ جا رہی ہوں تو ایک بے شوہر اور بے محرم عورت اُن کے ساتھ جا سکتی ہے۔ البتہ صرف ایک عورت کے ساتھ اسے نہ جانا چاہیے۔

۴۔ ان سب کے خلاف ابنِ حزم ظاہری کا مسلک یہ ہے کہ بے محرم عورت کو تنہا ہی حج کے لیے جانا چاہیے۔ اگر وہ شوہر رکھتی ہو اور وہ اسے نہ لے جائے تو شوہر گناہ گار ہو گا مگر عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کے بغیر حج کو چلی جائے۔ میں ان چاروں مسالک میں سے تیسرے مسلک کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اس میں ایک دینی فریضے کو ادا کرنے کی گنجایش بھی ہے، اور اُس فتنے کا احتمال بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے حدیث میں عورت کے بلا محرم سفر کرنے کو منع کیا گیا ہے۔

(رسائل و مسائل، دوم، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۶-۲۰۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب سوم

قربانی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

تاریخی پس منظر

آج سے چار ہزار برس پہلے کی بات ہے کہ عراق کی سرزمین میں ایک شخص پیدا ہوا تھا جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسانی تاریخ پر اپنا ایک مستقل نشان چھوڑ گیا ہے۔ جس زمانے میں اس نے آنکھیں کھولیں اس وقت تمام دنیا شرک اور بُت پرستی میں مبتلا تھی۔ جس قوم میں وہ پیدا ہوا وہ ایک ستارہ پرست قوم تھی، چاند، سورج اور دوسرے سیارے اس کے خدا تھے اور شاہی خاندان انھی خداؤں کی اولاد ہونے کی حیثیت سے اہلِ ملک کا رب مانا جاتا تھا۔ جس خاندان میں وہ پیدا ہوا وہ پروہتوں کا خاندان تھا۔ اور اپنی قوم کو ستارہ پرستی کے جال میں پھانسے رکھنے کا اصل ذمہ دار وہی تھا۔

ایسے زمانے، ایسی قوم، اور ایسے خاندان میں یہ شخص پیدا ہوا۔ دنیا کی عام روش پر چلنے والا ہوتا تو وہ بھی اسی راستے پر جاتا جس پر اس کے خاندان کے لوگ، اس کے ملک کے لوگ اور اس کے زمانے کے لوگ چلے جارہے تھے۔ کوئی ایسی روشنی بظاہر اس وقت دنیا میں کہیں موجود بھی نہ تھی جو کسی دوسرے راستے کی طرف رہنمائی کرنے والی ہو۔ اور اس کے ذاتی و خاندانی مفاد کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ کسی اور راستے کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لاتا، کیونکہ اس کے خاندان کی مذہبی دکان تو اسی ستارہ پرستی کے بل پر زور شور سے چل رہی تھی۔ لیکن وہ ان انسانوں میں سے نہ تھا جو بے شعور خس و خاشاک کی طرح اسی رخ پر اڑنے لگتے ہیں جدھر کی ہوا ہو۔ وہ موروثی تعصب کی بنا پر باپ دادا اور قوم کے طریقے کو بے چون و چرا قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی یہ تحقیق کرنا ضروری سمجھا کہ جن عقیدوں اور اصولوں پر اس کے بزرگوں نے اور اس کی ساری قوم نے اپنی زندگی کی عمارت قائم کر رکھی ہے وہ بجائے خود صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ اس آزادانہ تحقیقات کے سلسلے میں اس نے سورج، چاند، زہرا اور ان سب معبودوں پر نگاہ ڈالی جن کی خدائی کے چرچے وہ بچپن سے سنتا آیا تھا۔ ایک ایک کو جانچ کر دیکھا کہ اس پر خدائی کا گمان کہاں تک سچا ہے۔ اور آخر کار یہ بے لاگ رائے قائم کی کہ دراصل یہ سب بندے ہیں، خدائی صرف اس ایک ہستی کی ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے۔

پھر جب یہ حقیقت اس پر منکشف ہوگئی تو اس نے ان لوگوں کی سی روش اختیار نہیں کی جو ایک بات کو حق جاننے اور سمجھنے کے باوجود اسے قبول نہیں کرتے۔ اس نے حق کو حق جاننے کے بعد اسے ماننے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کی۔ فوراً اقرار کیا: میں جھک گیا اُس خدا کے آگے جو زمین اور آسمانوں کا خالق ہے۔ اور اس اقرار کے ساتھ اپنی برادری اور قوم کے سامنے یہ اعلان بھی کردیا کہ میرا راستہ تم سے الگ ہے، میں اس شرک اور بت پرستی میں تمھارے ساتھ نہیں ہوں .... یہ اُس شخص کی پہلی قربانی تھی۔ یہ پہلی چھری تھی جو اس نے باپ دادا کی اندھی تقلید پر، خاندانی اور قومی تعصبات پر، اور نفس کی ان تمام کمزوریوں پر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پھیر دی جن کی وجہ سے آدمی اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف ایک راستے پر صرف اس لیے چلتا رہتا ہے کہ برادری اور قوم اور دنیا اسی پر چلی جارہی ہے۔

اس اقرار و اعلان کے بعد یہ شخص خاموش نہیں بیٹھ گیا۔ اس پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ کائنات کی اصل حقیقت توحید ہے اور شرک سراسر ایک بے بنیاد چیز ہے۔ اس حقیقت کو جان لینے کے بعد وہ خود ہی یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ سب انسان جو توحید کے بجائے شرک کے عقیدوں اور مشرکانہ اُصولوں پر اپنے مذہب، اخلاق اور تمدن کی عمارت قائم کیے ہوئے ہیں انھوں نے دراصل ایک ایسی شاخِ نازک پر آشیانہ بنا رکھا ہے جو سخت ناپائدار ہے۔ اس احساس نے اس کو بے چین کر دیا۔ وہ پورے احساسِ فرض کے ساتھ کھڑا ہو گیا کہ اپنی قوم کو شرک سے روکے اور توحید کی طرف دعوت دے۔ اسے معلوم تھا کہ قومی مذہب کے خلاف اس طرح کی علانیہ تبلیغ کر کے وہ خود پروہت کی گدی سے محروم ہو جائے گا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا خاندان اگر قومی مذہب سے پھر گیا تو وہ ساری وجاہت ختم ہو جائے گی جو اسے ملک میں حاصل ہے۔ اس کو یہ بھی خبر تھی کہ اس تبلیغ کی وجہ سے ساری قوم کا غصہ اس پر بھڑک اُٹھے گا۔ وہ اس بات سے بھی بے خبر نہ تھا کہ یہ تبلیغ اسے حکومت کے عتاب میں مبتلا کر دے گی کیونکہ شاہی خاندان کے اقتدار کی بنیاد ہی وہاں یہ عقیدہ تھا کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہے اور اس بنا پر توحید لازماً حکومت کے بنیادی نظریے سے ٹکراتی تھی۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود وہ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اٹھا، اپنے باپ کو، اپنے خاندان کو، اپنی قوم کو اور بادشاہ تک کو اس نے شرک سے باز آنے اور توحید کا عقیدہ قبول کرنے کی دعوت دی اور جتنی زیادہ اس کی مخالفت کی گئی اتنی ہی زیادہ اس کی سرگرمی بڑھتی چلی گئی۔ آخر کار نوبت یہ آگئی کہ ایک طرف وہ تن تنہا انسان تھا اور دوسری طرف اس کے مقابلے میں بادشاہ، ملک، برادری، خاندان، حتیٰ کہ اس کا اپنا باپ تک صف آرا تھا۔ اب پورے ملک میں کوئی اس کا دوست نہ تھا۔ ہر طرف دشمن ہی دشمن تھے۔ ایک ہمدردی کی آواز بھی اس کے حق میں اُٹھنے والی نہ تھی۔ اس پر بھی جب اس نے ہمت نہ ہاری اور توحید کی دعوت پیش کرنے سے اس کی زبان نہ تھکی تو فیصلہ کیا گیا کہ برسرِ عام اسے زندہ جلا دیا جائے۔ مگر اس ہول ناک سزا کا خوف بھی اسے باطل کو باطل اور حق کو حق کہنے سے باز نہ رکھ سکا۔ اس نے آگ کے الاؤ میں پھینکا جانا گوارا کر لیا مگر یہ گوارا نہ کیا کہ جس حقیقت پر وہ ایمان لا چکا تھا اس سے پھر جائے اور اسے حقیقت کہنا چھوڑ دے ــــــ یہ اس کی دوسری عظیم الشان قربانی تھی۔

نامعلوم کس طرح خدا نے اُسے آگ میں جلنے سے بچا لیا۔ اس خطرے سے بخیریت گزر جانے کے بعد اس کے لیے ملک میں ٹھہرنا غیر ممکن تھا۔ آخر کار اس نے جلاوطنی کی زندگی اختیار کی۔ آس پاس کے سارے ملک جن میں وہ جا سکتا تھا اُس وقت بت پرست تھے۔ کہیں کوئی ایسی چھوٹی سے چھوٹی برادری یا سوسائٹی بھی موجود نہ تھی جو توحید کی قائل ہوتی، جس کے پاس وہ پناہ لے کر امن کی زندگی پا سکتا۔ اس حالت میں امن پانے کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ وہ اپنے ملک سے نکل جانے کے بعد دعوتِ توحید سے زبان بند کر لیتا۔ انفرادی طور پر اگر ایک اجنبی آدمی کسی مذہب کا پیرو ہو تو دوسرے ملکوں کے لوگ اسے خواہ مخواہ چھیڑنے کی تکلیف کیوں کرنے لگے تھے۔ بلکہ انھیں یہ معلوم ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ مگر یہ خدا کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بندہ دوسرے ملکوں میں بھی جا کر خاموش نہ رہا۔ جہاں بھی گیا اس نے خدا کے سب بندوں کو یہی دعوت دی کہ دوسروں کی بندگی چھوڑ دو اور صرف اُسی ایک خدا کے بندے بن کر رہو جو حقیقت میں تمھارا خدا ہے۔ اس تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ملک سے نکل کر بھی اسے کہیں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ کبھی شام میں ہے تو کبھی فلسطین میں، کبھی مصر میں ہے تو کبھی حجاز میں۔ غرض ساری عمر یوں ہی ملک ملک کی خاک چھانتے گزر گئی۔ اس کو آرام کے ٹھکانے کی طلب نہ تھی۔ اس کو گھر اور کھیت اور مویشی اور کاروبار کی طلب نہ تھی۔ اس کو دنیا کے عیش اور زندگی کے سروسامان کی طلب نہ تھی۔ اسے صرف اس چیز کی طلب تھی کہ جس حق پر وہ ایمان لایا ہے اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کے بنی نوع گمراہی کو چھوڑ کر اس سیدھی راہ پر چلنے لگیں جس میں ان کا اپنا بھلا ہے۔ یہی طلب اسے جگہ جگہ لیے پھرتی تھی اور اسی طلب کے پیچھے اس نے اپنے ہر مفاد کو تج دیا ـــــ یہ اس کی تیسری قربانی تھی۔

اس خانہ بدوشی اور بے سروسامانی کے عالم میں پھرتے پھرتے جب عمر تمام ہونے کو آئی تو خدا نے اسے ایک بیٹا دیا۔ اس بچے کو پالا پوسا۔ یہاں تک کہ وہ اس عمر کو پہنچا جب اولاد والدین کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانے اور زندگی کی دوڑ دھوپ میں ان کا ساتھ دینے کے قابل ہوتی ہے۔ بیٹا اور وہ بھی اکلوتا بیٹا۔ پھر عنفوانِ شباب کو پہنچا ہوا، اور باپ زندگی کے اُس مرحلے میں جب کہ آدمی جوان اولاد کے سہارے کا سب سے بڑا محتاج ہوتا ہے۔ ہر شخص اس صورت حال کا تصور کر کے اندازہ کر سکتا ہے کہ اس باپ کو وہ بیٹا کیسا کچھ عزیز ہوگا۔ مگر مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ اسے خدا اور اس کی مرضی سے بڑھ کر کوئی چیز بھی عزیز نہ ہو۔ اس لیے وہ ساری قربانیاں بھی کافی نہ سمجھی گئیں جو یہ بندہ اپنے خدا کے لیے ساری عمر کرتا رہا تھا۔ ان سب کے بعد اس کا آخری امتحان لینا ضروری سمجھا گیا اور وہ یہ تھا کہ یہ بندۂ مسلم اپنے اس عزیز ترین بیٹے کی محبت کو بھی خدا کی محبت پر قربان کر سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ یہ امتحان بھی لے ڈالا گیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ بوڑھا انسان اپنے خدا کا صریح حکم نہیں، محض ایک اشارہ پاتے ہی اکلوتے نوجوان بیٹے کو خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ خدا نے عین ذبح کے وقت لڑکے کی جگہ مینڈھے کو قبول کر لیا، کیونکہ خدا کو لڑکے کا خون مطلوب نہ تھا، محض محبت کی آزمایش مقصود تھی، لیکن اس سچے مسلمان نے اپنی نیت کی حد تک تو اپنا لختِ جگر اپنے خدا کے اشارے پر قربان کر ہی دیا تھا۔ یہ تھی وہ آخری اور سب سے بڑی قربانی جسے اس شخص نے اپنے اسلام اور ایمان، اور خدا کے ساتھ اپنی وفاداری کے ثبوت میں پیش کیا تھا۔ اسی کے صلے میں خدا نے اسے تمام دنیا کے انسانوں کا امام بنایا اور اپنی دوستی کے مرتبے پر سرفراز کیا۔

آپ سمجھے کہ یہ کس شخص کا ذکر ہے؟ یہ اُس ذاتِ گرامی کا ذکر ہے جسے آج ہم سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے جانتے ہیں۔ اور یہی وہ قربانی ہے جس کی یادگار آج دنیا بھر کے مسلمان جانوروں کی قربانی کر کے مناتے ہیں۔ اس یادگار کے منانے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان کے اندر قربانی کی وہی روح، اسلام و ایمان کی وہی کیفیت اور خدا کے ساتھ محبت و وفاداری کی وہی شان پیدا ہو جس کا مظاہرہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی پوری زندگی میں کیا ہے۔ اگر کوئی شخص محض ایک جانور کے گلے پر چھری پھیرتا ہے اور اس کا دل اس روح سے خالی رہتا ہے تو وہ ناحق ایک جان دار کا خون بہاتا ہے۔ خدا کو اس کے خون اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گوشت کی کوئی حاجت نہیں۔ وہاں تو جو چیز مطلوب ہے وہ دراصل یہ ہے کہ جو شخص کلمہ لا الہ الا اللہ پر ایمان لائے وہ مکمل طور پر بندۂ حق بن کر رہے۔ کوئی تعصب، کوئی دل چسپی، کوئی ذاتی مفاد، کوئی دباؤ اور لالچ، کوئی خوف اور نقصان، غرض کوئی اندر کی کمزوری اور باہر کی طاقت اس کو حق کے راستے سے نہ ہٹا سکے۔ وہ خدا کی بندگی کا اقرار کرنے کے بعد پھر کسی دوسری چیز کی بندگی قبول نہ کرے۔ اس کے لیے ہر تعلق کو قربان کر دینا آسان ہو، مگر اس تعلق کو قربان کرنا کسی طرح ممکن نہ ہو جو اس نے اپنے خدا سے قائم کیا ہے۔ یہی قربانی اسلام کی اصل حقیقت ہے اور آج ہر زمانے سے بڑھ کر ہم اس کے محتاج ہیں کہ یہ حقیقت ہماری سیرتوں میں پیوست ہو۔ مسلمانوں نے جب کبھی دنیا میں چوٹ کھائی ہے اسلام کی اسی حقیقت سے خالی ہو کر کھائی ہے۔

(نشری تقریریں، فروری ۱۹۷۸ء، ص ۹۷-۱۰۳)

تاریخی دن کا انتخاب

(قربانی) کے لیے حضورؐ نے وہ خاص دن انتخاب فرمایا جس دن تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ زرّیں کارنامہ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے انجام دیا تھا۔ یعنی یہ کہ بوڑھا باپ اپنے رب کا ایک اشارہ پاتے ہی اپنے اکلوتے جوان بیٹے کو قربان کر دینے کے لیے ٹھنڈے دل سے آمادہ ہو گیا، اور بیٹا بھی یہ سن کر کہ مالک اس کی جان کی قربانی چاہتا ہے، چھری تلے گردن رکھ دینے پر بہ خوشی راضی ہو گیا۔ اس طرح یہ محض قربانی کی عبادت نہ رہی بلکہ ایک بڑے تاریخی واقعے کی یادگار بھی بن گئی جو ایمانی زندگی کے اس منتہائے مقصود، اس کے اس آئیڈیل اور مثل اعلیٰ کو مسلمانوں کے سامنے تازہ کرتی ہے انھیں اللہ کی رضا پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ قربانی کا حکم بجالانے اور عید کا تہوار منانے کے لیے سال کا کوئی دن بھی مقرر کیا جا سکتا تھا۔ اس سے دوسرے تمام فوائد حاصل ہو جاتے، مگر یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ اس کے لیے اس خاص تاریخ کا انتخاب بیک کرشمہ دو کار کا مصداق ہے۔ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس انتخاب کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے۔ آپؐ سے پوچھا گیا: ما ھذہ الاضاحی، یہ قربانیاں کیسی ہیں؟ فرمایا: سنۃ ابیکم ابراھیم، یہ تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس واقعے کے بعد ہر سال اسی تاریخ کو جانور قربان فرمایا کرتے تھے۔ حضورؐ نے اس سنت کو زندہ کیا اور اپنی امت کو ہدایت فرمائی کہ قرآن میں قربانی کا جو عام حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل خصوصیت کے ساتھ اس روز کریں جس روز حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اس عظیم الشان قربانی کی یاد تازہ کیا کرتے تھے۔ اپنی تاریخ کے یادگار واقعات کا 'یوم' دنیا کی ہر قوم منایا کرتی ہے۔ اسلام کا مزاج، یادگار منانے کے لیے بھی اس دن کا انتخاب کرتا ہے جس میں دو بندوں کی طرف سے خدا پرستی کے انتہائی کمال کا مظاہرہ ہوا۔

(مسئلہ قربانی، اگست ۱۹۷۹ء، ص ۲۰-۲۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

اہمیت

قربانی کی مصلحتیں

ہر شخص جو حکمتِ تشریع[1] میں ادنیٰ بصیرت بھی رکھتا ہے، اس کے لیے یہ سمجھنا بھی کچھ مشکل نہیں کہ شرک و بت پرستی اور رسوم جاہلیت کو مٹانے کے لیے اس سے زیادہ کارگر کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی کہ جن اقسام اور جن شکلوں کی عبادتیں مشرک قوموں میں رائج ہوں اُن سب کو اللہ کے لیے مخصوص کر دیا جائے اور غیر اللہ کے لیے انھی سب کو ممنوع ٹھہرا دیا جائے۔ دنیا میں توحید فی العبادت اور اس کے ذریعے سے توحید فی الاعتقاد کا قیام بغیر اس تدبیر کے ممکن ہی نہ تھا۔ یہ بات کچھ انسان کی فطرت ہی میں ہے کہ وہ جس کسی کو اپنا ملجاو ماویٰ سمجھتا ہے اس کے سامنے نذر و نیاز اور قربانی ضرور پیش کرتا ہے۔ چنانچہ ابتدائے آفرینش سے آج تک دنیا میں کم وبیش اس طریقِ عبادت کا سلسلہ جاری ہے۔ حتیٰ کہ جہالت کی بنا پر خود مسلمان بھی اس قسم کے شرک فی العبادت میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ پس جب عبادت کے مختلف طریقوں میں سے ایک یہ طریقہ بھی نوعِ انسانی میں رائج ہے اور اس طریقے کی طرف نوعِ انسانی میں ایک فطری میلان پایا جاتا ہے تو اخلاص فی العبادت کے لیے ناگزیر ہے کہ نذر و نیاز اور قربانی کو بھی غیر اللہ کے لیے ممنوع کر کے صرف اللہ کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔

اس چیز کی عقلی و روحانی اور اخلاقی و مادّی منفعت سطحی نظروں کو اگر محسوس نہ ہو تو یہ اُن کی اپنی نظر کا قصور ہے۔ اللہ کے علم اور اس کی حکمت میں تو لوگوں کا مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ[2] اور حُنَفَآءَ لِلّٰهِ بن جانا اس سے بدرجہا زیادہ مفید ہے کہ اُن کے لیے ایک نہیں دس لاکھ عظیم الشان بنک کھل جائیں یا ۲۰ ہزار کالج قائم ہو جائیں۔

قربانی کی ایک دوسری مصلحت بھی ہے جس پر قرآن سے روشنی پڑتی ہے۔

نوعِ انسانی کا ایک گروہ تو وہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے، یعنی وہ جو خدا کے ساتھ اس کی مخلوق کو اعتقاد اور عبادت میں شریک ٹھہراتا ہے اور خدا کے بخشے ہوئے رزق سے غیر خدا کے سامنے نذریں اور قربانیاں پیش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا گروہ بھی ہمیشہ موجود رہا ہے اور اب بڑھتا جا رہا ہے، اور یہ وہ گروہ ہے جو سرے سے خدا کا قائل ہی نہیں، یا اگر ہے بھی تو محض وجوب عقلی کی بنا پر اس کو اس طرح مانتا ہے جیسے ریاضی کے کسی فارمولے کو مانتا ہے۔ باقی رہا خدا سے کوئی تعلق تو وہ ان کے ہاں مفقود ہے۔ ان لوگوں کو یہ احساس تک نہیں کہ دنیا کے جس مال و متاع سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، جس زمین کی پیداوار کھا رہے ہیں، جس دولت وثروت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، جن حیوانات سے خدمت لے رہے ہیں، ان میں کسی چیز کے بھی وہ مالک

۱۔ درست لفظ 'تشریع' ہے یعنی عین کے ساتھ۔ تفہیمات کے کاتب نے غلطی سے حاء کے ساتھ لکھا ہے۔ (مرتبین)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں ہیں، نہ کسی چیز پر ان کو ذاتی استحقاق حاصل ہے، بلکہ یہ خدا کی بخشش اور اس کا انعام ہے۔ یہ غفلت جس میں لوگ مبتلا ہیں، اُن کو کیسے کیسے روحانی، اخلاقی اور عملی مفاسد میں مبتلا کر رہی ہے اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ آج ہر آنکھوں والا اُن خرابیوں کا برأی العین مشاہدہ کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھی مفاسد کا سدِ باب کرنے کے لیے مال و دولت اور زمین کی پیداوار میں سے زکوٰۃ کا، اور حیوانی دولت میں سے قربانی کا قاعدہ مقرر کیا، تا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو کچھ رزق عطا فرمایا ہے اس کا ایک حصہ وہ ہمیشہ خدا کی جناب میں نذر کرتا رہے اور یہ حقیقت اس کو یاد رہے کہ ہم ان چیزوں کے مالک اور مختارِ مطلق نہیں ہیں، بلکہ یہ بغیر کسی استحقاق ذاتی کے ہم کو عطا کی گئی ہیں، اور ان میں عطا کرنے والے کی مرضی کے خلاف تصرف کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔

دیکھیے اس مضمون کی طرف آیاتِ ذیل میں کس قدر لطیف اشارے کیے گئے ہیں:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ ...... كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ (الانعام ۶: ۱۴۱-۱۴۲) اور وہی ہے جس نے باغ اُگائے ہیں جن میں سے کسی میں بیلیں ٹٹیوں چڑھائی جاتی ہیں اور کسی میں نہیں چڑھائی جاتیں، اور اسی نے نخلستان اور کھیت پیدا کیے ہیں......... جب وہ پھل لائیں تو ان کے پھل کھاؤ اور فصل کاٹتے وقت اس کا (یعنی خدا کا) حق ادا کرو اور حد سے نہ گزرو کہ وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اسی نے جانوروں میں سے بعض بلند قامت پیدا کیے ہیں جو بار برداری کے کام آتے ہیں اور بعض پست قامت ہیں۔ اللہ نے تم کو جو کچھ دیا ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۭ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ۭ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰي مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (الحج ۲۲: ۳۴-۳۵) اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مقرر کر دی ہے تا کہ وہ اللہ کا نام لیں اُن جانوروں پر جو اللہ نے ان کو بخشے ہیں۔ پس یاد رکھو کہ تمھارا خدا وہی ایک خدا ہے۔ اسی کی اطاعت میں تم سرِ تسلیم خم کرو۔ اور اے نبیؐ! اُن عاجزی کرنے والوں کو خوش خبری سنا دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز اُٹھتے ہیں اور جو مصیبتوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہتے ہیں اور جو نماز پڑھتے ہیں اور ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔

یہ رسمِ قربانی کی دوسری مصلحت ہے۔ اگر کسی کے پاس عقلی ترازو ہو تو وہ ایک پلڑے میں اس کو رکھے اور دوسرے پلڑے میں اُن تمام قومی اداروں اور تجارتی بینکوں اور یتیم خانوں کو رکھے جنھیں چندہ دینے کے لیے یہ مخالفینِ حدیث قربانی کو بند کرانا چاہتے ہیں، اور پھر موازنہ کر کے ہمیں بتائے کہ ان دونوں میں سے کون سا زیادہ وزنی ہے۔

(تفہیمات، دوم اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۲۳۷-۲۴۱)

قربانی کی حکمت

لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ڰ (الحج ۲۲: ۳۶) تمھارے لیے اُن میں بھلائی ہے۔

یعنی تم ان سے بکثرت فائدے اٹھاتے ہو۔ یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ تمھیں ان کی قربانی کیوں کرنی چاہیے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آدمی خدا کی بخشی ہوئی جن جن چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے ان میں سے ہر ایک کی قربانی اس کو اللہ کے نام پر کرنی چاہیے، نہ صرف شکرِ نعمت کے لیے، بلکہ اللہ کی برتری اور مالکیت تسلیم کرنے کے لیے بھی، تاکہ آدمی دل میں بھی اور عمل سے بھی اس امر کا اعتراف کرے کہ یہ سب کچھ خدا کا ہے جو اس نے ہمیں عطا کیا ہے۔ ایمان اور اسلام نفس کی قربانی ہے۔ نماز اور روزہ جسم اور اس کی طاقتوں کی قربانی ہے۔ زکوٰۃ اُن اموال کی قربانی ہے جو مختلف شکلوں میں ہم کو اللہ نے دیے ہیں۔ جہاد وقت اور ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کی قربانی ہے۔ قتال فی سبیل اللہ جان کی قربانی ہے۔ یہ سب ایک ایک طرح کی نعمت اور ایک ایک عطیے کے شکریے ہیں۔ اسی طرح جانوروں کی قربانی بھی ہم پر عائد کی گئی ہے تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کی اس عظیم الشان نعمت پر اُس کا شکر یہ ادا کریں اور اس کی بڑائی مانیں کہ اس نے اپنے پیدا کیے ہوئے بکثرت جانوروں کو ہمارے لیے مسخر فرمایا جن پر ہم سوار ہوتے ہیں جن سے کھیتی باڑی اور بار برداری کی خدمت لیتے ہیں، جن کے گوشت کھاتے ہیں، جن کے دودھ پیتے ہیں، جن کی کھالوں اور بالوں اور خون اور ہڈی، غرض ایک ایک چیز سے بے حساب فائدے اٹھاتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۲۷، الحج، حاشیہ ۶۸)

قربانی کا حکم، قرآن میں

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قربانی کے متعلق قرآن مجید کیا کہتا ہے۔ کیا وہ قربانی کو صرف حج اور متعلقاتِ حج تک محدود رکھتا ہے، یا دوسرے حالات میں بھی اس کا حکم دیتا ہے؟ اس باب میں دو آیتیں بالکل صاف ہیں جن کا حج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پہلی آیت سورۂ انعام کے آخری رکوع میں ہے:

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (الانعام ۶: ۱۶۲-۱۶۳) اے نبی! کہو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت خم کرنے والا میں ہوں۔

یہ آیت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی تھی جب کہ نہ حج فرض ہوا تھا نہ اس کے مراسم و مناسک مقرر ہوئے تھے۔ اور اس میں کوئی اشارہ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ اس حکم سے مراد حج میں قربانی کرنا ہے۔ نُسک کا لفظ جو اس آیت میں مستعمل ہوا ہے اسے خود قرآن مجید میں دوسری جگہ قربانی ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا أَوْ بِهٖٓ أَذًى مِّنْ رَّأْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ۚ (البقرہ ۲: ۱۹۶) تم میں سے جو شخص سفرِ حج میں بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں تکلیف ہو اور وہ سر منڈوالے تو فدیے میں روزے رکھے، یا صدقہ دے یا قربانی دے۔

اس نظیر سے معلوم ہوا کہ سورۂ انعام کی مذکورہ بالا آیت میں بھی نُسک کے معنی قربانی کے ہیں۔ تاہم اگر اس لفظ کو عام عبادات کے معنی میں بھی لیا جائے تو قربانی کا مفہوم اس میں ضرور شامل مانا جائے گا۔

دوسری آیت سورۂ کوثر میں ہے:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ (الکوثر ۱۰۸: ۲) پس اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔

یہ آیت بھی مکی ہے اور اس میں بھی کوئی اشارہ یا قرینہ ایسا نہیں ہے جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ قربانی کا یہ حکم حج کے لیے خاص ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اہل لغت نے نحر کے معنی سینے پر ہاتھ باندھنے، اور قبلہ رخ ہونے اور اوّل وقت نماز پڑھنے کے بھی بیان کیے ہیں، لیکن یہ سب دور کے معنی ہیں۔ عام فہم عربی میں اس لفظ کا مفہوم قربانی کرنا ہی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ احکام القرآن میں علامہ جصّاص لکھتے ہیں:

جن لوگوں نے اس کے معنی اونٹ ذبح کرنے کے بیان کیے ہیں انھی کی بات صحیح ہے، کیونکہ اس لفظ کا حقیقی مفہوم یہی ہے۔ اور مطلق لفظ نحر سن کر ایک عرب اس مفہوم کے سوا اور کوئی مفہوم نہ سمجھے گا۔ اگر کہا جائے کہ فلاں شخص نے آج نحر کیا ہے تو ہر شخص یہی سمجھے گا کہ اس نے آج اونٹ ذبح کیا، نہ یہ کہ اس نے آج بائیں ہاتھ پر سیدھا ہاتھ باندھا۔ (احکام القرآن، سوم، ص ۵۸۵)

یہی وجہ ہے کہ قرآن کے تمام مترجمین، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب، مولانا محمود الحسن، مولانا اشرف علی صاحب، ڈپٹی نذیر احمد صاحب وغیرہم نے بالاتفاق اس لفظ کا ترجمہ قربانی ہی کیا ہے۔

قربانی کا حکم حدیث میں

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے اس حکم کا منشا کیا سمجھا اور اس پر کیا عمل فرمایا۔ کیا آپؐ نے صرف حج ہی میں قربانی کی ہے، یا مدینہ طیبہ میں بھی آپ عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کرتے رہے؟ اور کیا آپؐ نے بقرعید پر قربانی کبھی کبھار کی ہے یا بالالتزام کرتے رہے؟ اور کیا آپؐ نے محض بذاتِ خود اس پر عمل کیا ہے یا مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا ہے؟ اس باب میں جو مستند روایات ہم تک پہنچی ہیں، میں انھیں بے کم و کاست یہاں نقل کیے دیتا ہوں۔

۱۔ عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمِ اِنَّ اَوَّلَ مَانَبْدَأُ بِهٖ فِيْ يَوْمِنَا هٰذَا اَنْ نُصَلِّيَ ثُمَّ نَرْجِعَ فَنَنْحَرَ۔ مَنْ فَعَلَهٗ فَقَدْ اَصَابَ سُنَّتَنَا وَ مَنْ ذَبَحَ قَبْلُ فَاِنَّمَا هُوَ لَحْمٌ قَدَّمَهٗ لِأَهْلِهٖ لَيْسَ مِنَ النُّسُكِ فِيْ شَيْءٍ۔

۲۔ وَ فِيْ رِوَايَةٍ مَنْ ذَبَحَ بَعْدَ الصَّلٰوةِ تَمَّ نُسُكُهٗ وَاَصَابَ سُنَّةَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (بخاری، کتاب الاضاحی)

براء بن عازب کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلا کام جس سے ہم آج کے روز ابتدا کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں پھر واپس جا کر قربانی کرتے ہیں[1]۔ جس نے اس پر عمل کیا اس نے ہمارے طریقے کے مطابق کیا، اور جس نے نماز سے پہلے ذبح کر لیا تو اس کا شمار قربانی میں نہیں ہے بلکہ وہ گوشت ہے جو اس نے اپنے گھر والوں کے لیے مہیا کیا۔

۱۔ صریح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ اور اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ کی تفسیر ہے۔ نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] نے ٹھیک ٹھیک قرآن کی ہدایت کے مطابق یہ طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ پہلے نماز پڑھی جائے پھر قربانی کی جائے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسری روایت میں ہے کہ جس نے نماز کے بعد ذبح کیا اس کی قربانی پوری ہوئی اور اس نے مسلمانوں کا طریقہ پالیا۔

ظاہر ہے کہ یہ روایت بقرعید ہی سے متعلق ہے اور اس کا کوئی تعلق حج سے نہیں ہے، کیونکہ حج میں کوئی خاص نماز ایسی نہیں ہے جس سے پہلے قربانی کرنا اس سنت مسلمین کے خلاف اور بعد قربانی کرنا اس سنت کے مطابق ہے۔

۳۔ قَالَ يَحْيٰى بْنُ سَعِيْدٍ سَمِعْتُ اَبَا اُمَامَةَ بْنَ سَهْلٍ قَالَ كُنَّا نُسَمِّنُ الْاُضْحِيَةَ بِالْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ الْمُسْلِمُوْنَ يُسَمِّنُوْنَ۔ (بخاری، کتاب الاضاحی) یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے ابوامامہ ابن سہل انصاری سے سنا، وہ کہتے تھے کہ ہم لوگ مدینے میں قربانی کے جانور کو خوب کھلا پلا کر موٹا کرتے تھے اور عام مسلمانوں کا یہی طریقہ تھا۔

۴۔ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُضَحِّيْ بِكَبْشَيْنِ وَاَنَا اُضَحِّيْ بِكَبْشَيْنِ (بخاری، کتاب الاضاحی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص انس بن مالک کہتے ہیں: حضور دو مینڈھوں کی قربانی کیا کرتے تھے اور میں بھی دو ہی مینڈھوں کی قربانی کرتا ہوں۔

۵۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَلْاُضْحِيَةُ كُنَّا نَمْلَحُ مِنْهُ فَنُقَدِّمُ بِهٖ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ۔ (بخاری، کتاب الاضاحی) حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ہم مدینے میں قربانی کے گوشت کو نمک لگا کر رکھ دیا کرتے تھے اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔

۶۔ عَنْ اَبِیْ عُبَيْدٍ مَوْلٰى بْنِ اَزْهَرٍ اَنَّهٗ شَهِدَ الْعِيْدَ يَوْمَ الْاَضْحٰى مَعَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَصَلّٰى قَبْلَ الْخُطْبَةِ ثُمَّ خَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ نَهَاكُمْ عَنْ صِيَامِ هٰذَيْنِ الْعِيْدَيْنِ اَمَّا اَحَدُهُمَا فَيَوْمُ فِطْرِكُمْ مِنْ صِيَامِكُمْ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيَوْمٌ تَاْكُلُوْنَ مِنْ نُسُكِكُمْ (بخاری، کتاب الاضاحی) ابوعبید مولیٰ ابن ازہر کہتے ہیں کہ انھوں نے بقرعید کے روز حضرت عمرؓ کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپ نے پہلے نماز پڑھائی۔ پھر خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور فرمایا: لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو ان دونوں عیدوں میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک عید تو تمھارے لیے افطار کا دن ہے، رہی یہ دوسری عید تو اس میں تم قربانی کا گوشت کھاتے ہو۔

یہاں یہ بات جان لینی چاہیے کہ حج میں بقرعید کی نماز سرے سے ہوتی ہی نہیں ہے، لہٰذا حضرت عمرؓ کا یہ خطبہ یقینی طور پر مدینہ طیبہ میں ہوا ہے اور جو حکم انھوں نے بقرعید کی قربانی کے متعلق بیان کیا ہے اس کا تعلق بھی لازماً مکے سے باہر دوسرے مقامات سے ہے۔

۷۔ قَالَ اَبُو الزُّبَيْرِ اَنَّهٗ سَمِعَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ يَقُوْلُ صَلّٰى بِنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ النَّحْرِ بِالْمَدِيْنَةِ فَتَقَدَّمَ رِجَالٌ فَنَحَرُوْا وَظَنُّوْا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ نَحَرَ فَاَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ كَانَ نَحَرَ قَبْلَهٗ اَنْ يُعِيْدَ بِنَحْرٍ اٰخَرَ وَلَا يَنْحَرُوْا حَتّٰى يَنْحَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (مسلم، باب وقت الاضحیہ) ابوالزبیر کہتے ہیں: میں نے جابر بن عبداللہ سے سنا وہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یوم النحر کو مدینے میں نماز پڑھائی پھر بعض لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ حضورؐ قربانی کر چکے ہیں آگے بڑھ کر اپنے جانور قربان کر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیے۔اس پر حضورؐ نے حکم دیا کہ جس نے مجھ سے پہلے قربانی کر لی ہے اسے پھر دوسری قربانی کرنی چاہیے اور آئندہ کوئی شخص اس وقت تک قربانی نہ کرے جب تک کہ میں نہ کرلوں۔

۸۔ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِيْدَ الْاُضْحٰى فَلَمَّا انْصَرَفَ اُتِىَ بِكَبْشٍ فَذَبَحَهٗ فَقَالَ بِسْمِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَنِّىْ وَ عَمَّنْ لَمْ يُضَحِّ مِنْ اُمَّتِىْ۔ (مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی) جابر بن عبداللہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بقرعید کی نماز پڑھی۔پھر جب آپؐ پلٹے تو آپ کی خدمت میں ایک مینڈھا پیش کیا گیا۔اور آپؐ نے اسے ذبح کرتے ہوئے فرمایا: اللہ کے نام پر اور اللہ سب سے بڑا ہے۔خدایا! یہ میری طرف سے اور میری امت کے ان سب لوگوں کی طرف سے ہے جنھوں نے قربانی نہ کی ہو۔

۹۔ عَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ عَنْ اَبِىْ رَافِعٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَاضَحّٰى اِشْتَرٰى كَبْشَيْنِ سَمِيْنَيْنِ اَقْرَنَيْنِ اَمْلَحَيْنِ فَاِذَا صَلّٰى وَ خَطَبَ النَّاسَ اُتِىَ بِاَحَدِهِمَا وَ هُوَ قَائِمٌ فِىْ مُصَلَّاهُ فَذَبَحَهٗ بِنَفْسِهٖ بِالْمَدِيْنَةِ۔(مسند احمد) علی بن حسین رضی اللہ عنہ ابورافع سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقرعید کے موقع پر دو مینڈھے خریدتے تھے خوب موٹے تازے بڑے سینگوں والے اور چت کبرے۔پھر جب آپؐ نماز پڑھ چکتے اور خطبے سے فارغ ہو لیتے تو ان میں سے ایک مینڈھا پیش کیا جاتا اور آپؐ اپنے مصلے ہی پر کھڑے کھڑے اس کو ذبح فرما دیتے۔

۱۰۔ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ وَجَدَ سَعَةً فَلَمْ يُضَحِّ فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا۔(مسند احمد، ابن ماجہ) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص استطاعت رکھتا ہو پھر قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔

۱۱۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشْرَ سِنِيْنَ يُضَحِّىْ۔(ترمذی) ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس سال مدینے میں رہے اور ہمیشہ قربانی کرتے رہے۔

یہ [گیارہ] روایتیں مختلف صحابیوں سے حدیث کی چھ معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے مذکورۂ بالا احکام کا منشا یہ سمجھا تھا کہ قربانی صرف حاجیوں کے لیے مخصوص نہ ہو بلکہ ذی استطاعت مسلمان بھی اپنی اپنی جگہ بقرعید کے موقع پر قربانی کرتے رہیں۔اس طریقے پر حضورؐ خود عامل رہے۔دوسرے مسلمانوں کو حکم دیا اور اسے سنتِ اسلام کے طور پر مسلمانوں میں جاری کیا۔

فقہائے اُمت کی آرا

قرآن اور حدیث کے ان دلائل کی بنا پر فقہائے امت نے بقرعید کی قربانی کے متعلق بالاتفاق یہ رائے دی ہے کہ یہ ایک مشروع فعل ہے اور سننِ اسلام میں سے ہے۔اختلاف اگر ہے تو اس میں کہ یہ واجب ہے یا نہیں۔مگر اس کا مشروع اور سنت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہونا متفق علیہ ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں مذاہب فقہا کا خلاصہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بقرعید کی قربانی شرائعِ دین میں سے ہے۔ شافعیوں اور جمہور کے نزدیک یہ سنتِ مؤکدہ ہے بطریق کفایت۔ اور شافعیہ میں ایک دوسری رائے یہ ہے کہ فرضِ کفایہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ مقیم اور خوش حال آدمی پر واجب ہے۔ امام مالک کی رائے بھی ایک روایت کی رو سے یہی ہے۔ مگر انھوں نے مقیم کی قید نہیں لگائی ہے۔ اوزاعی، ربیعہ اور لیث کی بھی یہی رائے ہے۔ حنفیوں میں سے ابو یوسف اور مالکیوں میں اشہب نے جمہور کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ قدرت کے باوجود قربانی نہ کرنا مکروہ ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ قربانی کرنا واجب ہے۔ امام محمد کہتے ہیں کہ قربانی ایک ایسی سنت ہے جسے چھوڑ دینے کی اجازت نہیں ہے۔ (فتح الباری، ج ۱۰، ص ۲)

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں تک قربانی کے سنت اور مشروع ہونے کا تعلق ہے یہ مسئلہ ابتدا سے اُمت میں متفق علیہ ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں رہا ہے۔

اُمت کا متواتر عمل

سب سے بڑا ثبوت اس کے سنت اور مشروع ہونے کا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے لے کر آج تک مسلمانوں کی ہر نسل کے بعد دوسری نسل اس پر عمل کرتی چلی آ رہی ہے۔ دو چار یا دس پانچ آدمیوں نے نہیں بلکہ ہر پشت کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں نے اپنے سے پہلی پشت کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں سے اس طریقے کو اخذ کیا ہے اور اپنے سے بعد والی پشت کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں تک اسے پہنچایا ہے۔ اگر تاریخ اسلام کے کسی مرحلے پر کسی نے اس کو ایجاد کر کے دین میں شامل کرنے کی کوشش کی ہوتی تو کس طرح ممکن تھا کہ تمام مسلمان بالاتفاق اس کو قبول کر لیتے اور کہیں کوئی بھی اس کے خلاف لب کشائی نہ کرتا؟ اور کس طرح یہ بات تاریخ میں چھپی رہ سکتی تھی کہ اس طریقے کو کب کس نے کہاں ایجاد کیا؟ آخر یہ امت ساری کی ساری منافقوں پر ہی تو مشتمل نہیں رہی ہے کہ حدیثوں پر حدیثیں قربانی کی مشروعیت پر گھڑ دی جائیں اور ایک نیا طریقہ ایجاد کر کے رسول خدا کی طرف منسوب کر دیا جائے اور پوری امت آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر بیٹھے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ہماری پچھلی نسلیں ایسی ہی منافق تھیں تو معاملہ قربانی تک کب محدود رہتا ہے۔ پھر تو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، بلکہ خود رسالتِ محمدیہ اور قرآن تک سب ہی کچھ مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ جس تواتر کے ساتھ پچھلی نسلوں سے ہم کو قربانی پہنچی ہے اُسی تواتر کے ساتھ انھی نسلوں سے یہ سب چیزیں بھی پہنچی ہیں۔ اگر ان کا متواتر عمل اس معاملے میں مشکوک ہے تو آخر دوسرا کون سا ایسا معاملہ رہ جاتا ہے جس میں اسے شک سے بالاتر ٹھہرایا جا سکے۔

(تفہیمات، دوم، اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۲۵۲-۲۶۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

احکام

قربانی کی قسمیں

قرآن مجید میں قربانی کے جو احکام دیے گئے ہیں ان کو تین اقسام پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔[1]

۱- مناسک حج کے طور پر

ایک قسم کی قربانی وہ ہے جو مناسک میں سے ایک خاص نسک ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ ...... وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰي كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَاۗىِٕسَ الْفَقِيْرَ ۝ (الحج ۲۲: ۲۶-۲۸) اور جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کی (تو حکم دیا کہ) .... اور لوگوں میں حج کے لیے پکار دے کہ ہر راہِ دور دراز سے تیرے پاس پیدل اور ہر طرح کی دُبلی سواریوں پر آئیں۔ یہ اس غرض کے لیے ہے کہ وہ اپنے حق میں منافع دیکھیں اور چند معلوم دنوں[2] میں ان

۱- سورۂ بقرہ آیت ۱۹۶ میں تین حکم الگ الگ بیان فرمائے گئے ہیں:

۱- جب آدمی نے حج یا عمرے کے لیے احرام باندھ لیا ہو اور پھر کوئی مانع ایسا پیش آ گیا ہو کہ حرم تک پہنچنا ممکن نہ رہا ہو تو اسے ہدی بھیجنی چاہیے اور اس وقت تک احرام سے باہر نہ آنا چاہیے۔ جب تک ہدی کی قربانی نہ ہو چکی ہو۔

۲- اگر آدمی کسی بیماری کی وجہ سے حجامت کرانے پر مجبور ہو جائے تو حجامت کرا لے اور فدیہ ادا کرے۔

۳- اگر کوئی امر مانع پیش نہ آیا ہو اور آدمی حرم پہنچ گیا ہو تو تمتع یا قِران کی صورت میں اسے قربانی دینی ہو گی۔ البتہ اِفراد کرنے کی صورت میں اس پر کوئی دم واجب نہ ہو گا۔ (رسائل و مسائل، پنجم، اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۵-۱۳۶)

۲- ایام معلومات (چند مقرر دنوں) سے مراد کون سے دن ہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان سے مراد ذی الحجہ کے پہلے دس دن ہیں۔ ابن عباسؓ، حسن بصری، ابراہیم نخعی، قتادہ اور متعدد دوسرے صحابہ و تابعین سے یہ قول منقول ہے۔ امام ابوحنیفہؒ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا بھی ایک قول اسی کی تائید میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یوم النحر (یعنی ۱۰/ ذی الحجہ) اور اس کے بعد کے تین دن ہیں۔ اس کی تائید میں ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابراہیم نخعی، حسن اور عطاء کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں اور امام شافعیؒ و احمدؒ سے بھی ایک ایک قول اس کے حق میں منقول ہوا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد تین دن ہیں: یوم النحر اور دو دن اس کے بعد۔ اس کی تائید میں حضرت عمر، علی، ابن عمر، ابن عباس، انس ابن مالک، ابوہریرۃ، سعید بن مسیب اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کے اقوال منقول ہوئے ہیں۔ فقہا میں سے سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ نے یہی قول اختیار کیا ہے اور مذہب حنفی و مالکی میں اسی پر فتویٰ ہے۔ باقی کچھ شاذ اقوال بھی ہیں مثلاً کسی نے یکم محرم تک قربانی کے ایام کو دراز کیا ہے، کسی نے صرف یوم النحر تک اسے محدود کر دیا ہے اور کسی نے یوم النحر کے بعد صرف ایک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جانوروں پر اللہ کا نام لیں[1] جو اس نے ان کو بخشے ہیں پھر تم ان جانوروں میں سے خود بھی کھاؤ اور تنگ دست فقیر کو بھی کھلاؤ۔

جیسا کہ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے، حج قائم کرنے کا یہ حکم بنائے کعبہ کے ساتھ ہی ابراہیمؑ کو دیا گیا تھا اور اس کی غرض یہ بیان کی گئی تھی کہ لوگ یہاں آکر دین و دنیا کے منافع سے مستفید ہوں اور خدا کے نام پر قربانی کریں۔ پھر یہی فرض انھی مناسک کے ساتھ امت محمدیہ پر مقرر کیا گیا، کیونکہ یہ ملتِ ابراہیمی کی وارث ہے...... اور قربانی جس طرح ملت ابراہیمی کے مناسکِ حج میں شامل تھی اسی طرح امت محمدیہ کے حج میں بھی شامل رہی۔ چنانچہ سورۂ حج کے پانچویں رکوع میں امتِ محمدیہ کو خطاب کرکے ارشاد ہوتا ہے:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ [الحج ۲۲:۳۶] اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے اللہ کے شعائر میں سے قرار دیا ہے، تمھارے لیے ان میں بھلائی ہے، پس تم ان کو صف بستہ کھڑا کرکے ان پر اللہ کا نام لو (یعنی انھیں قربان کرو) اور جب وہ پہلو کے بل ٹھہر جائیں (یعنی ان کی جان نکل چکے) تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور اس کو بھی کھلاؤ جو (اللہ کے دیے ہوئے) رزق پر قانع ہے اور اس کو بھی جو سوال کرتا ہے۔

۲- دمِ تمتع و قران وغیرہ

دوسری قسم کی قربانی وہ ہے جو تمتع یا قران کے فدیے، یا احصار کی صورت میں، یا ان جنایات کی جزا میں واجب ہوتی ہے جو مُحرِم سے حالت احرام میں سرزد ہوں۔ اس کے احکام حسب ذیل ہیں:

۱- وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۖ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۖ [البقرہ ۲:۱۹۶] اور حج اور عمرے کو اللہ کے لیے پورا کرو۔ لیکن اگر کہیں تم روک دیے جاؤ تو جو کچھ ہدیے کی قربانی میسر آئے بھیج دو اور اپنے سر [نہ][2] منڈواؤ جب تک کہ قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے۔

۲- فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ [البقرہ ۲:۱۹۶] پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (اور اس بنا پر اسے احرام کی قیود توڑنی پڑیں) تو وہ فدیے میں یا تو روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

← مزید قربانی کا مانا ہے، لیکن یہ کمزور اقوال ہیں جن کی دلیل مضبوط نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۱۹-۲۲۰، الحج، حاشیہ ۴۹)

۱- جانوروں سے مراد مویشی جانور ہیں، یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری جیسا کہ سورۂ انعام آیات ۱۴۲-۱۴۴ میں بصراحت بیان ہوا ہے۔ ان پر اللہ کا نام لینے سے مراد اللہ کے نام پر، اور اس کا نام لے کر انھیں ذبح کرنا ہے، جیسا کہ بعد کا فقرہ خود بتا رہا ہے۔ قرآن مجید میں قربانی کے لیے بالعموم 'جانور پر اللہ کا نام لینے' کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد اللہ کے نام پر جانور کو ذبح کرنا ہی ہے۔ اس طرح گویا اس حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ کا نام لیے بغیر یا اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر جانور کو ذبح کرنا کفار و مشرکین کا طریقہ ہے۔ مسلمان جب کبھی جانور کو ذبح کرے گا اللہ کا نام لے کر کرے گا اور جب کبھی قربانی کرے گا، اللہ کے لیے کرے گا۔ (تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۱۹، الحج، حاشیہ ۴۹)

۲- اس وقت تفہیمات کے جتنے نسخے ہمیں دستیاب ہو سکے اُن سب میں یہاں ''نہ'' لفظ غائب ہے۔ مزید یہ کہ اس لفظ کی عربی لَا تَحْلِقُوْا کو ''ت'' کی پیش کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں صریح غلطیاں ہیں۔ ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۴۷ء میں، جس میں یہ مضمون پہلی بار شائع ہوا ہے، یہ پوری عبارت درست ہے۔ (مرتبین)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۳- فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ؕ [البقرة ۲:۱۹۶] پھر جو کوئی عمرے کے ذریعے سے حج تک فائدہ[۱] اٹھائے تو جو کچھ قربانی میسر آئے کر دے۔ اور جسے قربانی میسر نہ ہو تو وہ حج کے دنوں میں تین دن کے اور واپس گھر پہنچ کر سات دن کے روزے رکھے۔

۴- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ ۔ [المائدة ۵:۹۵] اے اہل ایمان! شکار نہ مارو جب تک کہ تم حالتِ احرام میں ہو، اور تم میں سے جو کوئی جان بوجھ کر شکار مار لے وہ اس کے بدلے مویشیوں میں سے اُسی کے ہم قدر ایک جانور قربان کرے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں، اور یہ قربانی کعبے پہنچا دی جائے۔

اِن آیات میں قربانی کے جانوروں کو لفظ ھدی[۲] سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امام رازی نے اس لفظ کی لغوی تحقیق بیان کرتے ہوئے کہیں یہ لکھ دیا تھا کہ مَعْنَى الْهَدْيِ مَا يُهْدٰى اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ تَقْرِيْبًا اِلَيْهِ بِمَنْزِلَةِ الْهَدِيَّةِ يَهْدِيْهَا الْاِنْسَانُ اِلٰى غَيْرِهٖ تَقَرُّبًا اِلَيْهِ۔ [هَدْیٌ کے معنی ہیں وہ تحفہ جسے اللہ کے تقرب کے لیے بیت اللہ شریف میں پیش کیا جائے، جس طرح ایک انسان دوسرے کا قرب حاصل کرنے کے لیے اس کو تحفہ پیش کرتا ہے۔] اتنی گنجایش سے فائدہ اُٹھا کر مانعین قربانی نے بے تکلف فیصلہ کر دیا کہ ہدی سے مراد قربانی نہیں بلکہ کوئی سا ہدیہ اللہ کے حضور پیش کر دینا ہے۔ لیکن امام رازی نے اسی عبارت سے چند سطر آگے یہ بھی لکھا تھا: فَتَقْدِيْرُ الْاٰيَةِ: حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ وَيُنْحَرَ فَاِذَا نُحِرَ فَاحْلِقُوْا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب تک ہدی اپنے مقام پر پہنچ کر ذبح نہ کر دی جائے اس وقت تک سر نہ منڈواؤ اور جب ذبح ہو جائے [تو] منڈ ادو۔

مگر چوں کہ یہ عبارت مفید [مطلب] نہ تھی اس لیے دورِ جدید کے محققینِ اسلام نے اس کی طرف توجہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور یہ تو خیر امام رازی ہیں، انھوں نے خود اللہ تعالیٰ کی عبارت کو بھی قابل اعتنا نہ سمجھا جس نے سورۂ مائدہ والی آیت میں هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ کی تفسیر فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ۔ [المائدة ۵:۹۵] سے کر دی ہے۔ یہ آیت قطعی طور پر ہدی کے معنی متعین کر رہی ہے کہ قرآن میں جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں اس سے مراد قربانی ہی ہے نہ کہ کچھ اور۔

۳- عمومی قربانی

تیسری قسم کی قربانی وہ ہے جس کے ادا کرنے کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ کے ذریعے سے بالعموم سب مسلمانوں کو

۱- اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص حج سے چند روز پہلے مکہ پہنچ گیا وہ عمرہ کر کے احرام کھول دے اور ان قیود سے آزاد ہو جائے جو حالتِ احرام کے لیے شریعت نے مقرر کی ہیں۔ پھر جب حج کی تاریخیں آئیں تو دوبارہ احرام باندھ لے۔ اس صورت میں جو فائدہ عمرہ کے ذریعے سے اٹھایا جاتا ہے اس کے شکرانے کے طور پر قربانی کرنے کا حکم دیا گیا۔ (مؤلف)

۲- ہدی کے معنی ہیں وہ چیز جو اللہ تعالیٰ سے تقرب حاصل کرنے کے لیے اس کے گھر کی طرف بطور ہدیہ لے جائی جائے۔ جس طرح کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے تقرب پیدا کرنے کے لیے اس کے پاس ہدیہ لے جاتا ہے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دیا گیا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ [الانعام ۶: ۱۶۲-۱۶۳] کہو اے محمدؐ! میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ پروردگار عالم کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں فرماں برداروں میں سب سے پہلے ہوں۔

اس آیت میں صلوٰۃ کے بعد نُسک کا ذکر ہے جس کے معنی عبادت اور تطوع کے بھی ہیں اور قربانی کے بھی۔ قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر دوسرے ہی معنی کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ سورۂ حج میں ہے:

وَلِکُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَکًا لِّیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ ۗ (الحج ۲۲: ۳۴) اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی مقرر کی ہے تاکہ وہ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے انھیں بخشے ہیں۔

اور سورۂ بقرہ میں ہے:

فَفِدْیَةٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُکٍ ۚ [البقرہ ۲: ۱۹۶] تو اس کا فدیہ روزوں سے ادا کیا جائے یا صدقہ سے یا قربانی سے۔

ان آیات سے نُسک کے معنی متعین ہو گئے۔ اب یہ دیکھیے کہ صلوٰۃ کے ساتھ نُسک کے لیے بھی بِذٰلِکَ اُمِرْتُ (مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ فرمایا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے ہے۔ اسی بنا پر حضور نے تمام مستطیع مسلمانوں کو قربانی ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آیا ہے:

مَنْ کَانَ لَهٗ یَسَارٌ فَلَمْ یُضَحِّ فَلَا یَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا. جو شخص استطاعت رکھتا ہو اور پھر قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔

اِنَّ اَوَّلَ نُسُکِنَا فِیْ یَوْمِنَا هٰذَا الصَّلٰوةُ ثُمَّ الذِّبْحُ. ہمارے آج کے دن (یعنی بقرعید کے روز) ہماری پہلی عبادت نماز ہے پھر ذبح۔

مَنْ صَلّٰی مَعَنَا هٰذَا الصَّلٰوةَ فَلْیَذْبَحْ بَعْدَ الصَّلٰوةِ. جو شخص ہمارے ساتھ یہ نماز (یعنی بقرعید کی نماز) پڑھے وہ نماز کے بعد ذبح کرے۔

(تفہیمات، دوم، اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۲۳۰-۲۳۵)

قربانی کا وجوب

اس مقام پر یہ جان لینا چاہیے کہ اس پیراگراف میں قربانی کا جو حکم دیا گیا ہے وہ صرف حاجیوں کے لیے ہی نہیں ہے، اور صرف مکے میں حج ہی کے موقع پر ادا کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ تمام ذی استطاعت مسلمانوں کے لیے عام ہے، جہاں بھی وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوں، تاکہ وہ تسخیرِ حیوانات کی نعمت پر شکریے اور تکبیر کا فرض بھی ادا کریں اور ساتھ ساتھ اپنے اپنے مقامات پر حاجیوں کے شریکِ حال بھی ہو جائیں۔ حج کی سعادت میسر نہ آئی نہ سہی، کم از کم حج کے دنوں میں ساری دنیا کے مسلمان وہ کام تو کر رہے ہوں جو حاجی جوارِ بیت اللہ میں کریں۔ اس مضمون کی تصریح متعدد صحیح احادیث میں وارد ہوئی ہے، اور بکثرت معتبر روایات سے بھی ثابت ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینہ طیبہ کے پورے زمانۂ قیام میں ہر سال بقرِ عید کے موقع پر قربانی کرتے رہے اور مسلمانوں میں آپؐ ہی کی سنت سے یہ طریقہ جاری ہوا۔ مسند احمد اور ابن ماجہ میں ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ وَ جَدَ سَعَةً فَلَمْ يُضَحِّ فَلاَ يَقْرَبَنَّ مُصَلاَّنَا جو شخص استطاعت رکھتا ہو، پھر قربانی نہ کرے، وہ ہماری عید گاہ کے قریب نہ آئے۔

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ محدثین میں صرف اس امر پر اختلاف ہے کہ یہ مرفوع روایت ہے یا موقوف۔

ترمذی میں ابن عمرؓ کی روایت ہے:

اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشْرَ سِنِيْنَ يُضَحِّي۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں دس سال رہے اور ہر سال قربانی کرتے رہے۔

بخاری میں حضرت انس کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بقرعید کے روز فرمایا:

مَنْ كَانَ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَلْيُعِدْ وَمَنْ ذَبَحَ بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَقَدْتَمَّ نُسُكُهٗ وَاَصَابَ سُنَّةَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ جس نے عید کی نماز سے پہلے ذبح کر لیا اسے دوبارہ قربانی کرنی چاہیے اور جس نے نماز کے بعد قربانی کی اس کی قربانی پوری ہو گئی اور اس نے مسلمانوں کا طریقہ پالیا۔

اور یہ معلوم ہے کہ یوم النحر کو مکے میں کوئی نماز ایسی نہیں ہوتی جس سے پہلے قربانی کرنا سنت مسلمین کے خلاف ہو اور بعد کرنا اس کے مطابق۔ لہٰذا لامحالہ یہ ارشاد مدینے ہی میں ہوا ہے نہ کہ حج کے موقع پر مکے میں۔

مسلم میں جابرؓ بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں بقرعید کی نماز پڑھائی اور بعض لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ آپؐ قربانی کر چکے ہیں اپنی اپنی قربانیاں کر لیں۔ اس پر آپؐ نے حکم دیا کہ مجھ سے پہلے جن لوگوں نے قربانی کر لی ہے وہ پھر اعادہ کریں۔

پس یہ بات شک و شبہے سے بالاتر ہے کہ بقرعید کے روز جو قربانی عام مسلمان دنیا بھر میں کرتے ہیں، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی جاری کی ہوئی سنت ہے[1]۔ البتہ اگر اختلاف ہے تو اس امر میں کہ آیا یہ واجب ہے یا صرف سنت۔ ابراہیم نخعی، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام محمدؒ اور ایک روایت کے مطابق امام ابو یوسفؒ بھی، اس کو واجب مانتے ہیں۔ مگر امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل کے نزدیک یہ صرف سنتِ مسلمین ہے، اور سفیان ثوریؒ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کوئی نہ کرے تو مضائقہ نہیں۔ تاہم علمائے امت میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ اگر تمام مسلمان متفق ہو کر اسے چھوڑ دیں تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

۱۔ مدینے میں قربانی کا طریقہ جاری کر کے مسلمانوں کو یہ موقع بھی فراہم کر دیا گیا کہ حج کے زمانے میں اپنے اپنے گھروں پر ہی قربانی کر کے اس سعادت میں حصہ لے سکیں، جس سے دشمنوں نے ان کو محروم کرنے کی کوشش کی ہے اور حج سے الگ ایک مستقل سنت کی حیثیت سے قربانی جاری کر دی تاکہ جو حج کا موقع نہ پائے وہ بھی اللہ کی نعمت کے شکر اور اس کی تکبیر کا حق ادا کر سکے۔ (تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۳۰-۲۳۱، الحج، حاشیہ ۷۵)

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

یہ نئی اُپچ صرف ہمارے زمانے کے بعض لوگوں کو سوجھی ہے جن کے لیے ان کا نفس ہی قرآن بھی ہے اور سنت بھی۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۲۹-۲۳۰، الحج، حاشیہ ۶۰)

قربانی کے جانور

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ (الحج ۲۲:۳۶) اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے۔ تمھارے لیے اُن میں بھلائی ہے۔

اصل میں لفظ بُدن استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں اونٹوں کے لیے مخصوص ہے۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے حکم میں گائے کو بھی اونٹوں کے ساتھ شامل فرما دیا ہے۔ جس طرح ایک اونٹ کی قربانی سات آدمیوں کے لیے کافی ہوتی ہے، اسی طرح ایک گائے کی قربانی بھی سات آدمی مل کر کر سکتے ہیں۔ مسلم میں جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَّشْتَرِكَ فِي الْاَضَاحِي، اَلْبَدَنَةِ عَنْ سَبْعَةٍ وَ الْبَقَرَةُ عَنْ سَبْعَةٍ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا کہ ہم قربانیوں میں شریک ہو جایا کریں، اونٹ سات آدمیوں کے لیے اور گائے سات آدمیوں کے لیے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۲۷، الحج، حاشیہ ۶۷)

جانوروں کی تسخیر کا مقصد

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (الحج ۲۲:۳۷) اُس نے ان کو تمھارے لیے اس طرح مسخر کیا ہے تاکہ اُس کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اس کی تکبیر کرو۔

یہ پھر حکمِ قربانی کی غرض اور علت کی طرف اشارہ ہے۔ قربانی صرف اسی لیے واجب نہیں کی گئی ہے کہ یہ تسخیرِ حیوانات کی نعمت پر اللہ کا شکریہ ہے، بلکہ اس لیے بھی واجب کی گئی ہے کہ جس کے یہ جانور ہیں، اور جس نے انھیں ہمارے لیے مسخر کیا ہے، اس کے حقوقِ مالکانہ کا ہم دل سے بھی اور عملاً بھی اعتراف کریں، تاکہ ہمیں کبھی یہ بھول لاحق نہ ہو جائے کہ یہ سب کچھ ہمارا اپنا مال ہے۔ اسی مضمون کو وہ فقرہ ادا کرتا ہے جو قربانی کرتے وقت کہا جاتا ہے کہ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَ لَكَ، خدایا تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔

ہدی کے جانوروں سے استفادے کی مدت

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ (الحج ۲۲:۳۳) تمھیں ایک وقتِ مقرر تک اُن (ہدی کے جانوروں) سے فائدہ اُٹھانے کا حق ہے، پھر اُن کے (قربان کرنے) کی جگہ اسی قدیم گھر کے پاس ہے۔

یہ فقرہ ایک غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ شعائر اللہ میں ہدی کے جانور بھی داخل ہیں، جیسا کہ اہلِ عرب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مانتے تھے اور قرآن خود بھی آگے چل کر کہتا ہے کہ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ، اور ان ہدی کے اونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم کا جو حکم اوپر [آیت ۳۲] میں دیا گیا ہے کیا اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہدی کے جانوروں کو بیت اللہ کی طرف جب لے جانے لگیں تو ان کو کسی طرح بھی استعمال نہ کیا جائے؟ ان پر سواری کرنا، یا سامان لادنا، یا ان کے دودھ پینا تعظیم شعائر اللہ کے خلاف تو نہیں ہے؟ عرب کے لوگوں کا یہی خیال تھا۔ چنانچہ وہ ان جانوروں کو بالکل کوتل لے جاتے تھے۔ راستے میں ان سے کسی طرح کا فائدہ اُٹھانا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ اِسی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قربانی کی جگہ پہنچنے تک تم ان جانوروں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو، ایسا کرنا تعظیم شعائر اللہ کے خلاف نہیں ہے۔ یہی بات اُن احادیث سے معلوم ہوتی ہے جو اس مسئلے میں حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ سے مروی ہیں۔ ان میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ کی مہار تھامے پیدل چلا جا رہا ہے اور سخت تکلیف میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا اس پر سوار ہو جا، اُس نے عرض کیا یہ ہدی کا اونٹ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ارے سوار ہو جا۔

مفسرین میں سے ابن عباس، قتادہ، مجاہد، ضحاک اور عطا خراسانی اس طرف گئے ہیں کہ اس آیت میں 'ایک وقت مقرر تک' سے مراد 'جب تک کہ جانور کو قربانی کے لیے نامزد اور ہدی سے موسوم نہ کر دیا جائے' ہے۔ اس تفسیر کی رو سے آدمی ان جانوروں سے صرف اس وقت تک فائدہ اُٹھا سکتا ہے جب تک کہ وہ اسے ہدی کے نام سے موسوم نہ کر دے۔ اور جونہی کہ وہ اسے ہدی بنا کر بیت اللہ لے جانے کی نیت کر لے، پھر اسے کوئی فائدہ اُٹھانے کا حق نہیں رہتا۔ لیکن یہ تفسیر کسی طرح سے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوّل تو اس صورت میں استعمال اور استفادے کی اجازت دینا ہی بے معنی ہے۔ کیونکہ 'ہدی' کے سوا دوسرے جانوروں سے استفادہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی شک پیدا ہی کب ہوا تھا کہ اسے اجازت کی تصریح سے رفع کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ پھر آیت صریح طور پر کہہ رہی ہے کہ اجازت ان جانوروں کے استعمال کی دی جا رہی ہے جن پر 'شعائر اللہ' کا اطلاق ہو، اور ظاہر ہے کہ یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ انھیں ہدی قرار دے دیا جائے۔

دوسرے مفسرین، مثلاً عروہ بن زبیر اور عطا بن ابی رَباح کہتے ہیں کہ 'وقت مقرر' سے مراد 'قربانی کا وقت' ہے۔ قربانی سے پہلے ہدی کے جانوروں کو سواری کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، ان کے دودھ بھی پی سکتے ہیں، ان کے بچے بھی لے سکتے ہیں اور اُن کا اون، صوف، بال وغیرہ بھی اتار سکتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ حنفیہ اگرچہ پہلی تفسیر کے قائل ہیں، لیکن وہ اس میں اتنی گنجایش نکال دیتے ہیں کہ بشرطِ ضرورت استفادہ جائز ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۲۴-۲۲۵، الحج، حاشیہ ۶۲)

اونٹ ذبح کرنے کا مسنون طریقہ

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (الحج ۳۶:۲۲) پس انھیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو، اور جب (قربانی کے بعد) ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں تو اُن میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں اور اُن کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمھارے لیے مسخر کیا ہے تا کہ تم شکریہ ادا کرو۔

واضح رہے کہ اونٹ کی قربانی اس کو کھڑا کر کے کی جاتی ہے۔ اُس کا ایک پاؤں باندھ دیا جاتا ہے، پھر اس کے حلقوم میں زور سے نیزہ مارا جاتا ہے جس سے خون کا ایک فوارہ نکل پڑتا ہے، پھر جب کافی خون نکل جاتا ہے تب اونٹ زمین پر گر پڑتا ہے۔ یہی مفہوم ہے صَوَافَّ کا.......... ابن عباسؓ، مجاہد، ضحاک وغیرہ نے اس کی یہی تشریح کی ہے۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی منقول ہے۔ چنانچہ مسلم اور بخاری میں روایت ہے کہ ابن عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے اونٹ کو بٹھا کر قربانی کر رہا تھا۔ اس پر انھوں نے فرمایا: اِبْعَثْهَا قِيَامًا مُّقَيَّدَةً سُنَّةَ اَبِى الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ اس کے پاؤں باندھ کر کھڑا کر، یہ ہے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔

ابوداؤد میں جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ اونٹ کا بایاں پاؤں باندھ کر باقی تین پاؤوں پر اُسے کھڑا کرتے تھے، پھر اس کو نحر کرتے تھے۔ اسی مفہوم کی طرف خود قرآن بھی اشارہ کر رہا ہے: فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا۔ جب ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں۔

یہ اُسی صورت میں بولیں گے جبکہ جانور کھڑا ہو اور پھر زمین پر گرے۔ ورنہ لٹا کر قربانی کی صورت میں تو پیٹھ ویسے ہی ٹکی ہوئی ہوتی ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۲۷، الحج، حاشیہ ۶۹)

ذبح کے وقت تسمیہ کی مختلف صورتیں

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا۔ (الحج ۳۶:۲۲) ان پر اللہ کا نام لو۔

یہ الفاظ پھر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کرنے سے کوئی جانور حلال نہیں ہوتا، اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو ذبح کرو کہنے کے بجائے ’ان پر اللہ کا نام لو‘ فرما رہا ہے، اور مطلب اس کا جانوروں کو ذبح کرنا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ اسلامی شریعت میں جانور کے ذبح کرنے کا کوئی تصور اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کے سوا نہیں ہے۔

ذبح کرتے وقت بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہنے کا طریقہ بھی اسی مقام سے ماخوذ ہے۔ آیت ۳۶ میں فرمایا: فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا، ان پر اللہ کا نام لو۔ اور آیت ۳۷ میں فرمایا: لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ، تا کہ اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اس کی تکبیر کرو۔

قربانی کرتے وقت اللہ کا نام لینے کی مختلف صورتیں احادیث میں منقول ہیں۔ مثلاً:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۱- بِسمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَکبَرُ ، اَللّٰھُمَّ مِنکَ وَلَکَ۔ اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ خدایا تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔

۲- اَللّٰهُ اَکبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَللّٰھُمَّ مِنکَ وَ لَکَ، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ خدایا تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔

۳- اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ، اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَلَکَ۔ میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔ اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ بے شک میری نماز اور قربانی اور میرا مرنا اور جینا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سرِ اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔ خدایا تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۲۷-۲۲۸، الحج، حاشیہ ۷۰)

قربانی کے گوشت کا حکم

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰکِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ ط (الحج ۲۲:۳۷) نہ اُن کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون، مگر اسے تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

جاہلیت کے زمانے میں اہل عرب جس طرح بتوں کی قربانی کا گوشت بتوں پر لے جا کر چڑھاتے تھے، اُسی طرح اللہ کے نام کی قربانی کا گوشت کعبے کے سامنے لا کر رکھتے اور خون اس کی دیواروں پر لتھیڑتے تھے۔ اُن کے نزدیک یہ قربانی گویا اس لیے کی جاتی تھی کہ اللہ کے حضور اس کا خون اور گوشت پیش کیا جائے۔ اس جہالت کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا کہ اصل چیز جو اللہ کے حضور پیش ہوتی ہے وہ جانور کا خون اور گوشت نہیں، بلکہ تمھارا تقویٰ ہے۔ اگر تم شکر نعمت کے جذبے کی بنا پر خالص نیت کے ساتھ صرف اللہ کے لیے قربانی کرو گے تو اس جذبے اور نیت اور خلوص کا نذرانہ اس کے حضور پہنچ جائے گا، ورنہ خون اور گوشت یہیں دھرا رہ جائے گا۔ یہی بات ہے جو حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَ لَا اِلٰی اَلْوَانِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَ اَعْمَالِکُمْ، اللہ تمھاری صورتیں اور تمھارے رنگ نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دل اور اعمال دیکھتا ہے۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۲۸-۲۲۹، الحج، حاشیہ ۷۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قربانی کے گوشت کا مستحق کون!

فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ (الحج ۲۸:۲۲) خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں۔

بعض لوگوں نے اس ارشاد کا یہ مطلب لیا ہے کہ کھانا اور کھلانا دونوں واجب ہیں، کیونکہ حکم بہ صیغۂ امر دیا گیا ہے۔ دوسرا گروہ اس طرف گیا ہے کہ کھانا مستحب ہے اور کھلانا واجب۔ یہ رائے امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کی ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ کھانا اور کھلانا دونوں مستحب ہیں۔ کھانا اس لیے مستحب ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں لوگ اپنی قربانی کا گوشت خود کھانا ممنوع سمجھتے تھے، اور کھلانا اس لیے پسندیدہ کہ اس میں غریبوں کی امداد و اعانت ہے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔ ابن جریر نے حسن بصری، عطا، مجاہد اور ابراہیم نخعی کے یہ اقوال نقل کیے ہیں کہ فَكُلُوْا مِنْهَا میں صیغۂ امر کے استعمال سے کھانے کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ یہ امر ویسا ہی ہے جیسے فرمایا: وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ، جب تم حالتِ احرام سے نکل آؤ تو پھر شکار کرو۔ (المائدہ ۵:۲) اور فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ ، پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ۔ (الجمعۃ ۶۲:۱۰)۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ احرام سے نکل کر شکار کرنا اور نماز جمعہ کے بعد زمین میں پھیل جانا واجب ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ پھر ایسا کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اسی طرح یہاں بھی چوں کہ لوگ اپنی قربانی کا گوشت خود کھانے کو ممنوع سمجھتے تھے اس لیے فرمایا گیا کہ نہیں، اسے کھاؤ، یعنی اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

تنگ دست فقیر کو کھلانے کے متعلق جو فرمایا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غنی کو نہیں کھلایا جا سکتا۔ دوست، ہمسایے، رشتہ دار خواہ محتاج نہ ہوں، پھر بھی انھیں قربانی کے گوشت میں سے دینا جائز ہے۔ یہ بات صحابہ کرامؓ کے عمل سے ثابت ہے۔ علقمہ کا بیان ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے میرے ہاتھ قربانی کے جانور بھیجے اور ہدایت فرمائی کہ یوم النحر کو انھیں ذبح کرنا، خود بھی کھانا، مساکین کو بھی دینا اور میرے بھائی کے گھر بھی بھیجنا۔ ابن عمرؓ کا بھی یہی قول ہے کہ ایک حصہ کھاؤ، ایک حصہ ہمسایوں کو دو، اور ایک حصہ مساکین میں تقسیم کرو۔

(تفہیم القرآن، سوم، ص ۲۲۰-۲۲۱، الحج، حاشیہ ۵۰)

ہندوستان میں گائے کی قربانی کا مسئلہ

س: مسلمان قوم اگر ہندوستان میں گائے کی قربانی کو روک دے تو اسلام کی نگاہ میں کوئی قیامت نہیں آ جاتی، خصوصاً جبکہ اس فعل میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ پھر کیوں نہ ایک ہمسایہ قوم کا اتحاد حاصل کرنے کے لیے رعایت سے کام لیا جائے؟ اکبر اعظم، جہانگیر، شاہ جہاں اور موجودہ نظام حیدر آباد نے عملی مثالیں اس سلسلے میں قائم کی ہیں۔

ج: آپ نے جن بڑے بڑے 'اماموں' کا نام لیا ہے مجھے ان میں سے کسی کی تقلید کا شرف حاصل نہیں ہے، میرے نزدیک مسلمانوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کو راضی کرنے کے لیے اگر گائے کی قربانی ترک کی تو چاہے وہ کائناتی قیامت نہ آ جائے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے لیکن ہندوستان کی حد تک اسلام پر واقعی قیامت تو ضرور آ جائے گی۔ افسوس یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا نقطۂ نظر اس مسئلے میں اسلام کے نقطۂ نظر کی عین ضد ہے۔ ان کے نزدیک اہمیت صرف اس امر کی ہے کہ کس طرح دو قوموں کے درمیان اختلاف و نزاع کے اسباب دور ہو جائیں۔ لیکن اسلام کے نزدیک اصل اہمیت یہ امر رکھتا ہے کہ توحید کا عقیدہ اختیار کرنے والوں کو شرک کے ہر ممکن خطرے سے بچایا جائے۔

جس ملک میں گائے کی پوجا نہ ہوتی ہو اور گائے کو معبودوں میں شامل نہ کیا گیا ہو اور اس کے تقدس کا بھی عقیدہ نہ پایا جاتا ہو، وہاں تو گائے کی قربانی محض ایک جائز فعل ہے جس کو اگر نہ کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن جہاں گائے معبود ہو اور تقدس کا مقام رکھتی ہو، وہاں تو گائے کی قربانی کا حکم ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا۔ اگر ایسے ملک میں کچھ مدت تک مسلمان مصلحتاً گائے کی قربانی ترک کر دیں اور گائے کا گوشت بھی نہ کھائیں تو یہ یقینی خطرہ ہے کہ آگے چل کر اپنی ہمسایہ قوموں کے گاؤ پرستانہ عقائد سے وہ متاثر ہو جائیں گے اور گائے کے تقدس کا اثر ان کے قلوب میں اسی طرح بیٹھ جائے گا جس طرح مصر کی گاؤ پرست آبادی میں رہتے رہتے بنی اسرائیل کا حال ہوا تھا کہ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ۔ [البقرۃ ۲: ۹۳، اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہوا تھا] پھر جب اس ماحول میں جو ہندو اسلام قبول کریں گے وہ چاہے اسلام کے اور دوسرے عقائد قبول کر لیں، لیکن گائے کی تقدیس ان کے اندر بدستور موجود رہے گی۔ اسی لیے ہندوستان میں گائے کی قربانی کو میں واجب سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ میرے نزدیک کسی نو مسلم ہندو کا اسلام اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک وہ کم از کم ایک مرتبہ گائے کا گوشت نہ کھا لے۔ اسی کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے نماز پڑھی جیسی ہم پڑھتے ہیں اور جس نے اسی قبلے کو اختیار کیا جو ہمارا ہے اور جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا وہ ہم میں سے ہے۔ یہ 'ہمارا ذبیحہ کھایا' دوسرے الفاظ میں یہ معنی رکھتا ہے کہ مسلمانوں میں شامل ہونے کے لیے ان اوہام و قیود اور بندشوں کا توڑنا بھی ضروری ہے جن کا جاہلیت کی حالت میں کوئی شخص پابند رہا ہو۔

(رسائل و مسائل، اول، جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۴-۱۷۶)

جبری امتناع کی صورت میں مباحات کا وجوب

جب کسی مباح چیز کو کوئی حکومت یا کوئی طاقت زبردستی حرام قرار دے دے تو اس کی قائم کی ہوئی حرمت کو تسلیم کرنا گناہ ہے اور اس کو توڑ دینا واجب ہے......

......شریعت اسلامی کا یہ فطری تقاضا ہے کہ وہ زندگی میں اپنا پورا غلبہ بلا شرکت غیر چاہتی ہے اور اگر غیر اللہ کا کوئی اقتدار انسانوں پر اپنا دامن پھیلانا چاہتا ہو تو اسلامی شریعت اپنے متبعین کو اس کا باغی دیکھنا چاہتی ہے۔ نہ کہ مطیع و وفا شعار۔ جس نظامِ حق کو گائے کی قربانی جیسے معمولی مسئلے میں غیر اللہ کی مداخلت گوارا نہیں ہے، وہ آخر اسے کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ سیاست اور معیشت اور معاشرت کے اہم مسائل میں خدا سے سرکشی کرنے والی کوئی قوت اپنی مرضی کو اللہ کے بندوں پر نافذ کرے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شریعت اسلامی کی یہی اسپرٹ ہمیشہ نظامِ کفر و جاہلیت کے خلاف اربابِ حق کو صف آرا کرتی رہی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی پوری ہوتی رہی ہے کہ میری امت میں جہاد قیامت تک جاری رہے گا، نہ کسی عادل کا عدل اسے ختم کر سکے گا نہ کسی ظالم کا ظلم۔ یہی اسپرٹ ہمیشہ تجدیدِ اسلام کی تحریکوں کی محرک رہی ہے اور اسی نے صالحین کو ماحول کی خوفنا کیوں کے آگے جھک جانے سے روکا ہے۔

مگر جہاں یہ اسپرٹ مسلمانوں میں کمزور ہوگئی ہے وہاں انھوں نے اپنی اسلامیت میں کتر بیونت کر کے ہر قسم کے نظام ہائے طاغوت کو نہ صرف یہ کہ گوارا کر لیا ہے، بلکہ حد یہ ہے کہ اسے چلانے اور مستحکم رکھنے اور اس کا تحفظ کرنے کی خدمات تک سرانجام دینے کے لیے تاویلیں کر لی ہیں۔

یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ گاؤ کشی اگر طاغوت کی روک سے مباح کے بجائے واجب ہو جاتی ہے تو پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام کا قائم کرنا جو پہلے ہی فرض اور بہت بڑا فرض ہے باطل کی طرف سے کسی مزاحمت کے پیدا ہو جانے پر دین کے ہر فرض سے بڑا فرض ہو جاتا ہے اور اس سے چشم پوشی کر کے اگر مسلمان ہزار نفلی عبادتیں بھی کرے تو وہ بے معنی ہیں۔

درحقیقت کسی غیر الٰہی طاقت کی مداخلت فی الدین چاہے کتنے ہی چھوٹے معاملے میں ہو، مسلمان کے عقیدۂ توحید پر براہِ راست ضرب لگاتی ہے۔ اور ہر ایسی مداخلت کے معنیٰ یہ ہیں کہ مداخلت کرنے والے نے ایک خاص معاملے میں اپنی خدائی کا عملی اعلان کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اعلان پر مسلمان کا امن و سکون سے بیٹھے رہنا تک اس کے ایمان کو مشتبہ کر دیتا ہے، کجا یہ حال کہ اس اعلان کے اعلانچی خود مسلمان ہوں اور وہ دوسروں سے بالجبر اسے منوانے کے لیے اپنی قوتیں باطل کے ہاتھ فروخت کر دیں۔

پس اصلی مسئلہ قربانیِ گاؤ کا نہیں ہے، بلکہ عقیدۂ توحید کی حفاظت کا ہے اور اس کی حفاظت میں کوتاہی کر کے ہم کس اخروی بہبود کی امیدیں قائم کر سکتے ہیں!

(رسائل و مسائل، اول، جنوری ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۶-۱۷۸)

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

اعتراضات وشبہات[1]

افسوس ہے کہ موجودہ زمانے میں بعض لوگ نہ خدا کا خوف رکھتے ہیں نہ خلق کی شرم۔ علم اور سمجھ بوجھ کے بغیر جو شخص جس دینی مسئلے پر چاہتا ہے بے تکلف تیشہ چلا دیتا ہے۔ پھر اسے کچھ پروا نہیں ہوتی کہ اس ضرب سے صرف اسی مسئلے کی جڑ کٹتی ہے یا ساتھ ہی ساتھ دین کی جڑ بھی کٹ جاتی ہے۔

معاشی اعتراض

دراصل اس وقت قربانی کی جو مخالفت کی جارہی ہے اس کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ کسی نے علمی طریقے پر قرآن وحدیث کا مطالعہ کیا ہو اور اس میں قربانی کا حکم نہ پایا جاتا ہو۔ بلکہ اس مخالفت کی حقیقی بنیاد صرف یہ ہے کہ اس مادہ پرستی کے دور میں لوگوں کے دل ودماغ پر معاشی مفاد کی اہمیت بری طرح مسلط ہوگئی ہے اور معاشی قدر کے سوا کسی چیز کی کوئی دوسری قدر ان کی نگاہ میں باقی نہیں رہی ہے۔ وہ حساب لگا کر دیکھتے ہیں کہ ہر سال کتنے لاکھ یا کتنے کروڑ مسلمان قربانی کرتے ہیں اور اس پر اوسطاً کس کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اس حساب سے ان کے سامنے قربانی کے مجموعی خرچ کی ایک بہت بڑی رقم آتی ہے اور وہ چیخ اُٹھتے ہیں کہ اتنا روپیہ محض جانوروں کی قربانی پر ضائع کیا جارہا ہے، حالانکہ اگر یہی رقم قومی اداروں یا معاشی منصوبوں پر صرف کی جاتی ہے تو اس سے بے شمار فائدے حاصل ہوسکتے تھے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ ایک سراسر غلط ذہنیت ہے جو غیر اسلامی اندازِ فکر سے ہمارے اندر پرورش پا رہی ہے۔ اگر اس کو اسی طرح نشوونما پانے دیا گیا تو کل ٹھیک اسی طریقے سے استدلال کرتے ہوئے کہا جائے گا کہ ہر سال اتنے لاکھ مسلمان اوسطاً اتنا روپیہ سفرِ حج پر صرف کر دیتے ہیں جو مجموعی طور پر اتنے کروڑ روپیہ بنتا ہے، محض چند مقامات کی زیارت پر اتنی خطیر رقم سالانہ صرف کر دینے کے بجائے کیوں نہ اسے بھی قومی اداروں اور معاشی منصوبوں اور ملکی دفاع پر خرچ کیا جائے۔ یہ محض ایک فرضی قیاس ہی نہیں ہے بلکہ فی الواقع اسی ذہنیت کے زیرِ اثر ترکیہ کی لادینی حکومت نے ۲۵ سال تک حج بند کیے رکھا ہے۔ پھر کوئی دوسرا شخص حساب لگائے گا کہ ہر روز اتنے کروڑ مسلمان پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں اور اس میں اوسطاً فی کس اتنا وقت صرف ہوتا ہے جس کا مجموعہ اتنے لاکھ گھنٹوں تک پہنچتا ہے۔ اس وقت کو اگر کسی مفید معاشی کام میں استعمال کیا جاتا تو اس سے اتنی معاشی دولت پیدا ہوسکتی تھی۔ لیکن بُرا ہو ان مُلاؤں کا کہ انھوں نے مسلمانوں کو نماز میں لگا کر صدیوں سے انھیں اس قدر خسارے میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ بھی کوئی فرضی قیاس نہیں ہے بلکہ فی الواقع سوویٹ

۱- یہ مضمون' اخبار قاصد' میں ۲۲ رستمبر ۱۹۵۰ء کو تفصیلاً شائع ہوا تھا۔ مضمون کو پڑھتے ہوئے اس وقت کے حالات پیشِ نظر رہنے چاہییں۔ ہم نے یہاں جگہ کی مناسبت سے اس کا آخری حصہ تفہیمات حصہ دوم سے نقل کیا ہے۔ (مرتبین)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

روس میں بہت سے ناصحین مشفقین نے وہاں کے مسلمانوں کونماز کے معاشی نقصانات اسی منطق سے سمجھائے ہیں............ پھر یہی منطق روزے کے خلاف بھی بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کی جاسکتی ہے۔ اوراس کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان نری معیشت کی میزان پر تول تول کراسلام کی ایک ایک چیز کو دیکھتا جائے گا اور ہراس چیز کو مُلاؤں کی ایجاد قرار دے کرساقط کرتا چلا جائے گا جواس میزان میں اس کو بے وزن نظر آئے گی۔ کیا فی الواقع اب مسلمانوں کے پاس اپنے دین کے احکام کو جانچنے کے لیے صرف ایک یہی معیار رہ گیا ہے؟

(تفہیمات، دوم، اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۲۶۰-۲۶۲)

آپ کہتے ہیں کہ یہ اضاعتِ مال ہے۔ مگر قرآن کہتا ہے: لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ اور فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ [الحج ۲۲:۳۶] ''اس میں تمھارے لیے بھلائی ہے'' اور ''اس میں سے خود بھی کھاؤ اور [نہ] مانگنے والے غریب اور مانگنے والے سائل کو بھی کھلاؤ۔'' آج آپ کے اپنے ملک میں لاکھوں اللہ کے بندے ایسے ہیں جنھیں ہفتوں اور مہینوں اچھی قوت بخش غذا نصیب نہیں ہوتی۔ کیا اُن کو صدقہ اور ہدی اور نُسک کے ذریعے سے گوشت بہم پہنچانا آپ کی رائے میں اصولِ معیشت کے خلاف ہے؟ لاکھوں انسان اور گلہ بان ہیں جو سال بھر تک جانور پالتے ہیں اور بقرعید کے موقع پر اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ کیا ان کی روزی کا دروازہ بند کرنا آپ کے نزدیک بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا ہے؟ ہزارہا غریب ہیں جن کو قربانی کی کھالیں مل جاتی ہیں اور ہزارہا قصائی ہیں جن کو ذبح کرنے کی اجرت مل جاتی ہے۔ کیا یہ سب آپ کی قوم سے خارج ہیں کہ آپ ان کی رزق رسانی کو فضول بلکہ مُضر اور داخلِ اسراف سمجھتے ہیں؟

پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ کو تمام قومی ضروریات اور سارے فوائد و منافع صرف اسی وقت یاد آتے ہیں جب خدا کے کسی حکم کی پابندی میں روپیہ صرف ہو رہا ہو؟ گویا کہ بینکوں کا قیام اور قومی ادارات کا فروغ اور اعتقاد و اخلاق کی اصلاح اور یتیموں اور بیواؤں کی پرورش کا سارا کام صرف قربانی ہی کی وجہ سے رُکا پڑا ہے۔ اِدھر یہ بند ہوئی اور اُدھر قومی اداروں پر روپیہ برسنا شروع ہو جائے گا۔

اور اگر آپ کی قومی تنظیم ایسی ہی مکمل ہے کہ سارے ہندوستان[1] کا روپیہ جمع کر کے آپ ہر سال ایک تجارتی بنک کھول سکتے ہیں تو ذرا سی تکلیف گوارا کر کے پہلے ملک بھر کے سینما ہالوں اور قحبہ خانوں اور بدکاری و اسراف کے دوسرے اڈوں پر تو اپنے ایجنٹ مقرر فرمایئے تاکہ مسلمانوں کا جس قدر روپیہ وہاں ضائع ہوتا ہے وہ قومی فنڈ میں وصول ہونا شروع ہو جائے۔ اس طرح آپ ہر سال نہیں ہر روز ایک تجارتی بنک کھول سکیں گے۔

پھر اگر آپ میں کچھ تعمیری قوت ہے تو قربانی کی تخریب کے بجائے آپ اُسے زکوٰۃ کی تعمیر ہی میں کیوں نہیں صَرف فرماتے کہ تنہا اسی ایک چیز سے آپ وہ تمام قومی ضروریات پوری کر سکتے ہیں جن کی خاطر قربانی بند کرنے کی تبلیغ آپ نے شروع کی ہے۔

۱- یہ مضمون تفصیلاً جنوری ۱۹۳۷ء کے ترجمان القرآن میں 'اشارات' کے طور پر شائع ہوا تھا۔ اسے اسی پس منظر میں دیکھا جائے۔ (مرتبین)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آخری گزارش یہ ہے کہ اگر ایک دفعہ مسلمانوں میں یہ ذہنیت پیدا ہو گئی کہ جن جن مذہبی مراسم میں روپیہ صرف ہوتا ہے اُن کو بند کر کے وہ روپیہ قومی اداروں اور تجارتی بینکوں پر صرف ہونا چاہیے، تو معاملہ صرف قربانی ہی پر رُکا نہ رہ جائے گا۔ کل کوئی اور بندۂ خدا اُٹھ کر کہے گا کہ یہ حج، جس پر کروڑوں روپیہ ہر سال خرچ ہو رہا ہے، اور جس کا کوئی فائدہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اِسے بند ہونا چاہیے، اور اس روپے سے تجارتی بنک کھلنے چاہییں! سارا معاملہ اصل میں اقدار ہی کا ہے۔ جب ایک دفعہ معیارِ قدر بدل گیا، پھر آج قربانی بند ہو گی اور کل خواہ آپ نے چاہا یا نہ چاہا، حج کی باری آ کر رہے گی۔

(تفہیمات، دوم، اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۲۴۱-۲۴۲)

منکرین حدیث کے حملے کا جواب[1]

پچھلے سال عید اضحیٰ کے موقع پر پنجاب کی ایک جماعت نے ایک اشتہار شائع کیا تھا جس میں قربانی کو ایک بے محل، بے معنی، فضول، بلکہ مضر اور مسرفانہ رسم قرار دیا گیا تھا اور مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ 'ارض غیر ذی زرع کی اس نام نہاد سنت' کو چھوڑ کر اس روپے کو جو قربانی میں ضائع کیا جاتا ہے قومی اداروں کی اعانت، یتیموں اور بیواؤں کی پرورش اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے میں صرف کریں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس جماعت نے اس کام کو اپنی تبلیغ کا ایک مستقل جزو بنا لیا ہے کہ ہر سال بقرِعید کے موقع پر مسلمانوں کی قربانی سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اب تک ان حضرات کی یہ کوششیں کس قدر بارآور ہوئی ہیں۔ لیکن تبلیغ کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے...... [اور] مسلمانوں کے نفسیات کا جو حال اس زمانے میں ہم دیکھ رہے ہیں اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کو خوف ہے کہ ہزاروں مسلمان اب تک اس فریب میں مبتلا ہو چکے ہوں گے، اور اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو آگے چل کر نہ معلوم اور کتنے مسلمان اس کے شکار ہوں۔ اس لیے ہم بقرعید کی آمد سے پہلے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان غلط فہمیوں کو رفع کریں جو ان لوگوں کی طرف سے قربانی کے خلاف پھیلائی جا رہی ہیں۔

اس جماعت کی جو تحریریں ہماری نظر سے گزری ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی پر ان کو تین حیثیتوں سے اعتراض ہے:

ایک یہ کہ قربانی ان کے نزدیک رسوم جاہلیت میں سے ایک رسم ہے جس کو 'مولویوں' نے محض جہالت کی بنا پر ایک اسلامی طریقہ قرار دے لیا ہے۔ چنانچہ ان کے گروہ کا ایک مصنف قربانی کے متعلق اپنی تحقیقِ انیق ان الفاظ میں پیش کرتا ہے کہ قربانی کی رسم تمام دنیا کی وحشی و مدنی قوموں میں تھی۔ آج سوائے مسلمانوں کے کوئی اس کو نہیں کرتا۔

دوسرے یہ کہ معاشی حیثیت سے وہ اس کو نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جو روپیہ بکرے کی گردن پر چھری پھیرنے میں صرف کیا جاتا ہے۔ وہ بالکل ضائع ہو جاتا ہے اس کے بدلے میں کوئی عقلی یا مادی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

تیسرے یہ کہ ان کو قرآن میں قربانی کا حکم کہیں نظر نہیں آیا۔ رہی حدیث تو اس سے انکار کر دینا ان کے نزدیک ہر چیز سے زیادہ سہل ہے اور اس کو رد کرنے کا مسلک اختیار ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اسلام کے جس حکم پر غیر قوموں کو اعتراض ہو یا جس حکم کی مصلحت خود اپنی سمجھ

۱- یہ مضمون ذی القعدہ ۱۳۵۵ھ [ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۳۷ء] میں لکھا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ جماعت اب تک قربانی کے خلاف اپنی تبلیغ سے باز نہیں آئی ہے۔ چنانچہ ۱۳۶۸ھ [۱۹۵۰ء] میں بھی بقرِعید کی آمد پر ہمیں معلوم ہوا کہ اس نے حسب دستور عوام الناس کو اس غلط فہمی میں ڈالنے کی کوشش کی کہ قربانی ایک بدعت ہے جسے 'مولویوں' نے ایجاد کیا ہے۔ (مؤلف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں نہ آئے اس کو آسانی کے ساتھ دائرۂ دین سے خارج کیا جا سکے۔

چوں کہ یہ اعتراضات ایسے لوگوں کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں جو اپنے آپ کو مسلم کہتے ہیں اور قرآن کو حجت قطعی مانتے ہیں، اس لیے ہم قرآن ہی سے قربانی کے احکام بیان کریں گے اور قرآن ہی سے یہ بھی بتائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کن مصالح کی بنا پر عبادات کے مخصوص طریقوں میں قربانی کو شامل فرمایا ہے۔[1]

(تفہیمات، دوم، اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۲۲۸-۲۳۰)

منکرین حدیث کی ہٹ دھرمی پر تبصرہ

یہ ہیں قربانی کے متعلق قرآن کے صاف اور صریح احکام جن میں کسی شک وشبہے اور تاویل کی گنجایش نہیں۔ پڑھیے ان کو اور پھر داد دیجیے اُن لوگوں کی جرأت کی جو ایک طرف تو قرآن پر 'سب سے بڑھ کر ایمان رکھنے' کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف علی الاعلان یہ الفاظ لکھتے اور شائع کرتے ہیں کہ:

"قربانی کی رسم تمام دنیا کی وحشی اور مدنی قوموں میں تھی۔ آج سوائے مسلمانوں کے کوئی اس کو ادا نہیں کرتا"۔

"یہ کیوں کر ضروری ہو گیا کہ غیر حاجی خواہ مخواہ اس بے محل اور مسرفانہ رسم میں حصہ لیں"۔

"وہ روپیہ جو بکرے کی گردن پر چھری پھیرنے اور اسے زمین میں گاڑ دینے کے لیے صرف کیا جاتا ہے قومی اداروں کو ملنا چاہیے۔ وہ اس روپے سے ہر سال ایک عظیم الشان تجارتی بینک کھول سکتے ہیں، قرآن حکیم اور دوسرے علوم کی توسیع واشاعت کر سکتے ہیں، اعتقادات و اخلاق کی اصلاح کر سکتے ہیں، بیواؤں اور ناداروں کی مدد کر سکتے ہیں، اور ہزاروں نیکی کے کام کر سکتے ہیں بشرطیکہ تقلید کے جال سے آزاد ہو جائیں اور فضول بلکہ مضر رسوم کو چھوڑ دیں"۔

"افسوس ہے کہ سوائے نقل وتقلید کے آج تک کسی صاحب نے قربانی کے عقلی وتجربی فوائد پر روشنی نہیں ڈالی"۔

یہ قرآن سے کھلا ہوا معارضہ نہیں تو اور کیا ہے؟ قرآن حکیم ایک چیز کا حکم دیتا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ پہلے اس کے عقلی و تجربی فوائد پر روشنی ڈالی جائے۔ قرآن ایک چیز کے متعلق کہتا ہے کہ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ (تمھارے لیے اس میں بھلائی ہے) اور آپ اسے ایک فضول بلکہ مسرفانہ رسم قرار دیتے ہیں۔ قرآن ایک چیز کو شعائر اللہ میں شمار کرتا ہے اور خبر دیتا ہے کہ اللہ نے اس کو مقرر کیا ہے، مگر آپ اس کے مقابلے میں مغربی مستشرقین کی یہ تحقیق پیش فرماتے ہیں کہ یہ عہدِ جاہلیت کی ایک رسم تھی جس کو آج صرف مسلمانوں نے اختیار کر رکھا ہے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی است

قرآن پر ایمان رکھنے کا دعویٰ اور پھر قرآن کے مقابلے میں یہ جرأت! اگر ان دونوں کا اجتماع ممکن ہے تو ماننا پڑے گا کہ وجودِ شے اور عدمِ شے کا اجتماع بھی ممکن ہے۔

قرآن کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ جس قدر اعتراضات اس پر ہو سکتے ہیں ان کا جواب وہ خود ہی دے دیتا ہے۔ آیئے ذرا یہ بھی دیکھیے کہ قربانی کے حکم پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کے جواب میں قرآن کیا کہتا ہے۔

۱- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اس کتاب کی فصل سوم: قربانی کے احکام۔ (مرتبین)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جاہلیت میں جس طرح غیر اللہ کے لیے رکوع و سجود ہوتے تھے اور غیر اللہ سے دُعا اور استعانت کی جاتی تھی، اُسی طرح غیر اللہ کے لیے نذریں اور قربانیاں بھی ہوتی تھیں۔ ہندوستان، ایران، مصر، روم غرض کون سا ملک ایسا ہے جہاں معبودانِ باطل کے اصنام اور ہیکلوں پر قربانیاں نہ چڑھائی جاتی ہوں۔ حتیٰ کہ خدا پرست یہودی قوم بھی اس شرک میں مبتلا ہوئی اور بار بار اس نے بتوں پر قربانیاں چڑھانے کا ارتکاب کیا جس کی شکایت جگہ جگہ بائیبل کے عہدِ عتیق میں آتی ہے۔ قرآن میں بھی جاہلیت کی ان مشرکانہ رسموں کا ذکر ہے، مثلاً فرمایا:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ (الانعام ۶:۱۳۶) اور انھوں نے کھیتی کی پیداوار اور مواشی میں سے اللہ کا ایک حصہ ٹھہرا دیا اور بخیالِ خود کہنے لگے کہ یہ اللہ کا ہے اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کا ہے۔

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ (الانعام ۶:۱۳۸) اور انھوں نے کہا کہ یہ جانور اور کھیتیاں ممنوع ہیں کہ ان کو اس شخص کے سوا کوئی نہیں کھا سکتا جسے ہم اپنے خیال کے مطابق کھلانا چاہیں۔ اور کچھ ایسے جانور ہیں جن کی پشت پر سوار ہونا حرام کر دیا گیا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے۔ یہ ان کی افترا پردازی ہے (کہ ایسی جاہلانہ اور مشرکانہ باتوں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں)

قرآن نے آکر جس طرح عبادت کی تمام دوسری صورتوں کا رخ غیر اللہ سے اللہ کی طرف پھیر دیا اسی طرح نذروں اور قربانیوں کا رُخ بھی اُدھر سے اِدھر پھیرا۔ اس نے ہدایت کی کہ مشرکین غیرِ خدا کے لیے رکوع و سجود اور قربانی کرتے ہیں، تم کہو کہ ہمارا رکوع و سجود اور ہماری قربانی خدا کے لیے ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانعام ۶:۱۶۲) مشرکین اپنے جانوروں پر غیر خدا کے نام لیتے ہیں۔ تم ان پر صرف خدا کا نام لو: فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا۔ [الحج ۲۲:۳۶] وہ غیر اللہ کے نام پر جانوروں کو چھوڑ دیتے ہیں اور پھر نہ کسی کو ان پر سوار ہونے دیتے ہیں اور نہ ان کا گوشت کھانا یا کھلانا پسند کرتے ہیں۔ تم اس جہالت کے جواب میں ہدی کے اونٹوں سے ہر طرح کا فائدہ اُٹھاؤ: لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ (الحج ۲۲:۳۳) قربانی کا گوشت کھاؤ اور اللہ کے بندوں کو کھلاؤ: فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ (الحج ۲۲:۳۶) اس لیے کہ اللہ کو خون اور گوشت نہیں پہنچتا بلکہ تمھاری وہ خالص نیت پہنچتی ہے جس نے تم سے غیر اللہ کو ترک کر کے اللہ کی طرف رجوع کرایا: لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ (الحج ۲۲:۳۷) ہر شخص جو حکمتِ تشریع میں ادنیٰ بصیرت بھی رکھتا ہو اس کے لیے یہ سمجھنا بھی کچھ مشکل نہیں کہ شرک و بت پرستی اور رسومِ جاہلیت کو مٹانے کے لیے اس سے زیادہ کارگر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ جن اقسام اور جن شکلوں کی عبادتیں مشرک قوموں میں رائج ہوں اُن سب کو اللہ کے لیے مخصوص کر دیا جائے اور غیر اللہ کے لیے انھی سب کو ممنوع ٹھہرا دیا جائے۔[1]

(تفہیمات، دوم، اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۲۳۵-۲۳۸)

۱- مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ، اس کتاب کی دوسری فصل: قربانی کی اہمیت۔ (مرتبین)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل پنجم

عیدِ قربان

سماجی زندگی اور تہوار

تہوار اور انسان کی سماجی زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب سے آدمی نے اس زمین پر سماجی زندگی بسر کرنی شروع کی ہے، غالباً اسی وقت سے تہوار منانے کا سلسلہ بھی چلا آ رہا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے، اور کبھی نہیں رہی جس نے سال میں دو چار یا دس پانچ دن اس غرض کے لیے مخصوص نہ کیے ہوں۔ یہ تہوار دراصل سماج کی جان ہیں۔ لوگوں کا ایک جگہ جمع ہونا، مشترک جذبات کا مظاہرہ کرنا، مل کر خوشیاں منانا، ایک ہی قسم کی مقرر رسمیں ادا کرنا، یہ اپنے اندر سریش کی سی خاصیت رکھتا ہے جس سے افراد آپس میں جڑ کر ایک مربوط سوسائٹی بنتے ہیں اور ان میں اجتماعی روح نہ صرف پیدا ہوتی ہے بلکہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے تازہ اور بیدار ہوتی رہتی ہے۔

ہر تہوار تاریخی واقعے کی یادگار

عموماً جو تہوار دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں میں منائے جاتے ہیں اُن کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر تہوار یا تو کسی اہم تاریخی واقعے کی یادگار میں منایا جاتا ہے، یا کسی بڑے شخص کی ذات سے منسوب ہوتا ہے، یا کسی خاص مذہبی تقریب سے تعلق رکھتا ہے۔ بہرحال تہوار کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی تقریب ضروری ہے جو ایک قوم کے افراد یا ایک ملک کے باشندوں کے لیے مشترک دلچسپی کی چیز ہو اور جس سے ان کے گہرے جذبات وابستہ ہوں۔ اسی وجہ سے ایک قوم یا ملک کے تہواروں میں دوسری قوم یا ملک کے لوگ دلچسپی نہیں لیتے، اور کسی مصلحت سے بہ تکلف دلچسپی لینا چاہیں بھی تو نہیں لے سکتے، کیونکہ ایک قوم کا تہوار جن روایات سے تعلق رکھتا ہے وہ دوسری قوم کے جذبات و احساسات میں وہ حرکت پیدا نہیں کرتیں جو خود اُس قوم میں پیدا کرتی ہیں۔

تہوار منانے کے مختلف طریقے

تہوار منانے کے طریقے بھی دنیا کی مختلف قوموں میں بے شمار ہیں۔ کہیں صرف کھیل کود اور راگ رنگ اور لطف و تفریح تک ہی تہوار محدود رہتا ہے۔ کہیں تفریحات تہذیب کی حد سے گزر کر فسق و فجور اور ناشائستگی کی حد تک پہنچ جاتی ہیں۔ کہیں مہذب تفریحات کے ساتھ کچھ سنجیدہ مراسم بھی ادا کیے جاتے ہیں۔ اور کہیں ان اجتماعی تقریبوں سے فائدہ اٹھا کر لوگوں میں اعلیٰ درجے کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اخلاقی روح پھونکنے اور کسی بلند نصب العین کے ساتھ محبت اور گرویدگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غرض ایک قوم کا تہوار منانے کا طریقہ گویا ایک پیمانہ ہے جس سے آپ اُس کے مزاج اور اس کے حوصلوں اور اُمنگوں کو علانیہ ناپ کر دیکھ سکتے ہیں۔ جتنی بلند اخلاقی روح کسی قوم میں ہوگی اُتنے ہی اس کے تہوار مہذب اور پاکیزہ ہوں گے۔ اور اسی طرح اخلاقی اعتبار سے کوئی قوم جتنی پست ہوگی وہ اپنے تہواروں میں اتنے ہی مکروہ مناظر پیش کرے گی۔

اسلام چوں کہ ایک عالم گیر اصلاحی تحریک ہے جو کسی خاص ملک یا قوم سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کو ایک خدا پرستانہ تہذیب کا پیرو بنانا چاہتی ہے، اس لیے اس نے جہاں زندگی کے ہر شعبے کو اپنے خاص ڈھنگ پر ڈھالا ہے، اسی طرح تہواروں کو بھی ایک نئی شکل دی ہے جو دنیا بھر کے تہواروں سے مختلف ہے، سماجی زندگی میں تہوار کی جو اہمیت ہے، اور سماج میں اجتماعی تقریبات کے لیے جو ایک قدرتی پیاس پائی جاتی ہے، اس کو تو اسلام نے نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی ہے، مگر تہوار کی تقریب اور تہوار منانے کے طریقے اور تہوار کی اخلاقی روح میں بنیادی تغیر کر دیا ہے جس کی تین اہم خصوصیات کی طرف میں آپ کی توجہ دلاؤں گا۔

۱- ایک عالم گیر تحریک اُن قومی تہواروں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی جن تہواروں کی بنیاد الگ الگ قوموں کی روایات پر ہو، جن کے ساتھ ایک ہی قوم کے جذبات اور دلچسپیاں وابستہ ہوں، اور جن میں ایک قوم کے ساتھ دوسری قوم فطرتاً شریک نہ ہوسکتی ہو۔ وہ دراصل انسانیت کی قومی تقسیم وتفریق کو مضبوط کرنے والی طاقت ہیں۔ ایسے تہوار جس طرح ایک قوم کو اپنے اندر منظم ہونے میں مدد دیتے ہیں اُسی طرح وہی ہر قوم کو دوسری قوم سے پھاڑنے اور الگ کرنے کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا کوئی ایسی تحریک جو قومیتوں سے بالاتر ہو، انسانیت سے بحث کرتی ہو اور تمام دنیا کے انسانوں کو ایک تہذیب کے رشتے میں پرونا چاہتی ہو، اس قسم کے تہواروں کو صرف یہی نہیں کہ قبول نہیں کر سکتی بلکہ گوارا بھی نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ اس کے مقصد کی راہ میں بالفعل ایک رکاوٹ ہوتے ہیں۔ اُس کے پیش نظر مقصد کا فطری اقتضا یہی ہے کہ جو قومیں اس کے زیر اثر آئیں ان سے وہ قومی تہوار چھڑوا دے اور ایسے تہوار مقرر کرے جن میں وہ سب شریک ہوسکتی ہوں، جو بیک وقت قومی بھی ہوں اور بین الاقوامی بھی، جن کی بنیاد قومی روایات وجذبات پر نہ ہو بلکہ انسانیت کے لیے مشترک اہمیت رکھنے والے جذبات وروایات پر ہو۔

۲- پھر جو تحریک عالم گیر ہونے کے ساتھ خدا پرستانہ بھی ہو وہ ایسے تہواروں کو گوارا نہیں کر سکتی جن میں شرک اور مخلوق پرستی اور مشرکانہ توہمات کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ وہ اپنے مشن کی عین فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ جن قوموں اور ملکوں میں اس کا اثر پھیلے ان کے پرانے مذہبی تہواروں کو اور ان سب تقریبات کو جو قدیم عقائد کی یاد تازہ کرنے والی ہوں، بند کر دے اور ان کی جگہ ایسے تہوار مقرر کرے جو خدا پرستی کا گہرا رنگ لیے ہوئے ہوں۔

۳- خدا پرستی کے ساتھ لازمی طور پر اخلاق کا بھی ایک بلند نصب العین پیدا ہوتا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک خدا پرستانہ تحریک اپنے پیروؤں کو ایسے تہوار دے جو فسق وفجور اور ناشائستگی سے بالکل خالی ہوں، جن میں لطف وتفریح تہذیب کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ساتھ اور اظہارِ مسرت سنجیدگی کے ساتھ ہوں، جو محض کھیل کود ہی پر ختم نہ ہو جائیں بلکہ جماعتی زندگی میں تہوار سے جو ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے اس کو اعلیٰ درجے کے اخلاقی مقاصد کے لیے پوری طرح استعمال کیا جائے۔

عید اور بقر عید کے دو تہوار

اسلام نے اپنے پیروؤں کے لیے جو تہوار مقرر کیے ہیں ان میں یہ تینوں خصوصیتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ عرب، ایران، مصر، شام اور دوسرے ملکوں میں جن قوموں نے اسلام قبول کیا ان کے تمام مذہبی اور قومی تہوار اسلام نے چھڑوا دیے، اور ان کی جگہ دو تہوار رائج کیے جنھیں آپ عید اور بقر عید کے نام سے جانتے ہیں۔ ان میں سے پہلا تہوار تو اس خوشی میں منایا جاتا ہے کہ خدا کے نام پر رمضان کے تیس روزے رکھنے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی تعمیل کرنے میں ہم کامیاب ہو گئے۔ لہٰذا اس تعمیلِ فرمان سے فارغ ہو کر ہم اپنے مالک کا شکر بجالاتے ہیں۔ رہا دوسرا تہوار تو وہ اُس بے نظیر قربانی کی یادگار ہے جو اب سے چار ہزار برس پہلے خدا کے ایک سچے فرماں بردار بندے نے اپنے مالک کے حضور پیش کی تھی۔ ان دونوں تہواروں میں آپ صریحاً دیکھ سکتے ہیں کہ کسی مخصوص قومیت یا وطنیت کا لگاؤ بالکل نہیں ہے بلکہ دو ایسی چیزوں کو تہوار کی بنیاد بنایا گیا ہے جن سے دنیا کے سارے خدا پرست انسانوں کے جذبات یکساں وابستہ ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح دونوں تہواروں میں خداوندِ عالم کی خالص بندگی کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ کسی قسم کی اکابر پرستی (hero worship) کا یا کسی مخلوق کی پرستاری کا ادنیٰ شائبہ بھی آپ ان میں نہیں پا سکتے۔ پھر ان تہواروں کے منانے کا طریقہ جو مقرر کیا گیا ہے وہ بھی اتنا پاکیزہ ہے کہ اُس سے زیادہ نفیس، مہذب اور اخلاقی فائدوں سے لب ریز طریقہ تصور میں نہیں آ سکتا۔ بعد کے مسلمانوں نے اسلامی عید کی اصلی شان کو کسی حد تک جاہلیت کے افعال سے داغ دار کر دیا ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جس طرح عید منائی جاتی تھی اس کا نقشہ میں آپ کے سامنے کھینچتا ہوں جس سے آپ اس تہوار کی پاکیزگی کا صحیح اندازہ کر سکیں گے۔

عید منانے کا طریقہ

عید کے روز صبح کو تمام مسلمان، عورت، مرد، بچے سب غسل کرتے تھے اور اچھے سے اچھے کپڑے جو خدا نے ان کو دیے ہوں پہن کر نکلتے تھے۔ رمضان کی عید میں نماز کے لیے جانے سے پہلے تمام خوش حال لوگ ایک مقرر مقدار میں کھانے کا سامان یا اس کی قیمت غریبوں کو دیتے تھے تاکہ کوئی شخص عید کے روز بھوکا نہ رہ جائے۔ بقر عید میں اس کے برعکس نماز کے بعد گھر واپس آ کر قربانی کی جاتی تھی اور اس کا گوشت تقسیم کیا جاتا تھا۔ ذرا دن چڑھنے پر سب لوگ گھروں سے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ حکم تھا کہ عورت، مرد، بچے سب نکلیں تاکہ مسلمانوں کی کثرت اور ان کی شان کا اظہار ہو، خدا سے دعا مانگنے میں بھی سب شریک ہوں، اور اس اجتماعی مسرت میں بھی سب کو شرکت کا موقع مل جائے۔ عید کی نماز مسجد کے بجائے بستی کے باہر میدان میں ہوتی تھی تاکہ بڑا مجمع ہو سکے۔ نماز کے لیے جاتے وقت سارے مسلمان یہ تکبیر پڑھتے ہوئے چلتے تھے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَ لِلّٰہِ الْحَمْدُ. اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ ہی سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی سب سے بڑا ہے، ساری تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔

ہر گلی، ہر کوچے، ہر محلے، ہر بازار اور ہر سڑک پر یہی نعرے لگتے تھے جن سے ساری بستی گونج اٹھتی تھی۔

عیدگاہ کے میدان میں جب سب لوگ جمع ہو جاتے تو صفیں باندھ کر سارا مجمع رسولِ خدا کی امامت میں پوری باقاعدگی کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کرتا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دیتے۔ جمعے کی نماز کے برعکس یہ خطبہ نماز کے بعد ہوتا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ آدمی اپنے لیڈر کی اُس اہم تقریر کے وقت موجود رہیں جس کا موقع سال میں صرف دو ہی مرتبہ آتا ہے۔ پہلے ایک تقریر مردوں کے سامنے ہوتی۔ پھر آپ میدان کے اُس حصے کی طرف تشریف لے جاتے جہاں عورتیں جمع ہوتی تھیں۔ اور وہاں بھی تقریر فرماتے تھے۔ ان تقریروں میں تعلیم و تلقین اور وعظ و نصیحت کے علاوہ اسلامی جماعت کے متعلق اُن تمام اہم مسائل پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی جو اس وقت درپیش ہوتے تھے۔ کوئی فوجی یا سیاسی مہم اگر پیش نظر ہوتی تو اس کا انتظام بھی وہیں اسی مجمع میں کر دیا جاتا۔ جماعتی ضروریات کی طرف بھی لوگوں کو توجہ دلائی جاتی اور ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق ان کے پورا کرنے میں حصہ لیتا، حتیٰ کہ روایات میں آیا ہے کہ عورتیں اپنے زیور تک اُتار اُتار کر خدا کے دین اور جماعتِ مسلمین کی خدمت کے لیے پیش کر دیتی تھیں۔

پھر یہ مجمع عیدگاہ سے پلٹتا تھا اور حکم یہ تھا کہ جس راستے سے آئے ہو اس کے خلاف دوسرے راستے سے گھروں کی طرف واپس جاؤ تاکہ بستی کا کوئی حصہ تمھاری چہل پہل سے اور تمھاری تکبیروں کی گونج سے خالی نہ رہ جائے۔

نماز سے فارغ ہو کر بقرعید کے روز تمام ذی استطاعت مسلمان قربانی کرتے تھے۔ اس قربانی کا مقصد اس واقعے کی یاد ہی کو نہیں بلکہ اُن جذبات کو بھی تازہ کرنا تھا جن کے ساتھ عراق کا رہنے والا ایک غریب الوطن بوڑھا انسان مکے میں خدا کا اشارہ پاتے ہی خود اپنے بیٹے کو خدا کی محبت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا اور عین وقت پر خدا نے اپنے رحم و کرم سے اس کو بیٹے کے بدلے مینڈھے کی قربانی پیش کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ٹھیک اُسی تاریخ کو اُسی وقت تمام مسلمان وہی فعل عملاً کر کے اس جذبے کو تازہ کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح وہ بھی خدا کے مسلم اور مطیع فرمان بندے ہیں، انھی کی طرح اپنی جان، مال، اولاد ہر چیز کو خدا کے حکم اور اس کی محبت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہیں اور ان کا جینا اور مرنا سب کچھ خدا کے لیے ہے۔ اس نیت کا اظہار جانور کو ذبح کرنے کے فعل سے اور اُن الفاظ سے ہوتا ہے جو ذبح کے وقت زبان سے ادا کیے جاتے ہیں:

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ، اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَلَکَ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۔ میں نے اپنا رخ پھیر دیا اُس ذات کی طرف جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ میں ٹھیک اُسی طریقے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا پیرو ہوں جو ابراہیمؑ کا طریقہ تھا۔ میں خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ پروردگارِ عالم کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرماں بردار بندوں میں سے ہوں۔ خدایا! یہ تیرا ہی دیا ہوا مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے، بسم اللہ اللہ اکبر۔

یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہوئے جانور ذبح کیا جاتا تھا اور اس منظر کو گھر کی عورتیں اور بچے سب دیکھتے تھے تاکہ سب کے دلوں میں وہی قربانی اور خدا کی محبت و فرماں برداری کے جذبات تازہ ہو جائیں۔ پھر یہ گوشت غریبوں اور رشتہ داروں اور دوستوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اس کا ایک حصہ گھر میں اپنے کھانے کے لیے بھی رکھ لیا جاتا تھا۔ جانور کی کھال یا اُس کی قیمت غریب لوگوں کو دے دی جاتی تھی۔ اور اس کے علاوہ بھی دل کھول کر خیرات کی جاتی تھی تاکہ عید صرف خوش حال لوگوں ہی کا تہوار بن کر نہ رہ جائے۔

بس یہ عید تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں منائی جاتی تھی۔ ان 'سرکاری' مراسم کے علاوہ 'غیر سرکاری' طور پر جوان لوگ کچھ کھیل کود بھی لیتے تھے اور گھروں کی لڑکیاں بالیاں مل بیٹھ کر کچھ گیت بھی گا لیا کرتی تھیں۔ مگر یہ چیز بس ایک حد کے اندر ہی تھی، اُس سے آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ سوسائٹی کے لیڈر تو جوانوں کی ان جائز اور معصوم خوش فعلیوں میں بھی حصہ لینے سے اجتناب کرتے تھے تاکہ ان کی اتنی ہمت افزائی نہ ہو جس سے وہ ناروا مظاہرے کرنے کی جرأت کرنے لگیں۔

اس معاملے میں لیڈروں کا جو طرزِ عمل تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے جو مستند روایات میں بیان ہوا ہے۔ ایک دفعہ عید کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا حضرت عائشہؓ کے پاس پڑوس کی دو لڑکیاں بیٹھی گیت گا رہی ہیں۔ گیت کچھ عشق و عاشقی اور شراب و کباب کے مضمون کے نہ تھے بلکہ جنگِ بُعاث کے زمانے کے گیت تھے۔ لڑکیاں بھی کوئی پیشہ ور فن کار و موسیقار نہ تھیں بلکہ گھروں کی بہو بیٹیاں تھیں جو کبھی دل بہلانے کو آپس میں بیٹھ کر معصومانہ گیت گا لیا کرتی ہیں۔ رسول اللہؐ نے ان کی اس تفریح میں دخل نہ دیا اور خاموشی کے ساتھ ایک گوشے میں جا کر چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد حضرت ابو بکرؓ آئے اور انھوں نے اپنی صاحبزادی کو ڈانٹ بتائی کہ رسولؐ کے گھر میں یہ کیا شیطانی حرکت ہے۔ ان کی آواز سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا: رہنے دو، ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے، آج ہماری عید ہے۔

آنحضرتؐ کا یہ ارشاد سن کر حضرت ابو بکرؓ خاموش ہو گئے، مگر وہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اُن کے پیٹھ موڑتے ہی حضرت عائشہؓ نے لڑکیوں کو آنکھ کا اشارہ کیا اور وہ اپنے گھروں کو بھاگ گئیں۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جوان لوگوں کے معصومانہ کھیل کود اور کچھ گا بجا لینے کو جائز تو رکھا جاتا تھا مگر بڑے لوگ خود ان دلچسپیوں میں حصہ لے کر ان کی ہمت نہیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بڑھاتے تھے۔ بعد میں جب بڑوں نے حدود کی نگہداشت چھوڑ دی تو رسی ڈھیلی ہی ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ ناچ رنگ سے گزر کر معاملہ یہاں تک پہنچا کہ ؎

روزِ عید است لبِ خشک زمے آلود کنید
چارۂ کارِ خود اے تشنہ لباں زود کنید

(نشری تقریریں، فروری ۱۹۷۸ء، ص۸۶-۹۶)

❁ ❁ ❁

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ششم

متفرق مباحث

فلمِ خانۂ خدا کی شرعی حیثیت

س: جس قسم کی فلمیں ہمارے ہاں دکھائی جارہی ہیں، وہ معاشرے کے لیے ناسور کی حیثیت رکھتی ہیں مگر فلمی دنیا نے گزشتہ دنوں ایک فلم 'خانۂ خدا' کے نام سے بنا کر عوام کو دکھانے کا اہتمام کیا ہے۔ آپ کے خیال میں اور شریعت کی رُو سے یہ کہاں تک درست اور مناسب بات ہے؟ اور اگر مناسب نہیں تو اس کی روک تھام کے لیے کیا تدابیر اور اقدام کرنے چاہییں؟

ج: پہلے تو اس بات کو آپ سمجھ لیں کہ خانۂ خدا میں جو عبادت ہوتی ہے وہ لوگوں کے لیے تماشے کی حیثیت نہیں رکھتی۔ سب سے پہلے بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس کو بھی ایک تماشا بنا دیا گیا اور پھر اسے دکھایا بھی وہاں جارہا ہے جہاں لوگ تماشا ہی دیکھنے جاتے ہیں......... یہ ایک غلط کام ہے اور پھر اسے تماشے کی جگہ لے جاکر دکھانا اور بھی غلط ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک حج فلم بنائی جاسکتی ہے جس میں لوگوں کو عبادت کا طریقہ جو حج میں اختیار کیا جاتا ہے اور جو شریعت نے مقرر کیا ہے وہ سکھایا جائے۔ یا پھر یہ ہے کہ اس میں ایسی تبلیغ موجود ہو جو لوگوں میں حج کا شوق پیدا کرے۔ لیکن 'خانۂ خدا' کے نام سے بننے والی اس فلم میں یہ دونوں پہلو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، بلکہ اس کے برعکس تاثر ملتا ہے۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے بتاتے ہیں کہ بعض جگہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذاق کے لیے کسی خاص منظر کو لیا گیا ہے اور اس پر کافی دیر تک فوکس کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کے لیے وہ مضحکہ بنے۔ مثلاً منیٰ میں قربانی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں دس بارہ لاکھ آدمی جمع ہوں اور حج کے سلسلے کا آخری کام انجام دیا جا رہا ہو، وہاں ہر آدمی کو جلدی ہوتی ہے کہ وہ قربانی سے فارغ ہو کر جاکر کپڑے بدلے۔ اس موقع پر بھاگ دوڑ اور قربانی کے جانوروں کو جلدی جلدی لانے کے مناظر کو خاص طور پر لیا گیا ہے۔ اسی طرح دیکھنے والوں نے بتایا ہے کہ ایک جگہ جہاں حجرِ اسود کو بوسہ دیتے ہیں تو اس جگہ نظم وضبط برقرار رکھنے کے لیے ایک ایسا سپاہی کھڑا ہوا تھا جس کا رنگ کالا تھا اور چہرے پر کچھ دھبے سے پڑے ہوئے تھے۔ فلم بنانے والوں نے ایک دفعہ اس سپاہی کو دکھایا، پھر حجرِ اسود کو دکھایا، پھر اس سپاہی کو۔ یہ عمل تین مرتبہ کیا گیا۔ صرف یہ دکھانے کے لیے کہ اس کا رنگ بھی......... حجرِ اسود جیسا ہے۔ حجرِ اسود بھی ٹوٹا ہوا ہے اور وہاں بھی گومڑے سے پڑے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی باتوں کا مقصد حج کی تبلیغ نہیں ہوسکتا۔ پھر اس کے ساتھ کوئی کمنٹری ایسی نہیں ہے جو حج کا شوق پیدا کرنے والی ہو۔ اور مناسک بھی ترتیب کے ساتھ نہیں دکھائے گئے جس سے مناسکِ حج کی تعلیم حاصل ہو۔ صرف حج کو تماشا بنانے کا کام سرانجام دیا گیا ہے۔ اب کیا مسلمان اس حد تک گر چکے ہیں کہ وہ اپنی عبادتوں کو تماشا بنائیں گے؟ علاوہ ازیں اس کے اندر ایک چیز اور بھی ہے جو قابلِ افسوس ہے۔ وہ یہ کہ احرام کی حالت میں عورتوں کو حکم ہے کہ وہ چہرہ کھلا رکھیں۔ نماز کی حالت میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عورتوں کو لامحالہ چہرہ کھلا رکھنا پڑتا ہے کیونکہ نماز منہ ڈھک کر نہیں ہوتی۔ اب اس فلم میں جہاں عورتیں نماز پڑھتی ہیں۔ اس کے بار بار فوٹو لیے ہیں۔ کیا یہ دین داری کے جذبات کا مظاہرہ تھا؟ حج میں عورت کو جو چہرہ کھولنے کا حکم ہے اسی طرح مرد کو بھی یہ حکم ہے کہ وہ اپنی نگاہ نیچی رکھے اور عورت کی طرف نہ دیکھے۔ لیکن یہاں کیمرے کے ذریعے ان خواتین کو دنیا بھر کے مردوں کو دکھانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

(۵-اے ذیلدار پارک، دوم، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۲۶۴-۲۶۶)

شعائر اللہ

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (المائدہ ۵:۲) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو............نہ حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال کر لو، نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو، نہ اُن جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذرِ خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں، نہ اُن لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکانِ محترم (کعبے) کی طرف جا رہے ہوں۔ ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو............اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمھارے لیے مسجدِ حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمھارا غصہ تمھیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ نہیں، جو کام نیکی اور خدا پرستی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔

شعائر کے معنی

ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدے یا طرزِ فکر و عمل یا کسی نظام کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کا 'شعار' کہلائے گی، کیونکہ وہ اس کے لیے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے۔ سرکاری جھنڈے، فوج اور پولیس کے یونی فارم، سکے، نوٹ اور اسٹامپ حکومتوں کے شعائر ہیں اور وہ اپنے محکموں سے، بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے، سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیت کے شعائر ہیں۔ چوٹی اور زنار اور مندر برہمنیت کے شعائر ہیں۔ کیس اور کڑا اور کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں۔ ہتھوڑا اور درانتی اشتراکیت کا شعار ہے۔ سواستیکا آریہ نسل پرستی کا شعار ہے۔ یہ سب مسلک اپنے اپنے پیروؤں سے اپنے ان شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اُس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے، اور اگر وہ توہین کرنے والا خود اسی نظام سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا فعل اپنے نظام سے ارتداد اور بغاوت کا ہم معنی ہے۔

شعائر اللہ سے مراد

'شعائر اللہ' سے مراد وہ تمام علامات یا نشانیاں ہیں جو شرک و کفر اور دہریت کے بالمقابل خالص خدا پرستی کے مسلک کی نمائندگی کرتی ہوں۔ ایسی علامات جہاں جس مسلک اور جس نظام میں بھی پائی جائیں مسلمان ان کے احترام پر مامور ہیں، بشرطیکہ ان کا نفسیاتی پس منظر خالص خدا پرستانہ ہو، کسی مشرکانہ یا کافرانہ تخیل کی آلودگی سے انھیں ناپاک نہ کر دیا گیا ہو۔ کوئی شخص خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اگر اپنے عقیدہ و عمل میں خدائے واحد کی بندگی و عبادت کا کوئی جز رکھتا ہے، تو اس جز کی حد تک مسلمان اس سے موافقت کریں گے اور ان شعائر کا بھی پورا احترام کریں گے جو اس کے مذہب میں خالص خدا پرستی کی علامت ہوں۔ اس چیز میں ہمارے اور اس کے درمیان نزاع نہیں بلکہ موافقت ہے۔ نزاع اگر ہے تو اس امر میں نہیں کہ وہ خدا کی بندگی کیوں کرتا ہے، بلکہ اس امر میں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیوں کی آمیزش کیوں کرتا ہے۔

(تفہیم القرآن، اوّل، ص ۴۳۹، المائدة، حاشیہ ۵)

شعائر اللہ کے لفظ کا اطلاق صرف انھی چیزوں پر نہیں ہوتا جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے، بلکہ ہر وہ چیز جو خدا پرستی کی علامت ہو، شعائر اللہ میں شمار کی جا سکتی ہے اور جس چیز کو بھی اللہ جل شانہ کے حضور ہدیہ کرنے کی نیت کر لی جائے اس کا احترام بجا و درست ہے۔ یہ احترام اُس شے کا نہیں بلکہ اُس خدا کا ہے جس کے لیے اسے مخصوص کرنے کی نیت کی گئی ہے۔

(رسائل و مسائل، چہارم، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۱۳۲)

حالتِ جنگ اور احترام شعائر اللہ

یاد رکھنا چاہیے کہ شعائر اللہ کے احترام کا یہ حکم اُس زمانے میں دیا گیا تھا جب کہ مسلمانوں اور مشرکینِ عرب کے درمیان جنگ برپا تھی، مکے پر مشرکین قابض تھے، عرب کے ہر حصے سے مشرک قبائل کے لوگ حج و زیارت کے لیے کعبے کی طرف جاتے تھے اور بہت سے قبیلوں کے راستے مسلمانوں کی زد میں تھے۔ اس وقت حکم دیا گیا کہ یہ لوگ مشرک ہی سہی، تمھارے اور ان کے درمیان جنگ ہی سہی، مگر جب یہ خدا کے گھر کی طرف جاتے ہیں تو انھیں نہ چھیڑو، حج کے مہینوں میں ان پر حملے نہ کرو، خدا کے دربار میں نذر کرنے کے لیے جو جانور یہ لیے جا رہے ہوں اُن پر ہاتھ نہ ڈالو، کیونکہ ان کے بگڑے ہوئے مذہب میں خدا پرستی کا جتنا حصہ باقی ہے وہ بجائے خود احترام کا مستحق ہے نہ کہ بے احترامی کا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چند شعائر

'شعائر اللہ' کے احترام کا عام حکم دینے کے بعد چند شعائر کا نام لے کر ان کے احترام کا خاص طور پر حکم دیا گیا کیونکہ اُس وقت جنگی حالات کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جنگ کے جوش میں کہیں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی توہین نہ ہو جائے۔ ان چند شعائر کو نام بہ نام بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ صرف یہی احترام کے مستحق ہیں۔

احرام بھی من جملہ شعائر اللہ ہے، اور اس کی پابندیوں میں سے کسی پابندی کو توڑنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے۔ اس لیے شعائر اللہ ہی کے سلسلے میں اس کا ذکر بھی کر دیا گیا کہ جب تک تم احرام بند ہو، شکار کرنا خدا پرستی کے شعائر میں سے ایک شعار کی توہین کرنا ہے۔ البتہ جب شرعی قاعدے کے مطابق احرام کی حد ختم ہو جائے تو شکار کرنے کی اجازت ہے۔

چوں کہ کفار نے اس وقت مسلمانوں کو کعبے کی زیارت سے روک دیا تھا اور عرب کے قدیم دستور کے خلاف حج تک سے مسلمان محروم کر دیے گئے تھے، اس لیے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جن کافر قبیلوں کے راستے اسلامی مقبوضات کے قریب سے گزرتے ہیں، ان کو ہم بھی حج سے روک دیں اور زمانہ حج میں ان کے قافلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر انھیں اس ارادے سے باز رکھا۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۴۳۹-۴۴۰، المائدہ، حاشیہ ۵-۸)

حرام مہینوں میں لڑائی کرنا

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ (البقرہ ۲:۲۱۷) لوگ پوچھتے ہیں: ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو: اس میں لڑنا بہت برا ہے، مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ خوں ریزی سے شدید تر ہے۔

یہ بات ایک واقعے سے متعلق ہے۔ رجب ۲ ہجری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ نخلہ کی طرف بھیجا تھا (جو مکے اور طائف کے درمیان ایک مقام ہے) اور اس کو ہدایت فرما دی تھی کہ قریش کی نقل و حرکت اور اُن کے آئندہ ارادوں کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ جنگ کی کوئی اجازت آپؐ نے نہیں دی تھی۔ لیکن ان لوگوں کو راستے میں قریش کا ایک چھوٹا سا تجارتی قافلہ ملا اور اس پر انھوں نے حملہ کر کے ایک آدمی کو قتل کر دیا اور باقی لوگوں کو اُن کے مال سمیت گرفتار کر کے مدینے لے آئے۔ یہ کارروائی ایسے وقت ہوئی، جب کہ رجب ختم اور شعبان شروع ہو رہا تھا اور یہ امر مشتبہ تھا کہ آیا حملہ رجب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(یعنی ماہ حرام) ہی میں ہوا ہے یا نہیں۔ لیکن قریش نے، اور ان سے در پردہ ملے ہوئے یہودیوں اور منافقین مدینہ نے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے اس واقعے کو خوب شہرت دی اور سخت اعتراضات شروع کر دیے کہ یہ لوگ چلے ہیں بڑے اللہ والے بن کر اور حال یہ ہے کہ ماہِ حرام تک میں خوں ریزی سے نہیں چوکتے۔ انھی اعتراضات کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ ماہِ حرام میں لڑنا بڑی بُری حرکت ہے، مگر اس پر اعتراض کرنا اُن لوگوں کے منہ کو تو زیب نہیں دیتا، جنھوں نے ۱۳ برس مسلسل اپنے سینکڑوں بھائیوں پر صرف اس لیے ظلم توڑے کہ وہ ایک خدا پر ایمان لائے تھے۔ پھر ان کو یہاں تک تنگ کیا کہ وہ جلاوطن ہونے پر مجبور ہو گئے، پھر اس پر بھی اکتفانہ کیا اور اپنے ان بھائیوں کے لیے مسجدِ حرام تک جانے کا راستہ بھی بند کر دیا۔ حالانکہ مسجد حرام کسی کی مملوکہ جائداد نہیں ہے اور پچھلے دو ہزار برس میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کو اس کی زیارت سے روکا گیا ہو۔ اب جن ظالموں کا نامۂ اعمال ان کرتوتوں سے سیاہ ہے، ان کا کیا منہ ہے کہ ایک معمولی سی سرحدی جھڑپ پر اس قدر زور شور کے اعتراضات کریں، حالانکہ اس جھڑپ میں جو کچھ ہوا ہے وہ نبی کی اجازت کے بغیر ہوا ہے اور اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اسلامی جماعت کے چند آدمیوں سے ایک غیر ذمہ دارانہ فعل کا ارتکاب ہو گیا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی معلوم رہنی چاہیے کہ جب یہ دستہ قیدی اور مالِ غنیمت لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، تو آپؐ نے اسی وقت فرما دیا تھا کہ میں نے تم کو لڑنے کی اجازت تو نہیں دی تھی۔ نیز آپؐ نے ان کے لائے ہوئے مالِ غنیمت میں سے بیت المال کا حصہ لینے سے بھی انکار فرما دیا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ ان کی یہ لوٹ ناجائز ہے۔ عام مسلمانوں نے بھی اس فعل پر اپنے ان آدمیوں کو سخت ملامت کی تھی اور مدینے میں کوئی ایسا نہ تھا، جس نے انھیں اس پر داد دی ہو۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۱۶۵، البقرہ، حاشیہ ۲۳۲)

ماہ حرام کی حرمت کا خیال

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○ (البقرہ ۲: ۱۹۴) ماہِ حرام کا بدلہ ماہِ حرام ہی ہے اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہوگا۔ لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے، تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ اُنھی لوگوں کے ساتھ ہے، جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

اہل عرب میں حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے یہ قاعدہ چلا آ رہا تھا کہ ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے تین مہینے حج کے لیے مختص تھے اور رجب کا مہینہ عمرے کے لیے خاص کیا گیا تھا، اور ان چار مہینوں میں جنگ اور قتل و غارت گری ممنوع تھی تاکہ زائرینِ کعبہ امن و امان کے ساتھ خدا کے گھر تک جائیں اور اپنے گھروں کو واپس ہو سکیں۔ اس بنا پر ان مہینوں کو حرام کہا جاتا تھا، یعنی حُرمت والے مہینے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ ماہِ حرام کی حرمت کا لحاظ کفار کریں تو مسلمان بھی کریں اور اگر وہ اس حرمت کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نظر انداز کر کے کسی حرام مہینے میں مسلمانوں پر دست درازی کر گزریں، تو پھر مسلمان بھی ماہِ حرام میں بدلہ لینے کے مجاز ہیں۔

اس اجازت کی ضرورت خاص طور پر اس وجہ سے پیش آ گئی تھی کہ اہل عرب نے جنگ وجدل اور لوٹ مار کی خاطر نَسِی کا قاعدہ بنا رکھا تھا، جس کی رو سے وہ اگر کسی سے انتقام لینے کے لیے یا غارت گری کرنے کے لیے جنگ چھیڑنا چاہتے تھے تو کسی حرام مہینے میں اُس پر چھاپہ مار دیتے اور پھر اس مہینے کی جگہ کسی دوسرے حلال مہینے کو حرام کر کے گویا اس حرمت کا بدلہ پورا کر دیتے تھے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کفار اپنے نَسِی کے حیلے کو کام میں لا کر کسی حرام مہینے میں جنگی کارروائی کر بیٹھیں، تو اس صورت میں کیا کیا جائے۔ اسی سوال کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

(تفہیم القرآن، اول، ص ۱۵۲، البقرہ، حاشیہ ۲۰۶)

شعائر اللہ اور اشہرِ حرم

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ۔ (المائدہ ۵:۲) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو............ نہ حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال کر لو۔

اَشْھُرِ حُرُم کی حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے صدہا برس سے عرب میں طوائف الملوکی، بدنظمی اور بدامنی برپا تھی۔ قبائل میں آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ راستے غیر محفوظ تھے۔ کوئی شخص اپنے قبیلے کے حدود سے نکل کر اپنے آپ کو محفوظ نہ پاتا تھا۔ بلکہ کوئی قبیلہ خود اپنے حدود میں بھی کسی طاقت ور قبیلے کا چھاپہ اچانک پڑ جانے سے مامون نہ تھا۔ ان حالات میں کب، کس طریقے سے اللہ کی یہ رحمت عرب قوم پر نازل ہوئی کہ سال میں چار مہینے حرام قرار دے دیے گئے تاکہ ان میں جنگ اور قتل و غارت گری بند رہے اور لوگ اطمینان سے حج اور عمرہ ادا کر سکیں۔ یہ بات کسی ذریعے سے معلوم نہیں ہو سکی ہے کہ ان چار مہینوں کو حرام قرار دینے کا یہ قاعدہ کس نے بنایا، کب بنایا، اور کس طرح تمام عرب قبائل نے اسے تسلیم کر لیا۔ بہرحال اسلام سے پہلے صدیوں سے یہ قاعدہ عرب میں رائج تھا اور ہر سال چار مہینے کے لیے امن میسر آ جانا اُس بدنصیب قوم کے لیے اللہ کا بہت بڑا فضل تھا۔

اسلام جب آیا تو عہدِ جاہلیت کی تمام اچھی چیزوں کی طرح اس قاعدے کی بھی توثیق کی گئی، کیونکہ اس کی بدولت کم از کم چار مہینے خوں ریزی رُکی رہتی تھی۔ اور حج اور عمرے کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا، اور مزید برآں ان مہینوں کا احترام اس بات کی علامت بھی تھا کہ جاہلیت میں مبتلا ہونے کے باوجود اہلِ عرب میں کچھ خوفِ خدا باقی ہے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور مسلمانوں سے کفارِ عرب کی لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، اُس وقت بھی ان چار مہینوں کی حرمت کا حکم باقی رکھا گیا، تاکہ کم از کم چار مہینے مسلمانوں کو امن میسر آ سکے۔ مگر جب تمام عرب مسلمان ہو گئے تو یہ حکم آپ سے آپ منسوخ ہو گیا۔ کیونکہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد تو اُن پر دوسرا اور عظیم تر حکم یعنی قتلِ مسلم بغیر حق کی حرمت کا دائمی حکم عائد ہو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گیا۔ اب اَشْہُرِ حُرُم کی حرمت کا حکم باقی رہنے کے معنی یہ ہوتے کہ اہل عرب صرف چار مہینے تو جنگ سے پرہیز کریں باقی ایام میں وہ لڑ سکتے ہیں۔

اس حکم کو جزیرۃ العرب کے لیے، اور اس کے بھی صرف آغازِ اسلام کے دور تک کے لیے مخصوص ماننے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ جزیرۃ العرب کے مسلمان ہو جانے کے بعد مسلمانوں کی لڑائیاں جائز طور پر صرف جزیرے سے باہر کے کافر کے ساتھ ہی ہو سکتی تھیں اور ان لڑائیوں میں صحابہ کرام کے دور سے لے کر آج تک کبھی اشہر حرم کی حرمت کا سوال کسی عالم نے نہیں اٹھایا۔ ظاہر ہے کہ کفار تو جنگ کی ابتدا کرنے میں اَشْہُرِ حُرُم کا لحاظ کر ہی نہ سکتے تھے۔ لیکن خود مسلمانوں نے بھی کسی کافر قوم پر حملہ کرتے ہوئے اس بات کا لحاظ نہیں کیا کہ کسی حرام مہینے میں جنگ نہ چھڑے، اور میرے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ کسی فقیہ نے کبھی اس پر اعتراض کیا ہو۔

(رسائل و مسائل، پنجم، اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۱۶-۱۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کتابیات

نوٹ: یہ فہرست مولانا مودودیؒ کی ان کتابوں یا تحریروں، تقریروں اور مکتوبات پر مشتمل ہے، جن سے اس مجموعے میں براہ راست اخذ کیا گیا ہے۔ جن کتابوں سے مولانا مرحوم نے استفادہ کیا ہے، ان کے نام اس فہرست میں شامل نہیں ہیں کیونکہ ہم نے اُن کی طرف رجوع نہیں کیا۔ ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ہے۔

۱۔	استفسارات، اوّل	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	دسمبر ۱۹۹۲ء
۲۔	اسلامی ریاست	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	جولائی ۱۹۸۸ء
۳۔	اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر	مکتبہ جماعت اسلامی، دارالاسلام پٹھان کوٹ	بار سوم، سنہ ندارد
۴۔	اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	جولائی ۱۹۷۹ء
۵۔	اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	جون ۲۰۰۲ء
۶۔	اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	اکتوبر ۲۰۰۴ء
۷۔	اقبال، دارالاسلام اور مولانا مودودیؒ (مجموعہ مکتوبات، مرتبہ: سید اسعد گیلانیؒ)	اسلامی اکادمی، اردو بازار، لاہور	۱۹۷۸ء
۸۔	ترجمان القرآن، ماہنامہ	دفتر ترجمان القرآن، حیدر آباد (دکن)	جولائی ۱۹۳۴ء
۹۔	ترجمان القرآن، ماہنامہ	دفتر ترجمان القرآن، حیدر آباد (دکن)	اکتوبر ۱۹۳۴ء
۱۰۔	تصریحات	احباب پبلی کیشنز، لاہور	جولائی ۱۹۷۹ء
۱۱۔	تفہیمات، دوم	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	اکتوبر ۱۹۶۷ء
۱۲۔	تفہیمات، دوم	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	دسمبر ۱۹۷۴ء
۱۳۔	تفہیمات، دوم	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	اپریل ۱۹۷۷ء
۱۴۔	تفہیمات، دوم	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	اپریل ۱۹۸۰ء
۱۵۔	تفہیمات، دوم	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	نومبر ۱۹۸۱ء
۱۶۔	تفہیمات، چہارم	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	اکتوبر ۱۹۸۹ء

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۱۷-	تفہیمات، چہارم	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	اگست ۱۹۹۹ء
۱۸-	تفہیم الاحادیث، سوم	ادارہ معارف اسلامی، لاہور	اگست ۲۰۰۴ء
۱۹-	تفہیم القرآن، اوّل	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	اکتوبر ۱۹۷۲ء
۲۰-	تفہیم القرآن، دوم	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	دسمبر ۱۹۷۲ء
۲۱-	تفہیم القرآن، سوم	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	فروری ۱۹۸۳ء
۲۲-	تفہیم القرآن، چہارم	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	جون ۱۹۸۱ء
۲۳-	تفہیم القرآن، پنجم	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	اگست ۱۹۸۱ء
۲۴-	تفہیم القرآن، ششم	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	مئی ۱۹۸۱ء
۲۵-	خطبات	ادارہ معارف اسلامی، کراچی	ستمبر ۲۰۰۳ء
۲۶-	خطبات	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	دسمبر ۲۰۰۴ء
۲۷-	خطبات حرم	منشورات، لاہور	اگست ۲۰۰۰ء
۲۸-	رسائل ومسائل، اوّل	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	ستمبر ۱۹۵۱ء
۲۹-	رسائل ومسائل، اوّل	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	اپریل ۱۹۸۱ء
۳۰-	رسائل ومسائل، اوّل	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	جنوری ۱۹۹۶ء
۳۱-	رسائل ومسائل، دوم	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	دسمبر ۱۹۸۷ء
۳۲-	رسائل ومسائل، سوم	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	مئی ۱۹۶۵ء
۳۳-	رسائل ومسائل، سوم	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	جون ۱۹۶۷ء
۳۴-	رسائل ومسائل، سوم	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	جولائی ۱۹۷۶ء
۳۵-	رسائل ومسائل، چہارم	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	جولائی ۱۹۷۶ء
۳۶-	رسائل ومسائل، چہارم	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	اپریل ۱۹۸۱ء
۳۷-	رسائل ومسائل، پنجم	ادارہ معارف اسلامی، لاہور	اپریل ۱۹۸۳ء
۳۸-	رسائل ومسائل، پنجم	ادارہ معارف اسلامی، لاہور	جولائی ۲۰۰۳ء

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۳۹-	سنت کی آئینی حیثیت	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	دسمبر ۱۹۷۹ء
۴۰-	قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	فروری ۱۹۸۴ء
۴۱-	کتاب الصوم	البدر پبلی کیشنز، لاہور	جولائی ۱۹۸۰ء
۴۲-	کتاب الصوم	البدر پبلی کیشنز، لاہور	نومبر ۲۰۰۰ء
۴۳-	گفتار و افکار	ادارہ معارف اسلامی، لاہور	فروری ۱۹۸۸ء
۴۴-	مسئلہ قربانی	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	اگست ۱۹۷۹ء
۴۵-	مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اوّل	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	جون ۱۹۷۰ء
۴۶-	مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، دوم	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	نومبر ۱۹۷۲ء
۴۷-	مکتوبات	البدر پبلی کیشنز، لاہور	جنوری ۶ [illegible] ۱۹ء
۴۸-	نشری تقریریں	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	فروری [illegible] ۱۹ء
۴۹-	نشری تقریریں	اسلامک پبلی کیشنز، لاہور	اکتوبر [illegible] ۰ ۲ء
۵۰-	۵-اے ذیلدار پارک، اوّل	البدر پبلی کیشنز، لاہور	اپریل [illegible] ۱۹ء
۵۱-	۵-اے ذیلدار پارک، دوم	البدر پبلی کیشنز، لاہور	دسمبر ۹ [illegible]

www.kitabosunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

ادارہ معارف اسلامی